THE BOOK WAS DRENCHED

Noise Book

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224245
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRAR

Call No. ٨٩١٥٣٠٣ Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the last marked below.

Checked 19

تمدن

التقریب

از شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد خاں صاحب ایل-ایل-ڈی-

ڈی او ایل

سی ایسے رسالہ کے واسطے جو دلی اور میری ایڈیٹری سے شائع ہو جس کے مقاصد میں زبان اردو کی خدمت بھی شامل ہو اس کے پہلے پرچہ کا میں بزرگ کے کلام سے محروم رہنا جو اسوقت قوم اور ملک دونوں کے واسطے مایۂ ناز ہے جس کے احسان سے اردو زبان مدتوں سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ کم از کم میرے خیال میں نہایت شرم کی بات تھی یہی تھا وہ خیال ۱۵۔ مارچ ۱۹۱۰ء کو ایک بجے کے قریب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ مولانا نے موصوف اسٹیٹ ہائی اور ۱۰ صفحے لیتے تھے میں نے اپنی آرزو ظاہر کی تو فرمایا

یہاں اب چل چلاؤ کا وقت ہے جو کرنا تھا وہ کر لیا اور جو لکھنا تھا وہ لکھ چکے
شب و روز کی غذا چند چمچے دودھ کے رہ گئے ہیں۔

اُس حسن عقیدت کے اظہار پر جو مجھکو مولانائے موصوف سے ہے
کچھ لکھوانے کا ارادہ کیا اور لکھوایا مگر افسوس ضعف و نقاہت نے
تکمیل نہونے دی امید ہے کہ آیندہ کسی پرچہ میں ہدیہ ناظرین ہو
بالفعل یہ چند سطریں ہیں جو تقریب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ گو
انمیں زیادہ تر سیر از کرہے لیکن تحریر کی وہ شان جسپر میں مٹا ہوا ہوں
اسمیں بھی موجود ہے +

تمدن جبتک دنیائے ادب میں زندہ ہے ان چند سطروں پر
ناز کرے گا اور میں تا دم واپسیں اس دستخطی مسودہ کو کلیجہ سے لگا کر
رکھوں گا +

راشد الخیری۔

تقریظ یا تنقید کا لکھنا یا لکھوانا دونو باتوں میں سے کسی کی وقعت دواؤں کے
اشتہار سے زیادہ نہیں اور دونوں مذموم و متہم ہیں۔ اسی لیے میں نے
ساری کتابیں لکھ ڈالیں مگر کسی سے کسی کی تقریظ یا تنقید نہیں لکھوائی بلکہ
محمد حسین آزاد مرحوم اور مولوی عبد الغفور شہباز مرحوم نے کسی کتاب کے چھاپنے
کی مجھ سے اجازت لی اور اجازت لے کر کتاب چھپوائی اور اس کے ساتھ از خود
تقریظ بھی لکھی مجھکو معلوم ہوا تو میں نے دونو کو تقریظ کے علیحدہ کرنے پر
کیا اور یہ جو کسی نامی کتاب میں گورنمنٹ یا ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن
ہے وہ ان لوگوں کا کار منصبی تھا۔ تقریظ و تنقید سے اس سے کیا تعلق
جو کچھ میں لکھوا رہا ہوں اسکو کوئی صاحب تقریظ یا تنقید نہ سمجھیں
طرح کی تقریب ہے کہ میرے بھتیجے اس معنے کر کہ میں ان کا چچا ہوں

ن نکالتے ہیں +

ولوی عبدالراشد نے یہ شان کئی برس سے اختیار کر رکھی ہے ان کی
ہیں پبلک میں کثرت سے شائع و مقبول ہوئیں انہوں نے مخزن اور عصمت کو
ایڈیٹ کیا اور ابھی تک رسالہ عصمت کو ایڈٹ کرتے ہیں۔ اگر کوئی
بدالراشد کے حسب نسب سے واقف ہو تو اسکو ان کے خاندانی حالات
سنکر تعجب ہوگا کہ یہ خیالات انہوں نے کہاں سے اخذ کیے۔ مولوی
راشد مولویوں کے خاندان کے ایک ممتاز ممبر ہیں جو وقت انکی تعلیم
تھا وقت تعصب مذہبی مسلمانوں میں اس بلا کا تھا کہ مولوی عبدالراشد
وہ خیالات کا آدمی مسلمانوں کی سوسائٹی میں رہ نہیں سکتا تھا میرے
لی تعلیم خاندانی سوسائٹی کی تعلیم ہے جو زمانہ مولوی عبدالراشد کی
ہ کا تھا ان کے خاندان میں مولوی عبدالراشد کے آج کے سے
ید ہونے محال تھے۔ لیکن مولوی عبدالراشد میں ہمکو اس بات کا
ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ غرض مولوی عبدالراشد
جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کے فطری خیال ہیں ایک بات
قعہ پر لکھنے کے قابل ہے کہ مولوی عبدالراشد کے پردادا مولوی
مرحوم اپنے عصر میں دلی کے ممتاز مولویوں میں تھے وہ آخر
ب ضعف پیری ایک مشت استخوان رہ گئے تھے اسوقت انکی تصویر
ں کے سامنے ہے۔ مسجد کے ایک در میں اکڑوں بیٹھے ہیں ایک
ہے اسپر کچھ کتابیں رکھی ہیں انکو دیکھ رہے ہیں اور کچھ اسپر
ئے ہیں۔ مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو انکا ترکہ یعنے کتابیں انکی
واناث میں تقسیم ہوا کچھ کتابیں مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کے

حصہ میں بھی آئیں جو مولوی عبدالراشد کے دادا اور میرے خسر تھے چونکہ میر خانہ داماد تھا مجھکو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کوئی کتاب عربی۔ فارسی۔ اردو کی نہ تھی جسپر مولوی عبدالخالق صاحب کا تشحیہ نہ تھا یہانتک کہ مثنوی بدر منیر جس سے مولوی صاحب کی وسعت معلومات کا ثبوت کافی ملتا ہے اور اس بات کا کہ اگلے بزرگ علم کو علم کے لیے سیکھتے تھے اسی طرح مولوی عبدالراشد نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ کیا ایسے شخص کا رسالہ تمدن جو وہ جاری کرنے والے ہیں تقریب کی قابلیت نہیں رکھتا؟

ہمارے خاندان میں ایک وقت وہ بھی تھا کہ میں ضلع اوری میں نبابت کا ڈپٹی کلکٹر تھا چھٹی لیکر گھر آتا تو پہلے سے گھر میں خط لکھ بھیجتا تھا کہ میرے پرانے لیتڑے پڑے ہوں تو سٹیشن پر بھیجدینا۔ کہ ان کو پہن کر میں ریل پر سے اتروں گا یہ ہی وہ تعصب تھا جسنے مولوی عبدالراشد کو وقت تعلیم سبقاً سبقاً حاصل نہ کرنے دی مگر انمیں خداداد مادہ تھا کہ انہوں نے انگریزی بھی سیکھ لی۔ اب اس خاندان میں بے تکلف لڑکے انگریزی پڑھتے ہیں اور میری نسل میں تو بعض ڈاکٹر بھی ہیں ڈاکٹر بہ معنے طبیب نہیں بلکہ علمی ڈاکٹر جیسا میں ہوں۔ اس نسل میں میں مولوی عبدالراشد کو ان کے خیالات اور انکی سیلف سٹڈی کے لحاظ سے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور وہ بھی جیسا ہر شریف خاندان کے فرزند کو چاہیئے مجھکو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ پس یہ چند سطریں رسالہ تمدن کی تقریب سے جو مولوی عبد کی دوسری تصنیفات کی طرح انشاء اللہ پبلک میں مقبول ہوگا۔ میرا ذاتی حال یہ ہے کہ کئی برس سے ہاتھہ مرتعش ہے اور میں خود اپنے ہاتھہ سے ایک سطر بھی نہیں لکھہ سکتا۔ ناچار کسی سے لکھواتا ہوں تو وہ

نہیں آتا۔ صرف مذہب کے متعلق میں کبھی کبھی کچھ لکھوا تا رہتا ہوں
عبدالرشد نے بتقاضائے سعادتمندی مجھ سے فرمائش کی اور
نے یہ چند سطریں لکھوادیں ؛

سائر راشد

فقیر کی صدا

قوم نے جھولی سنبھالی لے کے نام اللہ کا
بھائیو دنیا یہ سودا ہے خدا کی راہ کا
لوگ رستہ دیکھتے ہیں اب دکن کے شاہ کا
کب بجے ڈنکا نظام الملک آصف جاہ کا
غُل ہوا نکلے اگر وہ دینے والا قوم کا
او سخی داتا بھرے جائیو پیالا قوم کا

احمد علی شوق قدوائی

گدا کی صدا

بہنو کوڑی پیسا کچھ دو قوم پیالا لائی ہے
بہنو قوم کی عزت رکھ لو در پہ تمھارے آئی ہے
بہنو بچے ماؤں کے اور ماں پر فرض بھلائی ہے
بہنو سب بچوں پر صدقے جو کچھ آنا پائی ہے
بہنو بچے علم پڑھیں گے سودا حق کی راہ کا ہے
بہنو نام علیگڈھ کا ہے کام مگر اللہ کا ہے

(از عصمت)

تمدن کا اجرا

پرستش کے قابل نہیں وہ مقدس و متبرک صورتیں جن کے مبارک ہاتھ چمنستان ادب میں سدا بہار پھول کھلا گئے، مر کر زندہ، اور فنا ہو کر باقی ہیں، دریائے سخن کے، وہ گوہر شہوار، جن کی چمک دمک نے اردو کو حسینان جہاں کی صف میں بٹھا دیا، یہ اُن ہی کا طفیل تھا کہ اس کی میٹھی زبان سچے دل اور دلکش ادا نے ایک عالم کو مسخر کیا، کس اعزاز اور مرتبہ کی مستحق ہوگی وہ حسینہ جسکے منہ سے ایسے پھول برسے کہ دنیا معطر ہوگئی اوس کی شیریں بیانی کا سکہ چار دانگ عالم میں چلا اور شہرت کا ڈنکا دے دیں پر بجا نظم و نثر کے اولوالعزم فرزند اس کے ہم رکاب ہوئے، تخیل نے اپنا تاج شاہانہ اس کے سر پر رکھا اور تاریخ سخن کے وہ تاجدار جو فلسفہ اور سائنس کی زبردست فوج پر راج کر رہے تھے اسکی نفاست و نزاکت کا لوہا مان گئے۔ جن زبانوں پر ابا و اجداد کی عظمت کے گیت جاری تھے وہ بھی اسکا کلمہ پڑھنے لگیں مگر آہ اے فلک ناہنجار دل مجروح یہ کہتے ہوئے خون کے آنسو روتا ہے کہ تیری نیرنگیوں نے زمانہ کے ساتھ اسکا ورق بھی الٹا اس کے عاشق صادق اپنی عمریں اسپر قربان کر کے آج جنگلوں میں بجبر پڑے ہیں اور کوئی اتنا نہیں کہ اس بدنصیب پر دو آنسو بہالے ؎

بیرحمی کے زبردست ہاتھ اس کے تاراج کرنے پر آمادہ ہیں اور کوئی دم جاتا ہے کہ تعصب کا شہباز جو عرصہ سے نفسانیت کی ہوا میں منڈلا رہا ہے اسپر گر کر معزول کر دے ؎

ٹوٹی پھوٹی قبروں اور ویران کھنڈروں میں رہنے والو! ذرا کروٹ لو
اور اسکی حالت زار پر نظر ڈالو۔ تمھاری آنکھ بند ہوتے ہی اس کی مٹی پلید ہوگئی
کدھر ہو! آسمانی راج میں بسنے والی روحو! آنکھیں تمھاری صورتوں کو
ترس گئیں تمھاری شب جدائی کس غضب کی رات تھی جسکی آجتک صبح نہوئی تمھاری
زندگی غنیمت نہیں نعمت تھی۔ تم گئے مگر وہ کر گئے کہ اب ایسے لوگ نظر نہ آئیں گے
تم مر گئے مگر زندہ ہو تم نہیں ہو لیکن ہو۔ تمھاری یہ زندگی وہ زندگی ہے جسے
موت کا کھٹکا نہیں۔ تم خیالات کی لڑیوں میں ایسے موتی پرو گئے۔ جو
تا الابد جگمگائیں گے +

آسمان ادب کے روشن ستاروں شاہجہاں آباد کا چپہ چپہ اور کونہ کونہ
تمھاری یاد میں آنسو بہا رہا ہے۔ اردو جسپر تم اپنی زندگیاں نثار کر گئے آج
اس حال میں ہے کہ لونڈیاں اس کی سوکن اور پاؤں تلے کی چیونٹی اس کی
دشمن نمک خوار انجان ہیں اور دوست نادان! اپنی برکت کا ہاتھ بڑھاؤ
اور اس کے سر پر رکھو! زمانہ آگیا اور ابھی آئیگا کہ یہ فانی دنیا تمھارے نام آنکھوں
سے لگائے قدرت کے بازیگر کیسے ہی روپ بھریں مگر قصر اردو کے معمار
تمھاری گلکاریاں دیکھ کر سر جھکا لیں گے۔ تمھاری قبریں مٹی کا ڈھیر
ہو جائیں۔ تمھارے مدفنوں کا نام و نشان تک نہ رہے مگر اس کٹھن منزل میں
تم وہ فانوس جلا گئے ہو جسکی روشنی بھولے بھٹکے مسافروں کو منزل مقصود پر پہونچاتی رہیگی!
تمدن اسی خاک پاک کا ایک ذرہ ہے جسمیں تم جیسے جواہر مدفون ہیں مقدس روحوں
سے لو لگ رہتا اور دعا کرنا کہ یہ ناچیز پرچہ اس گمنستان کی کچھ خدمت کرے جسکو تم نے
اپنے خون سے سینچکر لالہ زار بنایا +

بس مقدس روحوں میرا سلام لو اور میری اس دعا پر آمین کہو کہ تمدن
اس بوڑھی کی ایک بار اور شباب ہو جسکو تمھارے مبارک ہاتھوں نے لگایا تھا۔ ایڈیٹر

قندِ پارسی

حضرت اقبال کے اُردو کلام سے ایک زمانہ مستفید ہو چکا ہے لیکن یہ امر نسبتاً کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جناب موصوف فارسی کلام پر بھی کما حقہٗ قدرت رکھتے ہیں۔

اس صنف میں ان کے لطفِ زبان اور حسنِ بیان کا ذیل کی غزل سے اندازہ ہو سکتا ہے جسے تیمناً درج کرتے ہیں۔ انکی طبعِ نیساں کا یہ ترشح امید دلاتا ہے کہ تمدّن کی کشتِ مضامین آئندہ بھی اُن کے ترشحاتِ قلم سے سیراب ہوتی رہے گی۔ اُردو اور فارسی کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ فارسی غزلیات کا اُردو رسائل میں شائع ہونا کسطرح بھی ناموزوں نہیں۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ "تمدّن" آئندہ بھی صاحب کمال شعرا کے فارسی کلام کا نمونہ وقتاً فوقتاً پیشکش ناظرین کرتا رہے گا۔

سعید

(پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب۔ ایم۔ اے۔)

غزل

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابانِ جنوں بردی و رسوا ساختی

جرمِ ما از دانۂ تقصیرِ او از سجدہ
نہ بآں بیچارہ مے سازی نہ با ما ساختی

ای خنک روزی کہ فرمانِ پریشانی دہی
مشت خاکِ را کہ حشر آرزوہا ساختہ

جرمِ امروزست فالِ چہرۂ فردائے حشر
آفتاب ایں سحر از ظلمتِ ما ساختی

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل
یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختہ

این چہ افسوں دیں چہ نیرنگ است اے حسن غیور — دیدہ بخشیدی و محرم تماشا ساختی
طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم — ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی
اے سرشت گردم چہ پنداری کہ ما نشناختیم — چاک دامن خود از دست زلیخا ساختی
پرتو حسن تو مے افتد بروں مانند رنگ — صورت مے پردہ از دیوار مینا ساختی

بر لب اقبال مہر خامشی زیبا نبود
چوں دل وارفتہ اش آن نغمہ پیرا ساختی

جب لارڈ ایلڈن کو لارڈ چانسلری کی خدمات سپرد ہوئیں تو اس تقریب پر ہز میجسٹی سے انکو مبارکباد دی گئی۔ بادشاہ نے اپنی مبارکباد میں فرمایا کہ لارڈ ایلڈن میری طرف سے مہربانی فرماکر اپنی بی بی کا بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔

لارڈ ایلڈن نے شاہی مبارکباد کے ان الفاظ کو تعجب سے سنا اور عرض کیا میں اس شکریہ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بادشاہ نے فرمایا تمھارے لارڈ چانسلری کے تقرر کا سبب جسقدر تمھاری بیوی ہے وہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں تمھاری خواہش تو صرف اتنی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کسی قصبہ کے پادری ہوجاؤ لیکن تمھاری بی بی نے تمکو میرا لارڈ چانسلر بنا دیا۔

تعدد ازدواج

قطع نظر ان کے جنکی تہذیب زمانہ کے لاطائل دور کے پردوں میں اخفا ہے، اور جتنی قومیں تماشا گاہ عالم کے اسٹیج پر گذری ہیں ان سب کے تمدن و معاشرت کو جب ہم علم تہذیب الاقوام کی عینک لگا کے دیکھتے ہیں، تو مظاہر قدرت کی تصویریں لوگوں کی رنگا رنگ رسموں کی شان میں عجیب و غریب مناظر پیش کرتی ہیں ؛

دانایان فرنگ جنکا ذہن رسا علوم مختلفہ کے رہواروں پر سوار ہو کر فلک الافلاک سے ٹکراتا ہے، جن کی نظر بنیاد طبقات الارض سے گذرتی ہوئی تحت الثرے کے پار اتر جاتی ہے، جنھوں نے پیش رفتہ اقوام کے، علوم و معیار تمدن کے تحقیق کرنے میں آنکھوں کا تیل نکالا اور صحیح نتائج مستخرج کرنے کی جانکاہی میں دماغ کا گودا پگھلا دیا، کسقدر قابل تحسین و آفرین ہیں ان رہبران کامل نے اپنی دانش و بینش جہاں نما سے علم السنین آثار قدیمہ، تشریح الانسان اور تہذیب الاقوام جیسے بیش بہا اصناف علم تدوین کیے، جن کے ذریعہ سے ہم اقوام عالم کے حالات بود و باش، رسم و آئین، عادات و اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عورت جسکو خالق ارض و سما نے نسل انسانی کی بقا و بزم دنیا کی زیبائش کے لیے پیدا کیا ہے، اقوام عالم میں اس نازک فرقہ کی عجیب گت بنتی رہی در تو اور رومن جیسی شائستہ قوم جو اپنے قانون کے لحاظ سے دنیائے یورپ کی پیشرو مانی جاتی ہے، عورت کے وجود کو وجود ہی نہیں سمجھتی تھی طرفہ تر یہ ہے اور تمام یورپ کو اس کے روح ہونے نہ ہونے میں بھی کلام تھا، چنانچہ اس خلش کو رفع کرنے کے لیے ۵۸۶ء میں یورپ کے بڑے بڑے حکیموں نے

کہ جلسہ کیا جسمیں بڑی جد وجہد فلسفانہ کے بعد اسکو ذی روح اور نوع آدم تسلیم کیا۔ اہل عرب اس کے وجود کو ننگ خاندان سمجھتے تھے اور اس لیے نبی اکرم صلعم کی بعثت سے قبل باپ اپنی لاڈو کو بڑی سنگدلی سے جیتے جی گور میں سلا دیتا تھا۔ ہندوستان میں عورت کا وجود شوہر کا وجود ہوتا تھا۔ اہل ہنود اور عیسائی قوموں میں حقوق نسواں اظہر من الشمس ہیں جب اسکا وجود، وجود مرد کا جزو لاینفک ہی قرار پایا تو پھر اسکا کیا حق! نہ وہ کسی چیز کی وارث ہے نہ مالک، نہ کسی معاملہ میں خود مختار نہ کسی معاہدہ کا اسے مجاز۔ غرض یہ کہ وہ مرد کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے کہ جسطرح اسکا دل چاہے بنائے۔ علےٰ ہذا یہودیوں میں عورت کی ذات زر خرید چیز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اہل میڈیا و پرشیا بھیڑ بکریوں سے زیادہ اسکی قدر و منزلت نہیں کرتے تھے۔ اہل چین اسے اپنا قیدی سمجھتے تھے اور مکافات اعمال میں جہان سے گذار دیتے تھے۔ اہل سپارٹا و یونان کے ہاں نوزائیدہ بچوں کے ڈاکٹری معائنہ کا طریقہ بڑا ستم افزا تھا۔ کمزور جسم کے بچوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ یا پہاڑ پر سے لڑکا کے مار دیا جاتا تھا۔ قوی ہاتھ پاؤں کی عورتوں کو جنگی ہتیار زیب تن کر کے مردوں کے پہلو بہ پہلو میدان کارزار میں لڑنا پڑتا تھا۔ ستم پر ستم یہ کہ انکی چھاتیاں قلم کیجاتی تھیں جس کے صدمہ سے اکثر عورتیں پھڑک پھڑک کر دم توڑ دیتی تھیں البتہ یونانیوں نے ایک صورت سے اسکی خوب قدر کی وہ یہ کہ جذبات دل کی تصویر اس کے رنگ و روغن سے اُتاری۔ حسن کی پری، غصہ کی چوڑیل اور شہرت کی بڑھیا اسے بنایا۔ ہندوؤں نے دھن دولت کی دیبی اور عشق کی موہنی کا اظہار اسی کے قالب سے کیا۔ وقس علیٰ ہذا۔

اسیطرح تعدد ازدواج کے متعلق اقوام عالم میں گوناگوں رسوم ہیں۔ ہم

ہر زمانہ اور ہر ملک کی رسوم پر اور پھر اس کے حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالیں گے کہ شارع اسلام نے فطرت انسانی اور ملکی ضرورتوں کے مطابق مناسب حدود و سخت قیود کے ساتھ اس جزو اعظم معاشرت انسانی کی تعداد پر جو دستور العمل قرار دیا ہے، وہ دنیا کی موجودہ حالت کے مقابل میں کہاں تک مستحسن ہے۔

ملک روم کی قدیم فرماں روا اقوام اطروسقان کے ہاں کثرت ازدواج کا بڑا چرچہ تھا، لیکن جب اورنگ نشین اقبال رومیولس اور ریمس کے دل میں آوارہ ہنری جنگا پیشہ تھا، اس سرزمین کے ہوشربا مناظر نے اقامت کا پھلا ڈالا اور ہوائے ملک گیری اور ملک داری نے اس عظیم الشان شہر اور سلطنت کی بنیاد ڈلوائی تو ان لوگوں کی احتیاج انسانی کے لیے دنیا کی تمام نعمتوں کی فراوانی تھی، لیکن چونکہ ان کے پیرہن پر قزاقی کا بدنما دھبا تھا اس لیے کسی ابنائے جنس نے انسے پیوند..... کرنا قبول نہیں کیا ایسی صورت میں انہیں لامحالہ یہ کرنا پڑا کہ اپنی ہمسایہ قوم صابین کو بزم مے و مسرت میں مدعو کیا اور ان کی عورتوں کو جو ساتھ آئی تھیں زبردستی اپنے قبضہ میں کیا، جس نے مقابلہ کیا اُسے تلوار کے گھاٹ اتارا۔ ایسے عالم میں جبکہ بانیان روم نے اس لطیف جنس کو جان پر کھیل کر فراہم کیا، تعدد ازدواج کا خیال خواب میں بھی نہ آتا ہوگا۔ ابتدار زمانہ میں عورتوں کی تعداد جب مردوں سے بڑھ گئی تو یہ رسم رواج پکڑ گئی۔ لیکن اسکا پتہ تارک انیٹونی ۸۳-۳۰ قم سے قبل کچھ نہیں چلتا۔ روم کی تاریخ میں یہ جنرل اور بادشاہ پہلا ہے جس نے دو شادیاں کیں۔ حاکم وقت کا ہر فعل رعیت کو بھلا معلوم ہوتا ہے، مخلوق نے اپنے بادشاہ کی نظیر کو پیش نظر رکھکر ایسی لے دے کی کہ دو چھوڑ جتنی عورتیں جس کے ہاتھ لگیں، اس نے بے تکلف ڈال لیں۔

اب ضرورت محسوس ہوئی، قانون معاشرت مدون کیا۔ اسی زمانہ میں نازک مسئلہ طلاق کے متعلق قانون وضع ہوا اور ساتھ ساتھ مشروط اور عارضی شادیوں کا قانون بھی پاس ہوا۔ موخر الذکر کی رو سے پہلی شادی کی میعاد استقرار ایکسال کی گئی، پھر وہ تخفیف ہوکے چھ ماہ رہ گئی۔ پھر تین ماہ، گھٹتے گھٹتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک ہفتہ! اور پھر کلہم ایک شب!! آج رات نکاح ہوا اور کل صبح طلاق! ظاہر ہے ایسا قانون ملک کے لیے بے انتہا ضرر رساں تھا۔ چنانچہ جب ۳۸۶ء میں آرکیڈیس سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے ایک قلم عارضی اور ایک سے زیادہ شادی کرنے کے رسم کو موقوف کیا۔ حضرت عیسے علیہ السلام کو چار صدیاں گذر چکی تھیں اور اہل یورپ نے ملت ثلث ثلثہ قبول کر لیا تھا۔ نصرانیت کے تیسوں کا خاندانی گروہ قائم ہو چکا تھا اور یہی طبقہ قانون کے پردہ میں سب سے زیادہ مزے اڑاتا تھا۔ فطرتاً اسے یہ فرمان بہت شاق گذرا۔ اس لیے اس فرمان کے خلاف خوب دھڑے بندیاں کیں اور شاہ پر یہ ملامت برسائے فرمان کو سراسر خلاف شرع عیسوی بتایا، اس مستقل شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیمن ٹونین ثانی کو اسکی ترمیم و اصلاح کرنی پڑی۔

عارضی شادیوں کو موقوف کیا، مگر کثیر الازدواجی مباح ہی رکھی جسٹی نائن کے زمانہ تک یہ دستور جاری رہا لیکن اس نے اپنے عہد میں عارضی شادیوں کی طرح اسے بھی اڑا دیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بادشاہ موصوف کا فرمان جو انسٹیٹیوشن کے لباس میں نافذ ہوا تھا، وہ کسی عیسائی کی قلم سے نہیں نکلا تھا اس کا مصنف بلاشبہ ہرمیہ تھا، اس لیے عیسائی اگر اس پر ناز کریں تو وہ ان کا تفاخر بیجا ہے۔ روم کا مشہور دستند مورخ ٹیسی ٹس کہتا ہے کہ اس کے عصر میں نہ صرف روم بلکہ تمام یورپ باستثنائے جرمن کثیر الازدواجی کا دلدادہ تھا

جرمن کے ہاں بھی یہ طریقہ تھا کہ غریب غربا تو واقعی ایک شادی کرتے تھے لیکن امیر امراعلی قدر مراتب و امارت شادیاں کرتے تھے۔ اس کے اقوال پر نکتہ سنجان عیسوی یہ شقیں نکالتے ہیں کہ اس نے جو کچھ بھی اس باب میں لکھا ہے اسکی غایت یہ تھی کہ وہ جرمنز کے عوام کا کریکٹر بنظر استحسان دنیوں کے آگے پیش کرے اور انہیں شرم دلائے کہ وہ قوم جو ان کے مقابلہ میں نیم وحشی تھی اور جن کا کوئی مرتبہ نظام تمدن نہ تھا۔ انکی خوبیاں دکھائے اور رومنز کو ان کی عیاشانہ معاشرت سے باز رکھے۔ لیکن ان اظہار خیالات کو خواہ کسی رنگ میں رنگا جائے یہ امر مسلمہ رہتا ہے کہ اس کے زمانہ میں تمام اقوام یورپ تعدد ازدواج پر مٹی ہوئیں تھیں۔

اہل میڈیا و فارس کے ہاں کثیر الازدواجی کے مختلف طریقے تھے سلطنت کے ایک صوبہ میں مروسات بیویاں کر سکتا تھا لیکن دوسرے میں اس کے برخلاف عورت اکٹھے پانچ خاوند کر سکتی تھی۔ اتنا ضرور ہے ان کے ہاں یہ رسم افراط و تفریط فرقۂ اناث پر مبنی تھی ان لوگوں کا قانون اسقدر لوچ دار تھا کہ ضرورت زمانہ و مصلحت ملکی کو مدنظر رکھ کر قوم کا دل جسے چاہتا تھا توڑ مروڑ ڈالتی تھی۔

زمانہ جاہلیت کے اہل عرب و اہل برطانیہ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں دشمن سے مصئون و مامون رہنے کے لیے ترتیب و انتظام سے یکجا رہتے تھے ان کا سامان خورونوش یا پارچہ ظروف وغیرہ تمام ملکیت مشترکہ ہوتی تھی، لطف یہ کہ بیویاں بھی بالاشتراک ہوتی تھیں، اور بچہ پنچاتی کہلاتا تھا۔

عربوں میں تو اتنی خیر صلاحیت بھی تھی کہ جب چند شخص ایک عورت سے ایسا تعلق پیدا کرتے تھے تو عورت دو چار روز بعد کہلوا دیتی تھی کہ فلاں شخص سے

میرا قدم بھاری ہوگیا ہے۔ لیکن برٹش [illegible] صفات واقع ہوئے تھے کہ انہیں اسکی مطلق پروا نہ تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ فلاطون نے بھی یہی طرز معاشرت اختیار کرنے کے لیے قدیم یونانیوں سے بڑی شد و مد سے کہا۔ فلاطون کہتا ہے قدیم یونانیوں میں رسم ازدواج کی [illegible] صورتیں تھیں اہل میڈیا کی طرح ایک صوبہ میں مرد بہت سی شادیاں [illegible] لیکن دوسرے صوبہ میں ایک عورت کئی خاوند کرتی تھی۔ یہ رسم انحطاط و بہتات [illegible] ذکور و اناث پر منحصر تھی۔ جنگ میں اگر مرد آبادی کام آجاتی تھی تو عورتوں کی افراط کے باعث طبقہ ذکور آزاد تھا کہ جتنی ہر ایک سنبھال سکے رشتہ زوجیت میں لائے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ عورتیں کسی آفت ارضی و سماوی سے ہیجڑا جاتی تھیں اور ملک میں قحط الرجال پڑ جاتا تھا تو پھر ایک عورت کئی کئی شوہر کرتی تھی۔ پس بجائے جوڑے جوڑے کے وہاں عجیب مخلوط حساب تھا۔ مشہور یونانی سیرۃ نگار پلوٹاک بہت رطب اللسان یا لیس سے یونانی رسم ازدواج کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے کہ یہ آئین ان کے ہاں انتہا دانشمندی سے مملو تھے چونکہ وہ جو کام کرتے تھے، قوم کی ضرورت اور رفع ضرورت کو مدنظر رکھکر کرتے تھے علیٰ ہذا ایور یپڈز جو یونان کا نہایت فاضل ادیب اور مشہور ڈرامانسٹ عیسیٰ علیہ السلام سے چار سو برس قبل گذرا ہے لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں یونان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے قریباً دگنی تھی اور اگر اس صورت میں مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہوتی اور وہ ایک سے زیادہ کے خرچ کا بآسانی متکفل نہ ہوتا تھا تو لازمی تھا کہ فرقہ اناث کی آبادی رنگ لاتی اور سلطنت کی سود و بہبود کے لیے وبال جان ہوتی ایک اور فاضل اجل ڈیماستھنیز جو عہد قدیم کے سحر بیان مقرروں میں تھا، مسئلہ ازدواج پر نہایت گہری اور نقادانہ نظر ڈال کے کہتا ہے کہ سلطنت میں تین قسم کی صورتیں ہیں اوّل نکاحتہ یا بیاہتہ بیویاں، دویم مدخولہ۔ سویم کسبیاں۔ موخر الذکر قوم کی تباہی

کے لیے سخت خطرہ ہیں، اس لیے انسب طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہی خواہاں قوم بجائے اس کے کہ ان عورتوں کو اجازت دیں، اپنے حرم میں داخل کرلیں۔ اور ان کو اس انتہا درجہ کی بے غرتی اور بے حیائی سے بچالیں جس سے قوم کی قوم غرق عصیاں ہوتی ہے اور وجود اخلاقی کا تار تار جدا ہوتا ہے۔

اب کتب منزلہ من اللہ کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتی ہیں توریت اور موسوی قانون میں جہانتک ہم دیکھتے ہیں، تکثیر ازدواج کے خلاف کوئی حکم نظر نہیں آتا۔ احکام مقررہ میں یہ تو مذکور ہے کہ کسی شخص کو اپنے ہمسایہ کی بیوی کو نظر بد سے نہیں دیکھنا چاہیئے، لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ توریت میں جو واقعات منقول ہیں، وہ بین طور پر اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں یہ رسم رائج تھی۔ پیٹری آرک (مذہبی گروہ اور خاندانی بزرگ) کی نیک خصایل بیوی بھی سوکن کے آجانے پر معترض نہیں ہوتی تھی، بلکہ نہایت خوشی سے خود، اولاد ہونے کی آس میں اپنے خاوند کو لونڈی بلانے کی طرف مائل کرتی تھی۔ یہودیوں کے قانون طاعود کے سایہ میں بھی یہ رسم جاری تھی۔ ہر اہل ملت کو مجاز تھا کہ حسب استطاعت جتنی چاہے شادیاں کرے۔ یہودیوں کا ربی اعظم ہلال جو حضرت مسیح سے سو سال پہلے ہوا ہے اسکی رائے تھی کہ بیویاں زیادہ سے زیادہ چار ہونی چاہیں۔ قیرطی جو یہودیوں کا ایک فرقہ ہے، جن کے خاندان، ابتک انگلستان اور فلسطین میں آباد ہیں، اور روس میں تو یہ لوگ بہت کثرت سے تھے، لیکن مذہبی ظلم و تشدد نے بیچاروں کو بے خانماں کردیا۔ ان کے ہاں ابتک تعدد ازدواج کی رسم جاری ہے۔ یورپین ممالک میں یہ لوگ ملکی قانون اور مذہبی اثر سے خائف ہوکے ایک شادی کے پابند ہوگئے ہیں ورنہ دیکھا جائے تو انکے ہاں

کوئی قانون اس رسم کے خلاف نہیں جس شخص نے بھی کبھی صحیفہ مقدس کو اٹھا کے دیکھا ہوگا، اُسے غالباً یاد ہوگا کہ حضرت سلیمان جو بنی اسرائیل کے زبردست شہنشاہ گذرے ہیں، جن کی سطوت و شوکت، علم و دانش فسانۂ روزگار ہے خدا کے فضل سے علاوہ حرم کے سات سو بیویاں رکھتے تھے اور اسپر بھی وہ ہمیشہ اس امر کے شاکی رہے کہ انہیں کوئی عورت باعصمت و عفت نہیں ملی۔ علیٰ ہذا حضرت داؤد جو اسی قوم کے دوسرے بادشاہ تھے ان کی بھی متعدد عورتیں تھیں +

انجیل میں سوائے بشپ کے اور کسیکو تکثیر ازدواجی کی ممانعت نہیں خلاف احکام کی عدم موجودگی میں ہر عیسائی شرعاً متعدد نکاح کر سکتا ہے زمانۂ اولے کے عیسوی بزرگان دین کا خیال بھی تعدد ازدواج کے بالکل موافق تھا۔ سینٹ آگسٹائن نے اس معاملہ میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے، انہوں نے علی الاعلان کہدیا کہ بغیر روک ٹوک کے برادران عیسوی جتنی شادیاں پسند کریں کریں، انکا یہ خیال تھا کہ کثرت ازدواج احکام عیسوی کے بالکل مطابق ہے اور بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک سے زیادہ بیوی کرنا عین عقلمندی اور مصلحت وقت ہوتا ہے۔ پولیس یا پاپائے جن کی شان جبروتی وصفات ملکوتی خدائے ثلثہ سے اتر کر ہی ہوتی ہے، انکا حال اہل نظر کو بخوبی معلوم ہوگا۔ گریگری ثانی نے جو اپنے زہد و تقوی و تدبر میں شہرہ آفاق تھا، ۷۲۶ء میں ایک فرمان بدیں مطلب شائع کیا، کہ اگر کسی شخص کی پہلی بیوی سے شادی ہے دو سال کے اندر بچہ نہ ہو یا اسکی بیوی اس قسم کے عوارض میں مبتلا ہو جسکی وجہ سے زوجیت کے رکن اعظم کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اذن عام ہے کہ ایسا شخص دوسری شادی کرے۔ اس فرمان کے اجرا کی تاریخ سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ یہ بعینہ انہی اصولوں پر مبنی ہے جسکی تلقین رسول عربی نے کی تھی۔ چونکہ

سول اکرم فخر معظم کی ولادت ۵۶۹ء میں ہوئی۔ اس لیے یہ یقینی ہے کہ اسلامی
انون جو اس ضمن میں منضبط ہوا تھا پوپ نے اسکی نقل کی شمشیر اسلام ایکیسو چھبیس
سال سے فتوحات میں مصروف تھی، اور اس کے قانون معاشرت و اصول تمدن
نے مشرق و مغرب کے خیال میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا ٭

گریگری آف ٹور زکہتا ہے کہ میری وبخین خاندان کے شاہان تمام کثیر الازدواج
تھے اور انہیں خصوصیت کے ساتھ شارلیمن جو زمانہ وسطی میں مذہب عیسوی کا نہایت
بردست مدعی تھا، اکٹھی پانچ بیویاں رکھتا تھا۔ اس شخص کا مذہبی جوش اسدرجہ
بڑھا ہوا تھا کہ کوئی غیر مذہب والا جسجگہ مل جاتا تھا اُسی دم زبردستی عیسائی کر ڈالتا
تھا اور اگر کوئی بدبخت انکار کرتا تھا تو اسکو تہ تیغ بیدریغ کرتا تھا۔ اس مقدس داعی
عیسائیت کے پانچ بیویاں تھیں، ایک کو طلاق دے کر دو اور کر لیں اور اسطرح
چھ ہو گئیں ٭

خیر شارلیمن تو رومن کیتھلک تھا، مارٹن لوتھر صاحب کو لیجئے جو بانی مبانی فرقہ
پروٹسٹنٹ ہیں، یہ بکثرت ازدواج کے موئد تھے۔ اسکی تصدیق اس تاریخی واقعہ سے
ہوتی ہے کہ لینڈگیر موآف ہیسی (نواب اعظم ریاست ہیسی) کی پہلی بیوی سے
کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لینڈگیر موپروٹسٹنٹ عقائد رکھتے تھے اور اس لیے انکی
دلی خواہش یہ تھی کہ انکا جانشین بھی اسی فرقہ کا پیرو ہو لیکن اتفاق سے
ان کے ورثا میں کوئی لڑکا ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے مارٹن لوتھر سے
اس اہم مسئلہ کے متعلق استصواب کیا۔ عالم موصوف نے بکمال خوشی انہیں
اجازت دی کہ وہ شوق سے دوسری شادی کریں۔ فتوے کے یہ الفاظ ہیں۔

"شادی کوئی استیناع نہیں بلکہ ایک قانونی معاہدہ ہے، اسلیے"
"لینڈگیر موآف ہیسی بالکل مجاز ہیں کہ وہ دوسری شادی کر لیں"

تاریخ انگلستان کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایڈورڈ اول کے
ں کوئی قانون خلاف کثرت ازدواج نہ تھا ولیم فاتح کے عہد میں کلیسائی
توں میں اس رسم کے مقدمات سماعت ہوتے تھے۔ اگر مجرم کوئی با اثر یا صاحب
وہ شخص ہوتا تھا۔ تو عالی وقار شب چشم پوشی کر جاتے تھے۔ روئداد عدالت
کوئی مثل ایسی دیکھنے میں نہیں آتی کہ جس سے کسی ملزم کو ایک سے دو نکاح
جرنے کی پاداش میں سزا ملی ہو۔ البتہ غربا جور و ستم کرنے کے لیے یا کوئی مالدار
یودی محض ہاتھ رنگنے کے لیے اس کے دائرہ میں آجاتا تھا۔ ایڈون اوّل کے
عہد میں یہ قانون تھا کہ جس شخص کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، اسکو
نیلنی کا مجرم قرار دیا جائے جسکی سزا مال کی ضبطی اور موت ہوتی تھی۔ لیکن یہ
صرف جاہلوں کے لیے تھی۔ جو لکھنا پڑھنا جانتا تھا وہ کچھ جرمانہ دیکر چھوٹ جاتا
تھا، غریبوں میں اتنا دم کہاں جو دو دو بیویاں کرتے، اصلی مجرموں کے لیے مراعا
تھیں، اس لیے چند دنوں میں یہ قانون اکارت ثابت ہوا۔ جیمس اوّل کے زمانہ میں
یار لوگوں نے چاہا تھا کہ کچھ اور بچاؤ کی صورتیں نکالکر پرانے قانون کو از سر نو
جاری کیا جائے۔ لیکن یہ مسودہ جارج چہارم کے وقت تک پڑا رہا۔ ہنری ہشتم
اور جارج چہارم کے حالات ناظرین سے مخفی نہیں، خود الذکر تو عیش کا
تھا، اس نے اس جرم کو جرائم کبیرہ کی فہرست سے نکالکر سزا میں تخفیف کر
پہلے سزائے موت تھی اب ایک کے ہوتے دوسرا نکاح کر لینے پر سات سال
لیے عبور دریائے شور ہے اور یہی قانون آج تک چلا جاتا ہے +

اہل چین میں زمانہ قدیم سے کئی شادیوں کا رواج چلا آتا ہے، چین کے
تبحر عالم و فلاسفر کنفوسیس کی تصانیف جن صاحبان کی نظر سے گذری ہونگی
انہیں معلوم ہوگا کہ اس نے نہایت فصیح بلیغ پیرایہ میں اس رسم کی تائید میں

قطع الدرابلت اثبات پیش کیئے ہیں۔

یورپین ممالک میں سوائے سویڈن کے اور کہیں کثرت ازدواج کبیرہ خیال نہیں کیا جاتا، لیکن یہاں تو روز ازل سے یہ رسم بمنزلہ قتل کیجاتی ہے، اور مجرم کو سزائے موت دیجاتی ہے حقیقت میں یہ امر قابل ہے کہ دنیا کی تمام شمالی اقوام ایک شادی کی پابند ہیں جس قدر آپ معتدل اور حارہ میں اُترتے آئینگا اسیقدر زیادہ آپ کثرت ازدواج رسم پائینگا۔ جنوبی یورپ، ایشیا، افریقہ، ہندوستان، امریکا، مختصر یہ تمام اقوام عالم میں یہ رسم مکروہ بیش مختلف صورتوں اور طریقوں سے برتی جا

محمد اکرام

مشہور یورپین عالم مانتیجزا لکھتا ہے

مرد کتنا خود غرض ہے کہ اس نے علم تشریح تک میں اپنی مکاری کو ہاتھ سے نہ دیا یہ ہی نہیں کہ اس نے اس ظلم پر بس کیا ہو بلکہ اس نے یہ عہد کر لیا کہ وہ انسانیت کے اعتبار سے عورت کو اپنے سے بہت ہی بدتر ثابت کرے اور اس کا درجہ انسان اور بندر کے بیچ میں رکھے صرف اس لیے کہ اپنی غرض پوری کرنے اور اسکو جائز حقوق سے محروم کرنے میں کامیاب ہو۔

افسوس کہ وہ یہ بھول گیا کہ جس عورت کو ذلیل کرنے کی وہ اتنی کچھ کوشش کر رہا ہے وہ اسکی ماں ہے۔

قطعہ

وہ کون ایسا ہے، جو کھٹا نہیں منہ اور سخن ور ہے
دمِ رفتار، اُس کے زیرِ پا ہے، فرشِ نورانی
جو ٹہلے وہ، تو ٹہلیں پانچ خادم، اُس کی خدمت میں
جو لیٹے وہ، تو ہو موقوفِ سکوت و محوِ حیرانی
جو دیکھو شکل اُس کی، تو وہ اِک انگشت حیرت ہے
جو پوچھو کام اُس کا، تو شجر آسا گل افشانی
بزنگِ میلِ سرمہ، چشم سے ہے ارتباط اُس کو
مگر وہ چشمِ تر، ہو جس میں اشکوں کی فراوانی
اُٹھاؤ، تو اُٹھے وہ، چھوڑ دو اُسکو، تو گر جائے
جو کاٹو اُس کے سر کو تو بڑھے اُس کی زباں دانی
نہیں حدّاد وہ، لیکن بنا دیتا ہے زنجیریں
بڑا نقاش ہے، لیکن نہ بہزاد اور نہ ہے مانی
عیاں کرتا ہے وہ، حالِ جہاں کو، گر اشارہ ہو
اُگل دیتا ہے، پیتا ہے زباں سے بس قدر پانی
زبانِ گنگ سے گویا، سرِ بے جبہہ سے ساجد
چلے تو اشک بے دیدہ سے ہو مصروف گریانی
زباں کا سخت ہونا، اُس کے وصفِ خاص میں داخل
رگوں سے جسم پُر، لیکن نہ مثلِ جسمِ انسانی

شہودِ راز پر حاوی، کشودِ کار پر مائل
نمود اُس کی، جہاں دیکھو، وجود اُس کا بیابانی
نہیں جان اُس میں، لیکن، زندہ کرتا ہے وہ مردوں کو
نہیں بادل سے کچھ نسبت، مگر کرتا ہے نیسانی
زباں میں زخم، لیکن، درد سے محفوظ، اور گویا
کبھی وہ عیب جُو ہے، اور کبھی صرفِ ثنا خوانی
نہ حِس اُس کو، نہ روح اُس میں، مگر چلتا ہے، پھرتا ہے
نہیں آنکھیں، مگر کرتا ہے دنیا کی نگہبانی
سوادِ شام، گویا رنگ ہے، اُس کی قلم کا
بیاضِ صُبح، گویا تختۂ مشقِ سخن دانی
ہُوا صحرائے عالم میں، وہ، اے شوق اسلیے پیدا
کہ ہو سررشتۂ اہلِ قلم میں صرفِ جولانی

بقلم، احمد علی، شوق، قدوائی،

دنیا کی موجودہ حالت پر فلسفیانہ نظر ڈالکر دیکھیں تو گو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہاں کا قیام عارضی ہے مگر یہ مقام عارضی قیام کے واسطے بہتر سے بہتر ہے دوسروں کی بُرائی پر آنسو بہاؤ مگر یاد رکھو کہ بنی نوع انسان کی ذلت فطرت انسانی کی ذلت نہیں ہماری اپنی ذلت ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ دوسروں کی ہنسی اُڑائیں بلکہ اپنے اسیطرح روئیں جسطرح اپنے اوپر۔ (ہیزلٹ)

حیات بعد ممات

نمبر (۱)

تمدن کا اعلان پڑھ کے بے انتہا مسرت ہوئی اعلان دیکھ کے یہی جی چاہا کہ اس کے دسترخوان نعمت پر اپنی طرف سے کچھ چنوں، گو میں کیا اور میرا بوتا کیا، لیکن ایک فطرتی جوش ہے جسکا روکنا مناسب نہ سمجھا۔ سائنس جس کا لٹریچر اردو میں ہما ہے اس کی طرف نگاہ دوڑائی مگر ہربرٹ اسپنسر، ھکسلے رسل وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ انہیں زبان اردو کا لباس پہنانا، اور عرش کے تارے توڑنا برابر ہے، ذہن میں اتنی رسائی نہ زبان میں اتنی وسعت، اسلئے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے زرین مقولہ کو مدنظر رکھ کے نیچے درجے کی تصانیف پر ذہن لڑایا، ایک کتاب جچی، جو ایک فرانسیسی فاضل ادیب کی زور قلم کا نتیجہ ہے، انگریزی میں اسکا ترجمہ ہوگیا جسکا نام "دی ڈے آفٹر ڈیتھ" رکھا گیا اور جسکا میں قوام کشید کر کے جستہ جستہ "حیات بعد ممات" کے عنوان سے ہدیہ ناظرین تمدن کرونگا۔

مصنف اس کتاب کا فرقہ طبعیون میں سے ہے۔ علوم جدیدہ طبعیات، ملکیات، عنصریات، وغیرہ وغیرہ سے دلائل و براہین کی فوجیں اپنی کمک میں لاکر مملکت غیب کو فتح کرنا چاہا ہے، لفاظی اور بلند خیالی کے فیلان مست کو فرطاس پر ٹکرایا ہے اور اس امر کے استفسار پر قیاس دوڑایا ہے، کہ روح انسانی عالم اجسام سے وداع ہو کر کہاں جاتی ہے اور اسکا کیا حشر و نشر ہوتا ہے؟ سوال پرانا ہے لیکن اس طرفہ معجون انسان کا مرتبہ نظام نت نیا اور اچھوتا ہے

نگارش کی مرصع نگاری عجیب و غریب اور دلائل کی معجون نرالی چٹ پٹی ایسی کہ جو پڑھے زبان چٹخارے بھرے۔ اور لطف یہ کہ پڑھنے والا باتوں ہی باتوں میں بہت سارے اصناف علوم کی ماہیت کو سرسری نظر سے دیکھ جائے اور جان جائے کہ انکی صورت و ہیئت کیسی ہے اور وہ کیا ہیں!

اصلی کتاب زبان فرانسیسی میں بلحاظ انشاپردازی گلگشت چمن ہوگی۔ ترجمہ کرنے کے لیے بڑی صنعت درکار ہے، مترجم خواہ کیسا ہی فاضل ہو، ترجمہ پر بھی قالب بے روح کہلاتا ہے، زبان انگریزی میں آنے سے ضرور ہے اسکی ضائع و بدائع کی جان آدھی رہ گئی ہوگی اور اب جبکہ میں اس کے اصل الاصول کا نقشہ اردو کے رنگ و روغن سے مزین کرنا چاہتا ہوں تو قطعی اس کے اصلی روپ کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ بہرکیف اب تو اس کی قسمت کا لکھا پورا ہوگا۔ السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

مسٹر لوی فگائر نے جو اس کتاب کے مصنف ہیں ایک نہایت دلچسپ دیباچہ لکھا ہے، جسمیں سے ہم طویل اقتباسات کرنے کی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، چونکہ انمیں بھی تصویر کا خاکہ کئی رخوں سے کھینچا ہے اس لیے دلچسپی سے مملو ہے۔

ناظرین باتمکین! آپ کو مرنا ہے، نہ معلوم موت آج آجائے یا کل لیکن یہ تو فرمایئے آپ کو کچھ یہ بھی خبر ہے کہ آپکا حشر کیا ہوگا؟ موت کے بعد آپ کیا ہونگے۔ میرا مافی الضمیر آپکا جسم نہیں۔ آپکا جسم ایک بے حقیقت چیز ہے اسکی وقعت کپڑے جو آپ کے تن پہ ہیں یا کفن جسمیں لپٹ کر یہ دفن ہوگا اس سے زیادہ نہیں۔ اسی لباس اور کفن کی طرح اسکا جز یہ ہو جائیگا۔ اور عناصر جس سے اس نے ترکیب پائی ہے وہ قدرت کے عظیم الشان مادی ذخیرہ آب و خاک

میں جا ملیں گے۔ لیکن آپ کی روح یہ کہاں جائے گی۔ اسکا کہاں ٹھکانا ہوگا؟ وہ روح جو آپ کے جسد عنصری میں بے کھٹکے ساری ہے وہ روح جو غور و فکر، پیار و محبت کرتی ہے۔ وہ روح جو درد و دکھ جھیلتی ہے یہ تو فرمایئے کہ آخر اسکا کیا حشر ہوگا میں نے مانا یہ آپکا عقیدہ نہیں کہ آپ کی روح اجل کے آتے ہی لائف[1] کے ساتھ بجھ جائیگی۔ اور یہ کہ وہ چیز جو آپ کے سینہ میں پنکھے کے مانند ہلتی ہے۔ عالم مسرت و راحت میں یا عسرت و کلفت میں دل کی کور پر کھٹکتی ہے فرط ناز و نیاز اور بے شمار جذبات و حادثات زندگی میں دھکڑ پکڑ ہوتی ہے اسکا نام و نشان نہیں رہے گا! پھر وہ ذی حس غیر فانی روح کہاں جائے گی اس کا کیا ہوگا اور آپ کیا ہوں گے؟

تمام حکمار متقدمین یک زبان ہیں کہ موت کے حشر و نشر کا سوال لاینحل ہے بڑی کد و کاوش کے بعد انہیں یہ کہدینا پڑا کہ عقل انسانی میں اتنی تاب و طاقت نہیں کہ اس پر اسرار عقدہ کو حل کر سکے اس لیے معقول طریقہ یہی ہے کہ اس قسم کے تجسس و تفحص سے اجتناب کرے۔ بنی آدم کا علی العموم یہی استدلال رہا ہے خواہ وہ غفلت دلا پرواہی کی وجہ سے ہو یا اعتقاد آ۔ ماورائے ازیں جب ہم اس میت ناک سوال پر نظر غائر ڈالتے ہیں تو چار و ناچار طرفین سے ہمارے دل و دماغ پر ایسی سیاہی کی گھٹا چھا جاتی ہے کہ جس سے ہماری تلاش و جستجو کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آیندہ زندگی کے حالات دریافت کرنے کے خیالات کو طاق نسیاں میں رکھدیتے ہیں۔

[1] لائف کا مرادف یا قریب المعانی لفظ اردو میں جان ہے لیکن ہم پوری صحت سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ کہاں تک اس مفہوم کو ادا کرتا ہے، اس لیے ہم نے بجنسہ لائف رکھا ہے اور اسی کو استعمال کریں گے۔ جان اگلوئی، ایل ایل ڈی کہتے ہیں لائف وہ چیز ہے جو جسم اور روح کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ سید علیہ الرحمۃ نے لائف کا ترجمہ نفس کیا ہے، ناظرین اسے اپنے آپ سمجھ لیں۔

بااینہمہ واقعات عالم ہمیں اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اس تیرہ و تاریک موضوع پر توسن طبع کو جولانی دیں، جب ایک شخص کی کشتی عمر موت کے کنارے آلگتی ہے یا جب اس کا کلیجہ کا ٹکڑا داغ مفارقت دیجاتا ہے تو وہ حیات بعد ممات کے خیال سے نہیں بچ سکتا۔ اور جب ہم گرمجوشی اور صدق دلی سے اس سوال پر غور و خوض کرتے کرتے عالم استغراق میں پہنچ جاتے ہیں تو پھر ہماری طبیعت اس امر کے قبول کرنے کی طرف راغب نظر آتی ہے کہ یہ معما جو زمانہ قدیم سے لاینحل چلا آتا ہے انسانی تخیل کی حد پرواز سے بعید نہیں۔

عمر کے بڑے حصے تک اس کتاب کے مصنف کا ہر فرد بشر کے ساتھ یہی خیال رہا کہ آئندہ زندگی کے معمے کی عقدہ کشائی میں ہماری عقل قاصر اور تصور خاسر ہے، اس لیے حقیقی دانائی اسی میں ہے کہ اپنی جان کو ضغطہ میں نہ ڈالیں اور سوہان روح نہ بنا دیں لیکن خدا کا کرنا ایک دن بیٹھے بٹھائے اندوہ غم کی بجلی ٹوٹ پڑی اسکا نوہنال جو تمام امیدوں کا مجاو ماوی تھا، کشور اجسام سے عالم ارواح کو سدھار گیا اس جانکاہ صدمے کے رنج و محن میں اسکی طبیعت بے اختیار تفکر و تعمق کے پر لگا کے اڑی تاکہ معلوم کرے کہ آنے والی زندگی کا اسرار کیا ہے، جہاں ہم سب کو جانا ہے، بے انتہا کاوش فکری و عرقریزی کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا:۔

اوّل تمام محققہ اصناف علم جو اس بات میں ہیں، اُن سے دریافت کیا کہ وہ اس سینہ خراش موضوع پر کیا قطیع الدلالت اثبات اور اطلاعیں بہم پہنچا سکتے ہیں دوئم جاہل اور سادہ دل اشخاص سے، دہقانی و گنوار سے، تعلیم سے بے بہرہ شہریوں سے جرح و قدح کی اور اُن کے خیالات کو دماغ میں محفوظ کر لیا، اس لیے کہ نیچر کے سچے اصول سمجھنے کے لیے مصنف کی نگاہ میں ان سے بہترین ذرائع

وسائل نہیں تھے چونکہ قدرت نے اُنکی فطرت میں جن خیالات و دیعت کر دیے تھے وہ بجنسہ اُن کی لوح دل پر آئینہ تھے اسلیئے ترقی علوم یا فلسفہ عام کے دستور العمل نے اِن میں کچھ بھی انقلاب پیدا نہیں کیا تھا۔

مصنف نے متذکرہ بالا ذرائع کی بنیاد پر جاودانی زندگی کے متعلق اپنے یہ ان سلسلۂ خیالات کو کامل طور پر ترتیب دیا ہے جو اس کے ساتھ دنیا سے اُٹھنے کے بعد پیش آنے والے ہیں۔

مصنف کا مرتبہ نظام فطرت یا نیچر پر مشتمل ہے، ہر ایک[1] ذی روح جسم کا علاقہ اُس جسم سے ہے، جو اُس سے پیشتر ہو چکا ہے یا جو اس کے بعد آنے والا ہے چنانچہ اس سر لئے فانی کی ذی روح مخلوق میں یہ تسلسل لگاتار چلا جاتا ہے، نباتات اور حیوانات، حیوانات اور اشرف المخلوقات، ایک سلک میں منسلک ہیں ایک دورے میں پروئے ہوئے ہیں جنکا دور ابد الآباد تک چلا جائیگا اور جن کی اخلاقی اور جسمانی تنظیم ایک نقطہ پر جا کر ملتی ہیں اور خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی فرد اکمل جسکو یہ تیقن ہو جائے کہ اُس نے اس نظام عالم کے صرف کسی نکتہ یا واقعیت کو تحقیق کر لیا تو وہ اس نکتہ یا واقعیت کا باحسن وجوہ نہایت سرعت سے تمام جاندار مخلوق پر اطلاق کر سکتا ہے اور ایک کڑی کو دوسری کڑی سے جوڑ کر صحیفہ فطرت کے دراز سلسلہ کو مرتب کر سکتا ہے چنانچہ مسٹر فگارٹ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اور جب انہوں نے ہمارے روح کا جسم انسانی سے پرواز کرنے کے بعد کا ٹھکانا معلوم کر لیا تو اپنی آرا کو تمام ذی روح حیوانات اور نباتات پر عائد کیا فکر و دلیل نے اُن اجسام کے مطالعہ پر مجبور کیا جنہیں چشم بینا دیکھ نہیں سکتی اور جن کے ذریعہ سے استنباط کیا کہ اختر و کواکب اور لکھوکھا تارے جو فضائے عالم پر منتشر ہیں یہ سب آباد ہیں پس آپ اس مضمون میں صرف

[1] یہ عقیدہ اسلام اور ہندو ازم سے بالکل مختلف ہے مترجم۔ مؤلف خاتمہ پر اس سے بحث کریگا۔ مترجم

زندگی جاوداں کے پیچ در پیچ عقدہ کی از روئے سائنس حل کرنے کی مساعی نہیں پائیں گے بلکہ نیچر کے مسئلہ اور نظام عالم کے حقیقی فلسفہ کا انکشاف بھی ملاحظہ فرمائینگے

اس کتاب کے لکھنے کا مسٹر فگا ئران الفاظ میں عذر پیش کرتے ہیں اور اہل فضل و کمال کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ وہ بھی اس معمائے لاینحل کی عقدہ کشائی میں سعی فرمائیں۔ کہتے ہیں:-

شاید میں دھوکا کھا رہا ہوں، شاید میں اپنے فکر کے خواب و خیال کو دقیق و قائع سے تعبیر کر رہا ہوں، یا شاید میں ظلمت کے بحر ذخار میں جا پڑا ہوں، راستہ بھول گیا ہوں اور اسے ٹٹول رہا ہوں، بہرحال میرا گمان یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں نہایت صدق دلی اور صفائی قلب سے، میں امید کرتا ہوں کہ ارباب دانش کو میری ناچیز تشیل اس باب میں مزید کوشش کرنے کے لیے آمادہ کر دے اور وہ اپنے فضل و کمال اور محققہ علوم کو اس عظیم الشان مسئلہ کی چھان بین، تحقیق و تکشیف کے لیے حرکت میں لائیں اور بنی نوع انسان کے ہستی ناپائدار سے وداع ہونے کے بعد کی کیفیت کو پردہ فطرت کے سامنے سے ہٹائیں۔ اس شعبۂ علم میں اگر ایک سلسلہ تصانیف کا تدوین کیا جائے تو میرے خیال میں یہ کام نیچرل فلاسفی اور ترقی بنی نوع انسان کی نہایت زبردست خدمت کی منزلت رکھے گا۔

۱۸۷۰ء کے روح فرسا ہنگامہ تباہی میں فرانس کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا، جسکو اپنے کسی عزیز یا اقارب کا دل سوز ماتم نہ کرنا پڑا ہو، میرے لخت جگر کا داغ جو سینہ پر ہے وہ تو خار زار یاس و حرماں بن چکا، دل کی کملاہٹ کو شادابی کہاں، ہاں اتنا ہے کہ اس تصنیف سے دل وحشت زدہ کو قدرے سکون ہو گیا۔ میں بوثوق کہتا ہوں کہ وہ صاحبان جو اس قسم کے چرکے کھا چکے ہیں اور کسی کی

مفارقت میں خون کے آنسو بہاتے ہیں، اُن کے جگر پارہ کش دلوں کو ان اوراق کے مطالعہ سے تسکین قلب ضرور ہوگی۔"

آجکل سوسائٹی کو ایک مہلک عارضہ لاحق ہوگیا ہے، جو اس کے اخلاقی وجود کو گھلائے دیتا ہے، اور خوف ہے کہ کہیں اسکی جان سلب نہ کر ڈالے یہ عارضہ مادہ پرستی ہے۔ اس کی ماہیت و حقیقت کی اول اول دارالعلوم جرمنی کے کتب فلسفہ نیچرل سائنس میں تعلیم دیگئی تھی، کچھ زمانہ بعد وہ فرانس میں بھی پھیل گئی، طبقہ حکماء و فضلاء میں کچھ دنوں رہکر تعلیم یافتہ جماعت میں اُتر آئی، ان کو خوب متاثر کرکے عوام الناس میں گھس گئی جنھوں نے مادہ پرستی کے عملی نتائج کا خوب سبق پڑھایا۔ تمام اخلاقیات انسانی کی بندشوں کو توڑ دیا، بزرگوں کا ادب لحاظ اوٹھ گیا، اصول زندگانی پر پانی پھر گیا۔ مذہب، و بزرگان دین کا ادب، ملک کی آزادی کا خیال نظام تمدن و معاشرت کا تار تار جدا کر دیا، سب یک قلم آزاد ہو گئے۔ نتیجہ عیاں تھا جو نہایت خوفناک صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ ایک زمانہ تک غدر مچتا رہا اور پھر ایک جماعت خونخوار دیوانوں کی اٹھی جس نے دارالخلافہ فرانس میں کشت و خون کی گرم بازاری کی اور خوف در جا، آگ و پانی سے فتنہ محشر بپا کر دیا۔

اسکو کون حب الوطنی کہہ سکتا ہے؟ جس نے پیرس کی مقدس اور مشہور یادگاروں کو آگ لگوائی، انیسٹ سے انیسٹ بجوادی! یہ صریح مادہ پرستی تھی، اس سے زیادہ صاف اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ جس گھڑی سے آپ کے دلمیں یہ خیال بیٹھ جائے کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے، موت کے بعد کچھ بھی پیش نہیں آتی ہے تو میں کیا اور آپ کیا! ایک کیا اور ہزار کیا، تمام دنیا کے افراد من حیث المجموع شورہ پشتی پر آمادہ ہو جائیں، لوٹ اور غارت مچائیں، اور پھر اس

عالمگیر غدر میں مخلوق کی خواہشات نفسانی وغیرہ کا وہ ڈنکا بجے اور ایسا طوفان عظیم آئے کہ دنیا وگرگوں ہوجائے۔ تہذیب و شائستگی، سوسائٹی و اخلاق ایک لڑی کے موتی ہیں، جس کے ڈورہ میں روح کے لافانی ہونے کے اعتقاد کی گرہ لگی ہوئی ہے، گرہ کو توڑ ڈالیے سب موتی بکھر جائیں گے۔

مادہ پرستی فی زمانہ ایک ایسا منبع ہے، جہاں سے یورپین سوسائٹی کے تمام افعال قبیحہ و شنیعہ نکلے ہیں۔ مادہ پرستی سے اس مضمون میں جان تورٹ کے جنگ و جدال کی گئی اور اس خیال سے اسے اثبات الروحانیت بالطبعیات کہنا زیب دیتا ہے چونکہ یہی اسکا منشا ہے +

جسم، روح اور لائف کے خلط کا نتیجہ انسان ہے، انہیں سے کون کون سی چیز فنا سے معمور ہے۔

فرانس کے حکمائے متاخرین نے جنہیں ڈاکٹر بارتھیز اور لارڈ ات زیادہ ممتاز ہیں ہیوسن ایگریگیٹ یا مجموعہ انسانی کا مسئلہ اختراع کیا جس کی مراد ان چوٹی کی چیزوں سے جس کے امتزاج سے انسان عالم وجود میں آتا ہے، ان حکماء کا انکشاف فطرت انسانی بے مثل ہے، لہذا ہم انہی کو اپنا راہ نما بنائیں گے، ان کی تعریف کے بموجب انسان تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے :-

(۱) جسم۔

(۲) لائف۔

(۳) روح

لائف اور روح کو ہمیں مخلوط نہیں کرنا چاہیئے، جیسا کہ مادیین اور اوجھی پوبجی کے اہل فلاسفہ نے کیا ہے، انہیں ایک بین و بہ الامتیاز ہے، لائف

فانی شے ہے روح لافانی، لائف ایک کیفیت عارضی ہے، جو تنزل و تباہی سے معمور ہے روح پر کسی چیز کا زور نہیں چل سکتا، یہ پنجۂ موت سے مبرا ہے لائف گرمی اور بجلی کی مانند ایک قوت ہے جو چند اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوتی ہے، اسکی ابتدا اور انتہا دونوں چیزیں ہیں اور اسکو فنا ہی برخلاف اس کے روح کو بقائے دوام ہے اور اسکا انجام نہیں،

انسان کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک روح کامل ہے اور مادی جسم اس کا مکان ہے اس تعریف کو پیش نظر رکھ کے ہم بتا دیں گے کہ موت کس چیز کو کہتے ہیں!

موت جسم سے روح کی جدائی کا نام ہے، موت اسوقت آتی ہے جبکہ جسم میں لائف موقوف ہو جاتی ہے، حیوانات اور نباتات چند حالتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ حیوانات ہوا بغیر، نباتات ہوا اور پانی بغیر، مچھلی پانی بغیر اور اگر انہیں ان حالتوں سے محروم کر دیا جائے تو آناً فاناً میں انکا کام تمام ہو جائے علاوہ ان معمولی کیفیتوں کے بعض موجودات کی زیست کے لیے خاص خاص حالتوں کی ضرورت ہے۔

بعض بہت سی ٹانگوں والے کیڑے صرف کاربانک ایسڈ گیس یا ایزاٹک گیس (یہ ایک قسم کا گیس ہوتا ہے جو حیوانی زندگی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے) میں زندہ رہ سکتے ہیں ایسی جڑی بوٹیاں جو زمین کے اندر ہی اندر رسیل سے پیدا ہوتی ہیں اگر انکو علی التواتر نمی نہ پہنچتی رہے تو وہ ہرگز پھل پھول نہیں سکتیں، سمندر کی مچھلی آب شیریں یا آب تلخ جسمیں کم شوریدگی ہو جانبر نہیں ہو سکتی۔

اسلیے ہر جاندار جسم کے لیے خاص حالتوں اور خاص مکان کی ضرورت ہوتی ہے روح بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں، روح کا مکان جسم ہے، جب جسم میں لائف موقوف ہو جاتی ہے تو روح بھی علیحدہ ہو جاتی ہے جسم روح اور لائف کا یہی تعلق ہے

جو ہم نے بیان کیا، اور یہی زندگی اور موت کے پرزے ہیں +

یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جسم، روح اور لائف کا امتزاج صرف انسان ہی وابستہ نہیں، یہ تینوں چیزیں حیوان میں بھی ہوتی ہیں، حیوان کا جسم بھی ذی حس ہوتا ہے اور روح ہوتی ہے، لیکن حیوان کی روح بمقابلہ انسان بدرجہا پست ہوتی ہے، حیوان کی ضرورتیں گنتی کی ہوتی ہیں اسی ہی کی اقتضا سے اسکی قابلیتوں کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور جو کچھ ہی قابلیتیں ہوتی ہیں وہ ابتدائے حالت میں ہوتی ہیں انسان کے قوائے دماغی کی ترکیب ایسی ہے کہ اسمیں ترقی کیطرف صعود کرنے کی غیر محدود قابلیتیں ہوتی ہیں اور یہی انسان اور حیوان کا مع الفارق ہے ورنہ دیکھا جائے تو بہت سی حالتوں میں جسم کی بناوٹ اور عضو کا فعل ہو بہو یکساں ہوتا ہے +

جسم، روح اور لائف کا بعد موت کیا حشر ہوتا ہے؟

موت کے بعد جسم، خواہ انسانی ہو، یا حیوانی، کیمیائی طاقتوں کی حکومت کے تابع ہوجاتا ہے، چونکہ لائف جو اسکو تباہی سے محفوظ رکھتی تھی وہ اب فنا ہوجاتی ہے اگر کسی انسان یا حیوان کی لاش کو ایسے مقام پر رکھا جائے، جہاں حرارت کا درجہ صفر سے نیچے ہو یا ایسے مقام پر بند کر دیا جائے جہاں ہوا کا مطلق گذر نہو یا ایسی خوشبوؤں وعطریات میں بسا دیا جائے، جس سے لاش سڑ نہ سکے تو وہ ایسی ترو تازہ رہے گی جیسے لائف جدا ہوتے وقت تھی۔ اسی طریقہ کو انگریزی میں ایما سنگ کہتے ہیں۔ مختلف انواع کیمیائی اجزا جنمیں لاش کو بسایا جاتا ہے انکا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مردہ کے رگ وریشہ کے تار تار کو وابستہ رکھتے ہیں اور تفریق عناصر نہیں ہونے دیتے، اسی طرح اگر آپ یخ بستہ کی دو سلوں کے بیچ میں میت کو رکھدیں یا تابوت کو برف میں لگا دیں اور تازہ تازہ برف پہنچاتے

رہیں تو متذکرہ بالا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ نقطۂ انجماد میں بے جان جسم رکھنے سے تجزیہ نہیں ہوتا، کیونکہ جسم مردہ میں خمیر اٹھانے اور ٹھہرانے کے لیے حرارت میں کافی استعداد نہیں ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ قرون اولیٰ کے عظیم الجثہ میمتھ یا ہاتھیوں کی لاشیں جوں کی توں ہزارہا سال تک قائم رہیں ۱۸۰۶ء میں ایک عفیرتن دتوش والے جانور کی لاش، بالکل صحیح وسالم دریائے لینا کے کنارہ پر ملی، یہ دریا بر اعظم ایشیا کے قطب شمالی حصہ میں بہتا ہوا بحر منجمد شمالی میں گرتا ہے۔ دریائے لینا کے کناروں پر برف نہایت گہری تہ میں سدا رہتی ہے، اسمیں یہ دیو ہیکل جانور جا پڑا تھا اور اسکی لاش برف میں دبے رہنے کی وجہ سے مطلق متعفن نہو سکی اور ایک لاکھ برس بعد اس مقام کے ماہی گیروں کی غذا بنی۔ شمالی ملک میں اگر کوئی شخص لاش کو سلامت رکھنا چاہے تو وہ بآسانی برف میں لپیٹ کے جب تک جی چاہے رکھ سکتا ہے،

جب کسی آدمی یا جانور کی لاش ہوا، پانی اور معتدل درجہ حرارت کے مجموعی تاثیر کے زیر اثر آتی ہے تو اس کے اجزا میں تجزیہ کا دور شروع ہو جاتا ہے، اور انجام کار عناصر تیسکل کاربانک ایسڈ گیس اور چند مرکبات، جامد یا تحلیل شدہ، تبدیل ہو جاتے ہیں، یہ جسم کے زائل ہونیکی منزل اول ہے، مختلف قسم کے گیسز مثلاً کاربانک، ہائیڈروسلفرک (پانی اور گندک ملی ہوئی گیس ایموناٹک (نوسادریا شور ملا ہوا گیس) اور پانی کے بخارات ہوا میں اڑے اڑے پھرتے ہیں یا زمین کی سیل اور رطوبت میں گھل مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد کی منزل میں ان مرکبات کو جو زمین کی سیل میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں، ننھے ننھے پودوں اور جڑی بوٹیوں کی جڑیں اپنا لیتی ہیں، جو انکی غذا ہے اور جن پر انکا مدار زندگی ہے۔ اب رہے وہ مرکبات جو ہوا میں منتشر اڑتے پھرتے ہیں انکی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مینہ کے پانی کے ساتھ نیچے اتر آتے ہیں

اور تحلیل ہو کر نباتات کی شادابی کے کام آتے ہیں ایمونائک اور کاربالک میں قابلیت ہوتی ہے کہ وہ زمین کی تہ میں گھس جاتا ہے اور جڑیں اُسے جذب کر لیتی ہیں، پیڑوں کے تنوں میں اور ٹہنیوں میں اسکا اثر دوڑ جاتا ہے۔ اور انہیں ہمیشہ سرسبز و تر و تازہ رکھتے ہیں پس مادہ جس سے انسان اور حیوان کے اجسام ترکیب پاتے ہیں، ضائع نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ یا انفصال کے بعد نئے اجسام کی ساخت میں حصہ لیتا ہے اور موجودات کا بوقلموں پیکر بن کر نکلتا ہے۔

عالم تجسم یہ میں جسم انسانی عام قانون فطرت کا مطیع ہے، جو کچھ معاملہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے اوسی کے اور تمام اجسام ترکیبی تابع ہیں، حیوان و اشجار جو ہوا، پانی اور حرارت کے اثر کے زیر فرمان ہیں سب بعینہ انہی کیفیتوں سے ہو کر گذرتے ہیں کوئی کپڑا ہو یا پھل ترکاری ہو، ہر ایک سڑیگا پٹیگا، ریزہ ریزہ الگ ہو جائے گا اور نت نئی جون بدل لیگا۔ یہی انسانی جسم کی حالت ہوتی ہے۔

مادہ جس سے انسان کا جسم بنا ہے روپ بدل بدل کر آفاق میں گشت لگاتا ہے کبھی حیوانات سے نباتات کی ہیئت کذائی میں نمودار ہوتا ہے، کبھی نباتات سے حیوانات کی شان میں جلوہ نما ہوتا ہے، مگر لائف کے ساتھ صورت معاملہ بالکل معکوس ہے، لائف ایک قوت کا نام ہے جو گرمی، روشنی، یا قوت کہربائی کے مانند پیدا ہوتی ہے اپنا کام کرتی ہے اور چل بستی ہے اسکا آغاز و انجام دونوں چیزیں ہیں۔ جن طبعی قوتوں کی تمثیل (گرمی، روشنی، بجلی) سے ہم لائف کو سمجھتے ہیں۔ اور جن کا مبدا و جوہر بلاشک و شبہ ایک ہی ہے انہی کے مانند لائف عالم ظہور میں آتے اور کتم عدم کو جانے کی علت و سبب سے وابستہ ہے، لائف جب ایکبار معدوم ہو جاتی ہے تو پھر عود نہیں کر سکتی۔ لائف اپنے آپ کو استمراری حالت میں نہیں رکھ سکتی، یہ جسم کی معمولی کیفیت ہے یہ ایک بے ثبات آن کی آن میں غائب ہو جاتی

والی حالت ہے جو ہزارہا اثرات حادثات اور جذبات کی ماتحت ہے، لائف روح کے مقابلہ میں ایک ذرہ ناچیز ہے، روح ابدی اور سرمدی ہے، روح عالم نیچر کا جزو لابدی ہے، روح ہر حیثیت سے قوت فاعلی وصفات مثبت سے متصف ہے، جسم لائف ہر دو اجزائے ترکیب انسانی عاجز ومنفی ہیں، اجزائے جسم تقسیم ہو کے غائب غلہ ہو جاتے ہیں، لائف ملیا ملیٹ ہو جاتی ہے روح نہ غائب ہوتی ہے نہ نیست و نابود۔

لیجئے یہ تو معلوم ہو گیا کہ آدمی کے جسم کا موت کے بعد کیا تفرقہ ہوتا ہے اور لائف کا کیا حشر ہوتا ہے! اب دیکھنا یہ رہ گیا کہ روح کہاں جاتی ہے۔

کوئی فلاسفر، کوئی عالم جس نے کائنات کی وسعت اور زمانہ کی قدامت کو محصور کر لیا ہے اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہماری زیست اس ہستی میں ایک محدود جنس ہے؟ اور ہماری زندگی کا علاقہ بعد موت کرہ ارض سے بالا اور کسی چیز سے نہیں ہے۔ آدمی تیس سال کی عمر میں چل بستا ہے یا بیسویں سال ہی میں لقمۂ اجل بن جاتا ہے یا اگر زندہ رہا تو کچھ سال اور سہی عمر انسانی کا معیار ڈوبلارڈ کے نقشہ کے بموجب کل اٹھائیس برس ہے۔ فی زمانہ ۳۳ سال شمار کیا جاتا ہے۔ بنی نوع انسان کی ایک چوتھائی تو سات سال بھرنے سے پیشتر مر جھا جاتی ہے اور نصف کو مشکل سے سترہویں سال میں قدم رکھنا نصیب ہوتا ہے، باقی فائدہ جو اس وسط سے تجاوز کرتے ہیں وہ اُن حقوق کی رنگ رلیاں مناتے اور خوشیاں رچاتے ہیں۔ جس سے باقی نسل انسانی محروم رہتی ہے +

اگر ہم اپنی زندگی کا دنیا کی عمر اور زمانہ کی میعاد سے اندازہ کریں تو ایک لمحہ کے برابر بھی نہیں، ہماری زندگی بجز ایک حادث چیز کے اور کیا ہو سکتی ہے، ایک قلیل المیعاد، ڈھلتی پھرتی چھاؤں، یا ایک گذرتا ہوا منظر خدائے واجب الوجود ہے جو تاریخ نیچر کی کسی گنتی میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں۔

اس چند روزہ زندگی میں جو انسان پر جسمانی کوائف گذرتے ہیں وہ قابل نفرت ہیں، انسان ضعیف البنیان بے کس و بے بس، اسکی جسمانی ساخت تناقص ہمیشہ خارجی عوارض سے معرض خطر میں رہتا ہے، سردیوں میں سردی کی شدت، گرمی کی حدت سے ڈرتا ہے، کمزور، بیمار، جنم ننگا عالم ہستی میں آتا ہے، آب و ہوا کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی قدرتی سامان نہیں ہوتا، اگرچہ یورپ اور امریکہ کے معدودے چند حصوں میں تہذیب و شائستگی کے قدم کی برکت سے امیر امرا اور با ثروت لوگوں کے لیے ہر قسم کا تعیش و تنعم کا سامان مہیا ہے لیکن ان ہی براعظموں میں غریب غربا کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اقالیم ایشیا، افریقہ اور اوشینیا کی مضر صحت آب و ہوا میں خلق اللہ کی کثیر جماعت کا جام عمر ہمیشہ مصائب و تکالیف سے لبریز رہتا ہے، اور وہ زمانہ جبکہ بنی آدم وحوش اور بہائم کے مانند تھا، وہ زمانہ جسکی پہنائی ہم سے لکھو کھا برس کے فاصلہ سے بھی بعید ہے۔ ہاں! اس زمانہ میں بنی آدم کا نوشتہ تقدیر کیا ہوگا، مصیبت و آفت، خوف و خطر، رنج و الم کا ایک دور ہوگا جسکو قرار نہ ہوگا۔

کیا جسمانی اور کیا اخلاقی نقطہ نظر سے انسان کی زندگی چمن غموم و خارزار آلام ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ اس سرائے فانی میں انسان کے لیے شادمانی ناممکنات سے ہے، صحائف مقدسہ میں کسقدر حسین شاعرانہ تخیل واقع ہوا ہے جو قاطبۃً ہمارے حال زار پر صادق آتا ہے، کہ "یہ چمنستان ارض وادی رشک ہے"

فی الحقیقت انسان کے نوشتہ تقدیر میں ہجوم افکار و حوادث روزگار کے علاوہ اور کیا دھرا ہے، اس کی خواہشیں، اس کے ارمان، سب میں تشنہ کام، شور بخت، سب خاک میں مل جاتی ہیں، وہ کوشش و سعی کرتا ہے تقدیر کا زبردست ہاتھ چرخ دیگر اٹھا دے مارتا ہے، غیر مغلوب و ناقابل تسخیر کاوشیں قافیہ تنگ و عقل دنگ کر دیتی ہیں

حیران و سرگردان، ششدر متحیر رہجاتا ہے، خون کے آنسو بہاتا ہے، جگر کاٹ کاٹ کے کھاتا ہے، سکھ چین و کامرانی اس کے لیے اور متمنع ہے، راحت کی چند گھڑیاں جو کبھی میسر آجاتی ہیں تو اُس کے کفارہ میں رنج و محن کا مملو ساغر پینا پڑتا ہے۔ ہم سے ہماری پیاری چاہیتی چیزیں چھین لی جاتی ہیں اور ہم دم نہیں مار سکتے۔ ہماری آنکھوں کا تارا ہمارا قوت بازو، ہماری مادر مہربان، ہماری ہمشیرہ تسکین بخش، ہماری محبوبہ دل آرام ہماری آنکھوں کے سامنے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

یہ ناممکن ہے کہ ایسی بے قاعدہ حالت ایک ایسی محدود کیفیت ہو جس کے بعد کچھ نہو، ترتیب، تناسب، مساوات کا عالم اجسامی میں چاروں طرف ظہور ہے، اور بعینہ حالت عالم اخلاقی میں ہے۔ لیکن ترتیب و تناسب و مساوات کو ایک طرف اور بے قاعدگی و کوائف گوناگوں کو دوسری طرف، جب مشاہدہ کے کانٹے میں رکھہ کر ہم تولتے ہیں تو ہمیں دنیا کی بے قاعدگی کا پلڑا جھکا ہوا نظر آتا ہے، اور پھر بادل ناخواستہ سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کہ اس دنیا میں آرام و مصائب کا شہرہ ہے، بے انصافی ظلم و تعدی کا دور دورا ہے، زبردست کو ظفر نصیب ہے جبر و تشدد کے فولادی پنجہ میں مظلوم و بیکس کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس تمام کیفیت کو مدنظر رکھہ کر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب اشیاء فی الواقعی عارضی ہے۔ دار فانی ایک متعدی لمحہ ہے، ایک درمیانی وقفہ ہے، جسکو نہایت سرعت سے گذارنے کے لیے رب الارباب نے ہمیں یہاں بھیجا ہے تاکہ ہم اپنی درستی کرکے، اس سے برتر عالم کے لیے جو نیکی اور ترقی سے معمور ہے تیار ہو جائیں +

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسری حالت کیا ہے، ہماری نئی زندگی جو دنیاوی زندگی کے بعد آنے والی ہے، اُسکی حقیقت کیا ہے یا دوسرے لفظوں میں

یوں کہنا چاہیئے کہ روح انسانی کا کیا حشر ہوگا جب موت کا زبردست چنگل ان بندشوں کو جن سے روح اور جسم وابستہ ہیں توڑ ڈالیگا؟

وہ متنفس جو عالم بالا کی ذی حیات مخلوق کے درجہ میں آدم سے بھی اشرف اور افضل ہے اسکا کسی زبان میں کچھ نام نہیں، فرشتہ یا اینجل جو اہل کتاب میں صفات ملکیہ اور قابلیتوں سے ممتاز ہے، صرف ایک ہی وجود ایسا ہے جو ہمارے مفہوم کے لگ بھگ اور ہمارے خیال کے ادا کرنے میں پورا اترتا ہے۔ جین ریناڈ ایک فرانسیسی فاضل نے بھی اس اشرف مخلوق کو جسکی نسبت اسے کامل یقین ہے کہ وہ بنی آدم کا وہم نکلنے کے بعد عالم بالا پر اسکا جانشین ہوتا ہے، ملک کے نام سے تعبیر کیا ہے، لیکن ہم اس لفظ کو اپنے لغتی جغرافیہ میں مفصل نہیں کریں گے اور اس مخلوق کامل کو جو ہمارے اعتقاد کے موافق انسان کے بعد نیچر کے مدارج ترقی کے سلسلہ میں آتا ہے، مافوق الانسان کہیں گے ٭

سید شوکت دہلوی

غزل

از شمس العلماء میرزا موسےٰ کوثر صاحب

تحمل سخت مشکل ہے بیان ماجرا مشکل
عجب حالت ہوئی آساں کرے میری خدا مشکل

کہوں کس منہ سے اور اب کیسے مطلب ہو کہوں کیونکر
سکوت و صبر مشکل عرض حال و مدعا مشکل

علاج درد دل میرا کرے وہ آپ ہی ورنہ
دعا میری مشکل ہے دوا مشکل شفا مشکل

نہیں مشکل رہائی رنج سے اشکال ایسے ہیں
پڑی مشکل میں جاں ایسی کہ جینا ہو گیا مشکل

بقا سے تنگ ہوں بعد از فنا کیا جانوں کیا ہوگا
مجھے ہر طور مشکل ہے بقا مشکل فنا مشکل

رواں کی میں نے کشتی کہکے بسم اللہ مجریٰھا
نہ اب دریائے غم مشکل نہ طوفاں بلا مشکل

نہو کوثر ہراساں صبر ہے ہر حال میں اچھا
کرینگے لطف سے آساں میری مشکلکشا مشکل

اسلام

مولوی سید علی حیدر صاحب زیدی ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے برادر عزیز سید محمد مستحسن صاحب زیدی بی۔ اے کی یہ نظم ہمیں عنایت فرمائی۔ یہ نظم سید محمد مستحسن صاحب کی پہلی نظم ہے جو تمدن کے پہلے پرچہ میں شائع ہوتی ہے۔

اسلام راہ راست ہے۔ بھٹکے ہوؤں کیواسطے
بھوکوں کی خاطر ہے غذا۔ کپڑا ہے ننگوں کیلئے
پونجی ہے یہ نادار کو۔ قوت ہے نحیف و زار کو
مردہ کو ہے یہ زندگی۔ صحت ہے یہ بیمار کو
اندھے کو بینائی ہے یہ۔ لنگڑے کو ہے یہ عصا
امید ہے بے اس کی۔ ساتھی ہے یہ بے یار کا
اس کا گدا ہے بادشاہ۔ اس کا غلام آزاد ہے
جس دل میں ہے یہ جلوہ گر۔ وہ دل ہمیشہ شاد ہے
ہے وہ دریکتا۔ جسے۔ کوئی مچھڑا سکتا نہیں
ہے وہ خوشی۔ کوئی جسے۔ ہرگز مٹا سکتا نہیں

(مستحسن زیدی از کیمبرج)

قطعہ

عقلی تہی یا کہ عیش و مسرت کا ایک خواب — سمجھا نہ میں کہ نیند کا جھونکا تھا یا شباب
ناپا مدار زیست کی اب کیا امید ہو — پیری بھی دے چکی مجھے دنداں شکن جواب

(محمد ہادی۔ عزیز)

بھائی کا خط بہن کے نام

پیاری بہن خدا تمکو خوش نصیب کرے!

ایک عرصہ سے میرا خیال تھا کہ پردہ کی نسبت اپنی ذاتی رائے تمپر ظاہر کردوں، مگر عدم الفرصتی نے بالکل موقع نہیں دیا:۔ اب تم نے پھر تقاضا کیا اور مجھے چار و ناچار وقت نکالنا ہی پڑا +!

پردہ۔ وہ پردہ سسٹم جو ہندوستان میں رائج ہے۔ نہ مذہب کے احکام میں داخل ہے، نہ عربوں کا پرانا رواج؛ نہ سلطنت اسلام اسکی بانی تھی، نہ خود اہل ہنود اس کے عادی! پھر اسکا وجود ہوا تو کیونکر ہوا؟ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ زمانہ فتوحات میں نہ تو فاتحین اسے اپنے ہمراہ لائے، اور نہ اسوقت اسکا نام و نشان مفتوحین ہی میں موجود تھا؛ اس لیے اس کی بنیاد بعد کے زمانہ میں پڑی! کیونکر پڑی اور کس نے ڈالی؟ اس سے تو ہمیں بحث نہیں، ہاں! اسقدر ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ فعل۔ اچھا یا برا۔ تھا زیادہ تر مسلمانوں کا ہی!!

ضروری اور نہایت ضروری سوال یہ ہے کہ "آیا موجودہ زمانہ میں بھی پردہ کی ضرورت کسی مصلحت سے ہے"؟ بہت بڑا گروہ تیز طبع، نوجوان، اور تعلیم یافتہ گروہ۔ بلا تامل جواب دے گا کہ "قطعی نہیں! پردہ لغو ہے! پردہ فضول چیز ہے! پردہ ہماری ترقی میں حارج ہے!" اور صرف سیدھا سادھا جواب ہی نہیں دے گا بلکہ اپنی پُرزور تقریر کے باتھوں جو کچھ کہیگا منوا کر چھوڑے گا! شاید میرا یہ بیان تمہیں ہاں اور نہ آسکے، لیکن نہیں پر زور تقریروں کا لب لباب۔ مستحکم دلائل کا خلاصہ

پہلے سن لو۔ طبقۂ نسواں کو جہالت کی تاریکی میں رکھنے والا، پردہ: معلومات دنیاوی سے محض بے بہرہ رکھنے والا، پردہ: ترقی کے راستہ میں سدراہ پردہ: غرض ہر عیب اور برائی کی جڑ، پردہ۔ اور صرف پردہ!! اس کی مدّاح اگر کوئی ٹوٹی پھوٹی خوبی صرف ایک اکیلی خوبی۔ بیان بھی کر سکتے ہیں تو یہ ہی کہ پردہ محافظِ عصمت ہے! اللہ اللہ و خیر صلاح۔ مگر یہ دعوے ہی کہنے والوں کا محض خیال ہی خیال ہے جسمیں اصلیت نام کو بھی نہیں! بیوقوف سے بیوقوف شخص کو بھی اس کے ماننے میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا کہ ایک شریف اور نیک سرشت عورت اگر بے پردگی کی زندگی بسر کرے۔ بُرے سے بُرے اشخاص سے اسکو پالا پڑے۔ تو بھی وہ، ایک دن نہیں۔ تمام عمر اپنی عصمت کی خود حفاظت کر سکتی ہے اور کوئی اس کو بُری آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا! پھر ایسی عورت کو پردہ میں قید کرنا اس کو نقصان پہنچانا۔ اس کو معلومات زندگی سے جاہل رکھنا، ہے! اب رہی دوسری صورت یعنی ایک خبث باطن کو۔ ایک مشتبہ کو۔ یا ایک ایسی عورت کو جو آمادۂ آوارگی ہو، پردہ میں مقفل رکھکر نیک بنانے کی کوشش، فضول اور لغو کوشش ہے! لاکھوں موجودہ وارداتیں۔ اور ہزاروں گذشتہ واقعہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ:- بدطینت کو نیک رکھنے کے لیے پردہ کا خیال: محال، محال۔ اور قطعی محال۔ اس گروہ کے لیے بھی پردہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ کسی بگڑنے والی طبیعت کو آج تک پردہ محض پردہ سنبھال نہیں سکا! گویا ایسی حالت میں پردہ محض بیکار اور بے سود ہے! اب عورتیں بلحاظ اپنے خصائل اور اطوار کے دو طرح کی ہو سکتی ہیں۔ نیک یا بد۔ نیکوں کے لیے پردہ مانع ترقی اور نقصان دہ ہے! تو بُری عادات والوں کے لئے قطعی بیکار اور بے سود! لہٰذا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پردہ یا تو ضرر رساں اور نقصان دہ ہے یا بیکار و فضول!!

اور سچ بھی یہ ہے کہ پردہ نہ کبھی محافظ عصمت ہوا۔ نہ اب ہی۔ نہ آئندہ ہو سکیگا!! اسکی مخالفت کرنا امر حق بجانب ہے اور اس کی اعانت کرنا، پرانی لکیر پر فقیر ہونا، اور آنکھیں ہوتے ساتھ ہی اندھا بننا ہے!"

یہ ہیں وہ دلیلیں جو پردہ کے مخالفین پردہ کے معاونین کا مضحکہ اڑانیوالے صاف صاف لفظوں میں یا ہیر پھیر کر بیان فرمایا کرتے ہیں، اور بڑے فخر اور غرور کیساتھ مخاطب کو جاہل اور بیوقوف سمجھکر ارشاد کیا کرتے ہیں! سب باتوں کو چھوڑ کر اسقدر تو ہم بھی مانیں گے کہ یہ دلائل و براہین بادی النظر میں تو اچھے سے اچھے کو اپنا ہم زبان بنالیں گی! اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں، تم ہی بتاؤ کہ اس تقریر کو پڑھکر تمھارا خیال پردے کی نسبت کیا قائم ہوا؟ غالباً تم بھی تھوڑی دیر کے لیے تو پردہ کو برا سمجھنے لگی ہوگی۔ اور ہونا بھی یہ ہی چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں، پیاری بہن، ناسمجھ بہن! میں تمہیں بتاؤنگا کہ یہ ساری دلیل مغالطہ اور دھوکا ہی دھوکا ہے! ایسے طریقہ استدلال کو لاجک یا منطق کی اصطلاح میں ڈائی لما کہتے ہیں! تم شاید یہ انگریزی کا لفظ نہ سمجھو۔ خیر میں تمھیں اور طرح سمجھاؤں گا!!

میں کہتا ہوں کہ قانون فوجداری جرائم کی سزا دینے کا قانون۔ یا تو محض فضول ہے یا بے سود! تم شاید اس دعوی پر ہنسوگی۔ مگر نہیں پہلے میری دلیل سن لو پھر کچھ رائے قائم کرنا۔ "انسان بلحاظ اپنے چال چلن کے دو گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نیک یا بد۔ نیک سرشت حضرات خدانہ کرے جو کبھی بھولکر بھی چوری، جوئے، ڈاکے، قتل وغیرہ کے مرتکب ہوں۔ وہ بغیر کسی خاص وجہ کے خود ان حرکات ہی کو نہایت ذلیل سمجھتے ہیں اور کسی حالت میں بھی۔ بڑی سے بڑی مجبوری اور تکلیف میں بھی ایسے جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتے! اس لیئے قانون فوجداری کم از کم ایسے حضرات کے واسطے فضول ہے۔ اب رہے بدطوار

آوارہ، بدمعاش؛ ایسے لوگ صاف ظاہر ہے کہ بید کی سزا جھیلتے ہیں، قیدیں کاٹتے ہیں، حوالات بھگتتے ہیں، لیکن پھر بھی آجتک تو سنا نہیں گیا کہ کسی ایک بدمعاش کو بھی حوالات، جیلخانہ، اور پھانسی کے خوف نے۔ صرف ان ہی باتوں کے خوف نے ارتکاب جرم سے باز رکھا ہو اور بگڑے ہوئے کو سنبھال لیا ہو! لہذا ان کے لیے بھی قانون فوجداری قطعی بے سود ہے! اب نتیجہ آخری کیا ہوا؟ یہ ہی نا، کہ قانون فوجداری محض فضول ہے یا قطعی بے سود! یعنے محکمۂ پولیس لغو محکمہ! امن قائم رکھنے کی کوشش مجنونانہ خیال!! اور قوانین موجودہ از سر تا پا مہمل اور بیکار رہا!! صاف ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں تمام اقوام نے غلطی کھائی۔ تمام سلطنتیں اس غلطی میں مبتلا رہیں۔ اور موجودہ زمانہ میں بھی۔ نہایت ترقی یافتہ زمانہ میں بھی۔ اسی غلطی میں گرفتار ہیں!! کیا خوب! کیسا اچھا اور بانکا نتیجہ نکلا ہے؟ اگر منطق اور استدلال اسی کا نام ہے تو ہمارا تو دور سے ہی سلام ہے!"

پیاری بہن! ذرا سوچ تو سہی کہ اگر یہ قانون قطعی منسوخ کر دیا جائے اور پولیس کا محکمہ بھی توڑ دیا جائے۔ تو کیا ہوگا؟ دن دہاڑے چوری، اور رستہ چلتے قتل و غارت! یہ کیونکر معلوم ہوا؟ زندگی کا مشاہدہ اور روزمرہ کا تجربہ خود بتا رہا ہے، ہماری عقل اور ہمارا دماغ خود مان رہا ہے! اگر جو نتیجہ کہ منطق سے نکلا ہے وہ کیوں غلط ہے؟ اب اسکا جواب شاید تم نہ دے سکو! مگر نہیں میں تمہیں خلاف اصلیت یا غلط نتیجہ نکلنے کی وجہ بھی بتاؤنگا! انسان کی تقسیم بلحاظ عادات و چال و چلن کے دو گروہوں پر۔ صرف دو گروہوں پر۔ کرنا بہت بڑی غلط فہمی ہے! نیک طینت گروہ اور بد باطن حصہ، دو انتہائی حدود ہیں۔ جن کے درمیان میں ایک گروہ ہے! یہ درمیانی گروہ وہ گروہ ہے جو بے عزتی، رسوائی، سزا، جیل، وغیرہ کے خوف سے نیک ہے۔ جو نیک رہنے پر مجبور کیا جائے تو نیک ہے! اور جس سے ایسے قوانین کی غیر موجودگی میں

بہت ممکن ہے۔ بلکہ یقین ہے۔ کہ کسی نہ کسی جرم کا ارتکاب۔ رضا و رغبت سے نہ سہی تو بہکانے سکھانے یا کسی فوری جذبہ و جوش کیوجہ سے ہی۔ ہو جائے!! یہی گروہ درمیانی گروہ۔ تعداد میں اور گروہوں سے بڑا ہے اور اسی کے لیے قوانین کی در اصل ضرورت ہے!! اب تو شاید تم بغیر سمجھائے ہی سمجھ گئی ہوگی کہ یہی دھوکا پردہ والی دلیل میں بھی ہے! عورتوں کے دو حصے۔ نیک اور بد۔ دو انتہائی حدود ہیں:۔ درمیانی حصہ یہاں بھی غائب ہے! یعنی وہ بڑا حصہ جسکو ہم کچی لکڑی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ایسی چیز جو نہایت آسانی کے ساتھ، اپنے آپ نہ سہی دوسرے کی قوت سے، چاہے جسطرف جھکائی جا سکتی ہے! وہ گروہ جو گرم و سرد زمانہ کا اثر بہت جلد قبول کر لیتا ہے یا جسپر صحبت کا اثر دیکھتے ہی دیکھتے بہت گہرے نقش ڈال دیتا ہے یہی گروہ بڑا گروہ ہے، اور اسی گروہ کے لیئے پردہ نہایت ضروری چیز ہے!! تم خود سوچو کہ بری صحبتوں، بری نگاہوں، اور شیطان صفت انسانوں سے بچنے کے لیے پردہ سے زیادہ کوئی اور بہتر، آسان، اور اچھا طریقہ ہو سکتا ہے؟ پردہ کے معنی "زندہ درگور ہو جانا یا چار دیواری میں مقید رہنا" اگر لیئے جائیں تو سب سے پہلے میں اسکا مخالف ہوں! لیکن نہایت آزادی کے ساتھ اس کو ملیامیٹ کر ڈالنا بھی خود اپنی تمام خوبیوں کی جڑ آپ ہی کاٹنا ہے! قوانین کی ضرورت عملی زندگی کے مشاہدے اور روزمرہ کے تجربوں سے ثابت ہوتی ہے، تو۔ پردہ کی خوبیاں ہندوستان اور یورپ کی موجودہ لائف اور حالت کا موازنہ کرنے سے اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں!!

کیا صرف تحریر اور تقریر میں "مائی ڈیر ہسبینڈ"۔ میرے پیارے شوہر لکھنا اور بولنا، اور در اصل شوہر سے سچی محبت یا اس کی قدر و عزت اتنی بھی نہ کرنا جتنی ہندوستان کی ایک بے پرواہ بیوی کرتی ہے کچھ لیاقت کی بات ہے؟ کیا

زبان کو جھوٹی محبت بھرے الفاظ کا۔ صرف کانوں کو پہلے معلوم ہونے والے الفاظ کا عادی بنانا تہذیب ہے؟ کیا پوڈر اور پوشاک سے نت نئی رنگتیں بدلکر نوجوان طبیعتوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرنا عقلمند اور ترقی یافتہ ہونیکا ثبوت ہے؟ کیا مردوں کے سامنے دل لبھانے والی ادائیں۔ بناوٹی تبسم، جھوٹا بھولاپن، اور خواہ مخواہ کی نزاکت۔ پیدا کرنا خوش خلق ہونے کی دلیل ہے؟ کیا بینیوں مدآح حسن اور سینکڑوں کشتہ اداپیدا کرنا حسین ہونے کی پہچان ہے؟ کیا بازار میں نیچی نگاہ کیئے، متانت کا چہرہ بنائے چلنا، اور جلسوں اور ناچ وغیرہ میں تقریباً نیم برہنہ ہوکر جلوہ افروز ہونا حیا و شرم کا تقاضا ہے؟ کیا اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر شوہر سے اور ہزاروں مردوں کے سامنے بلا تکلف خصتی۔ بنایت فرمانا ہی سچی محبت کی علامت ہے؟ اگر یہ ہی وہ باتیں ہیں جن پر ہمارا ملک دلدادہ ہے تو بسم اللہ۔ ع "یہ ناؤ آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی"۔ اور اگر ان حرکات کو برا سمجھا جائے تو میں کہونگا، ضرور کہونگا، اور ڈنکے کی چوٹ کہونگا۔ کہ جس چیز نے یہ رکیک اور نازیبا حرکت یورپ میں حد سے زیادہ بڑھادیں وہ بے پردگی ہے اور جس نے بفضلہ ابتک ہم کو اس ناپاک اثر سے محفوظ رکھا جسپر ہمیں فخر ہے اور رہے گا۔ وہ پردہ ہے اور محض پردہ ہے! رہی یہ صورت کہ پردہ اٹھایا جائے اور آزادی نہ دی جائے میرے خیال میں یہ امید بالکل ایسی ہے کہ پوس میں دیا سلائی دکھائی جائے اور امید رکھی جائے کہ وہ آدھا جلے گا اور آدھا بچ جائے گا! کسی راہ پر بڑھتے ہوئے کو ڈالدینا اور پھر کچھ آگے جاکر بڑھنے سے روکنا، ناممکن! ترقی کی رفتار پھر کسی روحانی قوت کے بس کی بھی نہیں؛ وہ بڑھے گی، تیزی کے ساتھ بڑھے گی، تمام مدارج کو طے کرکے اس حد تک پونچے گی اور پونچ کر رہے گی، جہاں یورپ کی بے پردہ اقوام اسوقت ہیں! بے پردگی کی وبائے عالمگیر یورپ میں رفتہ رفتہ ہی اس

حالت ناممکن العلاج تک پہونچی ہے جہاں اب ہم اُسکو دیکھتے ہیں! اور خدانخواستہ اگر جدت طبع، "اور کلُّ جدید لذیذ" کی ہَوا اسی زور وشور کے ساتھ رہی تو اس طوفان ناعاقبت اندیشی کے ہاتھوں آنے والی نسلیں انجمنوں اور سوسائٹیوں کے پردے میں اوٹینس اور باڈمنٹن کی آڑمیں ایسی کھُل کھیلیں گے کہ سننے والے دانتوں میں اُنگلیاں دے لیں تو سہی!!

تعلیم نسواں کے خلاف ہونا عقل کی آنکھوں سے اندھا ہونیکی دلیل ہے! لیکن تعلیم اور پردے میں آگ اور پانی کا بیَر تو نہیں! پردہ کے سایۂ عاطفت میں رہکر تعلیم کے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور سے آراستہ ہونا، ممکن تو کیا مشکل بھی نہیں! خانہ داری کی زندگی ہزار طرح سے روشن ومنور ہوسکتی ہے۔ اور ترقی کے مدارج پردے کی آمالیقی میں تعلیم حاصل کرنے سے طے ہوسکتے ہیں!! پردہ کی ناجائز اور جابرانہ سختی واقعی خلاف انسانیت ہے، اور خواہ مخواہ کی بدظنی اور بیہودہ شک اوّل درجہ کی حماقت ہے! میرے خیال میں۔ شوہر یا بزرگوں کی اجازت سے کسی کے ہاں ملنے جانا۔ "اَلصَّالِحَاتُ حَافِظَاتٌ قَانِتَاتٌ لِلْغَیْبِ" کا خیال رکھہ کر جانا۔ کوئی عیب نہیں؛ اور عجائبات دنیا کو اپنے شوہر یا بزرگوں کے ہمراہ دیکھنا۔ خود اپنے چہرے یا جسم کو کسی غیر محرم کو دکھائے بغیر دیکھنا۔ چنداں ہرج نہیں! مگر پیاری بہن! اسقدر آزادی بھی اُسیوقت اچھی ہوگی جب کہ کوئی نگراں ہو۔ خفا نہ ہوجانا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ خدانخواستہ تمھاری طرف سے طبقۂ نسواں کیطرف سے بدگمانی ہے! نہیں بلکہ، اُن زہریلی نگاہوں اور اُن متعدی امراض جیسا اثر رکھنے والے الفاظ سے بچانا مقصود ہے۔ جو زہر سے زیادہ برا اور وبا سے زیادہ خراب اثر رکھتے ہیں!!

اگر میری ذاتی رائے پوچھو، تو عورت ایک ناقابل تشبیہ دُرِ آبدار۔ ذرا سی

بے احتیاطی سے میلا ہو جانے والا موتی: یا ایک دلاویز غنچہ عفت و حیا تھوڑی سی تمازت سے کھلا جانیوالا پھول۔ ہے!! یہ موتی ہمارے تاج میں رہنے کے قابل، اور یہ پھول ہمارے زیب سینہ ہونے کے لائق: لیکن موتی کو موتی اور پھول کو پھول سمجھ کر کہنا بھی ہمارا فرض ہے! اگر خدانخواستہ اس موتی کی آب و تاب میں یا رنگ و بو میں فرق آجائے۔ خود ہماری غفلت اور غلط فہمی کیوجہ سے فرق آجائے، تو ہم۔ جو اس کی حفاظت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ اس بے عنوانی کا کیا جواب دے سکتے ہیں؟ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ملک نے پردہ دور کرکے۔ جہاں جہاں ایسا ہوا ہے۔ کوئی اچھی مثال پیش نہیں کی! "پہلی بسم اللہ ہی غلط" کی تعداد پر تو۔ جس میں ہر قسم کی نگہداشت اور آسانی کیوجہ سے خوبی ہی خوبی کی امید ہے۔ یہ حالت ہے اگر زیادتی ہوئی تو بس خدا ہی مالک ہے!! مجھے افسوس اور سخت افسوس ہے کہ میری آنکھوں اور میرے کانوں نے۔ بے پردگی کی تصویریں اور آزادی کی خبریں شرمناک ہی دیکھیں اور افسوسناک ہی سنیں!! بہت ممکن ہے کہ یہ میری کمی علم کا قصور ہو! بہر حال، میں تو یہی دعا کرونگا کہ خدا تمہیں نگاہ بد اور صحبت بد دونوں سے بچائے اور عقل سلیم اور دماغ صحیح عطا فرمائے! آمین!!

میں ہوں تمھارا خیر اندیش بھائی

سلطان حیدر جوش!

علیگ

شعر

اب تو یوں ہمسے کوئی اہل سخن ملتا ہے
جیسے غربت میں کوئی اہل وطن ملتا ہے (نسیم رنگ)

حبیب ابن مظاہر

از سید الشعرا خان بہادر مولانا شاد صاحب

دوستی چیز ہے کیا لذت نفسانی ہے
جسم سے گر متعلق ہو تو جسمانی ہے

روح پر محض اثر ہو تو وہ روحانی ہے
دین سے ہو اسکا تعلق تو وہ ایمانی ہے

ہے یہ واجب کہ بشر سب کے مدارج سمجھے
یہ محاسن نہ ہوں جسمیں اسے خارج سمجھے

اے خوشا وہ کہ اس اخلاق کا جو بانی ہو
جملہ اوصاف میں اس چیز کے ثانی ہو

شیفتہ دل تو زباں محو ثنا خوانی ہو
حسب نفسانی و روحانی و ایمانی ہو

یوں تو ملنے کے لیے کوہ گراں باقی ہے
دوست وہ ہے جو کسی حال نہ زنہار ملے

سچ ہے اسطرح کے ہیں دوست جہانمیں نایاب
فرد ہے اسمیں حسین ابن علی کے احباب

اس محبت کا بھلا ہو کہیں دنیا میں جواب؟
پہلے ہم صدقہ ہوں اس فکر میں سب تھے بیتاب

ذکر اب دوستی باطن و ظاہر کا سنو
غور سے حال حبیب ابن مظاہر کا سنو

آب زر سے جسے لکھیں وہ بیاں کس کا ہے؟
سائباں جسکا فلک ہو وہ مکاں کس کا ہے؟

نور عرفاں کسطرح وصف عیاں کس کا ہے؟
مدح گو کس کا ہے دل مرتبہ داں کس کا ہے؟

مہبط نور خدا ظاہر و باطن کس کا؟
نام نامی ہے حبیب ابن مظاہر کس کا؟

عہد طفلی سے بنایا تھا انہیں حق نے سعید
ان کے اخلاق سے ہوتے تھے لائق دید

طینت خوبی تھی ہوئی آکے جوانی میں مزید
ہوئی پیری یہ مبارک کہ ہوئے آپ شہید

رشتہ محکم ہوا خالق کے ولی سے انکا
مل گیا خون حسین ابن علی سے ان کا

حق پسند اہل کرم عاشق دیں اہل سخا
خلق باتوں سے عیاں طینت و فطرت میں وفا

ولیں تمکین سے بہری اہل پیمبر کی ولا
اہل حاجت کا لحاظ اہل ضرورت سے حیا

آبرو قوم کی فخر و بہجائے کوفہ
شرف موطن و آس مالرو سائے کوفہ

مسز اور مس الیٹ

کسی ملک یا قوم کے واسطے اس سے زیادہ اور کیا افسوس کا وقت ہوگا کہ غیر بھی اسکی حالت پر آنسو بہائیں ولایت کے ایک مشہور اخبار ڈیلی کرانیکل کے ایک نامہ نگار نے اپنے زمانہ سیاحت ہندوستان میں ہمارے موجودہ تمدن پر ۹ مارچ کے پرچہ میں اس عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ کرانیکل کے نامہ نگار پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اسنے چند بڑھیوں ٹھڑیوں یا باہر کی پھرنے والی گنواریوں کو دیکھکر یہ نتیجہ نکال لیا کہ تمام ہندوستان اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مگر اعتراض کس منہ سے؟ جن عالیشان محلسراؤں اور پردہ دار حویلیوں میں کرانیکل کے نامہ نگار کا گذر بھی نہیں ہوسکتا تہاں کی حالت ہم جانتے ہیں اور بآواز بلند کہتے ہیں کہ بہت تھوڑے چند عام طور پر ان گھروں کی حالت بھی قریب قریب ایسی ہی ہے البتہ ہم قابل نامہ نگار سے اتنا ضرور کہیں گے کہ غور کرنے کے حقوق کی غصب کر لینا ہمارا ذاتی فعل ہے ورنہ عیسائیت سے بہت زیادہ اسلام نے عورت کے جائز حقوق کی حمایت کی ہے۔

کرانیکل کا نامہ نگار اس مضمون کے لکھنے میں اگر اتنا اور ملحوظ رکھتا کہ ہندوستانی عورت کے حسن کا جزو اعظم شرم و حیا ہے تو یہ مضمون بہت زیادہ وقعت کے قابل ہوتا۔ گو اب بھی ان دو تین باتوں سے قطع نظر کرکے ہماری حالت زار کی یہ سچی تصویر ہے۔

ہم اس مضمون کا ترجمہ شائع کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ملک کے

قوم دونوں کو یہ دیکھکر افسوس ہوگا کہ ہماری خودغرضی اور نفس پروری نے ہماری کیا حالت کردی +

کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ جس گھر میں عورت کی عزت ہوتی ہے وہاں خدا بھی مہربان ہوتا ہے۔

ہندوستان کی سیر کرنے والا اپنے سفر میں اس مقولہ کو ہر قدم پر یاد کرے گا وہ خواہ شہر میں آرام کر رہا ہو یا ریل کی کھڑکیوں میں سے کھیتوں کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے دل میں سب سے پہلے یہی خیال پیدا ہوگا۔ کیونکہ وہ اس مقولہ کی صداقت کا پتہ ہر جگہ سے پائے گا اور دیکھے گا کہ ہندوستان میں عورتیں کیسی حقیر ہیں اور انکی عزت جوتی کے برابر بھی نہیں ہے جوں جوں وہ لوگوں کے حالات کا زیادہ مطالعہ کرے گا وہ یکہیگا کہ اس شاداب زمین پر کچھ قدرت کی ناخوشی ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ ہندوستان خوبصورت ہے مگر مغموم اسمیں چمک دمک ہے مگر جذبات مفقود۔ ہندوستان میں جس عورت کی عزت کی جاتی ہے وہ صرف گائے ہے مرد بادشاہ ہے لڑکا ولیعہد اور عورت انکی غلام وہ دنیا میں اس غرض سے نہیں آئی ہے کہ زندگی کی خوشیوں اور رنجوں میں شریک ہو بلکہ اپنے آقا کی وفادارانہ خدمات انجام دینے کے واسطے۔ اسکا فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کا کھانا پکائے مگر خود ہرگز نہ کھائے۔ جب تک کہ اسکا آقا اور آقا کے لڑکے نہ کھالیں وہ اس کے ساتھ گاؤں میں جائے مگر اس کے برابر ہرگز نہ چلے وہ شوہر بوجھ ڈھوئے مگر اسکا ہاتھ ہرگز نہ پکڑے ایسی کوئی مثال کہ کسی مرد یا عورت کو ہمشاش بشاش برابر کی حیثیت سے سڑک پر پھرتے ہوئے دیکھا ہو میری نظر سے نہیں گذری ایسی کوئی مثال کہ تمام خاندان ایک دسترخوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہو۔ میں نے چار ہزار میل کے سفر میں بھی نہ دیکھی اور جو ہندوستان سے

واقف ہے یہی کہے گا کہ میری آنکھیں ایسا سماں کبھی نہ دیکھیں گی۔ ہاں میں نے سخت گرمی میں دوپہر کے وقت جلتی ہوئی دھوپ میں عورتوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا میں نے انکو کھیتوں میں اناج کاٹتے ہوئے اور شہروں میں سڑک کوٹتے ہوئے بارہا دیکھا میں نے انکو صبح کے وقت سر پر بوجھ رکھے ہوئے اونٹوں کی قطار کی طرح نکلتے ہوئے اکثر دیکھا اور میں نے ہر ضعیف عورت کی آنکھ میں جسکو میں نے دیکھا تکلیف افلاس اور رنج کے آثار پائے تمام ملک میں ایک بڑھیا کو خوش نہ دیکھا ہندوستان کی اشیا میں سے سب سے زیادہ مغموم چیز عورت کا بڑھاپا ہے۔ جہاں وہ چالیس برس کی عمر میں بڑھیا سمجھی جانے لگتی ہے یورپ میں ہر شخص اس عمر کی عورتوں کو نہایت خوش اپنے زندگی سے مطمئن دیکھے گا۔ اور ایک ایسی قسم کی تمکنت پائے گا جسکی لڑکپن اور جوانی دونو عزت کریں گے لیکن ہندوستانی بڑھیا کی آنکھ کے واسطے کسی شارح یا مترجم کی ضرورت نہیں ہے اسکی آنکھ خود ہی یہ کہے گی کہ میں کیسی بدنصیب ہوں اتنک اس سخت دنیا میں زندہ ہوں میں اتنک اس گرم سورج میں رینگنے کو موجود ہوں اور اتنک مرد کی بے التفاتی دیکھنے کے لیے زندہ ہوں افسوس ہے اس عورت پر جس کے بال سفید ہوگئے جس کے چہرہ پر جھریاں پڑگئیں اور اسکو زندگی کا یہ نتیجہ ملا۔ اس بدنصیب بڑھیا عورت کی طرف دیکھو جس کے ہاتھ پاؤں خاک میں اٹ رہے ہیں کپڑے پھٹ گئے ہیں اور بدن کی ہڈیاں دکھلائی دے رہی ہیں اسکی آنکھوں میں پانی ہے اس کے اعضا میں درد ہے اور سفید بال کانوں سے لپٹے ہوئے ہیں اسنے تمام دن اپنا فرض انجام دیا ہے لیکن اس وقت اس کی کیا وقعت ہوگی کوئی بچہ مؤدبانہ اسکی طرف نہ دوڑے گا اور نہ کوئی عزیز اس کے تفکرات میں مددگار ہوگا۔ یہ شام کے وقت لیٹ جائیگی اور اسکے تفکرات اسکے ساتھ ہونگے

ہندوستان میں عورت کی تقدیر کا یہ حشر ہے کہ شاید عالم شیر خوارگی میں وہ فضائے آسمانی کو دیکھکر خوش ہولیتی ہو یا ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کا لطف اُٹھالیتی ہو لیکن جب وہ ماں کی گود سے اتر کر چلنے کے قابل ہوئی تو وہ وقت آجاتا ہے۔ جب ہندوستان کا تمدن بیٹے اور بیٹیوں میں ایک قسم کی تفریق کردے اور اسوقت گویہ بیٹیاں تو انہی ماں باپوں کی ہوتی ہیں۔ جنکے بیٹے مگر زیادہ تر یہ بہن ہونے کی حیثیت سے بھائیوں کا کھلونا ہوتی ہیں اور اسوقت سے بیوی ہونے تک انکو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ انکا درجہ بنی نوع انسان میں نہایت کم ہے ماں ہوجانا کبھی کسی عورت کے واسطے کوئی برکت نہیں ہے اور نہ اسکی محنت میں کمی کرسکتا ہے۔ وہ ملازم ہے مگر بلا تنخواہ اور ایسی ملازم کہ اسکو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اس نوکری کو چھوڑکر دوسری نوکری کرلے۔ اس کے سامنے دوامی غلامی ہے اور اگر قدرت اس سے اتنی ناخوش ہے کہ وہ بڑھاپے تک زندہ رہے گی تو اسکا نوشتۂ تقدیر مایوسی رنج والم اور تفکرات کا ساتھ ہے میں نے عورت پر افسوس کے معنی اسوقت تک نہ سمجھے جب تک کہ میں نے ایشیائی آسمان کے نیچے عورت کو نہ دیکھا۔

طبقۂ اعلیٰ میں عورتوں کی حالت گو ایسی نہو مگر وہ بھی اپنے شوہروں کی قیدیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں گو وہ کھانا پکانے یا شوہر کی خدمت کے سوا کوئی خاص محنت نہیں کرتیں لیکن وہ دنیوی خوشیوں سے بالکل اسیطرح محروم کردی گئیں جسطرح گرجا کی نننیں انکو بعض حالتوں میں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ شوہروں کے مردِ رشتہ دار کون کون ہیں وہ ان جانوروں سے جو کھلاڑیاں کرنے کے واسطے پنجروں میں قید کیے جاتے ہیں کچھ ہی زیادہ وقعت رکھتی ہیں۔

یہ ہے عورتوں کے ساتھ پیش آنے کا طریقہ جو مردوں نے اختیار کر رکھا ہے اور یہ ہے وہ طریقہ جس کے ساتھ ہندوستان گرتا پڑتا ترقی کر رہا ہے جب عیسائیت نے عورت کو مرد کا محبوب ساتھی بنا دیا تو یورپ نے تہذیب کو جگایا اور لفظ ماکو انسانیت نے اعلیٰ مدارج عطا کروا دیئے۔ یقیناً مشرق مغرب کی طرح اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک عورت کی عزت نہ کرے اور جب تک کہ مشرقی مرد کے دلمیں عورت کی واقعی عزت ہو اور وہ اسکی وقعت کو پہچانے۔ اسوقت تین ملک ہیں جہاں عورت کی عزت کیجا رہی ہے اور جہاں ماں کی اتنی عزت کی جا رہی ہے جتنی کسی حکم مذہب کی۔ جرمن امریکہ اور برطانیہ کلاں ؛

کیا ترقی کرے گا وہ ملک اور وہ قوم جسکی مائیں قیدی کیطرح زندگی بسر کر رہی ہوں خوشی نصیب ہے وہ قوم جسمیں بہت سے خوش گھر ہوں اور روزمرہ زندگی اطمینان سے بسر ہو رہی ہو اور جہاں عورت کی واقعی عزت ہو اور جہاں ماں ہونا قدرت کی ایک بڑی نعمت سمجھی جائے۔

لیکن جہاں عورت غلام ہے یا جہاں وہ بالکل ایک کھلونا ہے وہاں خوشی یا پورا اطمینان کبھی نصیب نہ ہوگا۔ نظام قدرت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسانی ترقی صرف ماؤں کے ہاتھ میں ہے ؛

ترجمہ

حسن تخیل

یہ دو تصویریں جو زیب ورق اول ہیں ایک انگریزی تصویر کی صناعی کا نمونہ ہیں جسمیں مختلف کیفیت انسانی کا اظہار ہے۔ کائنات کی بہترین شے انسان کے مطالعہ کا یہ پہلا سبق ہے کہ کسطرح واقعات زندگی سے قلب متاثر ہو کر حالت ظاہری میں تغیر پیدا کر دیتا ہے پہلی تصویر جو حسن کے نام سے پیش کیگئی ہے ایک خاص ملک اور قوم کا مذاق ہے لیکن یہ ہی عورت جو اسوقت کسی خاص کیفیت میں مصروف یا حالت سے متاثر نہیں ہے تخیل میں گھر کر ایک اور ہی صورت میں نظر آ رہی ہے امید ہے کہ قابل مصور کا یہ سلسلہ جسمیں تخیل مطالعہ خوشی بخشے امید کی وہ تصویریں ہیں جو انسانی تمدن کا جزو لاینفک ہے دقت سے دیکھا جائیگا ؛

عصرِ جدید

وہ پچھلے دور بدلے اور وہ اندازِ جہاں بدلا
ورق الٹا زمانہ کا طریق آسماں بدلا

طبیعت میں زمانے کی تغیر ہو گیا پیدا
زمیں بدلی فلک بدلا مکیں بدلے مکاں بدلا

سند بدلی فضیلت کی ہوئیں اب ڈگریاں قائم
نئے اسکول نکلے اور وہ طرزِ امتحاں بدلا

نیا طرزِ تمدن ہے نئی باتیں ہیں دنیا کی
نئی لفظیں[1] ہوئیں ایجاد انداز زباں بدلا

نئی صورت سے اب ہونے لگی میت کی آرائش
نیا ماتم ہوا ایجاد طرزِ نوحہ خواں بدلا

طلائی ہیکلیں ہیں اور نہ وہ مسند کے طوق اب ہیں
وہ وضعِ مشرقی بدلی وہ اندازِ بتاں بدلا

نئی تہذیب ہے اخلاقِ نو کا دور دورہ ہے
وہ طبعِ میزباں بدلی مزاجِ میہماں بدلا

نہ وہ شوخی نہ وہ سیرت نہ وہ اگلی سی آرائش
وہ شانِ حسن بدلی اور مزاجِ گلرخاں بدلا

کمی ہو جائیگی اب تو تمھاری جوشِ سودا میں
مبارک ہو کہ رنگِ گیسوئے عنبر فشاں بدلا

حقیقت کو تری حدِ نظر دنیا سمجھتی ہے۔
مرے نالے بھلا کیا تجھ سے لینگے آسماں بدلا

عزیز اب مجلسِ گیتی سے ہو کیا خاک دلچسپی
وہ اگلی صحبتیں بدلیں وہ دنیا کا سماں بدلا

میرزا محمد ہادی عزیز

رُباعی

نالہ سے میرے کسکو نہ کچھ جوش ہوا
نغمہ میرا کس کا نہ در گوش ہوا

تھی آہ میں میری بیخودی کچھ ایسی
جسنے اسے سُن لیا وہ بیہوش ہوا

[1] دلی والے لفظ کو مذکر کہتے ہیں اور جمع نہیں استعمال کرتے۔

ہر زمانے کے مؤرخ

(اُنکی فرگذاشت۔ اور روایتی تمثیلوں سے اس امر کا ثبوت)

چونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو مختلف الطبائع پیدا کیا ہے پس اگر وہ مختلف الرائے بھی ہو تو یہ اُس کا قصور نہیں ✣

جسوقت کوئی مؤرخ تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو گو اُس کا ارادہ یہی ہوتا ہے کہ میں اپنے زمانہ کے تمام واقعات صحیح صحیح قلمبند کرونگا۔ اور جہانتک بنے گا ادنےٰ سی ادنےٰ واقع کو بھی نہیں چھوڑونگا۔ مگر اُس کی طبیعت کا رجحان۔ اُس کے دل کا میلان اُسے اس ارادے میں پورا نہیں اُترنے دیتا۔

کوئی مؤرخ صرف بڑے بڑے واقعات کو لیتا ہے۔ کوئی تمدنی حالات پر گرتا ہے کوئی اخلاقی اوصاف پر جھکتا ہے۔ کوئی عقائد پر زور دیتا ہے۔ کوئی مذہبی امور پر بحث کرتا ہے۔ کوئی صرف انتظام کو لیتا ہے۔ کوئی فقط انصاف کی داد دیتا ہے۔ کوئی بادشاہِ وقت کے ذاتی واقعات پر جھک پڑتا ہے لیکن ایسی باتوں کو کوئی مورخ نہیں لیتا جن سے اُس کی تاریخ آسمانی کتاب سمجھی جائے اور آیندہ نسلوں کے واسطے عبرت و نصائح کا مجموعہ بنجائے۔ کیونکہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور فطرت کیا ہے ایک صحیفۂ قدرت ہے۔

مورخ وہی ہے جو بے لاگ ہر ایک بات پر غائر نظر ڈالتا چلا جائے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ بادشاہِ وقت کا ڈر۔ خوف۔ رعب۔ اُسے تختِ موجودہ کے برخلاف لکھنے سے روکتا ہے۔ مگر جن کو خدا تعالیٰ نے خاص ایسے کاموں کا مادّہ دیا ہے وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھ ہی جاتے ہیں۔ خافی خاں نے خفیہ نویسی میں نام

پایا اور باوجود ممانعتِ شاہی خفیہ خفیہ تاریخ لکھ ڈالی۔ نعمت خاں عالی بھی اپنی فطرت سے باز نہ آیا۔ یہ دونوں عالمگیری مورخ ہیں۔ مگر انہوں نے بھی بعض باتوں کو اور نے بعض کو فضول و بیکار سمجھ کر چھوڑ ہی دیا۔ بلکہ اور زمانوں میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ عوام الناس کے حالات اور واقعات کو سب نے قلم انداز کر دیا ہے جس بات کی دُھن باندھی ہے۔ اُسی پر زور دیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی باوجیکہ اکبر کا امام اور ابتدائی زمانہ میں اُس کا یہانتک مدّاح تھا کہ تاریخ کشمیر کے دیباچہ کو اُسکی خیر خواہی اور مدح سرائی سے بھر دیا مگر اخیر کو جو دشمنی پر کمر باندھی تو دہریہ لامذہب اور خدا جانے کیا کیا لکھ گیا۔ اپنی تاریخ میں فتوحات کی تفصیل تو چھوڑ دی مگر ذاتیات اور اندرونی راز یا مخالفوں کی خبر لینے پر اُتر آیا۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہی باتیں لکھیں جن سے اکبر کی بُرائی اور اُس کا دہریہ پن ثابت ہو۔ عبدالقادر پر یہ بڑا بھاری الزام ہے کہ اس نے ضروری واقعات کو قلم انداز کر دیا ہے۔

تاریخ تیموریہ کا ایک دمشقی ہمعصر مسمے ابن شہاب انصاری جو اُس کی برائیوں پر گرا تو واقعات و فتوحات عراق و عرب کو سوا تاسر ظلم اور تیمور کو اپنے مزدیک غاصب و ظالم اور بد دین ثابت کر کے رہا لیکن زمانہ ایک عجیب اور سچا واقع نگار ہے۔ یہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ جو کچھ لکھا پڑھا جائے وہی تو درست ہو اور قائم و برقرار رہ جائے۔ باقی حالات دب کر زمین کا پیوند ہو جائیں۔ وہ مورخوں کا کام زبانی روایتوں۔ اُسوقت کی نظموں۔ اُسوقت کے گیتوں۔ اُس وقت کی زبان۔ اُس وقت کے دوہوں۔ اُس وقت کے مذاق۔ اُس وقت کے خیالات اور ضرب الامثال سے لے ہی لیتا ہے کرشن جی کی بہت سی لیلائیں کتابوں یا تاریخوں میں نہیں پائی جاتیں مگر اُن کی صداقت اُس زمانہ کا برتاؤ۔ اُس زمانہ کا رسم و رواج اور مذاق برابر

کر رہا ہے سینکڑوں باتیں نہایت سچی اور ایسی ہیں کہ وہ سینہ بسینہ یا خاندان خاندان چلی آتی ہیں +

کوئی نہیں جانتا کہ بابر و ہمایوں کے رفیق۔ اکبر خاں بابا اور اتالیق بلکہ سپہ سالار جان نثار دلی خیر خواہ بہرام خاں کا مزار کہاں ہے۔ مآثر الامرا۔ تاریخ بدایونی سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی بغاوت سے پشیمان ہو کر بادشاہ سے معافی حاصل کی۔ بادشاہ نے اسے اختیار دیا کہ چاہے چندیری کی جاگیر لے کر وہاں راج کرے چاہے میری مصاحبت میں رہے۔ چاہے بیت اللہ کے حج کو چلا جائے مگر اس نے تارک الدنیا ہونا اور زیارت متبرکہ کعبہ کو جانا پسند کیا۔ حاجی محمد خاں سیستانی جو بہرام خاں کا جانی دوست تھا حسب ارشاد بادشاہ جم جاہ حفاظت جان و مال اور آسائش راہ کیواسطے مع فوج اسکے ہمراہ ہوا۔ بخیریت گجرات پہنچا حاکم گجرات موسیٰ خاں فولادی نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ لیکن کینہ توز مبارک خاں لوہانی ملاقات کے بہانے سے بہرام خاں کے پاس آیا۔ جونہیں مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ کم بخت نے ایسا خنجر مارا کہ سینہ کے پار ہو گیا۔ ایک اور ظالم نے سر پر تلوار کا وار کر کے رہا سہا کام تمام کر دیا۔ باعث دشمنی یہ بتایا کہ ماچھی واڑے کی لڑائی میں ہمارا باپ اسکی سپہ سالاری کے وقت میں مارا گیا تھا ہم نے وہ بدلہ لیا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے واقعات ماہم انگہ اور اسکے بیٹے شمس الدین کوکہ کی سازش کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ "شہید شد محمد بہرام" ۹۶۳ تاریخ نکلی سرو قد اس شہید بے گناہ کی نعش شیخ حسام الدین کے مقبرے میں سونپی گئی اور بعد میں دہلی آئی لیکن یہ کوئی نہیں لکھتا کہ دہلی میں آکر کس جگہ دفن ہوئی۔ البتہ آثار عرائع اور چلتا ہے کہ حسین قلی خاں جہاں ۹۸۵ھ میں یہاں سے مشہد لے گئے۔ مگر اس زمانہ کی سینہ بسینہ روایتیں۔ پٹواریوں کی کھیوٹ یا کھتونی اور بندوبست کی لال کتاب

نیز مالکانِ زمین کا قبضہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ نعش وہاں سے لاکر اُس کے آقائے قدیم ہمایوں بادشاہ کے قرب و جوار اور اُن کے محسن عیسیٰ خاں حجاب شیر شاہی و سلیم شاہی سپہ سالار کے مقبرے کے جانبِ غرب صرف ایک دیوار بیچ فاصلہ پر رکھی گئی جسکا ٹوٹا پھوٹا چبوترہ اب تک موجود ہے اور اُس سرزمین کا نام بھی اسی وجہ سے بیرم[1] ہے۔ جس زمانہ میں شیر شاہ نے بیرم خاں کو گرفتار کر لیا تھا تو عبدالوہاب رئیس سنبھل نے عیسےٰ خاں کو بیچ میں ڈال کر ان کی جان بخشی کرائی تھی۔ اس کے علاوہ ہمایوں بادشاہ کی ملکہ نواب حمیدہ بانو مریم مکانی کی قبر بھی ہمایوں کے برج میں ہی واقع ہے جنھیں بہرام خاں کی وفاداریوں اور جانفشانیوں کے سبب اُس کی زندگی میں اسکی بہت سی قدر تھی۔ پس ان وجوہ سے اسکا یہاں دفن ہونا قابل وثوق ہے۔ جس زمین کا نام بیرم ہے وہ ابتک عرب سرائے کے عربوں باعبود قبیلہ کے قبضہ میں ہے۔ یہ عرب وہی ہیں جن کو نواب حمیدہ بانو بیگم معروف بہ نواب حاجی بیگم صاحبہ والدہ جلال الدین اکبر نے اپنے پیارے خاوند ہمایوں بادشاہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے واسطے عرب جا کر حضرموت واقع صوبہ یمن کے زہاد و عبّاد کو باجازتِ سلطان روم ۱۴ سنہ جلوس اکبری مطابق ۹۴۹ھ ہجری میں ساتھ لائیں اور ہمایوں کے مدفن کے پاس بسا کر اُسجگہ کا نام عرب سرائے رکھا۔ وہیں ۹۶۹ھ ہجری میں ہمایوں کا مقبرہ بنا۔ ان میں سقاف۔ باعبود۔ باکثیر۔ باحسن جمل اللیل۔ باطہ۔ بالتور بالنّداویز قبیلوں کے عرب تھے جن کی یادگار مولوی سیّد عبداللہ صاحب بالفقیہ ہمارے ماموں مع شجرۂ

[1] بیرم ترکی زبان میں عید و جشن کے معنی میں آتا ہے۔ اور اسی وجہ سے بہرام خاں نے اپنا تخلص بھی بیرم رکھا تھا۔ اس مناسبت سے بیرم ایک اچھا اور بامعنی لفظ قایم رہا۔ غالباً اسی زمانہ میں یہ نام پڑا۔ اور صحت کے ساتھ پڑا۔

قدیم جو اُن کے ہمراہ آیا تھا اب تک زندہ و سلامت مستغرق الی اللہ موجود ہیں +

عبدالرحیم خان خاناں بیرام خاں کے خلف الصدق کا مقبرہ بھی جانب جنوب کوئی دو تیر کے فاصلہ پر اب تک قایم اور اوسکی تمام زمین خان خاناں کے نام سے موسوم ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جو ہم کو اُس قبر کا نشان بتایا وہ بالکل درست ہے جس موضع کے یہ زمین متعلق ہے اُس کا نام غیاث پور ہے یہ عجیب بات ہے کہ جسطرح حیات میں عیسےٰ خاں نے انکا ساتھ دیا تھا اسیطرح بیرام خاں ممات میں بھی اس احسان کے شکریہ میں اُنہیں کے زیر سایہ آکر آسودہ ہوئے عیسےٰ خاں کے کوٹھہ کی دیوار کے نیچے ہی جو احاطۂ مقبرہ کی چار دیواری ہے وہیں بیرم خاں کا مدفن واقع ہے +

اسی ضمن میں ایک اور مشہور روایت ملاحظہ فرمایئے جسکا تاریخوں میں ذکر نہیں۔ مگر بالکل ٹھیک اور واقعہ کے مطابق ہے فیضی نے ایک خواب گھڑا کہ اکبر بادشاہ کو پیغمبری ملی اور ایک جدید قرآن ہی نازل ہوا جو فلاں درخت کی کہوہ سے نکلے گا اور یہ شعر زبان پر لایا ؎

شکر صد شکر کہ خیر البشرے پیدا شد یک نبی رفت و بجایش دگرے پیدا شد

ان کے مخالف مُلّا عبدالقادر بدایونی کو بھی خبر لگی اور یہ شعر اُن کے کانوں تک پہنچا۔ چونکہ مُلّا اپنے مذہب کے پکے اور بڑے کٹے تھے اُنہوں نے جھٹ اس شعر کے جواب میں دوسرا شعر کہہ مشہور کر دیا ؎

حیف صد حیف کہ شر البشرے پیدا شد یعنی در دین نبی رخنہ گرے پیدا شد

چونکہ اس میں بادشاہ وقت کی سخت گستاخی تھی لوگوں نے دبو دبو کر دیا۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ زبانوں پر تو سہی مگر دلوں میں۔ گھر گھر یہ بات جا بجا پکڑ گئی اور دینداروں نے بے نقط سنانی شروع کیں اور فیضی بھی

دم کرے رہا اور اس بات کو گھٹنوں نہ چلنے دیا۔ البتہ تفسیر سواطع الالہام بے نقط لکھ کر اس اعتراض کو مٹا دیا اور جو کچھ قصور ہوا تھا اُسے دبا دیا۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے تو وہ روایتیں۔ حکایتیں یا کہاوتیں جو یکساں حالت میں نہ بانزد خاص و عام ہوں کسی حالت میں بھی اپنا وثوق اور اعتبار گھٹانے کے قابل نہیں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قطب الدین ایبک وہی شخص ہے جس نے اسلامی حکومت کا ہند میں مستقل جھنڈا گاڑا مگر اسکی سخاوت اور دان و تاری نے ہندوؤں تک کے دلوں کو تعصب سے آشنا نہونے دیا۔ مسلمانوں نے اُسے لکھ بخش کا خطاب دیا تو ہندو لکھ داتا کہنے لگے۔ بخی کی بجائے پیر مانا گیا اور اُس کے نام کے چھجے ہر ایک مُراد بر آنے کیواسطے قائم ہوئے چھجے میں کیا ہوتا ہے؟ ڈھول بجتا ہے۔ پہلوان جمع ہوتے ہیں کشتیاں لڑی جاتی ہیں اور لکھ داتا کے نام کا چڑھاوا بطور انعام و اکرام ان لوگوں کو دیا جاتا ہے اور تو اور ہمنے شملے کے ہندو پہاڑیوں تک میں لکھ داتا کے نام کی چھنج کا تماشا دیکھا اور اُن کی اس خوش اعتقادی کو سراہا کہ چھ سو برس کے قریب قطب الدین ایبک کو دنیا سے رخصت ہوئے گزر گئے مگر اُسکی داد و دہش اب تک اُس کے نام کو زندہ و سلامت ثابت کر رہی ہے۔ جلال الدین اکبر کے زمانے تک یہ بات تھی کہ جو شخص بہت بڑھ کی دریا دلی دکھاتا تو اُسے قطب الدین ثانی کہتے۔

نواب عبدالکریم خان خانساماں کی فیاضیاں۔ رحم دلیاں۔ قدردانیاں تو کتابوں میں بعض جگہ دیکھی ہونگی مگر اُس کے وقت کی ضرب المثلیں جو اُس کے واقعات اور حالات کا سین پیش کر رہی ہیں ان پر مورخوں نے بہت کم نظر ڈالی ہے۔ بعض باتوں کو خلافِ عقل بعض کو خوشامد بعض کو خلافِ تہذیب سمجھ کر چھوڑ دیا۔ مگر یہ نہ جانا کہ دل کے بھیدی اس راز کو حسنِ عقیدت سے ظاہر کیے

بغیر نہ رہیں گے چنانچہ ہم تمثیلاً چند حکایتیں جو تاریخوں میں شاذ و نادر پائی جائینگی اس جگہ نقل کرتے ہیں جس سے اُس زمانہ کی تاریخ میں جو کمی ہے وہ پوری ہو سکتی ہے بشرطیکہ کوئی مؤرخ ان روایتوں کو بہم پہنچا کر ایک جگہ جمع کر دے۔ ان سے اُس زمانہ کا رنگ ڈھنگ ہی معلوم نہیں ہوتا بلکہ بادشاہ و ارکین سلطنت کی طبیعتیں۔ بدظنیوں کی سدِ راہ قباتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں جو بدگویوں چغل خوروں بدگمانوں فتنہ پردازوں کا ذرا شاہی دربار دں میں گزر نہیں ہونے دیتی تھیں۔

ایک مشہور مثل چلی آتی ہے کہ نواب خانخاناں جن کے کھانے میں بطانہ جس سے خانخاناں کی شریف پروری اور انسانی ہمدردی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے جسطرح اگلے زمانے کے بادشاہ گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پھر کر رعایا کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ اسیطرح نواب خانخاناں آفت زدہ مصیبت رسیدہ خاندانیوں کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بگڑی بنایا کرتا تھا۔ جہاں اُسے خبر لگی کہ فلاں محلہ میں فلاں شریف زادہ یا کوئی غریب زادہ نان شبینہ سے محتاج ہے یہ اُسی کی دعوت کر دیتا۔ زردے۔ پلاؤ۔ بریانی کی قابیں بھروا تا۔ اُن کے اندر مٹھیاں بھر بھر اپنے ہاتھ سے اشرفیاں رکھتا اور بے معلوم کرکے صرف کھانے کے بہانے سے بھیجدیتا۔ چونکہ بطانہ پگڑی کے نیچے کا وہ کپڑا ہوتا ہے جسے رکھکر اوپر سے پگڑی باندھا کرتے ہیں لسوجہ سے یہ لفظ مثل میں لایا گیا تھا لیکن کثرت آشنا لوگوں نے اسے بتانا۔ یا بتلانا کر لیا۔

ایک اور کہاوت ہے کہ "کہاں دیں نواب خان خاناں۔ اُڑاویں میاں فہیم" فہیم انکا ایک دست گرفتہ لے پالک راجپوت زادہ تھا۔ جسے علمی و اخلاقی تعلیم دیکر خانخاناں نے اپنا دارو غہ بنا لیا تھا۔ میاں فہیم سانک حلال۔ وفادار تہجد گزار پکا مسلمان اور دیندار آدمی جس نے اپنے آقا پر اپنی جان تک نثار کر دی بہت کم سنی گئی

آیا ہوگا فہیم کی قبر۔ خانخاناں کے گنبد کے جانب غرب ایک چھوٹے سے گنبد میں بنی ہوئی ہے۔ ہم بچپن میں گنواروں تک سے سُنا کرتے تھے کہ فہیم کے گمٹ میں کوئی ہمارے لوارے گھیر کر بند کر گیا۔ کوئی کمہار کہتا ہوا آتا تھا کہ فہیم کے گمٹ کے پاس سے گدھے گھیر کر لایا ہوں۔ مؤرخ ماثر الامرا نے غلطی سے نیلا گنبد اُس کا مدفن لکھا ہے حالانکہ سر سیّد نے بھی آثار الصنادید میں نیلے گنبد کو فہیم کا مرقد قرار نہیں دیا صرف اِتنا لکھا کہ شاہی حجام کا گنبد مشہور کرتے ہیں ورنہ سیّد جیسا وسیع معلومات والا ضرور اسکو بھی اسیطرح جتاتا جسطرح دیگر مقامات اور مدفنوں کو کتبِ تواریخ سے ثابت کرتا چلا گیا ہے۔ چونکہ ہم نے وہاں پرورش پائی اور چپہ چپہ زمین پر ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے قدم پہنچے۔ بڑے بوڑھوں کی زبان سے اُس مقبرے کے مدفنوں کا نام سُنا۔ بار بار وہاں جا کر کھیلے۔ لڑکوں کی پلٹنیں بنا کر لڑے اور اُس بُرج میں چھپے ہم کیونکر یقین کریں کہ نیلا گنبد فہیم کا مدفن ہے۔ یہ صرف گھڑت ہے۔ اور کسی تاریخ کسی ثقات سے یا تک سر سیّد کی تحقیقات سے بھی اس نیلے گنبد کا پتا نہ چلا یہ نیلا گنبد کہاں اور فہیم کا مقبرہ کہاں۔ یہ تو اپنے آقا کے احاطہ میں رکھا گیا اور آقا کی عنایت سے اُس شہید وفا کا تابوت یہاں لایا گیا +

اس کہاوت نے میاں فہیم اور نواب خانخاناں کو آبِ حیات کا لطف دکھا رکھا ہے ہم اسے صحیح تاریخ نہ مانیں تو کس دلیل سے نہ مانیں فہیم کے ہاتھ سارا خرچ تھا۔ آقا کا حکم بے کم و کاست بجا لاتا۔ اُسے کریم الطبع۔ کریم النفس دیکھ کر آپ بھی سخی کہلانے کا وسیلہ ڈھونڈھتا۔ اور اپنی ذاتی آمدنی اپنے آقائے نامدار کی طرح خود بھی لُٹا دیتا تھا۔

خانخاناں کی فیاضی کے متعلق دو اور بھی عجیب حکایتیں مشہور ہیں جنہیں کسی مؤرخ یا تذکرہ نویس نے بھی نہیں لکھا۔ مگر ہم کو خلافِ عقل بھی ہوں اُنہیں لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اکثر باتیں جو فی زمانہ ہمیں خلافِ عقل اور ڈھکوسلا معلوم ہوتی ہیں

وہ اب محققوں کی نظروں میں از روئے تجربہ صحیح ثابت ہوتی چلی جاتی ہیں۔ گٹکا
ان حکایتوں میں ایک حکایت تو یہ ہے کہ کسی جوگی کا بالکا جو پورے منہ میں گٹکا
رکھ کر اڑتا اور جمنا جی سے جل بھر کر اپنے گرد کو جادیا کرتا تھا۔ شب کے وقت جو نواب خانخاناں
کے محل کی چھت سے گزر ہوا۔ تو صاف ستھرا کسکا یا پلنگ بچھا ہوا دیکھکر وہیں آرام
کی ٹھیرائی۔ لیٹا ہی تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں خانخاناں اوپر آئے دیکھا کہ منہ سے
گٹکا نکلا پڑا ہے اور ایک شخص جوگیا لباس پہنے پڑا سوتا ہے۔ انہوں نے وہ گٹکا تو اٹھا
لیا اور آپ نیچے آکر دوسری جگہ سو رہے۔ دفعتہً جو بالکے جی کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نہ
گٹکا ہے نہ اصلی مقام ہے۔ بہت سٹ پٹائے۔ خانخاناں نے اُسے بُلایا اور کہا کہ جوگی
جی گھبراتے کیوں ہو۔ اپنا گٹکا لو اور گرو جی کے پاس پہنچو۔ گٹکا ایک قسم کی طلسماتی
گولی سیماب یا اسٹ دھات کی آمیزش سے بنائی جاتی اور اُس میں ایسی برقی قوت
پیدا کی جاتی تھی کہ جس کے زور سے آدمی قوت پرواز بہم پہنچا کر اُڑ جاتا تھا جس طرح
اُڑن کھٹولے کا پہلے یقین نہ آتا تھا اور اب ہوائی جہاز اور ہوائی پرواز نے اُسے
ثابت کر دیا۔ اسیطرح کوئی دن جاتا ہے کہ گٹکے کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ جس حالت میں
ٹریموے ایک پتلے سے تار کی قوت سے بڑا بھاری بوجھ لے کر دوڑتی ہے۔ کیا عجب ہے
کہ اسی طرح گٹکے میں بھی ایسی قوت پیدا کر دیجاتی ہو۔ بہرحال اس کی بھی کچھ نہ کچھ
اصل ضرور ہے جو شعرا تک نے مثالاً اپنے اشعار میں باندھا ہے۔ ذوق ؎
جاں ہوا یوں ہوئی اُس خال کا بوسہ لیکر ذوق جیسے اُڑ جائے ہن میں کوئی گٹکا لیکر
یا گر عشق نے سنہ میں دل بیتاب کا گٹکا افشا تو جوگی جی دھرا رہ جائیگا سیماب کا گٹکا
علے ہذا۔ عروس نوازی۔ جسکا قصہ اسطرح مشہور ہے کہ نواب خانخاناں نے کسی دلپسند
جگہ اپنی شادی کا پیغام دیا تھا دُلہن والے ان سے راضی ہو گئے تھے مگر اُسی جگہ
کسی اور کا بھی دل تھا۔ اگرچہ وہ غریب تھا لیکن کیا کرے دل اسی جگہ آیا ہوا تھا۔

لیکن دارثانِ عروس نے انکار کر دیا تھا وہ یہ خبر سنکر خانخاناں کے پاس پہنچا خانخاناں وہاں شادی کرنے سے باز رہا۔ اور جس دولت کیوجہ سے وہ خانخاناں کو پسند کرتے تھے اس غریب کو مالا مال اور نہال کرکے دلہن کے والدین کو راضی کر دیا۔ اس قصہ کو ہمنے نہایت مختصر کرکے لکھا ہے باقی باتیں مآثر الامرا وغیرہ میں بالتفصیل ملتی ہیں نیز منگیتر کو چھوڑنا اسی عالی حوصلہ کا کام تھا جس نے اس کہاوت کو رد کر دیا "بیاہی چھوڑی جاتی ہے منگیتر نہیں چھوڑی جاتی"

اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ جب کسی شخص کو اخلاق شجاعت یا سخاوت وغیرہ میں اعلیٰ درجہ کا ثابت کرنا چاہتے ہیں تو وہ دیگر خلیق شجاع۔ اور سخی لوگوں کی صفتیں بھی اس کے نام میں شریک کر دیا کرتے ہیں جیسے راجہ بھوج۔ اور راجہ بکرماجیت کے ذکر میں اس قسم کی تعریفیں جمع کر دی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک نہ ایک وصف یا نقص ہونے پر متصف کو بڑھایا خواہ گھٹایا جاتا ہے بے اصل کوئی بات نہیں ہوتی +

اسیطرح ایک اور مثل مشہور ہے کہ جدہر مولا اُدھر آصف الدولہ۔ یعنے جیسے خدائے تعالیٰ کو دینا منظور ہوتا ہے آصف الدولہ سا دریا دل۔ غریب نواز بھی اسی کو دیتا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آصف الدولہ اپنے وقت کا حاتم صفت نواب تھا

اور سینئے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" یہ کہاوت کس منہ سے راجہ رامچندر اور راون کے بھائی بھبھیکشن کے تاریخی واقعات کو ثابت کر رہی ہے۔ علیٰ ہذا "چام کے دام" نظام سقہ کی کیسی خیر خواہی۔ اور وفاداری دکھا رہی ہے "اور نگ زیب ہپوڑا" گولکنڈے کے اس دیرطلب محاصرے کو جسمیں اجتماع لشکر و اختلاف آب ہوا کے سبب اکثر لشکریوں کے خون میں سودائے غیر طبیعی کا مادہ غالب ہو کر ہپوڑی نکل آتی تھی کس عمدگی سے اس دیرینہ مواد کا اظہار کر رہا ہے +

پس اس تمام تمہید سے ثابت ہوگیا کہ جو تاریخی باتیں مؤرخ نہ لکھیں یا ضبط تحریر میں نہ آئی ہوں وہ اس قابل نہیں ہیں۔ کہ انہیں بے اعتبار محض گھڑت یا غلط سمجھا جائے راجپوتانہ کے۔ کاٹھیاواڑ کے۔ مالوے کے بہت سے خاندان ایسے ہیں کہ انکو اپنے بزرگوں کے نام اور ان کے حالات کی خبر یا تو بھاٹوں کے گیتوں سے ملی ہے یا اپنے بڑے بوڑھے پرکھاؤں سے اسیطرح عالمگیر کے زمانہ کی وہ مشہور روایتیں دو ہے۔ اور گیت وغیرہ ہیں جو دکن پر فوج کشی کرنے اور وہاں ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دینے کے متعلق زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان سے سپاہیوں کی فراق زدہ بیویوں کی گزارش اور عالمگیر کے جواب کی ایک عجیب کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ بیوی کو اپنے خاوند کی جدائی کیسی شاق گزرتی ہے اور خاصکر ساکنان ہند میں کہ جہاں طلاق کا دستور ہے نہ خاوند کے چھوڑ دینے کا رواج۔ یہانتک کہ اگر چھوٹی عمر یا عین عالم شباب میں کوئی بیوہ ہوجاتی ہے تو اس کا بھی دوسرا نکاح جائز نہیں سمجھتے۔ ایسے ملک کی عورتوں کو کسقدر اپنے خاوندوں سے تعلق ہونا چاہیے ستی ہونے کی رسم اسی برہ کیوجہ سے نہایت خوشی اور استقلال کے ساتھ ہند کی دیویوں نے گوارا کی تھی۔ چنانچہ امیر خسرو دہلوی نے کس خوبصورتی سے اپنی دو ایک دوہنیں اس رسم کا اظہار کیا ہے۔ گو یہ رسم وحشیانہ ہے۔ ظالمانہ ہے۔ مگر ان کے

یک خاوند کی جدائی اس جلاپے سے بدرجہا بہتر اور ہیچ ہے کہ ہ فرماتے ہیں

ہ ہندو زنان کسے در عاشقی مردانہ نیست ۔۔۔ سوختن بر شمع و رقص پروانہ نیست

سر و اور عشق بازی کز ہندو زنان بیاموز ۔۔۔ کو بسوزد لیک ہرگز دل بیگانہ نیست

ندی یا رہ گئے ہیں اس کی عورتوں کے دل کا آئینہ ہیں۔ کوئی ہمجولیاں ایسی نہیں جو اپنے خاوند کی جدائی کو ایک مختصر کیا ہے ہیں اپنی ہوں۔ ہاں ایسا کیا کہ ہ اور کیتا تمام عمر کیواسطے اپنے خاوند کی کنیز ہے جاتی اور اس کی جدائی

دوہے کہا کرتی ہے ؎ دوہا نمبر ۱

پیتم تیں مت جانیو توہے بچھڑت موہے چین گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

یعنے۔ میرے پیارے خاوند یہ نہ جاننا کہ تمہارے بچھڑنے سے مجھے چین ہے۔ میں بن کی گیلی لکڑی کی طرح رات دن سلگتی رہتی ہوں ؎ دوہا نمبر ۲۔

سپنے میں موے پی ملے کر نہ سکی دو بات سوتی تہی روتی اٹھی ملت رہی دو ہاتھ

یعنے خواب میں میرے میاں مجھے ملے مگر دو باتیں بھی نہ کر سکی کہ آنکھ کھل گئی تو پڑی سوتی تہی روتی اٹھی اور دونوں ہاتھ ملتی رہ گئی ؎ دوہا نمبر ۳

ارے پپیہا کلسرے دیت کٹے پر نون پیو میرا میں پیو کی تو پیو کہے سو کون

یعنے ارے کل سرے پپیہے تو کیوں زخم پر نمک چھڑکتا ہے۔ پیا میرا ہے میں پیا کی ہوں تو پیا پیا کہنے والا کون ہوتا ہے ؎ دوہا نمبر ۴

کاجل ڈالوں کر کرا اور سرمہ دیا نہ جائے ان نینن میں پی بسے دوجا کون سمائے

یعنے آنکھوں میں کاجل لگاتی ہوں تو کر کرا معلوم ہوتا ہے اور جو سرمہ گھلاتی ہوں تو گھلایا نہیں جاتا سچ ہے جن آنکھڑیوں میں پیا بسے انہیں دوسرا کب سما سکتا ہے ؎ دوہا نمبر ۵۔

کاگا نین نکاس دوں جو پیا پاس لیجائے پہلے درشن دکھائیو پاچھے لیجو کھائے۔

یعنے۔ اے کاس ادھاری (گوشت خوار) کوے اگر تو بھوکا ہے تو میں اپنی دونوں آنکھیں نکالے دیتی ہوں انکو میرے پتی (خاوند) کے پاس لیجا۔ پہلے انکا دیدار دکھا۔ پھر شوق سے کھالے۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائینگے۔ تیرا پیٹ بھر جائیگا میری تسلی ہو جائیگی ؎ دوہا نمبر ۶

سائیں بسیں پہاڑ پر ہم جمنا کے تیر ابکا ملنا کٹھن ہے کہ پاؤں پڑی زنجیر

یعنے ساجن پہاڑ پر رہتے ہیں اور ہم دریائے جمنا کے پاس بڑے فاصلے پر بستے ہیں۔ ابکی دفعہ ملنا نہایت مشکل ہے کہ ادھر جمنا کی ادھر فاصلہ کی زنجیر ہمارے پاؤں میں پڑ گئی ہے۔ ؎ دوہا نمبر ۷۔

بانہ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے ہر دے میں سے جاؤ گے تو مر دبڑں گی تو ئے

یعنے میرے میاں گو تم مجھے کمزور اور بے بس سمجھکر اپنی بانہ جھٹک پردیس چلے ہو۔ مگر یہ مردانگی نہیں ہے۔ مردانگی تو جب ہے کہ تم میرے دل کے اندر سے نکل جاؤ کہیں جاؤ۔ رہو گے دل میں ۵

سوال دوہا نمبر ۸۔

بھونرا رے! پردیسیا میں پوچھت ہوں تو ئے سب تن تیرا سانولا مکھہ کیوں پیرا ہوئے

یعنے اے پردیسی بھونرے! میں تجھہ سے پوچھتی ہوں کہ تیرا تمام جسم تو سانولا ہے۔ مگر یہ تو بتا کہ منہ کیوں زرد ہے۔ ۵

جواب دوہا نمبر ۹۔

دکھیں کے مکھہ پیرے مرم نہ جانے کوئے جا مکھہ میں پیا بسے سو وہ مکھہ پیرا ہوئے

یعنے دکھیاروں کے منہ زرد ہی ہوا کرتے ہیں مگر اس رمز اور بھید کو کوئی نہیں پاتا کیونکہ جس منہ میں پیا بستا ہو وہ اسکی جدائی میں زرد ہی رہا کرتا ہے۔ ۵ دوہا نمبر ۱۰

لگا اساڑھ سہاونا گرجت ہے چہوں اور پی پی کرت پپیہا۔ راسو بولت دادر مور

یعنے اساڑھ کا مرغوب الطبع مہینا شروع ہوگیا چاروں طرف گھنگور گھٹا چھا کر گرجنے لگی۔ پپیہے نے پی پی کی راسو۔ مینڈک اور موروں نے جھنگارنے کی جھڑی لگادی مگر اتنیک میرا ہی خاوند نہ آیا۔

اور تو اور ان عورتوں کو جانوروں کے جوڑے کے بچھڑنے کے ساتھ بھی وہی ہمدردی و دلسوزی ہے جو اپنی ذات کے ساتھ ہے۔ ہند میں مشہور ہے کہ چکوا چکوی یعنے سُرخاب کا جوڑا یہ دونوں پرند۔ دن کو تو سارس کی طرح ہر وقت ساتھ رہتے ہیں مگر قدرتاً رات کو جُدا جُدا ہو جاتے ہیں۔ اگر دریا کے اس پار چکوی ہے تو اس پار چکوا چلا جاتا ہے۔ اور رات بھر ایک دوسرے کو پکارتا رہتا ہے چنانچہ امیر خسرو نے بھی اس امر کا ایک موقع پر اظہار کیا ہے پس اس کی جدائی بھی یہانکی عورتوں کو ایسی ہی ناگوار ہے جیسی اپنی اور اپنے خاوند کی چنانچہ اس امر کے ثبوت میں

یہ دوہا کافی ہے۔ ؎ دوہا نمبر ۱۱

چکوا چکوی دو جنے اِن مت مارے کوئے یہ مارے کرتار کے رَین بچھوہا ہوئے

یعنے چکوا چکوی دو جنے (متنفس) ہیں۔ انہیں کوئی نہ مارو یہ تو خود ہی خدا کے مارے ہوئے ہیں کہ رات بھر باہم جدا اور فراق زدہ رہتے ہیں ✣

کہتے ہیں کہ جب عالمگیر کو دکن کی چڑھائی پیش آئی اور ہند کی فوج جمع کر کے وہاں لیگیا تو اُسے وہاں پڑے پڑے بارہ برس ہو گئے مگر دکن سر نہوا۔ اِس موقع پر اُن سپاہیوں کی عورتوں نے جو اپنی اپنی شادیاں کرتے ہی حکماً چلے گئے تھے مشورہ کر کے ایک دوہا بطور عرضداشت لکھکر کسی قاصد کو دیدیا کہ جہاں تو اور سرکاری کاغذ دے۔ وہاں یہ بھی اُسمیں رکھدیجو شاید عالمگیر کو رحم آجائے اور وہ ہمارے خاوندوں کو کچھ دنوں کے لیئے رضا دیکر یہاں بھیجدے۔ وہ دوہا یہ ہے ؎ دوہا نمبر ۱۲

دلّی شہر سُہاونا اور برسے کنچن نیر سب کے گنٹھ جُور کے لے گیو عالمگیر

یعنے دلی ایک بڑا اچھا اور خوش آیندہ شہر ہے جہاں سونے کا مینہ برس رہا ہے۔ مگر یہ دولت اور یہ ثروت کس کام کی جبکہ عالمگیر بادشاہ سب کے خاوندوں کو سمیٹ سماٹ کر دکن لے گیا۔ دولت کا لطف تنہا نہیں آتا کیسی ہی بیش قرار تنخواہیں کیوں نہوں ہمارے حق میں تو وہ زہر مار ہیں عالمگیر نے دوہے کے جواب میں یہ دوہا بطور حکم لکھکر واپس کیا ؎ - دوہا نمبر ۱۳

بیٹھی رہو قرار سے من میں راکھو دھیر صاحب سے منتی کرو جو بُہریں عالمگیر

یعنے بے تاب نہو تحمل سے صبر کئے بیٹھی رہو اور خدا تعالیٰ سے عاجزی کیساتھ دعا مانگو تاکہ عالمگیر کامیاب ہو کر فتح کا ڈنکا بجاتا ہوا آئے اور دونوں گھر آباد رہیں اس حکم پر صبر نہ آیا تو اُنہوں نے پہلی طرح پھر ایک اور دوہا لکھکر روانہ کیا۔ جو یہ ہے ؎ دوہا نمبر ۱۴

سونا لاون پی گئے اور سُونا کر گئے دیس سونا ملا نہ پی ملے رُوپا ہو گئے کیس

یعنے ہمارے سوامی کما دھما کر سونا لینے تو چلے گئے مگر یہ خبر نہ رہی کہ اُن کے جانیسے

ہمارے نزدیک سارا دلیس اُجاڑ اور سُنسان ہوگیا۔ نہ تو سونا ہی ہاتھ لگا۔ نہ ساجن ہی پھر کر آئے یہانتک کہ جوانی سے بڑھاپا آکر ہمارے بھونرلے سے بال بھی چاندی کیطرح سفید ہوگئی۔ اس کے جواب میں عالمگیر نے یہ حکم چڑھا کر دوہے میں بھیجا ؎ دوہا نمبر ۱۵

ڈاڑھی ہتی سوسن بھئی آنکھیں بھئی سریش جیسے کنتھا گھر رہے ویسے رہے بدیش

یعنے اس مدت میں تمہارے گبرو خاوندوں کی ڈاڑھیاں سن کیطرح سفید ہوگئیں اور آنکھیں بڑھاپے کے مارے چیپڑ بہ بہ کر سریش بن گئیں۔ اب اُنکا آنا نہ آنا برابر ہے یہ سمجھو کہ جیسے کنتھا گھر رہے ویسے بدیس رہے۔

گو ان دوہوں پر کلّی اعتماد نہو مگر مورخانہ نظر اُس زمانہ کی وہ چپڑھائی جو عالمگیر کیطرف سے دکن پر ہوئی اُسکی درازی مدت سپاہیوں کی بیویوں کی بیکلی اور عالمگیر کا منشا بخوبی ظاہر کر رہی ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جس بادشاہ کو اپنے ملک میں امن وامان رکھنا ہو۔ وہ مدت دراز کے واسطے ایک ہی فوج کو اُن کے ملک۔ اُن کے دیس۔ اُن کے کنبہ عزیز واقارب سے جدا نہ کرے تاکہ وہ دل مار کر بیدل ہوکر اپنی جوانمردی کو بزدلی سے اور بہادری کو نامردی سے بدل کر شکست کا موجب نہو جائے۔ بال بچوں میں رہنے کی خوشی بہادری کے تمغوں کی خوشی کو پرے بٹھاتی ہے۔ انگریزی حکومت نے فوج کے واسطے رضا چھٹی جس قاعدے سے مقرر کی ہے وہ ایسے خیالات سے بچاتی ہے +

ان معروضہ دوہوں کی نسبت یہ بھی مشہور ہے کہ یہ کھتریانیوں کی طرف سے گئے تھے۔ اگرچہ اس کا کوئی اور ثبوت نہیں مگر کھتریوں کا فوج میں ملازم ہونا محمد شاہ اور احمد شاہ کے وقت میں بھی پایا جاتا ہے اور رسالہ ہفت چمن سے بھی جو مرہٹہ گردی کے زمانہ کے ایک سپہ سالار کے خاندانی آدمی کا لکھا ہوا ہے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہتے ہیں جسوقت ناوشاہ محمد شاہ پر چڑھکر آیا تو قزلباشوں کے علاوہ کابلی

کھتریوں کا ایک رسالہ بھی تھا۔ جسے محمد شاہ نے پسند کیا اور نادر شاہ نے ازراہ دوستی اُس کی نذر کر دیا۔ یہ رسالہ احمد شاہ خلف محمد شاہ کے وقت میں بھی موجود تھا جب احمد شاہ ابدالی اپنے ہمنام پر یورش کر کے آیا اور یہ رسالہ اپنے بادشاہ کیطرف سے لڑکر لڑا اور ڈٹ کر مرا۔ تو اُسوقت دُرّانی نے اس رسالہ کی بہادری دیکھکر اُس کے افسروں اور سواروں سے کہا کہ تم ہمارے ملک کے ہو۔ اور ہماری سلطنت کے نمک خوار رہے ہو ہم سے مل جاؤ۔ مگر اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم تو آج نہیں مرے کل مرجائیں گے مگر یہ نمک حرامی اور بیوفائی کا داغ ہماری زندگی میں ہمارے ماتھوں سے اور ہمارے بعد ہماری قوم اور نسلوں سے مٹائے نہ مٹیگا جس حالت میں ہمارا آقا نادر شاہ دہلی کے بادشاہ کے سپرد کر گیا۔ اور ہم اُن کے نمکخوار ہو گئے تو اب کس مُنہ سے بیوفائی اور کورنمکی قبول کریں ✣

جسوقت عالمگیر کے پاس ان عورتوں کی اخیر درخواست پہنچی تو اُس نے اُن کے بڑے بوڑھوں اور دارثوں کو کہلا بھیجا کہ ان عورتوں کی دوسری شادی کر دو۔ ان لوگوں نے جواباً گزارش کیا کہ ہماری قوم میں یہ دستور نہیں ہے۔ پس اُسوقت سے عالمگیر نے کھتری قوم کو فوج میں رکھنا موقوف کر دیا۔ اور سابقہ خدمات کے صلہ میں ہمیشہ کے واسطے خاص اِس قوم کے نام دہلی کی دلالی چڑھا دی۔

اِس روایت سے بعض تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

عالمگیر کی اس رعایت پر ہمیں اُسوقت کا ایک ایسا ذکر یاد آگیا جس سے اُس کی رحمدلی اور حق شناسی بخوبی مترشح ہے۔ ہمنے اِس ذکر کو اپنے کئی بزرگوں سے متواتر سُنا تھا جس کے باعث لکھنے کی جرأت ہوئی ✣

مُلّا جیون جو ایک بہت بڑے فاضل اور فتاویٰ عالمگیری کے جامع ہیں انکے اُستاد تھے۔ عالمگیر کی شہزادگی کا زمانہ تھا۔ وہ انکی بہت ہی خاطر کیا کرتا تھا۔ مولویونکو

زبان کا چسکہ اور کھانے پینے کا شوق ہوتا ہی ہے طرح طرح کی چیزوں پر دل چلنا اور دعوتوں میں جانا انکی عادت میں داخل ہے۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کہ ملّا جی کا دل گلگلوں پر چلا اور بے تکلفانہ سیدھے سبھاؤ عالمگیر سے کہدیا کہ صاحب عالم! آج تو گلگلوں کی بہار ہے۔ عالمگیر جھٹ تاڑ گیا کہ آج ملا جی کا دل گلگلوں کو چاہتا ہے۔ فوراً امیر مطبخ کو حکم دیا۔ وہ آن کی آن میں قند کے نہایت لطیف اور خوشنما گلگلے تلوا کر قابلوں میں سجا حاضر ہوا۔ ملّا جی کے آگے آبدار گلگلے رکھے گئے۔ آپ نے اُن میں سے ایک اُٹھا کر کھایا اور کہا کہ صاحب عالم سب کچھ ہے مگر انمیں گڑھیت نہیں ہے۔ عالمگیر مسکرایا اور فرمایا حضرت اس گڑھیت کے صیغہ اور مصدر کو میں نہیں سمجھا۔ ذرا اس کی بھی تشریح کر دیجئے۔ ملّا جی نے کہا سنو! بھائی گڑھیت اسے کہتے ہیں کہ چھاچھم مینہ برس رہا ہو۔ بچے کڑھائی کے واسطے سر ہو رہے ہوں۔ ہم دوڑے دوڑے بازار گئے ہوں۔ وہاں سے بھیگتے بھاگتے تھتھ تھتھ۔ چادرے کے ایک کونے میں میدہ۔ دوسرے میں بیسن تیسرے میں گڑھ۔ چوتھے میں پھلکیوں کا مصالحہ بندھا ہوا ہو۔ ایک ہاتھ میں تیل کی ہانڈی۔ دوسرے میں لکڑیاں۔ بغل میں چادرے کی پوٹلی دبی ہوئی ہو اور خوشی خوشی گھر آ رہے ہوں۔ ہمارے آتے ہی بچوں کی ماں کڑھائی کرنے بیٹھی ہو۔ ادھر اودنی ٹپک رہی ہو۔ اُدھر گلگلے چھن چھن تلے جا رہے ہوں۔ پیار کی ہلکی ہلکی بوچھاڑ آ رہی ہو۔ ٹکٹکیاں۔ پھلکیاں گرما گرم اُتر رہی ہوں۔ ایک بچہ کہے اماں ہمیں؟ دوسرا بچہ کہے اچھی اماں! پہلے ہمیں! بچوں میں چھینا جھپٹی ہو رہی ہو۔ باوا کے پاس فریادیں آ رہی ہوں۔ ساتھ ساتھ ہم بھی کھاتے جاتے ہوں۔ بچوں کی ماں بھی کبھی کبھی منہ میں ڈال لیتی ہو۔ منہ میں شہد کے سے گھونٹ آ رہے ہوں۔ میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی ہوں اس کا نام گڑھیت ہے۔ میں نے تمہارے محل میں بیٹھکر قند کے گلگلوں سے منہ میٹھا کر لیا اور یہ سب بچوں کے منہ میں نہ گیا۔ تو یہ قند مجھے تو ہزار قید اور بند کے برابر ہے۔

عالمگیر اُستاد کی اس ہمدردی اور بچوں کی محبت سے بہت خوش ہوا۔ جیب میں سے اشرفیاں نکال ملاجیون کی خدمت میں پیش کیں اور فرمایا کہ اچھے مولوی صاحب ابھی جایئے آج اس گڑھیت کے مزے آپ لیجئے اور کل اسکی خوشی سنا کر ہمیں متلذذ فرمایئے +

گو یہ سب بظاہر کتابی یا تاریخی باتیں نہیں ہیں مگر ان پر اگر ذرا بھی نظر غائر سے توجہ ڈالی جائے تو یہی بہت بڑی نتیجہ خیز کہانیاں بلکہ اُس زمانے کی دل خوش کن کشانیاں ہو جائیں۔ اور آپ جان لیں کہ ہر زمانہ کی زبان۔ ہر وقت کے الفاظ۔ اُسوقت کی تاریخ بتانے کو خود موجود ہیں۔ کوئی کتاب میں لکھتے یا نہ لکھتے۔ یہ منہ سے بولتے ہوئے زندہ مؤرخ ہیں۔

جنگ کے موقع کے الفاظ و محاورات جنگ کا۔ صلح کے وقت یا بزم کے الفاظ صلح کا۔ اطمینان کے زمانے کے الفاظ امن و امان کا سماں باندھ دیتے اور کانوں میں جھک کر کہدیتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں وقت فلاں فلاں موقع پر بنائے اور رواج دیئے گئے۔ فقط

سید احمد دہلوی۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ
ممبر ہسٹوریکل سوسائٹی (پنجاب)

افسوس ہے کہ ضخامت اور ڈیکلریشن فارم کے جھگڑوں کی وجہ سے اپریل کا پرچہ اخیر اپریل میں شائع ہو سکا اور بجائے اس کے شروع مئی میں شائع ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کی تاخیر کو ہمیشہ ناقابل معافی سمجھتے ہیں اور ناظرین تمدن کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ہر مہینہ کا پرچہ حتے الوسع اسی مہینہ کی آخر تاریخوں میں شائع کرنے کی کوشش کریں گے +

منیجر عصمت و تمدن دہلی

نغمۂ مسرت

بہارِ جانفزا کیا جلوہ افروزِ گلستاں ہے
مسرت پتے پتے ڈالی ڈالی سے نمایاں ہے

تعجب کیا اگر بزمِ گلستاں شاد و خنداں ہے
کہ ہر ایک شاخسارِ گل عروسِ گل بداماں ہے

صدا یہ بلبلوں کی ٹولیوں سے پیہم آتی ہے
مہیّا جانفروشی کا چمن میں آج ساماں ہے

قبائیں سبز کلیوں کی نہیں ہیں چاک اے بلبل
مگر یہ بھی طریقِ عرضِ حالِ جوشِ پنہاں ہے

نگاہِ دیدۂ نرگس سے ہے انداز رم پیدا
اسے بھی دعویٰ ہم چشمیِ چشمِ غزالاں ہے

ہوئی ہے کیسا نرالی طرز کی کاشانہ افروزی
گلِ مہتاب سے روشن ہر ایک کنجِ گلستاں ہے

چمن میں لالۂ پرداغ بھی یوں کھلکے کہتا ہے
کہ میرے دامن دل میں متاعِ گلفروشاں ہے

وہ زلفِ مشکبو اپنی مگر کھولی ہے سنبل نے
شمیمِ جانفزا سے جسکے گلشن عنبر افشاں ہے

جنوں انگیزیاں یوں ہی اگر ہوں سبزہ و گل کی
تو دیوانوں کا پیہم چاک گریباں تا بداماں ہے

بہارِ آفرینش کی حقیقت پوچھ مت بلبل
کہ پنہاں اسمیں رازِ فیضِ خاکِ گلعذاراں ہے

اثر کس زلف کے سودے کا تجھپر ہے اے سنبل
ترے ہر یک رگِ تن پر گمانِ مارِ پیچاں ہے

وفورِ کامرانی و مسرت کا اثر دیکھو
سیہ بختی مری مسرت کشِ چشمِ غزالاں ہے

عوض نکہت کے نغمے غنچۂ منقار سے نکلے
تعجب کیا جو شاخِ گل پہ یوں بلبل غزلخواں ہے

گلے مل لو گلے مل لو کہ روزِ عید قرباں ہے
میسر سیرِ گلشن۔ بزمِ یاراں۔ دیدِ جاناں ہے

خبر کردے کوئی اوس مست صہبائی جوانی کو
شبِ آبِ مبتلا دو چار دن کا آہ مہماں ہے

محمد سیف الدین شباب

(از حیدرآباد دکن)

ضمیرہ

نتیجہ نکل تو یہ بھی سکتا ہے کہ بچین ضمیرہ اور حسن دونوں کیواسطے سم قاتل ہوا لیکن ایک محلہ کے رہنے والے ایک جگہ کے اُٹھے بیٹھے ایک مکان کے کھیلے کودے اور ایک مکتب کے پڑھے لکھے اگر انسان ہونے کے بعد اسوقت کو یاد کرتے رہے جب نادان تھے تو کیا گناہ کیا؟ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ دونوں کے دونوں کیچڑ میں لتھڑے تھپڑے انگنائی میں مٹی کے گھر بنا رہے ہیں ملاپ تنا لڑائی ہوئی کوسا کاٹا۔ مارا پیٹا۔ تھوڑی دیر میں پھر ایک کے ایک۔

ذمہ دار ہیں تو اور قصوروار ہیں تو وہ دونوں مائیں جنہوں نے کلیا میں گڑ پھوڑ لیا۔ بیٹا بیٹی کا بیچ منہ کا نوالہ نہ تھا کہ چپکے سے بیٹھ سر جوڑ قول قرار وعدے وعید قسما قسمی سب کچھ ہوگئی۔ یہ مانا کہ دولہا دولہن دونو اسوقت کیڑا تھے مگر ترقی عمر کے ساتھ ہی احساس کا وجود تقاضا فطرت تھا اسپر غیر متوقع واقعات و حوادث سبب بنے ان نتائج کا جنکا ظہور یقینی و قطعی تھا۔ دونوں کان اشنا تھے اس خبر سے کہ ہمیں اپنی عمر کا بڑا حصہ اس تعلق میں بسر کرنا ہے جس کے انقطاع کا انحصار موت اور صرف موت پر ہے اور دونو دماغ گھنٹوں فلسفۂ عقد کی ماہیت پر غور کر چکے تھے باوجود اس علم و اعتراف کے کہ یہ نہنے دماغ جنکا نشو و نما ابھی ترقی پذیر تھا اس مشکل مسئلہ پر کافی خوض سے معذور تھے لیکن انکا خلوص صداقت طفولیت ہر چیز سفارش کرتی ہے کہ انکی یہ کوشش نمایاں عزت کی مستحق ہو۔

قیاس چاہتا ہے کہ ضمیرہ کی ماں اگر اسکو موت نہ آتی تو چاہے مرجاتی مگر جو کہا تھا وہ کر دکھاتی ایک شوہر کیا کنبہ بھر پیٹتا رہتا مگر وہ یہ اندھیر نہ کرتی کہ

کہ مدتوں کی بات چھڑا اور برسوں کے عہد تڑا بچی کو جیتے جی کنوئیں میں جھونک دے یہ تمام اتفاقات تھے کہ ماکو آئی سوت باپ کی آنکھ پر پڑا پردہ صلاح کار ملے تو کیسے؟ کہ جانی دشمن اور خون کے پیاسے۔ مینڈھے لڑوائے اور تماشا دیکھا۔ ضمیرہ نے مصیبت بھگتی تو اور احسن پہ آفت آئی تو انکی بلا سے۔

مقدر اگر کوئی شے ہے تو ضمیرہ چونکہ ازلی بدنصیب تھی اچھا ہوا کہ دنیا سے اٹھ گئی اور یہ جگر خراش صدمہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا گو اتنے الزام سے وہ بری نہیں ہو سکتی کہ اس فسانہ کا اصل سبب اسکا اقرار ہوا اور میدان حشر برحق ہے تو باپ اسکی روح نہ شرمائے ایک ایسے مواخذہ میں گرفتار ہوگا جس سے چھٹکارا رحمت اور مغفرت کسی کے بس کا نہیں۔

آسمان ان دو معصوم بچوں پر خون کے آنسوؤں (۱) سے رو رہا تھا جو ٹھیک دوپہر کے سنسان وقت میں جبکہ لوگ کے تھپیڑے ذی روح اور غیر ذی روح دونوں کو جھلسا رہے تھے جنوبی ہند کے مشہور قبرستان دار الاقامۃ میں ایک تازہ قبر پر سر پکڑے بیٹھے تھے ان کے ننھے دل جو ابھی ذائقہ حوادث و مصائب فراق سے قطعی ناآشنا تھے صرف اتنا محسوس کر سکتے تھے کہ اس مرحومہ کا فراق فراق ابدی ہے گو ابھی تک انکی قوت متخیلہ بہت کچھ ترقی کی محتاج تھی تاہم خیالات نے ان دماغوں میں اتنا اثر کر رکھا تھا کہ دونو حالت استغراق میں تھے دفعتہً کسی خیال سے ضمیرہ کو بیتاب کیا اسنے ایک حسرت بھری نظر چچازاد بھائی احسن پر ڈالی اور اس کے ساتھ فرط محبت میں قبر سے لپٹ گئی اور باواز بلند کہا۔ "اماجان! آنکھ کھولیے ضمیرہ حاضر ہے"

باقی

راشد الخیری

گپ شپ

ایک ٹھیکیدار صاحب جو علم سے بالکل کورے تھے اس فکر میں ہوئے کہ کسی تعلیمیافتہ عورت سے شادی کریں اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور ایک مہذب روشن خیال پڑھی لکھی عورت سے شادی ہوگئی دو تین روز بعد صبح کیوقت ایک دن ٹھیکیدار صاحب نے بیوی کو نہایت خاموش دیکھکر دریافت کیا خیر وعافیت ایسی خاموش کیوں بیٹھی ہو طبیعت تو اچھی ہے؟

بیوی۔ کچھ نہیں! سعدی کے اس شعر پر غور کر رہی تھی سمجھ میں نہیں آتا کہ سعدی سے شخص نے یہ کس طرح کہدیا۔

زن دوست بود و پنج زنانے ۔۔۔ تا جز تو نیافت مہربانے

آپ ہی اسپر غور کیجئے۔

میاں۔ میں اسکا مطلب سمجھ گیا۔

بیوی۔ (خوش ہوکر) ہاں فرمایئے +

میاں۔ بس اسکا مطلب یہ ہے کہ میری اور آپ کی گذر نہیں ہوگی۔ سلام علیکم۔

ایک طالب علم تحصیل علم کی غرض سے ایک مدرسہ میں داخل ہوگئے فارغ التحصیل ہونیکے بعد جب اپنے وطن کو جانے لگے تو مولوی صاحب نے اور چند احباب کو جمع کیا تاکہ آنکو رخصت کریں اور فرمایا۔

استاد۔ میاں اب تم جاتے ہو اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو شبہ ہو تو اسوقت اپنا اطمینان کرلو۔

فارغ التحصیل۔ الحمدللہ۔ کوئی شبہ نہیں ہے ..... مگر بوستاں میں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی یہ جگہ جگہ چکایت چکایت کیا لکھا ہے +

راحت زمانی

مولوی سیّد احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کیگئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت۔ ایک روپیہ۔ (عہ)

مصرا فروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے۔ قیمت ایکر دپیہ (عہ)

ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر)

منیجر عصمت و تمدن۔

(تمدن پریس دہلی)

عصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے **عصمت** ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق۔ عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے۔ **عصمت** اُن کو بتائے گا کہ کوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت اِن کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو قسمیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض اُن کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُرلطف و باطمینان بسر کروانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ **عصمت** ہی **عصمت** اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل وغش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جنسے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے۔ **عصمت** بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کیساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجۂ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ہر ماہ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں۔ سالانہ قیمت (چھ روپے)

منیجر عصمت و تمدن (دہلی)

تمدن

تمدن اسلام

تغیر اور حدوث جو زمان و مکان میں دائر و سائر ہے، جس طرح افراد انسانی کے حالات میں حشم زدن میں زمین و آسمان کا انقلاب پیدا کر دکھاتا ہے، قوم جو افراد انسانی کے ایک بڑے مجموعہ یا گروپ سے عبارت ہے اوس کے حالات میں بھی دیگر اقوام کے دیکھتے دیکھتے وہی انقلابات برپا کرتا رہتا ہے، جس سے قومیں وجود پاتی ہیں پھولتی اور پھلتی ہیں، اور اپنی بہار دکھا کر فنا ہو جاتی ہیں، یہ سلسلہ سلف سے جاری ہے اور آخر تک رہے گا، یعنی زمانہ اسی طرح بنا بنا کر بگاڑے گا +

دور مجنون گذشت و نوبت ما است
ہر کسے پنج روز نوبت اوست

آپ کو تعجب ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ یہاں اس عالم کے سوا جسے آپ غیر قار اور نشانہ حوادث پا رہے ہیں، ایک عالم ایسا بھی ہے، جو قار ہے، جہاں گذرا ہوا زمانہ اور گذشتہ صدمات بدستور اپنی جگہ برقرار ہیں، اور جہاں تک فلک کے

ست تظلم، اور انقلابات کے طوفان کے رسائی نہیں

حالات نے جسکے دو حصہ کر دیئے ہیں اور جنمیں سے وہ حصہ زیادہ روشن اور نمودار ہے جسمیں تاریخ کے چراغ جلتے ہیں، مطالعہ کی عینک لگا کر تم جب چاہو دیکھ لو، دنیائے تاریخ وہ زندہ دنیا ہے، جسمیں سارے گذشتہ حالات حروف کا لباس پہنے ہوئے، نظروں سے گذرتے معلوم ہوتے ہیں،

درس و تدریس کی مسندیں بچھی ہیں، ملکی انتظامات کی کلیں چل رہی ہیں، عرصہ مصاف میں فوجیں سرگرم پیکار ہیں، غرضکہ بظاہر ساکن مگر متحرک اور چلتی پھرتی دنیا ہے، جس کے بسنے والے بقا و دوام، اور حیات جاوداں کی منزل امن و امان کی دنیا میں ہیں،

اس عالم آثار کا دوسرا حصہ دنیائے تاریخ سے پرے ہے، جہاں دنیائے تاریخ کے ایسے پرشان ایوان حکومت آراستہ محلات علم کا صدقہ جاریہ تقسیم کرنے والی درسگاہیں، اور یہ دھوم دھام اور چہل پہل تو نہیں لیکن پرانی عظمت و وقار کی یادگار، سر بفلک عمارات کے ٹوٹے پھوٹے آثار، کھنڈر، محراب و در کچھ مقدسات مذہبی[1]، تجسس و تلاش کی کچھ نشانیاں اور عمل کے انکشافات، جیسے آگ کی اختراع نمک کی تلاش، روٹی پکانے کی ترکیب، سینے، بننے، اور کاشتکے طریقوں کی ایجاد، پتھر اور دوسری دھاتوں کے کارآمد اسلحہ و آلات وغیرہ البتہ موقعہ موقعہ سے ملتے ہیں جو اس گذشتہ تمدن کے باقیات، اور اس پرانے وقت کے آثار ہیں جو تاریخ کی روشنی پھیلنے سے پہلو گذر چکا ہے،

یہاں اکر اس بات کا سخت افسوس ہوتا ہے، کہ آج دنیا کے ان بڑے

[1] اگرچہ تاریخ سے پہلے سینہ بسینہ چلے آتے تھے، مگر اب سفینہ تاریخ میں منضبط ہو گئے ہیں۔ ۱۲

محسنوں کے نام و نشان بھی پردۂ غیب میں ہیں، (جن کے تجسس و تحقیق سے آج ہم بڑے بڑے فائدہ اُٹھا رہے ہیں)، جس سے اس سُنسان دُنیا کا منظر بعینہ اوس بزم کے منظر سے مشابہ ہے، جسمیں رات بھر یاروں کا جمگھٹا رہا ہو، اور صبح ہونے پر آئی تو سارے نچلے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ہوں، دن کو لوگوں نے رنگ محفل کا سامان تو اِدھر اُدھر پھیلا ہوا سب کچھ پایا، مگر کسی انسان کی صورت نظر نہ آئی ؛

یہ تاریکی کا پردہ کچھ ہماری اِس پُرانی ہی دنیا پر چھایا ہوا نہیں ہے بلکہ نئی دنیا کے اُفق تاریخ کے نیچے بھی اُس وقت سے یہ سیاہی نظر آرہی ہے جبکہ ہمارے اسلاف نئی دنیا ہی سے ناواقف محض تھے، اور اوس بہادر اور شیر دل انسان کی کشتی تلاش ساحل امریکہ تک نہ پہونچی تھی، جو امریکہ کا مجسس ہی نہیں ہے، بلکہ فاتح اعظم کے لقب کا سچا مستحق ہے،

اوسوقت خود وہاں کے لوگ قدیم فن تعمیر اور سنگتراشی کے نمونے اُدھر اُدھر پھیلے دیکھکر، اور اُن کے بنانے والوں، اور تراشنے والوں کا سراغ نہ پاکر حیران تھے ؛

الغرض یہاں اور وہاں ہر جگہ تاریخ سے قبل کا زمانہ ایک طلسم ہے، جس کا راز دانایان فرنگ بھی نہ پاسکے، جو ہر بات کا پتہ پاتال سے نکال لایا کرتے ہیں۔

آیئے! اس کالی کوٹھری سے نکلیں، اور تاریخ و تمدن کی دنیا میں ذرا پھر آئیں، اور سبق لے آئیں، کیونکہ گذشتہ تمدن کا علمی اور اختراعی مواد جس تدریجی رفتار سے اس پایہ تحقیق کو پہونچا ہے، کہ آج اوس کے سطح پر نئی روشنی کے ایوان ترقی قائم ہیں، دماغ کے لیے یہ خود ایک قابل غور مسئلہ، گہری فلاسفی، اور ذہنی نتائج سے عملی توقعات کا برگ و بار لانیوالی ایک تر و تازہ شاخ ہے،

جو قومیں عہد تاریخ میں اُبھریں، اور کشورِ اقبال میں فرمانروا رہیں، اون کے فتوحات، اور اُن کی عہد کی عام برکات کا معائنہ آپ تاریخ کے آئینہ خانہ میں جاکر کر سکتے ہیں ہم یہاں تمہیداً اون کے تمدن و تہذیب کی محض اون نشانیوں کو دکھائیں گے جو آج بھی پائی جاتی ہیں۔ اور آثار کا صحیح اطلاق جنپر ہو سکتا ہے مثلاً

۱۔ فینقی تمدن کے آثارات میں سے اونکی قابل فخر اور واحد ایجاد حروف ہجا ہیں، جنھوں نے اپنے تجارتی سفروں کے ذریعہ سے اقصار عالم میں پھیلکر شرق سے غرب تک کو اپنا منت کش تحریر بنایا،

یورپ میں اگر یونانیوں نے اُن سے اصلاح لی، تو ایشیا میں کلدانیوں نے اور یمن میں اہل عرب نے، اور انہیں خطوں میں رد و بدل کرنے سے دنیا کے تمام مروجہ اور متروک الاستعمال خطوط وجود میں آئے۔ جن کے فینقی نام ہمیشہ اپنے اصل موجد کی سند پیش کرتے رہیں گے۔

۲۔ مصری تمدن کی یادگار علم زراعت، علم تشریح، اور تصویروں پر رنگ آمیزی کرنے کا فن لطیف، انتظام سلطنت کے بہترین اصول و ضوابط، نظم فوج کے قواعد،

مذہبی عقائد و عام خیالات کے ذیل میں۔ نماز کے وقت بخور اور خوشبوؤں کا سلگانا، عقیدۂ تثلیث، وکہانت، عباد تخانوں کی ہیکلوں کا ایک خاص طرز تعمیر، بعض اہل ادیان اپنے معبدوں میں اس طرز تعمیر کی اب تک تقلید کرتے ہیں

۳۔ کلدانیوں کے باقیات صالحات میں سے علم طب (جسکی اصولی تدوین کی سند اولیت انہیں کے پاس ہے) فلکیات۔ نجوم۔ سحر۔ وغیرہ فن تعمیر میں عراق والے اب تک ان کی استادی کا سکہ مانتے ہیں

۴- بنی اسرائیل کے بقایا میں سے مقدس الہامی دستور العمل توراۃ عقیدہ توحید، وغیرہ۔

۵- یونانی عہد کی نشانیاں علمی سلسلہ میں فن روایات تاریخ علم الہیات علم خطابت منطق فلسفہ۔ فن محاماۃ۔ وتمثیل۔ ریاضی اصول کے کھیل علمی اشاعت کے سلسلہ میں۔ مدارس علمی بحث ومکالمہ کی انجمنیں سلسلہ تعمیر کے متعلق یہ کہدینا کافی ہے، کہ یونان اور دوسرے مقامات میں جو پرانی عمارتیں آج بھی قائم ہیں، اون کے علاوہ یورپ کا کوئی میوزیم جس میں تعمیرات کے نمونہ رکھے گئے ہیں، یونانی ساخت کی قدیم عمارات کے نمونوں سے خالی نہیں،

۶- رُوما کی گذشتہ عظمت و وقار یورپ کا ایک واحد، مسلم الثبوت مسئلہ ہے، جسکی بناء پر وہ آج بھی یورپ میں متمدن اعظم یا اُستاد اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن باوجود مدارج ترقی میں سب سے اعلیٰ درجہ پر پہونچنے، اور ایک عرصہ دراز تک تمدن وتہذیب کی دُنیا میں فرمانروائی کرنے کے، تاریخ میں اوسکی خالص علمی کوششوں کا بہت کم سُراغ لگتا ہے، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اہل رُوما کو شروع شروع یونانی علوم اور فلسفہ سے بہت شغف رہا، مگر پھر رفتہ رفتہ اون کی عنانِ توجہ حکمت عملی کی تیسری شاخ یعنے علم سیاست مدن کی طرف مڑتی گئی اور وہی پھر اونکی توجہ کا مرکز قرار پاگئی، جس سے اس سیاست کے چمن بیجزاں کو انکی توجہ کے آب لطیف نے ایسا سیراب کیا، کہ ملکداری کے آئین اور قانون کی بیلیں ہر طرف پھیلنے لگیں، پھر کلیاں پھوٹیں، اور حسن قبول کے پھول کھلے، جو بُوئے قبولیت سے

بس گئے۔ اور ایسے بسے، کہ اس کے اثر سے یورپ کے اجتماعی اور سیاسی خیالات اُسوقت تک مہکتے رہیں گے۔ جبتک رُومن لاکی مستحکم بنیاد پر یورپ کے آہنی ایوان قائم ہیں،

لاطینی (لیٹن) زبان کو اسی تمدن کے آغوش تربیت میں نشو ونما پانا نصیب ہوا، یہیں سے وہ علوم، اور مصطلحات قانون کی دولت سے مالا مال ہوکر ٹکسالی اور باقاعدہ زبان کی سند لیکر نکلی جسے غنی پاکر یورپ کی تمام مروجہ زبانوں نے اوس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، اور اوس نے حسب ضرورت سب کی حاجت روائی کی،

گذشتہ قوموں نے تہذیب و تمدن کے جو باغ سنوارے تھے اُن کے چند شگفتہ پھول خاطر عاطر کے سامنے پیش کیے گئے،

اب ہمارا دعوے ہے، کہ اسلامی عہد کے آثار، اور تمدن کی برکتیں، مقابلۃً عہود سابقہ سے اعلیٰ تہذیب پھیلانے میں کامیاب تھیں، اور اُن کے آثار سے بھی تمدن جدید نے پیش از پیش استفادہ کیا،

جسکی مختلف حیثیتوں پر روشنی ڈالنے کے لیئے اسکی تحلیل دو جزوں میں کی گئی ہے، پہلے جزو میں اُن علمی اور ادبی واقعات پر ریویو کیا گیا ہے، جو تمدنِ اسلام سے دیگر اقوام کے علمی استفادات کے سلسلہ میں وقوع پذیر ہوئے لیکن اس خاص اور اہم ریویو کی بابت ناظرین باتمکین سے ہماری التماس ہے، کہ وہ مخزن کی گذشتہ فائل جلد ۸ نمبر ۱ و ۲ و ۳ بابت ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۰۹ء میں ہمارا وہ مضمون جو "مشرق و مغرب" کے عنوان سے ہے ملاحظہ فرمائیں،

اس کا جزو ثانی جو تمدن اسلام کے سوشل حالات و آثارات، اور رفاہ و سعادت ابنار جنس کے خیالات کو مشنری قوت حاصل ہونے کے واقعات کا

ایک بسیط ریویو ہے، ذیل کی سطروں میں اون کا ہدیہ پیش ہوتا ہے،

اسلام کے قبل دنیا کی اجتماعی حالت کیا تھی؟

جبتک اسلام کا چشمۂ رحمت ریگستان عرب سے نہ اُبلا تھا، دنیا میں ہر طرف مفاسد و مظالم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، لہذا اُس پُرآشوب زمانہ کی حالت کے لحاظ سے اُسوقت جو مہذب ترین اقوام اور ممالک تھے اونکا نمونہ پیش کرنے سے بخوبی اسکا اندازہ ہو سکے گا، کہ اُسوقت کی اعلیٰ تہذیب کیا تھی، اور اسلام نے اوسپر کیا اضافہ کیا،

مشرق و مغرب میں اُسوقت دو سلطنتیں تھیں جو اپنی وجاہت سے ان دونوں مقامات کے لیئے مرکزی حیثیت رکھتی تھیں،

فارس کو اگر مشرق میں درجہ مرکزی حاصل تھا، اور وہاں کی تہذیب کا وہ سرمایۂ انتخاب تسلیم کیا جاتا تھا، تو روم کو مغرب میں،

روم کی سلطنت برائے نام مذہب عیسوی کی نام لیوا تھی، تو فارس کی سلطنت مجوسیت کی، ان سلطنتوں کے ڈانڈے ملے ہوئے تھے، جن کے حدود فاصل خون کی وہ ندیاں تھیں، جو قیصر و کسریٰ کی صف آرا فوجیں ہمیشہ باہمی کشت و خون سے بہایا کرتی تھیں، ان کے درمیان آتش جنگ مشتعل رکھنے کا اصل باعث وہ بےچین طبیعتیں تھیں، جو دوسری قوم کو برسر حکومت دیکھکر اپنے ناجائز جوش سے بےچین نہ بیٹھ سکتی تھیں، جن کی شر انگیز ریشہ دوانیوں نے خلق خدا کے جدال و قتال، اور جبری جنگ آزمائیوں سے فارس و روم کی سرسبز یونکو بالکل پامال کر ڈالا تھا، ملک داری کا سلیقہ

نہونے پر بھی ملک گیری کے بڑھے ہوئے حوصلہ رکھتے تھے۔ غرضکہ دُنیا کی مہذب ترین اقوام، خوش انتظام اور لائق گورنمنٹوں کا یہ نقشہ تھا، کہ آفتاب اسلام نے افقِ خاور سے طلوعِ اجلال فرمایا، جس نے اگر صلح و آشتی کی زمین میں عدل و انصاف کا قانون جاری کیا۔ تو ظلم و تعدی کرنے والوں کو اون کے استیصال کا فرمان بلند آہنگی سے سُنایا، مغلوب اقوام کو اونکی حمایت اور پشت پناہی، اور اُن کے تسلیم حقوق، جابروں کو زیر رہنے، اور قاعدوں و قانون سے ایک قدم تجاوز نہونے کا اعلان کیا۔ اور اہل فارس و روم کو اوس کشمکش سے نجات دلائی جو اُنمیں سے کسی ایک کے غلبہ کی صورتمیں یوں ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اہل فارس کا قدم مقبوضات روم میں پہونچا تو شام۔ مصر۔ اور دیگر مشرقی حصص میں دیانت مجوس نے اعتقادی درجہ پایا، اور جب رُومیوں کو فتح نصیب ہوئی، تو کرمان و خراسان میں مسیحیت کے دائرہ اعتقاد کو وسعت ہوئی۔

سلطنت روم اسوقت شام۔ مصر۔ اور شمالی سواحل افریقہ تک پھیلی ہوئی ہے، جو رومیوں کے جغرافیای معلومات کے حدود آراضی ہی ہیں اور ان حدود سے باہر اُن کے معلومات ویسی ہی غیر یقینی اور ہوائی تھے جسطرح آج ہمارے، معلومات مریخ اور زہرہ اور وہاں کے باشندوں کی بابت اسیطرح فارس والوں کے معلومات بھی اوسی دنیا تک محدود تھے جو اُن کی کاروباری نقل و حرکت کی دُنیا تھی، علوم و فنون کی صلاحیت بجز چند نفوس ذاکیہ و اشراف کے کسی میں نہ تھی،

الغرض اسی قدیم روئیں خراباں خراماں وہ منازل زندگی طے کرتے جاتے تھے کہ دفعتہً اسلامی فتوحات کا سیلاب اُمنڈتا ہوا آیا،

اور قیصر و کسریٰ کی سلطنت کو تاخت و تاراج کرتا ہوا نکل گیا،

اب وہی ملک جو قیصر و کسریٰ کے دور حکومت میں ایک کفدست اور خار ناک میدان تھا، عربوں نے اُسے سرسبزی میں چمن زار بہشت کا نمونہ بنا دیا، وہاں اصلاحات کے وہ وہ گل کھلائے کہ بلبل سدرہ کو وجد آیا، انتظام و سیاست کی وہ نہریں نکالیں کہ انہیں کوثر سے ملا دیا، غرضکہ نظم و نسق، ترقی و تہذیب کی اُن آرائشوں سے اوسے سنوارا کہ تاریخ اوّلین میں اوس سے ایک ایسے روشن باب کا اضافہ ہوگیا، جس کے مقابلہ میں عہد ماضی کی تمام ترقیاں اور کارنامے بجز اہل بابل فینیقیین۔ اور مصریوں کے تاریک پڑ گئے،

ان کے سوا جن قوموں کو خاص طور سے اسلام کے سایۂ عاطفت اور دامن تربیت میں پرورش پانا، قابل رشک اور مسعود خلائق زندگی بسر کرنا، اور جگ جگ جینا نصیب ہوا، اون کا ذکر ہم علی التفصیل کریں گے،

(باقی آئندہ)

غافل ندوی

محض ان واقعات اور نتائج سے جو اب تک ظہور میں آئے عورت کی طبیعت کا فیصلہ کرنا بڑی غلطی ہے یہ فیصلہ صرف اسوقت جائز ہو سکتا ہے جب عورت مرد کی طرح اپنی حریت کی مالک ہو۔ یہ خیال کہ فزیالوجی کی تحقیقات سے دونوں میں کچھ فرق معلوم ہوتا ہے استدلال کا طریقہ صحیح نہیں ہے نہ اس کے یہ معنی ہیں کہ کون ادنےٰ ہے کون اعلیٰ۔ یہ فیصلہ اسی حالت میں درست ہو سکتا ہے کہ عورت کو بھی اتنا ہی وقت ملے جتنا مرد کو اپنی دماغی تربیت کیواسطے ملا ہے اور وہ تعلیم حاصل کرے۔ پروفیسر جیک لوریٹ

کلامِ نادر

دل بھر آیا پھر سامانِ بے سری دیکھکر
رو دیا میں اپنا زندان خالی خالی دیکھکر

ساحل جو لانگہ امواج پر شکلِ حباب
دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھکر

دشتِ غربت میں چلا ناحق میں ہستی کی نیرنگ
کون اپنے پیچھے گا مجھے میری غریبی دیکھکر

لاکھ میں آنکو بھلانا ضبط کرتا ہوں مگر
دل بھر آتا ہی پھلوا اپنا خالی دیکھکر

کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستی موہوم کا
بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھکر

اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق
پیار بھی آتا نہیں اب شکلِ پیاری دیکھکر

عشق کا نادر کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھکر

نہ دی دم لینے کی فرصت مجھی صدمات پیہم نے
ہوا اک غم سے چھٹکارا کہ گھیرا دوسرے غم نے

نو آسنجی کو کیا پہنچے بلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف دی ناحق چمن پیرے اعالم نے

فغاں شب بھر جو میں تکلیف مجبوری سے کرتا ہوں
بلا کرتا ہوں لیکن بخت مجبوری سے کرتا ہوں

نادر علیخاں نادر کاکوری

رباعی

کی شیخ حرم نے سبحہ خوانی شب بھر
پنڈت نے کہیں کتھا بکھانی شب بھر

ہو حق کے سوا کوئی حقیقت نہ کھلی
رٹتے رہے سب رام کہانی شب بھر

ثاقب

انسان فرشتہ کی عینک سے

ایک نوعمر فرشتہ جو ہنوز ملازم اعلیٰ کی انتہائی تعلیم سے فارغ نہوا تھا اور جسے بنا بران نہ ابھی کوئی ڈگری ملی تھی اور نہ کوئی خدمت تقدیس۔ تحمید وغیرہ کی عطا کی گئی تھی۔ سنٹرل عرشیہ کالج کی موسم پرشگال کی تعطیل میں اپنے چیف پراکٹر مہتر فصطاعیل کی اجازت سے چند ہفتے دنیا کی سیر کرنے کی غرض سے رفعت کورٹ سے جو ذوالجلال بورڈنگ ہوس کا ایک نہایت پرفضا حصہ ہے روانہ ہوا۔ یہ متعلم فرشتہ دوستوں کا بہت وسیع دائرہ نہ رکھتا تھا۔ پھر بھی اس کے ہم مذاق چند دوست فرشتے ایسے تھے جنھوں نے روانگی سے پہلے اسے ایک مختصر الوداعی ڈنر دیا۔ فرشتہ نکو زیادہ بولنے چالنے کا شوق نہیں ہے تاہم ایک آدھ تقریر ضرور ہونی ضرور تھی۔ فورتھ ایر کلاس کا طالبعلم فرشتہ طرفیل نامی روحانی چیئر کی گونج میں اپنی نورانی کرسی پر سے اوٹھا اور شام کے مہمان کا ہارم صحت تجویز کرتے وقت اسطرح گہر افشاں ہوا

فضائے عرش کے نوعمر مکینوں کی زندگی میں آجکا دن تاریخ جاوید کا ایک نیا ورق اوٹھے گا کیونکہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے حضرت انسان کے مطالعہ کے قصد سے دنیا کے دور دراز سفر کی اولعزمی اختیار کی ہو۔ ہمارے مقدس بزرگ مہتر جبرائیل کو عالم خلق میں تشریف لے گئے ہوئے عرصہ دراز ہوگیا اور اب ادن سے دنیا کی کوئی تازہ خبر نہیں ملتی۔ ہمارے دوسرے مقدس بزرگ حضرات عزرائیل ہر روز ہر گھڑی۔ ہر لمحہ۔ وہاں آتے جاتے

رہتے ہیں مگر اونکا کار منصبی گو بہت اہم ہے تاہم محدود ہے اور چونکہ اون کے محکمہ کی کل کارروائی کانفیڈنشل ہے اس لیے ہم لوگوں کو اوسکا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ہم نوعمر فرشتوں میں سے کوئی اولوالعزم کمر ہمت باندھے اور دنیا میں جاکر وہاں کے حالات قلمبند کرے۔ میں اپنے معزز دوست شرقیل کو اون کے نیک ارادہ پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور بے انتہا مسرت اور شوق قلبی سے اونکا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔ بڑے جوش اور سرگرمی سے یہ جام طہورا نوش کیا گیا۔ اب سب کی آنکھیں ظریف زشطیل کیطرف اوٹھیں جنھوں نے لوگوں کے استعجاب اور حیرت کی حالت میں انسان کا ٹوسٹ پر دپوز کیا اور اوسکی جلو میں حسب ذیل تقریر کی:-

مجھے انسان کا جام صحت پیش کرنے کا خاطر خواہ حق حاصل نہیں ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جہانتک مجھکو صحیفہ اعظم کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے انسان کا تعلق فرشتوں سے کم ہے مگر حوروں سے زیادہ ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان کو ہم سے تناسل پیدا کرنے میں سراسر تکلیف کے بیچارے کو وقتے دیے جاتے ہیں یہ ایلچ دے کر کہ تجھ میں ملکوتی صفات پیدا ہوجائیں گے سونا کم کر۔ کیونکہ فرشتے سوتے نہیں۔ ہنسنا بولنا چھوڑ دے اسلئے کہ فرشتے متین ہوتے ہیں۔ دن رات تسبیح لیے بیٹھا رہ۔ اس لیے کہ فرشتے بھی دن رات تسبیح و تحلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اب آپ خود خیال کرسکتے ہیں کہ انسان کو کیا پڑی کہ اپنی جان پر یہ سب مصیبتیں لے۔ صرف اس لیے کہ ہم سے تھوڑی بہت مشابہت پیدا کرے۔ ہم میں سے بعض تو اوس کے جانی دشمن ہیں اوس کے کندھوں پر بیٹھ کر اوسکا کچا چٹھا لکھتے

رہتے ہیں۔ بڑے آباجان حضرات عزرائیل سے تو ہر انسان کی روح کانپتی ہے
(سنو سنو) بھلا پھر انسان ہمیں کسطرح اچھا سمجھ سکتا ہے۔ اور جب یہہ حالت ہے
تو ہمارا اوسکا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ (افسوس افسوس) البتہ پرلے پار کے
لطیف طبقہ سے جنھیں حوریں (چیرز) کہتے ہیں انسان کے دل کو بہت
لگاؤ ہے۔ اصل وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی (اور اگر پیارا شرقیل دنیا کے
سفر میں صرف ایک اسی راز کا پتہ لگا لایا تو ہم سمجھیں گے کہ اوسے کافی کامیابی
ہوگئی) مگر ہاں قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان میں لالچ کا
مادہ بہت ہے اور حوریں شاید کچھ بڑی نعمت کی چیز ہونگی۔ نماز پڑھو تو جنت
میں حوریں ملیں گی۔ نیچی نگاہ کرکے چلا کرو۔ حوریں ملیں گی۔ یہہ نہ کرو تو حوریں
ملیں گی۔ وہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی وغیرہ وغیرہ (قہقہہ) اب نہیں معلوم
حوروں کے کسقدر پہلو ہیں کہ ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے پر اونکا ایک نہ
ایک پہلو بطور انعام کے انسان سے چسپاں ہوسکتا ہے (قہقہہ) افسوس میرا
بیان غیر مکمل بلکہ گونہ مہمل ہے اس لیے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے انسان
بھی دو طبقوں میں منقسم ہے۔ ایک غالباً کثیف اور دوسرا حوروں کیطرح
لطیف۔ پھر یہہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہماری حوریں انسانِ کثیف کو
ملیں گی تو حوروں نے کیا قصور کیا ہے۔ اور اگر انسانِ لطیف کو ملیں گی
تو بات ہی کیا ہوئی۔ (سنو سنو)

پیارے شرقیل۔ ضرور اسکا پتہ لگائیو۔ (چیرز)۔ ان سب باتوں کو مدنظر
رکھکر پھر بھی جو میں انسان کا اجام صحت تجویز کرتا ہوں اوسکی یہہ وجہ ہے
کہ سنتے آئے ہیں کہ جب حضرت انسان پیدا کیا گیا تو ہمارے سب بزرگوں سے
اوسے سجدہ کرایا گیا اور ستوائے اون بزرگ کے۔ (توبہ توبہ اب ہم میں سے

کوئی بھی اونہیں بزرگ کہنے کا مجاز نہیں ہے۔) سب نے سجدہ کیا۔ سجدہ نہ کرنے پر وہ بارہ تھپڑ باہر کیے گئے اونکا (الیفی جی) بت جلایا گیا اور دفتر قدم میں درج ہے کہ تعزیرات قدس کی شدید ترین دفعہ کی انتہائی سزا اونہیں دی گئی (نعرہائے لاحول لاحول) پھر کوئی بات تو ہے جو ان کو یہ شرف بخشا گیا (ضرور ہوگی ضرور ہوگی) عقلمند شرقیل کیا تم اپنے سفر میں اس معمہ کو بھی حل کر لوگے؟ اس تقریر کا جسمیں ہر چند ظرافت شامل تھی۔ حاضرین جلسہ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ مجوزہ جام نوشی جاں کرتے وقت بعض معمر اور رمز شناس فرشتوں نے تو گردنیں تک جھکالیں۔ یہ جلسہ بڑی خیر و خوبی کے ساتھ برخاست ہوا۔ اور اس کی روداد موتیوں کے حرفوں میں چھاپی گئی راوی لکھتا ہے کہ باوجودیکہ ہر طرح اہتمام کر لیا گیا تھا کہ یہ باتیں سوائے فرشتوں کے اور کسیکو معلوم نہوں مگر کسی نہ کسی طرح اس روئداد کی دو چار کاپیاں ایجال ایکڈیمی کے پردہ راز کے اندر پہونچ گئیں جس سے حوروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

اتفاق وقت جب یہ پرچے حوروں میں پہونچے تو میوزک (موسیقی) کا گھنٹہ ختم ہو کر کالج بند ہو گیا تھا اور حوریں بناؤ سنگار کرنے اپنے اپنے کمروں پر جا رہی تھیں۔ وہاں سے بعض ٹینس کھیلنے آئیں بعضی سیدھی رنگ[1] میں جاتیں یہ پڑھکر کہ انسان حوروں کا بہت مشتاق ہے بعض خوش ہوئیں۔ بعض چیں بجبیں ہوئیں۔ بعضوں نے آج بناؤ سنگار اور اچھی طرح کیا۔ نئی ٹاپیاں نئے ربن (فیتے) نئے پھول لگائے اور لیونڈروں کی شیشیاں۔ لنڈھا دیں (مخفی نہ رہے کہ کچھ عرصہ سے حوروں میں بناؤ سنگار کا کوڈ ترمیم

[1] ایک قسم کی لوہے کی کھڑاویں سی ہوتی ہیں اونکو پاؤں میں باندھکر ناچتے ہیں۔ ۱۲

ہو گیا ہے۔ پرانی حوروں کو تو اب تک کنگھی چوٹی سرمہ مسی وغیرہ کی اجازت ہے۔ لباس میں بھی قدامت پسندی کا عیب ہے بے جوڑ گنواری گھرے رنگ۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے۔ حلّ حلّ کرتے ہوئے پیجامے گھیتلے جوتے اب تک کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ مگر ماشاء اللہ نئی حوریں فیشن کی موجد ہیں۔ اور خدا دے اور بندہ لے آئے دن نت نئی تراش خراش نکالتی رہتی ہیں۔ جن حوروں کو انسان سے وابستہ ہونیکا خیال ناگوار گذرا۔ انہوں نے بالکل بناؤ سنگھار نہ کیا۔ اور نہ کھیلنے گئیں رو رو کر آنکھیں سجھا لیں اور کسی اک سے تو نماز مغرب بھی وقت پر ادا نہ ہوئی۔ رویٹر کا خاص نامہ نگار لکھتا ہے کہ اونہوں نے کوئی کانفڈینشل میموریل تیار کیا تھا۔ اوسپر کمیشن بیٹھا تھا جسکی رپورٹ بھی تیار ہوئی تھی مگر سوائے ان چند احکامات کے اور کوئی بات پبلک نہ کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(الف) منظور کیا گیا کہ جو حوریں اجمال ایکڈمی کی ڈگری ہولڈر ہیں اور جنھوں نے کوئی سے دو مضمونوں میں اونرز کے ساتھ امتحان پاس کیا ہے وہ ایسے انسان کو رد کر سکتی ہیں جو بدتمیزی سے کھنکارتا ہو۔ زور سے ڈکار لیتا ہو۔ اکڑوں بیٹھتا ہو۔ کھجاتا ہو۔ سوتے میں خراٹے لیتا ہو کھنکتا ہو۔ جمائیاں بہت لیتا ہو۔ انگلیاں چٹخاتا ہو۔ انگڑائیوں کے ذریعہ سے جماٹک کرتا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

(ب) جائز ہوگا کہ حوریں قبول کرنے پر خود انسان کا لباس تجویز کریں مگر کسی حال میں وہ کنٹوپ نہ اوڑھ سکیگا۔ اور نہ ادھوڑی اسٹر کی جوتی پہن سکے گا +

(ج) ڈاڑھی کے متعلق مقراض الحکمت حضرت سنریل (انگریزی لفظ سنر

یعنی قینچی سے مشتق ہے) علحدہ رپورٹ دینگے اور نمونے اور خاکے پیش کریں گے۔ واضح ہو کہ لبوں کا مسئلہ بھی ڈاڑھی کے مسئلہ اعظم کا ایک جزو ہے ٭

(د) ہر انسان ہر حور کو ٹوپی اُتار کر سلام کرے گا۔ بازار میں اوس کے لیئے راستہ دیدیگا اور آپ پیچھے ہٹ جائیگا۔ ضرورت ہوگی تو اوسکی رکشا کے ساتھ پیدل چلے گا۔ گھوڑے پر سوار کرے گا۔ نیز اتاریگا غرض پبلک اور پرائیوٹ ہر موقعہ پر اوسکا ادب اور لحاظ کرے گا۔

(ہ) کوئی حور کسی ایسے انسان کے ساتھ بال میں رقص نہ کرے گی جو چندھا ہو۔ یا کانڑا ہو۔ یا بھینگا ہو۔ یا گنجا ہو۔ یا گندہ دہن ہو۔ یا جسمیں پسینہ کی بُو آتی ہو ٭ یا جسے بغل گند ہو یا جسکے پھنسی پھوڑے ہوں یا جس کے داد ہوں۔ یا جسکے دانت میں کیڑا لگ گیا ہو۔ یا بلا وجہ بھی کوئی سی نو حوروں میں سے پانچ حوریں لینے آدھی سے زیادہ اوس انسان کو اپنی معیت اور ہمرکابی کا اہل نہ گردانیں۔

(و) کوئی انسان کسی حور کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر نہ دیکھیگا۔ نہ اوس کے لباس کی خوشبو پر دھواں لپک بنے گا۔ اور نہ پیچھے مڑکر یا کن انکھیوں سے دیکھے گا ٭

خیر یہ سب باتیں تو قرین قیاس نہیں ہیں۔ مبالغہ سے بہت کچھ لبریز معلوم ہوتی ہیں اور غالباً ایسے شخص کے فکر کا نتیجہ ہیں جو انگریزی تہذیب کا دلدادہ شیدا ہے اور جس کے دلمیں میمیں گھس گئی ہیں۔ خدا کرے پڑھنے والے بھی انکا یقین نہ کریں اور گناہ میں شریک نہوں۔ البتہ آگے چل کر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ ہر کہ دمہ کے واسطے قابل غور ہے ٭

ہمارا انتظار اخدا بادشاہ۔ خدا کا نبی یا رسول بادشاہ۔ یوں سمجھ لو کہ مسٹر شرقیل دنیا کے سفر سے ملاء اعلیٰ پر واپس پہونچ گئے۔ فرض کرو کہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر آئے تھے اور اوسی پر واپس گئے۔ اونکا استقبال اور اون کی آؤ بھگت اون کے دوستوں نے دل کھولکر کی ہوگی۔ مگر ہمیں اس کے متعلق کچھ لکھنا منظور نہیں ہے۔ ہمارا تعلق زیادہ تر اوس اسپیچ سے ہے جو اونہوں نے فرشتوں اور حوروں کے سامنے جلسہ میں جو خاص اسی غرض سے منعقد کیا گیا تھا ادا کی۔ وادی مقدس کا وسیع اور خوش منظر پارک اس اوپن ایر میٹنگ کے واسطے چمن زار جناں کا ہم پلہ بنا دیا گیا تھا۔ سوائے مقام النس کی اُن چند روشوں کے جو نازنینان الجمال اکیڈیمی کے گلگشت کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں۔ یہ سارا وسیع میدان وقت سے پہلے فرشتوں سے پٹ گیا تھا۔ اس جلسۂ عام میں حوروں کو خاص پردہ کے اہتمام کے ساتھ بھی شریک ہونے کی اجازت بڑی کوشش سے وقت کے وقت ملی تھی۔ تاہم کارپردازان میٹنگ نے پلیٹ فارم کے دائیں طرف قطار در قطار نورانی نازک کرسیاں طبقہ لطیفہ کے واسطے اس سلیقہ سے بچھائی تھیں کہ نگاہ اونہیں کیطرف پڑتی تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے کوئی پانچ منٹ پہلے صوت سرمدی کی ہم آہنگی کے ساتھ حجاب عصمت میں مستور تمام نازنینان الجمال اکیڈیمی اپنی اپنی کرسیوں پر جلوہ افروز ہو گئیں۔ اللہ جمیل و یحب الجمال۔

فرض کرو کہ جلسہ کا پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ چیرز کے ساتھ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوا۔ اسپیکر کا حاضرین سے مزید تعارف کرایا اور اوسے تقریر کرنے کی اجازت بلکہ دعوت دی۔

بنابران مسٹر شرقیل مسیفر ماید

"جناب صدر انجمن صاحب۔ و دیگر حاضرین جلسہ" میری واپسی پر جو محبت اور شفقت کا برتاؤ آپنے میرا خیر مقدم کرنے کی صورت میں میرے ساتھ کیا ہے اول اوسکا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مجھے جو کچھ حالات اپنے سفر کے بیان کرنے ہیں اونمیں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس حضرت انسان کی کل باتیں بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں ہیں سینکڑوں باتیں ایسی ہیں جو نہ میں بیان کرسکتا ہوں اور آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میرا قصد تھا کہ کچھ تصویریں اور خاکے اپنے ہمراہ لاؤں مگر دنیا کی چیزیں یہاں تک پونچ نہیں سکتیں اس لیئے میں ہار کر اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر سامنے کی پردہ والیوں میں سے ایک نوعمر جان اس اسٹیج پر تھوڑی دیر کے واسطے میرے پاس آکھڑی ہو تو میں شاید کچھ باتیں بیان کرنے میں کامیاب ہوں۔

جلسہ میں سب بات پر اتفاق اور اختلاف دونوں ہوئے مگر کثرت رائے سے پردہ والیوں سے درخواست کی گئی اور جو حور وہاں لیڈی سوپیریر کی خدمت پر ممتاز تھی اوس کی اجازت سے ایک ہوشیار۔ ذہین اور چلبلی حور۔ کچھ شرماتی ہوئی کچھ مسکراتی ہوئی اپنا لباس اور زیور درست کرتی ہوئی شرقیل کے پاس نیچی نگاہ کرکے آن کھڑی ہوئی +

شرقیل نے آتے ہی اوسے مودبانہ سلام کیا جسمیں اشتیاق آمیز مسکراہٹ شامل تھی۔ اور اسطرح کہنا شروع کیا۔

معزز حاضرین ۔ حضرت انسان کا کل راز اوس کے اون تعلقات میں پوشیدہ ہے جو اوس کے دونوں طبقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں

مجھے پہلے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ انسان دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کرخت محنتی۔ بہت چلتا پھرتا بہت بولتا چالتا یوں ہی اناپ شناپ۔ لڑتا بھڑتا اور اسی قسم کی کیفیات کا مرکز ہے۔ اوسے مرد کہتے ہیں۔ دوسرا فرقہ نازک بتین۔ کم گو۔ کم حرکت۔ صلح کل۔ محبت والا بنایا گیا ہے جسے عورت کہتے ہیں مردوں کو فرشتوں سے اور عورتوں کو حوروں سے تشبیہ اس لیے نہیں دیجاتی کہ وہاں مرد اور عورت ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ملتے جلتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ پیار اخلاص سے رہتے ہیں اور انمیں ایک پاک جذبہ جسے وہ عشق کہتے ہیں ایسا زبردست ہوتا ہے جو اون دونوں کو یکجان دو قالب کر دیتا ہے مگر یہاں ہماری حالت دوسری ہے۔ اس لیے ہم اون کے معاملات اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ اب آپ صاحب ملاحظہ فرمایئے کہ یہ میرے پاس کھڑی ہیں مگر انمیں میری طرف جھکنے کا میلان نہیں ہے۔ نہ انکا جی یہ چاہتا ہوگا کہ اپنے بالوں اور کپڑوں کی خوشبو شریف کو سنگھاؤں نہ انکا دل اسبات کو ڈھونڈھتا ہوگا کہ میں ان کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر نرمی سے دباؤں۔ اور آنکھوں کو لگاؤں یہ کب گوارا کریں گی کہ میں اپنے ہاتھ پھیلاؤں اور یہ بھی پھیلائیں اور ہم دونوں ..... اور یہ بات دیکھنی تو آپ کے مقدس حلقہ کو نصیب ہو ہی نہیں سکتی کہ میں اپنے ... کو ان کے .... کیطرف عاجزانہ سعی کے ساتھ رجوع کروں اور اول تو یہ رکیں جھجکیں ہٹیں۔ مگر پھر ایک لمبا سانس بھر کر آنکھیں بند کرلیں اور پہلے میرے ... کے عمل کو پورا ہونے دیں اور پھر گو اوسی رفتار سے نہیں مگر پھر بھی قریب قریب اوسی رفتار سے میرے .... کو بھی اپنے .... کے احساس سے عزت بخشیں۔

حضرات! اس طرز عمل کو انسانوں کی زبان میں پیار کہتے ہیں۔

(چیرز چیرز۔ کرکے دکھاؤ۔ ادا کرکے دکھاؤ)

حد بالکل شروع گئی۔ شرقیل نے ..... کے کچھ کلکھنے کیے مگر بھونڈے بھدے۔ حور کو پسینہ آگیا اور وہ کچھ کہسیانی سی ہوکر اسٹیج پر سے اُتر گئی اور پردہ میں چلی گئی۔ مگر یہ عجب بات سب فرشتوں نے نوٹ کی کہ پردہ میں داخل ہونے سے پہلے اس گھبرائی ہوئی حور نے کوئی آدھا چوتھائی مڑکر شرقیل کو ایک دفعہ دیکھا اور پھر نیچی نگاہ کرلی +

حضرات۔ آپ مجھ سے ناراض ہونگے کہ شرقیل بڑے بڑے وعدوں کے ساتھ دنیا میں گیا تھا مگر وہاں سے معلومات کا بڑا ذخیرہ نہ لایا۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے سوائے اس ایک بات کے جسکا میں نے ذکر کیا کچھ نہ ملا۔ اسکے وقتوں میں تو جو کچھ ہوتا ہو وہ ہوتا ہو مگر اب کی تو میں کہتا ہوں کہ انسان نہ خدا کو پوجتا ہے نہ حور و قصور کے خیال میں ہے۔ ایک اور محض ایک مشغلہ ہے اور وہ مشغلہ مرد۔ عورت۔ یا عورت مرد کے لقب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

غزل

"بقلم نسائی"

وہی احسانِ وحشت ہے مرے حالِ پریشاں پر
وہی دستِ جنوں کی مہربانی ہے گریباں پر

تری حسرت چلی جاتی ہے کلفتہائے ہجراں پر
ترے ارمان باقی ہیں ہجومِ یاس و حسرت پر

اب اُمید وفا ہی مٹ گئی۔ اب کیا بھلا ہوگا
اس طرزِ تغافل کو اُٹھا رکھ طاقِ نسیاں پر

کبھی طولِ مرضِ بیمار کا دل توڑ دیتا ہے
کبھی خبطِ شفا مجبور کر دیتا ہے درماں پر

ابھی تھوڑی بہت اُمید باقی ہے ترحم کر
ابھی ارمان کا اطلاق ہوسکتا ہے ارماں پر

جو ممکن ہو تو اب کلفتِ اصبو کی خبر لیجئے
اضافہ یاس کا ہونیکو ہے غمخوارِ ہجراں پر

وہی ناکامیٔ پیہم، وہی کاوشِ بے سود
وہی مایوسیاں چھائی ہوئی ہیں دل کے ارماں پر

تم آوازِ جرس میں نوحۂ غربت میں کیوں گھبرائے جاتے ہو
جہاں تک ہو نظر رکھو خدا کے فضلِ احساں پر

آزاد سہارنپوری

جوانی اور غم

جوانی ؎ ہو دور کہیں اے غم ــــ دکھلا نہ مجھے صورت

ہے صاف جبیں میری ــــ پُر نور میری آنکھیں
کس طرح جھکی ہے ــــ سُرخی مرے گالوں میں

اعضا میں بھری ہے ــــ طاقت بھی تو صحت بھی
دل بھی ہے مرا ہلکا ــــ ہے شاد طبیعت بھی

میرا نہ تعاقب کر ــــ چل دور پرے ہٹ جا
لے چھوڑ مجھے اچھا ــــ ماتی ہو بڑھاپے کا

غم ؎ اک دوست کی صورت ہے ــــ نفرت ہے تجھے اتنی
نافہم ہے تو کیسی ــــ نادان ہے تو کتنی

سُرخی ترے گالوں کی ــــ یہ تجھ کو مبارک ہو
ڈھنڈلا نہ کروں گا میں ــــ پیاری تری آنکھوں کو

نقصان کا تیرے ہاں ــــ در پے نہیں اصلا میں

سکھلاؤں گا اے پیاری ـــــ سچا تجھے ہونا میں

جوانی: ہو دور کہیں اے غم ـــــ بھاتا نہیں تو مجھ کو

میرے دلِ روشن کو ـــــ دکھلاتا ہے تاریکی
بتلا تو سہی مجھ سے ـــــ کیوں ضد ہے تجھے اتنی

سیاہی مری زلفوں کی ـــــ جا دور نکر اے غم۔
اِس مُشک کو میرے تُو ـــــ کافور نہ کر اے غم"

غم: اس وقت تجھے مجھ سے ـــــ ناصح کی ضرورت ہے۔

مغرور ترے دل کو ـــــ ہونے نہیں دونگا میں
یہ سخت ہے تجھ سے ـــــ موم اس کو کروں گا میں

ہمدردیٔ انساں سے ـــــ واقف تجھے کر دوں گا
میں مہر و محبت سے ـــــ دل کو ترے بھر دوں گا

لازم نہیں اتنا بھی ـــــ پیاری تجھے خوش رہنا
کیا چاہتی ہے دل سے ـــــ نیکی کو بھلا دینا

جوانی ہو دور کہیں اے غم —— دکھلا نہ مجھے صورت

کیوں اشک فشاں ہوں میں —— جبتک کہ جواں ہوں میں
میرے لیے دنیا میں —— دلچسپیاں لاکھوں ہیں

کچھ دن تو مجھے اے غم —— تو لطف اُٹھانے دے
جا پھر خدا میری —— ہے استدعا تجھ سے"

غم نافہم جوانی تو —— واقف نہیں کیا مجھ سے
مالک ہوں میں دنیا کا —— قبضہ میں ہے یہ میرے

میرے ہی سبب سے ہے —— سوزش یہ محبت میں
باعث ہوں ترقی کا —— میں عیش کی لذت میں

کام آئیں گے پیری میں —— غم تیری جوانی کے
یہ تجھ کو بڑھاپے میں —— ذی عقل بنائیں گے"

الرقم

سید علی حیدر زیدی

رباعی

دنیا کا عروج کیا ہے پستی کیا ہے — صحرا کیا چیز اور بستی کیا ہے
کہتا ہے جسے زمانہ ہستی ہستی — اب تک نہ کھلا اسکی ہستی کیا ہے

میل ملاپ

(جو فارڈ ایوبری کی ایک تصنیف سے ماخوذ ہے)

ہم کو اس بات پر ناز ہے کہ آجکل ہر شخص کا مکان اس کا قلعہ ہے۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ ناز ایک حد تک بہت بجا ہے۔ مگر حقیقت میں یہی کافی نہیں ہے۔ مکان کے لیے قلعہ ہونے سے بدرجہا زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ گھر بھی ہو۔ ہر ایک مکان کو قلعہ تو قانون اور پرامن سلطنت نے بنا دیا ہے مگر اسکو گھر بنانا اس کے رہنے والوں کا ذاتی کام ہے لیکن آخر مکان اور گھر میں فرق کیا ہے؟ کیا یہ دونوں لفظ ہم معنی نہیں ہیں؟ کیا ان دونوں کا مفہوم جدا جدا ہے۔ ہاں مکان تو صرف انسانی رہائش گاہ کا نام ہے اور اسکے لئے اور کبھی معنوی صفت اور اندرونی خوبی کی ضرورت نہیں۔ مگر اسکے گھر ہونے کے لیے یہ بات بھی لازمی ہے کہ اسکے مکینوں میں محبت ہمدردی اور اتحاد ہو۔

ایک چار دیواری میں محصور زمین کا نام گھر نہیں ہے۔ بلکہ گھر وہی ہے جسکے بچپن کی پیاری پیاری باتوں کی یاد۔ لڑکپن میں ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود کے خیال اور جوانی کی دلخوش کن امنگوں اور تمناؤں کے تصور نے دلکش اور دلربا بنایا ہو۔ ماں باپ کی شفقت۔ بہنوں کی غمخواری اور پیار بھائیوں کی محبت اور ہمدردی اور سب گھر والوں کی باہم یگانگت۔ اور بگہتی۔ غمخواری اور دلداری نے اسکو پاک کیا ہو اور انمیں برکت دی ہو گھر کے لیے سب سے پہلی چیز محبت ہے اور جب تک محبت نہو وہ خواہ قلعہ جیسا

محل۔ مگر گھر تو نہیں ہوسکتا جس گھر میں محبت نہیں ہے وہ اس جسم کی طرح ہے جسمیں جان نہیں ہے اور ایسا گھر گھر کہلانے کا اتنا ہی مستحق ہے جسقدر بے جان لاش انسان کہلانے کی۔

آجکل گھر امن اور حفاظت کا قلعہ ہونے کی وجہ سے قابل قدر نہیں ہے ہم اس لیے اپنے گھر سے محبت نہیں کرتے کہ اس کے حصار میں ظالموں کے ظلم اور ستم شعاروں کی دارو گیر سے پناہ ملجاتی ہے۔ بلکہ اسواسطے کہ اسکی چار دیواری میں دنیا کی بے مہریوں اور زندگی کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے ایک گونہ نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور اسکی حرم محترم میں بحر ہستی کے جانکاہ طوفانوں اور روح فرسا موجوں سے کسیقدر امن مل سکتا ہے۔ دنیا میں خوشی دولت اور کامیابی پر موقوف نہیں ہے۔ دولتمند سے دولتمند اور کامیاب سے کامیاب شخص کو بھی اکثر موقعوں پر حصول مسرت کے لیے ایک ایسی شے کی حاجت ہوتی ہے جسے دولت نہیں خرید سکتی اور جس کا بدل کامیابی نہیں ہوسکتی۔

انسان میل ملاپ کا اتنا محتاج ہے کہ وہ دنیا تو دنیا جنت میں بھی اکیلا نہیں رہ سکتا اور نہیں رہا۔ تلاش معاش اور ضروریات زندگی اسے دنیا کے دور دراز حصول میں لیجاتی ہیں۔ اسے شہر شہر اور ملک ملک میں پھراتی ہیں۔ مگر اسکا دل ہمیشہ اس کے گھر میں ہی پڑا رہتا ہے۔ اور اسکی آنکھیں ہمیشہ وطن ہی کیطرف لگی رہتی ہیں حقیقت میں ہم نہ بالکل تنہا زندگی گزارنے کیلئے بنے ہیں نہ ہر وقت گھر میں پڑے رہنے کے لیے۔ ہمارے لیے دونوں باتیں مفید ہیں۔ نہیں خالی مفید ہی نہیں بلکہ ضروری اور لازمی ہیں۔ اور دنیا میں کامیاب اور پر مسرت زندگی بسر کرنے کے واسطے دونوں باتوں کے مناسب اور معتدل استعمال کی ضرورت ہے

قدرت کی دلچسپیاں اور کائنات کی دلربائیاں تو کبھی کم نہیں ہوتیں اور سب کے لیے یکساں پیش کی گئی ہیں۔ مگر جب تک دلمیں خوشی کا اُجالا نہو تب تک سورج کی روشنی کے باوجود بھی دنیا اندھیر ہے اور جب تک طبیعت مسرت اور اطمینان سے شگفتہ نہو۔ تب تک بادِ بہار کے جھوکے اور پھولوں کی شگفتگی بیکار ہے ہمارے دلمیں عزت۔ الفت اور یگانگت کے خیالات گھر اور گھر والوں کیوجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر تمدن کی بنیاد اور تہذیب کی جڑ ہے۔ انسانی طبیعت کے تمام اوصاف پسندیدہ اور صفات حمیدہ کا سب سے پہلا اور سب سے آخری سبق یہ ہے۔ اس سے ہمارے عمدہ جذبات میں ترقی اور ہماری اعلیٰ خواہشات میں ترقی پیدا ہوتی ہے۔ غرض اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انسان کو انہی تعلقات خانگی نے انسان بنادیا ہے۔

گھر کیسا ہی ٹوٹا پھوٹا اور کتنا ہی شکستہ اور خراب حال کیوں نہو۔ گھر پھر بھی گھر ہے اور فرض اور محبت کی زنجیریں ہم کو اس سے جکڑے ہوئے ہیں اور اس دلچسپ فرض کی ادائے گی میں جتنی مشکلیں زیادہ ہونگی اسیقدر اسکا اجر بھی بیش بہا ملیگا حقیقت میں سخت سے سخت محنت اور مشکل سے مشکل کام بھی اتنا جانکاہ نہیں ہے جسقدر کسی بیجا ناانصافی یا دلی بیچینی کو صبر اور تحمل کے ساتھ چپ چاپ برداشت کرنا غالب کا قول بالکل درست ہے

لپٹنا پرنیان میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دلمیں سوزِ غم چھپانیکی

یہ جیتے جی کی قربانی ہے۔ دل و جگر کی بھیٹ ہے جس کے سامنے دولت۔ عزت۔ اور محنت سب ہیچ ہیں اسمیں شبہ نہیں کہ ایسے سنگدل بہت کم ہونگے جو جان بوجھ کر دوسروں کو ملول کرنا چاہتے ہوں۔ اور جو کوئی

ایسے ہیں بھی غالباً ان تک اس مضمون کی رسائی مشکل ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ دنیا میں رنج و غم کا بہت بڑا حصہ سنگدلی سے نہیں بلکہ لاپروائی اور بے خیالی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملیں۔ اور ہر ایک سے محبت آمیز گفتگو کریں اور سب سے خوشخلقی کا برتاؤ رکھیں۔ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے دل ہی دلمیں محبت کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ہمکو مناسب طور پر اسکا اظہار کرنا چاہیئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری ذرا سی لاپروائی۔ بے توجہی اور کج ادائی ان دلوں کو صدمہ پہنچا دیتی ہے۔ جن کا پاس خاطر ہمکو سب سے زیادہ منظور ہے۔ اور جن کی اعانت اور ہمدردی ہمیشہ ہمارے مدنظر رہتی ہے۔ ہم خود اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ سکتے ہیں کہ زندگی میں کتنی مرتبہ دلجوئی اور تشفی کے صرف چند لفظوں سے ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ گئیں ہیں اور پست شدہ حوصلے پھر بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے اکثر رہ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

ترا بلطف زبانی بہ من مضائقہ چیست
چو میتوان بہ دلاسا شگفتہ کرد مرا۔

لارڈ چیسٹر فیلڈ لکھتا ہے "میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ شاید عام باتوں میں لوگ سب سے زیادہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ ان کو محبت کیونکر کرنی چاہیئے؟ اور نفرت کس طرح؟ اکثر لوگ بیجا رعایت اور حد سے زیادہ چشم پوشی اور اغماض سے انہی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ جن سے انکو سب سے زیادہ محبت ہے۔ اور بسا اوقات فرط نفرت میں اونکا بیجا غصہ اور بے موقع جوش خود انہی کے حق میں مضر ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں۔ بلکہ اکثر ہم دوستوں اور عزیزوں میں رہکر بھی حقیقت میں بالکل تنہا ہوتے ہیں۔ اور ان کی ملاقات اور محبت ہمارے لیے ذرا بھی مفید نہیں

ہوتی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے خیالات کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے جسمیں کوئی غیر کبھی داخل نہیں ہوتا۔ کہنے کو دوست ہیں مگر ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر۔ نام کو عزیز ہیں مگر ایک دوسرے کی خیالات سے ناآشنا ہر ایک اپنے اپنے دلمیں اپنے اپنے انکار کا بار اور اپنے اپنے راز دفکا طومار لیئے ہوئے ہے جس کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا جاتا۔ اور جنکو ان کی سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ اندرونی بیگانگی کا پردہ ایسا ہے کہ جب تک یہ نہ اٹھے۔ تب تک باہم کسی قسم کی ہمدردی غمخواری اور دلداری ممکن ہی نہیں۔ غرض ہر شخص زبانِ حال سے یہی کہتا ہے کہ ؎

سراغِ یک نگاہِ آشنا از کس نے یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور مے ماند

لوگ بظاہر بڑے تپاک سے ملتے ہیں۔ ہر قسم کی باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے موسم کی کیفیت۔ فصلوں کی حالت۔ تمدنی مسائل۔ سیاسی مباحث۔ غرض دنیا جہان کے جھگڑے سوائے ان چند باتوں کے جو ہر ایک دل میں سب سے زیادہ کھٹک رہی ہیں۔ مگر جنکا عزیز سے عزیز دوست اور قریبی سے قریبی رشتہ دار کے سامنے بھی اٹک آنا حرام ہے

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اپنی ہر ایک بات ہر ملنے والے سے کہتے پھریں۔ یا کوئی راز خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہو اپنے کسی ملاقاتی سے چھپائیں ہی نہیں۔ اگرچہ سچی دوستی اور دلی محبت تو اس کی متقاضی ہے لیکن خیر ہمارا یہ مطلب نہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر کم سے کم اتنا تو ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے جو گفتگو احباب میں ہو وہ ایسے سرسری اور فضول امور کے متعلق نہو۔ جن سے نہ سننے والے کو کوئی فائدہ

کہنے والیکو کچھ حاصل ضرور ہے کہ ہم اپنے روز کے ملنے جلنے والوں کے حالات وعادات سے واقف ہوں پس کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ذرا سی کوشش سے اپنی گفتگو کو انکے مذاق کے موافق اور اون کے حالات کے مطابق بنالیں جس سے اونکی افکار میں کمی اور اون کی خوشیوں میں کچھ ترقی ہو جس سے اون کی بھی طبیعت پہلے اور ہمارا بھی دل خوش ہو۔ کیا یہ بات اتنی دشوار ہے کہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر نطق کے دائرے میں سے اس فضول اور لایعنی گفتگو اور ان لچر اور بیکار مضمونوں کو نکالدیا جاوے جو آجکل اکثر ملنے جلنے والوں میں زیر بحث رہتے ہیں تو حیوانِ مطلق کی تعداد میں نہایت نمایاں کمی ہو جائے یہ امر مسلم ہے کہ بہت سے لوگ اپنی گفتگو کو دلچسپ اور دل آویز بنا نہیں جانتے اور اسی سبب سے ان کی باتیں پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہیں مگر یہ نقص ذرا سی کوشش سے دور ہو سکتا ہے۔ ہمدردی فصیح و بلیغ الفاظ کی محتاج نہیں ہے محبت کے لیے چکنے چپڑے فقروں اور میٹھی میٹھی باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ایرانی نازک خیال کا قول بالکل درست ہے ؎

چون محبت در میاں باشد تکلف گو مباش
شیر مادر در حلاوت بے نیاز شکر است

لیکن سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اگر اور لوگ ایسا نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے تو سب سے پہلے ہمکو اسپر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر ہمارے ملاقاتی ہم کو خوش کرنا نہیں چاہتے تو ہم کو اون کو خوش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارے احباب ہمارا دل نہیں بھلا سکتے تو ہم کو اون کا دل بہلانا چاہیئے۔ اس میں کچھ زیادہ ایثار اور نفس کشی کی حاجت نہیں ہے

لیکن ہاں محض خیال ہی خیال اور آرزو ہی آرزو سے بھی کچھ کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے بھی تھوڑی سی تمیز۔ توجہ اور مشق چاہیئے۔ اور اسپر ہی کیا موقوف ہے دنیا میں کوئی کام ہو اچھا یا بُرا عمدگی اور خوبصورتی سے کرنے کے لیے ہر ایک میں انہی باتوں کی ضرورت ہے۔ خوش خلقی کے لیے تو لب ہلانے کی بھی حاجت نہیں ہوتی۔ ایک لطف آمیز نگاہ۔ ایک ہمدردی کی آہ ستم دیدہ دل کے لیے وہ کام کرتی ہے جو ہزار تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جو کچھ منہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں اور دوسرے کے خیالات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اور پھر اپنی صاف گوئی اور راستبازی پر ناز کرتے ہیں۔ سچائی کی اچھائی میں کلام نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے سخت الفاظ اور کرخت لہجہ کی بھی ضرورت ہے۔ بعض لوگ درشتی کو طاقت کی علامت سمجھتے ہیں حقیقت میں یہ کمزوری کا نشان ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ جسکو طاقت اور بزرگی عطا فرماتا ہے اون کو حلم اور بردباری بھی مرحمت فرماتا ہے یاد رہے کہ ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اپنے گھر والوں کو حتے المقدور خوش رکھیں اور اپنے گھر کو گھر بنانے کی کوشش کریں۔ کج خلقی اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے۔ بدمزاج آدمی دوسروں کے لئے تو عذاب ہوتا ہی ہے۔ مگر وہ خود بھی اپنے اوپر وبال ہی ہو جاتا ہے جو شخص اوروں کو خوش نہیں رکھ سکتا وہ خود بھی کبھی خوش نہیں رہ سکتا اور جو دوسروں کو دکھ دیتا ہے وہ آپ بھی کبھی سکھ نہیں پاتا۔

اگر کوئی ہماری کسی بات پر اعتراض کرے تو خفا نہ ہونا چاہیئے اور جس وقت ہم خفا ہوں اسوقت کسی پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ اگر

کسی غلطی پر تنبیہ کی ضرورت ہی ہو تو اسے نہایت نرمی اور مہربانی سے سمجھا دینا چاہیئے۔ خاص کر بچوں کے ساتھ نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آنا چاہیئے۔ کیونکہ بقول جین پال رچٹر "بچے کے ننھے سے گہوارے میں بڑے آدمی کے تاروں بھرے آسمان کی نسبت بہت جلدی اندھیرا چھا جاتا ہے" اور ان کے بھولے بھالے دلوں کی ناشگفتہ کلیاں گرمی کی ذرا سی لپیٹ سے کملا جاتی ہیں۔ یہ بھی بڑا اچھا قاعدہ ہے کہ سرزنش خفیہ اور تعریف علانیہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ تنہائی میں سمجھانے سے ہمدردی بھی پائی جاتی ہے۔ دلشکنی بھی نہیں ہوتی۔ اور بات کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے اور علی الاعلان تعریف کی قدر بھی زیادہ کی جاتی ہے۔ اور آئندہ کے لیے ہمت بھی زیادہ بڑھتی ہے۔ تنبیہ حقیقت میں نصیحت کی ذرا سخت صورت ہے۔ انتقام کا نام نہیں ہے۔ اس لیے اگر کیسکو کسی غلطی پر چشم نمائی کرنی ہو تو جہانتک ہو سکے متانت اور افسوس کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ غصہ اور ناراضی سے نہیں۔ اور ہم سبکو ہمیشہ اس یونانی حکیم کی تقلید کرنی چاہیئے جسنے کسی بات پر اپنے غلام سے کہا تھا کہ اگر مجھے غصہ نہ آگیا ہوتا تو میں تجھے ضرور سزا دیتا" اگر غصہ آجائے تو کچھ کہنے سے پہلے ذرا سوچ لینا چاہیئے۔ میتھو آرنلڈ اعلیٰ ترین تہذیب اور شریف ترین طبیعت کی خصلتیں یہ بتاتا ہے کہ "اس میں بے انتہا مہربانی۔ حالات و واقعات کا لحاظ۔ افعال کا نہایت دقیق امتحان مگر اس کے ساتھ ہی اشخاص پر بیحد رحم ہو" ہر شخص کی کمزوریوں کی رعایت کرنی چاہیئے۔

بسا اوقات اگر سارے حالات معلوم ہو جاویں تو دلیں غصہ کی بجائے

رحم اور سرزنش کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ جہانتک ہو سکے رشک اور حسد کی جگہ تعریف اور استحسان لے لے۔ تاکہ ہم دوسروں کی کامیابیوں پر چلنے کی بجائے خوش ہوں۔ عنقریب موت سب کو برابر کر دے گی۔ اور زمین سب کو اپنے آغوش میں سلائے گی۔

عزت شاہ و گدا زیر زمیں یکسان است
میکند خاک برائے ہمہ کس جا خالی

اس لیے ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہیئے اور سب سے محبت اور خوش خلقی سے پیش آنا چاہیئے۔

حتے المقدور کبھی کسی دوست سے غصے کی حالت میں جدا نہ ہو۔ جدائی کے وقت سرد مہری بھی بری بات ہے۔ کیا معلوم کہ کون سی مفارقت آخری مفارقت ہو جائے۔ اور کسوقت کی جدائی آخری جدائی بن جائے +

بعض لفظ سورج کی کرنوں کی طرح اندھیرے میں اُجالا کر دیتے ہیں۔ مگر بعض لفظ سانپ کے کاٹے اور زہر آلود تیروں کے زخم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل ہے کہ "زبان کا زخم تلوار کے زخم سے بہت زیادہ ہوتا ہے"۔ سوچنا چاہیئے کہ جب لفظ اتنے گھاؤ ڈال دیتے ہیں تو نرم اور شیریں الفاظ کیسی کچھ خوشی بخشتے ہونگے۔ جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ "شیریں زبانی میں خرچ کم ہوتا ہے اور نفع بہت"۔

اس لیے ہمکو بہت زیادہ محتاط اور حد سے زیادہ متین نہیں ہونا چاہیئے جنکو ہم چاہتے ہیں اون سے اپنی محبت کا مناسب اظہار زیبا نہیں ہے

اس سے کیا فائدہ کہ ہمیں تو محبت ہو مگر تیوری پر بل اور پیشانی پر شکن ہو۔ اور چہرے پر سرد مہری
نہیں ہمکو ہمیشہ اپنے عزیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے اون سے گرمجوشی کے ساتھ
محبت کرنا چاہیئے۔ آدمیوں کو عملی اعانت کی نسبت ہمدردی سے زیادہ مدد ملتی
ہے۔ محبت دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ ایک پر لطف لفظ صد ہا روپیوں سے
زیادہ خوش آیند اور فرحت افزا ہوگا۔ جب لوگوں نے بنجمن ڈیسٹ سے
پوچھا کہ اسے کس چیز نے مصور بنا دیا تو اس نے کہا "میری ماں کے پیار نے"
چین کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کانفیوشیس کا قول ہے کہ "اگر خامی فرائض اچھی
طرح بجا لائے جائیں تو قربانی اور جاترا کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں"
دوستوں کے انتخاب میں نہایت احتیاط کرنی چاہیئے۔ کیونکہ بقول سروں
"اسباب زندگی میں سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ خوبصورت چیزیں ہیں" فارسی
نازکخیال انشا پرداز کہتا ہے ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکان بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

عربی کی ایک مثل ہے کہ "اگر کسی کا حال پوچھنا ہو تو اس کے دوست کو دیکھ لو"
جارج ہربرٹ کا قول ہے [illegible] رہو تم بھی اچھے ہو جاؤ گے" ٹیلی کہتا
ہے کہ "دوستی انسانی زندگی کا [illegible] ہے" اور جسکا کوئی دوست نہیں وہ
بہت قابل رحم ہے۔ خاص کر اس لیے کہ یہ غالباً خود اس کا ہی قصور ہے۔
یہ تو نہایت ہی مشکل ہے کہ ہمکو کبھی اپنے دوستوں سے کوئی شکایت
ہی پیدا نہو۔ لیکن ضرور نہیں کہ وہ رشتۂ الفت کو توڑ ہی دے۔ جب کبھی ہم
اپنے کسی دوست سے کسی بات پر ناخوش ہوں تو ہمکو صبر اور تحمل سے کام لینا
چاہیئے۔ اس معاملہ پر اپنے دوست کے نقطۂ خیال سے نظر ڈالنی چاہیئے۔

اگر اسوقت بات اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔ تو کچھ ہرج نہیں۔ جلدی کیا ہے۔ قدرت کبھی جلدی پسند نہیں کرتی تعجیل شیطان کا کام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسوقت اس خیال کو چھوڑ کر سو رہیں۔ جلدی میں کسی بات کا فیصلہ کرنے سے یہ بہتر ہے کہ بے فیصلہ کیے سو جائیں۔ نیند ہمارے اضطراب کو تسکین دیدیتی ہے۔ ہماری بیچینی کو کم کر دیتی ہے۔ اور ہمارے دلمیں اطمینان پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر باتیں جو رات کو بہت مکروہ اور ناپسند معلوم ہوتی ہیں صبحکو اوس کی نسبت بہتر نظر آتی ہیں۔ غرض تھوڑا سا تحمل بہت سی مشکلیں آسان کر دے گا سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کبھی جلدی سے لڑائی شروع نہ کرو پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیئے۔ پھر جو کچھ کرنا ہو کرو۔ اگر ہم اپنی وجہ شکایت اپنے دوست سے بیان کر سکیں تو اکثر شکایتیں رفع ہو جاتی ہیں۔ مگر اکثر لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ اور سب باتیں دل ہی دل میں رکھتے جاتے ہیں۔ جس سے روز بروز انقباض اور تکدر بڑھتا جاتا ہے۔ اور آخر کار دوستی دشمنی سے بدل جاتی ہے۔ مگر یہ ان لوگوں کی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ یہ انصاف صاف گوئی اور راستبازی دونوں کے منافی ہے۔

شریروں اور بیوقوفوں سے کنارہ کشی ہے۔ مگر انکو دشمن بنا لینا اس سے بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہمارے تعداد غیر محدود ہے۔ دوستوں کو ہم پر ہر طرح کا حق ہے۔ اور جو کچھ ہم ان کو دے سکتے ہیں اس سے ہم کو دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ مگر کسی دوست کو بھی دوست سے قرض مانگنے کا حق نہیں ہے کیونکہ بقول شکسپیئر "قرض خود بھی جاتا ہے اور دوست کو بھی لیجاتا ہے عربی کی مثل ہے کہ "قرض محبت کی مقراض ہے"۔ خود قرض کا لفظ ہی قطع تعلق پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اسکی اصل معنی کاٹنا ہیں ÷

غرض خوشی کی زندگی بسر کرنے کے لیے ضرور ہے کہ ہم اچھے دوست تلاش کریں۔ اور جب وہ ملجائیں تو اون کو ہمیشہ دوست بنائے رکھیں۔ اور اون کو کبھی بھول کر بھی خفیف سے خفیف شکایت کا موقعہ نہ دیں۔ اور اصل نکتہ یہ ہے کہ اگر ہم خود اچھے ہیں اور دوستی کے حقوق و فرائض کو جانتے ہیں تو ہم کو دوست مل بھی جائیں گے اور ہمارے دوست رہیں گے۔ ورنہ نہ یہ ہوگا نہ وہ ؛

محبت جسکا پہلا سبق ماں کی گود میں شروع ہوتا ہے۔ اسکا انتہائی امتحان کتخدائی ہے اور گھر جسکی سب سے بڑی برکت والدین کی شفقت۔ بھائی بہنوں کی الفت۔ اور بچپن کی یاد ہے۔ اوسکا آخری زیب و زینت کا سامان بیوی ہے جسپر یہ محبت آتی ہے تو ساری دنیا کو اپنے قوس قزح کے سے رنگوں سے خوشرنگ بنا دیتی ہے۔ اس ویک راگ سے ہر ایک دلمیں پریم کا چراغ جل اٹھتا ہے۔ جگنو کے پروں کی چمک سے لیکر بلبل کے نغموں کی چہک تک سب کچھ اسیکا کرشمہ ہیں۔ پرندوں کے چہچہے اور شاعروں کے ترانے سب اسیکا نتیجہ ہیں۔ اور پھر اس کا اثر جانوروں اور انسانوں پر محدود نہیں ہے بیجان چیزیں بھی محبت کے اثر سے خالی نہیں ہیں (باد بہاری کے جھونکے جبتک اسکا احسان نہ لیں تب تک کلیوں کو نہیں کھلا سکتے) باد بہاری کا نام ہے مگر اصل میں کلیاں اسی کے دم مسیحائی سے کھلتی ہیں ابر نیساں کا بہانہ ہے لیکن حقیقت میں پھول اسی کے نفس جاں بخش سے شگفتہ ہوتے ہیں ؎

در عدم ہم ز عشق شورے ہست
گل گریباں دریدہ مے آید

حقیقت میں وہ گھر جو کتخدائی کی برکت سے محروم اور بچوں کی میٹھی میٹھی باتوں کی آواز سے ناآشنا ہے وہ کبھی بھی سچے معنوں میں گھر نہیں کہا جا سکتا۔ کتخدائی ایک فرض ہے جسکو فطرت نے قایم کیا ہے۔ جسپر انسانیت نے زور دیا ہے جسکی مذہب نے تاکید کی ہے۔ اور جسے قانون لازمی کرتا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جسطرح اور جگہ دنیا میں گل بنجار کا وجود موہوم ہے اسی طرح کتخدائی بھی موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے۔ اگر اچھی بیوی سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں تو بری بیوی سے بڑھکر کوئی عذاب بھی نہیں۔ سعدی نے سچ کہا ہے ؎

زن بد در سرائے مرد نکو
ہمدریں عالم است دوزخ او۔

مگر جسطرح اور بہت سی باتیں ایک حد تک ہمارے قبضۂ اختیار میں رکھی گئی ہیں اسیطرح اکثر صورتوں میں شادی کو بھی مخزن راحت و مسرت یا منبع رنج و مصیبت بنانا زیادہ تر ہمارے ہی ہاتھ میں ہے حقیقت میں بہت سی چیزیں جو ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں وہ ہمارے ہی خیالات اور ہماری ہی طبیعت کا پرتو ہوتی ہیں یہ مطلب نہیں کہ اونکا خارج میں کوئی وجود ہی نہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم اونکو انہی رنگوں میں رنگا ہوا دیکھتے ہیں جس رنگ کا چشمہ ہم لگائے ہوئے ہیں۔ اگر ہم خود اچھے ہیں تو ہمارے ملنے جلنے والے۔ دوست۔ احباب۔ عزیز و اقارب۔ اہل و عیال سب ہی اچھے معلوم ہونگے اور اگر فی الواقع اچھے نہ بھی ہونگے تو آہستہ آہستہ اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہے تو نتیجہ کے برعکس ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ سچ ہے کہ حالت کتخدائی یا تو نہایت ہی

خوشگوار ہوگی یا انتہا درجہ کی تلخ اور ناخوش آیند شادی ایک نہایت اہم ذمہ داری ہے اور اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ حقیقت میں شادی آنکھ اور ناک سے نہیں ہوتی بلکہ دل اور دماغ سے ہوتی ہے۔ اور جو شادی اس کے برخلاف ہو وہ کبھی شادی کے نام کی مستحق نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ حقیقت میں شادی نہیں ہے بلکہ دو روحوں کو متحد اور دو جانوں کو ایک کردیتا ہے۔ یہ عمر بھر کا تعلق اور زندگی بھر کا ساتھ ہے ایک جگہ اٹھنا بیٹھنا۔ اور ایک مکان میں رہنا سہنا ہی نہیں ہے بلکہ رنج وغم میں۔ راحت و آرام تکلیف و مصیبت میں۔ خوشی وکامیابی میں غرض دنیا کی ہر ایک منزل اور زندگی کی ایک گھاٹی میں ایک جان ہے جو دو جسموں میں کام کرتی ہے۔ ایک روح ہے جو دو دلوں کو حرکت دیتی ہے۔

سٹیل کہتا ہے "حسب منشا شادی ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک نئی دنیا کا دروازہ ہے۔ نئی نئی خوشیاں اور نئے نئے مشغلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ شادی سے اس بات کا بڑا عمدہ موقعہ ملجاتا ہے کہ آدمی اپنی گذشتہ لغزشوں اور بچپن کی غلطیوں کو ہمیشہ کے لیے یک قلم چھوڑ دے۔ اور نئی ہمت نئی طاقت اور نئی امیدوں کے ساتھ اس نئی زندگی کی ابتدا کرے۔ دنیا میں جنت کی سب سے عمدہ مثال گھر ہے۔ جہاں شوہر اور بیوی ماں۔ اور باپ۔ بھائی اور بہن۔ بچے اور والدین سب اپنی اپنی مختلف روشوں پر ہر ایک کی اعانت و امداد کرتے ہیں جسقدر جنت گھر کی چار دیواری میں پائی جاسکتی ہے۔ اتنی باقی ساری دنیا میں ہی ملنی ناممکن ہے کیونکہ گھر سے باہر نہ کوئی ہمارے حالات سے اتنا واقف ہے نہ کوئی ہم سے اتنی محبت کرتا ہے۔ نہ کسی کو ہماری اتنی پرواہ ہے۔ نہ کسیکو ہم سے اتنی ہمدردی ہے اور نہ کسیکو ہمارے ساتھ اتنا تعلق ہے لیکن گھر میں ایک کی خوشی سب کی خوشی اور ایک کا غم سب کا غم ہے۔ گھر کا تعلق وہ تعلق ہے کہ ایک کی خود غرضی۔

[illegible]

"مجمعِ احباب"

احباب کا یہ مجمع یارب رہے سلامت
دل جس سے شادماں ہے حاصل ہے جس سے فرحت

آنکھوں کا نور ہے یہ، یہ دل کا سرور ہے یہ
آرام جان کا ہے تن کے لیے ہے راحت

جب غم ہوا تو مینے جی اس سے خوش کیا ہے
یہ لطفِ زندگی ہے، یہ باعثِ مسرت

مایوسیوں میں امید اسنے دلائی مجھکو
مجبوریوں میں اسنے دلکی بڑھائی ہمت

مجھکو اداس پاکر ہوتے ہیں دوست غمگیں
ہمدرد دل کے بنکر کرتے ہیں غم میں شرکت

یہ دوست بے ریا ہیں، یہ خوگرِ وفا ہیں
میری طرف سے ان کے دلمیں نہیں کدورت

غربت میں مجھکو ان کے اخلاق یاد آئے
مجھپر وطن میں بیحد ان کی رہی عنایت

یکساں بنا رہتے تھے یہ رسمِ دوستداری
ہو فقر یا امیری، غم ہو کہ عیش و عشرت

گو دوستوں کا مجمع اب ہوگیا پریشاں
رہتی ہے یاد لیکن آٹھوں پہر وہ حالت

برتاؤ وہ وفا کا، وہ لطف انتہا کا
وہ دوستانہ باتیں۔ یارانہ وہ حمیت

وہ ساتھ ساتھ رہنا ہر وقت اور ہر جا
دن ہو کہ رات کچھ ہو خلوت ہو یا ہو جلوت

آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ شکل اجتماعی
ایک ایک کی وہ صورت، ایک ایک کی وہ سیرت

وہ پیاری پیاری باتیں اب تک خیال میں ہیں
وہ ہم سنی کی شوخی وہ باہمی ظرافت

دل سے نہیں مٹے ہیں یاروں کے نقشِ اوصاف
پیشِ نظر ہے گویا اک نقشۂ رفاقت

اوصاف دوستوں میں گو مختلف تھے لیکن
اپنی کبھی کسی نے ظاہر نہ کی فضیلت

اللہ! دوستوں کی فرقت نہیں گوارا
دل کو قلق ہے ہر دم رہتی ہے جاں کو کلفت

ہنسنے کو بوسنے کو جی چاہتا نہیں اب
چہرہ پہ ہے اداسی، افسردہ ہے طبیعت

ہمراز تھے وہ میرے ہم بزم تھے وہ میرے — وہ میرے ہم سخن تھے وہ میرے ہم عقیدت
باہم نباہنے کے پیمان ہو چکے تھے — جائز نہ تھا تعصب ممنوع تھی رقابت
شیرازہ ٹوٹنے سے اوراق منتشر ہیں — اب وہ کہاں ہیں جلسے۔ اب وہ کہاں صحبت
میں بستر الم پر روتا ہوں چپکے چپکے — منہ فق ہے، رنگ اڑا ہے، جاتی رہی ہے شدت
کمرہ نشست کا بھی سونا پڑا ہوا ہے — عالم ہے ایک ہو کا چھائی ہوئی ہے وحشت
شب ہے تو شمع گل ہے۔ دن ہے تو فرش میلا — برباد ہو گیا سب سامان زیب و زینت
تفریح کے لیے اب میں کس کے ساتھ جاؤں — بچھڑے ہوئے ہیں سارے یارانِ بامروت
آنسو بہا کے دل کی حسرت نکالتا ہوں — یاد آتی ہے کبھی جب گزری ہوئی وہ صحبت
ہر قول فعل ان کا میرے لیے سبق تھا — میرے موافق آئی یاروں کی ہر نصیحت
اپنے لیے انہوں نے میرا برا نہ چاہا — گویا لہو بدن میں تھا جوہر شرافت

اوصاف دوستوں کے کیا کیا سناؤں محوی
پورا کبھی نہ ہوگا یہ نغمۂ ارادت

غزل

نظارہ سوز کیوں نہ رخ بے نقاب ہو — کچھ تو نگاہِ شوق کا آخر جواب ہو
ناکامیِ امید کے قربان جایئے — کیوں وقف آرزو دلِ حسرت مآب ہو
پایانِ درد و رنج کی مانند اے فلک — خمیازۂ نشاط میں بھی انقلاب ہو
ارمان مٹتے دیکھئے نہ جائیں گے اے خدا — مانوسِ اختلاط نہ رنگِ شباب ہو

شیرازۂ خیال کا محشر ہے ایک ورق
ارشد غضب ہو جمع اگر یہ کتاب ہو

غزنین[۵۱]

یورپ والے اس شہر کو غزنہ۔ غزنا۔ غزنی اور ایشیائی مورخ بالعموم غزنین کہتے ہیں قدیم زمانے میں زابلستان یا زابل کہتے تھے افغانستان کا ایک مشہور تاریخی شہر سطح آب سے ۷۲۶۷ فیٹ بلندی پر ۶۸ درجہ ۲۰۔ دقیقہ طول البلد شرقی اور ۳۳ درجہ ۳۴۔ دقیقہ عرض البلد شمالی کے درمیان واقع ہے۔ ازمنہ متوسط میں وہ مختلف خاندانوں کے وسیع سلطنت کا پایہ تخت رہچکا ہے اور برٹش انڈیا کی جدید تاریخ میں بڑا دلچسپ مقام ہوگیا ہے۔ جو سیدھی سڑک قندھار اور کابل کے درمیان گذرتی ہے اوسپر قندھار سے ۲۲۳ میل کے فاصلہ پر شمال و شرق اور کابل سے ۸۵ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب

---

[۵۱] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دہم صفحہ ۵۵۵۔ اور آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۹۳ جسمیں علامی ابوالفضل لکھتے ہیں "غزنین از سوم اقلیم و زابل عبارت ازیں پائی تخت سلطان محمود و سلطان شہاب الدین و برخے دیگر این ولایت را بیشتر **زابلستان** گفتندے برخے قندھار را داخل ایں بلاد شمرند حکیم سنائی و بسیارے ادیبارا خوابگاہ۔ زمستان او برابر سمرقند و تبریز نشان دہند۔ رودی از شمال بجنوب میرود و کشتزار و کاربداں سرسبز و شاداب۔ و کشاورزاں رنج بسیار برند۔ ہر سال خاک نو آورند تا کشت پذیر شود۔ و بیشتر از اراضی کابل برہ ہند۔ روئیں قراوان شود از یخ ہندوستان برند۔ و در زماں فردوسی کافی قبرے بود کہ چون در رود برد۔ خواندے در بیش آمدی۔ از پژوہش دیدہ وران آگاہ دل روشن شد کہ دستان سرائی دکانداران استخواں فریش است و سرچشمہ ایست کہ اگر قادر ذرات در افتد شورش بر دو بارندگی پدید آید۔ دیکھو واقعہ نگاری کی منزل کیسی کٹھن ہوتی ہے!!!

کیجانب واقع ہے خاص شہر کی موجودہ آبادی چار ہزار سے متجاوز نہوگی۔ شہر کے شمالی حصہ میں جو قلعہ ہے وہ سطح زمین سے ۱۵۰ فیٹ بلندی پر ہے۔ شہر پناہ بھی بلندی پر واقع ہے جسکا کچھ حصہ اینٹ و پتھر کا اور کچھ حصہ خام بنا ہے۔ اس کا دور بشکل مربع ایک میل کا ہوگا۔ اسپر بہت سے مینار بنے ہوئے ہیں۔ چوگرد وہ جو خندق بنی ہے اوس میں دریائے غزنی سے جو شہر کے قریب جانب مغرب بہتا ہے پانی آتا ہے۔ اسپر تین پھاٹک بنے ہیں۔ شہر کے مکانات اونچے اور کئی درجوں کے ہیں۔ عموماً گلیاں میلی اور بے ترتیب ہیں البتہ دو زیادہ سیدھی اور کشادہ سڑکیں وسط شہر سے گذرتی ہیں۔ دکن کا منظر بہت وسیع ہے قندھار کے سمت کا میدان بھی انتہائے نظر تک چلا گیا ہے۔ دریا کے قریب جہاں مواضعات اور باغات مجموعی لحاظ سے زیادہ ہیں گیہوں اور جو کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے۔ آب و ہوا بہت سرد ہے تین مہینہ تک برف پڑا کرتی ہے۔ مشہور ہے کہ کئی مرتبہ شہر برفباری سے برباد ہو چکا ہے۔ ایندھن کی قلت ہے۔ زیادہ تر خاردار جھاڑیاں جلانے کے کام آتی ہیں۔ کابل اور قندھار کی طرح گرمی تو نہیں پڑتی لیکن کشادہ اور مرتفع مقام ہونے کی وجہ سے رات اس لیے اور بھی تکلیف دہ ہو جاتی ہے کہ اوسوقت اکثر آندھی آتی رہتی ہے۔ بظاہر محمود کا عالیشان شہر موجودہ شہر پناہ کے اندر محدود نہ رہا ہوگا یہ ہوسکتا ہے کہ اسجگہ صرف قلعہ رہا ہو۔ ابن بطوطہ کی تحریر (۱۳۳۲ء) سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ آثار قدیمہ میں سے صرف دو مشہور مینار باقی ہیں۔ جنکا فاصلہ ۴۰۰ گز کا ہے۔ لیکن بلندی میں ہر ایک ۱۴۰ فیٹ ہے۔ یہ مینار دہلی کے قطب مینار سے نہ صرف چھوٹے ہیں بلکہ طرز تعمیر میں بھی اسکا اور انکا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ خطا کوفی میں جو کتبہ ہے اس سے

ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مینار سلطان محمود کا دوسرا اوس کے بیٹے سلطان مسعود کی تعمیر کرایا ہے۔ مینار محمود پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ السلطان الاکرم ملک الاسلام یمین الدولہ و امین الملۃ ابو المظفر ظہیر المسلمین معین المساکین ابو القاسم محمود نار اللہ برہانہ بن سبکتگین غازی الغازی امیر المومنین الرضا رضی العامۃ العالۃ العلیۃ قدمت بالیمن و البرکۃ۔"

مینار مسعود کی عبارت کی نقل یہ ہے وہو ہذا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امر السلطان الاعظم ملک الاسلام اعلام الملکۃ و الدولۃ ابو سعید مسعود بن ظہیر الدولۃ المحمود ابو ابراہیم نصیر الدین امیر المومنین یمین المملکۃ امین الملۃ مالک رقاب الامم سلطان المکرم الخاقان مولی ملوک العرب و العجم خلد اللہ تعالی ملکہ و سلطانہ و افاض علی العلمین برہ و احسانہ غفر اللہ لہ و لوالدیہ و لجمیع المسلمین۔"

ایک اور عبارت کی نقل ملی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ چھاٹک کے آخری حصہ پر کندہ تھی۔ غالب یہ ہے کہ قبر پر کندہ ہوگی وہو ہذا

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ غفران من اللہ للامیر الاجل السید الملک المولی امیر الدولۃ و امیر الملۃ ابو القاسم محمود بن سبکتگین رحمۃ اللہ علیہ و نور حمرتہ

کابل روڈ پر مینار محمود سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک موضع ہے جسکو روضہ کہتے ہیں یہیں ایک مختصر باغ میں اس مشہور فاتح کا مزار ہے۔ قبر سنگ مرمر کی ہے جو ایک معمولی پیڈسٹل کمرہ میں واقع ہے جسپر سبز کی کا ایک گنبد بنا ہوا ہے

لہ سر ولیم کنگ سوسائٹی آف بنگال جرنل مطبوعہ ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۰۱۔

جاہل افغان صاحب ہمت سلطان کے مزار کی بہت تعظیم کرتے ہیں کہ دور ہی سے پا برہنہ ہو کر نہایت عاجزانہ شکل سے آدمی داخل ہوتے ہیں۔ یہ موضع سبز اور شاداب باغوں کے درمیان واقع ہے جو ایک وسیع نہر سے سیراب ہوتے ہیں سلطان بابر نے روضہ کے انگوروں کی لطافت کی تعریف کی ہے۔ سومنات[۵۱] کا مشہور پھاٹک ۱۸۴۲ء تک اوس عمارت میں لگا ہوا تھا جسمیں محمود کی قبر تھی اوس کے بعد بحکم لارڈ البرہ ہندوستان میں لایا گیا غالباً گورنر جنرل موصوف کا یہ ارادہ رہا ہوگا کہ پھاٹک کو گجرات کے مندر میں پہونچا دیا جائے لیکن اوسے آگرہ ہی میں رکھا گیا۔ پھاٹک کا طول ۱۱ فیٹ عرض ۹ ½ فیٹ وزن ۵۰۰ پونڈ کے قریب ہے نیچے کا حصہ خراب ہوگیا ہے۔ یہ دروازہ دیودار لکڑی کا ہے جو ہمالیہ میں ہوتی ہے۔ اسپر اسلامی طرز کی مساحت کی شکلیں بنی ہیں اس لیے بظاہر اس کا سومنات سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ شاید اس روایت کی بنا اس واقعہ پر ہو

---

[۵۱] دروازہ روضۂ سلطان محمود کہ از چوب صندل ساختہ بودند با انواع نقش خوب و مرغوب و منشی ہرہن لال کہ در سنہ ۱۲۴۱ یکہزار دو صد و چہل و شش ہجری الغزنی رفتہ بود و زیارت روضہ مذکور نمودہ نوشتہ کہ مردم آنجا میگفتند کہ ہرگاہ کہ سلطان محمود سومنات را فتح ساختہ این دروازہ عالی را از آن بتخانہ آوردہ بود و امروز اعلم۔ و بعد ازان چون در سنہ ۱۲۵۵ یکہزار دو صد و پنجاہ پنج ہجری افواج سرکار کمپنی انگریزی برای امداد شجاع الملک دران دیار رفتہ کابل و قندھار و غزنین را فتح ساخت شاہ شجاع الملک از تخت نشانیدہ دست محمد خان والی آن ولایت را اسیر نمود و بعد از چند سال اکبر خان پسر دست محمد خان مگناٹن صاحب بہادر را بدغا بکشت و اکثری را گرفتار ساختہ قید نمود سرداران انگریز ہنگام معاودت ازان دیار تختہ غزنین را مسمار ساختہ آن دروازہ صندلی را از مغتنمات تصور نمودہ باز ہندوستان آوردند و آن را حالا قبلہ اکبر آباد باحیاط تمام نگاہ داشتہ اند" مفتاح التواریخ مصنفہ مسٹر ٹامس ولیم بل صفحہ ۳۵

کہ شاہ شجاع نے جب رنجیت سنگھ سے صلح کے بعد کابل کا تخت حاصل کرنے کی غرض سے مدد چاہی تو راجہ نے یہ بھی ایک شرط پیش کی تھی کہ سومنات کا پھاٹک اوسے واپس کر دیا جائے۔ ایک اور روایت کپتان کلاڈ ڈی ویڈ کی رپورٹ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۸۳۱ء میں درج ہے کہ شاہ شجاع نے مہاراجہ کو ایک پیشین گوئی یاد دلائی تھی کہ غزنین سے پھاٹک لیجانا سکھوں کی زوال حکومت کا پیش خیمہ ہوگا۔ سلطان محمود کی دوسری یادگار بند سلطانی دریائے غزنی پر شہر سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے بنہنشاہ بابر نے اس بند کی اونچائی غالباً معہ ڈھال کے ۱۰۰ فیٹ اور لمبائی ۱۰۰۰ فیٹ لکھی ہے ۱۱۵۰ء میں علاء الدین نے جب شہر کو غارت کیا تو یہ بند بھی خراب و خستہ ہو گیا تھا لیکن بابر نے اوس کے مرمت کا صرف خود دیا۔ یہ بند صاحب اسکی بلندی صرف ۲۵ فیٹ بتاتے ہیں اور قابل مرمت لکھتے ہیں۔ اس بند سے غزنین کے مغربی میدان کی آبپاشی میں مدد ملتی ہے۔ غزنین کے گرد و نواح میں بہت سی متبرک زیارت گاہیں ہیں جن کے چوروپہ انگور کے باغات ہیں کہا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ میں اون لوگوں کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے جو سلطان محمود کے قبر کی زیارت کر کے واپس جاتے ہیں۔ زایرین سے سوالات کر کے اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ غزنین کے مشہور مقامات دیکھ آئے ہیں یا نہیں۔ ورنہ وہ بالتفصیل اون کے ذکر سے معذور ہونگے جن کی صفت فارسی کے چند اشعار میں کی گئی ہے۔ غالباً واقعہ نگار ان انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مطلب ذیل کے اشعار سے ہوگا ؎

نشانے شہر غزنی چار چیز است — کسے داند کہ او اہل تمیز است
اول دروازہ سلطان دیندار — سہ گنبد ہر سہ گنبد سرنگوں سار
دوم طاقی است در سقف منارہ — کہ افتد آفتاب از ہر کنارہ

سوم سقادۂ سنگ رقام است میان مسجد جامع مدام است
چہارم مسجد ارباشش گویند کہ کج محراب قبلہ راست گویند

سکندر اعظم کے زمانہ کے واقعہ نویسوں یا کسی قدیم مصنف نے اس شہر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے اس کے قدیمی حالات معلوم نہیں ہوئے ممکن ہے کہ یہ وہی گزیکا ہو جسکو ٹالمی پیرو پیڈیا میں بتلاتا ہے اور سراپیچ رائنس کے خیال کے موافق وہی کاسرس ہندوستانی شہر ہو جسکا ذکر دو قدیم یونانی شعرا نے کیا ہے کہ وہ مشہور جنگی اور ناممکن التسخیر شہر ہے اس نام کا مخرج غالباً فارسی و سنسکرت کے الفاظ گنج و گنجاہوں گر جنکے معنی خزانہ کے ہیں جیسے یونانی و لاطینی زبان میں گزہ کہتے ہیں مسلمانوں کے زمانہ ۴۲۲ھ سے قبل بھی اس شہر کے وجود کی شہادت میں ہمارے پاس چینی سیاح ہیون تسینگ کا سفرنامہ موجود ہے جو ہوسینا (غالباً غزنا) کا ذکر کرتا ہے کہ وہ مقام تاسوکوٹا یا آزکو سیا کے دار الحکومت میں سے ایک مشہور مستحکم اور جنگی مقام تھا۔ مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ میں غزنین سے ملا ہوا ملک زابل کہلاتا تھا جسوقت مسلمانوں کا پہلا حملہ اس ملک پر ہوا ہے اوسوقت غزنین ہندوستانی تجارت کا ایک زبردست مرکزی مقام تھا۔ تجارت کا اندازہ ابن حوقل کے بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ کابل میں قریب دس لاکھ پونڈ کی نیل سالانہ فروخت ہوتا تھی۔ اس شہر پر مختلف سلطنتوں اور خاندانوں کا اسلامی پرچم لہرایا گیا۔ جو معلوم ہے کہ غلزئی پر واقع تھے یا غزنین کے قریب آباد تھے اوپر اوایل زمانہ یعنی خلافت معاویہ (۴۱ھ - ۶۰ھ) ہی میں مسلم ہو چکا تھا۔ یعقوب بن لیث نے کابل و زابلستان کو ۲۵۳ھ میں فتح کیا۔ اگرچہ کابل کا ہندو خاندان ہنوز دریائے کابل کے ایک حصہ پر محمود کے زمانہ تک قابض رہا۔ یہ وہی زمانہ تھا

جس کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزنین میں اسلامی حکومت نے استقرار پکڑا۔
ایک مسلمان سرخ نے قلعہ اور شہر کا بانی تعمیر یعقوب کے بھائی عمر بن لیث
(وفات ۹۰۰ء) کو ٹھہرایا ہے لیکن قرائن سے اسکی تائید نہیں ہوتی۔

نویں صدی کے آخری حصہ میں سامانی خاندان نے سمرقند میں زور پکڑ کر
بخارہ میں بڑے شان و شوکت سے سلطنت کی۔ یہ خاندان اکیوتیس برس تک
قایم رہا۔ اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ ہجری میں وفات پائی اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل
اور ان کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ ملک الشعرا رودکی اسے تاجدار
کے دربار کا گل سرسبد تھا۔ ۳۰ برس کے حکمرانی کے بعد ۳۳۱ھ ہجری میں
وفات پائی اس کے بعد نوح فرمانروا ہوا جو علوم و فنون کا بڑا حامی و سرپرست
تھا حکیم ابو نصر فارابی سے فلسفہ یونانی کے بیشمار تصنیفات کا از سر نو ترجمہ
کرایا جس کے بدولت فارابی دنیائے اسلام میں معلم ثانی مشہور ہوا۔ سامانی خاندان
کا ۳۹۵ھ میں اسمٰعیل بن عبد الملک کے بعد خاتمہ ہوگیا خاندان غزنویہ اس حکومت
کی ایک شاخ ہے ۳۵۰ھ ہجری میں الپتگین جو ترکی غلام اور اسی خاندان کا پروردہ
تھا ترقی کرکے امارت کے درجہ تک پہونچگیا عبد الملک نے اس کو
خراسان کا حاکم مقرر کردیا جب منصور بن عبد الملک تخت نشین ہوا تو الپتگین
خراسان سے غزنین چلا گیا اور یہاں اپنی حکومت قایم کی ۱۶ برس کے
بعد جب اسکا انتقال ہوگیا تو اسکا جانشین ابو اسحاق اسی کا بیٹا ہوا۔ لیکن
چند روز بعد وہ بھی فوت ہوگیا۔ الپتگین کا ایک ترکی اور غلام سبکتگین نامی
تھا اس نے اپنے آقا کے عہد میں قابلیت کے ایسے ایسے جوہر دکھائے تھے
کہ ابو اسحٰق کے بعد ۳۶۵ھ ہجری میں لوگوں نے اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کردیا
یمین الدولہ امین الملۃ سلطان محمود غزنوی انار اللہ برہانہ اسی نامور سردار سبکتگین

بانی سلطنت غزنویہ کا سنہ رہ ہے جسنے سبزپوش غزنین کو شہرت کا آسمان بنادیا یہ سلطان سیف وقلم دونوں کا مالک تھا یہ مضمون اوسی کی علیحدہ مستقل صالحات زندگی کا ایک جزو ہی۔ فقہائے حنفیہ کے حالات میں جواہر مضید ایک معتبر کتاب ہے اسمیں محمود کو فقہا کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔ فقہہ میں خود سلطان محمود کی ایک مبسوط تصنیف کا پتہ لگا ہے۔ غزنین میں اوس نے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا۔ ملک کے مشاہیر کو بلاکر دربار میں جگہ دی۔ اس کے دربار کے سبع سیارہ عنصری وفردوسی وغیرہ کے حالات تم المحمود میں پڑھوگے اور دیکھوگے کہ کس طرح سلطان کے نام کے ساتھ غزنین اور خاندان غزنویہ نے بقائے دوام حاصل کیا۔ اوسکی حکومت کرمان سے سمرقند تک اور کیسپین سے سواحل گنگا تک پھیل گئی تھی محمود ۴۲۱ھ میں فوت ہوا اوس کے بعد ۱۴ بادشاہ اوس کے نسل سے فرمانروائی کرتے رہے۔

ابراہیم کا زمانہ (۱۰۹۹-۱۰۵۹) بعض ترقیوں کے لحاظ سے سرسبز زمانہ کہا جاسکتا ہے لیکن سلطنت پر پچھلی شان وشوکت کو نہ پہونچی۔ غزنویہ کے بعد سلجوقیوں اور غوریوں نے زور باندھا۔ بہرام شاہ (۱۱۵۲-۱۱۱۸) نے غور کے ایک شاہزادہ قطب الدین کو قتل کرادیا تھا سیف الدین نے بھائی کا بدلہ لیا اور بہرام کو بھگا دیا لیکن بہرام نے ۵۴۷ھ میں پھر شہر پر قبضہ کرلیا سیف الدین اور اس کے وزیر کو گرفتار کرکے ذلت کے ساتھ شہر کرایا اور بعد میں دونوں کو پھانسی دلوادی۔ بہرام شاہ کے تخت نشینی پر سید حسن نے ایک قصیدہ کہا تھا جسکا مطلع یہ ہے۔

ندای برآمد ز ہفت آسمان کہ بہرام شاہ است شاہ جہان

حکیم سنائی نے اپنی مشہور کتاب حدیقہ الحقیقہ اسی بادشاہ کے نام سے منزین کی ہے جسکا ایک شعر یہ ہے ؎

عرش گر بارگاہ راز یبد　　شاہ بہرام شاہ راز یبد

اصل کتاب عربی ہے کلیلہ و دمنہ بھی اس کے نام پر لکھی گئی ہے۔ علاء الدین غوری نے دونوں مقتول شاہزادوں کے خون کا بدلہ لینا چاہا اور فوج کثیر جمع کر کے ہنڈ کے قریب بہرام کا مقابل ہوا اور متواتر کامیابی کے بعد غزنین پر قبضہ کر لیا جسے قتل و غارتگری کے بعد جلا کر خاکستر کر دیا۔ سلطان محمود کی قبر سے تو تعرض نہیں کیا اور اکثر کی لاشیں قبر سے نکالکر جلوا دیں اسی واقعہ کے بعد سے ملقب بہ جہانسوز ہوا۔ علاء الدین کی واپسی پر بہرام پھر غزنین پر قابض ہو گیا اور ۱۱۵۲ء میں وفات پائی اوس کے بیٹے خسرو شاہ کے وقت میں غزنین پر ترکان غزان قابض ہوئے جنکو اب عام طور پر ترکومن کہتے ہیں بادشاہ لاہور کو بھاگ گیا ۱۱۷۳ء میں ترکان غزان کو غیاث الدین سلطان غور نے نکالدیا جو علاء الدین جہانسوز کا بھتیجہ تھا۔ اور اپنے بھائی معز الدین کو غزنین حوالہ کیا۔ اسی مشہور شہزادے نے جو بعد میں شہاب الدین غوری کے نام سے پکارا گیا تھوڑے ہی دنوں بعد (۱۱۷۵-۷۶ء) میں ہندوستان پر حملہ کیا اور ملتان اور اوچ کو فتح کیا۔ خاندان غزنویہ کا آخری شاہزادہ خسرو ملک لاہور کا حاکم تھا وہ گرفتار کیا گیا اور بحالت قید غور کے پہاڑی میں فوت ہوا ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راے یا تھہورا کو جو اجمیر کا راجہ تھا۔ شکست ہوئی اور وہ تھانیشر کے قریب مارا گیا۔ اور غزنین کا مفتوحہ ملک اجمیر تک غوری بادشاہ کے زیر حکومت آیا۔ غیاث الدین کے مرنے کے بعد معز الدین غور و غزنین کا پورا مالک بن گیا اور غزنین پر کچھ مزید

عرصہ کے لیے ایسی حکومت کا صدر مقام ہوگیا جو وسعت میں محمود بن سبکتگین کی سلطنت سے کم نہ تھی۔ معز الدین پنجاب کے کھکروں کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے ایکبار اور دریائے سندھ کے پار آیا واپسی کے وقت کسی کھکر یا ملاحدہ نے اوسے قتل کر ڈالا اور غزنین کچھ دنوں تک خوارزم کی سلطنت کا جز ہوگیا۔ جلال الدین بن محمد شاہ خوارزم نے غزنین کو صدر مقام بنایا کابل کے اوتر بمقام پروان منگولوں کی فوج کو جلال الدین نے شکست دی لیکن چنگیز خاں نے جلال الدین کو بھگا کر چھوڑا اور لغتائی خاں کو غزنین کے محاصرہ کو بھیجا۔ اس کے بعد سے غزنین کا نام تاریخوں میں بہت کم آیا ہے ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس شہر کا زیادہ حصہ ویران تھا صرف ایک حصہ میں آبادی تھی۔ غزنین میں تیمور کی آمد کا حال تو نہیں پایا گیا البتہ یہ معلوم ہوسکا ہے کہ ۱۴۰۱ء میں اوسنے کابل۔ قندھار اور غزنین کی حکومت پیر محمد اپنے پوتے کو دی تھی۔ ابوالفضل نے صرف اسقدر لکھا ہے۔

"دو سال صد و ہفت ہجری در حکومت ہشام بن عبدالملک امین بن عبداللہ قشیری (حاکم خراسان) غور غرجستان و ملک نیمروز کابل را بدست آورد و حاکم نشین خود ساخت و ازاں پس ہموارہ در زمان بنی امیہ و بنی عباس حاکم خراسان داشت تا آنکہ در زمان سامانیان الپتکین نام غلام آں خاندان جدا شدہ غزنین و کابل را متصرف شد و دم استقلال بر زد۔ و چوں در گذشت سبکتگین پدر محمود بکلاتی ایں دیار قرار گرفت۔ و ہمچنیں در تحت تصرف غزنویان بود سپس بغوریان و پس ازاں بغلامان آنہا کہ یکے ازاں تاج الدین یلدوز بود۔ و پس ازاں بخوارزمیان و لشکر قاآن بزرگ چنگیز خاں استیلا یافت و از انجا بصاحبقرانی باز گردید و فرزندان دولت افزائی او معدلت آرا شدند" الغ بیگ میرزا بھی جو

مشہور ہیئت داں تھا غزنین اور کابل کا حاکم رہچکا تھا ۱۵۰۴ء میں دونوں جگہ پر بابر کا قبضہ ہوگیا وہ اپنے تزک میں اسکا کچھ حوالہ دیتا ہے اوس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر اوسوقت برباد ہوچکا تھا وہ تعجب کرتا ہے کہ کیوں اون تاجداروں نے جو ہندوستان اور خراسان پر فرمانروائی کرتے تھے اس جگہ کو صدر مقام تجویز کیا تھا۔ البتہ وہاں کے باغوں اور پھلوں کی تعریف کرتا ہے۔ نادرشاہ کے حملہ ۱۷۳۸ء سے قبل غزنین خاندان تیموریہ کے قبضہ میں رہا کیا۔ نادر کے بعد احمد شاہ درانی قابض ہوا۔ مسٹر جارج فارسٹر جو ۱۷۸۳ء میں ایک قافلہ کے ساتھ ہیئت بناکر بطور سیاح گئے تھے لکھتے ہیں کہ شہر کی نازک حالت کو کسیقدر ہندوؤنکا خاندان سنبھالے ہوئے ہے جو اپنی تجارت کے ذریعہ سے مسلمان باشندوں کی ضرورت رفع کرتے رہتے ہیں۔ ۲۳ جولائی ۱۸۳۹ء کو سر جان کین کے ماتحتی میں برٹش فوج نے غزنین پر قبضہ کیا تھا اب یہ مقام بادشاہ کابل کے زیر حکومت ہے۔ خاکسار سید عبدالسبحان

محمڈن یونیورسٹی۔ منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی نے جنکی قابلیت سے ملک اچھی طرح واقف ہے حال میں یہ نظم لکھی ہے خیالات کی پاکیزگی تشبیہات و استعارات اور سب سے زیادہ حسرت نصیب قوم کی حالت زار انمیں کچھ اس درد سے کھینچی ہے کہ اکثر مصرعے نشتر کا کام کرتے ہیں اس نظم کے ہر بند سے مولانا کی قادرالکلامی کے علاوہ وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جب سر آغا خاں چارٹر لے چکے اور قوم خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتی۔ نظم واقعی اسکی مستحق تھی کہ کرنل حاجی محمد عبیداللہ خانصاحب نے اسکو اپنے حکم سے شائع کروایا۔ ہم اس بے نظیر نظم کی داد کن الفاظ میں دیں البتہ یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ایسے بزرگ کی عمر میں برکت دے۔ ناظرین تمدن آیندہ پرچہ میں یہ بیش بہا نظم ملاحظہ فرمائیں گے ✣

عالمِ خیال
کا
تیسرا رُخ

مئی کا رسالہ یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ ہمارے محترم مولوی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی، کی یہ نظم ہماری درخواست کے جواب میں موصول ہوئی۔ مولانائے موصوف کا دم قوم کے واسطے غنیمت، اُردو لٹریچر کے واسطے نعمت، اور ہمارے واسطے برکت ہے باوجود عدیم الفرصت اور دائم المریض ہونے کے مولویصاحب کا یہ احسان اور خدمت ایسی چیزیں نہیں کہ انکا شکریہ ادا ہو سکے۔ مولانائے محترم کا کلام ہمارے نوٹ کا محتاج نہیں، یہ وہ سدا بہار پھول ہیں، جو ہمیشہ مہکتے رہیں گے البتہ ہمیں اتنا کہنا ہے کہ مولانا شوق، نے ابتک عالمِ خیال کے تین رُخ لکھے ہیں، پہلا رُخ وہ ہے جس میں فرقت زدہ عورت شوہر کی یاد میں محو خود اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے،

دوسرا رُخ وہ ہے کہ پردیس سے شوہر کی آمد آمد تھی، مگر عذر کا خط آیا کہ ابھی نہیں آسکتا، فرقت نصیب عورت نے پریشان ہو کے اُسے خط لکھا ہے،

یہ دونوں رُخ لکھنؤ کے نامی رسالہ الناظر میں شائع ہو چکے ہیں،

تیسرا رُخ یہ ہے، جو "تمدن" میں شائع کیا جاتا ہے، شوہر نے عورت کے خط کا جواب لکھا ہے،

تمھارے خط کو دیکھا نظر اُسی میں گھر گئی تمھاری شکل خط کے ساتھ پتلیوں میں پھر گئی

ہے لفظ لفظ خط کا درد و غم کی داستاں سے
قلم تمہارا دل بنا وہ بول اُٹھا زبان سے
تمہارے سب گلے بجا، تڑپ بجا، الم بجا،
تمہاری سب شکایتیں، تمہاری ہی قسم بجا
وہاں جو دل میں درد ہے، یہاں بھی آہ سرد ہے،
وہاں جو رنگ زرد ہے، یہاں بھی رُخ پہ گرد ہے
اُدھر بھی چوٹ، اِدھر بھی ہے، نہ تاب اُدھر، نہ تاب اِدھر
نہ چین اُدھر، نہ چین اِدھر، نہ خواب اُدھر، نہ خواب اِدھر
اُدھر ٹہل[1] کے شب کٹے، اِدھر تڑپ کے شب کٹے
یہ سوچ شام ہی سے ہو کہ دیکھیں رات کب کٹے
تمہارا چین میں ہی تھا، جو ڈور میں تو ڈور وہ
سرور میرے دم سے تھا، نہ میں نہ آپ سرور وہ
میری خوشی تمہیں سے تھی، نہ تم نہ اب خوشی مری
فراق چھین لے گیا رولا کے سب خوشی مری
وہ دن خیال ہو گئے، وہ راتیں خواب ہو گئیں
وہ دو دلوں کی راحتیں سب اضطراب ہو گئیں
نہ ان لبوں پہ وہ ہنسی نہ رُخ پہ آب وہ رنگ ہے
نہ روح میں وہ تازگی نہ دل میں وہ اُمنگ ہے
شباب، رنگ، حُسن، ان کی صورتیں بگڑ گئیں
گھروں میں لوٹ پڑ گئی تو بستیاں اُجڑ گئیں
جہاں کوئی دوسرا جو غم سے پاک ہو کہیں
تو ہم تم اِس جہان سے نکل چلیں، رہیں وہیں
یہاں ہزار آفتیں، اِنھیں میں دل گھرا کریں
یہاں ہزار گردشیں، اِنھیں میں سر پھرا کریں
وہ مُلک چل کے ڈھونڈ لیں، جہاں نہ آسمان ہو
جہاں نہ اِس کے ظلم سے مصیبتوں میں جان ہو
جہاں نہ ہو اجل کہ "اِس" کو "اُس" کا داغ دے سکے
جہاں زمین ہی نہ ہو کہ گور منہ میں لے سکے
جہاں نہ کوئی فکر ہو، نہ بھوکھ ہو، نہ پیاس ہو
جہاں نہ ہیں اُداسیاں ہوں، جہاں نہ تم اُداس ہو

[1] عورت نے خط میں لکھا تھا کہ ٹہل ٹہل کے رات کاٹتی ہوں، شوہر نے یہ اُسی کا جواب دیا ہے۔

تمھارے[۱] آنسوؤں کے داغ خط میں جس جگھ پڑے
وہ خط سے میرے دلمیں آ کے، داغ بنکے، رہ پڑے
تمھاری[۲] عمر ہو دراز، اجل کا نام چھوڑ دو
لحد کے مُنہ میں خاک، مُنہ سے یہ کلام چھوڑ دو
ہُوا لحد کے سبزے کی بھرے نہ پھر دماغ میں[۳]
ہے سبزہ نرم اور ہرا تمھارے خانہ باغ میں
نہ تم ہو بھولنے کی شے، نہ تم ہو چھوٹنے کی شے
قسم خدا کی، تم ہو دل میں اور دل بغل میں ہے
نظر میں کھب، کے، نور بن کے، تم مری نظر میں ہو
جمال بن کے دل میں ہو، خیال بن کے سر میں ہو
تمھاری مُسکراہٹوں کو یاد کر رہا ہوں میں
کھلیں نہ دانت، اِس ادا پہ صاد کر رہا ہوں میں
وہ لب، وہ اُن کی جنبشیں مری نظر کو یاد ہیں
وہ ہلکی ہلکی چٹکیاں مرے جگر کو یاد ہیں
وہ ترچھی ترچھی چتونیں ستم کریں پھریں جدھر
وہ کالی کالی پتلیاں، کبھی اُدھر، کبھی اِدھر
وہ بال کھول کر کبھی جھٹک کے سر کو تھامنا
لچک پڑے بدن تو پھر لپک کے در کو تھامنا
لبوں کو اپنے پونچھنا وہ آرسی کو دیکھکر
نہ پھیل جائے تاکہ رنگ پان کا اِدھر اُدھر
وہ ناز کی کہ تم نے کہہ کے یہ اُتاری آرسی
گراں ہے میرے ہاتھ پر، جڑاؤ بھاری آرسی
وہ ناپسند لونگ کا بھنویں چڑھا کے پھیرنا
وہ میری سمت پھر نظر کو مُسکرا کے پھیرنا
گلوریوں کی صورتیں وہ خوش نما نئی نئی
سپید پان اوپر اور اندر اُس کے پستی

---

[۱] عورت نے خط میں لکھا تھا کہ میرے آنسو اور خط کے کچھ حرف بگڑ گئے، یہ اُس کا جواب ہے۔
[۲] عورت نے لکھا تھا کہ زندگی سے درگذری، اب میں موت کی تمنا کروں گی، شوہر نے یہ اسکا جواب دیا ہے،
[۳] عورت نے شوہر کو لکھا تھا کہ اگر تم آ کے مجھے نہ پاؤ گے تو کیا میری لحد پہ آؤ گے، لحد کے سبزے کو ضرور دیکھنا کہ وہ نرم اور ہرا رہے، سوکھ کے خار نہ ہو جائے، یہ اوس کا جواب ہے،

وہ سادگی تمھاری، بانکپن کو شہ دیے ہوئے
وہ شوخیاں، حیا کو اپنی گود میں لیے ہوئے
سحر کے وقت پھینکنا گلے سے ہار اُتار کے
بچھونے سے وہ جھاڑنا، گریں جو پھول ہار کے
وہ ہار مجھ کو یاد ہے، کہا تھا دیکھ کر جسے
ہیں موگرے کے پھول کم، نہیں ہے نتھ میں اِسے
کرخت بو ہے، سر میں درد ہوگا، دور ڈال دو
نہیں تو کامنی کے پھول چُن کے تم نکال دو
پلنگ اپنا کھینچکر وہ چاندنی میں لیٹنا
ہوا سحر کی سرد ہو تو جسم کو سمیٹنا
ذری کریب سے وہ چڑھ کہ چھُپتی ہے یہ خارسی
پسند صرف ململ اور گلبدن بنارسی
وہ چوڑیوں کا پھیرنا، کہا تھا دیکھ کر جنھیں
چھُپیں گے اِن کے گوکھرو، نہ پہنوں گی کبھی انھیں
کہو، بدل کے لائیں ایسی چوڑیاں، بڑے میاں
کہ تین تین بانکیں، چار چار ہوں کہ بلیاں
گراز مرد ایک شب جو ٹوٹ کر بلاق سے
تم اُس کو ڈھونڈھنے لگیں، چراغ لیکے طاق سے
تمھیں تو وہ نہیں ملا، مگر میں اُس کو پا گیا
دیا تو پھر تمھیں مگر میں اُس گھڑی چھُپا گیا
مری ہنسی پہ وہ تمھارا پیچ و تاب یاد ہے
وہ تیوریاں چڑھی ہوئی، وہ اضطراب یاد ہے
غرض، خُدا سے ہے دعا کہ تم ہو اور جہان ہو
تمھیں تو میری روح ہو، تمھیں تو میری جان ہو
تمھارا زیور اور آئے میرے پاس ٹوکرے پر[1]
لگا ہا تھ پھر گلشن کا یہ تم نے دل کو تاک کر

---

[1] عورت نے لکھا تھا کہ یہ زیور تمھارے ہی لیے تھا اور تم آکے اسے دیکھتے ہی نہیں، تو اب میں بکس میں بند کر کے تمھارے ہی پاس بھیج دوں، یہ اُسی کا جواب ہے۔

تمھاری[1] بدظنی بجا، مگر غلط، مگر غلط
یہ آنکھیں بے وفا نہیں تو پھر تمھیں کیوں نظر غلط
نظر میں تم، جگر میں تم، تو کون دخل پا سکے
مکان سب گھرے ہوئے ہیں، کون ان میں آ سکے
قسم تمھارے گیسوؤں کی، جن کے بیچ میں ہے دل
قسم تمھارے صاف رُخ کی، جس پہ ہے سیاہ تل
قسم تمھاری پتلیوں کی، جن کی ہر نظر بلا
قسم تمھارے ابروؤں کی، جن کے بس میں کربلا
قسم تمھارے اُن لبوں کی، جن کا رنگ لال ہے
قسم تمھارے گھونگھروؤں کی، جن کے پاس جال ہے
قسم تمھارے سر کی، جس کے بال ہیں بڑے بڑے
قسم نظر کی، سحر جس سے پائے نرگ اگر لڑے
قسم تمھارے دل کی، جس میں بارہا پھرا ہوں میں
قسم تمھارے وسوسوں کی، جن میں اب گھرا ہوں میں
قسم تمھارے اُس سخن کی، طنز جس کا کام ہے
قسم تمھاری اُس چھری کی، ناز جس کا نام ہے
قسم تمھاری اُس ہنسی کی، جس سے گل کھلا کرے
قسم تمھاری اُس زبان کی، مجھ سے جو گلا کرے
قسم تمھارے اُس غضب کی، سُرخ جس سے گال ہوں
قسم تمھاری اُس حنا کی، ہاتھ جس سے لال ہوں
قسم شکن کی، جب جبیں پہ ناز اُس کو ڈال دے
قسم صدا کی، بات کو جب اُٹھ کے سانتہ ٹال دے
قسم گلے کی، جس سے زیب موتیوں کے ہار کو
قسم دہن کی، جس سے دانت دیں شکست انار کو
قسم ہے اُنگلیوں کی، دل کو چھین لیں وہ جب ملیں
قسم ہے رُخ کے سائے کی، زمین پہ جس سے گل کھلیں
قسم ہے بے رُخی کی، جس کو پھر کے رُخ عیاں کرے
قسم ہے خامشی کی، جب نگاہ کچھ بیاں کرے،

[1] عورت نے اگرچہ اظہار بدگمانی کے ساتھ ہی اپنی زبان لپیٹ دی تھی، لیکن اخلاقاً شوہر نے یہ جواب دیا ہے،

قسم ہے تن کی، قدِ آدم آئینہ جسے کہوں
قسم ہے قد کی، جس کا سایہ بن کے کاش میں رہوں
قسم تمھاری چال کی ہے، جس کے ساتھ حشر ہے
قسم قدم کی جنبشوں کی، جن کے ساتھ نشر ہے
غرض تمھارے حسن کی قسم، یقین مان لو
مرے جگر میں اور دل میں ہو تمھیں، یہ جان لو
یہاں میں آکے پڑ گیا تجارتوں کے پھیر میں
جب آن میں گتھیاں پڑیں، تو سلجھیں جا کے دیر میں
نہ چھوڑ دو اپنا آسرا، نہ توڑ دل کو یاس سے
نہ تم اُمید کو ہٹا دو اپنے دل کے پاس سے
گلے نہ پھر گلے رہیں گے مجھ کو پا کے ایک دن
ہنسی نہیں گے سب گلے لبوں پہ آ کے ایک دن
میں خط میں چین بھیج دوں، جو تم کو چین آ سکے
نظر تو پا ہی جائے گی، مگر جو دل بھی پا سکے
یہ خط ہے میرے ہاتھ کا، اسی کو چین جان لو
میں بیسویں دن آؤں گا، یقین اس کا مان لو
میں[۵۱] اس خبر سے خوش ہوا کہ زندہ ہے چکور ابھی
تمھارے پاس ہے تمھارا وہ حسین مور ابھی
پپیہے[۵۲] خوش رہیں کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں
جواب کہیں وہ "پی کہاں" تو تم کہو کہ آتے ہیں
یہ خط تو ختم ہو چکا، پیام اب ہے شوق کا
دعائیں اب ہیں شوق کی، سلام اب ہے، شوق کا

احمد علی، شوق، قدوائی

---

۵۱ عورت نے خط میں لکھا تھا کہ چکور جسے تم پال گئے ہو، اُسے گودیں لے لے کے میں تمھیں یاد کرتی ہوں، یہ اوس کا جواب ہے،

۵۲ عورت نے خط میں لکھا تھا کہ گھر میں انار کا پیڑ ہے، اوس پر پپیہے روز آتے ہیں، اور مجھے شرم سے چپ پاتے ہیں تو مجھ پر ترس کھا کے تمھیں پکارتے ہیں، یہ اوس کا جواب ہے،

ضمیرہ

(۲)

ان الفاظ کے ادا ہونے سے قبل نا امیدی کی خوفناک تصویر ذہن کے سامنے تھی جس نے بجلی کی طرح دلپر گر کر حواس باختہ کر دیا تخیل نے باصرہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور سائی کولوجی کا ایک مشہور مسئلہ اسطرح حل ہوا کہ ضمیرہ جو بے تابانہ قبر سے لپٹ رہی تھی بالکل خاموش ہو گئی اور اسکو ایسا معلوم ہوا کہ ماں کے محبت بھرے ہاتھ قبر سے باہر نکلکر اس کے گلے میں آئے اور سینہ سے چمٹا لیا وہ اب چکنی مٹی کے ڈھیر سے چپکی لپٹی پڑی ہوئی تھی آنکھیں بند تھیں اور روحانی تعلق محض تخیلات کی مدد سے یہ یقین دلا رہا تھا کہ اسکا سر ماں کی گود میں ہے۔

ایسے سنسان وقت میں جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوسوں آدمی یا جانور کا پتہ نہ تھا درخت اور اس کے پتے پودے اور ان کے پھول قبریں۔ اور ان کے کھڑے۔ غرض ہر چیز تابنے کی طرح تپ رہی تھی ایک فاختہ نے املی کے درخت پر سے بے ثباتی دنیا کے گیت گانے شروع کیے احسن جو شفیق چچی کی موت اور چچازاد بہن کی حالت زار پر آنسو بہا رہا تھا اسطرف متوجہ ہوا۔ فاختہ دو چار صدائیں لگا کر اڑ گئی اور احسن نے ضمیرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا بس ضمیرہ جلو بہت دیر ہو گئی۔ اب چچا جان اٹھ بیٹھے ہوں گے کیسے سخت الفاظ تھے جنہوں نے ضمیرہ کو ماں کی آغوش سے جدا کر دیا۔ گھبرا کر اٹھی احسن کو دیکھا اور کہا ہاں چلو، احسن مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے سچ مچ اماجان نے مجھکو

کلیجہ سے لگا کر اپنے پاس لٹا لیا۔ سچ کہتی ہوں اب تو مجھے صبر آگیا اماجان میں سے کیسی دلہنوں کی سی خوشبو آرہی تھی۔

ان دونوں میں صرف ایک سال کا چھٹا پا بڑا پا تھا اور گو ضمیرہ ابھی آٹھویں ہی برس میں تھی مگر اسکا بلا اجازت اتنی دیر تک غائب رہنا ایسا فعل نہ تھا کہ کسی کو تشویش نہ ہوتی محلہ بھر میں کھلبلی مچ گئی تو بس یہ۔ وہ کنبہ بھر امنڈ پڑا۔ کونہ کونہ اور چپہ چپہ دیکھ مارا مگر دو بچے تھے سوئی نہ تھی چاروں طرف آدمی دوڑ پڑے۔ اسبات کا تو کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ دونوں قبرستان پونہچے ہوں گے ✣

باپ اگر قلب کی اس کیفیت کو محسوس کرسکتا جو ضمیرہ کو بیتاب کر کے ماکی قبر پر لے گیا تو جسوقت دونو ننھے ننھے دل دھکڑ دھکڑ کرتے سامنے آئے ہیں کلیجہ سے لگا لیتا۔ مگر جہاں مادۂ احساس ہی مفقود ہو وہاں شفقت کی توقع ہی نامعقول ✣

(۳)

دن بیت رہے ہیں اور زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے ضمیرہ کی ماکو مرے تین ساڑھے تین برس ہوگئے ہڈیاں تک گلکر خاک ہوگئیں قبر کا نشان تک نہ رہا مگر اس واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضمیرہ اسی روز اور اسی رات اپنے چچا کے پاس ایک گانوں میں بھیجدی گئی جہاں خدا کے سوا کوئی اسکا رفیق نہ تھا۔ ماکا صدمہ فطرتاً اس کے دل سے زائل ہوتے ہوتے قریب قریب معدوم ہوگیا تھا لیکن ترندونکا فراق ایک ایسی مصیبت تھی جسنے مردوں کی یاد قطعی دل سے بھلا دی گھر گھر والے لونڈیاں مامائیں مکتب سہیلیاں بھائی بہنیں۔ سب کو یاد کر کر کے روتی اور بلبل نوگرفتار کیطرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتی قدرت نے

جہاں اسکی سرشت میں تحمل و دور اندیشی اطاعت و انکسار کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا وہاں یہ کہنا بھی بیجا نہوگا کہ وہ خلوص اور صداقت کی دیوی جسوقت اپنے تمام عزیزوں کے تعلقات پر ایک محققانہ نظر ڈالتی تو حسن ہمدردی کا تاج سر پر رکھے سچی محبت کے گلدستے ہاتھ میں لیے تمام عزیزوں سے دو قدم آگے ہی دکھائی دیتا۔

ساون شروع ہو چکا تھا غروب آفتاب کے وقت اودی گھٹا آسمان پر چھا گئی ضمیرہ اسوقت صحن میں بیٹھی تھی اور برابر کے گھروں سے لڑکی بالیوں کے ملہار گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

برسات کے دن جھٹ پٹا وقت ملہار کی آواز اور ضمیرہ کا مغموم دل وہ خیالات کے ایسے دریا میں غوطہ کھا رہی تھی جسکی کہیں تھاہ نہ تھی اسوقت اسکو اپنے چھوٹے حقیقی بھائی کا خیال آیا جسکو ماچار برس کا چھوڑ کر مری تھی اور جسکی صورت دیکھے ضمیرہ کو تین سال سے زیادہ ہو گئے تھے اسکی پیاری پیاری صورت بھولی بھولی باتیں اسوقت بہن کا کلیجہ مسوس رہی تھیں وہ سوچتی تھی کہ جوان اور بڑھیا مائیں تو دنیا میں مرتی آئی ہیں مگر یہ ستم کسی پر نہیں ٹوٹتا کہ ماں کے ساتھ باپ بھائی کی صورت کو آنکھیں ترس گئیں۔ میں تو خیر جو پڑی وہ سہی جو گذرے گی وہ بھگتونگی مگر ضمیر کی مٹی کیسی پلید ہوئی وہ نگوڑا تو پہلے ہی ابا جان کے نام سے سہمتا تھا۔ گھر میں گھستے اور وہ دبکا یوں ہی وہ اس کے نام سے جلتے تھے اتنا حکم نہیں تھا کہ ان کے سامنے ہوں تو کرے۔ اماں کی شرمساری چپکے ہو جاتے تھے تو کیا اس کے رونے سے تیوری پر بل آہی جاتا تھا اب کون بیٹھا ہے جو بہلائے گا چوڑا میدان ہے جو چاہیں گے وہ

کریں گے۔ میں بھی اچھی تقدیر لیکر آئی کہ کوئی لمحہ خوشی کا گذرا ہی نہیں۔ میں نے کس منت سے کہلا بھیجا تھا کہ دن بھر کے لیے ضمیر کو میرے پاس بھیج دیجئے میرا دل اس کے دیکھنے کو تڑپ رہا ہے مگر کان دھر کر سنا بھی تو نہیں چھوٹے چچا جان نے وعدہ کیا تھا کہ جمعہ کو آئے گا لو آج جمعہ چھوڑ پیر ہو گئی مگر ان کا جمعہ ہی پورا نہ ہوا ایسی میرے نام کی کیا جلتوائی پڑ گئی کہ گھر بار۔ کنبہ محلہ سب سے تو چھٹا یا ہی تھا۔ بھائی بہنوں سے بھی الفظ کروایا۔ موئے قیدیوں کی طرح اس کھنڈلے میں پڑی سڑا کروں

(۴)

صبح کا سہانا وقت تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ضمیرہ نماز سے فارغ ہو کر قرآن شریف لے کر بیٹھی تھی کہ یہ آواز اس کے کان میں آئی

"آپا جان کہاں ہیں"

مری ہوئی ماں کی یادگار سر بدلے کا سر برسوں کا چھوٹا ہوا بھائی ضمیر کی اس آواز کا کان میں آنا تھا کہ ضمیرہ بیتاب ہو کر دوڑی اور بیقرار ہو کر لپٹی دیکھتی ہے تو بھائی چوڑا آپ کپڑے شور بہ شور سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے اندر لائی مگر بھائی کی صورت اور حالت دیکھکر اسکا دل کٹ گیا اسوقت ماں کی تصویر اس کے سامنے تھی اس کی شفقت اور بھائی کی حالت دونو ملکر اس کا کلیجہ سوس رہی تھیں آج ضمیرہ کو یہ یقین ہو گیا کہ "ماں سے ناری اور باپ لکھ پتی"

جس ڈیوڑھی پر تین تین چار نوکر حاضر جس دروازہ پر رتھ۔ نالکی پالکی۔ گھوڑے۔ تانگے موجود۔ جس باپ کی ایک ہوں پر بڑے بڑے آدمی آنکھیں بچھانے کو تیار اسکا بچہ اس کیچڑ پانی مینہ اور طوفان میں

کہ چاروں طرف سے دھواں دھوں دیواریں گر رہی ہوں اس چمک اور کڑک میں کہ بجلی آنکھوں نہیں گھس رہی ہو۔ اکٹھے پانچ کوس کی منزل پیدل کاٹ کر اور رستہ میں بیٹھ بیٹھ کر طے کرے۔ ضمیرہ کو اسوقت وہ دن یاد آئے جب ماذرا سی گرج میں دونو تینیوں بچوں کو لے مرغی کی طرح دھر اندر کمرے میں لیجا اپنے برابر بٹھاتی بھائی کو پیار کیا اس کے کپڑے اتارے مگر بدلتی کہاں سے ان ہی کو چھوڑ پچھاڑ الگنی پر ڈال دیا۔

ضمیر کچہ تو بچپن کچہ اتنے روز کی جدائی اور سب سے زیادہ بہن کی محبت بھری گود کلیجہ سے لگتے ہی بلک گیا۔ بھائی بہنوں کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں جسوقت ضمیر نے یہ لفظ کہے ہیں کہ آپا اباجان تو طوطے کی طرح دیدے بدل گئے ان کی نگاہ میں ایک کتابھی مجھ سے بہتر ہے تو ضمیرہ کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مدتوں کے بچھڑے اور بے ماکے بہن بھائی مل مل کر روئے اور لپٹ لپٹ کر بلکے۔

رو دھو چکے تو ضمیر تہکا ہارا تو تہا ہی بہن کے پاس لیٹتے ہی سو گیا ضمیرہ بھائی کو پنکھا جھلتی رہی اس کی صورت دیکھہ دیکھہ کر کلیجے پر گھونسے لگ رہے تہے فرط محبت میں بیتاب ہو کر پیار کرنے کو جھکی تو دیکھتی کیا ہے تمام بیٹھ پر مار کی بدھیاں پڑی ہوئی ہیں۔ (باقی)

(راشد الخیری)

آہ رسا

ذرا پہلو میں بیٹھو اور یہ منظر دیکھتے جاؤ (بند اول) کہ دل کے ساتھ اک عالم ہے مضطر دیکھتے جاؤ

کہاں تک صبر ہو آخر یہ دل ہے کوئی پتھر ہے
تم اپنی بے رخی اللہ اکبر دیکھتے جاؤ

یہ ہے دور دوم اور پھر رہے ہو آج تم ساقی
ذرا ساغر بکف ہمکو مکرر دیکھتے جاؤ

کہاں جاتے ہو قوم جاں بلب کو چھوڑ کر تنہا
بھرے آتے ہیں آنسو دم بھر دیکھتے جاؤ

ہماری شکوہ سنجی پر یہ کہنا کیا قیامت ہے
دکھاتا ہے ابھی کیا کیا مقدر دیکھتے جاؤ

ابھی دیکھا ہے کیا تمنے جو ہمت ہار دیتے ہو
ترقی کرتی ہے یہ قوم کینوکر دیکھتے جاؤ

نتیجہ میں ہیں بلوائیں گے دنیا و دین دونو
کتاب علم اخلاق پیمبر دیکھتے جاؤ

جو آئے ہو تو اب ان مرمٹوں کا حال بھی پوچھو
ذرا گور غریباں کا بھی منظر دیکھتے جاؤ

نظر نیچی کرو سوچو تو کیا تھے یہ ہوا اب کیا
پڑے ہیں کچھ شکستہ کاسہ سر دیکھتے جاؤ

صدا ٹوٹی ہوئی قبروں سے آتی ہے ذرا ٹھیرو
ہماری بیکسی کو اور دم بھر دیکھتے جاؤ

بہت نازک دماغ اس خاک کی بستی میں ہیں لیکن
نہ لگ جائے کسی تربت پہ ٹھوکر دیکھتے جاؤ

خزانے علم و حکمت کے پتے ہیں گوشہ گوشہ میں
ابھی دیکھا ہے کیا تم نے ٹہر کر دیکھتے جاؤ

انہیں قبر و نہیں پاؤ گے مہ خورشید کے جلوے
یہاں سے اور وہاں تک تم برابر دیکھتے جاؤ

حروف لوح تربت دیکھکر بھر لائے کیوں آنسو
ہر اک فقرہ میں ہے عزت کا دفتر دیکھتے جاؤ

وہی رسمی ہے باڑھتی ہے رونق انکی قبرونکی
ذرا اک سورہ الحمد پڑھکر دیکھتے جاؤ

زمانہ کی روش پر کیوں نہ کار قدم اٹھیں
اگر تم گردش چرخ ستمگر دیکھتے جاؤ

چلو اب آئینہ خانہ میں لیکر ساغر مے
نشان عہد جمشید و سکندر دیکھتے جاؤ

ہم آمادہ ہیں دیکھو تم بھی تو کچھ اپنی زینت کو
سنواریں ہم جو تم آئینہ لیکر دیکھتے جاؤ

لگی دل کی بجھائی تم نے کیونکر کیا زمانہ ہے
تمھارے تر بجھے جاتے ہیں تیور دیکھتے جاؤ

زباں کھلتی ہے ختم اب ضبط کی تعریف کرتے ہیں ۔ جسے کرتم میں طاقت ہو کہ ہم فریاد کرتے ہیں ۔ (میر محمد ہادی غریب)

"کرمان کا محرم"

سٹر ہیوم گریفتھ نے ایران، وعراق، عرب، کی زمانہ قیام کی سرگذشت اور وہاں کے حالات جو قلمبند کیئے ہیں حقیقت میں دلچسپی سے خالی نہیں اگر اونکی تحریر سے اسلام پر حملہ ہوتا ہے تو ہم اونکو معذور سمجھتے ہیں اسوجہ سے کہ ایک غیر مذہب والے کو دوسرے کے مذہبی حالات وعادات سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی آسان نہیں کسی قوم کے افراد کے بعض برائیوں کو مذہب سے متعلق کرنا کوتاہ بینی ہے ایسی غلطیاں اکثر وبیشتر سربرآوردہ یورپین مصنفوں سے سرزد ہوتی ہیں۔ سٹر ہیوم گریفتھ کا غلطی نہ کرنا ہی تعجب تھا قطع نظر ایسے سطحی خیالات کے جو واقعات سٹر ہیوم گریفتھ نے قلمبند کیئے ہیں وہ ضرور دلچسپ ہیں۔ چنانچہ ماہ محرم کی عزاداری کا واقعہ جو اس کتاب میں اپنا چشم دید لکھا گیا ہے اوسکا ترجمہ درج ذیل ہے +

ماہِ محرم غم کا مہینا ہے جس میں تمام شہر شہدائے کربلا حضرت امام حسن وامام حسین فرزندان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ماتم کرتا ہے۔ حضرت علی کی نسبت اہل شیعہ کا خیال ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جائز اور مستحق جانشین تھے۔ ایام عشرہ شریف میں اکثر وبیشتر لوگ ماتم کرتے ہیں اور بعض وقت بازاروں میں بھی سیاہ کپڑے لٹکائے جاتے ہیں۔ ایران میں بہت بڑا ماتم اس مہینے میں ہوتا ہے۔ جب ہم کرمان میں تھے تو خوش قسمتی سے یہاں کے عزاداری دیکھنے کا ہمکو بھی موقع ملا۔ درحقیقت یہہ ایک ایسا منظر ہے جو کم از کم زندگی میں ایکبار قابل دید ہے۔ محرم کی دسویں تاریخ ہے

تقریب کے لیے مخصوص ہے جسمیں عام تعطیل ہوتی ہے تاکہ بانئے اسلام کے نواسوں کی رحلت کی یادگار میں جو میلہ ہوتا ہے اوسکو تمام لوگ دیکھ سکیں کرمان کے گورنر نے براہ مہربانی اپنے مکان سے اس تماشہ کو دیکھنے کی ہمیں دعوت دی اور اوس روز تخمیناً آٹھ بجے صبح کو ہمارے لیے اپنی سواری کی گاڑی بھیجدی۔ گاڑی میں سوار ہوکر بازار کی بہیڑ بھاڑ سے گزرتے ہوئے ہم گورنر صاحب کے (ارک) مکان کو پہنچے۔ گورنر صاحب کے قیام گاہ کو کرمان ارک کہتے ہیں۔ ایک پرائیوٹ راستہ سے داخل ہونے کے بعد ہم ایک بڑے دالان میں بٹھائے گئے جو فرنگیوں کے استعمال کے واسطے مخصوص کیا گیا تھا۔ چونکہ اوسوقت صرف ہم دو شخص (زن و شوہر) ہی اس شہر میں یورپین تھے لہذا ہم دونوں اس مکان میں رہے ؛

تماشہ کے قبل چاء۔ کافی۔ مربّہ۔ روٹی۔ پنیر اور کیک سے ہماری مدارات کی گئی۔ باہر کا منظر حیرت انگیز تھا۔ روبرو ایک وسیع باغ تھا جہاں میرا قیاس ہے کہ تقریباً دس ہزار نفوس جمع ہوں گے۔ باغ کے ایک حصہ میں بڑے حوض پر شامیانہ استادہ کیا گیا تھا اوس کے قریب ایک بڑے ممبر پر مجتہدین وعظ کہہ رہے تھے اور کوشش کیجارہی تھی کہ لوگوں کے غم و الم میں زیادہ رقت پیدا کیجائے خاص کر کے ایک شخص اپنی کوشش میں کامیاب نظر آیا یعنے اوس کے وعظ سے عورتیں وحشیانہ طور پر رونے اور دیوانہ وار سینہ کوبی کرنے لگیں اور مردوں نے اپنا سر پیٹنا شروع کیا۔ ایک گھنٹہ کے وقفہ سے بڑے جلوس کے ساتھ تماشہ کی ابتدا ہوئی۔ اس جلوس نے باغ کے آخری حصہ سے داخل ہوکر

ادھر اُدھر سے پھر پھرا کر تمام باغ میں گشت لگایا۔ امام حسینؑ اور اون کے بھائی کی رحلت کے بعد اون کے خاندان نے ایک مقیدانہ حیثیت سے جو سفر کیا یہ جلوس گویا اوسکی نقل تھی سب سے پہلے چھ اونٹ آراستہ و پیراستہ نمودار ہوئے جن کے سوار دف بجاتے اور خوفناک آوازیں کرتے جاتے تھے اس کے پیچھے اور اونٹ گھوڑے خچر باربرداری کے سامان ڈیرے وغیرہ سے لدے ہوئے تھے بعد ازیں چار نعشوں کو آدمی اُٹھا کر لائے جسپر چار مردے تھے (گھاس پھوس سے ڈھکے ہوئے) یہ امام حسینؑ اور اون کے تین بھائیوں کی نقل تھی جنھوں نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس سے وفات پائی چونکہ دشمنوں نے انپر پانی بند کر دیا تھا۔ ہر ایک لاش پر ایک کبوتر بٹھایا گیا تھا جسکی نسبت یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ماتم میں ہے پھر ایک اور خوفناک منظر نظر آیا جو دوبارہ دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ تخمیناً ایک سو آدمی دیوانہ وار برہنگیختہ لمبے لمبے سفید کرتے پہنے ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں اپنے سروں پر آپ زخم لگاتے جاتے تھے یہانتک کہ خون اون کے چہرہ و بدن سے بہتا ہوا سفید کرتوں کو سرخ کر رہا تھا۔ یہ جماعت حوض کے پاس پہنچتے ہی اوسکے اطراف صف آرا ہو کر تھوڑے عرصہ تک اس خوفناک جنگی ناچ میں مصروف رہی۔ یہ بڑا مہیب منظر تھا۔ ایک بیچارہ خون سے بیہوش ہو گیا جسکو وہاں سے اٹھا کر لیجانا پڑا۔ ایک آٹھ برس کے عمر کا لڑکا بھی ضعف سے گر پڑا۔ نوجوانوں ہی کو اپنے آپ زخمی کرتے دیکھنا مہیب تھا کجا کہ چھوٹے بچوں کو اسطرح زخمی ہوتے دیکھنا۔ یہ کام بڑی فضیلت کا سمجھا جاتا ہے جس قدر گہرے اور زیادہ زخم ہوں گے اوسیقدر زیادہ اون کی فضیلت ہے۔ یہ کام اوس وقت تک جاری رہا جب تک کہ گورنر صاحب نے ان لوگوں کو اشارہ سے کہا کہ ہم نے خوب دیکھ لیا بعد ازیں یہ لوگ ورانڈے کے روبرو جہاں گورنر صاحب تشریف فرما تھے قطار باندھکر

کھڑے ہو گئے اور استدعا کی کہ پانچ نفر مشہور قیدی جیل سے جو قریب ہی تھا رہا کیے جائیں۔ گورنر صاحب نے اوسیوقت اون کی خواہش پوری کی۔ چونکہ اس موقع پر یہ رواج ہے کہ یہ لوگ جس قیدی کے رہائی کی خواہش کریں اوسکو جیل سے گورنر رہا کر دے۔

اِس مہیب منظر کے بعد مختلف اشخاص کی ایک جماعت جسمیں بچے بوڑھے گھوڑوں پر سوار تھے سینہ اور سر پیٹتے ہوئے آئے بعض انمیں سے ایسے لیست قامت اور چھوٹے تھے کہ خدمتگاروں کو انہیں گھوڑوں پر سنبھالنا پڑا من بعد ایک اور مردہ نعش پر لایا گیا جسکے ہمراہ شیر کا چمڑا پہنے ایک شخص تھا جو مردہ کو پیار کرتا اور سینہ سے لگاتا جاتا تھا۔ اس مصنوعی شیر کا اپنے دوست یا مالک کی لاش کو بوسہ دینا اور سینہ سے لگانا اور اوسکی موت پر مختلف پیرایہ سے غم و درد کا اظہار کرنا جادو کا اثر رکھنے والا منظر تھا۔ پھر لڑکوں کے چند گروہ سینہ کوبی کرتے آئے جنکا جسم کمر تک برہنہ تھا حقیقت میں یہ خوش نما نظارہ تھا کیونکہ لڑکے بہت موزونیت سے کام کرتے تھے گویا بچوں کی جماعت جمناسٹک کی مشق کر رہی ہے ایک لڑکا شکل افسر کے تھا اون کے ہات ایک سات سینہ کوبی کرتے تھے جس سے تیز آواز نکلتی تھی اور سات ہی وہ حسین حسین کہکر پکارتے تھے تمام تماشہ دلچسپ مگر مغموم منظر تھا جو کبھی دل سے نہ بھولے گا۔

تلواروں کی جھنجھناہٹ دن کی آواز عورتوں کی واویلا اور چیخ پکار لوگوں کا شور یہ تمام چیز مجموعی مشرقی زندگی کا ایک قابل یادگار منظر ہے۔

"محمد حفیظ الدین خاں"

نوٹ۔ الفاظ کی سختی اور روایت کی غلطیوں کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔ ۱۲ مترجم۔

عالمِ ارواح سے

عورتوں کی

صدا

عالمِ فانی کے بسنے والو، تمہاری ناپائدار دنیا تمکو مبارک، ہمارا تمہارا ساتھ یہیں تک تھا، ہم چلے اور وہاں چلے جہاں سے آنا نہیں، چھوٹے، اور ایسے چھوٹے، کہ اب یہ صورتیں تمکو نظر نہ آئینگی، تمھاری عمریں چمنستان حیات میں سدا بہار پھول بنکر کھلیں، اور آسمان زندگی پر قمر چہار دہم ہوکر چمکیں،

بزمِ دنیا کے روشن فانوسوں، ہم نہیں ہیں، مگر ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، تم ہم کو بھول گئے مگر تمہاری یاد ہمارے دل سے نہیں جاتی، قدرت نے ہمکو وہ دل نہ دیے تھے، جو عارضی جذبات کا گھر ہوتے، ہماری طبیعتیں ایسی طبیعتیں نہ تھیں، جو ایک دفعہ ہاتھ پکڑکر ساتھ چھوڑ دیتیں، یہ ٹوٹی پھوٹی قبریں اور ویران کھنڈر، جنہیں تم اپنے ہاتھ سے ہمکو سلا گئے دیکھ رہے ہیں کہ یہ مجروح دل جو ہمارے مردہ جسم میں موجود ہیں آجتک تمہارے خیال سے غافل نہیں ہوئے۔ دنیا ہم سے چھوٹ گئی، تمہاری صورتیں ہماری آنکھ سے اوجھل ہوچکیں، مگر! ہماری روحیں لذت وصحبت سے آشنا! مرکر بھی درد فراق کو نہیں بھولیں ہا!

سرزمین ہندوستان، جو آج زندوں اور مردوں دونوں پر ناز کر رہی ہے، جسمیں وہ وہ جواہرات مدفون ہیں جنکی روشنی تمام دنیا کو جگمگا گئی، ہمارے لیے نہ تھی! ہم ازلی بدنصیب تھے، نامراد رہے اور ناشاد اُٹھے، قدر

ہمارے واسطے مصیبتیں ہوئیں اور یہ دنیا جو تمہیں نصیب، اسکی دلچسپیاں، ہمارے آفتیں چار دیواری کی حکومت پر راج کرنے والے بادشاہوں، بادِ بہاری کے ٹھنڈے جھونکے، جنھوں نے جنگلوں میں پھول اور باغوں میں کلیاں کھلائیں، ہمارے کلیجوں پر نشتر بنکر چبھے اور تیر ہوکر برسے، چاند مدتوں سر پر چمکا، تارے برسوں سامنے دمکے، مگر حسرت نصیب دل کی کلی قبر تک نہ کھلی، تمہیں ساز گار مگر ہمارے لیئے وبال جان تھی، وہ دنیائے ناپائدار، جس کے ارمانوں نے تا دمِ واپسیں ساتھ نہ چھوڑا، عمریں اسطرح بیتیں سانس نکل گیا، مگر آرزوؤں کے کانٹے جیتے جی پہلو سے نہ نکلے، ہم انسان تھے مگر کیسے انسان؟ کہ کبھی اطمینان کی مسکراہٹ ہمارے ہونٹوں پر نہ کھیلی، رنج والم کی گھٹائیں جھوم جھوم کر آئیں اور کھل کھل کر ہمارے دلوں پر برسیں مگر اسکی بوچھاڑ زبان تک نہ آئی، یہانتک، کہ دکھ بھری دنیا نے ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کو رخصت کردیا!!

ہماری رام کہانی تمہارے دل ہلا دیگی یہ وہ پتا ہے جو تمہارے ہاتھوں ہمیں پڑی، دنیا، اور دنیا کے دھندے، رخصت دیں، تو سنلو، انصاف، اور انصاف کی آنکھیں، اجازت دیں تو پڑھو، اور سوچو، کہ کیا کیا، اور کیسا کیسا،

سرائے دنیا ابھی ہم سے کوسوں دور اور منزل مقصود میلوں پرے تھی، کہ قدرت کے انتظام نے، ہمارے آنیکا! مژدہ! تم تک پونچا دیا، دنیا دار مہمان نوازوں، تم نے ہمارے آنیکی تیاریاں مہینوں پہلے کیں، محبت کے ہاتھ ہمارے لینے کو بڑھے، اور قدر دانی کی آنکھیں ہم پردیسیوں کی راہ دیکھنے لگیں، مگر! اے خود غرض انسانوں، وہ سب تمہارا دھوکا تھا، تم جس چیز کے منتظر تھے وہ کچھ اور تھی، تم ان بیٹوں کے سوداگر تھے! جو ظلم و ستم کے دسترخوان پر نفس پروری کے کھانے چنیں، اور غضب کرکے ہمکو انسان سے جانور بنادیں،

ہمارا دنیا میں قدم دھرنا تھا، کہ تمھاری آرزوؤں پر پانی پھر گیا، تمھارے ارمان دل کے دلیں رہے، اور جس گھر میں مہمان کی آمد کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا وہاں سناٹا سا چھا گیا، سوچو، اور بتاؤ! ہمارے ننھے اور معصوم دلوں پر کیا گذری ہوگی؟ جب میزبان طوطے کیطرح دیدے بدل گئے، جنکے امید شفقت تھی، وہ ہماری موت کا! انتظار کرنے لگے!!!

اب اگر کوئی ہمارا رفیق شفیق تھا تو، ماں کی گود، وہ گود! جس کے ہر پہلو سے بوئے محبت آتی تھی، وہ الفت بھری، نگاہیں، جنمیں ماتا کے سوا، کچھ نہ تھا قیامت تک یاد رہے گا وہ وقت، جب وہ گود ہم سے چھوٹی، اور زمین نے اپنی آنکھیں ہمارے قدموں کے نیچے بچھائیں!

اسوقت کی ہماری زندگی عجیب زندگی تھی، تمدن ہمکو بتا رہا تھا کہ ہم ارذل المخلوقات ہیں، ماں باپوں کی آنکھیں ہمکو سبق دے رہی تھیں، کہ بیٹے چمکتے ہوئے لال، اور، بیٹیاں بھاری پتھر،

اسپر بھی ہمارے نفاست دل، اور پاک روحیں، تمہاری اطاعت سے منہ نہ موڑتیں، ہم گھر کے کام دھندوں میں لگے لپٹے رہتے، اور جہانتک ہمارے ناتہ پاؤں مدد دیتے ہم تمہاری خدمت سے جی نہ چراتے،

یاد ہیں وہ دن، جب گرمی کے جلتے بھلتے دنوں میں ہم چولہے میں گھسے مارا مار کا کھانا پکایا، اور اس خیال سے کہ ابا جان کو دیر نہ ہو جائے، وقت سے پہلے لا رکھا، بھر بھر مٹھی روپے لینی والی مائیں تک آنکھ چرا گئیں مگر ہماری آنکھ میں میل نہ آیا،

بزرگو، عزیزو، بھائیوں، اور بندو، اس محبت کا ثمر، اس خدمت کا اجر ملا

"ماں کے گھر بیٹی، گود ڈر بیٹی"

بہتر سے بہتر کھانے، اچھی سے اچھی چیزیں، بھائیوں کو ملیں اور ہم نے اُف نہ کی، ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے رہے کہ بچا کھچا کھانا، ہم کو ملا، ہماری زبان پر شکایت نہ آئی، جو ہاتھ اوٹھا کر دے دیا وہ سر جھکا کر لے لیا، بتاؤ! ہمارے دل کیا کہتے ہونگے، جب بے وجہ بے قصور، بھائیوں نے ہمیں گھر کیاں، جھڑکیاں دیں، اور ہم دل مار کر بیٹھ گئے، وہ مائیں جنھوں نے دکھ سہہ کر، مصیبتیں بھر کر ہمیں پالا، پوسا، وہ بھی فرنٹ ہوگئیں، کونونیں دبک دبک کر ہم روئے اور اوڑھنیوں سے آنسو پونچھ پونچھ کر چپکے ہو گئے

معزز ماباپو، یہ وقت سدا رہنے والا نہ تھا، ہم تمھارے مہمان تھے، اور ہمارا ٹھکانا ساتھ چند روز کا تھا، ہمیں ایک نئی دنیا بسانی، اور دوسرا گھر دیکھنا تھا، آخر وہ وقت آگیا، جب اس، ناپائدار دنیا نے، ہمکو تم سے جدا کیا مگر ہمارے دل دیکھو، اور اس فرمانبرداری کی داد دو، جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا اسکو سرکا سرتاج سمجھا اور روتے بلکتے تمھاری دہلیز سے رخصت ہوگئے

اب ایک دوسری دنیا ہمارے سامنے تھی، مگر تجربہ کی آنکھوں نے جو دیکھا اس کے خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، ہماری زندگی مصیبت ناک زندگی تھی، ساس نندوں کے برے ہمارے کلیجہ پر تھے، اور سوکنوں کے تیر ہمارے سینوں پر!

افسوس! اے فانی! اور ناپائدار دنیا! تجھ میں رہ کر کوئی گھڑی چین کی نہ گذری، جو ہاتھ اس امید پر پکڑے تھے، کہ ساتھ دیں گے وہ بے وفا نکلے، تڑپ تڑپ کر عمریں کاٹیں، اور جل جل کر دن پورے کیئے وہ چار دیواری جسمیں ٹھنڈی اور میٹھی ہوا کے جھونکے بھول کر بھی نہ پھٹکتے ہمارا مسکن ہوئی، اور وہ دو تین معصوم جو ابتدائی محبت کے یادگار رہتے ہمارے رفیق +

میکے کا زمانہ ایک خواب تھا، بھلا یا بُرا جیسا گزرا بسا غنیمت، سسرال، اس خواب کی تعبیر تھی، اور نکاح بلائے ناگہانی کی تصویر، قدرت کا منشا، جو کچھ ہو، مگر تمہاری غرض ہمپر، حکومت، کرنی نہی، نت نئے ظلم توڑے، اور طرح طرح کی مصیبتیں ڈھائیں۔ دنیا کی دلچسپیاں، قدرت کے انعام، ہمپر حرام ہوئے، اور ہمارے فرائض تمھاری خدمت ٹھہرے، اور حاصلِ زندگی تمہاری اطاعت،

ہمنے کیا نہ کیا؟ تمہارے اشاروں پر آنکھیں بچھائیں، تمھارے بچوں کو پالا۔ اور جوان سی جان گھلا گھلا کر تمپر سے قربان کر دی دنیا عالم خواب میں ہوتی اور ہم عالم اضطراب میں، عمر کی بہت سی راتیں آنکھوں میں گئیں، اور زندگی کے بہت سے دن بھلس بھلس کر گذرے۔

آخر دل پھوڑا اور دنیا وبال ہوگئی، سنگدل شوہروں! تمہارے ظلموں نے ہمارے ہاتھ اُٹھوا دیئے، کہ الہ العالمین، اب ہمکو موت دے، اور ان مصیبتوں سے نجات، ہماری دعائیں قبول ہوئیں، اور وہ قدرت جو تم سے زیادہ ہماری مددگار تھی ہماری حمایت پر اٹھی اور ہمارا فیصلہ کر دیا۔ اِن بچوں کے ساتھ جانیں لڑی ہوئی تھیں، جن کو آنکھ سے اوجھل کرنے کا دم بھر بھی دل و دلوا نہ تھا، انکو خدا کے سپرد کیا،

خوابِ غفلت میں سونیوالو! خود غرضی کا پردہ اٹھا کر دیکھو! آسمان و زمین کا ایک ایک کونہ تمہارے ظلم پر روتا ہے اور سرزمین ہندوستان کا ایک ایک چپہ ہمارے صبر کی داد دے رہا ہے اب بہت نزدیک ہے وہ وقت جب اس زبردست شہنشاہ کا دربار تمہارے سامنے ہوگا جسکی بہترین مخلوق کو تم نے بدترین بنا دیا!

راشد الخیری۔

تازہ غزلیں

رات ہے، رات تو اس مردِ خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

ہے شبِ قدر سے دعویٰ مساوات کی رات
ہمگدایانِ درِ پیرِ خرابات کی رات

گریۂ غم ہے کہ ساون کی جھڑی تا دمِ صبح
کوئی موسم ہو یہاں رہتی ہے برسات کی رات

کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روزِ قیامت والے
جسطرح کٹتی ہے امید ملاقات کی رات

صبح ہوتی ہے کوئی دم میں وہ آئے بھی تو کیا
نہ کسی کام کی رات اور نہ کسی بات کی رات

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شبِ گور بھی اوس گل کی ملاقات کی رات

بالیں پہ یاس بیٹھی۔ رک رک کے رو رہی ہے
اب آرزوئے جاناں۔ پہلو میں سو رہی ہے

رنگِ شکستہ حالی۔ ہے میرے رخ سے ظاہر
اے آہ مفت تو کیوں۔ بدنام ہو رہی ہے

اے چشمِ تر نہ کیوں کر ممنون رہوں میں تیرا
عصیاں کے داغ سب کے۔ دامن سے دھو رہی ہے

دیکھا جو تجھکو یادِ ابر و میں دل بھر آیا۔
کشتی ہلال تیری۔ مجھکو ڈبو رہی ہے

کہتی ہے سب سے خاکِ آسودگانِ مرقد
یاں آرزوئے جاہ و مکنت بھی سو رہی ہے

کیا تو بھی ہے جوانی اے دخترِ رز بتانا
خلقِ خدا جو تیری۔ دیوانی ہو رہی ہے

اے عندلیبِ ناداں تو اور حسرتِ گل!
کیوں اپنے حق میں کانٹے۔ کم بخت بو رہی ہے

ہے حالِ زار تیرا۔ دل بے قرار تیرا۔
اے شمع کس کے غم میں۔ تو شب سے رو رہی ہے

یہ آرزو تمہاری۔ یہ جستجو تمہاری
دنیا و دیں سے مجھکو۔ بیگانہ کر رہی ہے

اے محتسب عبث تو ڈرے ہے کہ تیری باتوں
وہ بھی ہے زہر لے کے جو رہی ہے

آمیزشِ عناصر ہے اے **شباب** لازم
کیا غم جو عمر اپنی۔ برباد ہو رہی ہے

راحت زمانی

مولوی سیّد احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سرِ نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کیگئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست و یکنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالرشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کیواسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایکروپیہ (عہ)

ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر)

منیجر عصمت و تمدن

(تمدن پریس دہلی)

عصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائے گا کہ کو ارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اس کے لیئے انہیں کیا تیاریاں کرنی ہے۔ جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کسطرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کیساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچاکر پُرلطف و اطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب۔ بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہی عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ چونکہ قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلاکر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائے گا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تہنائی میں دل بہلانیوالا فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ہر ہیں ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں سالانہ قیمت (سہ ملے)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

تمدن

تمدنِ اسلام

نمبر ۲

نمیگویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یا راز من

عرب | جس نے تاریخ اسلام کا باالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، یا تاریخ اسلام میں محض صدرِ اسلام اور قرونِ اُولیٰ کے روشن ابواب پڑھے ہیں، اوس کی نظر میں یہ مسئلہ مسلمات کی وقعت رکھتا ہوگا۔ کہ جن قوموں کی تاریخ عہدِ پیشین میں یا اون کے اسلام لانے سے پیشتر جیسی تاریک، جہالت، اور وحشانہ رسوائیوں کے واقعات سے پُر تھی، قبولِ اسلام کے بعد اسلام نے ویسی ہی اون کی کایا پلٹ کرنے میں اپنی اوس زبردست روحانی طاقت کا کرشمہ دکھایا ہے، جسکی نظیر پیش کرنے سے ادیان سابقہ نہ صرف قاصر ہی ہیں بلکہ اون حیرت خیز

کامیابیوں کو جو اسلام نے وحشی، اور غیر مہذب اقوام کے اخلاق، اور اصول معاشرت کی اصلاح کرنے، اور انہیں شائستہ اور مہذب بنانے میں حاصل کی ہیں، صداقت اسلام کا ایک معجزہ مانتے ہیں،

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور و معروف قوم عرب ہے، جو قبل ظہور اسلام ایک بادیہ نشین، جنگجو، سرکش اور جاہل قوم تھی، جلادت، قساوت، لوٹ، مار غرض پردہ دنیا پر انکا کوئی ہمسر نہ تھا، آن پر جان دینا جنکا مذہب، اور خدا کی جملہ نافرمانیاں جنکا خاصہ تھا، نہ کسی شرع کا اپر حکم تھا، نہ کوئی، قانون حاوی، اور نہ کسی دوسرے ملک سے ان کا تجارتی یا کسی قسم کا واسطہ و رابطہ تھا، بس مختصر یہ کہ نہایت یہ تھی اور ان کی بداعمالیوں کا بند ہا ہوا جال اعوام الجلار کے رسوا یہ خود ہی اپنا قدم کبھی جزیرہ عرب سے باہر نہ نکالتے تھے، کیونکہ زمانہ میں قیصر و کسرے کا دبدبۂ سطوت زبان زد عام خاص تھا۔ جو دور کے ڈھول کی طرح ہر ایک کا دل دہلانے کو کافی تھا، جن کا نام آتے ہی یہ لوگ جھکتے تھے،

اس گھٹاٹوپ تاریکی میں دفعتہً آثار صبح نمودار ہوئے، اسلام کا ستارہ افق پر چمکا، قدسیوں نے فضا بسیط میں بزم عیش رچائی مرغ سحر نے خوش آمدید کا ترانہ گایا، ادہر نسیم سحر نے سریلا نغمہ چھیڑا۔ اور بہزار جاہ و جلال اوس خورشید برج رسالت نے طلوع اجلال فرمایا، عالم کا روپ دوبالا ہو گیا، اوسوقت نہایت بلند آہنگی سے توحید کا شور مچا جس کی آواز کون و مکان میں گونجی، ختم رسالت کا غلغلہ ہوا جسمیں اوس ندائے غیب کی موالدثلاثہ نے ہم نوائی کی، سرکشوں کی گردنیں جھک گئیں، دیو پیر رعب چھا گیا انقیاد نے قدم بوسی کی، اعتقاد نے دست بوسی، الفت، محبت، [illegible]

وصداقت کا جام سب نے پیا اور گلے ملے جس سے دلونمیں راستہ ہوا، جہاں اختلاف اور عداوت باہمی کی گھٹا چھائی تھی، وہاں آیۂ رحمت "اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً" نے برق کی صورت دامنِ ابر چاک کیا، جسکی روشنی میں اعجاز تھا۔ اور اوس آواز میں ازل کے فراموش شدہ عہدِ الست کی یاد کا چٹخارا، جس کے اثر نے عرب کی سب متفرق قوتوں کو لاکر لوائے اسلام کے نیچے مجتمع کر دیا،

جہاں سے یہ نیر آزماؤں کا لشکر فتح و نصرت کا پہریرا اوڑاتا ہوا، اعلاء کلمۃ اللہ کرتا ہوا بڑھا راستہ میں جن قدموں سے دوچار ہوئے اگر ہنگامہ آرائی کی نوبت آئی اور بآسانی اونہوں نے ہتھیار نہ دھرے، اون کے مورچوں پر قبضہ کرلیا، جنھوں نے پناہ چاہی، اون کی جان و مال کی مثل اپنے جان و مال کی حفاظت کی اور جو اسلام لائے اونپر اپنا جان و مال تصدق کرنے کو طیار ہوئے،

غرضکہ اسیطرح ملکوں ملکوں کی خاک چھانی دریا پیرے، پہاڑ پھاندے۔ سفر کی مشقت، راہ کی صعوبت کو خاطر میں نہ لائے اور اعلاء کلمۃ اللہ کیا، جس سے مظفر و منصور کہلائے۔ قیصرانِ رُوم و کیاسرۂ عجم کی سلطنتوں میں جہاں طوائف الملوکی۔ اور بدامنی کا عمل و دخل تھا انصاف و عدل، امن و امان کی بنیادیں ڈالدیں، جنپر آگے چلکر عدالت کے عالیشان ایوان تعمیر کرائے جس سے خلافت ثانیہ تک کی قلیل مدت میں مشرق میں کنج مغرب میں سواحل بحر اٹلانٹک شمال میں نہر لوار اور جنوب میں وسط افریقہ تک خلافتِ اسلام کے اثر میں آگئے،

وہ عرب بداوت جنکی سنت آبا رہتی، اور جسکا خون اون کی رگوں میں دوڑتا تھا حضارت مدنیت کے گرویدہ ہوئے تو ایسے کہ بڑے بڑے

عظیم الشان شہر مثل قرطبہ و بغداد کے انہوں نے آباد کیے، جن کی عظمت اور رونق کا نقش بقدر تاریخ تک زمانہ کی پیشانی پر چمکے گا، تمدن کے باب میں وہ وہ ترقیاں کیں، کہ شاید و باید، تجارت گاہیں کھولیں، منڈیاں لگائیں، جہاں ہر ولایت کا قیمتی اور عمدہ مال آکر بکنا شروع ہوا، صنعت و حرفت کے طریقے جو اپنے سے ایجاد کیے اون کی اشاعت کی دوسروں کے طریقے خود سیکھے، اور اسطرح ان ممالک کو اپنی اقتصادی ترقیوں، اور بیش بہا عملی کوششوں سے زرخیز، آباد اور ہنرمندوں کا گھر بنا دیا، جہاں ہر فن کے ماہر، ہر کمال کے جاننے والے، ایک سے ایک بڑھکر موجود تھے۔

بہرحال جب یہ (عرب) وہاں ٹھیر گئے جہاں شاہان عجم کا جبروت انہیں موسم کی سختیوں سے تنگ آکر بھی طوعاً و کرہاً ٹھیرنے دیتا تھا۔ اور جو پھر ان کی آیندہ نسلوں کا مولد و مسکن بن گیا، تو ان کے دل و دماغ میں بوئے نفاست و تکلف پسندی بسنے لگی جو اہل عجم کے خصوصیات تھی، جس نے پرتکلف اسباب آرائش و آسائش دولت سراؤں میں موقعہ موقعہ سے جمایا، دیبا و حریر، قاقم و سنجاف، کی پوشاکیں کشتیوں میں لگا کر شوق کے تمیزدار ہاتھوں سے پیش کرائیں، خوان پُر الوان پر لطیف و لذیذ اقسام کی نعمتیں چنیں جسے ذائقہ نے خواب میں بھی نہ چکھا تھا، مگر!

بیداری عقل، اور ہمت مردانہ نے انہیں اسپر بھی عیش و عشرت کا ایسا چسکا نہ لگنے دیا، جو تہذیب و ترقی کے لیے کسی حد تک بدنما ٹھیرتا، اور انہوں نے مہمات سلطنت کے انصرام، سپاہ و رعیت کی دلجوئی، اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح، الغرض امور سیاست اور نظم و نسق سلطنت میں ایسی خوبی سے دلچسپی لی، کہ تمام دنیا نے اُن کے انتظام اور بیداری کو مان لیا،

وہ دماغ جو قیامت برپا کرنے والے جوش و خروش کا سرچشمہ خیال کیے جاتے تھے، اونہیں تحمل و برداشت کا جبزو دیکر ایسا معتدل خمیر تیار کیا، جو اہم معاملات کے سلجھانے، اور مشکل مواقع کو سر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ سینے جنمیں علم باالانساب یا اسلاف کے فخریہ کارناموں، اور گذشتہ معرکوں اور محاربات کا دفینہ تھا، اونمیں علوم و فنون، عقل و نقل کے لعل و جواہر کا خزانہ بھر دیا، جسمیں اگر عقل یونانی سے استفادہ کیا گیا تھا، تو یہاں کے فلسفۂ یمانی کا اوسپر اضافہ ہوا،

قصہ مختصر ایسی قوم سے جسکی استعداد و صلاحیت عرصہ سے مفقود ہو رہی تھی ایسے ایسے مشاہیر علماء، فضلاء، خطیب، مقنن، مدبر، سپہ سالار، ارباب قلم، اور فلاسفر، پیدا کر دکھائے، کہ جنھوں نے اپنے کمالات سے ایک عالم کو نقش حیرت بنا دیا۔ اگرچہ اب زمانہ کے انقلاب، اور انتزاع سلطنت نے اون کے وہ سب خصوصیات سلب کر لیں۔

تُرک وسط ایشیا میں ہندوستان، چین۔ اور سیبیریا کے مابین ایک ملک ہے، جو ترکستان کہلاتا ہے، اور وہاں کے باشندے ترک ہیں، قوم تُرک بھی عربوں کیطرح اہل بادیہ تھی، مگر ترک عربوں کی طرح غیرت مند اور باحمیت نہ تھے جسکا ثبوت اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ عجم میں عام طور سے ترک لونڈی غلاموں کے مصرف میں لائے جاتے تھے جنھیں بردہ فروش تُرکستان سے لاکر عجم میں جاریہ اور غلام بنا کر دولتمندوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ اور اس تحقیر و تذلیل کی زندگی پر وہ راضی و خوش چلے آتے تھے، کہ عرب فاتحین کا پرچم اقبال ترکستان کی چوٹیوں پر لہرایا، جن کے قدموں کی ادنیٰ برکت یہ تھی کہ ان کے پہونچتے ہی مفتوحہ ممالک میں روشنی تہذیب پھیلنے لگتی تھی، کیونکہ ان کے فتوحات کا نشانہ دوسرے

غارتگر فاتحین کیطرح مال غنیمت سے پیٹ بھرنا، اور قوم مفتوح کی دولت لیکر اپنے گھر کی راہ لینا نہ تھا، یہ جہاں جاتے تھے، اسلیے جاتے تھے۔ کہ قوموں کو قعر جہالت، اور تاریکی ادبار سے ابھاریں، روشنی عقل دکھا کر سیدھے راستہ پر انہیں چلنا بتائیں، چنانچہ جن جن ملکوں میں ان کا گذر ہوا، اون کے ویرانوں کو آباد، سنگلاخ وادیوں، اور بیہڑ جنگلوں کو چمن زار بہشت بناتے ہوئے آئے۔

قاعدہ ہے کہ جوہونہار اور صلاحیت مند ہوتے ہیں، اہل ہنر اور ارباب فضل و کمال کو دیکھتے ہی، اور اونکا فیض صحبت اوٹھاتے ہی اون کے دلوں میں خود بخود اون کی ریس اور پیروی کا شوق دامنگیر ہوتا ہے، ترکوں کے طبائع میں بھی ترقی و شایستگی کی صلاحیت مخفی طور سے موجود تھی ہمعربوں کے آنے نے اِس جوہر نہاں کے ساتھ تازیانہ کا کام کیا جن سے میل ملاپ ہوتے ہی راہ ترقی میں انکا قدم آیا۔ اور پھر تو یہ ایسے پھلے پھولے، کہ چودھویں کا چاند ہو کر چمکے، جس کی روشنی سے ایک عالم کو فیض پہونچا، فارس، عراق، مصر، شام، ایشیاء کوچک قسطنطنیہ افغانستان، اور ترکستان، کے ممالک میں ان کی زبردست سلطنتیں قائم ہوئیں، جنکی تعداد کا شمار جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے تیس سے زائد ہے اور جنمیں سے مشہور سلطنتیں طولونیہ، اخشیدیہ، غزنویہ، سلجوقیہ اور اتابکیہ، تھیں،

وسعت میں اونکا حکم ایشیا سے وسط یورپ تک جاری و نافذ تھا ✣

علم و کمال کے اعتبار سے بھی انمیں بڑے بڑے اکابرین فن اور ارباب فضل و کمال علماء کملاء اور فقہاء ہو گئے ہیں، جنکی فلسفیانہ و دقیقہ سنجیوں،

اور نکتہ نوازیوں کی دھوم تھی، جنکی تحقیقات دماغ، اور مخلوقات فکر سے شرقی دفتر علوم میں ایسے نمایاں اور قابل قدر اضافے ہوئے کہ جن سے مشرق کا لٹریچر کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا،

فن تعمیر کے اعتبار سے بھی ترکوں کے عہد کو خاص امتیاز حاصل ہے، چنانچہ اوس عہد میں اونہوں نے ایسے مساجد، مدارس، ایوان، و قصر، تعمیر کرائے تھے، کہ جس صنعت کے نمونے کبھی پہلے چشم فلک نے بھی نہ دیکھے تھے، بعض تاریخی عمارات ممالک مصر و شام و عراق میں اب بھی اوس "تمدن" کی یادگار اور بقاء عظمت کے طور پر اپنا وجود پیش کرتی ہیں، جنکی زبان حال اپنے انقلابات کی داستان ایک تاریخ داں وسیع النظر سیاح کو سناتی ہے جب وہ اس کی گذشتہ عظمت کا خیال دلمیں لیکر اون کا طواف کرتا ہوتا ہے، فقط

باقی آئندہ

خانخانی۔ ندوی

انتہرا پالوجی کے قریب قریب تمام علماء اس مسئلہ پر متفق الرائے ہیں کہ عورت و مرد سوسائٹی کی ابتدائی ساخت میں مساوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کا میلان اس طرف ہے کہ اکثر جگہ عورت مرد سے فائق تھی۔ فریالوجی نے چونکہ یہ ثابت کردیا ہے کہ عورت کے وجود سے قدرت کا منشار بقاء نوع اور حفاظت اولاد ہے اس لیے اس کے کام سوسائٹی میں بہ مقابلہ مرد زیادہ اہم اور وقعت سے دیکھے جانے کے قابل ہیں یہ خیال کہ عورت اور مرد کا پیمانۂ دماغ مختلف ہوتا ہے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر بوک تر بی بہت زیادہ تحقیقات کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچا ہے۔

میاں بی بی

خان بہادر مولانا شاد مدظلہ نے مرثیہ حبیب ابن مظاہر میں میاں بیوی کے تعلقات کی جو تصویر کھینچی ہے بیساختہ اسکی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی بی بی جس کا پچاس برس سے زیادہ کا ساتھ ہے انہیں سراسیمہ و پریشان دیکھ کر گھبراتی ہے۔ زندگی میں کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ نئی بات نے اسکا دل تہہ و بالا کر ڈالا ہے اور آخر اس راز کو دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہیں تو (۳) بند۔ مگر اللہ اکبر کس قیامت کے ہیں تیسرے بند کے چھٹے مصرعہ نے تو بجلی گرا دی۔ جسپر حبیب ابن مظاہر بھی آخر بیچین ہو گئے۔ اس ایک مصرعہ "کیا مدینہ کی کوئی تم نے خبر پائی ہے؟" نے حبیب کے کیرکٹر اور حسینؑ سے اون کے اندرونی تعلقات کو صاف صاف بیان کر دیا۔

حبیب جواب دیتے اور موقعہ و وقت کو جتا کر بہ مصلحت کہتے ہیں۔ کہ "کیا کروں کیا نہ کروں مجھکو خیال اپنا ہے"۔ اس فصیح و بلیغ بیان پر پہنز وجہ جو کچھ جواب دیتی ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ سلیم

سست پایا جو بہت ان کو تو زوجہ نے کہا "آنکھوں کیا ہے جو بدلا ہے تمہارا نقشہ؟
تم میں پہلی سی بشاشت نہیں پاتی اصلاً" "وہ ہنسی ہے نہ وہ اخلاق کی باتیں ہیں"

کیا سبب جان سے ہاتھوں کو جو یوں دھوئی ہو
آنکھیں کیوں لال ہیں سچ تو کہو کیا روئے ہو؟"

"رکھے رکھے ہو اکل دنکا ہی کھانا سب مرو" شب کو فاقہ جو کیا چہرے کی رنگت ہوئی زرد"

دور ادحال کوئی رنج ہے دلمیں یا درد؟" "دل ہے نازک مرا کلیجا نہ زیادہ آہ مرد"

تیرے ہی سر کی قسم جی سے گذر جاؤں گی
اب چھپائی ہے کوئی بات تو مر جاؤں گی

"چین سے سوتے ہو را تو تمکو نہ دن کو آرام" "میں تو ڈرتی ہوں کہ اچھا نہیں اس کا انجام"
"صاف ظاہر ہے کہ ایسا ہی ہے مشکل وہ کام" "جب تو دم بھر کا بھی آرام ہوا تم پہ حرام"

ہو نہ ہو بات کوئی ایسی ہی پیش آئی ہے
کیا مدینہ کی کوئی تم نے خبر پائی ہے؟"

اب حبیب ابن مظاہر کو بھلا تاب کہاں مختصر طور سے کرنے لگے یوں حال بیاں
"ہے لڑائی کا جو حاکم کی طرف سے ساماں" وجہ یہ ہے کہ حسین ابن علی آتے ہیں یاں"

گھر سے اس موسم گرما میں چھڑایا ہے انہیں
اہل کوفہ نے بہ اصرار بلایا ہے انہیں"

"یوں بلانے کو بلایا پہ دلو نہیں ہی فساد" "پھر غضب یہ ہے کہ حاکم ہے یہاں ابن زیاد"
"دیکھئے آپ یہاں آئیں تو کیا ہو افتاد" "بے سبب بھی مرے آقا سے ہر اک کو ہی عناد"

ہر گھڑی جان کا کھٹکا ہے یہ حال اپنا ہے
کیا کروں کیا نہ کروں مجھ کو خیال اپنا ہے"

سن کے یہ حال بصد جوش یہ وجہ نے کہا اسطرف آتے ہیں فرزند نبی شکر خدا"
"رونق افروز ہوں یارب کہیں جلدی آقا" "ہے جگہ فخر و مباہات کی ڈر نا کیا"

مال و زر چیز ہے کیا۔ جان فدا کرتے ہیں
جو ہیں دیندار وہ اسدن کی دعا کرتے ہیں

"جان دینا تو رہ حق میں ہے آسان سا کام" "لے زہے بخت جو آقا پہ تصدق ہو غلام"
"میں ان پردہ نشین ہوں نہیں کچھ اسمیں کلام" "یہ نہ تا تو بتاتی کہ وفا کس کا ہے نام"

حکم اللہ و نبی سے ہوئی مجبور رہوں میں
ہائے افسوس کہ نصرت سے بھی معذور رہوں میں

راتدن تم تو جپا کرتے تھے صاحب یہی نام" تم تو کہتے تھے کہ عشق انکا ہی عین اسلام
نہیں مقبول بہ غیر ان کی رضا کے کوئی کام" ایسے ہی ہوتے ہیں دنیا میں وفادار غلام"

یہ خبر سنکے محب بھی کہیں گھبراتے ہیں۔
سجدۂ شکر بجا لاؤ حسینؑ آتے ہیں"

خوب روئے یہ سخن سن کے حبیب ذیشاں گر پڑے پاؤں پہ اس صالحہ کے گریہ کناں
یوں لگے کہنے کہ میں سبط نبی پر قربان" ہوں نثار آپ پہ میں مجکو تو خود ہی ارماں

آزماتا تھا کہ نیت میں تمھاری کیا ہے
کسکو انکار ہے اس سے کہ حسین آقا ہے"

"نہ سنوگی کبھی اسوقت سے تشویش کا نام" مرنے والے جو ہیں گھبرانے سے اُن کو کیا کام"
کہا زوجہ نے کہ "ای آل پیمبر کے غلام شب سے کھایا نہیں دو حکم تو لے آؤں طعام"

ہوئی بشاش جو شوہر سے اجازت پائی
وہ زن صالحہ جلدی سے غذا لے آئی

شاد عظیم آبادی۔

ایک فلاسفر کی رائے ہے کہ صداقت اور آوارگی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر کسی ذہین شخص کو ایسے موقع میسر آئیں کہ وہ اپنی جو کام انجام دیتا تو یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ اس سے مضر و ایسے افعال سرزد ہوئے ہوں گے جو سوسائٹی کے واسطے نہایت مضر و تکلیف دہ ہوں اس لیئے سوسائٹی کا پہلا یہ فرض ہے کہ وہ ان طبیعتوں کو جنمیں خلوص اور صداقت کا مادہ موجود ہے اسس کے کام میں لانے کا موقعہ دیں +

سید جمال الدین "الافغان"[1]

لَیْسَ الْفَخْرُ لِمَنْ یُحِبُّ الْوَطَنَ بَلْ لِمَنْ یُحِبُّ الْعَالَمَ

فخر اس شخص کو ہی زیبا نہیں جو اپنے وطن سے محبت کرے بلکہ اسکے لیے ہے جو تمام عالم کو چاہے

اسلامی دنیا کی بیداری، کیا ترکی و ایران میں، کیا مصر، مراکش و ہندوستان میں، کیا کریمیا و کوہ قاف میں، تیس چالیس سال کے عرصہ سے مذہبی یا سیاسی رنگ میں ظاہر ہو رہی ہے، اسمیں بلاشبہ فتوحاتِ جاپان نے ایک کہربائی تموّج پیدا کر دیا، جاپان کے نمایاں کارناموں نے تمام عالم میں غلغلہ ڈال دیا کہ اگر مشرقی قومیں بھی یورپین ساز و سامانِ جنگ سے آراستہ ہوں تو یورپ کی زبردست سے زبردست فوج کو بھی سامنے نہ ٹھہرنے دیں۔ پچاس سال ہوئے مصطفیٰ پاشا، شناسی آفندی اور کمال بے نے خرقہ کہنہ اتار کے آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا، ینی ترکلر" یا ینگ ٹرکش کے طبقہ کی بنیاد ڈالی اور حکومتِ مشروطہ کا نقشہ کھینچا۔ پندرہ سال کی جان توڑ کوشش و کاوش کے بعد ۲۳۔ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کانسٹیٹیوشن کا افتتاح ہوا، لیکن عثمانیوں کی بدقسمتی کہیے یا مسلمانوں کی طالع کی پستی، جنگ روس و ترکی چھڑ جانے اور پھر سلطان عبدالحمید کی استبداد و مطلق العنانی نے تمام آرزوؤں کا جنازہ اٹھا دیا خدا کی قدرت، دفعتہً اقبال ترکی کا شہباز ہوائے "مشروطیت" میں بلند پرواز ہوا دنیا کو اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ یک بیک نہایت شاندار طریقہ سے ۲۴۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو قصر یلدیز پر گرا۔ قوم کے لیے جو مارِ سیاہ تھا اوسکو گوشہ نیستی میں بھیجدیا۔ اور پارلیمنٹری گورنمنٹ کو از سرِ نو زندہ کیا، غم کا سینہ چھلنی ہوئے

[1] ماخوذ از انقلاب ایران مصنفہ پروفیسر براؤن ۱۲

جاتا ہے اور دلپر سانپ سا لوٹے جاتا ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ اس واقعہ نزہت افزا سے ایک ماہ قبل شاہِ ایران اور اس کے ہم نوا روس نے ایران کی پہلی مجلس کا شیرازہ بکھیر دیا، مصر کی تحریک ملی یا نیشنل موومنٹ جس کا طلوع آفتاب ۱۸۸۱ء میں ہوا اور جو نصف النہار پر عربی پاشا کی بغاوت سے پہنچی، اور جسکا زوال ۱۸۸۲ء میں ہوا - علی ہذا دولت فارس میں بھی بیداری کا سامان عرصہ دراز سے ہو رہا تھا، اور ہمیں اسکی تلاش میں تاریخ کے بہت سے ورق الٹنے پڑتے ہیں ۱۸۹۱ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد حکومت میں تمباکو کے "ٹیکہ" کے برخلاف نہایت کامیابی سے بے چینی و اضطراب ہوا - یک لخت تمام ایرانیوں نے تمباکو کا استعمال چھوڑ دیا، یہ انکی بیداری کا بنیادی پتھر تھا مخلوق ایران آفات گوناگوں جھیل کر ۱۵- اگست ۱۹۰۶ء کو اپنی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی تھی، لیکن گردشِ فلک نے کچھ زمانے کے لیے ایسا ورق الٹا کہ کتم عدم میں پہنچا دیا - ۲۳- جون ۱۹۰۸ء کو روسی کوٹ ڈاٹا - یا حکمت عملی کے زبردست صدمہ نے بہارستان (ایرانی ہاؤس آف پارلیمنٹ) کو قلعہ شکن توپوں سے خاک کا تودا بنا دیا - لیکن مجاہدین و فدائیان ایران نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا اور کھوکھا جانیں قربان کر کے بالآخر ۱۶- جنوری ۱۹۰۹ء کو "شروطیت" ایران کا جھنڈا دار الخلافہ فارس میں گاڑ دیا، یہ تو سب کچھ ہوا لیکن ان جمہوری خیالات کا شائع کرنے والا کون تھا؟ کس نے مملکت ایران میں صور اسرافیل پھونکا اور ایرانیوں کو گہری نیند سے بیدار کیا کہ اٹھو! اپنے ملک، اپنی قوم کی خبر لو! اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگاؤ! اتحادِ اسلام کا داعی کون تھا! یہی غیبی سررشتہ سید جمال الدین الافغان تھا، جسکی زندگی کے کارنامے مختصراً ہدیہ ناظرین تمدن ہیں -

سیّد جمال الدین کے مقام پیدائش کے متعلق اختلاف ہے، ناظم الاسلام "مصنف" تاریخ بیداری ایرانیان" اور ایک اور یورپین محقق، جنرل شنڈلر تو اس امر پر متفق ہیں، کہ سیّد اسد آباد جو ہمدان کے قریب ملک فارس میں ہے پیدا ہوئے، لیکن سید کی ذاتی تحریر سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۸ء میں اسد آباد جو کنار کے قریب افغانستان میں واقع ہے تولد ہوئے، ان کے والد سید صفدر جنکا سلسلۂ نسب "سید علی الترمذی سے ملتا ہے ایک ہمہ دان فاضل تھے ولادت باسعادت کے کچھ زمانہ بعد معہ اہل وعیال شہر کابل میں آئے اور سکونت اختیار کی، ہونہار بچے نے اوائل عمر میں ہی انتہائے ذہانت اور طباعی کے جوہر دکھائے - جب آٹھویں سال میں قدم رکھا، بسم اللہ ہوئی۔ اور نیک نہاد استاد نے بچہ کی تعلیم اپنے دامنِ شفقت میں لی اور دس سال تک اسکا تار نہ ٹوٹنے دیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم عقلی ونقلی میں کامل مہارت حاصل کرلی، سیر وسیاحت کی امنگ دلیں آئی، ہندوستان آئے جوانی کی بہار کا زمانہ، جوش و ترنگ خون میں لہریں مار رہی تھی، ہمہ گیر ذہن کا یہ عالم کہ جو نئی بات سامنے آئے وہ دماغ میں محصور ہوجائے۔ جدتِ طبع کی یہ کیفیت کہ اسمیں سے چار باتیں نئی پیدا کرے ہندوستان آئے تھے مکہ جاتے تھے۔ لیکن علوم مغربی کے ذوق وشوق نے ایک سال تک یہیں رکھا، اسمیں آگاہی حاصل کرکے حج بیت اللہ کو گئے اور وہاں سے سیدھے وطن مالوف کو واپس آئے۔ دوست محمد خاں امیر کابل تھے سیّد کے محامد وفضائل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور معقول عہدہ پر ممتاز فرمایا۔ ہم ہرات میں امیر کے ساتھ تھے، امیر کی عمر نے وفا نہ کی۔ اور ایک سال بعد دنیا سے سفر کیا، امیر شیر علی انکا جانشین ہوا۔ بدانديش

مشیروں کی صلاح سے بھائیوں کو قید کرنا چاہا، خانہ جنگی ہوئی۔ امیر محمد اعظم اور اُن کے بھتیجے امیر عبدالرحمن نے حملہ ہائے آستمانہ اور چپقلشہائے افغانانہ سے دار الخلافہ پر قبضہ کرلیا، اور امیر افضل علی پدر عبدالرحمن کو غزنا سے رہا کر کے تخت پر بٹھایا، لیکن یہ بھی ایک سال بعد راہی ملک بقا ہُوا۔ اب امیر محمد اعظم کا دور دورہ ہوا۔ سید جمال الدین کی جانفشاں خدمتیں اور اعلی تدبیریں سفارش کو آئیں، اور کرسی وزارت پر جلوہ افروز کرایا۔ سید موصوف اپنی دانش و بینش جہاں نما سے تمام ملک کو شیر و شکر کر دیتا، اور فرزانگی حسن تدبیر سے تمام سرداروں کی گردنیں اطاعت میں جھکوا دیتا، لیکن امیر محمد اعظم کی کوتاہ بینی اور اقارب سے سوءظنی و حسد نے تیر تدبیر کو نشانہ پر نہ بیٹھنے دیا۔ بھائیوں حتے کہ بیٹوں کو مہمات ملکی و نظام دولت سے بالکل الگ تھلگ رکھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا جو نا تجربہ کار اور نالایق تھا ناک کا بال بنا ہوا تھا، غرور کا فرعون اور ظلم کا شداد تھا،

اسی اثنار میں محمد اعظم کے ایک بھتیجے نے چچا کے سامنے سرخرو ہونے کے خیال سے امیر شیر علی پر جو قندھار پر قبضہ و تصرف کیے بیٹھا تھا، یلغار کی لیکن جوش شجاعت میں دو سو سواروں کے ساتھ صدر سے جدا ہو گیا۔ امیر شیر علی کے جنرل یعقوب خاں نے جو بڈھا تجربہ کار آئین جنگ سے واقف تھا، جوشیلے جوان کو گرفتار کر لیا، شیر علی یہ صورت حال دیکھ کے شیر ہو گیا ادھر گورنمنٹ ہندوستان نے دام و درم سے مدد پہنچائی، پھر کیا تھا، ملک رزم گاہ شیر دلان افغانستان بن گیا۔

امیر محمد اعظم کا ستارہ نحوست زوال میں آیا اور امیر شیر علی نے گئی ہوئی سلطنت پائی۔ امیر عبدالرحمن نے بخارے کیطرف قدم اُٹھائے۔ اور

امیر محمد اعظم نے نیشاپور کی سمت باگیں ڈالدیں۔ سیّد جمال الدین وہیں رہے اور چونکہ ایک تو سیّد نژاد تھے اور دوسرے لوگوں پر ذاتی اثر بھی رکھتے تھے، اِس لیئے شیر علی کا دل نہ ٹھکا کہ انپر وار کرے۔ حکومت میں انقلاب ہونے کے تھوڑے دنوں بعد اس سرزمین سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ صلاح وقت بھی یہی تھی کہ اس شہر وبال گزندگاہ کمال سے نکل چلیں، چنانچہ نکلنے کا رستہ یہ نکالا، کہ روضہ پاک کی زیارت کے لیے اجازت چاہی سے امیر نے اجازت دے تو دی لیکن اس شرط پر کہ براہ نیشاپور نہ جائیں۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں ہندوستان آئے سرکار دولت مدار نے بہت عزت کے ساتھ مہمانداری کی۔ اور ایک ماہ کے سیر وسفر کے بعد باعزاز واکرام سوئیز جانے والے جہاز میں رخصت کیا۔

سکندریہ آئے اور پہلی بار قاہرہ گئے۔ چالیس دن قیام کیا بیت العلوم "ازہر" روز جاتے اور طلبا روشناسین سے صحبتیں گرم کرتے۔ کچھ دنوں چیدہ چیدہ کو خلوت میں بلایا اور جواہر معانی کے خزانے کی سیر کرائی مکہ معظمہ جانے کے عزم کو ملتوی کیا اور قسطنطنیہ پہنچے، علی پاشا اس زمانہ میں وزیر اعظم تھے وہ اور اور خوانین سلطنت بڑی مدارات سے پیش آئے یہاں گوشہ میں بیٹھ کے عقل و دانش کا چراغ روشن کیا۔ علوم وفنون کے درس میں دل بہلانے لگے۔ چھ ماہ اسیطرح گذرے، علم وعمل نے گمنامی کی چادر اُتاری۔ ترکش اکاڈمی یا "انجمن دانش" نے ممبری کا اعزاز بخشا۔ سنہ ۱۸۷۰ء کے اختتام مطابق ۱۲۸۵ھ ہجرے ماہ رمضان میں سیّد موصوف کا ستارۂ قسمت آسمان شہرت پر چمکا، حسن آفندی ڈائرکٹر دارالفنون نے انہیں طلبا کے آگے لکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔

زبان پر پورے قادر نہونے کی وجہ سے عذر معذرت کی، مگر صاحب ڈائرکٹر کے اصرار پر منظور کر لیا۔ ترکی زبان میں اڈریس تیار کیا، منیف پاشا، صفوت پاشا، وزیر صیغہ تعلیم، اور شوقی زادہ وزیر پولس کی خدمت میں بغرض ملاحظہ بھیجا۔ ان سب نے پسند کیا۔ ظاہر پرست اور بوالہوس ملائے حسن فہمی آفندی شیخ الاسلام کی آنکھ سید موصوف کو نہ دیکھ سکی، اور اس کے دل میں حسد کا شعلہ بھڑکا چاہتا تھا کوئی تدبیر نہ آئے تو سید کے کمال پر خاک ڈالے، اور ان کا اثر جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا، زائل کرے۔ سید موصوف نے معینہ وقت پر سلطنت عثمانیہ کے امرا و اعیان، مدبران ملک و وقائع نگار، اور طلبا و مشائخین کے انبوہ کثیر کو اڈریس دیا۔ حسن فہمی تو موقع کی تاک لگائے بیٹھا تھا کہ کوئی نکتہ گرفت میں آئے تو حریفانہ حربہ چلائے۔ چنانچہ جب سید موصوف نے اپنے ایڈریس میں باڈی پالیٹک کو ذی روح جسم سے نسبت دی اور اس کے مختلف ہنروں اور پیشوں کو مختلف اعضا سے تشبیہ دی اور استعارۃً بیان کیا کہ انسان دماغ کو بادشاہ تصور کر لو اس کے بازوؤں کو آہن گر، اس کے جگر کو کسان، اس کے پاؤں کو ملاح و قس علی ہذا اور مقطع کا بند یہ نکالا۔ اسطرح انسانی سوسائٹی کے وجود نے ترکیب پائی ہے لیکن وجود بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا اور اس وجود کی روح "نبوی" فلسفی استعداد ہے، اور انکا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اول الذکر خدا کی دین ہے جو ریاضت سے حاصل نہیں ہو سکتی لیکن موخر الذکر مطالعہ اور وسعت خیال سے حاصل ہو سکتی ہے، انمیں ایک اور یہ بھی فرق ہے کہ نبی عیب و خطا سے معرا ہوتا ہے لیکن فلاسفر غلط کاری اور خطا سے معمور ہے"۔ حسن فہمی جو قرابا دین قدرت کا عیب نسخہ تھا ان لفظوں کو

کو لے اُڑا۔ اور زبان کی تلوار کھینچ کے پل پڑا۔ غریب سیّد پر عجیب عجیب طوفان اُٹھائے، یہہ تہمت لگائی کہ مرتبہ نبوت کو ہنر یا پیشہ سے منسوب کرتا ہے اور نبیوں کو "کاریگر" و "ہنرور" نام دہراتا ہے۔ مُلّانوں میں بڑے کچا کے ہوئے اجناروں نے دِل کھول کے اسپر حاشیہ چڑھائے، دونوں طرف کی پارٹیوں میں خوب مورچے بندہے، گورنمنٹ ترکی نے بھی صلاح دی کہ سیّد کچھ دنوں کے لیے "عثمانی زمین" کو خیرباد کہیں اور اِس طرح اس فساد کا جو بہتروں کے شاہ نے اُٹھایا تھا خاتمہ کردیں۔ ارادہ یہ تھا کہ خلق خدا ملک خدا میں ہی نہیں رہونگا، جدہر جی چاہے گا چلا جاؤنگا لیکن کمال کے قدردانوں نے وہیں پلکوں کو بچھادیا اور آنکھوں پر بٹھالیا۔ علم کے پیاسے اطراف واکناف سے جوق جوق آنے لگے حکمت کے بستان سرا نے اس صحبت میں اور ہی طراوت دکھائی۔ فلسفہ و الٰہیات۔ نجوم و عرفان، فقہ و حدیث کے اعلیٰ اعلیٰ نکتے شیر و شہد بنکر بہنے لگے، اور کانوں کے رستہ دلمیں اُتر گئے۔ شمیم شہرت ملک میں پھیل گئی۔ کوہِ کمال و دریائے دانش نے رموزِ فن تحریر سے روشن دلوں کو آگاہ کیا، اور ادبی فلسفی، مذہبی اور پولیٹیکل آرٹیکلز لکھوانے شروع کیے، جس ملک میں سے دے کے نئی طرز کے دو چار ادیب تھے وہاں سینکڑوں عبداللہ پاشا فخری، محمد پاشا، مصطفےٰ پاشا ذہی اور خیری پاشا پیدا کردیئے۔ زمانہ کے مزاج کی تاثیر ہے کہ وہ کسی کے اوج کو ٹھنڈی مل سے نہیں دیکھ سکتا، ایک طرف تو اولڈ اسکول کے غلط مگر باکمال مولوی فلسفہ جدید کا شہرہ عام دیکھ کے بدک پڑے اور تکفیر و تضلیل کے تیر برسانے لگے اور دوسری طرف لارڈ دوفرین سفیر انگلستان کو ان کی طبیعت کی تراقی

اور پولٹیکل رموز شناسی سے کھٹکا ہوا کہ کہیں اسرار سیاسی پر متوجہ نہ ہوں غرض اس قسم کے سامان پیدا ہوئے کہ بیچارے میدان عالم میں نکل کھڑے ہوئے اور حیدرآباد آئے "رد ملاحدہ" لکھا اسی اثنار میں عربی پاشا کے جھنڈے تلے حق پرستوں نے خدیو مصر کی فضول خرچیاں اور خود مختار حکومت کے خلاف تحریک کی، غیر اقوام کے عمل و دخل و تحکمانہ طریقہ نے بھی قوم کے دل کو ہزار پارہ، خاطر کو گرانبار اندوہ کر دیا تھا۔ ان تمام پولٹیکل حقوق کے احساس کا تخم سید جمال الدین ہی نے مصریوں کے دل میں بویا تھا اور وہ انجام سے واقف تھے ٭

ینگ ایجپشنز کا اعلان جنگ ہونے سے قبل گورنمنٹ ہندوستان نے سید کو حیدرآباد سے کلکتہ بھیجدیا نیشلسٹ پارٹی کی شکست کے بعد سید بالکل آزاد تھے ٭

ہندوستان سے لنڈن اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے پیرس چلے گئے ان کے جگری دوست اور شاگرد رشید شیخ محمدہ صدر مفتی مصر بھی آملے شیخ محمدہ ایک متبحر عالم اور مسلمہ حکیم تھے اڈیٹر "المنار" سید محمد رشید رضا نے (جو شیخ سے واسطہ تلمذ رکھتے تھے) کئی ضخیم جلدوں میں انکی سوانح عمری لکھی ہے، ان دونوں جامع الکمالات فاضلوں نے ایک رسالہ موسومہ "العروۃ الوثقے" بزبان عربی پیرس سے نکالا۔ اس ہفتہ وار میں مضامین زیادہ تر پولٹیکل ہوتے تھے۔ یہ تھوڑے روز بعد بند ہوگیا۔

سید جمال الدین جنھوں نے فرانسیسی زبان میں کچھ دستگاہ حاصل کرلی تھی اب اپنی آرار کو یورپین پریس کے ذریعہ تشہیر کرنے لگے۔ اور رینان مشہور فاضل فرانس سے ایک فلسفی مجادلہ در باب "اسلام اور سائنس" کیا

ترکی و مصر، روس و انگلستان پر ان کے مضامین جو پولیٹیکل دقیق نظری کے اعتبار سے اپنے نظیر آپ تھے۔ تمام انگریزی اخباروں میں نقل کیے جاتے تھے۔ تمام سربرآوردہ مدبرین ہفت کشور ان کے وجود شریف کو فضل و کمال کا قبلہ سمجھتے تھے اور اسیقدر ڈرتے بھی تھے۔ باوجودیکہ انہوں نے سلطنت انگلشیہ کے خلاف بہت دلیرانہ اور بے باکانہ حملے کیے لیکن ۱۸۸۵ء میں لنڈن آئے۔ لارڈ اینڈالف چرچل، لارڈ سالسبری اور سر والف سے دیدوادید ہوئی۔ انہوں نے سوڈانی مہدی کی نسبت ان کی رائے لی۔ مسٹر بنیٹ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ "موسم بہار ۱۸۸۴ء میں میں پیرس گیا اور سید موصوف سے ملا۔ یہ زمانہ پرآشوب تھا، چونکہ جنرل گارڈن مہدی سے دست و گریبان ہو رہے تھے، میں نے سید سے التجا کی کہ وہ اپنے اثر سے اس معاملہ کو رو براہ کرادیں، سید نے بڑی شگفتہ روئی سے میری التجا قبول کی۔ لیکن یہ کہا کہ اگر میں انگریزی فارن آفس کیطرف سے انہیں پورا اعتماد دلادوں تو وہ بسر و چشم اس تنازع کا تصفیہ کرادیں۔ میں انگلستان آیا اور مسٹر گلیڈسٹون سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی مدد دینے کا وعدہ کیا اور تہیہ کر لیا کہ اس مسئلہ کو کینیٹ میں پیش کریں۔ لیکن فارن آفس کیوجہ سے یہ تجویز ناکام رہی، سال پیوستہ میں لارڈ اینڈالف چرچل سکرٹری آف اسٹیٹ ہوئے، ان سے میرا مراسم بڑھا ہوا تھا۔ میں نے سید جمال الدین کو لندن بلایا، وہ تین ماہ تک میرے مہمان ہوئے، چرچل اور والف سے "تقریب ملاقات کرائی۔ ایکدفعہ یہ بات قرار پائی کہ وہ والف کے ساتھ قسطنطنیہ جائیں جو ایک خاص مشن لیکر جا رہے تھے جسکا منشا یہ تھا کہ سلطان سے اس قسم کا معاہدہ ہو جائے

کہ ترکی، ایران و افغانستان روس کے خلاف انگلستان کے شریک حال ہو جائیں، سلطنت انگلشیہ اس کے صلہ میں مصر کی مداخلت سے دست بردار ہو جائے گی۔ سید نے اسے منظور کر لیا اور قسطنطنیہ کا ٹکٹ بھی خرید لیا لیکن عین روانگی کے وقت کسی نے والف کو ایسا راگ دیا کہ وہ انکی معیت سے منحرف ہو گیا، سید کو اسکا سخت صدمہ ہوا اور وہ چند روز بعد خفیہ طور پر ماسکو روانہ ہو گئے۔

ماسکو میں انکا استقبال بڑے تپاک سے کیا گیا۔ کامل چار برس تک رہے۔ مسٹر والف کے مشن کے خلاف کارروائی شروع کی اور کنٹکاف، میڈم ناویکاف، ایم زینا دلیف وغیرہ اراکین جلیل القدر کی استعانت سے مجوزہ عہد و پیمان مابین ترکی و انگلستان پر پانی پھیر دیا۔ اس شاہ تدبیر کے ارسطو نے اس سفر میں مسلمانان روس کی بڑی خدمت کی، ان کے حقوق کی بہت زور کے ساتھ زار روس سے سفارش کی اور کتب مقدسہ قرآن مجید و دیگر مذہبی کتابوں کے شائع کرانے کی اجازت دلوائی[۱] سید کے دوران

[۱] معلوم ہوتا ہے، سید دوبار روس گئے، پہلی بار تو ۱۸۸۵ء جب انگلستان سے مصالحت ناممکن نظر آئی اور دوسری بار ۱۸۸۹ء میں ناصر الدین شاہ قاچار سے ملاقات ہونے کے بعد امین السلطان، اتابک اعظم ایران نے ان کے سپرد ایک خاص کام کیا تھا جو روسی فارن آفس سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاہیر الشرق صفحہ ۶۲ میں ان کے حالات میں یہ لکھا ہے کہ ۱۸۸۶ء میں ناصر الدین شاہ نے بذریعہ تار انہیں طلب کیا اور وزیر جنگ کے ممتاز عہدہ پر مامور کیا۔ ظل السلطان سے اصفہان میں ملاقات ہوئی" اور اب وہوا تبدیل کرنے کی غرض سے ملک چھوڑنے کی اجازت ہوئی۔ وہاں سے روس روانہ ہوئے۔ دوسری بار ایران ۱۸۸۹ء میں آئے اور ۱۸۹۵ء میں نکال دیئے گئے ۱۲

قیام میں، ناصرالدین شاہ قاچار جو سیر و سیاحت کے بڑے دلدادہ تھے، قلمرو روس میں گئے۔ سینٹ پیٹرزبرگ میں شاہ نے انہیں یاد فرمایا۔ لیکن سیّد نے جانا پسند نہ کیا۔ حسنِ اتفاق سے بیونچ میں ملاقات ہوئی۔ سیّد موصوف کے عظیم الشان کارناموں سے متاثر ہو کر انہیں ایران لیجانا چاہا اور وزیر اعظم کا اعلیٰ مرتبہ بخشنے کا وعدہ فرمایا۔ سیّد نے صاف انکار کر دیا لیکن بعد میں شاہ کے مزید اصرار پر قبول کر لیا۔ سیّد کے رفیق شفیق عبدالقادر المغربی نے جب یہ سُنا، حفظ ماتقدم کے خیال سے منع کیا کہ، شاہ ایران تمہیں کس لیے لیجانا ہے جبکہ اُسپر ظاہر ہے کہ تم اہل سنت والجماعت کی تقویت میں دل و جان سے کوشاں ہو" اس کے جواب میں سیّد نے صرف اتنا کہا انکی حماقت اور بیہودگی غرض وہ شاہ کے ساتھ ایران آئے اور کچھ دنوں رہے۔ بادشاہوں کے گرد و پیش جو شر و سے لگے رہتے ہیں ان کے دل میں یہ خار کھٹکا انہوں نے چند ہی روز میں مختلف ترکیبوں سے ان کی طرف سے سوءظنی پیدا کر دی۔ سیّد نے شاہ کے طور بدلے ہوئے دیکھ کے نایش پیرس کے بہانہ سے کنارہ کشی کرنی چاہی۔ لیکن شاہ نے ترش روئی اور بد اخلاقی سے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ نشتر سیّد کے دل میں چبھ گیا اور وہ شاہ محمد عظیم کے آستانہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ سات ماہ تک رہے اور جاتے ہی نہایت آزادانہ طریقہ سے شاہ کی مخالفت پر کمر باندھی۔ دھواں دھار تقریروں اور پُرزور تحریروں میں شاہ کی معزولی کی تحریک کی۔ شاگردوں کا ایک جم غفیر وعظ لکچروں میں شریک ہوتا تھا انمیں سے ایک درجن نہایت ممتاز گزرے ہیں۔ سیّد جمال الدین جبکہ آستانہ میں بستر علالت پر تھے اور کمزوری و نقاہت نے نقش پلنگ بنا دیا تھا کہ یکایک شاہ کا نادرشاہی فرمان انکو حدود ایران سے

نکالدینے کا پہنچا اور تعمیل کے لیے پانسو فوجی سوار بھی جا دھمکے۔ تقدس آستانہ کو بالائے طاق رکھا اور سیّد کو بے بسی کے عالم میں بے دردی سے گسیٹ کے لے گئے اور حسد تر کی پر لیجا کے چھوڑ دیا۔ معتقدین سیّد کے دلوں کو اس حرکت نافرجام نے ہلا دیا اور ۱۸۹۶ء میں یہی شاہ کی ہلاکت کا باعث ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ اس شکستگی کے عالم میں سیّد لندن گئے ومانع شوریدہ سینہ زخم اندود، بڑے بڑے مجمعوں میں متعدد تقریریں کیں حدت طبع نے سحر بیانی کو آتش زبانی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اخبارو میں ایرانی جابرانہ وظالمانہ طرز حکومت پر نہایت زوردار آرٹکل لکھے، یہ تحریریں کیا ہیں خون کے قطرے ہیں جو دل افگار سے ٹپکے ہیں ان میں شاہ ایران کے چال وچلن پر ایسی سخت چوٹیں کیں کہ اسے دہلا دیا اور فاطر العقل ثابت کر دیا۔

معمورۂ جہان کو عبرت کے قدموں سے طے کر کے ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ گئے اور یہیں آ کے پانچ سال بعد جام عمر کا دور ختم ہوا۔ سلطان عبدالحمید کے دربار میں باریابی کے متعلق بلنٹ صاحب نے اپنی ڈائری میں عجب لطیفہ لکھا ہے کہ عید بہرام کے موقعہ پر سلطانی دربار ہوا تمام امرا وعیان شریک بزم تھے، سیّد صاحب بھی جا پہنچے۔ منتظمان دربار میں سے کسی نے انہیں باہر کرنا چاہا۔ سید ایک جید شخص تھا اور ہمیشہ کا آزاد رو، یہ اس ذلت کو کب سہ سکتا تھا، سر دربار اسکی مونچھیں پکڑ کے ہلا دیں۔ کہا "تو نہیں جانتا ہمیں اسمیں شریک ہونے کا پورا مجاز حاصل ہے کیونکہ ہم سید النسب اور عالم العلم ہیں" اور موجودہ ارا کین سلطنت کے ہم پلہ وہمسر سلطان عبدالحمید کی بھی نگاہ جا پڑی، قدردانی اور آدم شناسی کی آنکھ سے دیکھا، عنایت خسروانہ سے اپنی اشیت

کرسی دی۔ امیدوں کے گلبن پر کامیابی کی نسیم لہرانے لگی، رنگا رنگ کی نوازشوں سے اتنے بڑھے کہ مقربین بارگاہ میں سے ہو گئے۔ انتقال سے ایک سال قبل سلطان نے سیّد سے کہا کہ شاہ ایران پر اب حملے کرنا بند کر دو چونکہ یہ تیسرا موقعہ ہے کہ سفیر دولت ایران نے ہماری حضور میں عرض کی، دو موقعوں پر ہم نے خشک جواب دے کر ٹال دیا کہ ہم اسمیں دخل نہیں دے سکتے لیکن اس بار وعدہ کر لیا ہے کہ ہم اپنا اثر کام میں لائیں گے۔ سیّد نے عرض کیا، خلیفۃ المسلمین کا ارشاد بجا لانا لازمی ہے اس لیئے میں نے شاہ ایران کو معاف کیا! معاف کیا! سلطان نے فرمایا "شاہ حقیقت میں تم سے بہت خوف زدہ رہتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے اختتام پر مرزا رضا کرمانی جو سیّد سے ارادت رکھتا تھا اور شاگرد رشیدوں میں سے تھا قسطنطنیہ گیا۔ داستان اندوہ غم و مصائب پُر الم سنائے اس شخص نے تحریک ایران میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور سیّد کا شاگرد ہونیکی وجہ سے شہرہ آفاق تھا۔ ایرانی حکومت اور امرا نے کم ظلم اس پر بڑے جبر و تشدد کیئے تھے، سیّد نے کتاب بڑے بڑے سوانح عمری کی طرح رو نما ہوتے ہو، فرانسیسی اپنی سخت سے سخت صعوبت بیخ لکھنی پڑے شگفتگی سے ذکر کرتے ہیں، تم بھی اپنی درد بھری کہانی ایسٹرھی و ایران و مصر میرے سامنے ان آفات کا اعادہ کرنا بالکل عبث ہے تاج انتقام میں جس شخص نے تمھیں تباہ و برباد کیا اسکا وہیں کام تمام کر دو اقامت کے نقص یکم مئی کو مرزا رضا نے آستانہ محمد عظم میں ناصر الدین [illegible] کر لا کر بنایا۔ پہلے تو اسکا شبہ فرقہ بہائیہ کے پیرو کار و پنہاں رہا۔ رشا ہیر الشرق میں سے ان کے شاگردوں پر مرزا آقا خاں نائب اڈیٹر "رخ تے ہیں:۔

چہرہ کا رنگ گندمی جیسے کہ حجاز کے عربوں کا ہوتا ہے کشیدہ قامت سینہ چکلا، جسم گٹھیلا اور طاقت ور، آنکھوں کی پتلیاں سیاہ اور روشن لمبے لمبے بال، خشخشی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ لباس عموماً وہ پہنتے تھے۔ جو قسطنطنیہ کے علما میں مروج ہے، کھانا دن میں ایک وقت کھاتے تھے لیکن خوب ڈٹ کے۔ البتہ چائے ایرانی فیشن میں علی التواتر پیتے رہتے تھے حقہ کے بہت شوقین تھے اور تمباکو اپنے ہاتھ سے خرید کر لاتے تھے۔ سگرٹ پر سگار کو ترجیح دیتے تھے۔ آخری وقت میں جب انہوں نے قسطنطنیہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی، سلطان انہیں (۷۵۔ پونڈ) ماہوار دیتے تھے، نشان تاش میں مکان فرنیچر سے آراستہ اور شاہی اصطبل سے گھوڑا گاڑی دے رکھا تھا۔ سارے دن مکان پر رہتے تھے صرف شام کو ہوا خوری کے لیے وہ بھی "کیا نیدخانے" یا سویٹ واٹرز جاتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ترکی دار الخلافہ کے کسی اور خوش منظر اور تفریح کے مقام پر چلے جاتے تھے۔ سوتے بہت کم تھے "دیر میں سوتے صبح جلدی اٹھتے تھے۔ خود کسی کے ہاں نہ جاتے تھے، اور خصوصاً اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ہاں تو پھٹکتے بھی نہیں تھے۔ نہایت شگفتہ بیان تھے، الفاظ جن جن کے استعمال کرتے تھے جو اثر میں ڈوبے ہوئے نکلتے تھے، جس سطح کے خیال کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا، اسی قسم کی تقریر کرتے تھے اور آن کی آن میں ادھر کی دنیا ادھر کر دیتے تھے۔ مشرقی پبلک مقرروں میں انکا ثانی کوئی نہیں۔ گفتگو متانت میں ڈوبی ہوئی زور میں بھری ہوئی ہوتی تھی ظرافت کے رنگ سے رنگی ہوئی یا فضول نہ ہوتی تھی۔ زہد و تقوے بے انتہا بڑھا ہوا تھا اور دنیا کے عیش و نشاط سے مطلق سروکار نہ تھا۔ خوف و بیم کے موقع پر بالکل نڈر اور دلیر

پاک باطن اور خلیق لیکن تیز مزاج۔ میل ملاقات میں بڑی محبت سے ملتے تھے، بڑے لوگوں سے بے باک و آزاد۔ کہتے ہیں جب مصر سے نکالے گئے تو سوئیز بالکل مفلس اور قلاش آئے۔ سفیر ایران نے معہ چند ایرانی سوداگروں کے ان کو کچھ روپیہ بطور قرض حسنہ یا ہدیہ کرنا چاہا، لیکن بلند نظری کی آنکھ نہ جھکی اور انکار بایں الفاظ کیا، "اپنا روپیہ اپنے ہی پاس رکھئے چونکہ مجھ سے زیادہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ شیر جہاں جاتا ہے غذا پاتا ہے"۔ ان کی دماغی قابلیتیں، نہایت عمدہ اور دیدہ وری و بصیرت یکتائے زمانہ۔ جب کسی پر نگاہ ڈالتے تھے دل کے پار اُتار دیتے تھے اور اس سے قبل کہ کوئی شخص زبان سے کچھ کہے یہ اُس کے دل کا بھید پڑھ لیتے تھے، قوت مقناطیسی بھی عجیب و غریب تھی جس وقت بولنے پر آتے تھے، زبان گوہر فشاں، فسونگری کرتی تھی، سامعین واہ اور آہ کے نعرے بلند کرتے تھے، علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ فلسفۂ قدیم فلسفۂ تاریخ اور تمدنِ اسلام اور تمام اسلامی سائنسز میں انتہا درجہ درک رکھتے تھے۔ علم السنہ میں کامل تھے اور سات زبانیں جانتے تھے۔ ذکی الطبع، شدید الذہن ایسے کہ تین ماہ کے عرصہ میں بغیر استاد کی مدد کے زبان فرانسیسی میں لکھنے پڑھنے اور سلیس ترجمہ کرنے کی استعداد پیدا کرلی۔ انگریزی، روسی، فرانسیسی، عربی، فارسی، ترکی، افغانی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ کتاب پڑھنے کے نہایت شوقین تھے، عربی، فارسی کی کتابیں پڑھنے کا تو شمار ہی نہیں شادی کبھی نہ کی اور نہ کبھی کسی پری تمثال کے حسن و جمال نے بھی کچھ اثر کیا مشاہیر الشرق کا آخری پیرا ان کی پولیٹکل تمناؤں پر روشنی ڈالتا ہے، جسکا قوام کشید کر کے پیشِ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ان کی (سید جمال الدین) زندگی کے مختصر حالات سے مبصرین نتیجہ نکال لیں گے کہ انکا نصب العین اسلامی دنیا کا باہمی اتحاد تھا اور اسی پر انکی تمام امیدوں کا تکیہ تھا، وہ دل وجان سے چاہتے تھے کہ یہ تمام مسلمان اور اسلامی طاقتیں ایک خلیفۃ المسلمین کے تحت میں آجائیں[1] اس کوشش وسعی میں انہوں نے اپنی تمام قابلیتیں صرف کر دیں اور اسکو عالم وجود میں لانے میں انکا نفس رام ہوگیا تھا۔ نہ کوئی پیشہ اختیار کیا نہ شادی کی۔ بانیہمہ وہ اسباب میں ناشاد و نامراد گئے۔ اپنے خیالات کا کوئی منضبط ذخیرہ بھی نہیں چھوڑا صرف ایک کتاب جو بہ تردید ملاحدہ لکھی وہ اُن کی زندہ یادگار ہے علاوہ بریں منتشر و بے ترتیب خطوط اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں جو مختلف موضوع پر محیط ہیں۔ بہرکیف انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ہوش وحواس کو جلاکر کے چمکا دیا جس سے انکی تیغ قلم کہیں ہے کر رہی ہے اور خیکی مساعی بلیغہ سے مشرق بے انتہا فائدے اٹھا رہا ہے اور اٹھائیگا۔ یہ خیالات ایک شامی عیسائی کی قلم سے نکلے ہیں۔ پانچ سال ہوئے جرجی زائدان نے مشاہیر الشرق تصنیف کی تھی، اُس زمانہ سے لے کے اب تک ساری دنیا پر بخوبی ظاہر ہوگیا ہے، کہ اسلامی ممالک میں بالخصوص ایران میں سید جمال الدین جن تحریکوں کو حرکت میں لائے تھے وہ برابر اب تک جاری ہیں۔

[1] تاریخ بیداری ایرانیان میں مرقوم ہے کہ سید نے مکہ میں ایک بین اسلامک سوسائٹی (انجمن اتحاد اسلام) قائم کی تھی۔ اس کا اصلی نام "ام القریٰ" تھا۔ جسکا یہ مقصد تھا کہ عالم اسلامی کے ایک خلیفۃ المسلمین قرار دیئے جائیں، خواہ مرکز قسطنطنیہ ہو یا کوفہ، اس انجمن نے اپنے قواعد وضوابط شائع کر کے ملک ملک میں تقسیم کرا دیئے تھے، لیکن سلطان عبدالحمید کے دل پر اس کا ایسا بد نما عکس پڑا۔ کہ انہوں نے اس کے وجود کے ایک سال بعد اسکو بیخ بنیاد سے کھو دیا۔

اِس فرد اکمل کے متعلق اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جو ایک جہاندیدہ جہان گشت فاضل تھا، جس کے پاس بس فصیح زبان اور ایک جادو نگار قلم کے اور کوئی دنیاوی حیثیت نہ تھی جسکا فانوس خیال علم کی روشنی سے منور اور جسکا مشاہدہ پولٹیکل رموز کی تہ میں اترا ہوا تھا، ایثار نفسی اور ایک اخوۃ اسلامی میں وہ غرق تھا، اسلامی انحطاط نے اس فرزانہ فیروزمند کے سینے میں آگ دہکا رکھی تھی اور اس نے اپنی جان کو اسکی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسکی حسن تدبیر اور حکمت بے نظیر نے مدبران ہفت کشور کی بڑی بڑی تجویزوں کو مٹا دیا۔ اسکی عظمت و وقار اور اسکی طبیعت جادو کار نے سلاطین کو لرزا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس موقعہ پر کس طبقہ کے لوگوں کو ابھارنا چاہیئے اور کس محل پر لیٹنشن سے کام لینا چاہیئے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مصر میں تحریک ملی کی عمارت چنی، یہ وہ شخص تھا جس نے ۱۸۹۱ء میں تمباکو کے ٹھیکہ کی منظوری کی غلط پالیسی کو پیش بینی کی عینک سے دیکھا اور صرف ایک خط سے جو حاجی حسن شیرازی، مجتہد اعظم سامرا کو لکھا تھا، اسکو حرف غلط کیطرح اڑا دیا، اور ایران کو غیر ملک کی مداخلت کے خطرہ سے بچا لیا۔ اِس نے عام خود مختار اسلامی ریاستوں کو بیدار کیا، اور سب کو یورپین طاقتوں کے زر و خطرے سے مطلع کیا، اِس امر کی نہایت شد و مد کیساتھ ضرورت ثابت کر دی کہ اگر وہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں تو غنیم عام کے پے در پے حملوں سے محفوظ رہنے کیلیے باہمی رنجشوں کو آب فراموشی سے دھو ڈالیں اور ایک جہتی و اتحاد کی لڑی بنکر مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسی اصول پر اتحاد عالم الاسلامی کا چراغ روشن کیا۔ قلم کا جگر اب یہاں سے شق ہوتا ہے کہ اسکی آرزوؤں کی شاخ وجود میں پورے پھول نہ کھلے اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ اسلامی شاہوں میں

کوئی ایسا شخص قابل نہ تھا کہ اسکے خیالات کی اہمیت کو سمجھے نہ اسقدر ہمدردی اور جوش تھا کہ انکو تمام کو پہنچائے۔ ناصرالدین شاہ قاچار کو تھوڑے سے زمانہ میں تجربہ سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ ایک خود غرض و خود پسند ظالم ہے جسکو سوائے نفس پرستی اور ذاتی حکومت کے دنیا سے کچھ غرض نہیں اس لیے اپنی نظریں دوسری طرف دوڑائیں اور سلطان عبدالحمید میں اسکا جوہر پایا۔ انکی تمنا یہ تھی کہ ترکی و ایرانی مذہبی اختلاف کو ہر دو قوموں کے دلوں سے نسیاً منسیاً کرا دیں اور سلطان عبدالحمید کو اہل سنت کا خلیفہ اور شاہ ایران کو اہل تشیع کا رکن اعظم بنا دیں اور اس قسم کی فروعات جو باعث نزع اور سنگ راہ اتحاد میں بالکل اڑا دیں تاکہ مصالحت کا جام پینے میں کسی کو عذر نہ رہے۔ چونکہ انہوں نے تجربہ کی دوربین سے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں ریاستوں کے لیے غنیم مونہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور صرف اتحاد ہی ایک ایسی چیز ہے جو غنیم کا مونہ پھیر سکتا ہے۔ بہت سارے مولویوں اور مجتہدوں کو سیدنے اس بات کیطرف راغب کر لیا تھا لیکن ایران میں پچھلے سالوں کچھ ایسی طوفان خیز ہوائے مشروطیت چلی کہ کچھ تو بہ اقتضائے فرائض ملکی اور کچھ فطری ہمدردی و حب الوطنی ایرانی گورنمنٹ کے طرز عمل میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا سلطان عبدالحمید جن کے کان ۱۹۰۸ء تک لفظ "مشروطیت" سے زیادہ دنیا کی کسی چیز سے غیر مانوس نہ تھے، طبعی نفرت کے سبب مشروطیت کا دم بھرنے والی قوم سے تا عنکبوت کیطرح رشتہ یگانگت توڑ ڈالا اور ایران کی شمال مغربی حدود میں اپنی فوج بھیجکر اسکی مشکلات و مصائب کو دوبالا کر دیا۔ بہرکیف ہمیں ملکہ امید سے لو لگائے رکھنی چاہیئے کہ عثمانی نیا کا دور حکومت سید کی تمناؤں کو عملی لباس پہنائے اور مسلمان سلطنتیں اتحاد سے رہیں۔

سید شوکت دہلوی

آہِ رسا

بندِ دوم

اثر بہر کرا گر افسانۂ دل ہم سنا دینگے
عزیز اللہ نے چاہا تو ان سب کو رلا دینگے

یہاں آئے تو خود آنکھوں میں انسو ڈبڈبا آئے
جنھیں دعویٰ یہ تھا ہم رونیوالوں کو ہنسا دینگے

فلک کے مدعی ہیں یہ نہ انکو عرش سے مطلب
یہ وہ نالے ہیں جو سب لے پرزوں کو ہلا دینگے

نہ تھے قسمت تو قع اونسے اتنی بھی نہ تھی ہمکو
ہمارے شوق دیرینہ کو سنکر مسکرا دینگے

مداوا کرنے والو سعی بیحاصل نہ یہ سمجھو
مریضانِ محبت تمکو سب دل سے دعا دینگے

سمجھتے ہو خموش ان عالمان دین کو کیوں تم
یہی وہ ہیں کہ جو بگڑی ہوئی قسمت بنا دینگے

تم اپنی طرز روش سب کیلئے گھبرائے جاتے ہو
چلو تو ساتھ رفتار زمانہ بھی سکھا دینگے

وہ خود بستر سے اٹھے جب بام آفتاب آیا
جو ہم سے کہہ کے سوئے تھے اندھیری منہ جگا دینگے

تصدق جائے اس طرز دلجوئی کے اے حضرت
کسیکا خون بہائینگے پھر اسکا خوں بہا دینگے

یہ سمجھے تھے کہ مرکر داد جانبازی ملیگی کچھ
یہ کیا امید تھی وہ شمع تربت بھی بجھا دینگے

کہاں ہیں وہ مسیحا قوم کے جنکو یہ دعویٰ تھا
صدائے قم باذنی دیکے مردے کو جلا دینگے

سنائینگے ہم تاثیر جذب نامرادی کی
بہت چھیڑو گے تو ہم مطلع عرفی سنا دینگے

فغاں کز سینہ دائم آہ بے تاثیر مے زاید
صباح عید از دل نالۂ شبگیر نے زاید

"عزیز لکھنوی"

تمدّن

کئی روز ہوئے ایک ماہوار رسالے کا اشتہار میری نظر سے گذرا۔ اُردو کی فوج بے طرح نرغے میں آئی ہوئی ہے شکر ہے ایک تازہ دم رسالے کی کمک نظر آئی۔ ایسے رسالوں کے دو ایک میدان تو بڑے زور کے رہتے ہیں لیکن پاؤں ذرا کمزور ہوتے ہیں۔ رسالدار بہادر میاں خیری صاحب کئی ایک لڑائیوں کا تمغہ پائے ہوئے ہیں اس سے ذرا تقویت ہوتی ہے کہ خوب کٹ کٹ کے لڑیں گے۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیئت۔ ہندسہ۔ جرثقیل۔ علم مثلث وغیرہ کے ساتھ عورتوں کے حقوق کیونکر ثابت ہوں گے یہ نئی مہم ہے۔ تاریخ تشریح۔ اقتصاد۔ علم الابدان۔ علم الانسان تک تو کچھ گاؤ زوری بھی ہو سکتی تھی اس کے آگے کیونکر بس چلے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں جیسا ایک صاحب نے قرآن و حدیث سے عورتوں کی فوقیت اور مردوں کا ظلم ثابت کیا تھا۔ وہ تو جیسا کچھ ثابت ہوا مصنف صاحب ہی کو معلوم ہوگا یا بعضے نئے دولہا دلہن کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ دلیل ایک آدھ مجھے بھی یاد ہے۔ فرماتے ہیں عورتوں میں کوئی آج تک جو پیغمبر نہیں ہوئے اسکا یہ باعث ہے کہ پیغمبری کوئی نعمت تو ہے نہیں سراسر زحمت ہے اور اللہ میاں عورتوں پر خاص طور سے مہربان ہیں اس سبب سے اونکو اس زحمت سے محفوظ رکھا۔ افسوس اسکا ذکر انہوں نے کچھ نہ لکھا کہ مردوں سے اللہ میاں کیوں بیزار ہیں اور جو حضرات علیہم الصلوٰۃ والسلام اس زحمت کیواسطے منتخب کئے گئے اون سے اللہ میاں کو کس جنم کا بیر تھا۔

ایک دلیل اس سے بھی عمدہ یہ ہے کہ اللہ میاں ہی مرد پیغمبر صاحب بھی مرد اسپر اتنے حقوق عورتوں کے رکھے ہیں تو نہیں معلوم اصل میں کتنے ہوں گے اب اگر اسیطرح اخلاق ادب فلسفہ۔ سائنس وغیرہ کے ساتھ حقوق نسواں پر بحث ہوگی تو خدا حافظ ہے۔ مرد نکا ظلم وستم عورتوں کے ذہن نشین کرکے سوپچاس گھر وٹیں بدمزگی تو انہوں نے پیدا کردی آپ کچھ اور ترقی کریں گے۔ یہ حقوق کی پاسداری کیا ہوئی کمزور کو شے دے کر اور پٹوانا ٹھیرا۔ ان بیچاریوں کو رفیق بھی ملے تو ایسے بھلے مانس کہ ظاہر میں خیر خواہ اندر خانہ گھر کھوانے کے سامان۔ یہ جتنے رفیق نسواں شفیق نسواں حقوق نسواں آزادی نسواں۔ بربادی نسواں یہ نسواں وہ نسواں والے ہیں نسواں کا اطلاق دوسروں ہی کی مشورات پر کرتے ہیں اپنی گھر میں ایسے سبق نہیں پڑھاتے ایسے رسالوں اور کتابوں کی قدر اصل نونئی دلہنوں اور اونکی سہیلیوں میں ہوتی ہے اوس کے بعد اون ناعاقبت اندیش نوجوانوں جنکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اسی بیوی کے ساتھ عمر بسر کرنی ہے۔ کل کو یہی بیوی بچوں کی مانیگی۔ بچوں کی پرورش تعلیم و تربیت کا کفیل ہوگی انتظام اسکو کرنا پڑے گا۔ من تو شدم تو من شدی کا مضمون چند روزہ ہے۔ بڑے بڑے کام بڑے بڑے انتظام پیش آنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی عورتوں کے حقوق غیر متناہی سمجھنے سمجھانے کا موقع چند ہی روز۔ حاصل رہتا ہے۔ مزا جب آتا ہے کہ کسی دن شام کو تھکے ہارے گھر آئے بیوی گھر میں موجود نہیں ماما نے بتایا کہ اون کی سوتیلی بہن کی خیلا ساس کی بھتیجی بہو کی سہیلی باہر سے آئی ہیں وہاں گئی ہیں بچی کو بھی نہیں لے گئیں جنس کی کوٹھری کو قفل لگا ہوا ہے میں بھی ہاتھ پے ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں پھر رات گئے سواری اترنے والوں کی آواز

گان میں آئی تو جان میں جان آئی۔ ڈیوڑھی سے انگنائی میں قدم رکھتے ہی چولہے کو ٹھنڈا دیکھ کے ایک جھڑا کا ماما پر ہوا کہ آنکھوں کی اندھی صدیجا تیرے سامنے کنجنوں کا گچھا قفل میں لگا چھوڑ گئی ہوں۔ میاں اس احتیاط اور حسن انتظام کو دیکھ کے اور بھی کھسیانے ہوئے مگر چپ۔ بڑی دیر میں جب ذرا بیوی کا مزاج کچھ درست ہوا تو آپنے آہستہ سے پوچھا کہاں گئی تھیں تو مختصر تار کا سا جواب تعلیمیافتہ زبان میں ملا ایک "بہن کو دیکھنے" بڑی ہمت کر کے یہ بھی کہہ گذرے کہیں جایا کرو تو مجھ سے بھی پوچھ لیا کرو۔ پوچھنے کے لفظ پر حرارت پھر بڑھی اور برجستہ جواب دیا "کیوں۔ تم اپنے کسی دوست کے یہاں جاتے ہو تو مجھ سے پوچھ کے جاتے ہو؟۔ یہ بالکل مردوں کی بے انصافی ہے آپ جہاں چاہے خاک اڑاتے پھرتے ہیں بیویوں پر قیدیں لگاتے ہیں" میاں صاحب کسی زمانے میں حقوق نسواں خود ہی ذہن نشین کر چکے تھے اوسکو واپس کیونکر لیتے جز بز ہو کر رہ گئے۔ مگر تاکے +

ابتک حقوق نسواں کی جتنی بحثیں دیکھنے میں آئیں اونمیں اگر مردوں سے ارشاد ہے تو وہ بالکل رٹل اور عورتوں سے خطاب ہے تو وہ اسطرح کہ تم ایسی اور تم ویسی تمھارے پیٹ سے بڑے بڑے پیغمبر۔ ولی اللہ بادشاہ فلسفی۔ عالم فاضل پیدا ہوئے۔ تمھارے بغیر دنیا کی آبادی اللہ میاں سے بھی نہ ہو سکی مردوں کی عزت آبرو سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خدا کے نزدیک تمہارا درجہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ مردوں کا ظلم ہے کہ تمھاری قدر نہیں کرتے۔ سب یہی پڑھاتے ہیں اتنا کوئی غور نہیں کرتا کہ حق کسے کہتے ہیں کیونکر پیدا ہوتا ہے کس طرح ملتا ہے اور مل جائے تو کیونکر کام میں لانا چاہیئے کہ

ہمیشہ قایم رہے۔

سنیے حق دو قسم کا ہوتا ہے ایک فطری دوسرا اخلاقی۔ فطری حق وہ ہے جسپر بقائے وجود موقوف ہو جیسے ہر بچے کا حق ہے کہ اپنی ماکا دودھ پیئے اپنی پرورش اور حفاظت اوس سے کرائے۔ اخلاقی حق وہ ہے جس پر آسایش منحصر ہو جسکا خلاصہ ہے ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ فطری حق خدا کی طرف سے پیدا ہوتا ہے اخلاقی حق اپنی کوشش سے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماک دل میں اوسکی ماما خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہے نہ آیندہ کی اُمیدوں کو اوس میں دخل ہے نہ گذشتہ خدمات کا وہ نتیجہ ہے۔ بخلاف اس کے اخلاقی حق خاص اپنی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ع مرد آن گرفت جان برادر کہ کار کرد۔ یہ بات دوسری ہے کہ خداوند کریم نے اوس کا ایک معیار بتا دیا ہے اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ مرد اور عورت کے درمیاں کتنے حقوق فطری ہیں کتنے اخلاقی۔ فطری تو شاید ایک بھی نہیں اور کھینچ تان کے نکالے بھی جائیں تو وہ برابر سرابر ہوں گے اون کی نسبت کسیکو کچھ شکایت بھی نہیں جھگڑا ہے تو اخلاقی حقوق کے متعلق۔ اخلاقی حق بغیر خدمت کے پیدا نہیں ہو سکتا اور خدمت بغیر قابلیت کے ناممکن ہے کسی بہو کے کی وہ کیا خدمت کر سکتا ہے جسکے پاس پیسہ ہے نہ اناج۔ جو شخص آٹا گوندھنا تک نہ جانتا ہو وہ بیرچی گیری کی تنخواہ کیونکر پا سکتا ہے۔ جو صاحب یورپ کی شایستہ قوموں کے برابر یہاں کی مستورات کے حقوق قائم کرنا چاہتے ہیں پہلے وہ یہ تو غور فرمائیں کہ قابلیت میں بھی برابری ہے یا صرف حقوق کی ہی برابری مقصود ہے۔ اگر قابلیت میں کمی ہے (یقیناً ہے) تو پہلے اپنے دام کھرے

کرلیں اوس کے بعد پر کہنے والے کو دوش دیں۔

حقوق حاصل کر کے اون سے مستفید ہونے کی صلاحیت بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ بڑے شہروں میں ایک آدہ واقعہ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ماں باپ زر کثیر جمع کر کے چھوڑ گئے بیٹا نالائق ہوا یا قبل از شعور وہ دولت اوس کے ہاتھ آگئی یا رلوگ ایسوں کی تاک میں ہی رہتے ہیں۔ ایک ایک کر کے آنے شروع ہوئے۔ کوئی دوستی کا دعویٰ کرتا ہے کوئی عاشقی کا دم بھرتا ہے ایک آزادی کے معنی سمجھاتا ہے تو دوسرا دولت کا استعمال بتاتا ہے۔ ایک دنیا کی بے ثباتی پر بحث کرتا ہے تو دوسرا لطف زندگی کی حقیقت کی تشریح کرتا ہے۔ اسیطرح سب مل کے دیوانہ بنا لیتے ہیں چند روز خوب دن عید رات شب برات رہتی ہے اوس کے بعد ڈگریاں آنی شروع ہوتی ہیں آخر کار رہنے کا مکان بھی بک جاتا ہے منہ چھپانے کا کونا بھی نہیں رہتا اس سے تو ماں باپ کی قید میں اچھے تھے مدعیان حمایت نسواں میں سے بھی بہت سے ایسے ہی نظر آتے ہیں کہ اظہار قابلیت یا ذاتی نفع کی غرض سے اس قسم کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں لکھا کرتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ آج اگر وہ تمام حقوق جو مہذب و تعلیم یافتہ ملکوں میں حاصل ہیں ہندوستان کی عورتوں کو دیدیئے جائیں تو غدر ہو جائے۔ اس قید میں تو یہ حال ہے کہ جہاں چادر مل کے بیٹھتی ہیں سوائے بدی غیبت طعن و تشنیع فتنہ و فساد کے اور کوئی بات نہیں ہوتی ؎

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے۔

سب سے بڑی شکایت جو عورتوں کی طرف سے بیان کیجاتی ہے وہ یہ ہے

کہ بیچاریاں پنجرہ نہیں بند ہیں مرد مزے سے ہوا کھاتے پھرتے ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن پنجرہ نہیں پیدا ہوئیں۔ پنجرہ نہیں ملیں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک بھی اُڑ کر کبھی نہیں گئیں آج اگر کھڑکی کھول کے باہر نکال دو تو ایک ایک کر کے سب کو بلی لے جائے۔ چار قدم اسٹیشن پر پیدل چلنا پڑتا ہے تو سانس چڑھ جاتا ہے حال سے بے حال ہو جاتی ہیں بھلا یہہ ٹنڈی سڑک کے قابل ہیں؟۔ دس پانچ میل کے کبھی سیر کے نام سے کہیں جاتی ہیں تو وہاں کا سماں حشر کے میدان سے کیا کچھ کم ہوتا ہے۔ کسیکا بچہ پھول توڑنے پر مچل رہا ہے تو کوئی یونہیں بلک رہا ہے ایک کہیں بہی جاتی ہے تو دوسری کسیطرف اُڑی جاتی ہے۔ خدا خدا کر کے گھر پہونچیں تو کسی بچے کی جوتی ندارد کسیکی ٹوپی غائب گوجروں کے ڈر سے اپنا زیور بڑھا گئی تہیں ورنہ گہر آن کے اوسکی بہی ڈھونڈیا پڑتی۔ یہ حال اوس پہلی آزادی کا ہے جسکی خواہش اکثر رہتی ہے اور سال میں ایک آدہ دفعہ حاصل بہی ہو جاتی ہے بہتیرے حقوق تو ایسے ہیں کہ اون کے وہم و گمان میں بہی نہیں۔ وہ کانوں پر ہاتھہ رکہتی ہیں اور زبردستی اون کے حوالہ کیے جاتے ہیں وہ تو حقوق ایسے چاہتی ہیں جنمیں اون کی تفریح ذاتی متصور ہو اور ذمہ داری کچہہ نہ ہو مثلاً روپیہ تو صرف کر دیں گی مگر حساب لکہنے کا جھگڑا نہیں لگائیں گی بازار تو ہو آئینگی مگر سودا لانا مردونکا کام ہے۔

مختصر یہ کہ اسوقت باستثنائے اشاذ کالمعدوم عورتوں میں نہ اپنا حق قائم کرنے کی قابلیت ہے نہ اوس سے مستفید ہونے کی صلاحیت اور بغیر اس کے ادائے حقوق کی خواہش یا ارادہ کرنا بالکل بیجا بلکہ خطرناک ہے۔

ان امور پر غور کرنے کے بعد یہہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ہندوستان کی مستورات یورپ جیسے حقوق کی قابلیت رکھتی ہیں یا نہیں
(۲) قابلیت نہیں ہے تو اس نقص کے ذمہ دار مرد ہیں یا خود مستورات یا دونوں۔ اگر دونوں ہیں تو کتنا کتنا حصہ کس کس کا ہے۔
(۳) ناقابلیت کا نقص کیونکر رفع ہو سکتا ہے یعنی اپنی اپنی جگہ دونوں کو کیا کوشش کرنی چاہیئے +

میں سمجھتا ہوں ان ہی امور پر بحث کرنا تمدّن کا موضوع ہے اور دلائل عقلی و علمی و عام ہونگی نہ کہ خاص و مبنی بر اغراض ذاتی امید ہے کہ تمدن کے نامہ نگار صاحبان انمیں سے ہر ایک سوال کو ایک مستقل مضمون تصور کر کے بحث فرمائیں گے تاکہ خلط بحث نہو اور سوسائٹی کو واقعی نفع پہونچے۔ میں خود بھی بشرط فرصت کبھی کبھی کچھ عرض کرونگا۔

اشرف حسین

آخر نقاب اُلٹ گیا۔ یہ ایک انگریزی ناول کا ترجمہ ہے جسکو منشی محمد غلام حسن خانصاحب پشاوری آرمی کنٹریکٹر و سکرٹری انجمن حامی تعلیم نسواں ملتان نے نہایت محنت سے ترجمہ کیا ہے۔ منشی صاحب کو تعلیم نسواں سے بہت بڑی دلچسپی ہے اور ان چند حضرات میں سے ہیں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ قومی خدمات میں بسر کرتے ہیں اس کتاب کی تمام آمدنی منشی صاحب نے تعلیم نسواں کی ترقی کے واسطے وقف کر دی ہے اس لیے ہمیں امید ہے کہ صاحب موصوف کی یہ محنت وقعت سے دیکھی جائے گی اور حامیان تعلیم نسواں اسکی خریداری میں ایک پنتہ دو کاج کی مثل کو ملحوظ رکھیں گے۔ منشی صاحب موصوف۔ کیمبرج روڈ ملتان سے ملتی ہے۔

ادائے بے نیازی

مرے دل کو بھا گئی ہے یہ ادائے بے نیازی
کہ ہے بے نیاز ہو کر تمہیں پاس دلنوازی

یہ عدم کے جانو الے ہیں تمہارے ہی تو شائق
کوئی رہ گیا ہے پیچھے کوئی لیگیا ہے بازی

مجھے آرزوئے صلت تمہیں عاشقوں سے نفرت
مجھے دلدہی کی عادت تمہیں خوئے بے نیازی

مرا منہ ہے جو کہوں میں کہ نہیں خیال میرا
یہ نہیں تو کر رہے ہو مرے دل کی چارہ سازی

جو سحر پہ منحصر ہو رخ مہر وش کا جلوہ
تو نہ عاشقوں کو کھٹکے شب ہجر کی درازی

نہیں اعتنا جو میری تو نہو کہ تم ہو یکتا
جو میں سر کو تم پہ واروں تو ہے میری سرفرازی

مرا ہند گو وطن ہے، کوئی جستجو تو دیکھے
کہ چلا ہوں سوئے شیراز پئے دلبر حجازی

یہ مرے دل و جگر ہیں، جو تمہارے ہو گئے ہیں
مری جان سخت مشکل ہو گر نہ عشقبازی

جو ہو فرد حسن میں تم تو میں عاشقی میں کامل
تمہیں فن کرے بے نیازی مجھے فخر جانگدازی

یہ تھا راستاں ہے کہ ہے دیر بھی حرم بھی
یہیں جمع ہیں برہمن یہیں آئی ہیں نمازی

کسی سنگدل سے جلکر جو سہی ہیں گرم آہیں۔
تو کرے گی نرم محوی اوسے میری دلگدازی

محوی لکھنوی

تاریخ وفات حضرت تسلیم مرحوم مغفور

تسلیم کہ مقبول جناب حق تھے
پاس اپنے منگائی روح انکی حق نے

ہاتف نے خبر یہ دی مجھے اے ارشد
تسلیم کو جنت میں جگہ دی حق نے

۱۳۲۹ھ

ارشد تھانوی

شکست کی آواز

اگر یہ سچ ہے کہ انسان کے لیے بہترین مضمون مطالعہ خود انسان ہے تو کوئی ذی عقل حیوان بھی ایسا نہیں جو کسی پہلو سے بھی دلچسپ نہیں۔ بُری سی بُری صورت میں بھی کوئی خاص انداز کوئی انوکھی ادا۔ غرض کوئی نہ کوئی دلکش بات ضرور نکلتی ہے۔ اگر کسی کی صورت بُری ہے تو آواز اچھی۔ اگر دونوں بُری ہوں تو بشرہ اچھا۔ جو صورت سے ایک بالکل علیحدہ چیز ہے۔ کسی کا ظاہر خوب ہے کسی کا باطن خوب تر۔ صورت۔ سیرت کا ایک خاص معیار قرار دے کر ہر انسان کو اسی سے جانچنا سنیر منتھی کو سولہ گرہ کے گز سے ناپنا ہے۔ یہ طریق عمل تمدن کی تنظیم و استواری کے لیے لابدی ہو تو ہو لیکن قدرت کے تماشائی کے لیے ہرگز موزوں نہیں +

قدرت کے نقاد کے لیے صرف یہ ضروری ہے کہ ہر شے کو غائر نظر سے دیکھے۔ اور جو تاثرات یا محسوسات اُس شے کا نتیجہ ہوں۔ اُن کو بلا کم و کاست بیان کرے۔ اس خیال سے ایک شخص کے حالات بیان کرتے ہوئے صرف اسقدر لکھدینا کافی ہے کہ ہمارے آئینہ تاثرات پر اُسکا کیسا اثر پڑا۔ راقم الحروف کو اسوقت کسی خاص فرقہ کے حسن و قبح سے بحث نہیں صرف ایک دلچسپ شخصیت کا خاکہ کھینچنا مقصود ہے۔

ہم ایک ایسے پیشہ سے تعلق رکھتی تھی۔ جو دنیا کے قدیم ترین پیشوں میں سے ہے اور ہند میں مثل اور پیشوں کے موروثی ہوگیا ہے۔ مغرب میں لوگ اُس جماعت کو بُرے بُرے ناموں سے یاد کرتے ہیں لیکن

مشرق میں یہ جماعت تمدن کا جزو لاینفک ہوگئی ہے اور لوگ اسکی ہستی کو خاموشی کے ساتھ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انگریزی خوانوں کی ایک جماعت منجملہ اور تمدنی اصلاحوں کے اس فقرہ کی درستی کا بھی بیڑا اٹھاتی ہے۔ لیکن فی الحال ان کی کوششوں کا اسیقدر نتیجہ نکلا ہے کہ تعلیم یافتہ جماعت کی دلچسپی اس فرقہ کے ساتھ قدرے ترقی پاگئی ہے م۔ کا مسکن شمالی ہند کا ایک بارونق شہر ہے۔ جہاں راقم الحروف کا اکثر گذر ہوتا ہے ایک قیام کے دوران میں ہمارے ایک عنایت فرما جنکی م کے ہاں آمد و رفت تھی ہم کو بھی وہاں لے گئے۔ گانے کا ہنر بدرجہ کمال ہر اہل نظر کو کھینچ بلاتا ہے۔ ایک کوٹھے پر کہ جس کے نظر فریب برآمدہ کو سرکی کی نازک چکیں گستاخ نگاہوں سے محفوظ کر رہی تھیں۔ اور جسکا تنگ و تاریک زینہ اجنبی قدموں کے لیئے ضرور مخدوش تھا۔ ہماری ملاقات ہوئی۔ صورت میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ آنکھیں۔ دور بین آنکھیں جن کی شعاعیں قلب انسانی کی تہ تک پہونچتی تھیں۔ بے چین طبیعت اور نازک حس کی گواہی دیتی تھیں۔ رسمی گفتگو کے بعد گانے کی فرمایش ہوئی راگ کے اعتبار سے غزل پیش پا افتادہ گاتا ہے لیکن مضمون ہی تو آخر کوئی شے ہے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

استاد کے الفاظ۔ جنکی نشست گویا انگشتری میں نگینہ۔ درد بھری آواز جو چوٹ کھائے ہوئے دل کیلئے قدرتی نغمہ تھی۔ سامع پر کیونکر اثر نہ ہو۔ چوٹ کھایا ہوا دل" یہ الفاظ بے ساختہ قلم سے نکل گئے کسے خبر تھی کہ یہ

دریائے نغمہ بہت جلد موت کی سردی سے منجمد ہو جائے گا۔

میرے عنایت فرما جنکا مسلک اچھی صورت کی داد دینا۔ اور عالم گیر لگاوٹ بازی تہا۔ دبی زبان سے چاہنے کا لفظ زبان پر لائے۔ آہ! چاہنا آہ سرد لبوں پر تھی اور آنکھوں میں چشم آہوئے زخم خوردہ کی حسرت تہی۔ آہ! چاہنا ہاں صاحب زبان سے کہنا بہت آسان ہے۔ لیکن کر کے دکھانا بہت مشکل۔ جب کلیجہ کو پتھر بنائے تب کسیکو چاہے۔ کسے معلوم تہا کہ باغ ہستی کے اس نو دمیدہ پھول پر محبت کی اوس پڑ جائے گی۔

چند ہفتہ لب مشہور ہوا کہ م نے زہر کھالیا۔ ؎

بات پھوٹی ہے چمن میں مرے مرجھانے کی
اڑی پرزوں کی طرح پرزوں کے اڑوانے کی

وہ بدنصیب اس شرمناک نظام کا شکار ہوئی کہ جس نے اُسے پیدا کیا تھا۔ کیا اور عورتیں محبت کرنے کا حق رکھتی ہیں اور وہ اس پیدائشی حق سے محروم تھی کیا اور عورتوں کی گود تبسم طفلی کے پھولوں سے بہر سکتی ہے اور اسکا دامن مراد ازل سے خالی تہا۔ مانا کہ اس کا انتخاب بہت مبتذل تہا اور اسمیں سوائے ہنر کے اور کوئی خوبی وہبی یا اکتسابی نہ تھی۔ لیکن پسند کسی قوانین کی پابند نہیں بعض کا مقصود ادنیٰ ہے بعض کا اعلیٰ۔ دوسروں کو کیا حق تھا کہ اپنی خود غرضی سے اسکو ہم آغوش مدعا ہونے سے روکتے وہ تائبوں کے زمرہ میں آنا چاہتی تہی، لیکن اس کے عزیز سد راہ ہوئے وہ خدا کے گھر میں پناہ لینا چاہتی تہی لیکن انسان نے اسکا دروازہ بند کر دیا۔ اسکو معلوم ہوا کہ وہ اس جگنو کی مانند تہی جسکو ایک دور افتادہ دشت کے سیاح اپنی برچھی کی نوک پر پرو کر مشعل کا کام لیتے ہیں اسکو

بتایا گیا کہ تیرا کام صرف تمدن کی نجاست کو صاف کرنا ہے۔ پاک و صاف زندگی کی تمنا کرنا تجھے زیبا نہیں جب وہ غریب مفلس عورتوں کو جن کے پھٹے ہوئے کپڑے اُن کے بے ڈول اعضا کی عیب پوشی کرتے ہیں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتے دیکھتی ہوگی۔ تو اس کے دل پر کیا کچھ صدمہ نہ گذرتا ہوگا۔ جب وہ بچوں کو اپنی ماں کی کوکھ میں مچلتے دیکھتی تھی تو اس کے کلیجہ پر کیسا سانپ لوٹتا ہوگا۔ لیکن اُس سے ہمدردی کرنے والا کون تھا۔ عوام کی نگاہ میں تو وہ صرف بازار کی مٹھائی تھی جس کی چاشنی ہر شخص مول لے سکتا ہے کون جان سکتا تھا۔ کہ اس مٹھائی کی ترکیب میں کسقدر تلخی آمیز ہے۔ اسکی ظاہری وضع نزاکت و نفاست و تنعم سے مرکب تھی۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ نرم چہرہ حسرت سے پتھرائے ہوئے دل کی صرف بیرونی نقاب ہے جسنے جام محبت کی تلچھٹ کو پی لیا تھا۔ اُس کے لیے زہر کا پیالہ پی لینا کیا مشکل ہے۔ تو بھی تخیل اُس موت و زیست کی کشمکش کا تصور کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ جسنے آخری وقت اُس کے ہاتھوں کو ضرور مرتعش کر دیا ہوگا۔ آنکھوں کی اُس تڑپ کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جو ابدی تاریکی کا پردہ پڑنے سے پہلے اُنھوں نے روشنی کی آخری ماند پڑتی ہوئی شعاعوں کے لیے کی ہوگی۔

آخر اس مشت خاک کے سب ولولے سرد پڑ گئے۔ اور آتشین جذبات کی راکھ مٹی کے ساتھ مٹی ہو گئی۔ کاش کہ اس بے چین روح کو عدم کی وسعت میں وہ آرام ملا ہو جسکی وہ دنیا میں متلاشی تھی۔ دنیا کی مصنوعی تطہیم میں اسکو جائز خوشی سے بہرہ ور ہونیکا موقعہ نہیں ملا۔ کیا کائنات کے حقیقی نظام کے ترانہ میں یہ کھوٹا سُر بھی کچھ کار آمد ہوگا ؟ ۴

مرگ ہستی ایک ساز کی مانند ہے جسکے تار کو کوئی محتاط ہاتھوں نے توڑ دیا۔ اسکا نہ نالہ نہ تھا نہ نغمہ رباب صرف ایک دل کی شکست کی آواز تھا۔ "انجلز"

غزل

شمس العلما پروفیسر مرزا موسیٰ کوثر صاحب شیرازی

تغافل سقدر کیوں اور اتنا سرگراں کیوں ہو
خطا صادر ہوئی غیر و نے مجھ سے بدگماں کیوں ہو

محبت گر نہیں کچھ فرض ہے ہونا عداوت کا
نہیں تم دوست میرے مینے مانا خصم جاں کیوں ہو

مٹا دینا رقیبوں کے جگر سے داغ تک میرا
رہا جب میں اس محفل میں تو پھر سرگراں کیوں ہو

یہ کہنا پھر نصیب دشمناں کیا درد ہے دل میں
یہ حصہ دوستوں کا ہے نصیب دشمناں کیوں ہو

مجھے دینے کو رشک اب اٹھایا پاسباں در پر
جو میرا پاس ہو تو پاس دے کے پاسباں کیوں ہو

وہ میرے درد آہ سینہ سوزاں سے کہتے ہیں
جو سینے میں سلگتی آگ ہو اٹھتا دھواں کیوں ہو

تمہیں برتاؤ آتا ہی نہیں نازک مزاجوں سے
نہیں ہو جبہ یار مہرباں نامہرباں کیوں ہو

یہ روئے زرد میرا دیکھکر کہتے ہیں دشمن بھی
ابھی تو ہے بہار عمر ہمرنگ خزاں کیوں ہو

ابھی ابرو پہ بل ہیں تیر جنبش قہر باقی ہے
نہوں گر تیر ترکش میں کھنچی ایسی کماں کیوں ہو

نہیں ننگ و نشاں کا ذکر کیا زاہد کی محفل میں
نشان نام کا میرے یہاں نام و نشاں کیوں ہو

یہ بزم بادہ نوشاں ہے تو ہوگا دھول دھپا بھی
برا مانے نہ کوثر شیخ اس بزم میں پیر مغاں کیوں ہو

ظہور جلوۂ قدرت اوسے منظور تھا ورنہ
فلک کیوں ہو ملک کیوں ہو زمیں کیوں ہو زماں کیوں ہو

جہاں دیکھا نہیں سارے جہاں میں جز غم و کلفت
چلو کوثر اٹھو بے فائدہ بیٹھے یہاں کیوں ہو

"عالم خیال کا تیسرا رُخ"

اور

اُس پر ایک نظر

"عالمِ خیال" کی سُرخی سے اپنے رُخ کو بدلتی ہوئی دو نظمیں ہندوستان کے قادر الکلام سخنور منشی احمد علیخاں صاحب "شوق قدوائی" کے دماغ سحر آفرین سے نکلکر "الناظر" میں شائع ہوئی تھیں۔ اُن سے اُردو شاعری کی سرزمین پر نئے پھولوں کے چمن کھل چکے تھے۔ اب تیسرا رُخ رسالہ "تمدن" میں نکلا ہے جس نے نگاہوں کو دارفتہ اور دلوں کو گرویدہ کرلیا ہے،

اِن نظموں کا حسنِ بیان جس نے اپنی جدّت اور جذبات فطرت سے اداشمعوں کے دلوں پر قبضہ کرلیا ہے، طرز معاشرت کے فلسفہ اور اخلاق کی تھیوری کے ایسے دلفریب نقشے دکھا رہا ہے جس کے الفاظ اور جس کی ادائیں خود بول اوٹھیں۔ کہ بلاشبہ انسانی فطرت یوں ہی واقع ہوئی ہے۔ اور اپنے دلی جذبات کے ساتھ ایسے ہی خیالات کی مقتضی ہے اُردو در کنار فارسی کی زبان جو شاعری کے لیے بہت موزوں اور شیریں تسلیم کرلی گئی ہے۔ اوس میں بھی عورت اور مرد کے سچے جذبات کے ساتھ فطرت کے صحیح اور اکات اور انسانی دل و دماغ کے اصلی خیالات کی نظم کا وجود نہیں ہے۔ فطری نقاشی کا مذاق سخن سرایان فارس میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے۔ کہ برسات، بہار، خزاں، اور جنگل، وغیرہ پر

جتنی نظمیں شعرائے ایران کی ہیں۔ اون میں سوا لفاظیوں اور ادعائی بلند پروازیوں کے فطرت کی کارسازیوں اور قدرت کے خوبیوں کے نظارے کا ذکر کہیں خال خال ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ شاعر نے فطرت کو پیش نظر رکھکر نظم نہیں کہی بلکہ جہاں اور مختلف خیالات کے اشعار قلم سے نکلے وہاں دو ایک شعر ایسے بھی نکل گئے۔ جن میں فطرت کا رنگ اتفاقی آپڑا۔

اُردو شاعری نے ابتدا ہی سے فارسی شاعری کی تقلید کا جامہ پہن لیا۔ اسکا سبب یہ ہے۔ کہ اردو دا دنہیں لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جن کے دماغوں میں فارسی شاعری بھری ہوئی تھی سنسکرت۔ اور بھاشا اوس زمانے میں ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ اور اہل فارس کی کثرت آمد و رفت اور شعرا فارس کے ہجوم سے ہندوستان ملک ایران کا ایک حصّہ ہو رہا تھا۔ خود ہندوستان کے اصلی باشندے اپنی اپنی زبانوں کی شاعری چھوڑ کر فارسی کی جانب ٹوٹ پڑے تھے ایسی سوسائٹی کے اثر سے یہ بات لازمی تھی۔ کہ اُردو شاعری میں جو گرمی پیدا ہو وہ فارسی کے شعلوں سے پیدا ہوا در ایسا ہی ہوا۔

فارسی شاعری کے تخم سے اُردو شاعری پیدا ہوئی۔ تو سائنس کے قانون وراثت نے اپنا زور دکھایا۔ اور اُردو نے فارسی کی صورتیں لیکر بڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ فرع اپنی اصل سے بالکل مشابہ ہوگئی۔ سائنس کے قانون تبائن کا اثر صرف اسیقدر ہوا۔ کہ زبان میں ہندی کی آمیزش سے فارسی کے ساتھ اختلاف ہوگیا۔

بہرحال اُردو کی شاعری فارسی کی پیدا کی ہوئی اور پروردہ ہے۔ اسمیں فطری مذاق کہاں سے آتا۔ یہ بھی اپنے دامنوں کو سمیٹے ہوئے اُسی احاطے میں بیٹھ گئی۔ جو احاطہ اسکی مادر مہربان نے کھینچا تھا

ایک مدت تک غزل، واسوخت، مثنوی، اور قصائد، وغیرہ اسی قسم کی نظموں سے اُردو کی سخن سنجی کا خزانہ معمور ہوتا رہا۔ اور نثر میں فسانہ عجائب اور سروش سخن کی سی کتابوں نے بلند نامی کے جھنڈے اُڑائے۔ آخر سوسائٹی کے مذاق میں کچھ تغیر ہوا۔ اور زمانے میں حضرت آتش، حضرت غالب اور حضرت انیس، کے سے سخن سرا پیدا ہوئے۔ آتش نے غزل میں جذبات غالب نے جذبات نظم کے ساتھ نثر میں سلاست، اور انیس نے فطری نقاشی کی خوبیاں پیدا کیں۔ ان بزرگوں کے نام شاعری کی تاریخوں میں آبِ زر سے لکھے گئے۔ لیکن ان کے دماغوں۔ اور قلموں سے جو نظمیں نکلیں۔ وہ صرف ایک ہی صنف کو لیے ہوئے تھیں۔ مثلاً آتش اور غالب صرف تغزل کے عمدہ نواسنج اور اسی صنف میں جدت آفرینی کے ساتھ لطیف گو ہوئے اور انیس نے مرثیہ اور سلام کو اختیار کیا وہ صرف اسی صنف میں انتہائے کمال تک گئے اون کے کھینچے ہوئے فطری نقشے دلچسپ، دل کش، اور دلفریب ہیں لیکن وہ اونہیں حدود تک محدود ہیں۔ جو حدود مرثیہ اور اسلام کے لیئے قایم اور موزوں تھیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ جو تصویریں انیس مرحوم کے قلم سحر رقم نے دکھائی ہیں۔ وہ لاجواب ہیں۔ زبان اون کے قابو میں اور فصاحت اون کے قبضے میں تھی۔ مگر میرا مطلب یہ ہے۔ کہ فطرت کی عام جلوہ آرائیوں اور قدرت کی وسیع کارسازیوں کی جانب اون کو توجہ نہیں ہوئی توجہ نہ ہونے کے کچھ ہی اسباب ہوں مجھے اون سے بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بات کہنی ہے۔ کہ جو مذاق علمی اور عملی صورتوں کے ساتھ آج نظموں اور نثروں میں نظر آرہا ہے۔ یہ انگریزی علم ادب سے اُردو میں آیا۔ اور یہ مشرق کی سرزمین سخن میں مغرب کی تخم افشانیوں کے ثمرے ہیں۔

جدید مغربی مذاق کے پھیلتے ہی ہندوستان میں نیچرل شاعری کا وہ طوفان اوٹھا جسکی انتہا نہ رہی۔ دینلئے شاعری میں نوخیز اور نوآموز لڑکے (جن کی زبانیں اور جن کے قلم صحیح رفتار سے ناآشنا تھے) اپنے لڑکھڑاتے ہوئے۔ پاؤں اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے قدموں سے چل کھڑے ہوئے اس طوفان بے تمیزی نے سخن سنجی کے صاف راستوں کو برباد کردیا۔ اب تک ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ ناواقفانِ سخن اپنی نافہمی کے ساتھ سخن سرائی کے مدعی ہیں۔ نہ وہ شعر گربہ کو جانیں، نہ تنقید کو، نہ شایگاں کو، اور کسی نقص کو، اُن کے خیال خام میں سخن سنجی کے واسطے پختہ مغزی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ نافہمی کے ہجوم سے دماغ میں اس خیال کو لا ہی نہیں سکتے کہ دنیا کا کوئی علم اور کوئی فن اصول سے متجاوز ہوکے کامیابی کی منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔ ایسے لوگوں کی نظمیں سوا اس کے کہ ارباب فہم کے دماغوں کو پراگندہ اور نگاہوں کو پریشان کریں۔ کوئی دوسرا نفع نہیں پہونچا سکتیں۔ وہ قلمرو سخن میں ٹکسال باہر ہیں۔

یہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا۔ برپا ہے۔ اور غالباً ابھی برپا رہے گا لیکن اس افسوس کے ساتھ ہی کچھ اسباب اطمینان کے بھی مہیا ہوگئے ہیں یعنی اقلیم سخن نے حضرت سحر البیان "شوق قدوائی" کے سے قادر الکلام سخنور کو پیدا کردیا۔ جن کے پُرزور دماغ نے سائنس اور فلسفہ کے ہم مسائل کو فصیح اور سلیس اردو میں اصول نظم کرکے یہ بات ثابت کردی کہ اگر زبان دانی کیساتھ کلام پر قدرت کاملہ ہو۔ تو زبان اردو سخن پیرائی کی ہر صنف کو نہایت زور اور لطافت کے ساتھ اپنی گود میں جگہ دیسکتی ہے

علمی مسائل کے علاوہ حضرت شوق قدوائی نے جو سیریں دکھائی ہیں اور سبزہ زار قدرت کے جیسے چمن صفحوں پر کھلائے ہیں

انسان کے فطری جذبات، فطری خیالات، اور فطری اداؤں کی جیسی سچی اور خوشنما تصویریں کھینچی ہیں۔ اون کی مثال اگر آج ہندوستان کی زندہ شاعری میں تلاش کیجائے۔ تو سوا حضرت شوق قدوائی ہی کے نظموں کے اور نہیں مل سکتی۔ ایسی حالت میں مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ کہ حضرت شوق قدوائی ملک سخن میں فی زمانہ خود ہی اپنی مثال ہیں۔ اور یہ قول ہندوستان کے مشہور ایڈیٹر حضرت حکیم برہم کا جو اخبار مشرق کے مالک ہیں بہت صحیح ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی اور حضرت شوق قدوائی کی نظم و نثر کی داد روح القدس سے ملتی ہے۔

"عالم خیال" کے پہلے نمبر پر ہندوستان کے جلیل القدر فاضل مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا کا نہایت عمدہ ریویو "الناظر" میں نکل چکا ہے۔ جسکو دیکھکر میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "کہ حضرت بیرسٹر کے سخن فہمانہ خیالات، محققانہ اشارات، اور حکیمانہ نکات نے اس نظم کے فلسفہ کی نہایت ہی فصیح، بلیغ اور لطیف شرح کردی ہے۔ اگر حضرت بیرسٹر کے ادیب قلم سے ریویو کی روشنی نہ پھیلتی۔ تو نظم کی بلندی تک بعض کوتاہ بیں نظر پہونچ بھی نہ سکتی۔ اور سلسلۂ نظم کا قایم کرنا تو عموماً دشوار ہوتا۔

"عالم خیال" کے دوسرے رخ پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا کا ریویو الناظر میں نکلا۔ وسیع الخیال اور قابل بیرسٹر نے جن لطافتوں اور نزاکتوں کی شرح کی ہے ان کو دیکھ کے نظم اور ناظم دونوں کو لاجواب اور یکتا کہنے میں ذرا بھی تامل کی وجہ نہیں ہے۔

انگریزی تعلیم اور یورپ کے نظارے سے فطری مذاق پر جیسی وسعت

نگاہ کی ان دونوں فاضل اور محقق بیرسٹروں نے دکھائی ہے معمولی مذاق کے آدمیوں سے یہ ممکن نہیں۔ جیسا حق سخن حضرت مصنف نے ادا کیا ویسا ہی حق شرح دونوں جلیل الشان فاضل بیرسٹر صاحبان نے۔

علمی قلمرو کے دونوں رفیع القدر اہل قلم بالاتفاق اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ انسانی جذبات اور فطری خیالات کی ایسی مسلسل نظمیں انگریزی میں بھی نہیں ہیں اور ایسی دلفریب طرز کے موجد اردو میں حضرت شوق قدوائی ہی ہوئے۔ جن کے کمال سخن اور زور کلام نے علمی اور فطری نظموں سے ہندوستان کے سخن فہموں اور پاکیزہ خیالات رکھنے والے سخن سنجوں سے احسنت و آفرین کی آوازیں بلند کرا دیں۔

بقول نامور ادیب حضرت برہم کے اس زمانے میں یہ فخر ہمارے صوبہ جات متحدہ ہی کو حاصل ہے کہ اس میں "لسان العصر حضرت اکبر" اور "سحر البیان حضرت شوق قدوائی" دو یکتائے تاز سخن موجود ہیں۔

میں کہتا ہوں۔ خدا ان دونوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ انہیں دونوں سے اسوقت ہندوستان کی اردو شاعری اصول علمی اور لطافت زبان کے ساتھ اوج کمال پر پہونچی ہوئی اپنے خوشنما جلوے دکھا رہی ہے۔

"عالم خیال" کے دو رخ دو اعلیٰ درجے کے قابل بیرسٹروں نے لے لیے۔ اب میں بحیثیت ایک وکیل کے نمبر سوم کا مدعی ہوں یعنی میں نے عالم خیال کے تیسرے رخ پر ریویو کے لیئے قلم اٹھایا ہے۔

یہ نظم دوسرے رخ سے دست و بغل ہے۔ یعنی شوہر کی جانب سے اوس کی فرقت نصیب زوجہ کے خط کا جواب ہے۔ جسکا پہلا شعر یہ ہے

"تمھاری خط کو دیکھا نظر اوسی میں گھر گئی تمھاری شکل خط کے تا پتلیوں میں پھر گئی"

خط کو دیکھ کے جوش محبت سے نظر کا اوس میں گھر جانا اور اوس کے لکھنے والی کی شکل کا پتلیوں میں پھر جانا۔ نہ اس سے زیادہ فطری جذبے کا اظہار ہو سکتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ فصیح الفاظ میں خط اور پتلیاں ان دونوں کی محبتانہ کشش نظم سے پیدا ہو سکتی ہے۔ شاعر نے لطف بیان کا خاتمہ کر دیا اور حرفوں سے محبت کی مجسم شکل دکھا دی۔ اس خط کے الفاظ سے کیا حالت نظر آئی؟ اس حالت کا مصور یہ دوسرا شعر ہے۔

"ہے لفظ لفظ خط کا درد غم کی داستاں سے
قلم تمہارا دل بنا وہ بول اوٹھا زباں سے"

عورت کے درد فرقت کا اثر شوہر کے دل پر الفاظ سے پڑ گیا۔ وہ الفاظ کون ہیں؟ وہ ہیں! جن کو قلم نے عورت کا دل بنکر اپنی زبان سے ادا کیا ہے اس شعر کا دوسرا مصرع ترکیب کی خوبی اور زبان کی فصاحت کے ساتھ اس قدر بلاغت کو لیئے ہوئے ہے۔ اور اتنے وسیع مطالب کا گنجینہ ہے کہ اسکی پوری شرح کسی فرقت زدہ کا دل ہی کرے تو کرے قلم نہیں کر سکتا +

عورت کی درد انگیز حالت کو سمجھ بوجھ کے شوہر کس خوبی سے عورت کی دلجوئی کا پہلو لیے ہوئے اوس کے شکووں اور اوس کی بیچینیوں کو تسلیم کرتا ہے۔

"تمہارے سب گلے بجا۔ تڑپ بجا۔ الم بجا۔
تمہاری سب شکایتیں تمہاری ہی قسم بجا"

اس قسم سے عورت کے دل پر یقین کا اثر جس لطف سے ڈالا گیا ہے اسکو اہل فہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور محاورے کی نفاست نے زبان کا جو مزہ

پیدا کیا ہے۔ اسکو زباں دانوں کے دلوں سے پوچھیے۔

اظہارِ اضطراب کے بعد شوہر نے عورت کے اِس بیان کا (جو عورت کے لکھے ہوئے خط میں ہے) کہ وہ سٹرن کی طرح ٹہل ٹہل کے رات کاٹتی ہے۔ ذیل کے شعر سے جواب دیا ہے۔

"اُدھر ٹہل کے شب کٹے اِدھر تڑپ کے شب کٹے
یہ سوچ شام ہی سے ہو کہ دیکھیں رات کب کٹے"

دوسرا مصرعہ کتنا پاکیزہ خیال لیئے ہوئے ہے۔ اور کس لطف سے اوس فطری حالت کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو اضطراب کے وقت پیش آتی ہے۔ اور جس کی لازمی صورت یہ ہے کہ انسان شام ہی سے بیقرار ہو ہو کے صبح کے جلد نمودار ہونے کی تمنا کرے۔ یہ طے شدہ کلیہ ہے۔ کہ فرقت زدہ پر رات بھاری ہوتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ دن کو مختلف شکلوں کا انتظار و خیالات کو کچھ نہ کچھ اِدھر اُدھر بہلائے رہتا ہے۔ اور رات کو سب خیالات سمٹے ہوئے مصائب فرقت کے ہجوم میں گھر جاتے ہیں۔

اس شعر کے بعد چار اشعار اسبات کو ظاہر کرتے ہیں۔ کہ "کنھار اجیبن میں تھا اور میری خوشی تم تھیں۔ فراق سے۔ دونوں کی راتیں اضطراب ہوگئیں، اب نہ وہ ہنسی ہے۔ نہ وہ روح کی تازگی ہے البتہ یہ نقشہ ہے کہ

"شباب۔ رنگ۔ حُسن۔ انکی صورتیں بگڑ گئیں
گھروندیں لُوٹ پڑ گئی تو بستیاں اُجڑ گئیں"

یہ شعر اظہار حالت کے ساتھ زبان کی پاکیزگی۔ بیان کی فصاحت۔ اور مثال کی خوبی کو جس لطف سے دکھا رہا ہے یہ نفاستیں شاعر کی سحر البیانی کی نہایت پُر اثر تصویریں ہیں۔

فطرت انسانی کا یہ قاعدہ ہے۔ کہ کثرت رنج کے مصائب کو جھیلتے جھیلتے اُس کے خیالات حسرت کے ساتھ اسباب آسایش کے جویا ہوتے ہیں۔ اسباب آسایش کی جستجو کے پانچ مسلسل اشعار جو سحر البیان سحن سبز نے اس موقع پر کہے ہیں اور جن میں تخیل لطیف، کمال فن، فصاحت کلام، اور جدت معنی آفرینی کے ساتھ حسرت کا ایسا پُر درد نقشہ کھینچا ہے جس سے بہتر اور جس سے زیادہ پُر اثر اُردو کی نظموں میں آجتک میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ وہ اشعار یہ ہیں +

جہاں کوئی دوسرا جو غم سے پاک ہو کہیں — تو ہم تم اس جہان سے کل چلیں ہمیں وہیں
یہاں ہزار آفتیں۔ انہیں میں دل گھبرا گیا — یہاں ہزار گردشیں انھیں میں سر پھرا گیا
وہ ملک چل کے ڈھونڈھ لیں جہاں نہ آسمان ہو — جہاں نہ اسکے ظلم سے مصیبتوں میں جان ہو
جہاں نہ ہو اجل کہ "اس" کو "اوس" کا داغ دے سکے — جہاں زمین ہی نہ ہو کہ گور منہ میں لے سکے
جہاں نہ کوئی فکر ہو نہ بھوک ہو نہ پیاس ہو — جہاں نہ میں اودھ میں ہوں جہاں نہ تم اودھ ہو"

یہ قدرت کلام اور ایسے دل کو ہلا دینے والے پر تاثیر مضامین جو سلاست بیان کے ساتھ انسان کے خیال کو مسخر کر کے اپنی جانب کھینچ لیں۔ فی زمانا حضرت شوق قدوائی ہی کے قبضے کی چیز ہیں ہیں

حورت نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ بے ساختہ میرے آنسو ٹپک پڑے اور خط کے حرف بگڑ گئے۔ میں مجبور ہوں مشوہر کس لطیف شعر سے جواب دیتا ہے

"تمھارے آنسوؤں کے داغ خط میں جس جگہ پڑے
وہ خط سی میرے دل میں آکے داغ بنکے رہ پڑے"

میں کہتا ہوں کہ اس سے بہتر شعر اس موقع کے لیے ہو ہی نہیں سکتا دیکھئے کیسے سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ لیکن اپنی فصاحت اور ترکیبوں کی لطافت سے

شعر سہل ممتنع کی تعریف میں داخل ہوگیا۔ خوبی بالائے خوبی یہ کہ چند مختلف مطالب کو صرف ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ اگر زبان اور کلام پر قدرت کاملہ نہ ہوتی۔ تو یہ مطالب بجائے ایک شعر کے چند اشعار میں ادا ہو سکتے

عورت نے مصائب سے تنگ ہو کے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اب میں زندگی سے درگذری۔ موت کی تمنا کروں گی

یہ فطرت انسانی کا عام اور خیالات نسوانی کا خاص شیوہ ہے کہ رنج و غم کی کثرت اور مصائب کے ہجوم سے مجبور ہو کے حیات مصائب انگیز سے بیزاری، اور مرگ کو قطع مصائب کا ذریعہ قرار دے کے اوسکی تمنا ظاہر کی جاتی ہے۔

مرد نے کس لطیف اور فصیح پیرایہ میں دعائے درازی عمر کے ساتھ عورت کو جواب دیا ہے۔

"تمھاری عمر ہو دراز اجل کا نام چھوڑ دو
لحد کے منہ میں خاک۔ منہ سے یہ کلام چھوڑ دو"

لحد کے منہ میں خاک" اس پر لطف محاورے نے جو نفاست اس شعر میں پیدا کی ہے۔ قابل لحاظ ہے۔

عورت نے خط میں یہ بھی لکھا تھا۔ کہ تم میری لحد پر آ کے سبزے کو دیکھنا وہ نرم اور ہرا رہے۔ سوکھ کے خار اور مجھپر بار نہ ہو جائے۔

وفادار مرد نے کس مزے کا جواب دے کے اوس کے خیال کو کدھر سے کدھر پھیرا ہے۔

"ہو لحد کے سبزے کی بھر سے نہ پھر دماغ میں
ہے سبزہ نرم اور ہرا تمھارے خانہ باغ میں"

یہ خانہ باغ کی جانب انتقال ذہنی شاعر کی کمال معنی آفرینی کی صاف شہادت ہے معمولی شاعر کا دماغ ایسے مقامات تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔ اس لطیف تخیل کے علاوہ یہ شعر اول سے آخر تک دلچسپ محاورات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

عورت چونکہ شکستہ دل ہے۔ اب مرد کو اس امر کے یقین دلانے کی ضرورت ہوئی۔ کہ وہ اوسے بھولا نہیں ہے۔ اور اوسکی محبت کو دل و دماغ میں جگہ دیے ہوئے ہے۔ ان مطالب کو وہ جن فصیح اور دل آویز الفاظ میں جن الفت خیز خیالات کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ یہ خوبیاں حضرت شوق قدوائی ہی کی سخن سنجی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ دوسرے کو حاصل نہیں

"نہ تم ہو بھولنے کی شے نہ تم ہو چھوٹنے کی شے
قسم خدا کی تم ہو دل میں اور دل بغل میں ہے
نظر میں کھب کے۔ نور بن کے۔ تم مری نظر میں ہو
جمال بن کے دل میں ہو۔ خیال بنکے سر میں ہو"

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بلاغت معنوی سے لاجواب ہے۔ اور دوسرے شعر میں جتنے ٹکڑے ہیں سب جواہر کے ٹکڑے ہیں۔

شاعر نے عورت کی محبت کو اپنے جذب قلبی کے ساتھ ظاہر کر کے اوسکی تازہ رکھنے کی جو تصویریں کھینچی ہیں۔ یہ اردو کی شاعری میں حضرت قدوائی کی سحر البیانی کے سوا اور کسی کے قلم سے کھنچتی ہوئی نظر نہیں آئیں گویا فطرت کے مجسم نقشے نہایت خوشنما اور دلفریب لباس میں پیش نظر ہیں،

وہ یاد دلانے والے نقشے حسب ذیل ہیں۔ مگر صرف یاد کے متعلق بہت سے اشعار ہیں۔ میں چند اشعار تحریر کرتا ہوں۔ جسے وہ سب اشعار لطیف دیکھنے

وہ مئی کے تمدن میں دیکھے۔

"تمھاری مسکراہٹوں کو یاد کر رہا ہوں میں
کھلیں نہ دانت۔ اس ادا پہ صاد کر رہا ہوں میں"

یہ ادائے خاص اور پھر لطف قافیہ دونوں قابل صاد ہیں۔

"وہ بال کھول کر کبھی جھٹک کے سر کو تھامنا
لچک پڑے بدن تو پھر لپک کے در کو تھامنا"

عورتوں کی عادت ہے۔ کہ وہ سر کے بالوں کو کھول کے اون کے بیچ کھولنے کو ہاتھوں سے جھٹک دیتی ہیں۔ اس ادا کے ساتھ عورت کی فطری نزاکت کو کس لطف سے دکھایا ہے۔ یعنے جھٹکے سے سر کو صدمہ پہونچا۔ تو سر کو تھام لیا اور جھٹکے کی حرکت سے (نازک) بدن لچکا۔ تو لپک کے در کو تھام لیا۔

اس فصاحت، اس لطافت، اور ایسی فطری حالتوں کو اس نزاکت اور اس قدر پاکیزہ ترکیب کے ساتھ ایک سیدھے سادے الفاظ کے شعر میں بیان کر دینا یہ حضرت شوق قدوائی کی سحر البیانی اور انتہائی قدرت کلام کی واضح دلیل ہے گویا زبان پر ایسا مستحکم قبضہ ہے۔ کہ جس ادا پر خیال کیا اوسکی پوری شبیہ نظم سے پیش کر دی

"گلوریوں کی صورتیں وہ خوشنمائی نئی۔
سپید پان اوپر اور اندر اوس کے پستی"

یہ لکھنؤ کی گلوریاں ہیں پستی پان لکھنؤ میں وہ کہے جاتے ہیں۔ جو نہ بہت ہرے ہوں نہ بہت سپید۔ خوش مزہ ہونے کے سبب سے عمامہ میں اُنہیں کا رواج ہے۔ مگر گلوریوں کی خوبصورتی کے لیے ایک پان بہت سپید اوپر رہتا ہے شاعر نے کس فصاحت سے اِن گلوریوں کی اصل حالت دکھائی ہے۔

"وہ ہار مجھکو یاد ہے کہا تھا دیکھکر جسے
ہیں موگرے کے پھول کم نہیں نیتی میں اسے
کرخت۔ بو ہے۔ سر میں درد ہوگا۔ وہ ڈالو
نہیں تو کامنی کے پھول چن کے تم نکال دو"

کیا اس سے زیادہ زبانکی فصاحت اور ترکیب سخن کی لطافت کے ساتھ نازک دماغ عورت کی فطری حالت کا اظہار ہوا حضرت شوق قدوائی کے اور کوئی شاعر نظم سے کرسکتا ہے؟ اسوقت تو ہندوستان میں اور کوئی نظر نہیں آتا آیندہ کا حال خدا جانے! موگرے کے پھولوں کی خوشبو ہلکی ہوتی ہے اور کامنی کے پھولوں کی بو کرخت۔ عورت کی فطری نزاکت کے ساتھ ان پھولوں کی فطری حالت بھی دکھادی۔ دوسرے شعر کے ٹکڑے ایسے نرالے ہیں۔ جو سخن کو عرش معلّٰی پر لے گئے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ

"زری کریب سے وہ چڑھ کہ چبھتی ہے یہ فارسی
پسند صرف ململ اور گلبدن بنارسی"

ہار سے دماغ کی نزاکت کا اظہار تھا۔ اور زری کریب سے جسم کی نزاکت کا اس شعر کے مصرعہ دوم کا قافیہ کیا لطف دے رہا ہے۔

اب چوڑیوں سے ہاتھوں کی نزاکت دکھائی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ ذیل کے دونوں اشعار موتیوں کی دو لڑیاں ہیں۔

"وہ چوڑیوں کا پھیرنا کہا تھا دیکھکر جنھیں
بجھینگے ان کے گوکھرو نہ پہنونگی کبھی انہیں
کہو بدل کے لائیں ایسی چوڑیاں بڑی میاں
کہ تین تین بانکیں۔ چار چار ہوں کریلیاں"

لکھنؤ میں گوکھرو کی چوڑیاں بہت خوشنما اور قیمتی بنتی ہیں۔ لیکن اون کے گوکھرو ٹوٹ ٹوٹ کے ہاتھوں میں چبھتے ہیں۔ اسی سبب سے نازک مزاج عورتیں

نہیں پہنتیں +

پہلے شعر سے اون چوڑیوں کی حالت دکھائی گئی ہے۔ اور دوسرے شعر سے سادگی کی ادا ظاہر کی گئی ہے یعنی صرف بانکین اور کریلیاں ہوں جو اپنی سادگی سے نزاکت کے لیے موزوں ہیں۔

"بڑے میاں" کے الفاظ جو لطف دے رہے ہیں زبان داں ہی اسکو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک عورت کی زبان سے یہ الفاظ کس قدر زیبا ہیں اور معمولی بول چال کا بے تکلفانہ مذاق کس خوبی سے ظاہر کر رہے ہیں قلم سے اسکی تعریف کہاں تک کی جائے۔ نگاہیں دیکھیں اور دل لطف اٹھائیں۔

بانکیں وہ چوڑیاں ہیں جن میں لہر ہوتی ہے۔ اور کریلیاں وہ ہیں جن میں لہر نہیں ہوتی بیچ میں بانکیں اور ادھر اودھر کریلیاں پہنی جاتی ہیں۔ تین تین اور چار چار کی تکرار سے دونوں ہاتھوں کی چوڑیوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ چونکہ عورتیں ہمیشہ طاق کا شمار چوڑیوں میں رکھتی ہیں۔ اسوجہ سے سات سات چوڑیاں دونوں ہاتھوں کے لیئے چاہی گئی ہیں۔ الہدی قوت بیانیہ! زباں دانانِ ذی فہم اس لطیف بیان کا اندازہ فرمائیں۔ کہ نظم کیا ہے گویا نثر میں بات چیت ہو رہی ہے۔

اب شوہر ایک اور دلچسپ واقع کو یاد کرتا ہے۔

گزرا مرد ایک شب جو ٹوٹ کر بلاق سے
تم اوسکو ڈھونڈھنے لگیں چراغ لیکر طاق سے

یہ تخیل جمع بدل کے ایک واقعہ کی جانب پھری ہے کمال شاعری پر دال ہے واقع کی تصویر کیسی عمدہ اور کس لطیف اصلیت کے ساتھ کھینچی گئی ہے طاق کا قافیہ کتنا نفیس اور چراغ کی ضرورت سے کیسا لپٹا ہوا ہے۔ یہ سخن سنجیاں! الاجواب

ہیں لاجواب۔ اور یہ فطری ادائیں بے مثل ہیں بے شل۔ زبان ہے کہ چلتا جادو
اب شوہر شائستگی کے ساتھ عورت کی طنزیہ نوک جھونک کا جواب دے کے
قسموں کے ساتھ اپنی محبت اور وفا کا اوسکو یقین دلاتا ہے۔
قسمیہ اشعار بہت ہیں۔ اور نہایت لطیف لطیف ہیں۔ مگر میں بخوف طوالت
چند اشعار لکھ کے ارباب فہم کے فصاحت پیرا خیالوں اور بلاغت سنج دماغوں
کے سامنے پیش کرتا ہوں +

"قسم تمھاری پتلیوں کی جن کی ہر نظر بلا — قسم تمھارے ابروؤں کی جن کے بس میں کربلا
قسم تمھارے دل کی جسمیں بارہا پھر اسوں میں — قسم تمھارے وسوسوں کی جن میں اب گھر اسوں میں
قسم تمھارے اس سخن کی طنز جس کا کام ہے — قسم تمھاری اس چھری کی ناز جس کا نام ہے
قسم تمھاری اوس ہنسی کی جس سے گل کھلا کرے — قسم تمھاری اس زباں کی مجھ سے جو گلا کرے
قسم شکن کی جب جبیں پہ ناز اوسکو ڈال دے — قسم صد کی بات کو جب اُنہ کہہ کے ٹال دے
قسم ہے بے رخی کی جسکو پھر کے رخ عیاں کرے — قسم ہے خامشی کی جب نگاہ کچھ بیاں کرے

ایسی نازک خیالیوں کی دلفریب نظمیں، اُردو میں اب تک تو نظر نہیں آتی تھیں
ہاں! اب حضرت شوق قدوائی کی طبّاعیوں اور جدّت آفرینیوں نے قوت بیانیہ کے
اعجاز سے شاعری کے جسم مردہ میں نئی جان ڈالی ہے۔ اور یہ بات ثابت کردی ہے
کہ اگر زبان اُردو میں کمال اور قوت مقال حاصل ہے۔ تو مشکل سے مشکل مضامین
اور نازک سے نازک خیالات کو فصاحت کے ساتھ نظم کردینے کے لیے الفاظ
اُردو میں کافی وسعت موجود ہے۔

"ریویو" طویل ہوگیا۔ اگرچہ نظم کی وسیع خوبیوں کے سامنے ابھی مختصر
ہی ہے، خیر، اب میں درمیانی اشعار کو چھوڑ کے اصل نظم سے متعلق آخر
کا ایک لاجواب اور لاثانی شعر لکھ کے اس ریویو کو ختم کرتا ہوں۔

عورت نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ کہ گھر میں انار کا پیڑ ہے اوسپر ہر روز پپیہے آتے ہیں۔ وہ مجھ ترس کھا کے اور مجھے شرم سے چپ پا کے تم کو (یعنی شوہر کو) پکارتے ہیں (یہ مطلب پی کہاں، کی آواز سے ہے) شوہر نے جواب میں لکھا

"پپیہے خوش رہیں کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں
جواب کہیں وہ پی کہاں" تو تم کہو کہ آتے ہیں"

شوہر کی آمد آمد سے عورت کو تسکین دینے والا شعر اور پپیہوں کے استفسار کا جواب کیا اس سے زیادہ لطیف، فصیح، دلچسپ، اور پُر اثر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! مصرع ثانی کا آخری ٹکڑا اس قدر لطیف ہے جس نے شعر کو اوجِ کمال پر پہونچایا ہے۔

اب میں ریویو کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ حضرت منشی احمد علی صاحب "شوق" قدوائی کی عمر میں برکت دے۔ اور ہمیشہ نظرِ بد سے اون کو محفوظ رکھے۔ اون کی بدولت سرزمین سخن پر ایسے گراں بہا موتی بکھر رہے ہیں جن کو اربابِ فہم سلیم و اصحابِ مذاقِ لطیف کی نگاہیں شوق سے چن رہی ہیں چونکہ وہ دونوں نظمیں جو النّاظر میں چھپی ہیں، اور یہ نظم جو تمدن میں چھپی ہے۔ سب عورتوں سے متعلق ہیں، لہٰذا قادر الکلام مصنف اون میں اضافت کہیں نہیں لائے ہیں، اِس لیے کہ عورتوں کی زبان میں اضافت نہیں ہوتی نہ وہ اضافت بولتی ہیں نہ اضافت پر اون کی زبانیں مشاق ہوتی ہیں کہ وہ اوسے بے تکلف پڑھیں۔ فقط

سیّد مقصود علی۔ اسیونی۔ وکیل
از گوہر گنج

کرنا اور نہ کرنا

جو کرنے کے ہیں کام اونکو نہ کرنا
نہ کرنے کے جو کام ہیں اونکو کرنا

جو تقلید کرنا" تو یورپ کی کرنا جو تجدید کرنا" تو مذہب کی کرنا
جو تذلیل کرنا" تو ملت کی کرنا اگر فکر کرنا تو شہرت کی کرنا

کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

تمسخر ہر اک دیں پناہی سے" کرنا رعونت بھی کچھ قبلہ گاہی سے" کرنا
عداوت جو کرنا" تو بھائی سے" کرنا برائی جو کرنا" تو مائی سے" کرنا

کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

امانت میں جبتک خیانت" نہ کرنا کبھی اسکو واپس امانت" نہ کرنا
کبھی راستی اپنی عادت" نہ کرنا بھلائی کی ہرگز حمایت" نہ کرنا

کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

جو وعدہ کیا ہے تو ایفا" نہ کرنا بھلائی کا بھولے سے ایما" نہ کرنا
کسیکا کبھی عیب اخفا" نہ کرنا کبھی راستی کا ارادہ" نہ کرنا

کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

شریفوں کا اعزاز ہرگز" نہ کرنا غریبوں پہ اکرام ہرگز" نہ کرنا
کمینوں کی تحقیر ہرگز" نہ کرنا ذلیلوں کی تذلیل ہرگز" نہ کرنا

کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

جو تائید کرنا تو فیشن کی" کرنا اگر فکر کرنا" پوزیشن کی کرنا

زبانی حمایت بھی "فیشن" کی کرنا تدابیر کچھ "ایجیٹیشن" کی کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

نہ کالج کے چندے میں "انکار" کرنا نہ یونی ورسٹی میں "انکار" کرنا
گر عذر دینے میں ہر بار "کرنا" جو مانگے اُسے خوب ہی "خوار" کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

نہ بھولے سے بھی امتحاں "پاس" کرنا ہے بیہودہ کالج کی بکواس کرنا
فراغت کا آخر یہ "کیوں" "ناس" کرنا ضروری ہے راحت کا احساس کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

پس انداز کوڑی کفن کو "نہ" کرنا کبھی یاد اہل وطن کو "نہ" کرنا
کبھی یاد پہلے چلن کو "نہ" کرنا کبھی یاد ماں اور بہن کو "نہ" کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

پڑوسی ہو دکھیا تو پروا "نہ" کرنا ہو بھائی پہ فاقا تو پروا "نہ" کرنا
جو ہو باپ بھوکا تو پروا "نہ" کرنا چچا گر ہو ننگا تو پروا "نہ" کرنا
غرض کام کی بات کوئی نہ کرنا

ہمیں یاد ہے اب نہ جینا نہ مرنا

سید شوق تھانوی

ایک مصری خاتون کی تصویر جو زیب ورق اول ہے موجودہ مصری تمدن کا پتہ دے رہی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ہندوستان کیطرح مصری خواتین قدرت کے انعام سے محروم نہیں ہیں فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد انکو اتنا وقت ملجاتا ہے کہ وہ زندگی جیسی نعمت کی جائز قدر کر سکیں گھر والی بیگم بیچ میں ہے سہیلیاں ساتھ ہیں اور موسیقی سے اپنا دل بہلا رہی ہے۔

ضمیرہ

گذشتہ سے پیوستہ

یہ تھا وہ دردانگیز نظارہ جس نے ضمیرہ کی جان پر بنا دی۔ ماکی موت باپ کی سنگدلی۔ عزیز اقارب کی لاپروائی غرض تصویر زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جہاں امید کی جھلک دکھائی دے رہی ہو۔ ماں مری تو اچھا کیا اور باپ فرنٹ ہوا تو تعجب کیوں۔ رفتار دنیا شب و روز یہ گل کھلا رہی ہے اور ہم سے پوچھو تو جو کچھ ہوا نہایت درست اور بالکل بجا ہوتا ہے اکثر ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ ہاں اتفاق تھا تو اور خوبی تقدیر تھی تو مرے پہ سو درے وہ واقعات تھے جنھوں نے ضمیرہ کو دیس سے پردیس پونہچا دیا۔

بھائی کی بدھیاں دیکھ دل بھر آیا بلک بلک کر چیخی اور بھینچ بھینچکر لپٹی یہ وقت بھی ختم ہوا اور یہ بات بھی گئی گذری ہوئی ضمیرہ پڑا سوتا رہا اور ضمیرہ اپنی تقدیر پر آنسو بہاتی رہی۔ گذشتہ واقعات تو جو تھے وہ تھے ہی رونا یہ تھا کہ آیندہ زندگی میں بھی خوشی قریب قریب مفقود تھی۔ غیروں کا تو ذکر کیا حقیقی عزیز جان کے دشمن ہو گئے جس باپ نے مقتول مرادوں سے پالا جو کلیجہ کا ٹکڑا اور آنکھوں کی ٹھنڈک کہتا تھا ماکی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا الگ تھلگ ہوا کہ "اِن مِلوں تیل ہی نہ تھا گویا"۔

بہت بجا تھا اسکا رونا اور نہایت درست اسکا پیچ و تاب ناداں کی قدر و منزلت تو یہ کچھ کہ چھوٹے سے بڑے اور مرد سے عورت تک گھر بھر نے

آنکھیں بچھائیں اور جوان ہوئی تو یہ تیر پڑے کہ جس باپ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اس ہی نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینکدیا۔

وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھی کہ ضمیر کسمسایا۔ آنکھ کھولی اور بہن سے کہا میری جیب میں بھائی احسن کا ایک پرچہ ہے آپا وہ لیلو"

احسن کا نام سنتے ہی ضمیرہ اب اس دنیا میں تھی جسمیں سچی محبت کے پھول مہک رہے تھے خلوص کے ٹھنڈے چشمے جاری تھے صداقت کی نہریں بہہ رہی تھیں اور بادِ صبا شادمانی و کامرانی کے پیغام دے رہی تھی؛ اب احسن کی تصویر اس کے سامنے تھی جسنے برسوں کی باتیں مکتب کے دن اور بچپنے کی راتیں یاد دلادیں۔ ناتجربہ کار دل ان ٹھوکروں سے واقف نتھا جو اس منزل میں قدم قدم پر کھانی پڑتی ہیں۔

اِس کے احسانات اور ان حسرت آمیز نظروں کا خیال جو شام کے جھٹپٹے وقت میں اسوقت جب ضمیرہ باپ کے حکم سے گاؤں بھیجی گئی ہے ایک تیر تھا جو ضمیرہ کے کلیجہ پر لگا اور پانی ہوکر آنکھ سے نکل پڑا۔ اُٹھی بھائی کی جیب میں سے پرچہ نکالا۔ لکھا تھا۔

مبارک تھا وہ وقت اور اچھے تھے وہ دن جب آنکھوں کا نور سچ مچ کی حور سوہنی مورت اچھی صورت سیرت کی اچھی بات کی سچی بچپن کی رفیق شفیقوں کی شفیق احسن کی محرم ضمیرہ جیسی بیگم آنکھ کے سامنے تھی۔ آج وہ باتیں کہانیاں اور وہ دن خواب و خیال ہوگئے سچی جان کی صورت مرکر (میرے منہ میں خاک) چچازاد بہن کی صورت جیتے جی ایسی چھپی کہ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈھ رہی ہیں مگر بیکار۔ راتیں اس اُمید پر صبح اور دن اس آس پر شام کئے مگر حسرت نصیب دل کی پژمردہ کلی

آجتک نہ کھلی محض اتنے سے قصور پر کہ ہم قبرستان کیوں گئے چچا جان نے خون کے آنسو رلوا دیئے وہ مرنے والی بی بی جس کا دردِ فراق ہمکو کھینچکر لے گیا آج کو زندہ ہوتی تو چچا جان کی اتنی مجال نہ تھی کہ اتنا بڑا ظلم کرتے ضمیرہ بیگم تمہیں نہیں معلوم کہ بدنصیب حسن پر کیا گذر رہی ہے زندگی وبال زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک ایک سال عزیز دشمن اور جان اجیرن دنیا آفت اور جینا مصیبت ہوگیا کس کا سبق اور کیسی تعلیم ۔ کتاب محبت ہر وقت آنکھ کے سامنے ہے جسکا ہر ورق ضمیرہ کی تصویر سے مزین ہے راتیں آنکھوں میں کٹیں اور دن جنگلوں میں گذریں بادِ صبا فراٹے بھرے چشمے مچل مچل کر بہیں اور اترا اترا کر چلیں مگر حسن کے کان ضمیرہ کی آواز سے آشنا نہ ہوں ! کیوں پردہ نشین ضمیرہ کیا اس آسمان سے زیادہ ظالم بھی کوئی شے دنیا میں ہوگی جو ہندوستان کی سرزمین پر چھایا ہوا ہے اور جسنے سچی محبت کو دقیانوسی نگاہوں سے دیکھکر دو دل توڑ دیئے ۔

عزیز اور عزیزوں کی عزیز ضمیرہ حسن کتنی ہی دور کیسا ہی مجبور اور کسی حد تک معذور کیوں نہو اسکی دلی دعائیں ضمیرہ کے ساتھ ہیں ۔

اچھا ! خدا حافظ

لڑکی اور لڑکی بھی ناتجربہ کار ناتجربہ کار بھی ضمیرہ جیسی جس نے محض باپ کے حکم کی تعمیل میں کامل چار سال ایک ایسے گاؤں میں بسر کر دیئے جہاں پانوں تلے کی چیونٹی بھی دشمن تھی حسن کا یہ پرچہ دیکھکر تھرا اٹھی کہ اسکا دل یقین دلا رہا تھا کہ یہ تحریر حسن کی حالت زار کی سچی تصویر ہے [illegible] شرم و حیا اور عصمت و عفت نے جو رنگ بنگلا ہوں کا زرد کر رہے ضمیرہ کو پریشان کر دیا ۔ جواب لکھ کر رکھ لینے پر چپ پڑ رہنے ہی چین نہ کر دیا ۔ اور ہم کر بیٹھے انجمنی

(۵)

آسمان کھل کھل کر گھرا، ابر جھوم جھوم کر برسے گھٹائیں آئیں اور گئیں کلیں اور برسیں، بجلی کوندی، بادل گرجے، منہ بند کلیاں پھول ہو ہو کر مرجھائیں، تاری چمکے اور دکے پھول مہکے اور لہکے، خزاں آناً فاناً بہار، اور لہلہاتے سبزہ زار دیکھتے ہی دیکھتے اوجاڑ ہو گئے مگر نہ بدلی حالت تو اختر بدنصیب کی، جسکو دن مصیبت اور رات پہاڑ تھی، دیوانوں کی طرح پھرنا سودائیوں کی طرح رہنا، ہر چند کوشش کرتا کہ کسیطرح چھٹکارا ہو مگر ضمیرہ کا خیال ایسا ہاتھ دھو کے پیچھے پڑا کہ مردوں کی سی صورت بنادی، کھانے کا ہوش اُسے نہ تھا۔ پہننے کی سدھ اُسے نہ تھی، لوگوں کے کہنے سننے سے برائے نام دسترخوان پر بیٹھتا۔ نوالہ منہ میں لیا اور دو ذرا سے نے چٹکیاں لینی شروع کیں ✣

ایک رات چودھویں رات کا چاند نیلگوں آسمان پر اٹھکھیلیاں کر رہا تھا اور بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آگے پیچھے بساط فلک پر دوڑ رہے تھے رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور اختر اپنے خیالات میں منہمک، خاموش پڑا اپنی اوس وقت پر غور کر رہا تھا جب ضمیرہ اور وہ شام کے وقت پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھکر کھیلا کرتے تھے لڑائیاں ہوتی تھیں مار کٹائی ہوتی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد یہ کدورت میل ملاپ سے بدل جاتی تھی دفعتہً اسکو اس واقعہ کا خیال آیا جب وہ ضمیرہ کے لیے گڑیا کا گھر بنا رہا تھا اور بنی کے خراب ہو جانے سے ضمیرہ بگڑ گئی کچھ دیر تک دونوں میں بات چیت موقوف رہی مگر تھوڑی دیر بعد ضمیرہ کو خود ہی کہنا پڑا اچھا تو دوسرا ٹکڑا چپکا دو ✣

یہ یاد ایک نشتر تھا جو اختر کے کلیجہ میں چبھ گیا وہ بیتابانہ آسمان کیطرف دیکھکر چیخ اوٹھا "اے کمبخت آسمان کب کا بدلہ لیا"۔ (باقی) راشد الخیری

غزل

تصنیف جناب نواب حافظ سید محمد زکریا خانصاحب مرحوم رضوی دہلوی المتخلص بہ ذکی

بسیرہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خانصاحب بہادر معظم جنگ المتخلص بہ سرور۔

دکھاؤں سوزش وحشت کی کیفیت زمانے کو
چمن سے دشت کو جاؤں جلا کر آشیانے کو

کہاں سے آئے دل اس نازنیں کے اٹھانیکو
کہ وہ بیوجہ روٹھیں جمع ہوں دشمن منانے کو

یہیں ملجاؤں گا میں خاک میں نقش قدم ہوکر
نہ چھوڑا ہی نہ چھوڑونگا تمہارے آستانے کو

نہوگی اس سے زلف خم بخم کی اسقدر تزئین
دل صد چاک پر ترجیح کیوں دیتے ہو شانے کو

جگر سے لیکے طفل اشک نے دل تک کیا خالی
ملا یا خاک میں اس بے سروپا نے گھرانے کو

وہ صورت خوش گلو اور یہ صدائے جانگزا دلکی
ملاتے ہو مرے نالے سے بلبل کے ترانے کو

دل مضطر کو تسکین و نگاہ قہر کر لینا
لگانا تیر بھی قائم تو ہونے دو نشانے کو

یہ ارباب طلب کیا بیخبر ہیں ذوق وحشت سے
معاذاللہ بیگانہ سمجھتے ہیں یگانے کو

رہینگی یہ چمن آرائیاں جلوہ نما برسوں
بہار یکخزاں سمجھو مرے رنگیں فسانے کو

نہیں تسبیح نام یار سہل اے زاہد نادان
کہ سو سو عقدہ دل پیش ہیں ایک دانے کو

فراغ دل نشاط عمر ہم جنسوں کی صحبت ہے
جنوں نیں بزم شادی جانتا ہوں قید خانے کو

جہاں کو گلشن تازہ بنایا میرے جلوہ نے
تری خو نے بدل جانیکی رنگت دی زمانے کو

ادا کوئی شوخ جب دل چین کر آزردہ کرتی ہے
نگاہ صلح جو اٹھتی ہے عاشق کے منانے کو

یہ ہوگا وسعت بیداد خزاں سے پائمال آخر
عبث گل کیوں لیے پھرتا ہی سر پر آشیانے کو

دنور کاوش غم کیلئے آنکھیں بھی لازم ہیں
بنائے ہیں یہ دو نو چشمے خون دل بہانے کو

خجالت سے ذکی ہو سرنگوں تا بازوئے رحمت
مکافات عمل سے باز رکھے تازمانے کو

"تعلیم و قومیت"

ہندوستان میں آجکل ہر فرد بشر کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہے کہ قومی ترقی کے لیے تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے اور مسلمانوں میں خصوصاً اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان جو اپنے دیگر ہم وطنوں سے بلحاظ تعلیم کے پیچھے ہیں اُنکو ابھار کر ہم پلہ کیا جائے لیکن پیشتر اسکے کہ ہم مسلمانوں کو تعلیم کیطرف رجوع کریں ہمکو تعلیم کے معنی معلوم کرنے لازمی ہیں اور ساتھ ہی ہمکو یہ بھی فیصلہ کرنا ہے کہ اُنکو کس قسم کی تعلیم دینی چاہیئے تاکہ وہ مقاصد جن کے لیئے تعلیم محض ایک وسیلہ ہے خاطر خواہ حاصل ہوں۔ مجھکو اس مضمون میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے صنعت و حرفت کی تعلیم سے بحث کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ اس تعلیم سے مدعا ہے جو اہل اسلام میں قومیت کی روح پھونکے۔ فی زمانہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص تعلیم یافتہ ہے تو عموماً اُس سے یہ مُراد لی جاتی ہے کہ وہ انگریزی پڑھا ہوا ہے چنانچہ موجودہ تعلیم کے معنی ہی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ وہ سکولوں یا کالجوں کی تعلیم ہے اور ایک حد تک موجودہ تعلیم اور انگریزی تعلیم مترادف ہیں۔ یہ بات عمومی طور پر یہی بتلا دینا ضروری ہے کہ اس جدید طریقہ تعلیم کی شروعات ہندوستان میں کیونکر ہوئی ۱۸۱۷ء میں بمقام کلکتہ راجہ رام موہن رائے اور سر ای ہائیڈ ایسٹ کی کوششوں سے ہندو کالج قائم ہوا۔ یہ ہندوستان میں پہلا مدرسہ تھا جس میں فرنگی علوم مثل طبعیات اصول ادب وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی اسکی بعد ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل کے حکم سے ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے مقاصد یہ تھے "وقتاً فوقتاً گورنمنٹ کو ایسی تجویزیں بتائے جس سے ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت میں ترقی ہو اور ایسے علوم مفیدہ کی اشاعت کے لیئے جس میں فرنگی علوم و فنون شامل ہیں مشورہ دے۔ نیز اہل ہند کی

اخلاقی تعلیم کے طریقے وضع کرے۔" دس سال تک اس کمیٹی کی توجہ کلکتہ کے عربی اور بنارس کے سنسکرت کولج کی ترقی کیطرف مبذول رہی اور علاوہ ان دو مدرسوں کے ۱۸۲۴ء میں کلکتہ میں اس کے زیر نگرانی ایک سنسکرت کولج کھولا گیا اور ایک سال کولج مذکور کی افتتاح کے بعد دہلی میں ایک کولج قایم ہوا جسمیں عربی فارسی۔ اور سنسکرت پڑھائی جاتی تھی مگر ۱۸۳۴ء میں اس کمیٹی کے ممبروں میں ایک ایسا اختلاف رائے پیدا ہوا جس کی وجہ سے کمیٹی کو اپنا کام بند کرنا پڑا اس سے ممبران دونوں فریقوں میں منقسم ہو گئے ایک مستشرقین کہلاتا ہے اور دوسرا مجددین۔ گروہ اول کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو فقط عربی فارسی۔ اور سنسکرت کی تعلیم دیجائے اور طریقہ تعلیم جیسا کہ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے اسی اصول پر قایم رہے نیز ان زبانوں میں جو مفید کتابیں ہیں ان کے طبع کرانے میں گورنمنٹ فراخ حوصلگی سے روپیہ خرچ کرے۔ برخلاف اس کے فریق ثانی اس بات پر زور دیتا تھا کہ ہندوستان کے مدارس میں انگریزی اور ہندوستانی زبانیں معہ دیگر علوم مفیدہ کے پڑھائی جائیں اور پرانے طریقہ تعلیم کی بجائے انگریزی طریقہ پر سلسلہ تعلیم جاری ہو۔ مزید براں عربی اور سنسکرت کے طالب علموں کی مطلق ضرورت نہیں۔

چونکہ ان دونوں فریقوں کے ممبروں کی تعداد برابر تھی اس لیئے جب گورنمنٹ نے کمیٹی سے درخواست کی کہ آگرہ کولج کے لیے ایک نصاب تعلیم تیار کرے تو کمیٹی نصاب پر باہم متفق نہو سکی۔ اس کے تھوڑے دن بعد میکولے ہندوستان آنے پر اس کمیٹی کا صدر بنایا گیا اور اس نے دوسری فروری ۱۸۳۵ء کو اس کمیٹی کی کارروائی پر ایک نہایت بسیط مضمون لکھکر بحیثیت لیجسلیٹو ممبر ہونے کے لارڈ بنٹنگ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کیا اور

لارڈ منٹنگ نے اُس مضمون کی عالم فہم صداقت سے مؤثر ہوکر انگریزی زبان کے حق میں فیصلہ کردیا چنانچہ اُس وقت سے اب تک سرکار انگریزی کی تعلیمی مصلحت انہی اصول کی پابندی ہے جو لارڈ میکولے نے اپنے فاضلانہ مضمون میں بتفصیل بیان کیئے ہیں۔ اس پچھتر برس کے عرصے میں اس طریقۂ تعلیم نے جو ترقی کی اور جو اسکا اثر اہل ہند کی اخلاقی حالت پر ہوا وہ ظاہر ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے ایسے بُرے نتائج بھی نکلے ہیں کہ وہ تعلیم کے نام پر دھبا لگاتے ہیں مگر ساتھ ہی ہم کو وہ فوائد فراموش کرنے نہ چاہئیں جو اسکا خاطر خواہ نتیجہ ہیں ہر ایک مسئلہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل کے نوجوان کالجوں اور سکولوں سے نکلکر صرف اس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ انکو کوئی سرکاری نوکری ملجائے تو ہمکو افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ انکی تعلیم کا نقص ہے کیونکہ دس پانچ سال انگریزی وضع کے مدرسوں میں صنائع کرکے وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے آبائی پیشہ میں مہارت پیدا کریں اور وہاں کی تعلیم اگر اون کو کسی قابل بناتی ہے تو وہ یہی کہ کسی دفتر میں ملازم ہوں یا کسی مدرسے میں پڑھانے کی نوکری کریں۔ لیکن جب اِس تعلیم کے دوسرے پہلو پر نظر کرتے ہیں تو یہی صاف پایا جاتا ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اُس طالب علم سے جو اپنی عمر کا بہت سا حصہ پُرانے طرز کے مطابق عربی و فارسی سیکھنے میں گزارتا ہے بدرجہا بہتر ہے کیونکہ اُس میں کم از کم موجودہ زمانے کی رفتار سے واقفیت پیدا پیدا کرنے کی قابلیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور اپنی قوم کی طرف سے اگر بہت نہیں تو تھوڑا سہی مگر یہ خیال تو پیدا ہو جاتا ہے کہ اسکی حالت زبوں ہے اور اس لیے وہ ترقی کے ذرائع سوچنے میں تھوڑا بہت وقت ضرور دیتا ہے برخلاف اس کے ایک پُرانی لکیر کا فقیر جہاں تک دیکھا گیا ہے اپنے سرور علم میں کچھ ایسا سرشار ہوتا ہے کہ دنیا ہیچ نظر آتی ہے

اور اسکو ہر ایک نئی بات بدعت معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ قوم کے ذرا لائق ترقی سوچنے تو کجا موقع بہ موقع علوم موجودہ کی جہالت کی وجہ سے راہ سلامتی میں مشکلیں کھڑی کر دیتا ہے۔ اس لیئے ہمکو قومی بہتری کے لیے اگر قدیم طریقہ ناموزوں معلوم ہوتا ہے تو جدید طرز تعلیم میں بھی بہت سے ایسے نقص دکھائی دیتے ہیں جو قوم کے حق میں نہایت ضرر رساں ہیں۔ یہ واضح ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے نہ یہ مراد ہے کہ ہم انگریزی سیکھنے پڑھنے میں انگریزوں کی برابری کرنے لگیں اور نہ اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم عربی و فارسی میں دیوان متنبی یا مقامات ظہوری کے فاضل ہوں۔ قومی تعلیم کے میرے خیال میں یہ معنی ہیں کہ خواہ ہم کو انگریزی یا عربی آتی ہو یا نہیں مگر ہم میں اتنی قابلیت ضرور ہو کہ اپنی مادری زبان اچھی طرح لکھ پڑھ سکیں اور ہمارے میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ اپنی قوم کے برے بھلے کو دیکھ سکیں اور اپنے پیشے کے متعلق ضروری واقفیت رکھتے ہوں۔ قوم کو بحیثیت قوم کے اس عام تعلیم کی ضرورت ہے یہ اور بات ہے کہ قوم کے بہت سے آدمی ایم۔اے۔بی۔اے۔ ہوں یا مولوی فاضل اور عالم ہوں مگر قوم کے ہر فرد کو جس تعلیم کی ضرورت ہے وہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی خواہ وہ لازمی طریقہ سے انکو دیجائے اور خواہ کسی اور طرح پر۔ انگریزی تعلیمیافتہ اشخاص کا یہ ایک فقط اخلاقی نہیں بلکہ قومی فرض ہے کہ وہ انگریزی زبان سے مفید مفید کتابیں اپنی مادری زبان میں یعنی ہندوستانی میں ترجمہ کریں تاکہ آیندہ نسلوں کو ایک غیر زبان سیکھنے میں جو محنت اور اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے اسکی کفایت ہو۔ اور وہ وہی محنت اور وقت کسی اور مفید مطلب کام میں دے سکیں اگر ایک موجودہ انگریزی کالج کے

نصاب میں سے انگریزی زبان کو مضامین لازمی میں سے نکال کر عربی و فارسی کا درجہ دے دیا جائے اور دیگر مضامین مثلاً علوم طبیعات۔ ریاضی فلسفہ وغیرہ اردو میں سکھائے جائیں، تو ایک معمولی درجہ کے طالب علم کو بی۔ اے کی لیاقت حاصل کرنے کے لیے اس سے ایک چوتھائی مدت صرف کرنی ہوگی جو اس وقت اس کو دینی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ لوگ جن کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہو تاکہ قوم کو فائدہ پہونچا سکیں ان کو اس زبان کے حصول کے لیے زیادہ آسانی ہو جائے گی۔

"رؤف" (از لندن)

اطلاع

سوا "تمدن" کے میں اور کسی نئے رسالے کی جانب متوجہ ہو کر اپنے خیال کو تقسیم نہیں کر سکتا، اور سوا "تمدن" کے سر دست میں اپنے دماغ پر کسی رسالے کا حق نہیں تسلیم کرتا ہوں،

میرے مضامین نظم یا نثر میں جو کچھ تھے، سب میں "تمدن" کو دے چکا اس سبب سے کسی دوسرے رسالے کی خدمت ان دنوں مجھ سے ممکن نہیں ہے، مجھے امید ہے کہ بغیر میری اجازت کے کوئی صاحب مجھے اپنا نیا رسالہ نہ بھیجیں ورنہ میں اون کے نقصان کا ذمہ وار نہ ہونگا،

معافی کا طالب

احمد علی، شوق، قدوائی

از مقام بھوپال

راحت زمانی

مولوی سیّد احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سود مند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کیگئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے۔ قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت لکھنؤ نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸/

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصے سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالرشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کیواسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایکروپیہ (عہ)

ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸/) منیجر عصمت و تمدن

عصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ کوارپتے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُنکو شامل ہونا ہے اُس کے لیے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت اُنکو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے تحاشہ خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں۔ اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جنسے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کیسا کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ۴۰ میں ۴۰ صفحہ کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں۔ سالانہ قیمت (۲) روپے

منیجر عصمت و تمدن۔ دہلی

جلد ۲ جولائی سنہ ۱۹۱۱ء نمبر ۱

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر = شیخ محمد اکرام۔ محمد عبدالرشد الخیری

فہرست مضامین

تصویر۔ دربار اکبر شاہ ثانی۔	
تمدن اسلام۔ مولوی جواد علی خانصاحب عانی ندوی۔	۱
زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ سید سجاد حیدر صاحب بی اے (قسطنطنیہ)	۷
محمڈن یونیورسٹی۔ مولوی احمد علیصاحب شوق۔ قدوائی لکھنوی	۱۱
عورت کی خلقت بھی دلیل واضح ہے وحدانیۃ خالق کی۔ مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی	۱۹
حقوق نسواں۔ محمد عبدالرشد الخیری	۲۵
نخ مند۔ مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی	۳۰
ن کا خط بھائی کے نام۔ پروفیسر مشتاق حسین صاحب زاہدی بی اے	۳۳
ت اسلام۔ مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی	۳۷
مسٹر ابلیس۔ سلطان حیدر صاحب جوش ملیح	۳۹
انقلاب تمدن۔ محمد عبدالرشد الخیری۔	۴۶
نوحہ۔ مولوی سیف الدین صاحب شباب	۵۱
غزل۔ حضرت آزاد سہارنپوری۔	//
تعلیم و تربیت۔ مولوی سید شاہد حسین صاحب۔	۵۳
شکوہ۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی	۶۰
ضمیمہ۔ محمد عبدالرشد الخیری۔	۶۵
فاعتبروا یا اولی الابصار۔ حضرت راز ہوشیارپوری	۷۱
قدرت کی دو بولتی ہوئی تصویریں۔ مولوی رشید احمد صاحب تھانوی۔	۷۲

باہتمام محمد عبدالرشد الخیری

قیمت بیاگانہ قسم اول (۴ر) قسم دوم (۳ر) تمدن پریس ۱۳۲۹ھ دہلی میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ (۰۴ر)

کتبہ احقر ابوظفر حامد میرزا دہلوی

تمدّن

یہ ۷۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہوکر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک وقوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں۔

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پونہچانا ہے۔

تمدّن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالٹکس سے علیحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہوسکتا کہ **تمدن** اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدّن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں +

تمدّن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دوم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اوّل ۱؎ قسم دوم (عہ) نمونہ کا پرچہ (۲؎)

ولی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تمدن کی اشاعت میں حصّہ لیا:۔

مولوی ابو النعیم سید تصدیق احمد صاحب۔ شاہ گنج۔ مولوی نور احمد صاحب شاہ گنج۔ مولوی لطیف الدین صاحب بمبئی۔ مولوی محمد اسد مرزا دہلوی۔ شاہ گنج۔ مولوی سید ابو العاص صاحب بانکی پور۔ مولوی جواد علی خانصاحب عالی دکن۔ مولوی ابو حامد سیّد محمد مہدوی صاحب دکن۔ منشی لیاقت علی صاحب کمالپور۔ منشی سید حامد حسین صاحب مظفر نگر۔ منشی مختار احمد صاحب مظفر نگر۔ سید شوکت صاحب دہلوی۔ نواب نظری بیگم صاحب کلکتہ۔ منشی محمد حسین خانصاحب متر انوالی۔

تمدن

دہلی

تمدنِ اسلام

نمبر (۳)

مغل اون خوش نصیب قوموں مین جنھیں افعال شنیعہ اور خفیف الحرکتی میں صدیاں گذریں تھیں۔ مگر زمانہ نے اون کا راز طشت از بام نہیں کیا۔ ایک مغلوں کی قوم بھی ہے۔ جو سائبیریا کے جنوبی میدانوں میں اپنی وحشیانہ کارگذاریوں کا جال پھیلائے خونخوار اور لاگو درندوں کی طرح بے حساب انسانی زندگیوں کا خون کر رہے تھے۔ اور ہر ایک بدنامی یا داروگیر سے بری الذمہ تھے۔ کیونکہ اُن کے افعال سے نہ کوئی شخص بجز اُن بیگانہ اتفاقوں کے واقف تھا جو کبھی کبھار اُن بیڑ راستوں سے ہو گذرتے تھے جہاں ان کا عمل دخل تھا۔ اور نہ وہاں کوئی زبردست قوت اُن پر حاوی تھی اُن کے کرتوتوں کی اُنہیں سزا دیتی۔

غرضکہ نہایت اطمینان اور زمانہ کی آنکھوں سے بالکل اوٹ ہو کر وہ اپنے رنگ میں

اپنی زندگی کو نہایت خوشگوار طریقوں سے بسر کر رہے تھے کہ اونکی آنکھوں نے ایک عجیب و دلکش نظارہ کا مشاہدہ کیا۔ جس کے مشاہدہ میں اُنہوں نے اپنی طرز زندگی سے زیادہ مسرت بخش خوشی کا احساس کیا۔

یہ نظارہ مسلمانوں کے فتح و اقبال کا تھا جو جزیرۂ عرب سے داب کشورکشائی کے ساتھ نکلے تھے اور جو سرزمین ترکستان میں اپنی فاتحانہ عظمت کا نشان گاڑ چکے تھے +

چونکہ مسلمانوں کو ہر کمال اور ہر وصف میں اونہوں نے یکتائے روزگار پایا۔ اس لیے مسلمانوں کی ہر ادا اُن کے دل میں گھر کرتی اور اونکی نگاہوں پر چڑھتی جاتی تھی۔ کسب اور فنون میں اون کا انہماک۔ ذوق کمال اون کی جفاکشی۔ اون کا اقبال اون کی دولت۔ جاہ و مکنت۔ اثر اور طاقت اور باہمی الفت و محبت۔ غرضکہ اُن کی ہر ہر بات میں متجسس نظروں نے شان دلکشی پائی جس کی اون کے ستم پیشہ دل و دماغ پر قبضہ و فتح حاصل ہوتی جاتی تھی۔ جسکا اثر یہ ہوا۔ کہ اُنہوں نے مسلمانوں کی ادائیں سیکھیں۔ اون کے نقش قدم پر چلے اور بالآخر اس تقلید اور تتبع کا پھل اونہیں یہ ملا کہ اُن مغلوں کی جو ایک گمنام اور بادیہ نشین قوم تھی دنیا میں سلطنت قایم ہوئی۔ جس کے بعد کئی صدیوں تک اون کا دور حکومت رہا۔ اور جس کے زیر سایہ اکثر زبردست اور عظیم الشان سلطنتیں مثل اقطائی۔ طلوئی۔ جوجی۔ چغتائی۔ تھیں۔ اس کے علاوہ زنگاری سائبیریا۔ اور ترکستان میں متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بھی اونکی قایم ہوئیں +

جب فتح و اقبال کا سہرہ زمانہ نے اُن کے سر باندھا۔ تو اونکو یہ بھی

حوصلہ دیا کہ جن اقالیم پر اہل عرب سکہ زن ہیں وہاں مغلوں کا سکہ رواں ہو چنانچہ یاوری اقبال سے اونہوں نے یہ ارادہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس منصوبہ کو یوں پورا کر دکھایا کہ نسل تاتار کے مشہور و معروف سردار چنگیز خاں کے سرگروہی میں مسلمانوں پر فوجکشی کی جس سے سلطنت اسلام کا ایک حصہ ان کے قبضہ میں آگیا۔

اسلام کی اس خصوصیت نے جسکا منشا یہ ہے کہ جو قومیں علم و تہذیب کے اثر سے ہمیشہ بے بہرہ رہیں۔ اسلام نے جاتے ہی اون کے تمام حالات میں انقلاب برپا کر دکھایا۔ یہاں بھی جلوہ افگن ہوئی۔ جسوقت تک مغل اسلام نہ لائے تھے تہذیب و روشنی کا چلن۔ انمیں نہ تھا لیکن جب وہ اسلام کے بابرکت حلقہ میں آنے لگے۔ تو تہذیب اور علم کی روشنی وہی اون میں آنے لگی جو اسلام کا خاصہ ہے۔

اس روشنی کے زمانہ میں بڑے بڑے علما رحکما، مدبر۔ پالیٹیشن۔ انمیں پیدا ہوئے شاندار مساجد۔ مدارس۔ اجرام فلکی کا راز بتانے والی رصدگاہیں۔ انہوں نے بنوائیں۔ شہر بسائے جنمیں فلک نما قصور۔ باغ بہشت کے نمونے پر طیار کرائے۔ اور جملہ سامان ترقی مہیا کیے +

غرضکہ اعلی تمدن کے زمانہ میں جو جو ترقیاں ملک میں ہوتی ہیں اون سے انکا عہد آراستہ و پیراستہ ہوا جس کی یاد دلانے کے لیے گلزار تاریخ کے سجے سجائے تختہ ہائے گل موجود ہیں۔ اور سیر کے لیے محض مطالعہ کی عینک درکار ہے۔

بربری | شمالی افریقہ کے بادیہ نشین یا بدو۔ جو بربر کہلاتے ہیں جبتک اسلام نہیں لائے تھے وثن پرست وحشی۔ اور اہل بادیہ تھے انسانی

گروہ کے میل ملاپ اور آباد مقامات سے دور دور بھاگتے تھے۔ اہل یونان روما کو اون کی سفاکی اور بیدردی کی بدولت بڑے بڑے مصائب اور نقصانات برداشت کرنے پڑے مگر اون کا انسداد امکان سے باہر ہی رہا۔

عربوں سے بھی اُن کی فتوحات کے زمانہ میں اون کی جرأت جانبازی نے یہ تسلیم کرالیا تھا۔ کہ ان کا زیر کرنا کوئی منہ کا نوالا نہیں۔ اور پھر عرب ہی ایسے تھے جنھوں نے اُن کی مشکیں باندھ کر اُن کی رگین ڈھیلی کیں۔ لیکن جب وہ اسلام لائے۔ تو اون کی وہ قوتیں جو امن عامہ میں خلل انداز اور فسادات کی جڑ تھیں جن سے زیان مال کا خطرہ تو ایک طرف خود انسانی زندگی معرض خطر میں تھی۔ انہیں فسادات کی رُوک تھام میں صرف ہوئیں۔ قبل از اسلام اگر ان کی جلادت سے بیگناہوں کا قتل ہوتا تھا۔ اور اُن کا مال غارت، تو بعد اسلام لانے کے امن کے پھیلانے اور ان مظالم کے فرو کرنے کا کام انہیں سے لیا گیا پہلے اُن کی وہ قوتیں جو رہزنی اور قطاع الطریقی کے رکیک افعال میں صرف ہوتی تھیں وہ بعد اسلام لانے کے شرعی اور سیاسی جنگوں میں صرف ہونے لگیں جن کے حاکم دآمر عقل وعدالت تھی۔

چنانچہ یوں تمام فتوحات اور خصوصاً مغربی بلاد وامصار کی فتح وتسخیر میں انکی شرکت ایک زبردست کمان کے ہم پلہ رہی +

دول فاطمیہ مروینہ اور ادریسیہ کی بقا، اور استقلال کو اُن کی قوتوں نے بہت کچھ اہمیت دی۔ ملثمین۔ مرابطین اور موحدین وغیرہ حکومتوں کے بانی بھی یہی ہیں +

طارق ابن زیاد انہیں کی شجاعت واصالت پر بھروسہ کرتا ہوا فتح

اُندلس کو روانہ ہو فسنون سپہگری کے سوا تمدّن اور شایستگی کے مدارج میں بھی اس قوم نے درجہ حاصل کیا ہے۔

قوم زنگی گو آج زمانہ کی رفتار ایسے انکشافات کی اٹھکیلیوں سے بھری ہے جس نے اُن مسائل کی پردہ دری اور تکذیب میں جو سلف سے بطور مسلمات چلے آتے تھے۔ کوئی دقیقہ اوٹھا نہیں رکھا۔ مگر یہ مسئلہ جسطرح سلف کے مسلمات سے تھا۔ ویسا ہی آج بھی قابلِ تسلیم ہے کہ قوم زنگی دنیا کی تمام قوموں میں مدارج انسانیت کے لحاظ سے پست، اور اخلاقی اعتبار سے بدترین نسل آدم ہے باوجود نفوسِ انسانی میں اُن کا شمار ہونے کے بھیڑ اور بکری کی طرح اُنکی خرید و فروخت کی گئی۔ مگر وہ اپنی فطری اور جبلی ذلت کی وجہ سے ہمیشہ قانع اور راضی برضا، ثابت ہوئے اون کی اس فطرت پر زمانہ کی ترقی کا کوئی رنگ نہ آیا نہ گیا۔

اس قوم کا اصلی مولد و مسکن تو شمال افریقہ ہے مگر افریقہ کے شرقی اور غربی مقامات میں بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب عساکر عرب ربع مسکون کو کھنگال رہے تھے تو کسی ریلے میں اِن کے چند قبائل ان مقامات سے وسط افریقہ اور سواحل کی طرف جا پڑے۔ جو بعد کو مثل شمالی افریقہ کے ان کا مولد و مسکن بن گئے۔

اِن قبائل کے جلاوطن اور حملہ آور عربوں سے اُن کا تصادم اُن کی اخلاقی اور علمی نشوونما کے لیے ایک خوش آیند فال تھی۔ کیونکہ عربوں کے دیکھا دیکھی اپنے طرزِ عمل کی درستی کا انہیں احساس ہوا جس کا اثر اون کی درستی اخلاق پر بھی پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ اونہیں اسکا ایسا چسکا پڑا۔ کہ کسب فضائل کر کے وہ دوسرے متمدّن قوموں کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ وہ عربوں کے اثر سے اسلام لائے۔ اِس کے

بعد اُنہوں نے عرب مجاہدین کے قوت بازو بنکر خلفاء اور سلاطین کے اشاروں پر زبردست لڑائیوں میں اکثر جوہر شجاعت دکھائے انہیں ایسے بھی مرد آدمی ہوئے کہ مرحلہ دیانت و وفاداری میں ان کے غیر معمولی تدین اور غیر عادی پائے ثبات سے متاثر ہوکر بعض خلفا نے انہیں اپنی خانگی زندگیوں کا شریک بنایا۔ اُنہوں نے بسا اوقات دربار خلافت میں اپنا یہ اعتبار بھی پیدا کر دکھایا ہے کہ حل و عقد سلطنت اور عزل و نصب ادن کے اقتداری آمد ہو گئے۔

یہ ایسے اولوالعزم اور عالی خیال بھی ہوئے کہ اکثر اون کے سروں میں یہ سودا بھی سمایا کہ وہ حاکم علے الاطلاق بنکر رہیں چنانچہ دوسری مہذب قوموں کی طرح اونہوں نے بھی برابر کی سلطنتوں سے مقابلہ اور اپنے کو بادشاہ منوانے کے لیے آراستہ لشکر و باقاعدہ فوجیں طیار کیں۔ اور مدتوں مصروف پیکار رہے سلطنت عباسیہ کو سالہائے سال تک ان کے ان جوشیلے ارادوں کی وجہ سے چین لینا نہیں نصیب ہوا ان کی گو کوئی بڑی سلطنت تو قایم نہیں ہوئی لیکن متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتیں وسط اور غربی افریقہ میں قایم ہوتی رہیں۔

دماغی صلاحیت کے لحاظ سے اونمیں دقیقہ رس اور نازک دماغ مدبرین سیاست اور عدالت بھی ہوئے جن کے نام دنیا میں شہرت نصیب بھی ہیں۔

کافور الاخیشلائی ان میں ایک نامور شخص ہو گذرا ہے جس کے متعلق حکومت مصر تھی اس صلاحیت اور ترقی نے اونہیں امور معاملہ سے فنون لطیفہ کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ اکثر داد شعر دینے والے نازکخیال شعرا بھی اس طبقہ سے نکلے جنہوں نے اپنے قصیدہ خوانیوں سے صلہ و انعام

طبقہ میں خواجہ نے خاص کیے اور جن کی نزاکت خوانوں سے خلیفہ کی خلیس جو ہم اپنی ہفتہ اور قرار کی جاعتیں ہی انہیں سے نکلیں۔ نوشکے یہ سب جو ہر اوشیں کب آئے۔ جب وہ سلاطین سے اور ان کے لشکر سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ۱۲ ای بار دصلیں ہم آئندہ قسط۔ باقی۔ ۱۲ غفرلہ ۔ نیازمند

زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ

(۱)

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذار یاد آیا۔

مگر جب یاد آ ہی گیا، تو چل، اے دل چل۔ لیکن دھیرے دھیرے چل رے دوانے، دھیرے دھیرے چل

ایسی بیتابی کی کیا ضرورت ہے، مانا کہ تجھے اسیر کرنے کے لیئے احباب، اعزا، فرائض و علائق سب جال پھیلائے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں پہونچنے کے لیئے ایک جست کی ضرورت ہے۔ مگر مجھے بھی تو ساتھ لیچلتا ہے

وطن سے یہ دوسری مرتبہ ہی کہ میں باہر جاتا ہوں؛ اور دونوں مرتبہ میرے ساتھ "ظلم" کیا گیا۔ میں اس محبت کے برتاؤ کو ظلم ہی سے تعبیر کرتا ہوں۔ جانے والے کے دل کو الفت اور مہماں نوازی سے لبھا لینا، اُسپر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ملک سے باہر جاکر اسے یاد کرکر کے تڑپتا ہے۔ بمبئی میں، اپنے کلاس فیلو "ڈاکٹر" سید محمد (جن کی بے ریا، پر صداقت مہماں نوازی کے عوض میں میں صرف "تھینک یو، ڈاکٹر" کہہ سکتا ہوں) اور اُس ہیکل اخلاق و تواضع ہز ہائی نس نواب جنجرہ جو تواضع زگردن فرازاں نگوست کی زندہ تصویر ہے، اور مس عطیہ فیضی اور ان کے

خاندان کے التفات و توجہات کے چھاپے دلپر لیے ہوئے جہاز پر سوار ہوا۔ یہ چھاپے اب تک ویسے ہی گہرے ہیں اور رہیں گے۔

جہاز نے لنگر اٹھایا، اور میں گھنٹوں تک یہ شعر پڑھتا رہا ؎

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں

بلادِ عثمانی کی طرف یہ میرا دوسرا سفر ہے۔

کوئی صاحب، ان اوراق میں مصر اور استنبول کے متعلق "معاشرتی، ادبی، سیاسی و نمیدانم چہ وچہ حالات" کے جویا نہوں۔ نہ میں وہ غائر نظر رکھتا ہوں کہ ان حالات کی تدقیق کر سکوں، نہ نفوذ رکھتا ہوں، نہ علم رکھتا ہوں۔ ان حالات کے لیے لائق اور قابل حضرات کے سفرنامے ملاحظہ ہوں۔ ان سے آپکو بالتفصیل معلوم ہوگا کہ ذخیرہ ہمالوں سوزہ خانہ ہمالوں میں کیا کیا چیزیں رکھی ہیں، اور کس ترتیب سے رکھی ہیں۔ مکاتب عالیہ، دارشد، و اعداد یہ کی تعداد کیا ہے۔

ان اوراق میں اک وارفتۂ محبت کے ہزیانات ہیں اور میں تو صرف یہ کہتا ہوں:-

جو آج جائزہ لیتا ہے جاں نثاروں کا

لبیک! لبیک!! لبیک!!!

ہمارا نام بھی لیکر پکار ہم بھی ہیں۔

لبیک! لبیک!! لبیک!!!

سمندر پر لطف تھا۔ یہ لوٹتے وقت کا ذکر نہیں ہے۔ اور جہاز کی سوسائٹی بھی پر لطف، راستے میں صرف عدن کو، (جہاں باوجود میرے پاس دوربین

اور فوری عینک ہونے کے، مجھے "باغ" نظر نہیں آیا) دور ہی سے سلام کرتے ہوئے دسواں دن تھا کہ "ہم ارض فراعنہ" کے سامنے پہونچے یہاں پہلی چیز جس نے ہماری نظر اپنی طرف کھینچی وہ اس شخص کا بت تھا جس نے گو دعوی خدائی نہیں کیا، لیکن نیچے کے کاموں میں عظیم الشان تبدیلی کردی دو براعظم جدا کردیے دو سمندر ملا دیے۔ موسو سیپ ایہ کامران فرہاد جوئے سیز نکال کے، اپنا آسمان کے تلے نام کرگیا۔ جوئے شیر لانیکا کام عشاق کے لیے اب بھی باقی ہے ہمارا جہاز دن بھر، نہر سوئز میں چلا کیا۔ نہر سوئز کے کنارے پر بہت دور تک ریلوے لائن اس قدر قریب ہے کہ جہاز سے دکھائی دیتی ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا، مجھے اسلامی ملک میں ریل اور دیکھنے کا شوق اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ میں کئی گھنٹے متواتر جہاز کے ڈیک پر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کوئی ٹرین گذرے۔ یہ اثر در آہنین، جسنے دنیا میں ایسے ایسے تغیرات پیدا کردیے ہیں، اسلامی ملک میں کس شکل اور کس وضعیت کا ہوگا۔ اور ایک دفعہ اسے اپنی دہما کے کی چال سے، اس زمین پر چلتے ہوئے تو دیکھ لوں۔ میں نے ساڑھے تین برس بغداد میں گذارے مگر وہاں بغداد ریلوے کی گونج تھی، خود ریلوے ابھی نہ پہونچی تھی۔ سو یہ حسرت مصر میں جاکر نکلی۔ مگر اتفاق دیکھیے میں جتنی دیر تک ڈیک پر بیٹھا رہا ٹرین نہ گذرنی تھی نہ گذری۔ جوں ہی میں ڈیک سے اتر کے اندر گیا لوگوں نے کہا کہ ٹرین گذر گئی۔ پھر دوسری مرتبہ ڈیک پر جاکر بیٹھا۔ کھانیکا وقت بھی گذر گیا۔ لیکن ٹرین ندارد۔ جب بھوک نے بہت ستایا، میں کچھ کھانے کے لیے نیچے اترا، اور جھٹ ٹرین صاحب گھڑگھڑاتی ہوئی گذر گئیں۔ ایک صاحب، جن سے میں نے اپنے فراق کا حال بیان کردیا تھا، مسکراتے

ہوئے آئے اور خیر سنا کے اور مجھے جلا کے چلے گئے۔ آخر میں پھر تیسری مرتبہ ڈیک پر جا کر بیٹھا۔ اِس مرتبہ اُس محبوبہ مطلوبہ نے اپنا جمال دخاں افسرا مجھے دکھایا۔ اک ترکی ٹوپی ٹرین کو لیے جا رہی تھی۔ ٹرین چھوٹی پٹڑی کی ٹرین تھی، اور وہی ہندوستان میں۔ جزئی اختلاف نظر انداز کر کے میری دیکھی بھالی ٹرینوں سے ملتی ہوئی۔ مگر میری کیسی حسرت پوری ہوئی!

نہر سوئز کے دونوں کنارے، (اور وہ ایک دوسرے سے بہت دور نہیں) کچھ جاذب نظر نہیں۔ دونوں طرف میدان ریگ یا تو دہائے ریگ ہیں اور بس۔ ایک طرف بادیۃ الشام ہے اور ایک طرف ریگستان مصر ریگستان مصر! آپ مصر کی زرخیزی، شادابی، اور چپہ چپہ زمین پر زراعت ہونے کے فسانے سنتے ہیں؛ یہ فسانے صحیح ہیں؛ مصر نیل کے صدقے میں اِس سرے سے لیکر اُس سرے تک ایک کشت زار ہے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ ہیں اور سر بفلک کشیدہ کھجوروں کے درخت ہیں۔ مگر یہ آپکو آگے چلکر ملیں گے۔ مصر میں ریگستان ہی ہے اور یہ مصر کو نظر بد سے بچانے کے لیے، کاجل کا ٹیکا ہے۔ اور جیسا کوئی کاجل کا ٹیکا، کسی پیارے حسین بچے کو نظر بد سے نہیں بچا سکا، یہ کاجل کا ٹیکا بھی بیکار ہی نکلا۔

ہم آدھی رات کو پورٹ سعید پہونچے۔ پورٹ سعید، زبردست بندرگاہ ہے۔ بہت سے جہاز، موٹر کشتیاں، آجا رہی تھیں اور جہازوں کی سیٹیوں کا تار بندھا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ ان نالہائے نیم شبی کے سبب رہائشی پورٹ سعید کیسے سو سکتے ہوں گے۔ ایک دو گھنٹے بعد، کنارے سے ملے ہوئے ایک ہوٹل میں سیر خرائے لینے نے بتا دیا کہ یوں!۔ (باقی جب میں جاگوں)

سجاد حیدر (قسطنطنیہ)

محمڈن یونیورسٹی

از مولوی احمد علی صاحب شوق، قدوائی، لکھنوی،

او سوادِ علم، تجھ پر حکمرانی چاہیئے
او حروفِ صفحہ، تم سے نکتہ دانی چاہیئے
او قلم، تو شاخ ہے، تو گل فشانی چاہیئے
او سخن، ہے بحر تجھ میں، تو روانی چاہیئے

او صریرِ خامہ، تو مطلب ادا کر، بول کر
کہہ دواتوں سے، کہ کچھ دیکھیں آنکھ کھول کر

جہل کے بڑھنے سے عزت قوم کی کتنی گھٹی،
جتنی یہ آگے بڑھی تھی، اتنی ہی پیچھے ہٹی
لٹ گئی یہ، دولت اسکی جا کے غیروں میں بٹی
مثل بالوں کے پریشاں ہو گئی، ایسی کٹی

قوم میں، اب تو، فقیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
زر کہاں، کف میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

جہل سے رستا ترقی کا خرد پاتی نہیں
رات اندھیری ہو، تو کوئی شئے نظر آتی نہیں
چھپ رہی دولت، ہمیں اب شکل دکھلاتی نہیں
ہم سے شرماتی ہے وہ، غیروں سے شرماتی نہیں

ہم سے کیا مطلب، اگر دنیا میں من برسا کرے
ہم رہیں مفلس، ہماری آرزو ترسا کرے

عید کا دن، اور بلا نازل ہمارے گھر پہ ہے
عیش کیا آئے، کہ پہرا مفلسی کا در پہ ہے
زر نہیں، اور منحصر بچوں کی زینت زر پہ ہے
پاؤں میں ان کے نہ جوتا ہے، نہ ٹوپی سر پہ ہے

عیش و غم کے واسطے، سامان اب تو ایک ہے
عید گاہ اور کربلا کی شان، اب تو ایک ہے

ضعف دیکھو، ان یتیموں کا کہ چل سکتے نہیں
خشک پیڑ ان کو سمجھ لو، پھول پھل سکتے نہیں

لیں سنبھالا موت کا یوں تو سنبھل سکتے نہیں جان نکلے، حوصلے لیکن نکل سکتے نہیں

ان کے مورث، بن کے جاہل، علم سے بے حس رہے
ان کو تو کہیے میں بلا افلاس، یہ مفلس رہے

کیا پڑھیں یہ، کیا لکھیں یہ، پامالِ درد ہیں ان کے جسموں میں نہیں خون، ان کے چہرے زرد ہیں
ان کے نالے گرم ہیں، اور ان کی آہیں سرد ہیں ان کے اعضا خاک ہیں، اور ان کی جانیں گرد ہیں

غم میں دل ہے، دل میں غم ہے، کیا کریں، ناچار ہیں
سر میں درد، اور درد میں سر روتے ہیں، بیمار ہیں

اس اثنا میں آئی، طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا کی صدا آ رہی ہے اس گھڑی، اترک کی جانب سے ہوا

ہو نہ ہو، ہے یہ علیگڈھ کا پیامِ جاں فزا ہو نہ ہو، ایما ہے یونیورسٹی کے قصر کا

ایک ہی آواز کیسی، مچ گئی کالج میں دھوم
هُنَالِكَ رَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّتَعْلِيمُ الْعُلُومِ

اب تو کالج بول اٹھا، میرا مقدر دیکھنا آج جو دیکھا ہے، کل اور اس سے بڑھ کر دیکھنا
وہ کھڑا ہے اوج، وہ اقبال، در پر دیکھنا چتر گردوں پھیر رہا ہے میرے سر پر دیکھنا

نام اچھالوں قوم کا، بچوں کی شان اوج سے
فتح کر دوں میں قلم و علم کی اس فوج سے

باغ سیّد کا جا جب خطۂ اخلاق پر سایہ علم اس نے ڈالا پھیل کر آفاق پر
جڑ ہی مذہب، وہ ہی قائم قدرت خلاق پر ثبت ہے "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ" اس کے اوراق پر

اس کے پودے، قوم کے بچے ہیں، پھل لائیں گے یہ
آج پھولے ہیں، ثمر شاخوں میں، کل لائیں گے یہ

یاس کو رکھ دے کے، امیدِ ترقی ور رہی ہو یہ کالج علم و دولت کا خزانہ، تو سہی
پاکے آغا خان کا روح، یہ بات کالج نے کہی شارح لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہیں سہی

ے خوشی کے ساتھ اس میں داخل ہو ۱۲ ے علی گڈھ ۱۲ ترکی جانب ۱۲ ے یہاں ۱۲ دعست ۱۲ اور قوی ۱۲

قوم کے ہونٹوں پہ، ان کی گفتگو کا شور ہے
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا، کا شور ہے

بے ادب بنکر تمہیں، واقف کروں میں آپ سے — تم میں آغا خاں ہیں عیسیٰ اپنی ہر اندار سے
قوم مُردہ تھی، اسے زندہ کیا اعجاز ہے — جان پڑی قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ کی آواز سے

سایہ رحمت ہے، سایہ ان کا ساری قوم پر
آیۂ رحمت، ہوا نازل، ہماری قوم پر

فخر اس کالج کو ہے، دنیا میں، جس کے نام سے — سو رہا ہے، گوشۂ مسجد میں، وہ آرام سے
جاگ جاگ اوسنے والے، خوش ہو اپنے کام سے — علم کا لنگر ہے جاری، تیرے فیضِ عام سے

یہ ترے "مشتاق" ہیں، دیکھ ان کو آنکھیں کھول کر
شہ انہیں نے دی تھی، کالج کی، تجھے ہاں بولکر

کیا ہیں بھولا ہے سید، یہ نہیں، ممکن نہیں — قوم ہی میں ہوگا دل، گو خود وہ ہے جنت نشین
یوں کہیگا، کرکے سجدہ، جانب عرش بریں — شکر تیرا یا الٰہی، تو ہے رب العالمیں

کالج اب، دنیا میں جنت کا نمونا ہو گیا
جنتیں دو، میں نے پائیں، لطف دونا ہو گیا

اسکو کالج سے بہت الفت تھی، تو یہ قیامت — روح اس کی، پھر رہی ہوگی، اسی کے آس پاس
قوم سب مل کر کرے اللہ سے، یہ التماس — کرکے سید کو زندہ، اسکے پھر جسم و حواس

انتظام طولِ عمر، اس کے لیے کرلے گی قوم
اپنی اپنی عمر کا، ایک ایک حصہ، دے گی قوم

---

۵۱ ہرگز نہ پہونچو گے بھلائی کو اگر تم خرچ نہ کروگے۔ ۵۲ اٹھ کھڑے ہوئے ہو ساتھ حکم خدا کے ۵۳ لفظ آیۂ مذکر ہے ۵۴ سید احمد خاں مرحوم۔ ۵۵ نواب مولوی محمد مشتاق حسین خاں، جو اجل علیگڈھ محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری ہیں سب سے پہلے اس کالج کے قایم کرنے کے لیے سرسید کے ارادے کو انہیں نے خوت دی تھی ۵۶ یعنی ایک جنت اعتقادی جسے اصلی کہنا چاہیئے اور دوسری جنت کالج کی جہاں سید کی تربت ہے

شرط یہ ہے، پھر نہ سرسیّد کو مرنے دیں گے ہم — پھر نہ اُسکی عُمر کو، ہرگز، گذرنے دیں گے ہم
پھر نہ آنکھیں پھیرنے، اور بند کرنے دیں گے ہم — پھر نہ اِس کالج کے زینوں سے اُترنے دیں گے ہم

وہ ہمارا خضر ہے، ہستی کے عالم میں رہے
وہ ہمیں رستا بتانے کے لیے ہم میں رہے

دے نہیں سکتی فنا کے بعد فطرت پھر حیات — توبہ! کیا میں کہہ گیا، فانی نہیں سیّد کی ذات
وہ ہے زندہ خلق میں، جب تک ہے باقی کائنات — وہ ہے زندہ قوم میں، جب تک ہے کالج کو ثبات

کالج اُس کا جسم ہے، تعلیم اُس کی جان ہے
قوم کے بچّوں میں اعضائے بدن کی شان ہے

کس محبت سے سلام کر رہے ہیں یاد اُسے — دے رہے ہیں سب دُعائے مغفرت سے داد اُسے
بن کے یونیورسٹی، کالج کرے اب شاد اُسے — دے سرت سے اُسی کا دل، مبارک باد اُسے

تب تو سوچیگا کہ رضواں سے یہ کہنا چاہیئے
اپنی جنّت لے، مجھے، کالج میں رہنا چاہیئے

تربتِ سیّد کو، قدرت نے دیا، کتنا وقار — صاف کرتی ہے ہَوا، جاروب کش بنکر غبار
شب کو شبنم، اپنے موتی اُس پہ کرتی ہے نثار — صبح کو کرنیں چڑھایا کرتی ہیں سونے کے ہار۔

کیا کشش ہے، آتی ہے، کیا بوئے اُلفت خاک سے
دل مسلمانوں کے لپٹے ہیں، مزارِ پاک سے

یاد ہے، کالج سے مسٹر بک[۱] کی اُلفت یاد ہے — اُن کی تقریر، اُن کی تحریر، اُن کی محنت یاد ہے
قوم کے محسن[۲] ہمیں یاد، اور اُنکی ہمّت یاد ہے — وہ شگفتہ اُن کی پیشانی، وہ صورت یاد ہے

---

[۱] مسٹر تھیوڈر بک متوفی جو علی گڑھ محمڈن کالج کے پرنسپل تھے وہ مسلمانوں کے بڑے ہمدرد تھے اور یونیورسٹی کے لیے اُنھوں نے بے حد کوششیں کی تھیں [۲] نواب محسن الملک مہدی علیخاں مرحوم جو سرسیّد کے بعد کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے تھے اُن کے عہد میں کالج اور اس کے سررشتہ نے بہت ترقی کی، ۱۲

پھریں ہونگے وہ، جنت میں لبِ خنداں کے ساتھ

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں کے ساتھ

گو ہے کالج، معدنِ اب بھی بے بہا سامان کے — لوگ، علموں کے جواہر چنتے ہیں اس کان سے
قوم لیکن کہہ رہی ہے، جوش سے، ارمان سے — اور اسے چمکاؤ، یونیورسٹی کی شان سے

ہو نہ مستحکم ایسی، جو سمک[۵۱] سے جا ملے
اس قدر رفعت کو اچھالو، جو فلک سے جا ملے

چار جانب خوب آغا خاں نے پھیلائی صدا — پہلے چوبائی ہوا تھی اب ہے چوبائی صدا
وہ، اودھ، بنگال، اور پنجاب سے، آئی صدا — وہ، ہوا، بمبے سے اور مدراس سے لائی صدا

دی صدا، ہز ہائینس نے، اٹھ کے اس انداز سے
ہند گونجا، اَسْرِفُوْا لِلْقَوْمِ[۵۲] کی آواز سے

ناتی پھرتی ہے چندے کے لیے، قوم اب زمین — رحم کر ہمپر خدایا، اَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ
بعض زر کے جمع ہونے کا نہیں کرتے یقیں — کہہ انہیں شاید، کہ فَاْتُوْنَا بِسُلْطَانٍ مُّبِیْنٍ[۵۳]

یوں تھا، ہم دینگے، سلطانِ مبین کا کیا جواب
لفظ "سلطان" سے، مگر، خود ہی ہوا پیدا جواب

بول اٹھیں ہز ہائینس نواب سلطان جہاں[۵۴] — مجھ سے ہمت لے، قدم آگے بڑھا، اے قوم، ہاں
در خزانے کا کھلا، جس دم کھلا قفلِ داں — مثلِ سورج کے ہوئیں دستِ کرم سے زر فشاں

---

۵۱ سمک کے معنی مچھلی، شاعرانہ مراد اس مچھلی سے ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو اپنے اوپر لیے ہوئے ہے، از سما تا سمک محاورے میں اسی مچھلی سے مطلب ہے ۵۲ فضول خرچی کرو واسطے قوم کے ۱۲
۵۳ قرآن پاک کا جملہ ہے، یعنی لاؤ دلیل واضح ۵۴ ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے ملک بھوپال جنہوں نے یونیورسٹی فنڈ میں ایک لاکھ روپے عطا فرمائے ہیں، اور اس عطیے کے علاوہ فیاضی سے علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے برقی پنکھوں اور برقی روشنی کے کثیر مصارف اپنے ذمے لیے ہیں ۱۲

توبہ سورج کیوں کہا، کیا خاک دیتا ہے وہ زر
بخش دیتی ہیں یہ زر، اور پھیر لیتا ہے وہ زر[۱]

کی عیاں کرنل[۲] عبید اللہ خاں نے شانِ فیض — فیض کو جسم، اور اُن کے دل کو کہیے جانِ فیض
بارشِ زر سے نکالا، دل نے جب ارمانِ فیض — جوش سے شعلے کی کوٹھی پر اُٹھا، طوفانِ فیض
یادِ قرآن[۳] نے، فلا تحقرہ پہ مائل کر دیا
قوم سائل تھی، تو کاسہ اُس کا زر سے بھر دیا

شہ حمید اللہ خاں[۴] کی، مل گئی جب فیض کو — جوش میں لانے لگی، ہر جنبشِ لب فیض کو
جانبِ تعلیم، مائل دیکھ کر، اب فیض کو — دلولے سمجھاتے ہیں، بڑھ کر، یہ مطلب فیض کو
رعد جیسے، اس قدر ہو، بول بالا، قوم کا
آبِ زر چھلکے، بھرے ایسا پیالا قوم کا

قوم کا جھرمٹ ہوا، چندے کی دولت بڑھ گئی — عورتوں[۵] کی بالیوں سے زر کی زینت بڑھ گئی
اتحادِ قوم سے ملت کی شوکت بڑھ گئی — حوصلے کا، حوصلہ، ہمت کی، ہمت بڑھ گئی

---

[۱] شام کو سورج اپنی روشنی کو اپنے ساتھ سمیٹ لے جاتا ہے ۱۲ [۲] جناب کرنل حاجی حافظ محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر، جواہر مائنس فرمانروائے بھوپال کے منجھلے صاحبزادے ہیں آج سے چندہی دنوں پہلے انہوں نے پچاس ہزار روپے علیگڈھ محمڈن کالج کو عطا فرمائے ہیں، اور اب دس ہزار روپے یونیورسٹی فنڈ میں دیے ہیں سنٹرل پراونسز میں اس فنڈ کے متعلق وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ [۳] شملہ بھوپال میں ایک پہاڑ کا قدیم نام ہے، جس پر کرنل صاحب بہادر کی کوٹھی ہے وہیں یونیورسٹی فنڈ کے لیے جلسہ ہوا تھا، جسکے پریسیڈنٹ کرنل صاحب بہادر تھے [۴] یادِ قرآن سے یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک کا خیال کرکے اور یہ بھی کہ کرنل صاحب بہادر حافظ قرآن ہیں فلا تحقر کے معنی، پس نہ بھڑک
[۵] حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، ہز ہائنس فرمانروائے بھوپال کے چھوٹے صاحبزادے جو یونیورسٹی فنڈ کی تکمیل کے واسطے دلی جوش کے ساتھ تو جہ فرما رہے ہیں اور سات ہزار روپے خود اس کے چندہ میں عطا فرمائے [۵] شہر بھوپال کی ایک نیک دل بیوی جن کے پاس مرنے تک ۱۲ ہزار نقد تھا، انہوں نے یونیورسٹی فنڈ میں اپنی ہتھنی کی بالیاں بھیجدیں ۱۲

رشتۂ الفت سے، سب بھوپال وابستہ ہے آج
قوم، گویا، مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے آج

ہمت اب کہتی ہے، میں بڑھنے کی شے والا ہوں — جوش کہتا ہے کہ بڑھ چل میں ترے ہمراہ ہوں
بولے آغا خاں، میں خضرِ شاہ راہِ جاہ ہوں — جانی بوجھی منزلِ مقصد ہے، خوب آگاہ ہوں

آؤ، لو بخشیں گے سامانِ ہنز کنگ[1] اِمپرر
دیں گے یونیورسٹی کا چارٹر[2] کنگ اِمپرر

وہ کھڑے ہیں، صاحبِ تاج و نگینِ ہند، وہ — وہ ہیں وہ، فرماں روائے سرزمینِ ہند وہ
رہتے ہیں لنڈن میں لیکن ہیں مکینِ ہند وہ — گھر دلوں میں کر لیا، ہیں دل نشینِ ہند وہ

خوش مسلماں ایسے شاہنشاہ کے سایے میں ہیں
ان کے سایے میں ہیں، تو ظل اللہ[3] کے سایے میں ہیں

ہر تصور دل کا اب بولا کہ میں اُمید ہوں — بخت چمکا اور کہا اس نے کہ میں خورشید ہوں
خندہ ہنسکر بول اٹھا، میں عشرتِ جاوید ہوں — کہہ اٹھا دِن، اے مسلمانو، میں روزِ عید ہوں

دی صدا کالج نے، مجھکو چارٹر درکار ہے
بندہ پرور، اک نگاہ لطف اِدھر درکار ہے

ساتھ لیکر چند لوگوں کو وہ آغا خاں بڑھے — جیسے اُمیدوں کو لیکر ہمتِ انساں بڑھے
جیسے کرنوں کو لیے خورشیدِ نورافشاں بڑھے — نیکیوں کے ساتھ جیسے قوتِ ایماں بڑھے

لوگ اترائے ہوئے، پیر دبنے، یوں، پا کے ساتھ
جیسے لہراتی ہوئی، موجیں چلیں، دریا کے ساتھ

---

[1] کنگ کے معنی بادشاہ اور اِمپرر کے معنی شاہنشاہ، انگریزی میں ان الفاظ کو ملا کے مفہوم یہ رکھا گیا ہے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اور ہندوستان کے شہنشاہ، [2] چارٹر انگریزی میں اُس شاہی سند کو کہتے ہیں جو بادشاہ کے حضور سے عطا ہو ۱۲۔ [3] اِس اعتبار سے کہ بادشاہ ظل اللہ ہے ۱۲

وہ سہرے جا کر کھڑے کنگ امپرر کے سامنے — رُخ پہ فرحت اور رُخ اُنکی نظر کے سامنے
اب دُعائیں قوم کی، پھونچیں اثر کے سامنے — بخت چمکا جا کے شاہِ بحر و بر کے سامنے

سرنوشتِ قوم کو، ہز ہائنس پڑھنے لگے
آرزوئیں کھل پڑیں، اور حوصلے بڑھنے لگے

ایڈرس سنکر ہوا شکلِ تمنا کا ظہور — لب ہیں آغا خاں کے جنبانِ دل میں ہمت رُخ پہ نور
سُنتے ہیں کنگِ امپرر، اور کرتے ہیں ظاہر سرور — اُن کے ہونٹوں کا تبسم، کچھ تو کہتا ہی ضرور

چشمِ رحمت، لطف کی تصویر دکھلانے لگی
چارٹر کی شکل چتون سے نظر آنے لگی

ہز مجسٹی نے، وہ سُنے جیب کی ترچھی نظر — جیب میں وہ ہاتھ ڈالا، وہ نکالا چارٹر
بختِ کالج بنکے، وہ چمکے حروفِ آبِ زر — شوق دیکھو، وہ عطا فرماتے ہیں کنگِ امپرر

لے کے، وہ ہز ہائنس پلٹے خوشی کی چال سے
رُخ سے فرحت یوں عیاں ہے جیسے لال سے

احمد علی، شوق، قدوائی،

لہ ہز ہائنس آغا خان ۵۲ لال عربی میں عین کے ساتھ لعل ہے، اور اردو میں الف کے ساتھ لال بھی صحیح ہے لال کی پھوٹ اُس عکس کو کہتے ہیں، جو اوس کے رنگ کی تاب سے نکلکر سفید شے پر سُرخی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ۱۲۔

غزل

صوفی آں سرِ حقیقت کہ ہوید امیکرد — بر حدیثے کہ بما کرد ہم از ما میکرد
پیچ رتا بے کہ دل غمزدہ در پنہاں داشت — شکن طرّۂ گیسوئے تو پیدا میکرد
دوش رفتیم و ندیدیم کہ طوطی بہ چمن — داستانہا ز لب لعل شکر خا میکرد
فلسفی سرِ حقیقت تبوانست کشاد — گشت رازِ دگراں راز کہ افشا میکرد

شبلی از قامت زیبائے تو میگرد سخن — یا تو گوئی سخن از عالم بالا میکرد

عورت کی خلقہ بھی دلیل واضح ہے وحدانیۃ خالق کی

عالم کی ہر ایک شے اگر اوسکی حقیقتہ کو بنظر تعمق دیکھا جائے تو ایک حکیم صانع کا پتہ دے رہی ہے۔ مثلاً ایک بھٹے میں سیکڑوں دانے اور ہر ہر دانہ کے لیے ایک ایک خانہ پھر اُن نازک دانوں کی حفاظت کے لیئے ریشم سے نرم تر ریشے اون پر بچھے ہوئے پھر اون پر کئی غلاف اس ترتیب سے کہ اندر والا غلاف حریر محض سے زیادہ تر نازک اور باہر والا کرباس کے قریب قریب سخت۔ جوہری کی مجال نہیں کہ موتیوں کو بھی اس احتیاط سے رکھ سکے اور ہوائے سرد و گرم سے اِس طرح بچا سکے یہ حکمۃ و تدبیر نہ اون دانوں نے خود اپنے لیے کی ہے نہ کاشتکار کی زحمۃ کو اس میں کچھ دخل ہے نہ ابر و باد کو اس حکمۃ کے ساتھ کچھ لگاؤ ہے نہ مہر و ماہ کو کچھ تعلق ہے۔ انسان کی عقل ان تمام مصالح و حکم کو سمجھتی ہے اور یہی عقل حجۃ خدا ہے۔ منکر پر بھی اوسنے حجۃ تمام کر دی ہے۔ مسلہ ارتقاء والے جو وجود باری کے باب میں خاموش ہیں یہاں تک کہ بعضے اپنے تئیں متوقفین میں شمار کرتا ہے حیات کے باب میں اپنی تحقیق یہ بیان کرتے ہیں کہ حیوانات میں حیات وہی ہے جو نباتات میں ہے اور نباتات میں ابتدائے حیات یوں ہوتی ہے کہ پہلے ایک تیلی سی بنتی ہے جس میں جان ہوتی ہے۔ بس یہیں تک علم انسانی کی رسائی

ہوئی ہے لیکن یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ وہ مادہ جو غیر ذی روح تھا کیونکر ذی روح بن جاتا ہے اور غیر مرئی شے کیونکر دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ تیلی جس مادہ سے بنی نہ پہلے وہ مادہ دکھائی دیتا تھا نہ اوس میں جان تھی۔ ؎

نور حیرت در شب اندیشۂ اوصاف تو
بس ہمایوں مرغ عقل از آشیاں انداختہ

ان حکمائے وقت کا وجود باری میں توقف کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ چاہتے ہیں حواس ظاہری سے وجود باری کا پتہ لگالیں اور اون کا یہ کہنا کہ وجود باری ہم پر نہیں ثابت اس کے یہ معنی ہیں کہ حواس ظاہری سے ہم اوس کو نہ پاکر اور اسباب میں ہم بھی اون کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ حواس ظاہری سے اوس تک رسائی کسی طرح ممکن نہیں فیلسوف ہکسلی جوان لوگوں میں سربرآوردہ ہے۔ کہتا ہے کہ مادیین کا مذہب یہ ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کوئی اور شے موجود نہیں میں اس مذہب کو غلط سمجھتا ہوں۔ قوت کوئی اور شے نہیں سوا اس کے کہ علت حرکت اوس سے مراد لیں۔ میں اس کو نہیں سمجھ سکا۔ ہاں انکشافات علوم طبعیہ سے اتنا ثابت ہوا ہے کہ جسے لوگ مادہ سمجھا کرتے ہیں اوسکا دائرہ وسیع ہوگیا ہے اور جسے محض قدرت الہی کی طرف منسوب کرتے ہیں یا فعل روحانی سمجھتے ہیں اوسکا دخل کم پایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے وجود مادہ پر یا مذہب مادیین پر کوئی استدلال نہیں قایم ہوسکتا۔ اور جلد ۹ صفحہ ۱۴۰ میں اوس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی دیوانہ ہی ہوگا جو وجود باری کا انکار کرے انتہی

حکیم برکلی مادیات کے وجود کا منکر ہے اور وہ سچ کہتا ہے کہ مادہ ایک مجہول شے ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں علم مابعد الطبیعۃ سے اوسکو

تعلق ہے اور وجوہ نفس کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوتا۔ انتہی۔

راقم حروف کہتا ہے کہ بلاشبہ ہر نفس بخوبی یہ علم رکھتا ہے کہ میں ہوں مگر اس سے بے خبر ہے کہ میں کیا ہوں اور کیونکر ہوں اور کہاں ہوں۔ اسکی توضیح حکیم لوک کے اس مقولہ سے بخوبی ہوتی ہے کہ میں دیکھتا ہوں یا سمجھتا ہوں یا سوچتا ہوں جب کہ خدا کو منظور ہوتا ہے لیکن یہ کیا علاقہ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا انتہی۔ مگر لوک نے مادیات اور روحانیات دونوں کے وجود کی تصریح کردی ہے وہ کہتا ہے کہ جس قدر اجسام مادی کا علم ہم کو ہے روحانیات کا علم اوس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہم کو مادیات کا علم اتنا ہی ہے کہ اوس کے اعراض محسوسہ کا ہم کو حس ہوتا ہے مگر خود وہ شے نامعلوم ہے روحانیات کا علم بھی اسیقدر ہم کو حاصل ہے کہ اوس کے خواص منقولہ کا ہم کو تعقل ہوتا ہے گو خود وہ شے نامعلوم ہے انتہی۔ یہ تینوں شخص اساطین علوم مغاربہ میں سے ہیں ان کے اقوال کے ساتھ حکمۃ مغربیہ کے امام حکیم نیوٹن کی اس تحقیق کو منضم کرکے دیکھنا چاہیئے کہ جس طرح گھنٹی کی صدا یا کسی باجے کے تار کا سر یا کسی اور چیز کی آواز سوا اس کے کہ ایک حرکۃ ارتعاش ہے۔ اور کچھ بھی نہیں ہوا میں بھی سوا اسی حرکۃ کے جو کسی چیز میں سے اس میں سرایت کرگئی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اور حاسۃ اسی ارتعاش کے حس کو آواز سمجھتا ہے۔ بس یہی حال رنگوں کا ہے کہ اجسام پر جو رنگ ہیں وہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اون اجسام کی ساخت ایسی ہے کہ فلاں فلاں رنگ کی شعاع کو بہ نسبت دوسری شعاعوں کے اچھی طرح منعکس کرتے ہیں۔ شعاعوں میں جو رنگ ہیں وہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اون شعاعوں میں یہ خاصہ ہے کہ فلاں یا فلاں قسم کی حرکۃ کو پردۂ چشم میں منتقش کردیں

اور آنکھ اوسی حرکت کے ادراک کو رنگ سمجھتی ہے انتہی۔

نیوٹن کے اِس قول سے جو ثابت و مبرہن ہو چکا ہے ظاہر ہے کہ تمام مبصرات و مسموعات کا وجود ہمارے نفس ہی میں ہے خارج میں ایک حرکت کے سوا کچھ بھی نہیں ستاروں کا تلالو آفتاب کا لمعان اجسام کا اختلاف الوان بادل کی گرج نغمہ کی شیرینی حروف کے مخارج فقط ہمارے پردۂ چشم و پردۂ گوش میں یہ سب چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں خارج میں ایک حرکت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بعبارۃ آخری اِس کا یہ مطلب ہوا کہ عالم میں تاریکی ہے ہم کو روشنی معلوم ہوتی ہے۔ عالم میں خاموشی ہے ہم کو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ حقیقۃ ہے حواس خمسہ کے مدرکات کی۔ انہیں حواس کے ذریعہ سے جو لوگ خدا کو ڈھونڈھتے ہیں وہ تو اوسے کبھی نہیں پا سکتے۔

ہکسلی گو فرقۂ لا ادریہ میں سے ہے اور ذات باری اور روح اور مادہ کے ثبوت و وجود میں توقف کرتا ہے لیکن اِس الزام کو کہ وہ حواس خمسہ پر اپنے مدرکات کو منحصر سمجھتا ہے گوارا نہیں کرتا۔ اوس کا فاضل معاصر فیلسوف للی جب اوسپر معترض ہوا کہ ہکسلی جس چیز کو حواس خمسہ سے محسوس نہ کر سکے اوس کے ثبوت کا منکر ہے تو ہکسلی نے اوس کا جواب یہ دیا مجھے یقین ہے کہ للی کو غلط فہمی ہوئی اور اِس غلط فہمی کا احساس حواس خمسہ کے ذریعہ سے نہیں ہوا ہے پھر بھی میں اوس کی غلط فہمی کا منکر نہیں ہوں۔ اور میں للی کی اوس خوش بیانی کا معترف ہوں جس خوبی سے اونہوں نے اعتراض کی تقریر کی ہے لیکن یہ اعتراض بھی حواس خمسہ کے ذریعہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اوس کے استدلال منطقی و سبک عبارۃ کی خوبی میرے ذہن نے سمجھی ہے۔ انتہی۔

حیات کی تہیلی پر جیسی حیرت ڈارون کے متبعین کو پیدا ہوئی ہے ویسی ہی حیرت نیوٹن کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے کہ اجسام میں جذب و انجذاب باہمی کا ضابطہ تو ایک پایا جاتا ہے لیکن یہ میں کس سے کہوں کہ اجسام ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں جسم تو بے جان و بے حس ہے وہ بھلا کیا کھینچیگا۔ اسکی یہ حیرت پچھلے کی چاندنی ہے جس نے صبح کاذب کی طرح دھوکا دیکر طائر عقل کو وطن آوارہ و تباہ کر رکھا ہے ورنہ جو لوگ آنکھوں سے یہ دیکھ چکے کہ کیسے حیات عالم غیب سے محل شہود میں آجاتا ہے یا اس نکتہ کو سمجھ چکے کہ قوت اس کے سوا کوئی اور شی نہیں کہ اوس سے علۃ حرکۃ مراد لیں یا یہ فیصلہ کر چکے کہ جسم بے جان بے حس چیز ہے کشش کا فعل اس سے خود نہیں سرزد ہو سکتا یا یہ جانتے ہیں کہ ہمارا کیمیا سمجھنا سوچنا یہ سب فعل ہمارے اختیاری نہیں ان لوگوں کا وجود باری میں توقف کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ حواس ظاہری سے اوس کا ادراک نہیں حاصل ہوا۔ ورنہ خود ان کے نفس میں جو آثار احتیاج و افتقار کے موجود ہیں وہ باری تعالیٰ کا پتہ بتا رہے ہیں لیکن محض وجود باری کا پتہ مل جانا کافی نہیں اصحاب توحید و تثلیث کا معرکہ اس کے بعد سر کرنا ہے۔ تمام حکمائے فرنگ اصحاب تثلیث میں ہیں اور جب بطلان تثلیث تک اون کا استدلال منجر ہوتا ہے تو موحد ہونے کے بجائے منکر وجود باری تعالیٰ ہو جانا اونہیں نہایت آسان معلوم ہوتا ہے پریسٹلی حکمائے انگلستان میں بڑا مشہور و سربرآوردہ ایک فاضل جلیل القدر گزرا ہے جو فن کیمیا کے بہت سے مسائل کو حل کر گیا۔ اوس نے اپنے موحد ہونے کا اظہار کر دیا خلق خدا دشمن ہو گئی گھر کھود ڈالا۔ ساری کتابیں اور گراں بہا آلات اوس کے تباہ کر دیے۔ آخر مجبور ہو کر امریکہ میں جا کر ستر برس کی عمر میں ۱۸۰۴ء میں اس حکیم نے انتقال کیا مصلحۃ ملکی کے

آگے استدلال عقلی کا زور کچھ نہ چل سکا۔

وحدانیۃ باری تعالیٰ کا ثبوت بھی نفس انسان میں ہے۔ انسان کو بقائے شخص کے لیئے ہوا کی ضرورت ہے کہ سانس لے اناج کی احتیاج ہے کہ غذا کرے۔ اس سے ثابت ہے کہ جس نے انسان کو پیدا کیا اوسی نے ہوا کو اور اوس کے لیے غذا کو پیدا کیا۔ امیر المومنین کے اِس ارشاد سے کہ خالق النملۃ ہو خالق النخلۃ اُردو میں یوں کہیں گے کہ جس نے چیونٹی کو پیدا کیا اوسی نے شکر کو پیدا کیا و حدانیۃ خالق کی دلیل ظاہر ہے۔

جسطرح احتیاج انسان کی اپنے وجود میں ثبوت ہستی باری تعالیٰ ہے اور احتیاج انسان کی بقائے شخص میں ثبوت وحدانیۃ باری تعالیٰ ہے۔ اسیطرح احتیاج انسان کی بقائے نوع میں بھی ثبوت وحدانیۃ باری تعالیٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو بقائے نوع کے لیے عورت کی ضرورت ہے کہ اوس سے نسل چلے اور عورت کو اوس نے خود نہیں خلق کیا۔ غرض کہ عورت کی خلقۃ بھی وحدانیۃ خالق کی دلیل واضح ہے۔

علی حیدر طباطبائی

تاریخ سپارٹا میں لکھا ہے کہ جن دنوں میں وہاں یہ دستور تھا کہ ہر چھوٹا اپنے بڑے کو سلام کرے۔ ایک لڑکے نے جو سڑک پر جا رہا تھا ایک بزرگ کو آتے ہوئے دیکھا اور سلام کیا بزرگ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اسکو پکڑ کر مجسٹریٹ کے سامنے لیگیا مجسٹریٹ نے لڑکے سے پوچھا کہ تمنے کیوں نہیں اس بزرگ کے ادب کو ملحوظ نہ رکھا لڑکے نے جواب دیا اس لیئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اِس بڈھے کا کوئی لڑکا نہیں ہے اس لیئے کہ اس نے شادی نہیں چونکہ یہ لاولد مریگا اور اپنے بعد کوئی لڑکا نہ چھوڑیگا جو میرے بڑھاپے میں مجھے سلام کرے اسکو اس سے حق نہیں ہے کہ یہ مجھ سے تعظیم کا متوقع ہو۔ مجسٹریٹ نے یہ عذر پسند کیا اور بڈھے کو نکالدیا۔

حقوق نسواں

جون کے رسالہ تمدن میں جو مضمون "تمدن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ درحقیقت نہایت غور و توجہ سے دیکھنے کے قابل ہے گو قابل نامہ نگار نے آخر میں جاکر مضمون کو بہت سادہ اور مفید بنانے کوشش کی ہے اور اسمیں کلام نہیں کہ جو سوال پیدا کیئے گئے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ انپر بحث کی جائے لیکن تمام مضمون بلکہ ہر صفحہ ہر پیرا ہر سطر آئینہ ہے اس طرز معاشرت کا جسمیں ہماری عورتیں آجکل زندگی بسر کر رہی ہیں اور ثبوت ہے اس دعوے کا کہ عام نہیں بلکہ خاص اور خاص الخاص افراد قوم بھی اس طرز معاشرت کے ایسے عادی ہو گئے ہیں اور یورپ پر حکومت کا چسکا ایسا پڑگیا ہے کہ اب اسکا چھوٹنا آسان نہیں +

حامیان حقوق نسواں کی بابت قابل نامہ نگار کے ان الفاظ سے کہ "اظہار قابلیت یا ذاتی نفع کی غرض سے ایسے مضامین رسالوں میں لکھا کرتے ہیں" ہمیں بحث نہیں کام کرنیوالوں نے اس سے بہت زیادہ سنا ہے ہاں بحث صرف مضمون کے اس حصہ سے ہے جس میں مولانائے موصوف نے حقوق کی تصریح کی ہے - اس سے ہم اتفاق کر لیتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان فطری حق ایک بھی نہیں لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب فطری حق ہے نہیں تو مرد کی فوقیت ثابت ہوتی چاہیے تھی تاکہ عورتوں کے ذمہ یہ بار پڑتا کہ وہ خدمت کرکے اخلاقی حقوق پیدا کریں سو حالت میں کہ قدرت نے فریقین کے حقوق میں کوئی امتیاز نہیں

رکھا اور مرد کو عورت پر فوقیت نہیں دی تو ضرورت یہ ہے کہ مرد خدمت کر کے اخلاقی حق پیدا کریں۔ مولانائے موصوف کا مضمون مکمل ہوتا اگر مولانا اس بات کے ثابت کرنے کی بھی کوشش فرماتے کہ مرد کو عورت پر کیا فوقیت ہے اگر ہماری رائے غلط نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلیل قیاس مذہب کسی طرح بھی مرد کی فوقیت عورت پر ثابت نہ ہوگی اور غالباً یہ ہی وجہ ہے کہ قابل نامہ نگار نے مسئلہ کے اس پہلو کو ہاتھ نہ لگایا

مخالفہ حقوق نسواں سب سے بڑی دلیل مرد کی فوقیت کی اسکی وہ طاقت پیش کرتے ہیں جو قدرت نے جانوروں تک میں نر کو مادہ کے مقابلہ میں عطا کی ہے لیکن یہ دلیل اسوقت ٹوٹ جاتی ہے جب ہم بہت سے جانور ایسے بیان کرتے ہیں جنہیں نر اور مادہ میں بصورت ظاہری کوئی مابہ الامتیاز نہیں علاوہ ازیں طاقت وجہ فوقیت ہو بھی نہیں سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو طاقت حسن اس سے بہت زیادہ افضل و اشرف ہے +

مولانا صاحب نے چونکہ اس خاص معاملہ پر کچھ نہیں لکھا اس لیے ہم بھی اسکو خارج از بحث سمجھکر صرف ان واقعات پر بحث کرتے ہیں جو مولانا نے تحریر فرمائے مولانا کو نہ صرف یہ اعتراف ہے بلکہ انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ مرد عورت میں کوئی فطری حق نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ بآسانی نکلتا ہے کہ مذہب نے دونوں کو دنیا میں اس غرض سے پیدا کیا کہ وہ تعلقات میں اخلاقی حقوق قایم کریں اور زندگی پر لطف بنائیں۔

ایسی حالت میں جتنا فرض عورت کا ہے اتنا ہی مرد کا بھی کہ وہ اخلاقی حق قایم کرنے کی کوشش کرے مگر اس بیوی کے واسطے زندگی کا وہ لمحہ کیسا دردانگیز ہوگا جو علی الصباح نماز سے پہلے اٹھکر چولہے میں گھسی شوہر کے اٹھنے سے پہلے چار انڈے وغیرہ تیار کیئے۔ نہانے یا منہ دھونے کو پانی

گرم کیا اور اس ڈر کے مارے کہ کہیں اٹھ نہ بیٹھیں جھپاک جھپاک ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر، کھانا پکانے پر پل پڑی مارا مار کھانا پکایا دسترخوان بچھانا چاہتی تھی کہ باہر سے کسی نے آواز دی اور میاں صاحب جو یہ کہکر باہر گئے کہ تم کھانا نکالو میں آتا ہوں تو ساری دوپہر پوری شام اور آدھی رات نکل گئی مگر میاں ہی نہ پلٹے اس عورت کو کیا معلوم کہ میاں یار دوستوں کے مجمع میں اپنی آنکھیں سینک رہے ہیں اس کی آنکھیں دروازے ہی کو لگی رہیں عصر کی اذان کان میں آئی تو یہ خیال ہوا کہ صبح کا کھانا باسی ہوگیا دن بھر کے بھوکے تھکے ہارے آئیں گے ٹھنڈے چاول کیا آگے رکھوں جلدی جلدی سودا سلف منگوا مغرب سے پہلے پکا پکو راہ تکنے بیٹھ گئی بچے بھی پڑکر ڈھیر ہوگئے رات کا وقت ڈھنڈار گھر سنسان سماں دروازہ کھلا ہوا بیس کھٹکے ہزار خوف اتنی مجال نہیں کہ محلہ کی کسی عورت کو بلا کر بات کرلے یہ حکم نہیں کہ گھڑی بھر کو خود کسی کے ہاں چلی جائے آدھی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات اس ڈر سے کہ کہیں کھانا ٹھنڈا نہ ہوجائے انگیٹھی میں کوئلے دہکا۔ کھانا لیے بیٹھی رہی اتنا بڑا دن اور اتنی لمبی رات نیند کا جھوکا آگیا وہیں منڈگری مار پڑ رہی دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ میاں صاحب چرچر کرتے آدھمکے بیوی کو سوتا دیکھ تو آنکھوں میں خون اتر آیا آہستہ سے پکارا پہلی ہی آواز پر گھبرا کر اٹھ بیٹھی اٹھتا تھا کہ حشر ٹوٹ گیا اس میں تو اتنی قابلیت تھی ہی نہیں کہ وہ حق پیدا کرسکتی اور یہ پوچھ سکتی کہ کہاں رہے۔ ہاں میاں میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ وہ کمزور پر عمر بھر حکومت کرتے اور یہ فرماتے کہ "جب مجھے تم سے اتنا آرام ہی نہ ملا کہ کھانا کھلا سکو تو تمہارے ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوا"۔

ہم نہیں جانتے کہ کونسے مذہب کس اخلاق اور کیسی عقل نے اپنے بخت شوہر کو یہ حق دیا تھا کہ وہ بیوی سے آکر یہ توقع بھی رکھتا کہ اسکو کھانا تیار ملیگا۔

اسلام فریقین کی مساوات کو ان الفاظ میں ادا کر رہا ہے کہ "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم انکا لباس ہو"

اب رہا اخلاق اس سے بدتر اخلاقی گناہ اور اس سے ظالم اور جابر شخص دنیا میں کیا ہوگا جو ایک شریف بھولی بھالی لڑکی کو ایسی لڑکی کو جو عزیزوں کو دو پہر تھی نہ ماں باپ کے گھر کا کوڑا بحث کے وعدوں اور حسن سلوک کے اقرار پر حقیقی عزیزوں سے تڑا اپنے گھر لایا اور برسوں کی رفیق ہمدم کے ساتھ یہ قدر کی۔ گویا بیوی کا فرض صرف شوہر کی خدمت ہے

جسطرح انسان کی فطری حریت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اسی طرح یہ بھی قابل بحث نہیں کہ انسانیت کا اطلاق مرد اور عورت دونو پر یکساں ہے روڈلو جیکل سیر زیرین مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں فزیالوجی اور علم تشریح کی تحقیقات کا نتیجہ اس دعوے کا کافی ثبوت ہے پروفیسر مانجار اجوائی کا ایک زبردست عالم لکھتا ہے کہ مرد کتنا ظالم اور خود غرض ہے کہ اسنے علم تشریح تک میں اپنی مکاری کو ہاتھ سے نہ دیا اور یہ کوشش کی کہ عورت کو اپنے مقابلہ میں انسانیت کا ادنیٰ درجہ دے صرف اس لیے کہ اسکو ان حقوق سے محروم کردے جو وہ صرف اپنے واسطے مخصوص کرتا ہے اسکی رائے ہے جبتک کہ عورت کو فطری حریت سے پوری طرح متمتع ہونیکا موقع نہ دیا جائے۔ اسکی طبیعت کا فیصلہ کرنا یقینی غلط ہے۔

علماء انتھراپالوجی کے تمام علماء اس تحقیقات پر متفق ہیں کہ سوسائٹی کی ابتدائی ساخت میں مرد اور عورت دونو برابر تھے بلکہ کثر جگہ عورت افضل تھی

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ جو کامیابی رسالت میں قوۃ بازو رہیں انکی بابت پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ مجھے خدیجہ کی زندگی میں کبھی کوئی دقت ایسی پیش نہیں آئی جسمیں اسنے مجکو مدد نہ دی ہو۔

کم از کم مسلمان تو ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مرد کی بڑی سے بڑی دقت میں بھی عورت کی اعانت اتنی ہو سکتی ہے جتنی زیادہ سے زیادہ کسی مرد کی کیا اسپر بھی اکثر حضرات یہ ہی فرمائیں گے کہ عورت ناقص العقل ہے اور اس وجہ سے مرد کو خدا نے عورت پر افضل کیا ہے تاکہ وہ بیوی پر حکومت کرے اور اس کی حریت کو سلب کر دے۔

ہمیں نہایت ہنسی آتی ہے جب ہم ان بحثوں میں اکثر حضرات کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ قرآن صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ مرد عورتوں کے حاکم ہیں حالانکہ اس آیۃ کا مفہوم صاف ہے کہ چونکہ قوائے فطری کے اعتبار سے مردوں کے فرائض عورتوں سے زیادہ ہیں اس لیے وہ عورتوں کے بطور کفیل کے ہیں اور انکا فرض ہے کہ جو کچھ وہ کمائیں وہ بیوی کے آگے ڈالدیں تاکہ وہ اپنے فرائض باحسن الوجوہ انجام دے سکے ؛

خیر ابحث یہ تھی کہ قدرت نے نہ مرد کو عورت کا غلام پیدا کیا نہ عورت کو مرد کا - صرف تحصیل معاش کے واسطے مرد کے قوانہ نسبتہً مضبوط بنائے تھے لیکن ہندوستان نے اس طاقت سے یہ کام لیا کہ عورت پر حکومت کرنی شروع کر دی - عورت چونکہ فطرتاً باعتبار طاقت مرد سے کمزور تھی اور تحمل طبیعت میں ودیعت تھا دبتے دبتے غلاموں سے بھی بدتر ہو گئی لیکن یہ مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بجار سڑک پر پھر رہا ہو اور کسی آتی جاتی بڑھیا کو ایک ایسی ٹکر دے کہ وہ غریب چاروں خانے چت جا پڑے یا ایک بند کسی معصوم بچے کے ہاتھ سے

روٹی جھپٹ کر کوٹھے پر جا بیٹھے اور وہ کھا کر کھا کر ہاتھ جھاڑ کر سے - باقی - رہنے الخیری -

داغ فرزند اکبر

آج اپنے، پرائے، ہمسائے — کیوں نظر آ رہے ہیں گھبرائے؟
ایں! یہ خاموش کیوں ہیں بت کیطرح — کیا ہوا ان کو بیٹھے بٹھلائے؟
روح پرواز کر گئی شاید — ہائے اللہ کیا کیا جائے؟
طیبہ طیبہ! کدھر ہے تو؟ — تیرا بابا تجھے کہاں پائے؟
کیا تجھے ماں کی اب نہیں پروا — سو رہی ہے جو پاؤں پھیلائے؟
ابا کہہ کر گلے سے لپٹے کون؟ — کون گودی کو ہاتھ پھیلائے؟

وہ بھی کیا لوگ تھے! معاذ اللہ — اُٹھے اور زندہ مٹی گاڑ آئے
ایک میں ہوں کہ دل نہیں کہتا — لاش مٹی میں داب دی جائے
ناز سے ماں کی گود میں جو پلے — اُف وہ آغوش قبر میں جائے!
دیکھے اے خاکِ گور لعل تجھے — داغِ حسرت کلیجہ پر لائے

جب تری بھولی باتیں یاد آئیں — تیرے مکھڑے کا جب خیال آئے
صبر کیا آئے قلبِ مضطر کو — کوئی کسطرح دل کو بہلائے؟
ضبطِ گریہ میں کیا کروں ناصح — تیری آنکھوں میں اشک بر آئے
جو نہ واقف ہو ذوقِ گریہ سے — مفت کیوں آ کے میرا سر کھائے
داغ فرزند، کیا کہوں! اللہ — غیر کو بھی یہ دن نہ دکھلائے
ہائے کیا ہوک دل میں اٹھتی ہے — کاش سینہ سے دم نکل جائے!

"وہ چھٹے ہم سے جسکو پیار کریں
جبر کیونکر یہ اختیار کریں"

آپ ہنسکر ہنسائے گا اب کون؟ دل کا غنچہ کھلائے گا اب کون؟
تھی چمن کی بہار اُس گل سے دوسرا ویسا لائے گا اب کون؟
تھی اجالا اندھیرے گھر کا تو یہ خرابہ بسائے گا اب کون؟
آہ گل ہوگئی وہ شمع خوشی یہ دیا پھر جلائے گا اب کون؟
صبحکو آکے کھینچنی چادر نیند سے یوں جگائے گا اب کون؟
دیکھتے ہی مجھے لپٹ جانا دل سے یوں غم بہلائیگا اب کون؟
ہائے طفلانہ وہ رکوع و سجود وہ تماشے دکھائیگا اب کون؟
جانتی تھی تو رنج کے تیور آیا غصہ مٹائے گا اب کون؟
عمر ہی کیا تھی؟ دو برس اسمیں یہ ہوا نت دکھائیگا اب کون؟
تو بہری گود کر گئی خالی ماں کو تسکین دلائے گا اب کون؟
کانوں میں گونجتی تھی جو آواز دیسی بولی سنائیگا اب کون؟

"دل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں"؟

آہ میں آج ہوگیا برباد! دشمنو لو تمہیں مبارک باد!
آہ اندھیر ہوگئی دنیا کاٹے کھاتا ہے اب عظیم آباد
یاں کسی شے کا اعتبار نہیں اِس جہاں کی ہوا پہ ہے بنیاد
ہائے وہ عندلیب خوش الحاں جس کے دم سے تھا یہ چمن آباد
آسماں تجھ پہ کیوں نہ ٹوٹ پڑا لے چلا جب پکڑ کے اوصیاد
توڑی کچی کلی جو لے گلچیں کیا ملا اس سے اوستم ایجاد؟

دردِ دل کس سے میں کہوں جا کر — آہ لے جاؤں میں کہاں فریاد!
دے، نہ دے، دیکھ لیلے اے داتا، — تیرے سوگن ہیں اور سو تو آزاد
اے خدا تیری ہی امانت تھی — تو نے لے لی اگر تو کیا فریاد؟
کون دم مارے فیصلوں پہ تری — اپنی سر آنکھوں پر، جو ہو ارشاد
لب پہ آیا ہو حرفِ ناشکری — کی ہو بیتابیوں میں گر فریاد
ہم سے کیجو نہ باز پرس اس کی — درگذر کیجو اس سے رب عباد
کچھ تو اسمیں بھی مصلحت ہوگی — ہوگا کوئی نہ کوئی اس میں مفاد
ہے جو اعمال کی سزا مقصود — ہے جو تیری عذاب سے یہ مراد
یعنے دنیا میں جھیل لیں سب رنج — پرسشِ آخرت سے ہوں آزاد
جب یہی مصلحت ہے۔ یہ خوبی — صبر کر صبر اے دلِ ناشاد
بھول جا۔ یوں گناہ گار نہ کر — لب پہ آئے نہ شکوۂ بیداد
ہائے سب سچ ہے کیا کروں لیکن — دل سے جاتی کہاں ہے اسکی یاد

اشکِ خوں آنکھوں سے جو جاری ہے
بند کیا ہو۔ کچھ اختیاری ہے؟

دلِ لرزیں
محمد مسلم عظیم آبادی

---

(۱) وہ جو اپنی آباد اجداد کی تعریف کرتا ہے وہ اسبات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خود کوئی خوبی نہیں رکھتا

(۲) درحقیقت مالدار وہ ہے جو کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا اور غریب وہ ہے جو ہر شے کے حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے۔

(۳) ہر رنج کے بعد خوشی کا ہونا ضروری ہے۔

(۴) ہمیشہ خوش رہنا عقلمندی کی نشانی ہے۔

بہن کا خط بھائی کے نام

(مرقومہ پروفیسر مشتاق احمد زاہدی۔ بی۔ اے)

بھائی جان۔ آپ نے اپنے خیالات کا جو اظہار اپنے محبت بھرے خط میں کیا ہے میں بحیثیت ماں جائی ہونے کے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مگر آپ کی بہنوئی وہ خط پڑھ کے بہت زیر ہوئے اور کہنے لگے کہ "ظالم ظلم کو روا رکھنے کے لیئے ایسی ہی دلائل پیش کرتا ہے جیسی شیطان برائی کا کام کرتے وقت" جب چور چوری کرتا ہے تو وہ اپنے دل میں نادم نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہتا ہے کہ اگر میں چوری نہ کروں تو میرے ننھے ننھے بچے بھوکے مر جائیں۔ میرے باپ دادا کے نام پر دھبا آئے۔ میری برادری میں میری آبرو نہ رہے خدا مرنے کے بعد مجھ سے دریافت کرے گا کہ تو نے اپنے بچوں کو کیوں بھوکا مرنے دیا۔ اور جس پیشے میں ہم نے تجھے اتارا تھا اس میں کیوں نہ رہا۔ غرضکہ وہ اپنی چوری کرنے کو روا کرنے کے ثبوت میں وہ وہ دلائل لائے گا کہ سقراط کو مات کرے گا۔ میری طرف سے آپ اپنے بہائیصاحب سے پوچھیئے گا کہ آپ کی یہ دلیل تو صحیح ہے کہ پولیس یا قانون کا قائم رکھنا شریفوں کو چور سمجھنا نہیں ہے لیکن شریف اگر چوری کرنے لگیں تو پولیس انکو بخشنے والی نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پردہ وہ کام نہیں دیتا جو پولیس دیتی ہے پولیس اسلیئے جرائم کے لیئے ہے اور خواہ کوئی چور ہو یا نہو حفظ ماتقدم ضروری ہے۔ آپ کے بہائیصاحب پردے کو حفظ ماتقدم بتاتے ہیں۔ لیکن یہہ کس قانون نے انکو اجازت دیدی کہ اس حفظ ماتقدم میں عورتوں کو قید کر دیا

جائے۔ کیوں نہ یہ حفظ ماتقدم مردوں کے ساتھ کیا جائے جسطرح عورتوں کے بدچلن ہونے کا ڈر ہے اسیطرح مردوں کے بدچلن ہونے کا خطرہ ہے دونو اجناس میں سے ایک کو قید کر دیا جائے۔ آپ کے بھائی صاحب عورتوں کو قید کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مردوں کو پردے میں بٹھانا چاہیئے۔"

کیا عورتوں کو پردے میں بٹھانے سے مرد اپنی بدذاتی سے باز آئے عورتوں کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی مگر مرد تو اُن کے پاس پہنچ سکتے ہیں اور پہنچتے ہیں خواہ عورتوں کا لباس پہنکر اور ڈولی میں بیٹھکر کیوں نہ جانا پڑے چور کو سزا دی نہیں جاتی اُلٹی اُس شخص کو سزا ہوتی ہے جس کے ہاں چوری ہوئی ہو کہ تو نے کیوں اپنے مال پر قفل مضبوط نہیں لگایا۔ شہر والوں کے لیے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ اپنا مال و اسباب مقفل کر کے رکھدیں نہ کچھ پہنیں نہ کچھ برتیں ننگے پھریں اور بھوکے مریں اسوجہ سے کہ شہر میں چور ہیں چوروں کو نہیں روکا جاتا۔ وہ دندانہ شہر میں لوٹ مار کرتے پھریں۔

مرد عورتوں کو بہکائیں دھوکا دیں اور پھر خود ہی عورتوں پر فتوے دیں کہ انکو پردے میں رکھا جائے اور مرد مزے اُڑاتے پھریں کیونکہ وہ مرد ہیں چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ کھائیں اور غرائیں

اگر عورتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنی خوبصورتی سے مردوں کو لبھاتی ہیں اور اشتعال طبع دلاتی ہیں اس لیے انکو مردوں کی نظر سے دور رکھنا چاہیئے تو معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ عورت نما غیر جنس کو بھی پردے میں بٹھانا چاہیئے۔ کمسن لڑکے کم سے کم سولہ برس کی عمر تک پردے میں بٹھائے جانے چاہئیں۔ آپ کے بھائی صاحب اس کے جواب میں شاید یہ کہیں گے کہ اگر لڑکوں کو پردے میں بٹھایا جائے گا تو وہ کمزور

ہو جائیں گے۔ انکی صحت خراب ہو جاے گی وہ دنیا کے کاروبار کے لائق نہ رہیں گے یہ اُنکا فرمانا بجا۔ لیکن خواہ وہ کمزور ہوں۔ بیمار ہوں یا مر جائیں لیکن چونکہ ان کی عصمت بچانی سوسائٹی کا پہلا فرض ہے اس لئے اُن کی کسی تکلیف کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ انکو فوراً چوڑیاں پہنا کر عورتوں کے ساتھہ پردے میں داخل کر دینا چاہیئے۔ آپ کے بھائیصاحب اس خیال پر بہت ہنسیں گے اور مجھے باولا کہیں گے اور کہیں گے یہ کسطرح ممکن ہے کسیطرح آزاد دنیا ان عورتوں کو پردے میں رکھنے والو پر ہنستی ہے انکو باولا کہتی ہے اور ان پر افسوس کرتی ہے کہ یہ اس ایک موہوم خیال کے پیچھے جس کی کامیابی نامعلوم ہے۔ اپنی نصف آبادی کو برباد کر رہے ہیں اور اپنی آیندہ نسلوں کے حق میں کانٹے بو رہے ہیں"

عورت کی عصمت کی محافظ پتھر کی دیواریں یا مرد کی نگہبانی نہیں ہو سکتی اسکی حفاظت صرف عورت کا دل کر سکتا ہے۔

مثل مشہور ہے رہے تو آپ سے . . . . . اُس مرید شک جادوگر کا قصہ طوطا کہانی میں کس نے نہ پڑا ہوگا جو ہاتھی بنکر ہر وقت اپنی بیوی کو اپنے اوپر لیئے پھرتا تھا اور ایک منٹ کے لیے اپنے سے جدا نہ ہونے دیتا تھا اسپر بھی اُس عورت کے ساتھہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ پردہ ایک موہوم سی ہے جسکو عصمت کی حفاظت کے ڈھکوسلے پر قایم کر رکھا ہے"

اُن کا تو پھر لکچر شروع ہو گیا اور خدا جانے کب ختم ہوتا۔ لیکن میں یہ کہکر اُن کے پاس سے اُٹھہ گئی کہ تم تو نیچری ہو۔

بھائی آپنے سچ کہا ہے۔ یہ نیچری مرد تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم عورتوں کو تو پردے سے باہر نکال دیں اور خود پردے میں بیٹھہ جائیں۔ اِن کا

یہ حال ہے کہ کہیں آنا نہ جانا ہر وقت گھر میں گھسے رہتے ہیں اور مجھے نصیحتیں کرتے رہتے ہیں کہ عورت نے اپنا وقار بہت گھٹا لیا ہے۔ اور مرد سے بہت دب گئی ہے۔ اور بغیر عورت کے اُٹھے کام نہ چلیگا۔ ورنہ ہم جیسے حقوق نسواں کے حامیوں پر مدعی سست گواہ چست کی مثل صادق آتی ہے بھائی جان عورت کی عقل تو گدی پیچھے بتاتے ہیں مگر میں آپ کے بہنوئی صاحب کی عقل پر حیران ہوں کہ اُن کا مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اُن کا سامنا کروں۔ اُن سے نہ دبوں بازاروں کی سیر کرتی پھروں۔ اور مردوں کی طرح جو میرا جی چاہے کروں۔ یہ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں اگر ایکدن میں اُن کی نصیحت پر نہ عمل کروں تو حضرت خود ہی گھبرا جائیں۔ بھائی جان۔ آپ اُن باتوں سے نہ گھبرا جائیگا۔ انکو یہ ایک مرض ہے۔ کہنے دیجے۔ اُن کے کہنے سے ہم پر یا آپ پر کچھ اثر تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہم کوئی ... تھوڑا ہی ہیں جو ایسی باتوں میں آجائیں گے ... جنھوں نے اپنے بچوں کو مذہب چھوڑ کر انگریزی تعلیم ہی دینی شروع کردی۔ ہم نے نہ اُسپر عمل کیا۔ نہ اسپر کریں گے کم سے کم شروع میں تو نہ کریں گے۔ جب دنیا بے پردہ ہو جائیگی۔ اور دوسروں کی عورتیں مردنما ہو جائیں گی تب دیکھا جائے گا۔ اُسوقت تک کون جیتا ہے۔ بھائی جان آپ ہراساں نہوں۔ ہمارے جیتے جی تو پردہ اُٹھتا نہیں۔

آپ کی بہن

مال دنیا کا نہیں ہے تو جہاں میں مستحق ہو وہ دولت یا عمارت یا زمیں کا ہر طبق
تجکو آبادی دنیا سے فقط اتنا ملا ہے ترے قد کے برابر اس زمیں میں تیرا حق

(ترجمہ قول حضرت علیؓ) عزیز لکھنوی

اشاعت اسلام

چند سال سے بنارس میں ایک انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے منعقد ہوئی ہے جس کے اغراض و مقاصد اسلام کے نمایاں واقعات پر فلسفیانہ نظر ڈالنا اور اون خیالات کی تردید جو اعتراض کی حیثیت سے اسلام پر وارد کیے جاتے ہیں چنانچہ اسکے ۱۵-۱۶-۱۷-اپریل ۱۹۱۱ء کو یہ جلسہ نہایت مہتم بالشان طریقہ سے بنارس میں منعقد ہوا قریب قریب اکثر طبقہ اور مذہب کے لوگ اس میں شریک تھے آخری جلسہ میں نیظم پڑھی گئی جس سے حاضرین میں ایک نہایت جوش و خروش پیدا ہوا

ہے بنارس میکدہ اک رند دُردِ شام کا — دیکھنا ہے صبح تک منظر طلائی جام کا
ہاں یہی تو وقت ہے دورِ مے گلفام کا — دوڑتا ہے پرتا ہے رگ رگ میں لہو اسلام کا

انجمن میں ختم یہ وقتِ طرب انگیز کر
عقل کے دریا ذرا ہاں اپنا دھارا تیز کر

محفلِ ملت میں پیہم دورِ ساغر چاہیئے — عقل کہتے ہیں جسے ساقی وہ جوہر چاہیئے
اور ہلکی سی شرابِ خواب آور چاہیئے — مجکو روحانی تعقل بندہ پرور چاہیئے

تاکہ دکھلا دوں جہانکو اون حقائق کا اثر
جنّتیں ہوں ذوق و وجداں کی تری پیشِ نظر

کیا یہی شک فلسفہ مغرب کا پڑھکر چاہیئے — خونِ فاسد جوشِ زن ہے ایک نشتر چاہیئے
اب ہدایت کو کوئی اعجاز گستر چاہیئے — ہیں پیام اُن کے بہت سے اک پیمبر چاہیئے

کیا فرائض ہیں ہمارے باخبر ہو جائیں ہم
اور دل سے بندۂ پیغام بر ہو جائیں ہم

ہوشیاری ہاں خبردار اب کہ غفلت ہے ہمیں — بے ترے مشکل بہت قطع مسافت ہے ہمیں
دشت غربت میں تری اے خضر حاجت ہے ہمیں — عقل کہتی ہے پیمبر کی ضرورت ہے ہمیں

طلعت شب کو ہے خواہش ایک شمع نور کی
ہے کلیم اللہ کو حاجت چراغ طور کی

کیوں الٹتا ہے زمین و آسمان کے تو طبق — کیا نہیں واضح ہوا اب تک یہ تجھ پر امر حق
دیکھ بتلاتے ہیں یہ تاریخ کے رشن ورق — جب لیا ہر قوم نے اپنے پیمبر سے سبق

دین کی عزت ملی دنیا کو بھی حاصل کیا
وسوسے جو ذہن میں آئے اڑا دینے باطل کیا

کب ہوا اسلام رائج قوت شمشیر سے — بلکہ اخلاق حسن سے صلح جو تدبیر سے
موعظہ سے پند سے الہام سے تقریر سے — نعرۂ تہلیل سے اور نعرۂ تکبیر سے

باطنی تھی اک کشش اندر کے دل پر جوش میں
جذب روحانی تھا اندر کی کوشش خاموش میں

واعظ اسلام کے اخلاق ہیں سب آشکار — کافروں سے کیا کیا برتاؤ بعد از کارزار
تھا ہر اک مفتوح سے اوسوقت یہ قول و قرار — یا وہ جزیہ دے کرے یا دین احمد اختیار

قوت شمشیر اگر تھی کیوں کیا مختار انہیں
اختیار جزیہ حضرت نے دیا بیکار انہیں

تو ہی کہدے منصفانہ اے عرب کی سرزمیں — سختیاں تھیں پیمبر رسول اللہ نے کیا کیا سہیں
ہوگئی جنبش تبھی اور کانپ اٹھا عرش بریں — کیسے استقلال سے تجھکو کیا زیر نگیں

ذرہ ذرہ کو ترے مہر منور کر دیا
جھولیوں میں تھی جو پتھر اونکو گوہر کر دیا

یہ سمجھ لو ہو بیاں کیا اوسکا خلق دلپذیر — جسکا ہے قرآن شاہد اسکا اخلاق کا گنج خطیر

۴ بادشاہوں کا تہنیت اور فقیر کا فقیر + تمازت نے میں خدا کی سلطنت کا جو سفیر + دل کا ہر جذبہ نگاہ ہو سے نمایاں ہو گئی + آنکھ بھر کر جسکو دیکھا وہ مسلماں ہو گیا +
(میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی)

مسٹر ابلیس

نمبر (۱)

وہ شیطان علیہ اللعن نہیں جو پرانے زمانہ میں لاحول کے وزوں سے دُم دبائے گوشہ گوشہ چھپتا پھرتا تھا، جو اکثر منڈے ہوئے سر در ازریش اور اُٹنگے پائجامہ کے ساتھ تقدس کا روپ بھرے ہوئے مسجد کے ملانوں کے دل میں رات کی روٹی کی فکر پیدا کر کے نمازِ عشا کا خیال بھلا دیتا تھا: نہیں وہ نہیں۔ بلکہ وہ ابلیس جو نہایت کامیابی اور عیش کے ساتھ گذار رہا تھا، جو ہر سوسائٹی میں بلا روک ٹوک شامل ہوا کرتا تھا اور جو آئے دن نت نئی رنگتیں بدل کر اپنے حلقہ کامیابی اور دائرۂ فتح کو بڑھاتا جاتا تھا!

عقل کا فرشتہ کہتا ہے کہ یہ ابلیس ہشتادم ہے: اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ قدرت کا واضع قوانین زمانہ کی رفتار اور ضروریات کو دیکھ کر، کم و بیش ہر صدی میں، ایک نئے ابلیس کے ہاتھ میں عنانِ شیطنت دیتا رہتا ہے!۔ اس کی عمر اور اس کی صورت؟ کچھ نہیں، اور سب کچھ! وہ اپنی قوت ابلیسی سے۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے لیے تمام شیاطین قدرت کیطرف سے عطا ہونے والی قوتِ ابلیسی سے۔ آن واحد میں جس صورت اور جس سن کا چاہے نظر آسکتا ہے!

مسٹر ابلیس نے۔ ابلیس ہشتادم نے جو اپنا نام بغیر مسٹر کے استعمال کیئے جانے کو سخت ہتک سمجھتا تھا اپنی توجہ، بیشمار ذریات کیطرف۔ دنیا کے

چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ذریات الشیاطین کیطرف۔ مائل کی، آناً فاناً، آنکھ بند کرتے ہی اُسے اپنی قوت پر تلبیس کی مدد سے۔ ہیولوگراف وائرلس ٹیلیگرافی، شعاع نور و برق تاباں، باد صرصر و تخیل دماغی، ان سب سے بدرجہا تیز اور سریع السیر قوت کی مدد سے، معلوم ہو گیا کہ اُس کی ذریات اپنا مشکل کام عقل رکھنے والی انسان کی آنکھ میں اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا دکھانے کا مشکل کام۔ نہایت آسانی کے ساتھ انجام دے رہی ہے! یہہ دیکھ کر اُسے جسقدر فرحت، جسدرجہ مسرت، ہوئی اُس کا اندازہ یا تو وہی بازیچۂ اطفال کا تماشا دیکھنے والے کارپردازانِ قدرت کر سکتے ہیں یا خود مسٹر ابلیس ملعون کا دل۔ جو لانگاہ خباثت دل۔ اچھی طرح جانتا ہوگا!

مسٹر ابلیس کی موجودہ کامیابی مُسلّم، اُس کی روز افزوں ترقی تسلیم شدہ، لیکن اُس کارخانۂ دنیاوی کے فانی ہونیکا خیال، ایک ناقابل بیان خلش پیدا کرنے والا کانٹا تھا جو رہ رہ کر کھٹکا کرتا تھا! یہہ ہی بے چین کرنے والا خیال ہر موقعۂ مسرت پر، دلِ تزویر میں کسی نئے شکار کے پھنس جانے سے پیدا ہونیوالی عارضی مسرت کے موقعہ پر، مسٹر ابلیس کے دل و دماغ کے ساتھ، مسکن شیطنت دل و دماغ کے ساتھ، قدرت کے زوردار اور بے پناہ طمانچۂ غیبی کا کام کیا کرتا تھا! اسوقت بھی، خوش ہوتے ہوتے، دفعتاً وہی خیال۔ اس تمام کائنات کے ایک نہ ایک دن درہم و برہم ہو جانے کا خیال۔ مسٹر ابلیس کے تخیل مسرت و کامیابی پر بجلی کیطرح گرا، اور وہ چونک پڑا! وہ تھرا گیا، اور وہ کانپ اٹھا!

اس غیر معمولی اور اچانک خلش کا فوری علاج، حسب معمول اُس نے سامنے رکھی ہوئی بوتل سے۔ ہاؤس آف لارڈ کے لیبل والی سیاہ بوتل

کیا! آتشِ سیال کے ایک کناروں تک بھرے ہوئے گلاس نے اُس کے دفعتہً پژمردہ ہو جانے والے دماغ کو پھر از سرِ نو مشتعل کر کے نمونۂ دوزخ بنا دیا اور وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا "اب تو آرام سے گذرتی ہے اعاقبت کی خبر....." بس صرف اسی حرف تک پونچکر وہ خاموش ہو گیا! کیونکہ وہ اُس کے بعد کا حرف۔ قادرِ مطلق کا نام جسکی ایک صفت قہار بھی ہے اپنی زبان سے نکالنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا!

فوراً اُسے کسی خاص کام کا کسی پہلے سے سوچی ہوئی شیطنت کا خیال آیا، وہ کھڑا ہو گیا اور چلنے کی تیاری کرنے لگا! سب سے پہلے اس نے اپنی طوقِ لعنت کو جو آٹھ ہزار برس سے یکے بعد دیگرے ہر فرمانروائے شیطنت کے گلے کا ہار ہوتا آتا ہے نہایت احتیاط کے ساتھ چھپایا؛ اپنے متقدمین کیطرح اونی دبدیا شالی رومال باندھ کر نہیں چھپایا بلکہ چمکدار اسفید براق ڈبل کالر لگا کر چھپایا: پھر سر سے پانوں تک انگریزی لباس پہنا اور نکل کھڑا ہوا!

اب وہ ہندوستان کے مشہور شہر..... کے ایک بازار میں جا رہا تھا! ایک خوبصورت ہلکی ہلکی سیر و لیٹ جسے ایک سُرنگ عرب اُڑائے لیے جاتا تھا اُس کے پاس سے گذری، اس میں ایک جوان آدمی اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے اور ہیٹ لگائے رکھے ہاتھ میں لیے نہایت تمکنت کے ساتھ بیٹھا تھا مسٹر ابلیس نے پہلی ہی نظر میں معلوم کر لیا یہ حضرت کوئی جج صاحب ہیں؛ لیکن اُس نے کچھ زیادہ التفات نہیں کیا؛ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ ان حضرت پر ایک دیو خبیث مسٹر ابلیس کی ذریات میں سے ایک خاص پلید پہلے سے ہی مسلط تھا! ایسے مغرور حضرات کو وہ اپنا خاص الخاص، تابعِ قوت پر ابلیس سمجھتا تھا! اگر وہ گے گروہ، کوئی بگی میں کوئی گھوڑے پر

کوئی موٹر میں کوئی بائیسکل پر، اس بھرے پُرے شہر کے بازار میں اُس کے پاس سے گذر رہے تھے اور کوئی فرد بشر اُس کی ذریات کے حلقۂ تزویر اور دائرۂ فریب سے باہر نظر نہیں آتا تھا! اس لیے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود تکلیف گوارا کرتا، اور جو پہلے ہی سے اُس کے ادنےٰ کارپردازانِ شیطنت کے آگے گردن جھکائے ہوئے تھے، اُن پر کوئی سیہ چلاتا، یا اُن کو رام کرنے کی کوشش کرتا!

مسٹر ابلیس سگار کے دھوئیں سے ہوا میں چھلّے بناتا ہوا برابر آگے بڑھے جا رہا تھا اور اپنے معائنہ میں۔ اپنی ذریات کے اہم اور ذمہ داری کے کام کے معائنہ میں مصروف تھا: یہ اُسکا ہمیشہ کا معمول تھا۔ وہ اسیطرح گشت لگاتا اور جہاں کہیں اپنے ماتحتوں کو۔ اپنی قوت تلبیسیہ کی عملی مشین کے چلتے پُرزوں کو غلطی کرتے یا کاہلی میں مبتلا، بلکہ یوں کہیئے کہ غلطی سرزد کرانے میں ناکامیاب یا کاہلی پیدا کرنے میں سُست۔ پاتا، تو فوراً اصلاح کر دیتا، ڈانٹ دیتا اور تاکید کر دیتا!!

یوں تو دنیا کا ہر نیک نہاد شخص بالعموم، مسٹر ابلیس کا مدِ مقابل؛ اور مسٹر ابلیس اُس کے پھانسنے یا آزار دینے کے درپے! لیکن جو بُغض اور دشمنی مسٹر ابلیس کو بالخصوص مسلمانوں سے تھی وہ حد سے بھی تجاوز کر گئی تھی؛ اور کیوں نہ تجاوز کر جاتی، جبکہ وہ جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اُس کے متقدمین کو۔ گذشتہ فرمانفرمایانِ خباثت کو مع اپنی بیشمار لشکر ذریات کے فاش شکستیں ہوئی تھیں، اور صدیوں تحت الثریٰ تک بھی گوشۂ عافیت و اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا! مگر ایک عرصۂ دراز سے وہ اسطرف سے بھی مطمئن تھا: اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو۔ موجودہ مسلمانوں کو۔ اُس نے

اور اوس کی ذریات نے، ایک ایسی ناگفتہ بہ حالت تک پہنچا دیا تھا کہ وہ گردن جھکائے، آنکھیں بند کیئے، پستی کے غار کیطرف بڑھے جاتے تھے۔!!

اب پھر ایک موٹر مسٹر ابلیس کے برابر سے گذری: اس میں دو تین ہندوستانی عورتیں جلوہ افروز تھیں، جن میں غالباً دو ہندو، ایک یہودی، اور ایک مسلمان تھی!! یہودی لڑکی بقیہ تین سے عمر میں کم مگر حسن میں بدرجہا زیادہ تھی! یہ موٹر کچھ آگے بڑھکر ایک دوکان کے سامنے رکی اور مسٹر ابلیس بھی فوراً اُس کے پاس پہنچکر ٹھٹک گئے! یہ سب کی سب کچھ سامان دیکھنے بھالنے میں مصروف تھیں، اور تمام راہگیر جو پاس سے گذرتے اُن کے دیکھنے کے لیئے ٹھہرتے جاتے تھے!

کیوں ٹھہرتے جاتے تھے؟ اس لیے کہ کمسن یہودی لڑکی شعلہ جوالہ یا برق بلا۔ اپنے تبسم زیر لب سے، غنچۂ ناشگفتہ کی تصویر کھینچ رہی تھی: اُس کی سیاہ اور کمر تک پہنچ کر ہوا میں لہرانے والی زلف دراز۔ عمر تسلسل اور لیلۃ القدر اپنے پیچ و تاب سے۔ مرگ سبنل کی خبر دے رہی تھی: اُس کی شوخ اور چمکتی ہوئی آنکھیں، اپنی نگاہوں سے مست اور شرر نگاہوں سے عقل و ہوش کے فرشتہ کو فنا فی العشق کا چھلکتا ہوا جام پلا رہی تھیں: اُس کی پیوستہ اور گنجان بھنویں خنجر آبدار و کمان سخت۔ مژگانِ خمیدہ کی مدد سے چنگل شاہین تقدیر کی مدد سے۔ مرغ تدبیر کا دل نہایت آسانی کے ساتھ اُچک لیتی تھیں! مختصر یہ کہ، وہ کمسن نازنین اپنی خوبصورت ناک سے چشمۂ نور کی موج سے، اپنے نازک ہونٹوں سے۔ آبِ حیوان کے مُنہ میں پانی بھر لانیوالے ہونٹوں سے، اپنے صاف اور سرخ سُرخ رخساروں سے۔ رشک وہ حور و غلمان گلاب کی پکھڑیوں سے، اپنی نازک اور تنگ کمر سے۔ تکلیف دست اندازئ شوق کی

زندہ تصویر سے؛ اور سب کے آخر میں مگر سب سے زیادہ۔ اپنے علاج قوت بصارت سے؛ دیکھنے والوں کے دلپر، اور دل سے زیادہ ایمان پر، وہ وہ بجلیاں گرا رہی تھی کہ مسٹر ابلیس خوشی کے مارے آپے سے بے آپے ہوئے جاتے تھے۔

مسٹر ابلیس کو ایک حسین کمسن لڑکی سے جو بے پردگی کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ جو اپنے حُسنِ زاہد فریب کے نظارہ سے نوجوان طبیعتوں کے دل میں شعلۂ جہنم مشتعل کر دیتی ہو۔ خواہشاتِ بد اور شرورِ نفس کی بیحد امید تھی! اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ خاندانِ ابلیسیہ کے بانی نے ملعون اوّل نے اپنے انتقام کی آگ کا شکار، ایک عورت ہی کے ذریعہ سے، آدم کو بنایا تھا!

وہ نہایت خوش ہوتا تھا، اُس کی قوتِ تلبیس جوشِ مسرت میں کرۂ نار بجاتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ بے پردگی کی وَبا مسلمانوں میں بھی پھیل رہی ہے؛ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اس خنجرِ عصمت کش کے سامنے اِسلام کا طبقۂ نسواں۔ دامِ تزویر اور بدکاری کے جال میں کبھی نہ پھنسنے والا طبقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی راستبازی اور نیک نیتی کے ہتیار ڈال دیگا اور اپنے مردوں کو مسٹر ابلیس کا شکار بنانے میں قوتِ مقناطیسی اور کششِ اجسام کا کام دیگا!!

موٹر چلا اور وہ کیوپڈ کی نورِ نظر یہودی لڑکی جو قامتِ دلنواز میں قیامت سے بھی ایک قدِ آدم زیادہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں کی نظروں سے حسن عالمگیر کی شمع پر گرنے والے انسانی پروانوں کی نظروں سے۔ ہلالِ عید کیطرح غائب ہوگئی؛ مسٹر ابلیس اس حسنِ گلوسوز کے اثرِ بد کا اندازہ کرتا ہوا، پردہ کے خیال میں منہمک، چل نکلا! پردہ اور بے پردگی کا

مقابلہ کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ سب سے پہلے اُسے پردہ کے رواج کی بیخکنی کرنی لازمی ہے: اُس نے طے کرلیا کہ وہ طبقۂ نسواں کے متعلق، اپنی ذریات کی تمام کوششیں پردہ کے برباد کرنے پر عصمت آباد کی مضبوط فصیل کے منہدم کرنے پر لگادیگا، اور ضرور لگادیگا!!

اب وہ ایک کوٹھے کے نیچے سے گذر رہا تھا، اوپر کے کمرے میں سے گانے اور ساز کی آواز آرہی تھی! مسٹر ابلیس نے یہاں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا یہ فرقہ تمام خوبیوں کو خواہشاتِ نفسانی اور مبلغ علیہ السلام پر سے قربان کردینے والا فرقہ، مسٹر ابلیس کا موردِ عنایاتِ خاص تھا! صرف یہ ہی وہ گروہ تھا جس کے توکل اے الشیطان پیشہ کا کام۔ غارتگری اور تباہی کا کام۔ سالانہ رپورٹ میں، مسٹر ابلیس کی تمام ذریات کے پرتلبیس کامیابی کے برابر نظر آیا کرتا تھا! وہ آگے بڑھے گیا اور گانے کی۔ قوت سامعہ کے ذریعہ سے دل و دماغ کو بندۂ جذبات نفس بنانے والے جادو کی سُریلی اور دلکش آواز برابر آتی رہی: فوراً مسٹر ابلیس نے کسی عمدہ شعر پر جو ہوا میں گونج کر اُس کے کان تک پونہچا تھا "مرحبا! آفریں!! صد آفریں!!! بیشک کہا شعر نہایت عمدہ تھا؛ اور مسٹر ابلیس اپنی خبث بھری طبیعت اور پُرفن دماغ کے زور سے اُس شعر کے ایسے معنی تراشتا تھا جو شعر کے مصنف کو۔ شاعر مرحوم کو اگر سُنائے جاتے تو غالباً وہ تمام عمر کے لیئے شاعری سے دست کش ہوجاتا! جو کچھ بھی ہو مسٹر ابلیس اُس شعر کو بیحد پسند کرتا تھا، اور اب جبکہ وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا، جبکہ گانے کی دلکش آواز اُس کے کانوں تک نہیں پونہچتی تھی۔ اُس نے وہی شعر، شوق تلبیس اور اشاعتِ الحاد کے جوش میں خود گنگنانا شروع کردیا.....

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

انقلابِ تمدن

تڑپ، تڑپ، دل بیقرار تڑپ، اور ان صورتوں نیز خون کے آنسوؤں سے رو جنھوں نے، آبادی چھوڑ، جنگل بسائے، گئے اور ایسے داغ دیکر گئے، جو مدۃ العمر تازہ رہیں گے، عمر دنیا کہیں سے کہیں پونہچ جائے مگر انکی یاد دل سے نہ جائیگی، آئندہ الازمانہ ان کے نام آنکھوں سے لگائیگا اور یہ فانی دنیا ان کی ہستی پر فخر کرے گی،

راتیں اور دن، ہیں تو ویسے ہی، مگر! وہ نہیں ہیں، ختم ہوگئے وہ دن صبح ہوگئیں وہ راتیں، اور مٹ گئے وہ لوگ غدر ۵۷ء سے برسوں پہلے کا وقت ہے اور زندہ ہیں وہ صورتیں جن کے قدم سرزمین جہان آباد آنکھوں سے لگا رہی ہے دلی، بگڑ بگڑ کر بنی، اور بن بن کر بگڑی مگر پھر اس خاک سے ویسے لوگ نہ اُٹھے یہ عالیشان محلوں، اور پکی حویلیوں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کے گھر ہیں تو کچے دھانے اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، مگر پیسے پتے، صاف ستھرے، لیونڈر کا تو انہوں نے نام بھی نہیں سنا مگر چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو انکی سادگی مذاق کا پورا پورا پتہ دے رہی ہے۔

انکے دماغ مغربی ہوا کے جھونکوں سے آشنا نہیں ہیں مگر آنکھیں، کبھی کبھی، ایک آدھ صورت ایسی بھی دیکھ لیتی ہیں، جو انکو ششدر و متحیر بنا دیتی ہے، ان کی صورت ظاہری لباس پوشاک وضع و قطع نہ چندان دلچسپ ہے نہ دلکش، قبتہ دار ٹوپیاں۔ چنٹ دار انگرکھے، کمر میں پٹکے، ہاتھ میں عصا، جیب میں لمبے لمبے رومال، مگر، ان کے باطن پر کائنات

ہر ذرہ ورد و پڑھ رہا ہے، یہ وہ لوگ ہیں پابندی وضع جن کی گھٹی میں پڑی ہمدردی کے دودھ سے پلے، اور خلوص کے آغوش میں بڑھے، لباس تعلقات پر، قولاً و فعلاً، ایسے پھول برسا گئے، جن کی خوشبو سے آجتک زمانہ مہک رہا ہے۔

یہ بھولی بھالی صورتیں، یہ سیدھے سادے لوگ، جنہوں نے نمک کو، لون، اور چاقو، کو چکوا کہا، چند روز کے مہمان ہیں، کان، انکی آوازوں آنکھیں ان کی صورتوں، اور دل، ان کی، باتوں کو ترسیں گے ملکہ مغرب کی سواری کا غلغلہ بلند ہو چکا، یہ وہ سیتمن ہے جس کے آگے زاہد صد سالہ سجدے کریں گے، اسکی ادائیں متقیوں کے دل بھی لوٹ پوٹ کر دیں گی، انکی باتیں سنلو اور صورتیں دیکھ لو، پھر یہ کہاں اور تم کہاں، دیکھنا! دیکھنا! یہ پانچ برس کے دو چھوٹے ہوئے دوست ملے ہیں، سنو، سنو، ان کی باتیں سنو، اور یاد رکھو کہ محبت کا سکہ ان ہی کے دم تک تسلیم انسانیت میں چل رہا ہے، آگیا ہے وہ وقت، کہ مغرب کا دست شفقت اس تمدن پر پانی پھیر دے۔

ہائیں! خلیفہ بندو؟ ارے بھائی کلیجہ سے تو لگ جا، صورت دیکھے مدتوں ہو گئے، سنجھلے احمد بیگ کیا مرے وہ طبقہ ہی الٹ گیا، میاں لوی کالے کوسوں حیدر آباد پوچھے، سمندی کر، چچا امیر بیگ کی نظر کھا گئی، ہائے، بندو کیا کڑیل جوان اٹھا ہے، دہیان آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے، آبھائی ایک دفعہ اور مل، جی نہیں بھرا، ارے بنے ایک پانچ ہی برس میں ڈاڑھی بگلہ کا پر ہو گئی، وہ ٹونٹر قبضے کچھ بھی نہ رہے

بندو۔ آؤ میاں یوسف آڑے اجب سے نہیں کہتے کہ میں ہوں آڑے

تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ شہر کے شہر میں ہو اور اتنی خبر نہیں کہ بودی کو مرے تیسرا مہینہ ہونے آیا بیچارے کی ہڈیاں بھی گلکر خاک ہوگئی ہونگی کوئی ایسا ہی نصیبے کا دلی ہوگا جو دکن جاکر جیتا جاگتا پلٹا ہو تین کی سنا و نیاں تو ہم سن چکے ہیں بودی کا بڑا لڑکا تو تمہیں یاد ہوگا اُس نے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ سر اوٹھایا ہے کہ ماکو ناک چنے چبوا دیئے۔ دو ڈھائی آنے روز فقط چٹھے مٹھو نکو چاہیں وہ بیچاری مر کر صبح سے شام تک تین ساڑھے تین آنہ کی مزدوری کر کے اوس کا بھرنا بھرتی ہے۔ پرسوں پیسہ پاس نہیں تھا اسوقت کا جو نکلا ہوا ہے تو اب تک نہیں پلٹا سڑنوں کی طرح روتی پھرتی ہے صبح نماز دم دیکھتا کیا ہوں کہ کنڈی کھٹکھٹا رہی ہے میرا دل بھی دھکڑ دھکڑ کرنے لگا کہ یہ گھر دم خدا خیر کرے۔ اسکو گھر میں بٹھا کر جو نکلا ہوں تو یہہ وقت ہو گیا۔ پہاڑ گنج۔ تیلی واڑہ۔ صدر باڑہ شہر بہر چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلتا صبح سے نہار منہ ہوں اب کہاں ڈھونڈوں لوٹ کے جاتا ہوں تو خرابی اس بیچاری کو کیا منہ دکھاؤں گا اب یہ سنا ہے کہ بدر پور گیا سو بھائی وہاں جا رہا ہوں چھ کوس کی منزل ہے اور جھٹ پٹا ہو گیا۔ چلتے ہاتھ پاؤں میں جو کام ہو جائے اچھا پھر تو انکو کیڑے بھی نہیں کھائیں گے خدا دیکھتا ہے جو محبت بودی کے جیتے جی اُسکی اولاد سے تھی آج کے دم تک اسمیں فرق نہیں آیا میاں شتہ نہیں ناطہ نہیں مگر برابر کا یار تھا اسکی بیوی دھاروں روئے اور ہم چپکے بیٹھے سیر دیکھیں۔ تم سے ملکر جی خوش ہو گیا اب تو جانے دو اللہ چاہے صبح ہی آؤں گا +

یہ ہیں وہ دل، جو حاضر و غائب ایک، اور ظاہر و باطن یکساں، اس

جہالت پر علم سو دفعہ تصدق، اور ایسی، بدتہذیبی پر، تہذیب، ہزار بار قربان، مرے ہوئے دوست کی تصویر، جبتک زندہ رہے آنکھ کے سامنے رہے اپنا سکھ چین، عیش آرام اس کے بچوں پر نثار کر دیا، کیا لوگ تھے کہ رانڈوں اور یتیموں کو وارثوں کی موت بھلادی مر گئے مگر دضع کو ہاتھ سے نہ دیا جس سے جتنا لیے آخر وقت تک نباہ گئے، بیوقوف تھے یا جاہل جیسے بھی تھے اور جو کچھ بھی تھے۔ ایسے تھے، کہ یہہ آسمان جو مدتوں ان کے سر پر چھایا رہا، آج حسرت سے انکی قبر و پر رو رہا ہے، اور یہ زمین جو انکو کلیجہ سے لگائے پڑی ہے، باواز بلند یہ صدا دے رہی ہے کہ مادر گیتی کے پیارو، تمھارے بعد تم جیسی صورتیں نظر نہ آئیں +

ہندو اور آرٹے کی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہو گئے زمانہ سرعت کے پروں سے اڑا چلا جا رہا ہے، اور آناً فاناً نئے نئے انقلاب برپا ہو رہے ہیں، مگر یہ غنیمت ہے یہ وقت بھی ہے، کہ شرافت کے جوہر ہندوستانی تمدن میں اسی آب و تاب سے چمک دمک رہے ہیں۔

ملکۂ مغرب کا جہاز وسط سمندر میں اٹکھیلیاں کرتا چلا آرہا ہے اور مشرق اس شاہانہ جلوس کے انتظار میں چشم براہ ہے، دور کے ڈھول کے سہانے، بچہ بچہ نئے مہمان کے آنے کی تیاریاں کر رہا ہے، مگر فلک پیر جس نے سیکڑوں قومیں اور بیسیوں ملک تباہ و برباد کر ڈالے، ان کی ناتجربہ کاری پر ٹھٹھے مار رہا ہے اسکی دور بین نگاہیں تاڑ چکی ہیں، کہ مشرق آج جسکو ہنر سمجھ رہا ہے ایک سو ہی برس کے الٹ پھیر میں مغرب کی صحبت اس ہنر کو عیب اس مخمر کو ذلت اور اس وضعداری کو بیہودگی بنا دے گی +

وہی دن ہیں اور وہی لوگ، مگر کیسے؟ وہ محبت کا خاتمہ اپنے ساتھ کر جائیں گے، اور زمانہ جن کا خلوص قیامت تک نہ بھول سکیگا۔

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا! کرتہ میں تو گھنڈی تکمہ ہی ہے مگر اس جلتے بھلتے وقت میں کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے سر پر بوجھ ڈھوئے چلے آرہے ہیں، ان کی صورت دیکھ کر ہنسو مت۔ ان کے گن دیکھو اور پھر کہو کہ یہ کیسی صورتیں ہیں،

غریب تین چار آنہ روز کا مزدور ہے مگر پڑھنے والوں کا کلیجہ کٹے گا جب یہ سنیں گے کہ اپنی مزدوری چھوڑ کر، یہ گٹھری اُس بیوہ کے جو ہیں جس کے سر پر کوئی وارث نہیں، جو صبح سے بھوکی بیٹھی تھی جو آس تک رہی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مجھے جو لا دے تو پیس کر اپنا اور اپنے ننھے ننھے یتیم بچوں کا پیٹ بھر لوں۔

ذرا ان کا جواب بھی تو سن لو جب انہوں نے آواز دی ہے لو بہن اپنے جوے جاؤ تو وہ بھوکی پیاسی جو صبح سے اللہ اللہ کر رہی تھی اٹھکر دروازہ پر آئی اسکی آنکھ دعائیں دے رہی تھی مگر جب اس نے زبان سے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے احسان کی کیا بات ہے

"حق ہمسایہ ماکا جایہ"

لیجئے مغربی ملکہ آپہنچیں اُس وقت کو گذرے مدتیں ہوگئیں۔ اُنیسویں صدی کے دس برس نکل گئے اڑے اور بڑے میاں جیسی صورتیں کبھی کی چھپ چکیں، آج مغربی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہے۔ مگر

چشم بینا سے دیکھنے والوں۔ انصاف سے کہنا، دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا

عورتیں اپنے جوہر مغربیت پر قربان کر چکا اور آج وہ ناز کی وقت ہے کہ سوسائٹی ان بیسویں صورتوں کو اس بیت سے خارج بتا رہی ہے لیکن افلاق اور فنا دنیا کا ہر فرقہ یہ صدا دے رہا ہے کہ زنا

نوحہ

(ماخوذ از نظم انگریزی مطبوعہ دی اسٹوڈنٹ اڈنبرا)

اے دوست دم میں آہ کا تو ڈھیر ہو گیا — افسوس قہر ہو گیا اندھیر ہو گیا
رخشندہ تجھ میں اب شرر زندگی نہیں — وہ آب و تاب اور وہ تابندگی نہیں
سوز دروں نے پھونک دیا تجھ کو لا کلام — یہ رنج کی جگہ ہے۔ یہ عبرت کا ہے مقام۔
بے حس پڑی ہے خاک تری میرے سامنے — چھائی ہے مُردنی رخ تابندہ پر ترے
اب سرد و گرم دہر کا تجھ پر اثر نہیں — افسوس میرے حال کی تجھ کو خبر نہیں۔
تو مایۂ سکون دلِ بے قرار تھا — سچ تو یہ ہے کہ تو ہی مرا غمگسار تھا
نعم البدل بتا کہ کہاں تیرا پاؤں میں — اب ڈھونڈھکر کہاں سے بھلا تجھکو لاؤں میں
آزاد قید خانۂ ہستی سے کیا ہوا — تو میرے درد دل کی طرح لاپتا ہوا
لذت پذیر خندۂ لب نہیں رہے — جو لطف تجھ سے دل کو تھے وہ اب نہیں رہے

فرقت میں تیری کس کو کروں دل سے پیار ہائے
انمول و بے بہا تھا تو میرے سگار ہائے

محمد یٰسین

غزل

لطف کی آنکھ نے کیا دیکھا — ہائے کسی مصرف کا نہ رکھا
آنکھ ہے اور دیدار کی حسرت — دل ہے اور سوداغ تمنا
آج تک آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں — ہائے! وہ پیارا پیارا جلوہ
رسم نہ کرنا ٹھیک نہیں ہے — دیکھ ستا کر کچھ نہ ملے گا
آہ! ترے انداز تغافل — کاش مجھی کو صبر آجاتا

دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے — آنکھ اوٹھا کر دیکھ نہ لینا
شکوۂ غفلت کس سے کیجے — حرفِ شکایت کون سنیگا
زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے — کاش! ترا ارمان نہ ہوتا۔
صبر کبھی آیا ہے نہ آئے — حسبِ عادت بھول نہ جانا
آہ ہماری ناؤ کی حالت — موجیں حائل طوفاں برپا

آزاد! آپ اور قیدِ علائق
مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولےٰ

حضرت آزاد۔ سہارنپوری

بیاضِ ارشد۔ مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی وکیل بھوپال کی ابتدائی مشقِ سخن کا مجموعہ جو حضرت قیصر ایڈیٹر الحجاب بھوپال نے تیار کیا ہے

حضرت ارشد کا نام ادبی دنیا میں نیا نہیں ہے ان کے کلام سے اُردو کے اکثر مشہور رسالے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ بیاض ملک و قوم میں وقعت سے دیکھی جائیگی اور شائقینِ سخن حضرت ارشد کی اس محنت کی دل کھول کر داد دیں گے ٭

کاغذ لکھائی چھپائی خاصی قیمت درج نہیں غالباً ارشد صاحب سے مل سکتی ہے۔

تعلیم و تربیت

تمدنی مسائل میں تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے جس کے متعلق زبان و قلم نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے تاہم ہندوستان میں اوس کا اثر جیسا چاہیے ویسا نہیں ہوا۔ حامیان تعلیم جو عبارت ہے والدین یا اون سرپرست طلبا سے جنھیں تعلیم کے باب میں غور و فکر کا حق حاصل ہے اونہیں محسوس کرنا چاہئے کہ اس باب میں اون سے متعلق طلبا کے اون پر کیا حقوق ہیں اور یہ ریمارک محض اون والدین پر ہے جو اپنے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ علم کے اصلی ذائقہ کا ذوق شناس بنانا چاہتے ہیں۔ جن ماں باپوں کے خیالات یہ ہیں کہ اون کی اولاد ایک اعلیٰ نمونہ اون کے خاندان کے لیئے بنے۔ اون کے لیے ضرورت اسبات کی ہے کہ بچوں کی تعلیم اور بچوں کے اخلاق عادات کا امتحان لیا کریں بچپن ہی سے بچوں کا نشو و نما اور اون کا اٹھان اون کی نظر میں رہے۔ اور اون کی کسی غلطی پر گرفت کا موقع اونہیں ڈھونڈھنا نہ پڑے۔ بلکہ خود بخود اپنے سامنے آجائے غالبًا کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ والدین اپنے بچوں کے ہر فعل کے ذمہ دار ہیں اور اون کا سچا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کا چال چلن بچپن میں ایسا عمدہ بنا دیں کہ مرتے وقت تک اون کے بچے اوسپر قایم رہیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اون کی صحت کا بھی خیال رکھیں اور ساتھ ہی اون کے دلوں میں بخوبی اسبات کو بٹھا دیویں کہ وہ صرف والدین کی اطاعت کے واسطے ہی نہیں ہیں بلکہ اون پر خاص و عام کے حقوق اور ملک کی

ذمہ داریاں ہی ہیں جنکا سامنا اونکو اپنی آیندہ زندگی میں کرنا پڑے گا۔
اِن سب کے بعد بچے خود اس امر کے جوابدہ ہوں گے کہ لاپروائی یا اعتنائی
قلب سے وہ اپنے فرائض متعلقہ کو ادا کر رہے ہیں۔ بہت سے والدین اپنے
بچوں کو تین چار سال کی عمر میں ناسمجھ اور ناقابل تعلیم و تربیت سمجھکر اون کی
تعلیم و تربیت کی طرف سے لاپروائی کرتے ہیں۔ مگر یہ بات قابل افسوس ہے
کیونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اسبات کا مشاہدہ نہیں کرتے کہ بچہ پیدا
ہوتے ہی اپنی تعلیم خود شروع کر دیتا ہے۔ اور ماں باپ کی نظر اور آواز
کا لہجہ ہر ایک شے اوسکو اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔ جو اوس کے
آیندہ زندگی پر بہت بڑا اثر پیدا کرتی ہے دیکھو عقلمند جاپانی مائیں اسبات
کو محسوس کرتی ہیں اور بچہ پیدا ہوتے ہی اوس کی تعلیم و تربیت
شروع کر دیتی ہیں۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کی جاہل مائیں
اسبات سے بالکل بے خبر اور لاپرواہیں۔ اور جب کبھی تعلیم کا ذکر آتا ہے
تو کہتی ہیں۔ کہ چشم بد دور ابھی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھ لکھ لیں گے جلدی کیا ہے
خدا عمر تو دے۔ اور جب صاحبزادے خدا خدا کر کے آٹھ دس برس کے
ہوئے تو میاں جی نوکر ہوئے اور بچہ کی تعلیم بعد ادائے قاعدہ سے
شروع ہوئی۔

اسیطرح شروع سے جو چال چلن بچہ کا ہو گیا۔ ہو گیا۔ خواہ اچھا ہو یا
بُرا ہو جس افتاد پر عہدہ سے عہدہ صحبت ہی اپنا خاطر خواہ اثر نہیں جما سکتی
والدین کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کی قابلیت کو سمجھیں اور دیکھیں کہ اونکو کس
مضمون سے زیادہ رغبت ہے۔ اور کس مضمون میں وہ ترقی کرنے
کے قابل ہیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ صحبت بھی چال چلن پر بہت بڑا

کرتی ہے۔ اِس لیئے اونہیں بُری صحبت سے بچاویں۔ ہم تین چار سال کے عمر تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ماکو قرار دیتے ہیں کیونکہ اسوقت کا چال چلن و سیرت ایسا نقش ہو جاتا ہے کہ بغیر تبدیلی کے ہمیشہ قایم رہ سکتا ہے۔ کیونکر ماں بچہ کے جذبات کو اعتدال پر رکھتی ہے اوسکی بھوک کو روکتی ہے اوس کی خواہش کو درست کرتی ہے۔ اور اوس کے دلپر قابو حاصل کرتی ہے اور ایک نہایت عمدہ و نیک چال چلن والا لڑکا بناوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہہ کام استاد کا ہے اور اس کا جوابدہ استاد کو ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بالکل صحیح نہیں کیونکہ بچہ کی نگہداشت صرف تھوڑے عرصے کے لیے استاد کے ذمہ کردی جاتی ہے۔ جب لڑکا اسکول جاتا ہے۔ اور جب وہاں نئے لوگوں سے ملتا ہے۔ نئی سوسائٹی میں شریک ہوتا ہے۔ تو والدین کے فرائض کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ والدین کو بچوں کی تعلیم صرف اسکول ماسٹر پر ہی نہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ اور اسکول بھیجکر اپنے تئیں ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھنا چاہیئے۔

اونکو یہہ بھی چاہیئے کہ بچوں کے سامنے اون کے استاد کو بُرا نہ کہیں۔ بلکہ بچوں کو ہدایت کریں کہ استاد سے اور اپنے ہم جماعتوں سے محبت کریں۔ اور ہر ایک کو اوس کے مرتبہ کے موافق سمجھیں۔ اگر بچہ میں انتظام کی قابلیت ہے تو وہ اسکول کے انتظام کے قایم رکھنے میں استاد کا ہاتھ بٹاوے گا۔ لیکن اگر انتظام کی قابلیت نہیں ہے تو اسکول میں بدانتظامی ہوگی۔ اسوجہ سے یہہ کہا جاتا ہے کہ والدین اور استاد دونوں کو بچوں کی ذہنی اور عملی تعلیم میں اجتماعی

کوشش صرف کرنی چاہیئے بعض والدین اکثر استادوں کی تعلیم و تربیت کی شکایت کرتے ہیں اور ایک معنے کرکے اوستادوں کی ناقابلیت کا پہلو دکھاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے بچوں کی عملی کردار پر لحاظ نہیں کرتے جو استاد کی چشم حفاظت سے علحدہ ہوکر طرح طرح کی اخلاقی گستاخیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جن کی نگہداشت کا پورا بار والدین پر اور درصورت اون کے بورڈر ہونے کے نگراں بورڈنگ پر ہے۔ جسکا زہریلا اثر ایک بورڈر سے دوسرے بورڈر تک پہونچنا لازمی ہے۔ خانگی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ لڑکوں کے دلونکو علم کیطرف مائل کرنا چاہیے۔ جو ایک شفیق اور عقلمند ماں کا فریضہ ہے اکثر والدین خصوصاً ہیں محبت مادری کے جوش سے بچوں کو گھر میں بٹھالیتی ہیں اون کو ایسا نہ کرنا چاہیئے اور روزانہ اسکول بھیجنا چاہیے جب اسکول میں تعطیل ہوجائے تو بچوں کو اخبارات اور کتابوں کا مطالعہ عام لکچر میں شریک ہونے دلچسپ مباحثے اور اسیطرح دوسرے طریقوں سے والدین کو چاہیئے کہ اون کے معلومات کا دائرہ وسیع کرنے کی طرف اونہیں راغب کریں اور اون کے دلوں میں مطالعہ کا شوق علم کا اصلی مذاق پیدا کریں۔ اون کو چاہیئے کہ وہ خود بھی علم سے محبت کریں اور اوس میں خوشی محسوس کریں اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو کس طرح اپنے بچوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ کریں گے۔ کیونکہ جب اون کے بچے علم سے بے بہرہ ہوں گے اور اونکو علم سے دلچسپی مذاق نہوگا۔ اوسمیں اونہیں مسرت حاصل نہوگی تو وہ ذلیل سوسائٹی میں پائے جائیں گے جو کہ بُرے کاموں کا مخزن ہے اور بُرے کاموں کی طرف

رہنمائی کرتا ہے۔ اگر بچوں کو رسمی برائی سے محفوظ رکھا جائے اور انکو عمدہ تعلیم دی جائے اور ایسا قابل بنایا جائے کہ علم کا اصلی چشمہ وہ اپنے ذہن دماغ میں پاویں تو وہی بچے جو جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا شکار ہوتے ہیں دنیا کے واسطے نمونہ ہوں اور مثل تاروں کے شہرت کے آسمان پر چمکنے لگیں۔ اکثر نوجوان عارضی اور ناپائدار مسرت کی طرف زیادہ رغبت کرتے ہیں۔ اوسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اون کی کشت زار خیالات میں علم کا بیج نہیں بویا گیا۔ اور وہ علم سے بالکل بے بہرہ ہیں وہ نہیں جانتے کہ علم کا مزا تمام دنیاوی مزوں سے اچھا اور مسرت بخش ہے جو مطالعہ کی عادت ڈالنے سے سب مزوں پر غالب آجاتا ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو غور و فکر کی عادت سکھا دیں۔ اور ایسے کھیل سکھا دیں جن سے کوئی دماغی یا ذہنی فائدہ ہوسکتا ہو تو وہ آگے چلکر بجائے کہلاڑی ہونے کے غیور اور فکر کن آدمیوں کی تعداد اپنے وطن میں بڑھانے کا باعث ہوں گے۔ اور بچوں کو اسباب سے منع کر دینا چاہیئے کہ وہ اپنا قیمتی وقت مخرب اخلاق ناولوں اور بے سر و پا قصوں کے مطالعہ سے نہ ضائع کر سکیں کیونکہ وہ خراب اثرات ہیں جو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں چھپے ہیں۔ بلکہ وہ اپنا قیمتی وقت مستند اور مشاہیر مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کریں یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا تعلیم میں روپیہ کا زیادہ خرچ ہے اور کیا یہ معمولی دولتمندی کے امکان سے باہر ہے۔؟

جسکا جواب میں نہایت زور کے ساتھ نفی میں دونگا۔ کیونکہ آج کل عمدہ کتابیں نہایت ارزاں قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں۔ تمام بڑے

شہروں میں عام کتب خانے اور لائبریریاں موجود ہیں جہاں ہر زبان کا نہایت عمدہ لٹریچر ہر وقت موجود رہتا ہے جس سے ہر خاص و عام مستفید ہو سکتا ہے۔ اپنے ماں باپ کا ایک ایسا بچہ جو نیک اور لایق ہے۔ اور جس کے دماغ میں علم کا بیج عمدگی سے بویا گیا ہے وہ صرف آپ ہی خوش نہ ہوگا۔ بلکہ وہ تمام اپنے زیر اثر، لوگوں کو بھی خوش کریگا والدین کے واسطے یہ بات کسقدر باعث مسرت ہوگی۔ جب وہ اپنے بچوں کو لائق قابل اور صرف آپ ہی خوش نہیں بلکہ اپنی ملاقات سے دوسروں کے خوشی کو بڑھاتے ہوئے دیکھیں گے۔ اور لوگ اون سے ملنے کی تمنائیں کریں گے مگر کسقدر غم اور صدمہ ہوگا۔ جب اونکو جاہل مطلق۔ اور زندہ مصیبت زدہ اور دوسروں کی خوشی میں خلل انداز ہوتے ہوئے دیکھیں گے کاش ایسے والدین جو بعد کو غم و الم و مصیبت کی تصویر بن جاتے ہیں۔ پہلے سے اپنے بچوں کو پڑھانے لکھانے۔ اور شروع سے زیادہ لاڈ اور پیار نہ کرتے اور اون کی عادات و خصائل کو خراب نہ کرتے تو کیوں پھر روز بد اون کو دیکھنا نصیب ہوتا۔ بعض لوگ اس امر پر سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں۔ کہ بچوں کی تعلیم یہ ایک ملک کا فرض کیسے ہے؟ اسکا جواب نہایت صاف موجود ہے۔ کیونکہ تعلیم اونکو ہوشیار کارآمد اور آزو پسند شہری بناتی ہے اور ایک آزاد آدمی کو عقلمند آدمی ہونا چاہیئے کیونکہ پولیٹکل آزادی کی بنیاد عقلمندی پر قایم ہے اور نیکی و عقلمندی اوس کی حفاظت کرتی ہے — ہم ایک نہایت سنجیدہ، گورنمنٹ کے اب سایہ میں ہیں اور گورنمنٹ، کی خواہش یہ ہے کہ شہری نیک اور عقلمند ہو اور ہم بغیر اس کے ترقی نہیں کر سکتے جو لوگ یہ خواہش کرتے ہیں کہ

اپنے ملک کے حقوق قایم رکھیں اور آزادی تعلیم سے فائدہ اُٹھاہیں اور اپنے ملک کے عزت و وقار کو بڑھادیں اونکو چاہیئے کہ وہ اپنے بچونکو عمدہ تعلیم دیں۔ دیکھو جاپان۔ امریکہ۔ جرمنی۔ انگلینڈ تمام اس طریقہ میں نمونہ ہونیکی کوشش کر رہے ہیں یاد رکھو کہ اصلی مسرت اور سچی خوشی اوس دل و دماغ کے واسطے ہے جو علم سے بنایا گیا ہو۔ بچوں کو اصلی اور سیدھے راستہ پر تربیت کرو۔ تاکہ وہ دنیا کے واسطے بہت کچھ کرسکیں ورنہ وہ امن و امان کو برباد کریں گے۔ لڑائی جھگڑے پیدا کریں گے۔ کیونکہ وہ جاہل مطلق ہوں گے اور اون کے دماغ علم سے ناآشنا ہوں گے خیر جو نتیجہ ہو خواہ اچھا یا بُرا وہ بہت دور تک پھیلے گا اور مرتے دم تک قایم رہے گا۔ اس نتیجہ کے ذمہ دار کون ہوں گے! والدین

سیّد سخاوت حسین۔

شمس العلمأ مولوی سید علی بلگرامی کی بیوقت موت اور منشی

امیر اللہ صاحب تسلیم کے انتقال سے جو نقصان زبان اُردو کو پہنچا مشکل ہے کہ اب اسکی تلافی ہوسکے جو جارہا ہے اُسکا نعم البدل پیدا نہیں ہوتا۔ ہم دونو بزرگوں کے حالات جو قوم کے واسطے مایۂ ناز تھے مع تصویر کسی آیندہ پرچہ میں درج کرین گے ✣

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھکو
شکوہ اللہ سے۔ خاکم بدہن ہے مجھکو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؟

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

تجھکو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے

تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی!

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

تجھسے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے!

تو ہی کہدے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہرِ قیصر کا جو تھا اُسکو کیا سر کس نے؟

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھدیئے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟
اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟

کسکی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟
کسکی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

کسکی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
منہ کے بل گر کے ہُوا للہ احد کہتے تھے؟

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لیکر صفتِ جام پھرے

کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجکو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے!

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں!
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

اُمتیں اور بھی ہیں۔ ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں

ان میں کاہل بھی غافل بھی ہیں شیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں اُن کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں!
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں!

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی کوئی حد نہ حساب

تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے رسوائی و ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل بچھے دے بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

وہ لیلا بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی

عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیٔ غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیدا ؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

تجھکو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا ؟ بُت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا ؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا ؟ رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا ؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی کہتے ہیں ! زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں !
عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے !
سہرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے اِک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے
آتشِ اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں ؟
وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا قیسِ دیوانہ نظارہ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا
اے خوشا آں روزگارے آئی و صد ناز آئی بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی
بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکفِ نغمۂ کوکو بیٹھے
دورِ ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
پھر تنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے
قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچہ میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمہ بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کیلئے !
مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں میکدۂ از حسرتِ دیرینہ ما مے تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینہ ما

بوئے گل لیگئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہی کہ خود پھول میں غمّازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک!
اُسکے سینے میں ہیں نغموں کا تلاطم اب تک!

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول سے جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت ہی آزاد اسکی!
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اسکی!

لطف مرنے میں ہی باقی نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں

کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کسقدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اِس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینوں میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اِسی بانگِ درا سے دل ہوں

یعنے پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اُسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اقبال

رباعی

بے لطف شباب سے تونگری اچھی
آزادیِ مطلق سے اسیری اچھی

بگڑی ہوئی شاہی کی خرابی کو نہ پوچھ
اس سے تو بن آئے کی فقیری اچھی

"انیس"

ضمیرہ

گذشتہ سے پیوستہ

سو پچاس نہیں تو دو ایک صورتیں آج بھی ایسی موجود ہیں جن کی آنکھوں نے ضمیرہ کو دیکھا اور اوس وقت دیکھا جب مرض محبت اور خلوص کی بیماری اسکو شروع ہو چکی تھی۔ پیہم صدمات اور متواتر تفکرات نے برسوں کا بیمار بنا دیا تھا لیکن قدرت کا وہ انعام جو حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے اسوقت بھی دور دور اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

حسن کی دیوی پیکر انسانی میں آسمانی حور جسکی صورت پر نور اور باتوں سے پھول برستے تھے صدمۂ فراق کی زیادہ تاب نہ لاسکی برسات کے موسم میں کالی بھنور راتیں سر پر ہوتیں بجلی چمکتی بادل گرجتا اور وہ ضمیرہ جو دن دہاڑے اکیلے کمرہ میں جاتے ڈرتی تن تنہا چھت پر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رات گذار دیتی۔ مور جنگہا رتے پپیہا بولتا۔ ٹیٹری الاپتی اور ضمیرہ کا دل مجروح چچازاد بھائی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر صبح کر دیتا۔ آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑیاں لگاتیں کلیجہ ہاتھوں اچھلتا اور خیالات اُن اُن مقامات تک پہنچا دیتے جہاں کبھی امید کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار دکھائی دیتے اور کبھی ان پر اوس پڑ جاتی رات دن تفکرات کے دریا میں غوطہ کھاتی ڈوبتی اور ابھرتی بیٹھتی اور نکلتی۔ چچا کا گھر جیلخانہ نہ تھا۔ جہاں فراق احسن کی زبردست زنجیریں اس کے پاؤں میں نہیں جو دم بھر اکسنے کی اجازت نہ دیتیں۔

(۶)

آسمان نے کروٹیں لیں، زمین نے موسم پلٹے! برسات گذر کر گلابی جاڑا آپہونچا تھا۔ کہ ضمیرہ کو واپسی کا حکم پونچا۔ وہ چہرہ جسپر مردنی چھا گئی تھی سنتے ہی کھل گیا اور وہ دل جس کی آرزوئیں مرچکی تھیں اوچھل پڑا جسکی انتہائے کامیابی صرف اس بھائی کی صورت دیکھ لینی تھی جو مدتوں ساتھ کھیلا اور جسکو بچپڑے اب برسوں ہوگئے تھے اس کی حالت اسوقت دیکھنے کے قابل تھی جھٹ پٹا وقت ہوگا کہ ضمیرہ کی گاڑی مکان کے پاس پونچی چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر وہ صورت نظر نہ آئی اِس بدنصیب کو کیا معلوم کہ آج سنگدل باپ اسکی تمام امید و تپہ پانی پھیر دیگا اتری اندر گئی اور بیٹھی ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ باپ کے یہہ الفاظ اِس کے کان میں پونچے صبحکو تمھارا نکاح اسلم سے ہے۔

ہاتھہ پیروں میں سنسنی اور تمام بدن میں یہ سنتے ہی ایک سناٹا آگیا، باپ کا نادرشاہی حکم جس نے زندہ کو مردہ بنا دیا ضمیرہ بدنصیب کی آیندہ زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی کے پچھلے ورق میں کبھی کبھی کامیابی کا حرف اُمید دکھائی دے جاتا تھا لیکن اسوقت تھوڑی یا بہت جتنی بھی امیدیں تھیں وہ خاک میں مل گئیں آنکھیں نیچی تھیں اور سنگدل باپ کی تجویز پیش نظر۔ گھنٹوں اسیطرح ساکت بیٹھی رہی۔ باپ چلا گیا گھر والے پڑکر سوگئے تو وہ حسرت نصیب دل جسپر چرکے پہ چرکے لگ رہے تھے قابو میں نہ رہا آنے والی مصیبتوں کا یقین۔ احسن جیسے رفیق کی مفارقت زندگی جیسی نعمت کی بربادی اور باپ جیسے شفیق کی بیدردی۔ تیر تھے کہ کلیجے پر برس رہے تھے۔ گاؤں سے چلی تو یہ اُمید لے کر چلی۔ گاڑی

اتری تو یہ یقین لے کر اتری کہ کان جس کی باتوں کو ترس رہے ہیں آنکھیں اسکی صورت دیکھیں گی آپ جسکی ہمدردی کی محتاج ہے دل اسکی عنایت سے بشاش ہوگا۔ مگر منزل مقصود پر پہونچی تو نہ وہ مدعا تھا نہ غرض۔ نا امیدی کا دریا زور شور سے لہریں لے رہا تھا اور مایوسی کے ابر جھوم جھوم کر برس رہے تھے کیسی قیامت خیز رات تھی جس نے بھولی ضمیرہ کو کسی کروٹ چین نہ دیا وہ جانتی تھی کہ صبح کی اذان میری موت کا پیغام لا رہی ہے خدا دشمن پر بھی یہ مصیبت نہ ڈالے جو مجھ پر آکر پڑی۔ ماں پر ہوتی تو اس صدمہ کا سامنا نہ ہوتا ان بیسیوں رشتہ داروں میں جو ابا جان کی زندگی میں صدقے اور واری جاتے تھے ایک بھی ایسا نہیں جو اسوقت میرا ساتھ دے اور اس مصیبت سے بچائے ابا جان اپنی عقل کے ناخن لیں۔ میں اس ماں کی بیٹی ہوں جس نے اپنی ضد پر آکر بیس ہزار کی جائداد کو آگ لگا دی اور سگے بھائی کی مرتے مرتے صورت نہ دیکھی اسلم کی تو مجال کیا ہے کہ میرا آنچل دیکھ لے اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین پر اس طرح قربان ہوں کہ سننے والے واہ واہ اور دیکھنے والے آہ آہ کریں۔ مگر جب مرنا ہی ٹھیرا تو گمنامی کی موت کیوں مروں اس طرح مروں کہ میری موت دوسروں کے واسطے عبرت اور ماباپوں کے لیے ایک نصیحت ہو۔

اتنا کہکر ضمیرہ نے قلم ہاتھ میں لیکر اسطرح لکھنا شروع کیا،

"اس بدنصیب بیٹی کی طرف سے جو اب چند گھنٹوں کی مہمان ہے باپ کو آخری سلام"

اس دنیا میں جس کی بہار مجھے دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بیٹیاں بہت سی ہوئیں اور ہو ہو کر مریں ہیں اور رہ رہ کر مریں گی ہونگی اور بس بس کر اجڑینگی

فرمانبردار اور نافرمان رحمدل اور کٹر۔ غرض دنیا ہر قسم کی بیٹیوں سے بھری رہی بھری ہے اور بھری رہے گی مگر وہ بیٹی نافرمان نہیں جس نے اف نہ کی۔ تیوری پر بل نہ لائی۔ نگاہ اونچی نہ کی اور ایک نہ دو سات بلکہ آٹھ سال اس گھر میں بسر کر دیے جہاں زندگی کا ہر لمحہ مصیبت تھا جہاں تن ڈھلنکنے کو چیتھڑا اور پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نصیب نہ ہوا مصیبتیں جھیلیں دکھ بھگتے ایذائیں سہیں اور آفتیں اٹھائیں سگے چچا کے گھر میں جیٹھ بیاہ کے روزے نون کی کنکری سے کھولے مگر یہ آسمان جس کے نیچے بیٹھی ہوں اسکا خالق شاہد ہے اس بات کا کہ باسی کوسی۔ روکھی سوکھی جو میسر آئی شکر کیا اور کھالی۔ سامنے ہے وہ اصلی گھر جہاں میں نامراد چلی اور قریب ہے وہ وقت جب دونو چچا اور چچی ایک سچے حاکم کے سامنے اس بات کے جواب دہ ہوں گے کہ انہوں نے مہمان بھتیجی کو لونڈیوں سے بدتر رکھا۔

دیکھتی ہوں سمجھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ ماباپوں کی بیٹیاں فاقے کرتے کرتے مرجاتی ہیں۔ مگر حرف شکایت زبان پر نہیں آتا میرے علم میں بھی ہیں ایسی بدنصیب بچیاں اور مظلوم بیٹیاں کہ کائنات کی ہر شے اور زندگی کا ہر سانس ان کے واسطے مصیبت تھا لیکن دنیا کا ہر ذرہ جو کبھی انکا جانی دشمن تھا آج ان کے صبر و استقلال کی داد دے رہا ہے یہ ساکت ماہتاب اور منتشر تارے چمک چمک کر اور دمک دمک کر اس مصیبت بھری دنیا کی ان بسنے والی روحوں پر ناز کر رہے ہیں جنھوں نے جان دی مگر جو ہر شرافت ہاتھ سے نہ دیا۔

میری فرمانبرداری۔ میرے صبر اور میرے استقلال کا یہ بدلا نہ تھا کہ میں

باپ کے ہاتھوں تمام عمر کے واسطے غارت ہو جاؤں اور وہ شفیق و رفیق بھائی جس کے ساتھ زندگی کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں انکھیں جس سے وعدہ کر چکی ہیں کہ وہ اب کسی غیر مرد پر نہ پڑیں گی اور دل جس سے بآواز بلند کہہ چکا ہے کہ وہ اب ضمیرہ کے پاس اس کی امانت ہے اپنی آنکھ سے دیکھے کہ بدبخت ضمیرہ آج کسی غیر کی دلہن بن رہی ہے

یقیناً زندہ رہنے کا حق اب اس لڑکی کو نہیں ہے جو جوان ہو کر بچپن کے وعدوں کو فراموش کر دے اور اس بھائی کی سچی محبت کو جس میں کبھی خلوص کے سوا کچھ نہ دیکھا اس طرح خاک میں ملا دے۔

آپ نے باپ ہونے کا وہ فائدہ اٹھایا جو نہ اسلام نے دیا تھا نہ قدرت نے اور جس شخص کے خیال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس سے نکاح کی تجویز کی ✣

یہ زندگی جسکو آپ نے برباد کرنا چاہا آپ کی نذر ہے اور یہ جان جو میری نہیں اس کی ہے اُسپر سے قربان مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہو گا کہ باپ جیسا شفیق میرے خون کا پیاسا ہوا اور وہ تجویز کی جو میری جان لے کر ٹلی ✣

بچپن ہی تھا کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھا۔ ہشیار ہوئی تو بارہ پتھر باہر گانوں میں پھینکی گئی جوان ہوئی تو شادی کا فیصلہ اس شخص سے ہوا جو تہذیب کا دشمن اور محبت کا قاتل۔

ابا جان آپ دنیا میں خوش رہیں ناشاد و نامراد ضمیرہ آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کو جدا ہوتی ہے آپ نے اس دل کو جسمیں سینکڑوں ارمان اور ہزاروں حسرتیں بھری ہوئی تھیں بیدردی سے توڑا۔ اور اوس

بھائی کو جو عمر بھر کا رفیق تھا غیر بنا دیا یہ ہی ہے وہ شخص جسکو آپ نے غیر سمجھا اور جس سے بہتر عزیز میں نے ماں کے بعد نہ دیکھا اور جس کے خلوص پر آج ضمیرہ فدا ہو رہی ہے۔

کچھ دور نہیں ہے وہ وقت جب مظلوم ضمیرہ ایک انصاف والے باپ کے حضور میں دست بستہ کھڑی ہوگی۔ اور دل مجروح سنگدل باپ کے مظالم کی فریاد کر رہا ہوگا +

ابا جان وقت نازک ہوگا اور بات سچی حاکم حقیقی اور فیصلہ اٹل۔ دنیا مبارک! مگر اس وقت کے واسطے تیار رہیئے جب وہ بادشاہ جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں مظلوموں کی فریاد سنے گا + (باقی) راشد الخیری۔

دربار اکبر شاہ ثانی۔ جسکی تصویر زیب ورق اول ہے گو ہندوستانی مصوری کا ایک نمونہ ہے لیکن اس لحاظ سے اسکی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جشن تاجپوشی کے متعلق جو خوشیاں لندن میں منائی گئیں یعنے (دسٹیپول اوف ایمپائر) اونمیں مختلف ممالک کے قابل قدر چیزوں کے نمونہ بھی تھے ہندوستان کی نادر اشیاء میں سے اس دربار کی نقل کی گئی ۔ جو نہ صرف کامیاب ہی ہوئی بلکہ بے حد مقبول و پسند کی گئی۔ یہ جلوس ۹۔ جون کو آراستہ کیا گیا اور اس خوش اسلوبی سے انجام پایا کہ تمام یورپ نے اس کی داد دی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

وہ دن گئے کہ اپنا اقبال تاج سر تھا
تھی گھر میں اپنے دولت ہمدوش کر و فر تھا

منزل پہ جا رہے ہیں نزدیک و دور والے
وہ قافلہ ہے پیچھے جو سب کا راہبر تھا

یہ انقلابِ عالم رکھتا ہے کیا تماشے
وہ خاک پر قدم ہے جو پہلے تخت پر تھا

سِسلی لبِ سمندر لہروں سے کہہ رہی ہے
وہ کیا ہوئے کہ جن کو اہلِ جہاں سے ڈر تھا

حسرت برس رہی ہے دلّی کی سرزمین پر
یہ وہ جگہ ہے جس میں اسلام تاجور تھا

وہ کونسی تھی بستی جسمیں نہ ہم تھے ساکن
لنکا میں اپنا خیمہ بربر میں اپنا گھر تھا

ہندوستاں کو ہم نے اِک گلستاں بنایا
بنجر زمیں تھی جسکی جو وحشیوں کا گھر تھا

تہذیب ہم سے سیکھی دنیا کے وحشیوں نے
ورنہ تمام عالم نیچر سے بے خبر تھا

اب رہ گیا ہے مٹنا مثلِ شرار اپنا
کس کو سنائیں جاکر ہم حال زار اپنا

(زار ہوشیارپوری)

قدرت کی دو بولتی ہوئی تصویریں

دو شریک رنج و راحت! دو شریک زندگی
بزمِ ہستی کیلئے ہیں باعثِ تابندگی

ہے انہیں دونوں سے پاکیزہ خیالی کا وجود
ہے انہیں کے دم سے دنیا میں محبت کی نمود

ہیں مجسم جذب! یہ مہر و وفا کی پتلیاں
کونسی ایسی کشش ان پیکروں میں ہے نہاں

ان کی روحیں متحد ہیں ان کے جذبات ایک ہیں
ان کے مقصد ایک ہیں ان کے خیالات ایک ہیں

ان کے سینوں میں بھرا ہے سوز و سازِ حسن و عشق
جانتے ہیں ان کے دل از و نیاز حسن و عشق

ان کی کیفیاتِ قلبی میں ہے رد و افزوں سرور
دم بدم ہے ایک مسرت خیز شورش کا ظہور

لمحے لمحے میں نہیں ملتا ہے اک لطفِ جدید
راستاں ان کی شبِ برات اور ان ہی کا روزِ عید

ان کی امیدیں ہمالے میں ہیں برآئی ہوئی
آرزوئیں کامیابی پر ہیں اترائی ہوئی

ان سے پوچھے کوئی دنیا میں مسرت کے مزے
اس جہاں میں ہی نہیں حاصل ہیں جنت کے مزے

کسقدر آپس میں دلداری کا انکو پاس ہے
انکو الفت کی نزاکت کا بہت احساس ہے

بہرِ اغراض و مقاصد کیا توافق انہیں ہے
کسقدر روحانی تعلق ان میں ہے

ان کی دنیا ہے نہایت خوشنما و دلپذیر
جسکی نورانی شعاعوں سے جہاں ہے عکس گیر

ہو کے باہم مونس و غمخوار و ہمدرد و شفیق
منزلِ ہستی کو طے کرتے ہیں دونوں رفیق

پیرو حکمِ ازل قانونِ قدرت کے مطیع
چونکہ ہیں یہ! اسلئے ہے مرتبہ انکا رفیع

حاصلِ نقش و نگارِ آفرینش ہیں یہی
رونق افزائے بہارِ آفرینش ہیں یہی

ہے انہیں دونوں سے ای ارشد عروجِ کائنات
"اشرف المخلوق" کہتے ہیں جسے! ہے انکی ذات

ارشد تھانوی

راحت زمانی

مولوی سیّد احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے۔ مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے قصّہ کی دلچسپی۔ مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت انجمنی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے۔ قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلامت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام بھی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸؎

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالرشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے۔ لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸؎) منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

(تمدّن پریس دہلی)

جلد ۴ نمبر ۶ اگست ۱۹۱۱ء

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

تصویر۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم		زیارت قاہرہ بستنول سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے	۴۰
شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ مرحوم صاحب ایل ایل ڈی۔	۱	کسی دل گرفتہ کی سیر چمن۔ ز۔ خ۔ ش۔ صاحبہ۔	۴۴
ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قطعہ	۶	سکہ جات سلاطین گجرات مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری	۴۶
ضمیرہ۔ محمد عبد الراشد الخیری۔	۷	حیات بعد ممات سید شوکت صاحب۔ دہلوی	۵۴
اسلام اور عورت۔ مولوی سید رشید علیقات صاحب	۹	نار حسین علیہ السلام خان بہادر سید اشرف مولانا شاد عظیم آبادی۔	۶۲
جسم وفا۔ مولوی نیاز محمد خان صاحب نیاز فتحپوری	۳۰	ایک دردمند سر بہائی کا خط بہائی کے نام مولوی مفتی شمس الاسلام صاحب (علیگ)	۶۴

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری ۶

قیمت سالانہ قسم اول ۴ روپے قسم دوم ۲ روپے تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ ۴ آنہ

کتبہ احقر ابو ظفر حامد میرزا دہلوی

تمدّن

یہ ۷۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخری تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کیواسطے مایۂ ناز ہیں تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہونچانا ہے۔

تمدن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصّب اور پالیٹکس سے علٰحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہوسکتا کہ تمدن اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہونگے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں۔

تمدن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دوم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اوّل ۱۰ر قسم دوم ۸ر۔ نمونہ کا پرچہ (۴ر)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا۔ ابوالنعیم مولوی سیّد تصدیق احمد صاحب۔ منشی محمد حسین خانصاحب تیرانوالی۔ مولوی نیاز محمد خاں صاحب فتحپوری۔ سیّد رضا حیدر صاحب رضوی آگرہ۔ میر مہدی علی صاحب شہید دکن میرزا سردار بیگ صاحب مگیلنہ۔ مولوی محمد ادریس صاحب جہانسی۔ منشی محمد محسن صاحب رٹول۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی۔ مولوی شمس الاسلام صاحب (علیگ) منشی محمد عبدالرزاق صاحب بسمل دکن۔ محمد صالح صاحب بنگلور۔ محمد شفیع صاحب کسولی۔ مولوی محمد لطیف صاحب بی۔ اے۔ سلطانپور۔ منشی مظفر خانصاحب پہلور۔ منشی حامد حسین صاحب قریشی پور قاضی۔

دام وام کچھ نہیں

صرف دو خریدار۔ تمدن کے یا عصمت کے
(یا ایک عصمت کا اور ایک تمدن کا) بھیج دیجئے۔

اور
کتاب راحت زمانی جسکی قیمت عہ ہے اپنے نام

بالکل مفت

منگوا لیجئے۔ خریداروں کی قیمت وصول ہو جانے پر راحت زمانی
آپ کی خدمت میں فوراً بیرنگ ارسال کر دی جائے گی۔

اور
ہر نئے خریدار کو بھی یہ کتاب نصف قیمت میں
صرف آٹھ آنے میں مل سکے گی

مگر یکم اکتوبر ۱۹۱۱ء تک

اس کے بعد کوئی رعایت نہ ہوگی
خریدار کا نام اور اپنا نام صاف لکھئے

منیجر تمدن و عصمت دہلی

فہرست مضامین رسالہ عصمت بابت ماہ اگست ۱۹۱۱ء

تصویر ..... ایک مصری خاتون .....

سفر یحییٰ کا جلوس ..... شیخ محمد اکرام ۱

مسلم یونیورسٹی فنڈ ..... بنت سید نذر الباقر صاحب ۹

مہر ..... مسز مولوی محمد ذکی صاحب ۱۲

الوان نعمت ..... مس سیرزا عبداللہ بیگ صاحب ۱۶

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ۔ مسز شیخ علی صاحبہ باعکظہ ۱۷

ایڈریس ..... بنت عطا محمد خالص صاحب ۲۸

بلقیس ..... گلبدن بیگم صاحبہ ۳۲

طریق تندرستی ..... ایس ۔ ایچ ۔ جے ۔ بی صاحبہ ۳۸

اڑنے والی مچھلی ..... عبدالواحد صاحب ۴۲

عصر جدید ..... محمد فیاض صاحب (علیگ) ۴۷

تذکرہ خواتین دکن ..... حامدہ بیگم صاحبہ انیسہ ۵۶

صدائے کتاب ..... مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی ۶۱

بزم عصمت ..... ۶۲ ـ ۶۳ ـ ۶۴

تمدن

مولوی ذکاء اللہ مرحوم

از شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی لٹ

پورے ۱۲ سال ہونے آئے (یعنی جب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے مذہبی خدمات کی طرف رجوع کیا) کہ آنکھیں اور کان علامہ موصوف کی تحریر و تقریر کو ترس گئے۔ کوئی ممکن کوشش ایسی نہ تھی جو قوم نے اس عرصہ میں کی ہو۔ مگر افسوس کہ کامیابی نہ ہوئی اور یہ نقصان اردو لٹریچر کو ایسا پہونچا کہ اب اسکی تلافی نظر نہیں آتی ایسی حالت میں یہ مختصر مضمون بھی غنیمت ہے اور تمدن نہایت ادب سے شمس العلماء کا اس مضمون کے واسطے شکریہ ادا کرتا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین تمدن یہ سنکر بہت خوش ہوں گے کہ عنقریب ایک اور مضمون علامہ موصوف کا تمدن میں شائع ہوگا +

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بعد میرے تو مسلمانوں کو کسی بات پر اس عموم کے ساتھ متفق ہوتے دیکھا نہیں جیسا وہ آجکل اپنی یونیورسٹی کے بنانے پر تلے ہوئے ہیں اسی تقریب میں بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی۔ الہ آباد۔ پنجاب۔ ایک چھوڑ۔ پانچ پانچ سرکاری یونیورسٹیاں ہوتے ہوئے تعلیم کی گاڑی میں مسلم یونیورسٹی کے پانچویں پہیے کی کیا ضرورت ہے اور پھر مسلم یونیورسٹی کس قسم کے

عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آجتک پیدا نہیں کرسکیں۔ طرفداران مسلم یونیورسٹی اس سوال کے جواب بھی دیتے ہیں۔ مگر چونکہ خالی خولی جواب ہوتے ہیں۔ سائل کی تشفی نہیں ہوتی۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انہیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجہ تکمیل کو پہونچکر وماذالک علی اللہ العزیز ان جیسے عالم پیدا کرے گی۔ کریم النفس۔ وسیع الاخلاق۔ منکسر المزاج۔ روشن دماغ۔ متنوع المعلومات کثیر التصانیف۔ خیر خواہ عامۂ خلائق۔ فیاض طبع۔ برٹش گورنمنٹ کے قدرشناس۔ ارادتمند۔ راسخ الاعتقاد صلیح کل۔ مریخ دمرنجان۔

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط وضبط بچپن سے شروع ہوا۔ جبکہ وہ دہلی کالج یا دش بخیر کی فارسی جماعت میں تھے اور میں عربی میں۔ باایں ہمہ ہم ریاضیات میں ہم سبق تھے۔ ماسٹر رام چندر مرحوم کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے اور چونکہ ماسٹر صاحب نے بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہمنشینی کے شبہے سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے متہم بھی کرتے تھے لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پرانا ملاقاتی ہوں ان کے معاصر جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں ایک میں گراں جاں کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں لیکن تا بکے میں اب بھی گواہی دیتا ہوں اور مر کر بھی خدا کے حضور میں گواہی دونگا۔ کہ جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے

میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ پکے موحد تھے ایک خدا کے بجمیع صفاتہ الکمالیتہ قائل اور ایسا بالغ النظر آدمی جیسے مولوی ذکاء اللہ تھے سائنس کے معموں کو حل کرنے والے ہرگز منکر خدائے واحد ہو نہیں سکتا۔ خیر یہ معاملہ تو بینہ و بین اللہ ہے۔ میں مولوی ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا وہ یہ تھی کہ حسد انکو چھو تک نہیں گیا تھا ورنہ کالجوں اور اسکولوں میں امتحان اور کھیلوں کے ذریعہ سے تنافس پیدا کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر فی اغلب الاحوال حسد کی صورت پکڑ لیتا ہے دنیاوی عروج کے اعتبار سے مولوی ذکاء اللہ نہ تو حکومتہ کے کسی منصب جلیل پر پہونچے اور نہ انہوں نے کچھ ایسی دولت ہی جمع کی اس حرمان کا سبب یہ نہ تھا۔ کہ ان کو اسکی قابلیت ہی نہ تھی بلکہ اصلی اور واقعی سبب یہ تھا کہ انہوں نے علمی دھنوں کے آگے دنیاوی عروج کی کچھ پرواہی نہ کی اور کی بھی تو اسیقدر کہ کسی کو دنیاوی عروج پر پہونچتے ہوئے سنا اور خوش ہو گئے۔ وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے انہوں نے ساری عمر جو عمر طبعی سے تجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ اور وہ ہل من مزید ہی پکارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے وہ علم کو علم ہی کے لیے حاصل کرتے تھے یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا نہ اُن فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں اور جن کے لیے سب پڑھنے والے پڑھتے ہیں الا ماشاء اللہ جہاں تک فارسی کو تعلق تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی کالج کی تعلیم صرف برائے نام تعلیم تھی۔ بدتر از جہل جس نے ہندوستان کو تباہ کیا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ مدرسہ میں تو فارسی پڑھتے تھے۔ جہاں اور جس غرض سے ان قسموں کے رواج نے ان کو داخل کرایا تھا۔ مگر ماسٹر رام چند کی صحبت اُن کے دل و دماغ میں ایک اور مفید تعلیم کا بیج بو رہی تھی جس نے آخر کار مولوی ذکاء اللہ کو مولوی ذکاء اللہ بنایا۔ انہوں نے مدرسے سے نکل نوکری کی حالت میں اور نوکری بھی سررشتہ تعلیم کی نوکری از خود انگریزی کا شوق کیا اور اپنے مطالعہ کے زور سے بے مدد استاد اسکو اس درجہ تک پہونچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے ہچکچاتے تھے مگر ان کی ہر طرح کی معلومات جو اونہوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھی اتنی وسیع تھی کہ بی۔ اے اور ایم اے کو نصیب نہیں ہوتی۔ مولوی ذکاء اللہ حکیموں کی طرح بے فیض نہ تھے کہ ان کو اتفاق سے کوئی نئی حکمی دوا معلوم بھی ہوگئی تو دوسروں کو بتانے میں دریغ کیا کرتے ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ پکایا تصنیفات۔ تالیفات۔ ملفوظات اور تراجم کے ذریعہ سے اپنے سب ہم وطنوں کو چکھایا۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب کے لکھنے کے لیے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور ادا جسمیں وہ منفرد تھے ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انہوں نے انگریزی کے اتنے تبحر پر بال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے گویا پٹھو تھے مگر انہوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں اوڑھی انگریزی جوتی تک نہیں پہنی۔ ہیں جاڑے کے دنوں میں ان کو بوڑھے بنئے کی طرح کاروئی دار پائے جامہ

پہنے دیکھتا اور ہنسا کرتا۔

غرض مولوی ذکار اللہ کی وضع ظاہر یا طرز ماندو بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ان کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو ہمارا مذہب بھی یقیناً مسلمان تھے مگر ان کا دامن عقیدت لوث تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے سب سے خلوص کے ساتھ ملتے اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتور ہے تھی مولوی ذکار اللہ اور سکرات کی سی بیقراری پادری[1] صاحب کو تھی بہ ظاہر دونو میں کسی ایک کی کوئی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی۔ مگر دونو نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا اور ان کی باہمی محبت الحب للہ کی قسم سے تھی مودۃ اہل صفا چہ در رود و چہ در قفا۔

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر آدھے درجن پادری اینڈرو جیسے انگریز اور آدھے درجن مولوی ذکار اللہ جیسے مسلمان ہوں تو وہ وقت جلد آجائیگا کہ مسلمان اور انگریز دونو اپنی اپنی جگہ کہنے لگیں گے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

---

[1] پادری اینڈرو صاحب مرحوم

قطعہ

(جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے نے انجمن حمایت اسلام کی جلسہ میں پڑھا)

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے
عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز

تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ تری ذکر حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا انداز تملق بھی سراپا اعجاز

کبھی ایران کے لیے ہو جو دعا کا جلسہ
عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز

ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے
فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز

دل حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز

نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پروردہ تیرے ملک کے اجنا بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں بھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز

غم صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغ پرواز

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

سنکے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا
شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر
ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

ضمیرہ

یہانتک لکھکر ضمیرہ کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور فانی دنیا سے رخصت ہوکر اس احکم الحاکمین کے روبرو حاضر ہونے کے خیال میں جو اسوقت اسکی حالت زار کو دیکھ رہا تھا وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اسنے ایک حسرت بھری نظر آسمان پر ڈالی تارے کھل رہے تھے مگر ان کی چمک دمک پھیکی پڑ چکی تھی صبح صادق کا سہانا وقت تھا برابر کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور ضمیرہ کلمہ پڑھکر اٹھی غسل کیا نماز فجر ادا کرنے کے بعد سجدہ میں گری۔ اور کہنے لگی دلوں کے حال جاننے والے معبود یہ تیری گنہگار بندی ضمیرہ چند لمحہ بعد تیرے حضور میں شرمسار حاضر ہوتی ہے اپنی خدائی کا صدقہ جوار رحمت میں جگہ دے اور اُس بے ماں کی بچی پر جو چودہ برس دنیا کی مصیبتیں جھیلکر ماں کی شفقت بھری نظر کو ترستی پھر کتی دنیا سے چلی رحم کیجیو، الہ العالمین تیری شان تجھی کو سزاوار موت کی سختی آسان ہو اور سکرات کی نوبت نہ آئے اپنے فضل و کرم سے میرے گناہ پر پردہ ڈال اور اُس ماں سے ملا دے جس نے خون جگر پلا کر پالا۔ اور حسرت سے تکتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ تیری دنیا لازوال نعمتوں سے بھری ہے مگر ضمیرہ کے واسطے سب سے بڑی نعمت اسکی ماں کا دیدار ہے جس کی دھندلی سی تصویر اسوقت دکھائی دے رہی ہے ازلی اور ابدی راج والے شہنشاہ تیری سلطنت لازوال۔ تیری حکومت غیر فانی ضمیرہ کی روح بدن سے نکلتے ہی اس ماں کے آغوش میں پونہچا دے جس کے کلیجہ سے لگے ہوئے مدتیں ہو گئیں۔

بے وارثوں کے وارث اور بے والیوں کے والی تنہا ضمیر جس کے سر سے ماکا سایہ اُٹھ چکا اور جسکا اب دنیا میں کوئی رفیق نہیں تیرے سپرد ہے، غفور الرحیم یہ معصوم ماکی امانت تھی جو آج تیری حفاظت میں دیتی ہوں اپنی قدرت کاملہ سے اس کی پرورش کر، الٰہی ضمیر اس فانی دنیا میں پھلے پھولے مرحومہ ماکی نشانی موجود رہے اور بدنصیب بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے والا قائم۔

یہ دعا مانگ کر ضمیرہ سجدے سے اٹھی ایک شیشی نکالی اور پیکر نیچے آئی ضمیر نیچے پڑا سوتا تھا اس کے برابر لیٹی اور لپٹ گئی بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور گلے سے لگا کر اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی مچھلی کی طرح تڑپی اور ضمیر کے منہ پر منہ رکھکر کہا!

نیند کے متوالے بھائی ہشیار ہو، اُٹھ اور اس بہن سے مل لے جو اب ہمیشہ کی نیند سوتی ہے۔

یہ کہکر ضمیرہ نے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور شدت محبت میں یہ کہکر چیخ ماری۔ پیارے ضمیر خدا حافظ۔

صبح ہو چکی تھی برات کی تیاریاں ہو رہی تھیں لوگ کچھ آگئے تھے کچھ آرہے تھے شہسوار مشرق کے ساتھ ہی ساتھ نوشہ مردانہ میں داخل ہوا اور ضمیرہ کے والد بزرگوار زنانہ میں آئے۔ باپ کی صورت دیکھکر ضمیرہ ترک ادب کے لحاظ سے اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر نہ اُٹھ سکی بہ منت وزاری قصوروں کی معافی مانگی اور باواز بلند کہا۔

ابا جان! بدنصیب ضمیرہ بے مرضی کے نکاح پر قربان ہوگئی۔

گھر والے دوڑ پڑے دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ راشد الخیری

"اسلام اور عورت"

بنی نوع انسان اسلام کی تمدنی اصلاحوں کے جسقدر زیر بار احسان ہیں محتاج بیان نہیں غیر اقوام اور غیر مذاہب تک کو اسبات کا اقرار ہے کہ تمدن کو ترقی و تکمیل کے انتہائی مدارج پر پہونچانے والے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اسیری، ایرانی، مصری، یونانی اور رومی تمدن اپنے اپنے وقت میں اس زمانہ کی حالت کے مطابق بیشک اپنی نظیر آپ تھے مگر اب وہ سب گردروزگار ہیں صرف اُن کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ لیکن جو عظیم الشان تمدن پیغمبر عرب نے قایم کیا وہ آج تیرہ سو برس بعد بھی اُسی طرح کامل اور عدیم المثال ہے کہ اُس کے سامنے نہ صرف نینوی، بابل، اتھنس ممفس، وتھبیس، صدوم وغیرہ کے گزشتہ تمدن ہی ہیچ ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے دوسرے تمام شایستہ اور ترقی یافتہ اقوام و ممالک بھی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ انسان کی حالت روز بروز بدلتی رہتی ہے لہذا اس کی روز افزوں ضرورتوں پر کسی قانون معاشرت کا اس درجہ حاوی ہونا کہ سینکڑوں برس کے بعد بھی اسی طرح ناممکن التبدیل ثابت ہو کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زمانہ بجز آج سے اس وقت تک دنیا میں جتنے نظامات قایم ہوئے انمیں سے کیسکو اگر یہ عجیب و غریب خصوصیت حاصل ہوئی تو وہ محض پیغمبر اسلام کا قایم کیا ہوا تمدن ہے جس نے نہ صرف ہند و ایران و یونان و روم کے قدیم تمدنوں پر ہی فوقیت حاصل کی ہے بلکہ تیرہ سو برس کی طویل مدت میں بھی دنیا کی کوئی تازہ ایسا کامل، جامع، عالمگیر اور ناممکن التبدیل تمدن قایم کرنے میں باوجود دماغی ترقیات اور مختلف

تغیرات کے اس کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر نظام تمدن خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ اس عالی شان تمدن کی عظمت اور اہمیت اُس وقت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے جب ہم اس کے بعض اصول کا دنیا کی دوسری متمدن اقوام کے ترقی یافتہ نظامات کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ اور سب باتوں کو چھوڑ کر اگر ہم صرف عورتوں ہی کو لیں اور دیکھیں کہ حضرت پیغمبر اسلام کے قایم کردہ تمدن نے اُن کی حالت پر کیا اثر کیا تو بڑی آسانی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے اصول کس قدر انسانی فطرت سے مبنی اور کمال کے انتہائی حد پر پہونچے ہوئے ہیں جس کی بدولت اُسکو غیر معمولی استحکام حاصل ہے۔ دنیا کے مختلف تمدنوں کا باہمی مقابلہ کرنے کے لیے عورتوں کی حالت کا اندازہ کرنے سے بہتر کوئی شکل نہیں۔ یہہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ عورتیں تمدن کی بنیاد ہیں اور جس تمدن کی بنیاد سب سے اچھی ہو پھر اُس تمدن کے سب سے اعلیٰ ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اسی لیئے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تہذیب کو جانچنا منظور ہو تو سب سے پہلے اُس کی عورتوں کی حالت کا اندازہ کرو اور یہ دیکھو کہ وہ قوم عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ پس جب ہم اس معیار سے دنیا کی کل اقوام اور اُن کے قانون معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کر رکھے ہیں، جو آزادی دی ہے اور جو درجہ قایم کیا ہے اُس کی نظیر دنیا کی کسی قوم اور کسی ملک میں نہیں ملتی۔ زمانہ قدیم کے متمدنوں کے احکام تو وہ ہیں جن کی رو سے اشرف المخلوقات کا بہترین نصف حصہ اپنے تمام فطری حقوق سے محروم، انواع و اقسام کے مظالم کا تختہ مشق

اور مردوں کی ذلیل غلامی میں گرفتار کر دیا گیا ہے۔ ادیان سلف اور مصلحان سابقہ میں سے کسی نے عورتوں کے حقوق کی حمایت اور ان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرنے کی طرف مطلق توجہ نہیں کی بلکہ اور ان کی ذلت وخواری میں اضافہ ہی کیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں عورتیں انسانوں اور حیوانوں کے درمیان ایک قسم کی مخلوق سمجھی جاتی تھیں۔ لونڈیوں سے بھی بدتر حیثیت رکھتی تھیں۔ ان پر مردوں کی جابرانہ حکومت قایم تھی اور ان کا مصرف محض ترقی نسل اور مردوں کی ذلیل غلامی تھا۔ ہندو، یونانی اور رومی قانون نے عورتوں کو ان کی مستقل شخصیات سے ہمیشہ محروم رکھا۔ یونانی جن کی ترقی وتہذیب کا ایک زمانہ ثنا خواں ہے عورتوں کو ایک کم درجہ کی ذلیل مخلوق اور مردوں کی خدمت گزار سمجھتے تھے۔ محض ایک بچہ پیدا کرنے کی کل سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی۔ ان کی بے قدری وذلت کی یہ انتہا تھی کہ اگر کسی عورت کے ہاں ناقص الاعضا بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت کو مار ڈالتے تھے۔ اسپارٹا میں وہ عورت جس سے کسی قوی سپاہی کے پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی زندہ نہیں رکھی جاتی تھی۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا کہ ایک شخص دوسرے سے چند روز کے لیے اسکی بیوی عاریتاً لے لیتا۔ شوہر تو اپنی بیوی کی جان تک کا مالک ہوتا لیکن اس بیچاری کو حق وراثت تو کیا کسی قسم کا حق ہی حاصل نہ تھا۔ قیدیوں کی طرح عورتوں کے اپنے گھروں میں بند رہنے اور ضرورت کے سوا باہر قدم نہ رکھنے کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ رومیوں میں عورتوں کی حالت اس سے بہتر نہ تھی۔ ان کا قانون بھی عورتوں کو تمام ان کے

پیدائشی حقوق سے محروم کرتا تھا وہ ایک حقیر، ذلیل اور ادنی مخلوق تصور کی جاتی تھیں۔ شوہر کے سوا کوئی ان کے افعال کا فیصلہ کرنیوالا نہ تھا۔ یونانی اور رومی قانون کی رو سے لڑکیاں اپنے باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کرنے کی مجاز نہ تھیں۔ اس کے ارتکاب پر باپ کو حق تھا کہ وہ اپنی بے باک لڑکی کو قتل کر ڈالے۔ شادی بیاہ کی کوئی مہذب شکل نہ تھی۔ بالکل خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا تھا۔ باپ اپنی لڑکیوں کو ان کے خواستگاروں کے ہاتھ بیچتے تھے اور شوہر اپنے لیے بیویاں خریدتے تھے۔ بعض اوقات شوہر اگر ان کا جی چاہے اپنی بیویوں کو چند روز کے بعد دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے تھے۔

ہندو مقننوں نے بھی عورتوں کے ساتھ سختی کرنے میں کوتاہی نہیں کی قدیم ہندوستان کے زبردست مقنن منو کا حکم ناطق ہے کہ "عورت صغیر سنی میں باپ کی مطیع رہے، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی اور اگر بیٹے نہوں تو اپنے اقربا کی۔ کیونکہ کوئی عورت ہرگز اس لایق نہیں کہ خود مختار طور پر زندگی بسر کر سکے" ہندوؤں کے مذہبی قانون کی رو سے عورتیں اپنی مستقل شخصیت سے اس درجہ محروم ہیں کہ ان کو عبادت تک کرنے کی ممانعت ہے۔ حکم ہے کہ عورت کو مذہبی عبادتوں کے بجا لانے اور روزہ وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ اپنے شوہروں کی دل سے خدمت گزاری کریں تو وہ جنت میں داخل ہو جائیں گی۔ ایک اور حکم ہے کہ "جو عورت روزہ رکھے اور ریاضت کرے وہ جہنم میں داخل ہوگی اور اس کے شوہر کی عمر کم ہو جائے گی" ایک اور حکم ہے۔ کہ "اگر کسی عورت کو تیرتھ

وجاترے کا شوق ہو تو اسکو چاہیئے کہ اپنے شوہر کے پاؤں دھوکر پی لے کیونکہ اس کے لیئے اس کا شوہر وشنو اور شنکر سے بھی زیادہ بزرگ اور افضل ہے "۔ ان احکام کے نافذ کرنے والوں نے عورتوں کی یہہ تعریف کی ہے کہ "تقدیر، طوفان، موت، جہنم، زہر، زہریلے سانپ، ان میں سے کوئی اس قدر خراب نہیں ہے جتنی عورت

زردشت کے مذہب کا قانون بھی عورتوں کے متعلق قریب قریب ایسا ہی ہے۔ اس کی رو سے تو خانگی تعلقات میں کسی بات کا لحاظ ہی نہیں۔ تمام عورتیں خواہ وہ کسی عمر کسی رتبہ اور کسی رشتہ کی ہوں مردوں کی نفسانی خواہشوں کے لیے وقف قرار دی گئی ہیں۔ ماں بیٹے کے لیے بیٹی باپ کے لیے اور بہن بھائی کے لیے ویسی ہی مباح ہے جیسی بالکل غیر عورتیں۔ بلکہ بہن کے ساتھ نکاح تو بہت افضل خیال کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو ان کے مذہب نے کسقدر بے وقعت سمجھا۔ یہودی اور عیسائی مذاہب کے احکام نے بھی عورتوں کے حقوق کی کوئی نگہداشت نہیں کی۔

یہودی پیشوایان مذہب نے عورت کو تمام انسانی عیوب کا بانی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مردوں کی برائی عورتوں کی اچھائی سے بدرجہا بہتر ہے۔ موسوی مذہب نے نکاح کا کوئی ایسا شایستہ اصول نہیں قرار دیا جس سے زوجیت کے حقوق و فرائض میں مساوات پیدا ہوتی اور جس سے معاشرت کی ترقی ہوتی بلکہ اسی خرید و فروخت کے قاعدے کو جاری رکھا جس سے عورتوں کے استقلال بالذات سے محروم ہونے پر اور بھی مہر لگ جاتی تھی۔ چنانچہ ہوسیع نبی نے اپنی بیوی پندرہ روپے اور ڈیڑھ حمر جو کہ

خریدی تھی" (پیدائش ۳۴ و ۱۲- اصول ۱۸- و ۲۵) بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہ ہونے سے جو شخص جتنی بیویاں چاہتا اپنے گھر میں بہر بستا اور جب جی چاہتا ان کو نکال باہر کرتا۔ شریعت موسوی میں کثرت ازدواج اور طلاق کی کوئی حد ہی نہیں۔ فقہائے یہود کا یہ حکم تھا کہ ادنیٰ سی خطا پر بھی عورت کو طلاق دیدینی چاہیئے "اگر کسیکو اپنی عورت بری معلوم ہو تو اس کو نکال ڈالے" (استثنا ۲۴ و ۱) زلی عقیبہ کہتا ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی بیوی سے خوبصورت پاوے تو اپنی عورت کو نکال دے۔ معلم ہلل کا قول ہے کہ اگر کسی کی عورت اپنے شوہر کا کھانا بہت نمک ڈال کے خراب پکاوے یا اُسے زیادہ بھون دے تو وہ عورت طلاق دیدی جائے۔ بالمختصر یہ کہ یہودی مذہب نے عورتوں کی کوئی قدر اور ان کے تلف شدہ حقوق کیطرف کوئی توجہ نہ کی

عیسائی مذہب نے بھی بالکل اسی کی تقلید کی۔ عیسائی مقتدیان دین نے عورتوں کو جہنم کا دروازہ اور تمام انسانی برائیوں کا اصلی سرچشمہ قرار دیا اور نہایت شد و مد کے ساتھ تلقین کی کہ عورت کو ہمیشہ اس خیال سے شرمانا چاہیئے کہ وہ عورت ہے۔ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ "عورت موت سے زیادہ تلخ ہے"، اور "عورت مرد کی محکوم و غلام ہے" اور "جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنے کو عورت سے بچائیگا" عیسائی پیشوایان مذہب نے عورتوں کے ساتھ نفرت اور حقارت کرنے کی یہاں تک کوشش کی کہ اپنی مقدس کتاب کی تعلیم کے خلاف رہبانیت کو ایجاد کیا اور شدت کے ساتھ اس کے دلدادہ بن گئے۔ ان خیالات نے مذہب عیسوی کے معتقدوں پر ایسا اثر کیا کہ سنہ ۵۸۶ء میں بمقام ماکن (فرانس) ایک خاص مجلس اس غرض سے

لیے منعقد کرنی پڑی کہ وہ عورتوں میں کسی زندہ روح کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے۔ اس مجلس کے تصفیہ سے بھی پوری تشفی نہو سکی اور سولھویں صدی عیسوی تک برابر اس بات پر مباحثہ ہوتا رہا کہ عورت نوع انسان میں داخل ہے کہ نہیں۔ کرائسٹم نے علمائے مسیحی کی رائے عورتوں کے متعلق ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ عورت ایک ایسی بلا ہے جس سے گریز ممکن نہیں ہے اور ایک قدرتی مغوی اور ایک مرغوب آفت اور ایک خانگی فتنہ اور ایک مہلک سحر اور ایک رنگین بلا ہے۔" مشہور ہے کہ شارل میں شہنشاہ فرانس جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس نے علاوہ ملک گیری کے علوم و مذہب کی ترقی میں بڑی کوشش کی تھی اور معاشرتی اور مذہبی قوانین کے مجموعے شائع کیے تھے ایک دن اپنی بہن کے ساتھ مباحثہ میں اس پر حملہ کر بیٹھا، اس کے بال پکڑ لیے، خوب مارا پیٹا، لاتیں اور گھونسے لگائے اور اپنے لوہے کے دستانے سے اس کے تین دانت توڑ ڈالے۔ ایک ایسے مصلح تمدن و معاشرت، علم پرور، عظیم الشان بادشاہ کا اپنی بہن کے ساتھ یہ وحشیانہ برتاؤ ایسا ہے کہ اس سے بدتر سلوک خیال میں بھی نہیں آتا۔ دین، حکومت اور قانون عیسوی نے عورتوں پر وہ مظالم کیے ہیں کہ ان کے ذکر تک سے تکلیف ہوتی ہے۔ قسطنطین اعظم کے زمانہ میں شوہر خود اپنی بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔ اور اس کا یہ فعل کوئی جرم نہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک طول طویل زمانہ تک مذہب عیسوی نے عورتوں کو جلانا قتل کرنا اور سخت ترین عذاب دینا صرف جائز ہی نہیں کیا تھا بلکہ مقدس پوپ تشدد کے ساتھ اس بارے میں فرمان جاری کرتے تھے اور فرانس، جرمن،

انگلستان اور اسکاٹلنڈ وغیرہ یورپ کے ممالک میں ہر سال لاکھوں عورتیں جادوگری کے محض لغو الزام اور بیہودہ اتہام میں نہایت ہی سنگدلی و بے رحمی کے ساتھ زندہ جلائی جاتی تھیں۔ ازمنہ متوسطہ کی تاریخیں رحمدل مقدس پادریوں کے ان ظالمانہ اور وحشیانہ کارناموں سے بھری پڑی ہیں ✤

غرض اور اس قسم کے خیالات اور قوانین تھے جن کا ساری دنیا پر قبضہ تھا اور جو مدتہائے دراز تک نشو و نما پاکر ایسے راسخ ہو گئے تھے کہ آج بھی ان کے آثار دنیا کے اکثر حصوں میں باقی ہیں اور اکثر امور کا قلع قمع تو آجتک نہ ہو سکا۔ یہ حالت تھی جبکہ :-

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت — بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جسکی دیتے بشارت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

حضرت پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والثنا کی پیدائش کے وقت تمام عالم کے مذاہب و قوانین وغیرہ نے عورتوں کے حقوق کی پامالی میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ عورتوں کی نسبت بالکل بے اصل خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو کمزور، ناقص العقل اور ادنیٰ درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ وہ مردوں کی خدمت گزار غلام اور ذرائع خواہش نفسانی تصور ہوتی تھیں۔ اسیطرح عرب میں بھی عورتوں کی نہایت پست و ذلیل حالت تھی۔ یہودیوں اور ایرانیوں کے قبیح رسوم باہم خلط ملط ہو کر عجیب و غریب صورت میں رائج تھے۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا ایک

بہت بڑی بدنصیبی خیال کی جاتی تھی۔ دخترکشی کی رسم بدعام تھی۔ جہالت کے غلبہ سے لڑکیوں کا رکھنا سخت ذلت و اہانت سمجھا جاتا تھا۔ سخت بے رحم والدین لڑکیوں کو یا تو ہوتے ہی مار ڈالتے تھے یا پال پوس کے زندہ دفن کر دیتے تھے یا پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیتے تھے یا دریا میں غرق کر دیتے تھے یا اپنے ہاتھ سے اپنے لختِ جگر کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ کثیر الازدواجی کی رسم بڑے زور شور کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ بیٹوں کو باپ کی عورتوں سے نکاح کر لینے میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کے لڑکے اپنی سگی ماؤں کو چھوڑ کر اپنی سوتیلی ماؤں کو اپنی بیویوں کے گلے میں بلا تامل شریک کر لیتے۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ کسی روز تمام لڑکے اور وہ عورتیں جمع ہوتیں ان میں سے جو کوئی عورت سے پہلے اس پر چادر ڈال دیتا وہی اس عورت کا شوہر قرار پاتا۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اس کی سب بیٹیوں کا جبراً وارث ہو جاتا اور ان سے نکاح کر لیتا۔ اوس زمانہ میں ایک شخص دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کر سکتا تھا اور نہایت قریبی رشتہ کی عورتوں سے شادی کرنا بالکل جائز تھا۔ یعنی پھوپھیوں، خالاؤں، بہنوں اور بیٹیوں وغیرہ سے وہ لوگ بلا تکلف شادیاں کر لیتے تھے۔ عورت و مرد کا تعلق یا تو بیع و شرا کے ذریعہ ہوتا یا اس طرح کہ کوئی عورت اپنے مکان پر جھنڈیاں نصب کر دیتی اور جو شخص چاہتا اُس کے مکان پر بے تکلف چلا جاتا۔ اگر کوئی عورت اُمید سے ہو جاتی تو وضع حمل کے وقت اُن تمام آدمیوں کو جو اُس کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے جمع کیا جاتا اور قیافہ شناس اُنمیں سے جس شخص کو اولاد کے ساتھ مشابہ

پاتا اوسی کو اوس کا باپ قرار دیتا اور بچہ کی پرورش اوسی کے ذمہ ہوتی۔ جس طرح کثرت ازدواج کا عربوں میں رواج تھا اُسی طرح طلاق کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ ہر مرد اپنی عورت کو بلا کسی سبب کے فوراً طلاق دے سکتا تھا اور جب چاہتا اس سے دوبارہ شادی کر سکتا۔ اگر کوئی شخص ہزار دفعہ کسی عورت کو طلاق دے اور ہزار دفعہ اس سے نکاح کرے تو کوئی عیب کی بات نہ تھی عورتوں کو وراثت میں کچھ حصہ نہ ملتا۔ تنہا مرد ہی جائداد کے مالک ہوتے تھے۔ عورتیں جائداد کا ایک جزو سمجھی جاتی تھیں اور جائداد کی طرح باپ سے بیٹے پر منتقل ہوتی تھیں غرض اسیطرح کے صدہا قبیح رسوم اوس ملک اور اوس قوم میں رائج تھے جسمیں حضرت سرور کائنات صلعم پیدا ہوئے اور جہاں آپ نے آنکھیں کھولیں لیکن کسقدر حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ اوس بے پناہ و بے یار و مددگار اُمّی یتیم نے جس کے دنیا میں قدم رکھنے کے پہلے ہی سے باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور چھ سال کی نہایت کمسنی میں ماں کا پر شفقت سایہ بھی اُٹھ گیا جس نے نہ کسی کالج یا دارالعلوم میں کبھی تعلیم پائی، نہ کسی فلسفہ و حکمت کے عالم کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا، نہ علماء و فضلاء کی صحبت اُٹھائی، نہ سقراط و بقراط و فلاطون کے مسائل سنے بلکہ جو ہمیشہ بداخلاق، وحشی اور ناتربیت یافتہ اونٹ چرانیوالوں میں جو بت پرستی، باہمی جنگ و جدال، ظلم و ستم، بے رحمی و سنگدلی اور چوری و آوارگی کے سوا کوئی کام نہ رکھتے تھے گھرا رہا، اپنی قوم اور اپنے ملک بلکہ تمام دنیا اور دنیا کے تمام مذاہب کے برخلاف عورتوں کی ذلیل

حالت کی ایسی اصلاح کی، ان کے پامال شدہ حقوق کو قایم کرکے ان کو حیات انسانی بخشی اور حسن معاشرت کے وہ وہ احکام بنائے اور ایسے عظیم الشان لاثانی اصول قایم کیئے کہ تمام دنیا کے بڑے بڑے حکما، فضلاء، فلاسفر اور حکمت و اخلاق کے عالم دنگ ہوگئے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جو شریعت اسلامی پر عبور رکھتے ہیں اور پیغمبر عرب کی تعلیم سے واقف ہیں اس بات کا اقرار ہے کہ عورتوں کی آزادی، ان کی عزت و منزلت اور ان کی حق رسی مذہب اسلام کا ایک ایسا عظیم الشان مخصوص اصول ہے کہ اس کی بنا پر وہ دوسرے تمام ادیان و مصلحان کے مقابلہ میں جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے۔ کیونکہ اس نے تیرہ سو برس اول سے عورتوں کو وہ حقوق عطا کر رکھے ہیں کہ جو یورپ کی عورتوں کو باایں ہمہ اصلاح و تہذیب اب تک نہیں حاصل ہو سکے بقول شمس العلماء مولانا شبلی "عورت جو نوع انسانی کا نصف حصہ ہے اس کے حقوق کی نسبت دنیا کے مختلف حصوں میں سیکڑوں ہزاروں قانون بنے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک اس فرقہ نے اپنے حقوق کی داد نہ پائی جبتک اسلام دنیا پر سایہ فگن نہ ہوا" یہ کچھ پیروان اسلام ہی کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ غیر اقوام کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لی بان نے اپنی مشہور کتاب "تمدن عرب" میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور لکھا ہے :-

"اسلام نے عورتوں کی حالت کی بہت اصلاح کی ہے"
اور یہی مذہب ہے جس نے ایسا کیا۔ ہ آسانی سے ثابت"

"ہو سکتا ہے کہ کل اور مذاہب میں اور کل اور اقوام میں جو عربوں سے پہلے تھیں عورتوں کی حالت بہت ہی ابتر تھی"

مسس مل پٹرک نے ایک جگہ کہا ہے کہ:-

"آج سے بارہ برس پیشتر اسلامی شرع نے جو حقوق عورتوں کو دیے تھے ہمارے متمدن آجتک بھی ان کو نہیں دینا چاہتے"

اِس آزادی و ترقی کے زمانہ میں وہ ملک جو آزادی کا سب سے بڑا مدعی ہے یعنی انگلستان عورتوں کے بعض حقوق کی نسبت ابھی تک غور و بحث کر رہا ہے۔ شادی کے بعد انگلستان میں عورتوں کی ذات ہی قائم نہیں رہتی سان کی شخصیت میں نقص آجاتا ہے اور وہ اپنے شوہروں میں فنا ہو جاتی ہیں۔ قانون ان کو بالکل مردوں کی خودرائی کے تابع کر دیتا ہے اِن کو اپنے نام سے کوئی معاہدہ کرنے یا ذاتی جائداد علٰحدہ رکھنے کا ہرگز حق نہیں بلکہ شادی کے پہلے ان کی جو کچھ جائداد ہوتی ہے شادی کے بعد وہ سب شوہر کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس بیچاری کو تو اس پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور شوہر جس طرح چاہے اُسے صرف کر سکتا ہے۔ غرض بہت سے امور ایسے ہیں جن سے عورتوں کی سراسر حق تلفی ہوتی ہے اور ان کی حریت و منزلت میں فرق آتا ہے۔ لیکن شریعت اسلامی نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے ہیں اور کامل حریت عطا کی ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو کسی بات میں مردوں سے کم نہیں رکھا۔ عورت و مرد کی روحانی، تمدنی اور قانونی،

مساوات کی تلقین کی اور مردوں کو عورتوں کے ساتھ نہایت لطف و مہربانی سے پیش آنے اور ان سے عزت و احترام کا برتاؤ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ عورتوں پر انواع و اقسام کی عقوبتیں ہوتی تھیں ان کو دور کیا۔ مردوں کی ناجائز بیعت سے نجات دلا کر ان کے انسانی حقوق کی بنیاد ڈالی اور ان کی مستقل شخصیات کو قایم کیا۔

قرآن شریف میں عورت و مرد کی مساوات کو کسقدر بہترین تشبیہ میں بیان فرمایا ہے کہ "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" یعنی عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا (سورۃ البقر ۲۔ آیت ۱۸۲) عورتوں اور مردوں کے حقوق میں کسی قسم کا فرق نہ ہونے اور دونوں کے ہم رتبہ و ہمسر ہونے کی تلقین اس سے زیادہ موثر الفاظ میں اور کیا ہو سکتی ہے کہ جیسے مردوں کا حق عورتوں پر ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر ہے (سورۃ البقر ۲۔ آیت ۲۲۸)۔ اور "مردوں نے جیسی کمائی کی ہو ان کو ان کا حصہ اور عورتوں نے جیسی کمائی کی ہو ان کو ان کا حصہ" (سورۃ النساء آیت ۳۲) اور "بیشک مسلمان مرد اور عورتیں ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، فرمان بردار مرد اور فرمان بردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، خاکسار مرد اور خاکسار عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی . . . . کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، خدا نے ان

سب کے لیے مغفرت گناہ اور اجر عظیم تیار کیا ہے" (سورۃ ۳۳ پ ۲۲ آیت ۳۵)۔ اور "یہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہارے ہی جنس کی بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم کو ان کی طرف سے راحت ملے۔ خدا نے تم دونوں میں پیار و اخلاص پیدا کیا۔" (سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۲۰)۔ عورتوں کے حقوق کو اس طرح مشخص کرنے کے بعد ان کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق تاکیدی احکام نافذ فرمائے کہ "عورتوں کے ساتھ بھلائی سے سلوک کرو" (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۲۳) اور "عورتیں اپنے حقوق پر تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں" (سورۃ النساء آیت ۲۵)"

مردوں کے دست تظلم سے رہائی بخشنے اور عورتوں کے حقوق قائم کرنے کے بعد حضرت پیغمبر اسلام نے نہایت مدبرانہ اصول کے ساتھ دوسرے شرم ناک حیوانی رسوم کا ایسا انسداد فرمایا کہ ان وحشیانہ افعال کے مرتکبین خود اپنی حرکتوں سے متنفر ہو گئے دختر کشی کا خونخوار دستور جو دوسری اقوام کیطرح ایک ایک عرب کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اور جو اس سنگدل قوم کے لیے بمنزلہ طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا اس رحمۃ للعالمین کی دلوں کو مسخر کرنے والی تعلیم کی بدولت نام کو باقی نہ رہا۔ نکاح کے ایسے اعلیٰ اصول اور بہترین قواعد مرتب فرمائے کہ اس سے حسن معاشرت اور تدبیر منزل کی بیحد ترقی ہوئی۔ عورت و مرد جو خود خالق حقیقی کے ارشاد "ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" (وہ تمہارے

دامن کی جگہ اور تم ان کی چولی کی جگہ ہو) کی رو سے ایک دوسرے کے محتاج الیہ ہیں ان کے باہمی تعلقات کو نہایت درجہ مستحکم اور پائدار کیا۔ نکاح کو ایک ایسا عہد موثق اور عقد دائمی قرار دیا کہ اس میں نفس پرستی کا شائبہ تک باقی نہ رہے اور جس سے عورت کی وقعت اور منزلت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ محصنین غیر مسافحین (سورۃ النساء ۴- آیت ۲۴) سے نکاح اسلامی کی اصلی علت بہت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ عورتوں کو اپنی مرضی کے خلاف نکاح کرنے پر مجبور نہیں رکھا بلکہ ان کے اختیار اور رضامندی پر نکاح کو منحصر کیا۔ زر مہر جو بطور قیمت کے باپ کو ملتا تھا اسکی ممانعت کی اور خود عورت کو اسکا مستحق قرار دیا۔ کثیر الازدواجی کی قدیم رسم کو بڑی حکمت اور مصلحت کے ساتھ توڑا۔ چنانچہ قرآن مجید میں "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع" یعنے اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو۔ (سورۃ النساء ۴- آیت ۳) سے کثرت ازدواج کے بیشمار عدد کو اولاً تو بہت کچھ گھٹا دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی "فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ" یعنے پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کئی بیبیوں میں برابری کے ساتھ برتاؤ نہ کر سکو گے تو اس صورت میں ایک ہی بی بی کرنا (سورۃ النساء ۴- آیت ۳) میں ایک بہت سخت اور دشوار قید لگا دی اور پھر "ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم" یعنے اور تم اپنی طرف سے بہتیرا چاہو لیکن یہ تو تم سے ہو نہیں سکے گا کہ کئی کئی بیبیوں میں پوری پوری برابری کر سکو۔

(سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۲۸) کہکر نہایت لطیف پیرایہ میں وقت واحد میں ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی قطعاً ممانعت فرمادی۔ باپ کی بیواؤں اور قریبی رشتہ کی عورتوں سے نکاح کرلینے کے خلاف فطرت دستور کو بدترین گناہ قرار دیا۔ طلاق کے نہایت باقاعدہ احکام مرتب فرماکر اسکو نہایت سخت ناگزیر حالت میں جبکہ ازدواج کی اصلی مصلحت اور علت غائی ناپید ہو رہی ہو۔ اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہو جائز کیا اور اس کو دنیا کی تمام چیزوں میں بدترین چیز کہکر اس کے مذموم ہونے اور اس سے حتی المقدور محترز رہنے کی تلقین فرمائی۔ بیواؤں کو متوفی شوہر کی جائداد اور میراث سمجھ کر ان پر قابض ہو بیٹھنے کے رواج کو سختی کے ساتھ موقوف کیا۔ اور تاکید کی کہ "مسلمانوں! تم کو روا نہیں کہ عورتوں کو میراث میں سمجھکر زبردستی ان پر قبضہ کرلو" (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۲۳) عورتوں کی وراثت قایم کی اور ترکہ میں ان کو مردوں کا حصہ دار قرار دیا اور ہدایت کی کہ "ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں تھوڑا ہو یا بہت مردوں کا حصہ ہے اور ایسا ہی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں عورتوں کا بھی حصہ ہے اور یہ ہمارا ٹھیرایا ہوا ہے" (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۷) یکسر بے یار و مددگار یتیم لڑکیوں کو اپنی ولایت میں لیکر ان کے مال و اسباب پر قابض ہونے کی نیت سے ان کے ساتھ شادی کرنے کو جس کا کثرت سے رواج تھا منع کیا سخت و شدید احکام نافذ کرکے عورتوں کی تذلیل کے خیالات کو مردوں کے دلوں سے دور کیا۔ مردوں کو عورتوں کی توہین کرنے کی

جسارت سے روکا اور اسباب کی تلقین فرمائی کہ "جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لاسکیں تو اسّی درّے مارو اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یہ لوگ خود بدکار ہیں" (سورۃ النور ۲۴ - آیت ۴) اور "جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں جو بے چاریاں ایسی باتوں سے محض بے خبر ہیں اور ایمان رکھتی ہیں ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ملعون ہیں۔ اور قیامت میں ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا" (سورۃ النور ۲۴ - آیت ۲۳)۔ غرض اسلام نے عورتوں کی حق رسی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور ان کی حالت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کو از سر نو حیات انسانی حاصل ہوئی۔ عورتوں کے اسلامی حقوق اور حضرت پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی اصلاحوں کے متعلق جن کا نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ اوپر ذکر کیا گیا ہے نواب محسن الملک مرحوم فرماتے ہیں کہ:-

"عرب کے پیغمبر نے عورتوں کو روحانی زندگی میں بالکل مردوں کے برابر کر دیا۔ اتنا فرق بھی ان میں نہیں رکھا جیسا کہ دائیں بائیں ہاتھ یا سولہ آنے و روپیہ میں ہے۔ وہ اسی طرح نیکی کر سکتی ہیں جس طرح کہ مرد۔ وہ اسی طرح روحانی ترقی پا سکتی ہیں جس طرح کہ مرد۔ کوئی مذہبی نیکی ایسی نہیں ہے جو مرد پا سکتا ہو یا کر سکتا ہو اور وہ نیکی عورت کے لیے نہ ہو۔ ان کے دنیاوی حقوق سے بھی غفلت نہیں کی۔ وہ اسی طرح اپنے مال کی مالک ہیں جیسا کہ مرد وہ سب قسم کے معاہدہ کی مجاز ہیں اپنی جائداد کی خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ وہ خود آپ مالک ہیں۔ ہبہ کر سکتی ہیں۔ بیع کر سکتی ہیں۔ تمام تصرفات جو مرد کر سکتا ہے وہ بھی

کرسکتی ہیں۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"عورتوں کے حق میں آزادی، بیہودی، تہذیب اور عفت،
لباس میں احترام اور ان سے گفتگو میں ادب کے احکام
جاری کیے اور ایسے احکام ان کی حالت کے موافق اور
مناسب صادر کیے جو حکمائے سابقین سے نہ ہو سکے
تھے اور ایسے ایسے احکام جن کو بجز اس خالق حقیقی کے
جو مرد اور عورت کی فطرت اصلی سے واقف اور ان کا بنانے
والا ہو اور کوئی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ جو بدرسمیں اور قبیح رواج
عورتوں کی نسبت تھے اور جو کچھ ان کے حق میں ظلم و زیادتی مردوں
کی طرف سے ہوا کرتی تھی ان سب باتوں کی اصلاح کی۔ . . . ."

". . . عورت کو قرآن نے جملہ حقوق اور اختیارات میں
مرد کے ہم رتبہ اور تمام قابلیتوں میں مردوں کے مساوی
قرار دیا ہے . . . . . قرآن نے عورت اور
مرد کی باہمی گزران میں کمال عدالت اور محبت کو برابر قایم رکھنا
ضرور قرار دیا ہے اور مہر کا تقرر اور نکاح فسخ ہونے کی
صورت میں واجب الادا اور ناقابل نقصان ہونے کی وجہ
سے عورت کو خوش دل مطمئن رہنے اور مرد کو اسکا نیازمند
اور محتاج الیہا ہونے اور ہمیشہ کو ملے رہنے کی تدبیر کردی
اتحاد زوجین کی برکت اور مسرت اور اس کے نتیجہ میں حسن
معاشرت کیحالت سے قرآن خوب واقف ہے۔"

شمس العلما مولانا شبلی نے اپنی مشہور کتاب "الکلام" میں بیان کیا ہے کہ:-

ترقی تمدن کے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر قایم کیئے جائیں۔ اسلام سے پہلے تمام دنیا کا عمل اس اصول کے خلاف تھا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس کی تلقین کی ....."

سب سے پہلے قرآن مجید نے یہ بتایا کہ عورت و مرد میں کس قسم کا فطری تعلق ہے اور یہ کہ عورت انسانی معاشرت کی جزو اعظم اور مرد کی راحت و تسلی ہے .....

مرد عورت برابر درجہ کے دو رفیق ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج الیہ ہیں۔ دونوں کے تعلقات۔ دونوں کی حیثیت۔ دونوں کے حقوق برابر درجہ کے ہیں.....

قرابت کے تعلقات کے جو مدارج ہیں ان میں مرد عورت ایک درجہ پر ہیں۔ مثلاً ماں۔ باپ کا ایک درجہ ہے۔ بہن بھائی کی ایک حیثیت ہے۔ چچا اور پھوپھی کا یکساں مرتبہ ہے قرآن مجید میں ماں باپ کا جہاں ذکر ہے برابر درجہ کی حیثیت سے ذکر ہے ..... روزانہ معاشرت میں عورتوں کے ساتھ جس لطف محبت۔ یگانگت۔ مساوات کے ساتھ پیش آنا" چاہیئے اس کو (قرآن شریف نے ان جامع الفاظ میں ادا کیا وعاشروھن بالمعروف ..... قرآن مجید نے .. مختلف پیرایوں میں یہ تلقین کی کہ مرد و عورت کا تعلق نفس پرستی اور رفع .... کے لیے نہیں ہے بلکہ

"حسن معاشرت اور پائدار ربط و الفت کے لیے ہے"

حضرت سرور کائنات رحمۃ للعالمین صلعم عورتوں کے ساتھ جس لطف و عنایت اور جس توقیر و احترام سے پیش آتے تھے اور جس لحاظ و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور آپ کے دلیں عورتوں کی جو عزت و آبروئی اور جو ہمدردی و رحم و کرم آپ اپنے ہمیشہ ظاہر فرمایا کرتے تھے اسکو ساری دنیا جانتی ہے بلکہ بعض تنگ خیال مخالفین نے تو آپ پر اس بارے میں طعن و تشنیع بھی کی ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے اس دنیا کی تین چیزیں نہایت درجہ عزیز ہیں۔ عورتیں، خوشبو اور نماز"۔ آپ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ اس قدر عزت و آبرو اور عدل و انصاف سے پیش آتے تھے کہ آپ کو حالت نزع تک میں ان امور کا خیال تھا۔ اپنی بیویوں کے ساتھ آپ کے اخلاق و شفقت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعض دفعہ وہ آپ سے زبان درازی بھی کر بیٹھتی تھیں مگر آپ ہمیشہ نہایت نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کو تماشہ دکھلاتے اور آپ گھنٹوں اپنے آڑ کیے کھڑے رہتے تھے۔ اور کبھی کسیکو ناراضی کا ذرا بھی موقع نہ دیتے تھے مختلف پیرایوں میں آپنے اس بات کی سخت تاکید کی کہ اسی طرح پیروان اسلام بھی عورتوں کے ساتھ باہمی ربط و الفت اور مساوات و یگانگت کے برتاؤ میں کبھی غفلت نہ کریں آپ کے حکیمانہ ارشادات اس بارے میں ایسے ہیں کہ ان سے قیامت تک عورتوں کی حمایت اور ان کی اصلاح کی ترغیب و تحریص ہوتی رہے گی۔ آپ کا یہ فرمانا کہ "کامل الایمان وہ شخص ہے کہ جس کا خلق عمدہ ہو اور جو اپنی بی بی کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتا ہو" اور "تم میں سب سے نیک کردار شخص وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ عمدگی اور نیکی سے پیش آتے ہیں"

اور عورتوں کے ساتھ بھلائی اور نکوئی کرنے میں میری نصیحت قبول کرو اس لیئے کہ وہ تمھاری اعوان و مددگار ہیں" عورتوں کے اعزاز اور حقوق نسواں کی حفاظت کی بہت بڑی ضمانت ہے بالمختصر یہ کہ اسلام کے ان تاکیدی احکام نے سب سے پہلے دنیا میں عورتوں کی حمایت کی اور ایسی حمایت کی کہ ان خیالات میں جو عورتوں کے خلاف ایک نامعلوم زمانہ سے سارے عالم پر طاری تھے ایک عظیم الشان انقلاب ڈالدیا۔ عورتوں کی تمدنی حالت کی اصلاح، خانگی تعلقات کی تہذیب اور نظام معاشرت کے استحکام میں کوئی بات باقی نہ رکھی ان کا وقار قایم کیا اور ان کو اپنے افکار و اعمال اور ارادوں میں مستقل بالذات اور حریت سے جو ہر انسان کا فطرتی حق ہے کامل طور پر متمتع کیا۔ عورتوں کے متعلق اسلام کے یہ بے نظیر احکام اور جناب پیغمبر اسلام کی یہ مکمل تعلیم فطرت انسانی کی ایسے زبردست واقفیت پر مبنی ہے کہ باوجود سخت کوششوں کے آجتک کسی نے کوئی اس سے بہتر قانون مرتب کیا جا سکا اور نہ اس میں اتنی مدت مدید گزر چکنے کے سبب کوئی بات ضروریات زمانہ کے لحاظ سے قابل ترمیم محسوس کی جا سکی۔ یہ بہت بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ اسلام کی تمدنی اصلاحیں عین منشائے فطرت کے مطابق من جانب اللہ عمل میں آئی ہیں اور اس میں ایک ایسی قوت شریک ہے جو انسانی فطرت اور اوس کی ترقی کی انتہا سے خوب واقف ہے فقط

سید خورشید علی۔

حیدرآباد دکن۔

جُرمِ وفا

سیّد محمد شوکت علی (جو ہمیشہ اپنے تئیں ۔ اس ۔ ام سوکٹہلے لکھا کرتے ہیں) "عفت آباد" کے نوجوان اور مقتدر رئیسوں میں ہیں۔ چند ماہ ہوئے کہ پانچ سال کے بعد ولایت سے واپس آئے ہیں ان کے والد نے جو پرانے تعلیم یافتہ اور نہایت شایستہ لوگوں میں تھے، جب ان حضرت کو بغرض تعلیم ولایت روانہ کیا تھا، ان کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔ بدقسمتی سے خاندان کی ایک لڑکی سے رشتہ عقد قائم ہوچکا تھا، اور ان کے اس طویل مگر پُر امید سفر کے وقت، اوسکو چند بار ان کے دیکھنے کا موقعہ دے دیا گیا تھا۔ زکیہ، ایک قبول صورت اُردو فارسی پڑھی، نہایت سلیقہ مند، باتمیز ۱۹ سالہ لڑکی ہے۔ شرم وحیا تسلیم ورضا، طاعت ومحبت سے تو گویا اسکا خمیر ہوا ہے۔ عورتیں عموماً نازک دل ہوتی ہیں، اسلئے جب وہ کسی سے محبت کرتی ہیں، تو اون کا دردمند دل واقعی قابل رحم ہوتا ہے۔ اگر شوہر نے اون کے پُرسوز قلب پر ہاتھ نہ رکھکے اون کے محبت وپیار کی داد دیدی، تو خیر، غریبوں کو ثمرۂ درد ملجاتا ہے ورنہ پھر تو اون کے حسرت ویاس کا بیان درحقیقت نہایت حسرت انگیز وخونچکاں ہوتا ہے، غریب زکیہ اونہیں بدنصیب لڑکیوں میں سے ہے، جو ناقدری بیدردی، اور ظالمانہ طرز عمل کا شکار ہورہی ہیں۔

مسٹر شوکت علی کیمبرج کے بی۔ اے، نئی روشنی کے دلدادہ، پردے کے مخالف، انگریزی داں بیوی کے متمنی، فیشن کے مارے ہوئے، ایک نوجوان، ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ تو کہئے ان کی والد کی موت نے ولایت میں انکو

زیادہ فارغ البال زندگی بسر کرنے کا موقعہ نہیں دیا، ورنہ اپنے جدید مذاق کے موافق وہاں سے لیڈی لانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ ذیل کا مکالمہ ولایت سے آنے کے بعد اوس وقت کا ہے، جب ڈپٹی صاحب چار روز کی رخصت لیکر وطن آئے ہوئے ہیں اور اگلی صبحکو اپنی ملازمت پر واپس جانے والے ہیں۔ اتفاق سے غریب و بدنصیب رکیہ کو جو تنہائی نصیب ہوئی اور شوہر کا مزاج کچھ سیدھا پایا، تو اپنی دکھ بھری کہانی سنانی شروع کی جسپر قابل شوہر کا التفات قابل ملاحظہ ہے۔ افسوس ہے کہ یہ ہمارا قصہ سمجھئے یا ڈراما، مکالمہ سمجھئے یا فسانہ، صرف ایک ہی سین پر ختم ہو گیا ورنہ ہم نے تو یہ ارادہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اِن کے حالات سے پبلک کو آگاہ کرتے رہیں گے۔ سعیدہ (۵ سالہ لڑکی) اس بدقسمت مواصلت کا ایک ثمر ہے۔

شوکت (شوہر)
زکیہ (بیوی)
سعیدہ (لڑکی)۔

سین

(شوکت منزل، خوابگاہ، وقت ۱۱ بجے شب)

شوکت:- چار دن کی میری رخصت ختم ہو جائے گی کل
روکنا مجھکو تمھارا اب ہے بالکل بے محل
اے زکیہ تم نئی تہذیب سے ہو بے خبر
ہے تمھارا فرض دیکھو میرا اسباب سفر

صبح کو تیار رہنا چاہیئے سامان سب
کس طرح شائستگی کے تم کو سکھلاؤں میں ڈھب

زکیہ:- جانے کا تم نے اپنے ذکر چھیڑ کے پھر رُلا دیا
لاکھوں ہی دل میں تھے خیال سب کو مگر مٹا دیا
کیسے غضب دکھاؤں میں چیر کے اپنے دل کو ہائے
زخم ہیں سب ہرے تمہیں چاہے نہ اعتبار آئے
سوچتی ہوں کہ صبح کو مجھ سے جو ہو گے تم جدا
کیسے کروں گی ضبط میں کیسے سنبھلوں گی اے خدا
ایسی ہی جلدی تھی تمہیں جانے کی تو پھر آئے کیوں
قصد جو ہو رُلانے کا، پہلے کوئی بتائے کیوں
پوری ہوئی نہ ایک بھی آرزو اور تم چلے
مٹ گئیں ساری حسرتیں، بجھ گئے سارے ولولے
بیٹھے نہ جم کے دو گھڑی آئے کبھی جو میری پاس
پوچھا نہ تم نے پیار سے "کیوں ہے تو اتنی بدحواس"
کٹ گئی آدھی رات جب تب کہیں اونگھ کے آئے تم
اس پہ بھی فرطِ خواب سے آنکھ تھی بند ہوش گم
لیٹے جو تھے تو منہ نہ تم میری طرف سے موڑتے
کچھ نہ تمہیں فتن ہوا دل مرا ہائے توڑتے
میں وہ بُری سہی مگر، اتنا بھی کیا بھلا حذر
پوچھا نہ تم نے یہ کبھی "تکیہ ہے آج کیسا تر"
منہ سے نہ نکلا یہ کبھی "کیوں تری آنکھ لال ہے"
ہچکیاں کیوں ہیں دمبدم کیوں ترا جی نڈھال ہے"
اس پہ بھی صبر تھا بھلے، اس کا بھی تھا نہ شکوہ گلہ
میری محبتوں کا یہ تم نے مگر ملا صلہ
میں نے جو چھو لیا تمہیں ہات نہ تم مروڑتے
تھوڑا سا خون جو دل میں تھا وہ تو نہ تم نچوڑتے
اٹھتی ہوں جب میں رات کو، ہوتی نہیں تمہیں خبر
شکل تمہاری ہوتی ہے اور مری پاس کی نظر
چومتی ہوں تمہارے لب دیتے ہو جنبشی گالیاں
کرتی ہوں پیار ہات کو جس سے دکھاؤ بالیاں

پوچھوں جبیں سے میں عرق، سنگھوں تمہارے بال کو
چونک پڑو تو بار بار پوچھوں تمہارے حال کو
کل جو لگی تمہارے پھانس میں نے کہا تمہیں دکھاؤ
اتنے پہ تم بگڑ گئے، مار کے کہہ دیا کہ جاؤ
رہ گئی جی مسوس کر سن کے تمہاری جھڑکیاں
کوسنے میں جا کے ڈال دیں ٹوٹ گئیں جو چوڑیاں
ہات پہ ہیر سے پڑ گئے داغ تمام نیل کے
چاہ کی یہ نشانیاں پاس ہیں بجز ذلیل کے
تم کو نہ چاہتی تو کیوں مستحق ہوتی مار کی +
اس سے زیادہ ہو سزا ایسے گناہ گار کی
دیتی ہوں تم پہ دم جو میں سنتی ہوں یہ ملامتیں
لے لو جو جان بھی مری، مجھ کو نہ ہو شکایتیں
سوچتی ہوں کہ اس پہ جب کرتی ہوں تم پہ جاں فدا
چاہو مجھے جو اک ذرا، اور بھی حال ہے بُرا
تم کو ہو وقت دریا نہ ہو، مجھکو وفا پہ ناز ہے
طالب داد میں نہیں، دل مرا بے نیاز ہے
ہاں یہ کہوں گی میں ضرور تم کو جو اجتناب ہے
تلخ ہے میری زندگی، ماز ست مری خراب ہے
دل میں تمہیں کرو خیال جب یہ تمہارا رنگ ہو
جی میں ہو میرے کیا خوشی قلب میں کیا امنگ ہو
میں تو یہ جانتی تھی ہائے، لوٹ کے جب تم آؤ گے
سینکڑوں خند ہائے عیش بہر زکیۃ لاؤ گے
آ کے تو تم نے اور بھی حال خراب کر دیا
کاسۂ عمر کو مرے وقت سے پہلے بھر دیا
تھی میں جبھی مرے میں تم پہ نے تھے قلب و زار میں
لطف زیادہ وصل سے مجھکو تھا انتظار میں۔
تم سے زیادہ باوفا، آہ، تمہاری یاد تھی
دل میں تمہاری آرزو لے کے میں کیسی شاد تھی
ہائے وہ ساری حسرتیں میری وفا نہ ہو سکیں

رہ گئی اک میں بدنصیب اور وہ رسوا نہ ہو گئیں
اب نہ وہ شوق ہے نہ دل، رنگ ہے وہ نہ روپ ہے
زندگی میری پیٹر کی چوٹی کی گویا دھوپ ہے
کس کے لیئے نہاؤں میں کس کے لیے سنواروں بال
کس کے لیئے میں بیٹھوں آہ کر کے حنا سے مات لال
دیکھے گا میری کون چھپ۔ مجھکو کرے گا کون پیار
چاہنے والا کون ہے جس کے لیے کروں سنگار
سونگھے گا کون بار بار سینے پہ میرے ہار کو
دیکھے گا چاندنی میں آہ کون مرے نکھار کو۔
کون ہے جو ہنسائے گا گدگدی کر کے بات سے
کون ہے وہ تسلیاں ٹپکیں گی جس کی بات سے
کون ہے جو مکا کرے آنکھ کو میرے سینے سے
کس کے لیے سجاؤں گی بیج کو میں قرینے سے
گوندھوں گی بالیوں میں پھول کس کے شکھانے کیلئے
آئینہ دیکھوں آہ میں کس کے دکھانے کیلئے
مجھ سے تمھیں کہو ذرا بات اگر خراب ہو
دل میں نہ کیوں اُمنگ ہو جوش پہ جب شباب ہو
ہائے یہ کیا میں کہہ گئی سنتے یہ کیا نکل گیا
دیکھا تمھیں جو آج جوش میرا دماغ ٹل گیا
ورنہ کہاں یہ آرزو اور کہاں میں بدنصیب
کیسے ہو شاد کام کوئی اوس سے خفا ہو جب حبیب
خیر معاف ہو خطا حد سے زیادہ بڑھ گئی
دیکھ لو اتنی بات پر تیوری تمھاری چڑھ گئی
دل سے بھلا دو یہ گلہ، جوڑتی ہوں تمھارے ہاتھ
اب کے زبان کاٹ لو نکلے کبھی جو ایسی بات
مجھکو ہے بس یہی بہت، دیکھ لوں تمکو دور سے
مجھکو ہوس نہ عیش کی اور نہ غرض سرور سے
مجھکو بُرا کہا کرو اور میں دعا دیا کروں
مارو جو تم بلائیں میں بات کی سے لیا کروں

چیزیں تمھاری دیکھ کے بیٹھی ہوں میں ابھی ابھی
میرے خیال میں تو اب کچھ نہیں رہ گئی کمی
ہیٹ[۱] ہے باہر اک فقط، اس کے لیے جو حکم ہو
اوسکو کروں نہ بند میں، پہنوا دے جو صبح کو
شوکت:- شکر ہے قصے کو اپنے کر دیا تم نے تمام
میں تو سمجھا تھا کہ میرا آج ہو جائے گا کام
سنتے سنتے پک گیا جی، سر مرا چکرا گیا
میں نہ سمجھا مطلب آخر کیا تھا اس سے آپ کا
تہائت پُر درد قصہ مانتا ہوں میں اسے
پر نہ یہ سمجھیں سنانے جا رہی ہو تم کسے
جسکو نفرت ہے تمھارے طرز سے انداز سے
جو خفا ہے عشرتِ ہندوستاں کے راز سے
تکو گر ایسا ہی تھا ہینڈ[۲] کا اپنے خیال
ٹو گرسی[۳] لے لینا کوئی ایسا نہ تھا تم کو محال
طرزِ انگلش[۴] سیکھتیں انداز انگلش سیکھتیں
بال[۵] میں جا جا کے لحنِ ساز انگلش سیکھتیں
تم ڈرائنگ[۶] رُوم کے آداب سے واقف نہیں
ساتھ کھانے کے شرابِ ناب سے واقف نہیں
جان دو پردے پہ تم جو ہے طریق جاہلاں
تم کو کیا معلوم ہے کس طرح رفتار جہاں
گون[۷] پہنو شام کو کنسرٹ کو نکلو ذرا۔
یہ نہیں ہر وقت بس گھیرے رہیں اتا دَدا
سیکھو بائسکل پہ چڑھنا مشق گھوڑے کی کرو
شرم کرنا چاہیئے یوں قید میں گھٹ گھٹ مرو
ہاتھ رنگنا، پان کھانا ہیں عبث یہ چونچلے
قابلِ نفرت ہیں سب یہ اولڈ فیشن[۸] ولولے

---

۱ انگریزی ٹوپی۔ ۲ شوہر۔ ۳ سند تعلیم۔ ۴ انگریزی۔ ۵ محفل رقص سرور ۱۲
۶ کمرہ ملاقات۔ ۷ سایہ انگریزی عورتوں کی پوشش ۸ پرانا طرز ۱۲

سر مسی چھوڑ دو زیور اوٹھا کر پھینکدو
ہات میں اک ایک چوڑی، کان میں آویزہ ہو
بے جھجک ہو کر ملو احباب سے میرے جو آئین
شیک ہینڈ اون سے کرو جب اوٹھہ کے اپنے گھر کو جائین

زکیہ: شکر ہے آج کھل گئے بات تو تم نے اتنی کی
جان گئی سمجھ گئی باعث نفرت دلی
گرچہ تمھارا یہہ خیال میرے لیے ہے دلخراش
سن کے تمھاری گفتگو اور بھی دل ہے پاش پاش
خوش ہوں مگر کہ حال تو دل کا مجھے سنا دیا
طرز معاشرت تو خیر تم نے مجھے بتا دیا
مجھہ میں کہاں یہ تاب ہے، دوں میں اولٹ کر کچھہ جواب
پوچھنا چاہتی ہوں یہ، مجھہ پہ نہ ہو اگر عتاب
فرض تھا آپ کا مجھے آکے سکھاتے طرز نو
کیسے بقول آپ کے بند قفس میں آتی صو
جانتی ہوں نہیں برا غیر زبان جاننا
خوبیاں ہوں جو اور میں فرض ہے اونکو ماننا
بالی بھی پھینکدونگی میں، چوڑی بھی توڑ دونگی میں
مہندی نہ اب لگاؤں گی، پان بھی چھوڑ دونگی میں
اس کے علاوہ گون[1] بھی کرلوں گی خیر میں قبول
پیا[2] تو بھی سیکھ لوں گی میں ہوتے ہو تم اگر ملول
مجھہ سے نہ ہوگا پہ مگر توڑ دوں پردہ حیا۔
ایسی گھڑی جو آئے تو مجھکو نہ رکھیو اے خدا
غیر کی مجھہ پہ ہو نگاہ۔ کانپ گئی لرز گئی۔
تم نے یہ کیا کہا غضب، جس سے عرق عرق ہوئی
ہوتی مجھے فقط جو شرم ایک تمہارے نام کی
تو رکھ کے پھینکدیتی میں بیڑیاں روک تھام کی
سینکڑوں پشت سے مگر خون حیا رگوں میں ہے
مدتیں ہوگئیں مگر آب وہی نگوں میں ہے

---

[1] سایہ۔ [2] انگریزی مسز ۱۲

پہلے بدن کا خون سب فصد سے تم نچوڑ دو۔
پھر جو جیوں تو شوق سے پردے کو میرے توڑ دو
یوں تو مگر محال ہے، غیر سے آنکھ چار ہو
چاہے عدو ہو وہ کوئی، چاہے تمہارا یار ہو
پردے کے ساتھ اب اگر ملنے سے تم کو عار ہے
مرضی تمہاری، چھوڑ دو، کیا مجھے اختیار ہے
بندے کا اوس میں زور کیا ہو جو نصیب ہی خراب
سینے میں ہوگی آگ جب، آپ ہی ہوگا دل کباب
روتی تھی جب بھی میں غریب، روؤنگی اب بھی بے نصیب
تم سے نہ مل سکوں گی اب دور ہو مجھ سے یا قریب
ہائے مجھے خسر نہ تھی یوں مجھ کو تم ستاؤ گے
سیر کرو گے دور سے اور مجھے جلاؤ گے
لاکھ ہوں مجھ پہ ظلم و جور، منہ سے نہ کچھ نکالوں گی
اپنے ہی بس نصیب پر صبر میں سارا ڈالونگی
خوش رہو تم جہاں رہو دیکھو نہ میری مم جلن
مجھ کو ملیں خدا کرے، تم سے جو دور ہوں محن

شوکت:- سچ کہوں میں اے زکیہ یہ خیال اچھا نہیں
ہے سمجھ مجھ میں بھی اتنی سر میں کچھ سودا نہیں
رسم ہے پردہ بزرگوں کی خیال خام ہے
اون پہ یہ بہتان ہے، طوفان ہے، الزام ہے
کہہ رہی ہے ہسٹری اب بھی عرب کا صاف حال
تھا برائے نام پردہ اون میں وہ بھی خال خال
پیروی مقصود ہے اون کی تو ویسا ہی کرو
خود مرد مجلس میں اور الزام سب اون پر دھرو
بات ہے وہ کون سی پردے میں جو ستور ہے
جہل سے نزدیک لیکن عقل سے تو دور ہے
ہے اگر منظور تم کو یہ چلو کل میرے ساتھ
ورنہ ہے تم کو قسم اب جو لگاؤ میرے ہاتھ

زکیہ بیٹھ لیا میں نے سر پہ ہاتھ نہ اب لگاؤں گی
تم سے اوٹھا لیا جو ہاتھ، جینے سے بھی اوٹھاؤنگی
تم سے تو عدل ہو چکا رحم بھی تمکو آ چکا
ہیبے کی یہ کمی مگر دے گی میرا فیصلہ
تم بھی نہ اب لگاؤ ہات، لو یہ میں اوسکو کھا گئی
پردۂ زیست ہی چلو خوش ہو کہ میں اوٹھا گئی
جاؤ گے تم وطن سے جب میں بھی جہاں سے جاؤں گی۔
یہ بھی نصیب ہے تمہیں مر کے بھی میں نہ پاؤنگی
دل میں تھی آرزو یہی زانوں پہ دوں تمہاری جاں
ہائے یہ کیا نکل گیا میری زباں سے الاماں
میری خطا ہو درگذر، بھول گئی میں عہد و قول
تمکو ہراس کیا ہے اب، جی میں تمہاری کیوں ہو ل
کیا ہوا میں جو مر گئی، سمجھو کہ اک کنز تھی
ایسی میں زندگی میں کون تمکو بڑی عزیز تھی
فکر ہے تمکو اب عبث، رنج سے فائدہ ہی کیا
تیر کماں سے چھٹ گیا ہونا تھا جو سو ہو گیا
جائیے اب پلنگ پر راحت و خواب کیجئے
فرش زمین پہ مجھکو آپ یونہی تڑپنے دیجئے
اس طرح جائیے گا آپ اوٹھ کے یہانسے صبحکو
حال نہ کچھ کھلے مرا، اور خبر نہ گھر میں ہو
ورنہ قیام آپ کو کرنا پڑے گا پھر ضرور
دفن بھی اوسکو کیوں کریں، آپ ہوں جس سے یوں نفور
ہوتی ہیں مشکلیاں شروع، اب نہیں تاب گفتگو
بہر خدا نہ غل کریں آپ جو ہو کوں میں لہو۔
دل کے جو ٹکڑے دیکھنا جی کو ذرا سنبھالنا
ہو ڈی سی خاک ہو الگر پانوں سے روند ڈالنا
اب تو میں جاتی ہوں مگر اتنی ہے تم سے آرزو
بچی کا میرے ہائے تم یوں نہ بہائیو لہو۔
ننھی سی اوسکی جان ہے توڑ دیا جو دل ابھی

پیر نہ شگفتہ پائے گے سو کہہ گئی جو یہہ کلی
ایسا غضب نہ ہو کہیں جا کے اسے جگا دو تم
ڈرتے کہیں ہم نہ جائے جاگے تو تھپتھپا دو تم
صبحگہاں کی لاش بھی اپنی وہ دیکھنے نہ پائے
سوتا سمجھ کے مجھکو وہ ایسا نہ ہو کہ دوڑ آئے
مجھ میں نہیں ہیں اب حواس کیا میں کروں گی اسکو پیار
سوچتی ہوں نہیں کہیں، ہونے نہ پائے دلفگار
جب کبھی میرے قبر پر میرے چوتھے ہو گذر
نہنی بھی ساتھ ساتھ ہو، یہ نہ ہو چھوڑ آ دگھر
جان تھی میری ہائے وہ آنکھوں کی میری نور تھی
میرے دل فسردہ کی عیش تھی وہ سرور تھی
تمکو نہ اوسکا پیار ہو، مجھکو تو جان سے تھی سوا
میرے لیے نہ وہ کڑھے بس یہی خیال ہے ذرا
سر پہ جو ہاتھ رکھو گے ایسا نہ جی گھبرائے گی
یاد کرے گی چار دن پھر تو بہل ہی جائیگی
اب نہیں مجھ میں تاب ضبط لیجئے آخری سلام
نخل مراد بار ور، اور نصیب شاد کام

نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری

انڈین پریس الہ آباد کا رسالہ **ادیب** جس گرمی سے زبان اردو کی خدمت کر رہا ہے وہ قدر دانان اردو سے پوشیدہ نہیں منشی نوبت رائے صاحب نظر سابق ایڈیٹر کی علیحدگی سے احتمال تھا کہ ادیب کو نقصان نہ پہونچ جائے مگر منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی ایڈیٹری نے یہ یقین دلا دیا کہ رسالہ روز افزوں ترقی کرے گا۔ جون جولائی کے دونو نمبر ایک بڑھ چڑھ کر نکلے ہیں۔ متعدد رنگین و سادہ تصاویر نے مضامین کی شان اور بھی بلند کر دی ہے ہم اس کامیابی پر اپنے محترم دوست منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کو دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

زیارت قاہرہ و استنبول

نمبر (۲)

پورٹ سعید مصر کا پہلا شہر تھا جو میں نے دیکھا؛ مگر کیا یہ مصر کا شہر تھا، یا اٹلی یا یونان کا ایک بندرگاہ؟ نظر کو دھوکا ہوتا تھا اور خیال مشوش۔ بازار، قہوہ خانے، اسٹارنٹ، لوقنطی یورپینوں سے بھرے پڑے تھے۔ کہیں یہ مصروف کسب تھے، کہیں منہمک عیش۔ دوکانوں میں سب مال و اسباب تو یورپ کا تھا ہی، بیچنے والے بھی یورپ کے ہی تھے۔ کسی اچھے قہوہ خانے میں گھس جائیے وہاں عربی کم سنائی دے گی۔ فرانسیسی، اٹیالین، اور یونانی۔ زبانیں سامعہ خراب نواز ہونگی۔ پہلے ہی دن مجھے ثابت ہوگیا کہ اٹیالین اور فرنچ اور گریک لوگ بیسویں صدی میں، اہل مصر سے بنی اسرائیل کا بدلہ لے رہے ہیں (کہ آئیں جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد) حضرت موسےٰ تو غالباً اس سے بہت خوش ہوتے ہوں گے، مگر جس بنی کے اہل مصر اب نام لیوا ہیں، وہ؟

ہندوستان اور ان ممالک کی معاشرت میں بین فرق نظر آیا۔ اب ہم اس ملک میں تھے جہاں برقع، بازار میں، اسٹیشن پر، سیرگاہوں اور ناچوں میں ہر جگہ نظر آتا تھا۔ ہندوستان کیطرح صرف عورتوں کے ویٹنگ روم، اور اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم پر ہی۔ اور وہ بھی بدرجۂ آخر اور بدرجۂ مجبوری۔ دکھائی نہیں دیتا وہ

مسترحم اور دادخواہ نگر ساتھ ہی ساتھ شرارپاش جگردوز، ستمگری اور بے امانگاہیں جو کچھ نقاب کے پیچھے ہی سے برہم کن متانت ہوتی ہیں، وہاں آپ ہر طرف سے پڑتی ہیں۔ پورٹ سعید میں اسقدر نہیں۔ ان کے لیے قاہرہ جایئے اور اسکا پورا زور، کامل ہجوم دیکھنا ہو تو ذرا اور آگے بڑھیئے، ذرا اور آگے اور استنبول پہونچئے پورٹ سعید بھی اور بندرگاہوں کی طرح جو محض بندرگاہ ہوں خصوصیات رکھتا ہے علمی چرچے کم اور تجارتی مشغولیتیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ مصر میں لباس میں رنگا رنگی کم اور یکسانیت زیادہ نظر آتی ہے یہ خصوصیت خدا نے ہندوستان ہی کو عطا فرمائی ہے کہ جتنے آدمی اتنے ہی لباس کے فیشن۔

پورٹ سعید کو ہم نے فی امان اللہ کہا اور کم سے کم ایک شخص نے تو ہمیں بھی پورٹ سعید میں "مع السلامۃ" کہہ کے رخصت کیا، اور ہم اسٹیشن پہونچے اسٹیشن پر؟ نہیں "محطہ" پر؛ اور قلی، نہیں شیّال نے، ہمارا اسباب نہیں عفش، بک، نہیں تخلیص کرایا۔ اسٹیشن پر نہایت پاکیزہ خط نسخ میں نوٹس بورڈوں پر لکھا ہوا تھا۔

"ناظر المحطہ"۔ "للستات التخلیص" نیچے "اسٹیشن ماسٹر فاریڈ" یہ "بکنگ لکھا ہوا

بادیۃ المصر اور بادیۃ السودان میں ایک سانڈنی سوار کو جس کی زبان پیاس کے مارے تالو سے لگ گئی ہو، کوئی اونس اور کوئی پیالہ ٹھنڈے پانی کا وہ جان نہ بخشتا ہوگا جو ان الفاظ نے مجھے بخشی، اور میں نے ان الفاظ کو پی کر اپنی جان کو خوب ہی خوب طراوت پہونچائی

ٹرین آئی، اور اسپر ایک گاڑی پر لکھا ہوا تھا "للحریم" اُف! صرف عورتوں کے لیے" دیکھتے دیکھتے طبیعت اسقدر اکتا گئی تھی کہ للحریم" کا لطف کوئی

مجھسے پوچھے۔

ٹرین پر ہم سوار ہو گئے۔ صبح کا وقت تھا، ٹرین نے حرکت کی، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آکر مجھے لگنے لگی۔ یہ نسیم کزدیار مصر خیزد، تھی تین بجے کے قریب، ہم قاہرہ پہونچے۔ یہ میں آپ کے سمجھنے کے لیئے قاہرہ کہتا ہوں، ورنہ مجھے کہنا چاہیئے ہم مصر پہونچے، کیوں کہ اہل مصر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔

مصر القاہرہ کا اسٹیشن عالی شان، ہے اور غالباً اس قدر والا دوکان ہے کہ ہم جیسے کس مپرس، غریب الوطن آدمیوں کی خبر لینا اسکی شان کے خلاف ہے۔ اُس انبوہ میں، ہماری اور ہمارے اسباب کی خوب درگت بنی۔ قلیوں نے، معاف کیجیگا شیالوں نے، شیطانوں نے، جو دام چاہے ہم سے مانگے اور جہاں ہم نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی، اور ہاتھ کے اشاروں اور سر کے ہلانے کے ذریعے کچھ اختلاف کیا، اور جھٹ انہوں نے ہمارا اسباب زمین پر پٹک دیا اور کہا لیجاؤ اپنا اسباب" یہ کمبخت اسباب بھی کیا کیا خوشامد کراتا ہے۔ ہمیں فوراً معذرت کرنی پڑی اور انکی موہنہ مانگی مزدوری (دو روپیہ) دینی پڑی۔ خوش قسمتی سے بہت جلد ایک ترجمان نے ہمیں اپنی حراست میں لے لیا؛ اور ہم اس نصیحت پر عمل کرکے کہ بہت سے لیڈروں سے نجات پانے کے لیے اپنے تئیں ایک قوی اور با اثر لیڈر کے ہاتھ میں سونپدو، ہم نے اپنے تئیں ترجمان صاحب کو تسلیم کر دیا۔

مصر کیا عجیب شہر ہے۔ تھوڑی دیر میں اس گہما گہمی میں اپنے تئیں اور اپنے خیالات کو یکجا نکر سکا۔ میں دراصل ایک چھوٹے سے قصبہ کا رہنے والا ہوں، اور اب بھی ایک چھوٹے شہر میں ہیں مسترد بانہ

زندگی بسر کرتا ہوں۔ شاید یہ ہی وجہ ہوگی یا یہ کہ مدنیت مجھ میں پورے طور پر سرایت نہیں کرگئی ہیں بڑے شہروں کی شان و شوکت، امتزاج ثروت و فلاکت سے گھبرا اٹھتا ہوں۔ جب کبھی بمبئی یا کلکتہ گیا، یہی حالت ہوئی مصر پہونچا تو اُس سے بدتر اگر قسمت کبھی لندن لے گئی تو کیا ہوگا۔ خیر میں کپڑے بدل اور تھوڑی سی دیر آرام کرکے بازار مصر کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ برقی ٹرامواے، بیچ بازار میں سے اس تیزی سے گذر رہی تھیں گویا ریل جارہی ہے، پر گھوڑا گاڑیاں اور آٹنی بسیں۔ اس کثرت سے ادھر ادھر جارہی تھیں، کہ سڑک کی اِک جانب سے دوسری جانب جانا سخت دشوار تھا۔

اسپر آدمیوں کا اک دریا تھا کہ امڈا آتا تھا۔

"سجاد حیدر"

امام ابو حامد محمد الغزالی فرماتے ہیں جس صفت سے انسان انسان ہوسکتا ہے وہ ایک استعداد ہے علوم نظریہ کے قبول کرنے اور پوشیدہ صفتوں کی تدبیر پیدا کرنے کی جسکا نام عقل ہے جو لوگ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو کام میں لائے وہ صفات انسانی کے مقاصد اعلیٰ سے متمتع ہوئے۔ جنھوں نے اسکا استعمال جائز نہ کیا اور جو کچھ منکشف ہوچکا اسی کو غنیمت سمجھا وہ ادبار میں جا پڑے کیونکہ کسی شے پر بھروسہ رکھنے سے استغنا پیدا ہوتا ہے اور استغنا قوت عملیہ کو معطل کردیتا ہے چونکہ یہ قوتیں انسان میں فطری ہیں اور کشف حقائق کا مادہ انسان کی سرشت میں رکھا گیا ہے اِس لیے ہر انسان کا طبعاً میل خاطر اسکی طرف ہے اور اسی کے لحاظ سے بعض اقوام و ملل کی تقسیم بھی کی گئی ہے

x omnia sunt

کسی دل گرفتہ کی سیر چمن

جوشش وارفتگی اک روز حد سے بڑھ گیا — میرے دریائے توحش میں تلاطم تھا بپا
گریہ بیتابیاں ہیں "خوف تھا احباب کو — "ایکدن دیوانہ ہم پائینگے اس بے تاب کو"
کہتے ہیں کچھ ہم سے اپنے رنج کی تصریح کر — غم بھلا مرد خدا۔ کچھ شغل کر تفریح کر

مینے یہ مانا کہ وہ میدان وفا کے مرد ہیں
آہ! لیکن کب وہ لذت آشنائے درد ہیں

آزما دیکھا بہر صورت دل بے صبر کو — کام میں لایا تسلی کو۔ جفا کو جبر کو
ہاں مگر تعمیل پند دوست میں بہبود ہے — غمزدہ کو کوشش تفریح گو بیسود ہے
آ۔ دل ناداں! تجھے بہلائیں چلکر باغ میں — مست پریشاں کیجیو لیکن نکل کر باغ میں

کیا یہی ہے گلستاں جنت نشاں تفریح گاہ؟ — دے رہی ہے یا مری دل کی طرح دھوکا نگاہ؟
دیکھتے ہی سبزۂ گلزار کو یاد آ گئی — اپنوں کی بیگانگی۔ تقدیر کی خانہ بدوشی
اُف! صبا ہی ہے پریشاں خاطر آوارہ گرد — نکلی اسکی خانہ بردوشی پہ دل سے آہ سرد
دیدۂ پُرآب ہے یا یہ چمن میں حوض ہے — اشک حسرت ہیں کہ شبنم ہے مقام خوض ہے
لالہ کا داغ جگر عکس دل پر داغ ہے — پہلوئے صد چاک ہے یا گل؟ یہ کیا باغ ہے
کیلئے ہے آہ پرخوں بسمل تو اے حنا! — تجھکو حسرت ہے خوں گشتہ کی کیا بھائی ادا
جھومتا ہے کیلئے غصہ ہے سرو گلستاں — اسنے کیا اہل وطن کی دیکھ لیں بے مہریاں؟
ساکت و صامت کھڑا ہے گشن میں شمشاد — کون کہتا ہے کہ یہ پابند گل آزاد ہے
نرگس بیمار کو دیکھا تو حیرانی بڑھی — سنبل پُرپیچ سے دل کی پریشانی بڑھی

یا الٰہی! ان درختوں کی یہ شاخیں سرنگوں — یا کسی ناشاد کا ہے بخت برگشتہ نگوں؟
کس کے غم میں نوحہ رو ہیں نوجوانانِ چمن — وقف فریاد و فغاں ہیں نغمہ سنجانِ چمن
ہے زبان پر آہ خواہے کے جاری یہ سخن — لوٹ جا او بیخبر! ہے غم فزا سیرِ چمن
آ کہ ان کو دیکھ لے جو چشمِ بیداد و ہوس — میں ترا ہمدرد ہوں او عندلیبِ نالہ کش!

دردمندوں کی قضا ہے یہ فضائے بوستاں — ہیں انہیں تیغ و دوم یہ برگ ہائے بوستاں
دمبدم بڑھنے لگا جب دردِ دل سوزِ جگر — یاد شِ آہ آہ! گفتارِ سن شوریدہ سر

"ہو سکے تو مطلب دل اسکا برلا چارہ جو"
نعمتیں دنیا کی سب بے سود ہیں دل گیر کو"

اسوۂ حسنہ - الموسوم بہ **زندہ اور کامل نبی** - وہ لکچر جو مولوی خواجہ کمال الدین صاحب بی۔اے۔ وکیل لاہور نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ میں دیا اور جسمیں رسالت آب صلعم کی مقدس زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔
حق الامر یہ ہے کہ صداقت اسلام کا بہترین ثبوت خود آنحضرت صلعم کی زندگی ہے جسکی طرف کلام ربانی نے یہ اشارہ کیا ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ لیکن اسوقت بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ اب سرورِ کائنات کے واقعات زندگی اسطرح قلمبند کیے جائیں جو مغربی دنیا کے سامنے پیش کیے جاسکیں یہ لکچر جیسا کہ خود خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں اس ضرورت کا پیش خیمہ ہے اور اس قابل ہے کہ تعلیمیافتہ مسلمان اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں۔
ہماری دلی دعا ہے کہ خدا وہ وقت جلد لائے جب خواجہ صاحب اس مقصد کی تکمیل فرمائیں اور ان کے قلم سے رسالت آب صلعم کی مقدس زندگی کے وہ حالات لکھے جائیں جو ہم مغرب کے سامنے بھی فخریہ پیش کرسکیں **قیمت** ۸ر غالباً خواجہ صاحب سے ملسکتا ہے۔

سکہ جات سلاطین گجرات

(۱) سلطنت گجرات

گجرات کو سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۵ء-۱۳۱۵ء) نے تیرہویں صدی میں فتح کیا۔ اس کے بعد کچھ کم سو برس تخت دہلی کے ماتحت رہا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں یہاں کے حاکم مفرح خاں نے بغاوت کی جس کی سرکوبی کے لیئے بادشاہ نے ظفر خاں کو روانہ کیا۔ ظفر خاں نے جب باغیوں کا استیصال کر دیا تو ۱۳۹۵ء میں اوسے یہاں کی صوبہ داری مل گئی جس کے بعد دو برس تک بادشاہ مطیع و فرمانبردار رہا۔ پر سلطنت دہلی کی کمزوری سے فائدہ اوٹھا کر دوسرے صوبہ داروں کیطرح ۱۳۹۸ء میں اس نے بھی خودسری اختیار کی اور گجرات کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔

قوم راجپوت کے ایک ذی ثروت شخص سدھارن نے محمد تغلق کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تو بادشاہ نے اوسے اپنے اہل دربار میں شامل کر لیا جس کے بعد اوس نے روز بروز ترقی کرنی شروع کی یہاں تک کہ وجیہ الملک کا خطاب پاکر امیر الامراء کے درجہ تک پہونچ گیا۔ ظفر خاں اسی کا بیٹا تھا ظفر خاں نے جو بعد میں سلطان مظفر کے لقب سے مشہور ہوا گجرات پر چودہ برس حکومت کی اور اپنے زمانہ میں اطراف و جوانب کے بہت سے علاقے فتح کر لیئے۔ ۱۳۹۸ء میں کچھ عرصہ تک مالوہ پر بھی قابض رہا۔ اس کے جانشین احمد شاہ نے جو تاریخ گجرات میں ایک بڑا اولوالعزم بادشاہ گذرا ہے سلطنت کو

خوب وسعت دی۔ اور شہر احمد آباد کی بنیاد ڈال کر اسے اپنا دار السلطنت بنایا احمد شاہ کے پوتے سلطان محمود نے نہ صرف اپنی آبائی معرکہ آرائیوں کو جاری رکھا بلکہ بحیرہ قزاقوں کی سرکوبی اور پرتگیزوں کے استیصال کے لیے جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑہ بھی تیار کرایا۔ بہادر شاہ کے زمانہ تک گجرات کی سلطنت خوب عروج پر رہی۔ اس نے مالوہ فتح کر کے مارواڑ کے بعض علاقے بھی لے لیے۔ ڈیو سے پرتگیزوں کو نکل کر اون کی کوٹھی کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے مرنے پر سلطنت کمزور ہونے لگی۔ گرد و نواح کی حکومتوں نے اپنی مخالفانہ کارروائیوں سے اس کی طاقت کو گھٹانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات کو فتح کر لیا۔

گجرات کی سلطنت ۱۳۹۹ء سے ۱۵۷۲ء تک تقریباً اسی برس قائم رہی اور اس عرصہ میں یکے بعد دیگرے چودہ بادشاہ برسر حکومت ہوئے، جن کے نام اور سنین جلوس نیچے درج ہیں

(۲) سلاطین گجرات

وجیہ الملک

(۱) مظفر اوّل (ظفر خاں)

سنہ ۱۳۹۸ء - سنہ ۱۴۱۰ء

تاتار خاں

(۲) احمد شاہ

سنہ ۱۴۱۰ء - سنہ ۱۴۴۳ء

(۳) محمد شاہ — سنہ ۱۴۴۳ء - سنہ ۱۴۵۱ء

(۵) داؤد شاہ — سنہ ۱۴۵۰ء - سنہ ۱۴۵۸ء

(۴) احمد شاہ دوم — سنہ ۱۴۵۱ء - سنہ ۱۴۵۸ء

(۶) محمود شاہ — سنہ ۱۴۵۸ء - سنہ ۱۵۱۱ء

(۷) مظفر شاہ دوم

سنہ ۱۵۱۱ء - سنہ ۱۵۲۵ء

(۸) سکندر شاہ — سنہ ۱۵۲۵ء - سنہ

(۹) محمود شاہ دوم — سنہ ۱۵۲۵ء - سنہ ۱۵۲۶ء

لطیف خاں (۱۰) بہادر شاہ — سنہ ۱۵۲۶ء - سنہ ۱۵۳۶ء

دختر (زوجہ عادل خاں والی خاندیس)

(۱۱) میراں محمد شاہ — سنہ ۱۵۳۶ء - سنہ ۱۵۳۶ء

(۱۲) محمود شاہ سوم — سنہ ۱۵۳۷ء - سنہ ۱۵۵۳ء

(۱۳) احمد شاہ سوم — سنہ ۱۵۵۳ء - سنہ ۱۵۶۱ء

(۱۴) مظفر شاہ سوم — سنہ ۱۵۶۱ء - سنہ ۱۵۷۲ء

(۳) سکہ جات شاہان گجرات

مورخین نے لکھا ہے کہ شاہان گجرات میں سب سے پہلے ظفر خاں نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرایا۔ مگر ڈاکٹر ٹیلر نے اپنے اوس مضمون میں جسکو اونہوں نے بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جلد ۲ نمبر ۵ میں سکہ جات احمد آباد کے متعلق شائع کرایا تھا۔ اوس میں مورخین کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے اوسکی رائے میں احمد شاہ اول سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے گجرات میں اپنا سکہ جاری کیا۔ اون کے اس بیان کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شاہان گجرات کے اب تک جسقدر سکہ جات دستیاب ہوئے ہیں اون میں سب سے قدیم احمد شاہ کا سکہ ہے۔ پھر اس کے بعد سلطنت گجرات کے خاتمہ تک تمام بڑے بڑے بادشاہوں کے سکے ملتے ہیں۔

اِن سکہ جات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان گجرات کے دار الضرب مختلف مقامات پر تھے۔ احمد شاہ اول کا سکہ احمد نگر میں مضروب ہوا تھا۔ پھر احمد شاہ دوم تک دار الضرب اسی مقام پر رہا۔ محمود شاہ اول کے زمانہ میں محمد آباد (چانپانیر) میں منتقل کر دیا گیا۔ اور مصطفےٰ آباد میں بھی بادشاہ نے ایک دار الضرب کھولا۔ اس کے بعد مظفر شاہ دوم کے زمانہ میں بعض سکے خان پور میں تیار ہوئے۔ پھر یہ تمام کارخانے سلطنت گجرات کی تباہی تک برابر قایم رہے۔

(۴) تفصیل سکہ جات

قسم	دار الضرب	تاریخ	رُخ اوّل	رُخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
(۲) سلطان احمد شاہ اوّل سنہ ۸۱۳ھ - سنہ ۸۴۶ھ سنہ ۱۴۱۰ء - سنہ ۱۴۴۳ء				
پیسہ	احمدنگر	۸۴۳	السُّلطان الاعظم ناصر الدنیا و الدین ۸۴۳	السُّلطان احمد شاہ شہر ہمایون
(۳) سلطان محمد شاہ۔ اوّل سنہ ۸۲۶ھ - سنہ ۸۸۵ھ سنہ ۱۴۲۳ء - سنہ ۱۴۸۱ء				
پیسہ	۔	۔	شاہ باد غیاث الدین محمد سکہ سلطان ۸۵	ماہ باد مُہر تاگردون قرص بدار الضرب
پیسہ	۔	۸۴۴	السلطان الاعظم غیاث الدنیا و والدین	ابو المجاہد محمّد شاہ السُّلطان ۸۴۶
(۴) سلطان احمد شاہ دوم سنہ ۸۵۵ھ - سنہ ۸۶۳ھ سنہ ۱۴۵۱ء - سنہ ۱۴۵۸ء				

قسم	دارالضرب	تاریخ	رُخ اوّل	رخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
بیسہ	۰	۸۵۰۰	قطب الدنیا والدین ابو المظفر	السلطان احمد شاہ ۸۵
بیسہ	—	۸۶۲	قطب الدنیا والدین احمد شاہ السلطان	خلیفۃ المومنین امیر خلدت الخلافۃ (۵) ۶۲

(۶) سلطان محمود شاہ اوّل

سنہ ۸۶۳ھ سنہ ۹۱۷ھ سنہ ۱۴۵۸ء سنہ ۱۹۱۱ء

روپیہ	محمد آباد	۸۹۶	السُّلطان الاعظم ابو الفتح ناصر الدنیا والدین	السلطان محمود شاہ شہر مکرم محمد آباد ۸۹۶
روپیہ	محمد آباد عرف چانپانیر	۹۰۳	السلطان الاعظم ابو الفتح ناصر الدنیا والدین	ابو الفتح محمود شاہ السُّلطان
بیسہ	مصطفےٰ آباد	۸۸۳	السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ۸۸۳ ابو الفتح	السلطان محمود شاہ شہر اعظم مصطفےٰ (آباد)

قسم	دارالضرب	تاریخ	رخ اول	رخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
			(۹) سلطان مظفر شاہ دوم سنہ ۹۱۷ھ - سنہ ۹۳۲ھ . سنہ ۱۵۱۱ء - سنہ ۱۵۲۵ء	
اشرفی	—	۹۲۴	المویدبتائید الرحمن شمس الدنیاوالدین ابوالنصر	السلطان شاہ شاہ مظفر بن محمود
روپیہ	خانپور	۹۲۶	المویدبتائید الرحمن شمس الدنیاوالدین ابوالنصر	السلطان مظفر شاہ ضربت خانپور ۹۲۶
			(۱۰) سلطان بہادر شاہ سنہ ۹۳۲ھ - سنہ ۹۴۲ھ . سنہ ۱۵۲۶ء - سنہ ۱۵۳۶ء	
پیسہ	—	۹۳۸	قطب الدنیاوالدین ابوالفضل ۹۳۸	بہادر شاہ بن مظفر شاہ السلطان
			(۱۲) سلطان محمود شاہ سوم سنہ ۹۴۴ھ - سنہ ۹۶۱ھ . سنہ ۱۵۳۷ء - سنہ ۱۵۵۳ء	
			الواثق باللہ المنان الفتح ناصر الدنیاوالدین ابو	السلطان شاہ شاہ محمود بن لطیف ۹۴۷

قسم	دار الضرب	تاریخ	رخ اوّل	رخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
(۱۳) سلطان احمد شاہ سوم سنہ ۹۶۱ھ - سنہ ۹۶۹ھ . سنہ ۱۵۵۳ء - سنہ ۱۵۶۱ء				
			المعتصم باللہ الرحمن ابو المجاہد غیاث الدنیا والدین	السلطان شاہ شاہ عہد ۹۶۱ احمد بن محمد
(۱۴) سلطان مظفر شاہ سوم سنہ ۹۶۹ھ - سنہ ۹۸۰ھ . سنہ ۱۵۶۱ء - سنہ ۱۵۷۲ء				
			بتائید شمس	السلطان مظفر شاہ خلد اللہ ملکہ
			شمس الدنیا والدین ابو المجاہد	مظفر شاہ السلطان

حکیم سید شمس اللہ قادری

رات چوگنے ہوئے چلے جاتے ہیں اور نہایت تعجب انگیز سرعت کے ساتھ اس غیر محسوس مملکت میں ترکیب بھی پاتے ہیں۔

اس گھاس کی پتی سے آپ تمام روئے زمین کی نباتات کے متعلق نتیجہ مرتب کر سکتے ہیں

پانی جو زمین کی سطح پر بہتا ہے، یہ بھی بے شمار و لاتعداد وجود ترکیبی کا مسکن ہے قطع نظر نباتات و حیوانات، ندی اور نالوں کے، جنمیں جاندار جراثیم ننگی آنکھ کو نظر آتے ہیں، اگر آپ کسی کنڈیا جوہڑ میں سے ایک چلّو بھر پانی لیں اور اوسکو خوردبین سے دیکھیں تو آپکو یہ چلّو کیڑوں کوڑوں سے پُر نظر آئیگا جو اسقدر ننھے ننھے ہوتے ہیں کہ جنکو بغیر آلہ کی مدد کے دیکھنا محال ہے، بہرحال وہ متحرک ہیں، اور نظام فطرت میں اپنی اپنی معین جگہ پر برقرار ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک چلّو پانی کسقدر گھنا جراثیم سے آباد ہے۔ علاوہ پانی کے اُن جانوروں کے جو ظاہر ہیں، ہزارہا قسم کی مچھلیاں اور غلاف دار نباتی و حیوانی خاصیت والے کیڑے پائے جاتے ہیں۔ پانی کی ننھی ننھی بوٹیاں جو بغیر دوربین کے دکھائی نہیں دیتیں، اسقدر کثرت سے پانی میں موجود ہیں کہ جسکی انتہا نہیں

اِس چلّو بھر پانی سے آپ استنباط کر سکتے ہیں کہ تمام روئے زمین پر جو پانی پھیلا ہوا ہے، جس نے کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصّہ کو گھیر رکھا ہے، اسمیں جاندار مخلوق کسقدر ہوگی؟

سمندر کے پانی میں جو بے شمار زندہ مخلوق موجود رہتی ہے، اِسکو بخوبی سمجھنے کے لیے ہم ایک واقعیت کا اعادہ کرتے ہیں، جسکو ماہرین علم طبقات الارض خوب جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ عمارتوں میں جو قسم قسم کے پتھر کام میں آتے ہیں اور تمام وہ کنکریلی زمین جس سے کہر یا مٹی کی چٹانیں اور سمندر کے کنارے بنے ہوئے ہیں، یہ تمام سیپیاں اور گھونگے ہیں، جو امتداد زمانہ میں گھس گھسکر منجمد ہو گئے ہیں اور جو نہایت قدیم ازمنہ میں سمندروں کی تہ میں جمے تھے

اس نوع کی تمام جمادات سیپیوں اور گھونگوں کے مجموعہ سے عالم ترکیب میں آئی جب قدیم زمانہ میں جاندار مخلوق اسقدر کثرت سے پانی میں پھیلی ہوئی تھی تو ضروری ہے کہ اب بھی اتنی ہی ہو اور اسی ایک طریق پر ہو، چونکہ قانون قدرت جو ابتدائے آفرینش میں صفحہ ہستی پر مسلط تھا، وہی اب ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

زمین اور پانی کی طرح ہوا بھی ذی روح کائنات کا مسکن ہے، اور نہایت عظیم الشان مسکن ہے، ہم کو ہوائی طبقہ میں معدودے چند ذی روح مخلوق نظر آتی ہے لیکن ایک تبحر عالم کی نگاہ تصور ظاہر اشیاء کے پار ہوتی ہے، اسکو ہوائی لکھوکھا جانوروں کا وجود معلوم ہے۔ ظاہر بین لوگوں کو ہوا بالکل صاف و شفاف معلوم ہوتی ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہوا اسقدر روشنی سے منور نہیں ہوتی، جو ننھے ننھے ذروں کو ہماری نگاہ کے سامنے انکی اصلی صورت میں پیش کر سکے۔ اس کیفیت کا تجربہ معمولی ہے، جو ہم کمرے کے دروازے بند کر کے ذرا سی جھری رکھ کے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ سورج کی کرن کے ذریعہ سے یا چھوٹے سے روشن دان میں سے ہو کر ہوا کمرے میں پڑتی ہے، اور اندھیرے میں صاف روشن نظر آتی ہے۔ اس کرن کی سلسبیل یا تار میں جس کے ارد گرد اندھیرا گھپ ہوتا ہے، بہت ہی ننھے ننھے نازک ذرے ہوا کی حرکت کے ساتھ اترتے چڑھتے چکر کاٹتے نظر آتے ہیں۔ اس شعاع سے آپ تمام گرد و پیش بلکہ عالم کی ہوا کی ماہیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، چنانچہ تمام روئے عالم پر ہوا خاک کے ذروں سے پُر ہے۔

آپ کو معلوم ہے یہ تمام ذرے کس چیز کے بنے ہوئے ہیں! آپکو یہ پڑھکر تعجب ہوگا کہ یہ تمام جاندار مخلوق ہے انمیں خوردبین سے نظر آنے والی مائیکرا سکوپک۔ نباتات کے جراثیم ہوتے ہیں جنھیں کرپٹوگیمیا کہتے ہیں

اور ننھے ننھے کیڑوں کے انڈے ہوتے ہیں، آپ سے آپ پیدا ہونے والے حشرات یا خود رو نباتات جن کے وجود کے متعلق فرانس اور ممالک یورپ کے فضلا میں نہایت گرمی سے بحث مباحثے ہو رہے ہیں، تمام انہی جراثیم سے جو ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں عالم وجود میں آتے ہیں۔ جب یہ جراثیم ہوائی پانی میں گر جاتے ہیں یا زمین پر اتر آتے ہیں تو ان سے مختلف النوع کیڑے اور جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسی قسم کی مخلوق کو ہم آپ سے پیدا ہونے والے کیڑے یا سبزۂ خود رو سے تعبیر کرتے ہیں یعنے ایک ایسی کائنات جو بغیر حرم کے، ایک ایسی پود جو بغیر سبب کے پیدا ہوتی ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ہر ذی روح وجود کے والدین ہوتے ہیں جن کی سائنس اور عقل سلیم تصدیق کرتی ہے۔

اس قسم کے کیڑے اور پودے جو اپنے سے بڑے حیوانات و نباتات سے اپنی زندگی قایم رکھنے کے لیے غذا بہم پہنچاتے ہیں، ان کو پیراسائٹس یا ہمفت خور کیڑے کہتے ہیں۔ ہر ایک دودھ پلانے والے جانور کے پیراسائٹس ہوتے ہیں۔ انسان کے پیراسائٹ جوں۔ پسّو کھٹمل ہوتے ہیں۔ اسی طرح عالم نباتات کے پیراسائٹس ہوتے ہیں۔ بلوط کے درخت پر ایک قسم کی بناس پتی اور اور کرٹوگیمیا (بغیر پھول کے پودے) لپٹے ہوئے ہوتے ہیں، اور لطف یہ کہ تنوں پر قوبیل لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور جڑوں پر خاص قسم کے کرٹوگیمیا پائے جاتے ہیں جیسے ٹرفل وغیرہ اس آئین قدرت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایک ذی روح وجود دنیا میں آیا اور دوسرے نے اس بات پر پیوند لگایا یا ڈیرے ڈالدئے

لیکن اسپر بھی مستزاد پیراسائٹس کے بھی پیراسائٹس ہوتے ہیں اور یہ اسقدر ننھے ننھے ہوتے ہیں کہ صرف خوردبین کے ذریعہ سے نظر آتے ہیں بلوط کے درخت کی بناس پتی کی ایک پتی لیجئے اور اسکو خوردبین سے دیکھئے اور

ایک پسو یا لیکھ کا بھی امتحان کیجئے تو آپ استعجاب کے ساتھ شان قدرت کا نظارہ کریں گے کہ ان پیراسائٹس پر اور پیراسائٹس پلٹے ہوئے ہیں جو ان پر اپنا پیٹ پالتے ہیں بڑے درختوں سے غذائی مادہ دکھائی دینے والے پیراسائٹس کے پیٹ میں جاتا ہے اور ان سے غیر نظر آنے والی مخلوق پلتی ہے۔ غرض مظہر کائنات کا عالم گوناگوں ہے۔ ایک ذراسی جگہ میں جاندار مخلوق پر مخلوق جمع ہے اور ایک دوسرے کے نشوونما میں مدد پہنچاتی ہے اس واقعیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ خدائے جل وعلا نے کسقدر حیرت افزا بہتات اور فراط سے سمک تک ذی حیات مخلوق کو آباد کر رکھا ہے

پس دیدہ ور لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ کرۂ ارض کی سطح، شیریں سمندر دریا، اور طبقہ ہوائی میں ان گنت جاندار مخلوق سکونت پذیر ہے زندہ جانیں زمین اور پانی و ہوا میں بھری پڑی ہیں۔ ہمارے کرۂ ارض میں جانیں ننھی اور بڑی، ٹھونس ٹھونس کے بھر دی گئی ہیں۔

لیکن قدرت کا دور دورہ زمین پانی اور ہوا ہی پر نہیں ہے، ہوائی طبقہ کے اوپر اور ایک طبقہ ہے جسکو ماہرین علم طبیعات اور ہیئت داں جانتے ہیں اور جسکو وہ پلنیسفری ایتھر کہتے ہیں۔

ہوا جو ہمارے کرہ کے چوطرف چھائی ہوئی ہے یا زمین پر خول کے مانند چڑھی ہوئی ہے وہ خدا میں اسکی گردش کے ساتھ آتی ہے جبکہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور یہ بہت اونچی نہیں ہے۔ ہوا کا دائرہ ہوائی تین یا چالیس فرسنگ سے زیادہ نہیں ہے (ایک فرسنگ = ۳ میل) جسقدر آپ اوپر چڑھتے جائیے گا ہوا زیادہ لطیف ہوتی جائے گی۔ تین یا چار فرسنگ پر ہوا اسقدر لطیف ہوجاتی ہے کہ اسمیں انسان سانس نہیں لے سکتا

ہوائی کرہ پر انسان ۶-۷ میل سے زیادہ نہیں چڑھ سکتا۔ کیونکہ اس بلندی پر ہوا کی کثافت اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ وہ دم لینے کے مطلب کی نہیں رہتی اور نہ جسم کے اندرونی دباؤ کو بیرونی اثر سے برابر ٹلا رکھتی ہے۔ اس بلندی کے بعد ہوا اور بھی کم ہوتی جاتی ہے انتہا یہ ہوتی ہے کہ کرہ ہوائی ختم ہو جاتا ہے اور پھر ہوا کا مطلق نام و نشان نہیں رہتا اس نقطہ سے وہ خیالی مقام شروع ہو جاتا ہے جسے ہیئت داں یا ماہرین علم طبعیات ایتھر کہتے ہیں۔

ایتھر ایک لطیف مادّہ یا گیس ہے جو اس ہوا کے مشابہ ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایتھر بے انتہا لطیف جوہر ہے پلینٹری ایتھر کا وجود لاکلام بات ہے اسی وجہ سے کہ جب ہیئت داں اجرام فلکیہ کی رفتار کا شمار کرتے ہیں تو اس مقام سے گذرنے کی کشمکس اور مزاحمت کو بھی حساب میں لگا لیتے ہیں جیسا کہ وہ اُن اجسام کی رفتار کی مزاحمت کو شمار میں لیتے ہیں جو ہمارے کرہ ہوائی سے ہو کر گذرتے ہیں۔ لہذا ایتھر وہ سیّال مادہ ہے جو طبقۂ باد کے بعد آتا ہے یہ صرف ہماری زمین کے چاروں طرف ہی نہیں پھیلا ہوا ہے۔ بلکہ اور تمام سیاروں کے چاروں طرف بھی ہے اور یہ وہیں تک محدود نہیں ہر جگہ موجود ہے سیاروں کے درمیانی فاصلہ میں بھی یہی حکومت پذیر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سیّارے اور اُن کے گرد کے چھوٹے چھوٹے اجرام جو نظام شمسی کو ترتیب دیتے ہیں یہ تمام ایتھر میں ہی گردش کرتے ہیں دم دار تارے بھی اپنے بعد المشرقین مسافتوں میں ایتھر سے ہو کر گذرتے ہیں

جاہل شخصوں کا خیال ہے کہ کرہ ہوائی جو ہمارے کرہ ارض کے چوطرف پھیلا ہوا ہے اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہے اور محض خلا ہے لیکن عالم نیچر میں خلا کہیں بھی نہیں خالی جگہ میں کچھ نہ کچھ موجود ہے خواہ زمین ہو یا پانی ہوا ہو یا پلینٹری ایتھر

یہ سچ ہے کہ جان کرہ ارض۔ پانی و ہوا میں بھی ہوئی پھیلی ہوئی ہے۔ اور اسمیں شک کو مطلق گنجایش نہیں۔ اب رہا یہ کہ آیا ایتھر یا سیال مادہ کا طبقہ جو کرۂ باد کے اوپر ہے اور جس نے خالی جگہ کو پر کر رکھا ہے۔ یہ بھی ذی حیات مخلوق سے آباد ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو شاید کسی عالم قبر نے اپنے دل سے نہ پوچھا ہوگا، ہماری رائے میں یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ لائف جو پانی اور ہوا میں بھری ہوئی ہے، اس سیال مادہ میں مطلق نہ ہو جو ہوا کے بالکل مشابہ ہے۔ ہر بات یہی ظاہر کرتی ہے کہ طبقہ ایتھر میں مخلوق آباد ہے اور ضرور آباد ہے، لیکن وہ مخلوق کیسی ہے جو اسمیں آباد ہے؟ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ اسمیں وہ مافوق الانسان آباد ہیں جنکو ہم از سر نو زندہ خیال کرتے ہیں اور جو مکارم اخلاق میں درجۂ کمال رکھتے ہیں +

پلینٹری ایتھر کے کیمیائی اجزا معلوم نہیں کیا ہیں۔ مظاہر ہیئت نے اسکی موجودگی کا پتہ تو بتا دیا ہے لیکن اس کے مرکبات پر روشنی نہیں ڈال سکی۔ ہم خیال کرتے ہیں یہ کہنے میں کچھ ہرج نہیں کہ ایتھر کے اجزائے ترکیبی میں آکسیجن نہیں ہے، حقیقت میں کرۂ ہوائی کی ہوا کا اصلی عنصر آکسیجن ہی ہے۔ چونکہ جوں جوں ہم کرۂ ہوائی میں اونچے ہوتے ہیں ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے اور ہم مشکل سے سانس لیتے ہیں۔ اسلیئے اغلب ہے کہ سانس لینے میں دقت ایک ایسے گیس کی قربت کے باعث ہوتی ہے جس میں ہم سانس لینے سے عاری ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کرۂ باد کے اوپر کے طبقوں میں جان کا زندہ رہنا محال ہے جب کوئی شخص غبارہ میں اڑتا ہے تو اسکی کیفیت ایسی مچھلی کی سی ہو جاتی ہے جسکا آدھا دھڑ پانی میں ہو اور آدھا ہوا میں۔ ایسی حالت میں مچھلی کا سانس رک جاتا ہے، تڑپنے لگ جاتی ہے اور جان پر بن جاتی ہے۔ بعینہ انسان کا یہ حال ہوتا ہے، جب وہ کرہ ہوائی سے طبقہ ایتھر کے قریب آلگتا ہے

اسلئے ہم بہ تامل کہنے کو آمادہ ہیں کہ فی الواقعی پلینٹری ایتھر میں آکسیجن بالکل نہیں ہے
یہ بات بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ پلینٹری ایتھر ہائیڈروجن گیس سے
مرکب ہے جو اتم درجہ ہلکی ہے اور دباؤ کی عدم موجودگی کے باعث بے انتہا
لطیف ہے اس لیے ہم یہ امر منظور کرنے کیلئے آمادہ ہیں کہ ایتھر جسمیں تمام ستارے
گردش کرتے ہیں وہ بلاشبہ ہائیڈروجن گیس ہے۔ فضلائے یورپ کی کامل
طریق الشمس کے متعلق جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آفتاب
عالمتاب دہکتی ہوئی ہائیڈروجن میں گھرا ہوا ہے۔

ہمارے طبقہ ہوائی کے پرے، چرخ نیلی فام کے اوپر جو جگہ ہے اسکا ہر قوم کی
زبان میں جنت نام ہے۔ اس لیے ہم بھی اپنے فوق الانسان کا مسکن
جنت ہی کو جسے تمام دنیا مانتی ہے قرار دینگے۔ کیونکہ یہ تسلیم کرنے سے ہم
تمام دنیا کے مستند عقیدہ سے متفق ہوتے ہیں اور ہماری طبیعت کو اطمینان
و اطمینان حاصل ہوتا ہے بہشت کا خیال نسل انسانی کی ہزارہا پشتوں کی
دانائی کا نتیجہ ہے اور ایسی روایت جو ہر ملک، ہر قوم میں روز ازل سے
عام تام ہوا اور جس نے کبھی مخالفت کی بادسموم نہ کھائی ہو۔ سائنس کی نہایت
زبردست تصدیق کا وزن رکھتی ہے۔

اس کلام اور اس روایت کے مطابق جو قدیم الایام سے چلی آتی ہے، اور دنیا
کے بڑے بڑے موجودہ مذاہب عیسائی مسلمان، بدھ جنت کو خدا کے پیارے
بندوں کا گھر تصور کرتے ہیں۔

پس ہمیں معلوم ہوا کہ [illegible] روایت اس باب میں یکزبان ہیں اور یہ
فی الواقع سائنس کا ایک ایسا انکشاف تھا، جو مقدس قمیں کی زبان سے شہید
بادشاہ کے منہ سے نکلا، جبکہ اسے سولی پر چڑھایا گیا۔

سید شوکت۔ دہلوی

نامۂ حسین علیہ السلام

حبیب ابن مظاہر کے نام

تہایہ مرقوم پس از حمد و تحیات و سلام — خط مرے دوست حبیب ابن مظاہر کے ہی نام
اے شفیق آپنے بھیجا تھا جو مجھکو پیغام — یعنی کوفہ میں کروں چند دنوں آکے قیام
چھوڑ کر اپنا وطن سبط پیمبر آیا — حسب تحریر مہ خویش و برادر آیا
اس سفر میں مجھے ہر چند بہت کچھ ہیں خطر — پر نہیں دوست کی مرضی سے کسی حال مفر
ساتھ ہیں اہل حرم سخت بہت ہی یہ سفر — چھوٹے بچوں کو وہاں چھوڑ کے آتا کس پر
مطمئن دل ہی کہ اجابت کے گہر آیا ہوں — حد کا اصرار ہوا جب تو ادھر آیا ہوں
مجھکو آنا نہ کسی طرح ادھر تھا منظور — پائے مکتوب تواتر تو ہوا ہوں مجبور
بعض اسطرح کی باتیں تھیں خطوں میں مسطور — جنکی تعمیل بہر حال ہوئی مجھ کو ضرور
دوست بچین کے ہو دلسے مرے ہمراہ ہو تم — کیا لکھوں اس سے زیادہ کہ خود آگاہ ہو تم
دی ہی آنکی اجابا کو کئی بار خبر — بعض کے پاس روانہ کیے قاصد بکسر
مگر ابتک نہوا کوئی اثر — نہ جواب آیا کوئی۔ اور نہ وہ خود آئے نظر
اب ہیں بیعت کے بھی منکر یہ سنا جاتا ہے — ہمیں گھاٹا ہی انہیں کام کیا جاتا ہے
تمکو دیکھا نہیں مدت سے بہت ہوں مشتاق — پاس آیا ہوں تو اتنی بھی جدائی ہی شاق
یا اخی! جبسے ملا ہی مجھے سر حد عراق — دمبدم دل میں فزوں ہونے لگا درد فراق
اب توقف بہت اے دوست نہ فرماؤ تم
ماحصل یہ ہے کہ ممکن ہو تو جلد آؤ تم

سید رضا
عظیم آبادی

ایک دوسرے بھائی کا خط بہن کے نام

مسئلہ حقوق نسواں اس قدر پیچیدہ ہوگیا ہے کہ اس کا آسانی سے حل سلجھنا بہت ہی مشکل ہے اسی ضمن میں پردہ کی بحث ہے۔ جسپر سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) نے اپریل کے تمدن میں ایک خط لکھا اور جس کا جواب پروفیسر مشتاق احمد صاحب زاہدی نے جولائی میں دیا۔ اور اب مولوی شمس الاسلام صاحب تحریر فرما رہے ہیں۔

رسالوں میں کم اور اخباروں میں زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی مضمون اگر وہ ایڈیٹر کی رائے کے موافق نہیں ہے بہت مشکل سے شائع ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نے یہ پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ کوئی مضمون صرف اسوجہ سے کہ تمدن کی رائے وہ نہیں ہے رد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تینوں مضمونوں کو نہایت خوشی درج کیا لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ جون کے رسالہ میں جو مضمون مولوی اشرف حسین صاحب کا "تمدن" کے عنوان سے شائع ہوا اور اوس میں جو سوال قایم کئے گئے ہیں اگر اوپر کا فی بحث کیجائے تو یقیناً سوسائٹی کے واسطے بہت مفید ثابت ہوگی۔

علی گڑھ ۸۔ جون ۱۹۱۱ء

پیاری بہن خدا تمہیں خوش رکھے محبت نامہ وصول ہوا۔ آپا سہیلی کے ہاں جانا اور اون کے بھائی (سلطان حیدر) صاحب کا خط پڑھنا سنانا تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی خط ہے جو تمدن کے پہلے پرچہ میں

چھپا تھا۔ اگر وہ کھلی چٹھی میری نظر سے نہ گذری ہوتی تو تمہیں یہ مسئلہ سمجھانے میں قصہ بہت طولانی ہو جاتا۔ اور پھر بھی مجھے اندیشہ تھا کہ تمھاری دلجمعی نہ ہوتی۔ کیوں؟ کہ ممکن ہے تمھارے دلمیں سوال کچھ ہوتا اور میں بحث کسی اور پہلو پر کرتا۔

تمھارے بھولے پن پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ اتنا تو سمجھو کہ وہ نہ منجانب اللہ کوئی حکم ناطق ہے اور نہ سوسائٹی کی طرف سے قول فیصل۔ پھر ان دو بولوں پر ایمان لے آنا یا جنم قید کا فتوی سنکر ہراساں ہونا کیا معنے؟ ہر شخص اپنی اپنی رائے رکھتا ہے اور جب کسی بحث کا ایک پہلو اختیار کرکے اوس کی خوبیاں بیان کرنے پر آتا ہے تو لازمی طور پر دوسری طرف اوسے اتنے ہی عیب بھی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ نہ کوئی خوبی (سوائے اوس ذات واحد کے) بے عیب ہے۔ اور نہ کوئی عیب خوبی سے خالی ہے۔ الّا ابلیس!

یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ مذہب کو (خاصکر کے) معرض بحث میں نہیں لائے ورنہ ایک اور دقت ہوتی۔ کیوں؟ کہ میں پہلے ہی "مسلمانی در کتاب" کا قائل نہ تھا۔ میرے نزدیک رسم اور مذہب جدا جدا نہیں بلکہ سوشل قوانین ہی کے مجموعے کا نام مذہب ہے۔ اور رسم و رواج بجائے خود مذہب کا حکم رکھتے ہیں۔ اپنے ہی ہاں دیکھ لو کہ کیسی کیسی بدعتیں۔ اوہام پرستیاں اور ضعیف الاعتقادیاں جزو مذہب سمجھی جانے لگیں۔ جو لوگ اون کے پابند ہیں چاہو کہ اپنے دلمیں غور کریں اور اپنے اون کے جواز کی تاویلیں۔ گھڑنے کی فکر میں رہتے ہیں برخلاف اس کے بعض باتوں کی مذہب تو خوب دل کھول کے اجازت دیتا ہے مگر ہمارے ہاں چونکہ اونکا رواج نہیں اسلیے وہ جواز بھی بڑی بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کثرت ازدواج یا خلاء و طلاق کے مسئلہ کو لو۔ نکاح کیا ہے؟ ایک سوشل معاہدہ ہی تو ہے اگر وہ عہد و پیمان پورے نہ ہوں اور آرام اور فائدہ کی جگہ تکلیف و نقصان پہونچے تو بادی النظر میں وہ تعلقات کتنے ہی مضبوط ڈورے سے بندھے معلوم دیں مگر میں تو اوس عہد کو اور اوس عہد کے ساتھ اِس رشتہ کو بھی ٹوٹا ہوا سمجھتا ہوں۔ مگر ہمارے رسم و رواج کی بدولت صورت واقعہ یہ ہے کہ طلاقاً تو طلاقاً زنِ بیوہ کو لوگ اِس قہر کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ ستی ہو جانا اوس زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

حقیقت میں رسم و رواج قومی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ جس جہالت کے زمانہ میں لوگوں اپنے واقعات زندگی یا تواریخ ملکی قلمبند کرنے کا شوق یا سلیقہ تک نہ تھا تو اوس زمانہ کے حالات آخر کس طرح منکشف ہوئے؟۔ اونہیں کی زبان زد روایات یا حکایات نے اون کے تمدن پر روشنی ڈالی اور طرز تمدن نے اون کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا۔ اسے تو تم بھی اسطرح آزما سکتی ہو کہ ایک ہی کہانی کو دو مختلف حیثیت کے آدمیوں سے سنو۔ اون کی اوقات اور انتہائے خیال بالکل صاف معلوم ہو جائیگی کہ ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اب اوسی طرح اِس "پردہ سسٹم" کی ماہیت پر غور کرو! بات یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ "جس چیز نے ہم کو ابتک بہت سے ناپاک اثرات سے محفوظ رکھا وہ پردہ ہے"۔ مگر اسپر تمھاری سہیلی کے بھائی صاحب کو "جو فخر ہے اور رہے گا" اوس کا میں قائل نہیں ع آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری۔

ہمارے ہاں کا پردہ دراصل بیوند ہے جامۂ کہنہ کا۔ آج اوسے اگر اوٹھا دیں تو سارے عیب کھل جاتے ہیں۔ کیوں؟ کہ پردہ اوٹھانے کیلئے جن لوازمات کی ضرورت ہے وہ اول سرے سے ندارد ہیں۔ ہم میں نہ تعلیم ہے نہ تہذیب

نہ ثروت ہے نہ لباس ہے۔

جبتک تعلیم عام نہو ہر زن و مرد کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہو نہ ان کے اخلاق و آداب ٹھیک ہوسکتے ہیں نہ رہن چال و چلن ہی درست رہ سکتے ہیں کہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔ گھر سے باہر ہی نکلے تو کیا دنیا کو سمجھیں گے اور کیونکر عجائبات دنیا سے متمتع ہونگے؟

ایک تو جہالت جسکا لازمی نتیجہ بے تمیزی بدتہذیبی اوپر سے مفلسی۔ بقول حالیؔ نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانیوالی۔ آرام و آسائش کے اسباب تعیش کے ساماں۔ نفاست کا خیال مذاق کی خوبی۔ بات چیت کا سلیقہ۔ اوٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ۔ غرض دنیا بھر کی خوبیاں مفقود ہیں۔ زندگی کے اعلیٰ نمونے چراغ لیکر بھی ڈھونڈھیے تو مشکل سے ملیں گے اور ادنی مثالیں گلی گلی۔ کوچہ۔ کوچہ۔ بلکہ گھر گھر اور چپہ چپہ پر آنکھیں بند کرکے دیکھ لیجئے۔

میں تو پہر بھی کہونگا کہ پردہ در اصل دھوکے کی ٹٹی ہے۔ یا یہ کہو کہ دوسرے دیکھنے والوں کی آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے لیکن بہن! اتارنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ہزار ڈھکو لا کہہ چھپاؤ مگر خط کا مضمون بھانپ جاتے ہیں لفافہ دیکھکر تم نے شاید تمدن کا وہ پرچہ نہیں دیکھا ورنہ "مس اور مسز ایسٹ" (مضمون) پڑھکر دانتوں میں انگلی دے لیتیں ؎

قابل رحم ہے اوس شخص کی رسوائی بھی — پردہ پردہ ہی میں کمبخت جو رسوا ہوجائے

اور ایمان کی پوچھو تو جو دیکھیے تھوڑا ہے پستی اور نکبت کی بھی آخر حد ہوتی ہے گھروں کو دیکھیے تو مرغی کے دڑبے معلوم ہوتے ہیں سامان پر نظر کیجیے تو کباڑی کی دوکان میں شاید رونق ہو مگر یہاں نہیں۔ بسر اوقات کو دیکھیے تو جانوروں سے بدتر۔ لباس ہے تو ایسا ہی بدوضع بدقطع۔ (پہلے تو اس گمان کو سوءظن پر ہی محمول کرسکتے تھے لیکن "زنانہ حسن و لباس" دیکھکر تو پورا پورا یقین ہوگیا

کہ اس سے زیادہ لچر۔ پوچ پوشاک دنیا بھر میں نہیں) بھلا کون باذاق شخص دیکھ سکے گا کہ بیگم صاحبہ بھاری بھاری پائنچے سنبھالے سمدھن بنی بازار میں چلی جا رہی ہیں یا آڑا پاجامہ پہنکر جھانجن بجاتی سیر کو نکلی ہیں اور لوگ مشتاق ہیں کہ اب پیچھے پیچھے کوئی آرام دان اور ساز و سامان لیئے "اللہ کی امان! اعلیٰ اعلیٰ مراتب!" کہتا ہوا آتا ہو گا۔

اب تو تم پردہ کی حقیقت سمجھیں؟ کہ اپنا گھٹنہ کھولئے اور آپ ہی لاجوں مریئے، جو صاحب اس "پردہ سسٹم" پر ناز کریں وہ ہیں نہیں اسی میں سے؟ کہ مجھے تو ابابیل ہی بھاتی ہے،

قوم کے لیئے مایۂ ناز اور موجب افتخار، کوئی چیز ہو سکتی ہے تو قومی کیرکٹر یا قوم کو اگر شرف ہو سکتا ہے تو بس اپنے عادات و اطوار قوت اخلاق، تہذیب، وشائستگی عام لیاقت، اعلیٰ طرز تمدن اور عمدہ طریق معاشرت سے، اور جب یہی نہیں تو فخر کی جگہ، شرم کا مقام ہے!

خیر یہ تو وجوہات تھے اس رواج کے، اب اسکی اصلیت بھی سن لو یہ تو کون کہے گا کہ پردہ فطری شے ہے، اور جب یہ نہیں تو کوئی چیز، قانون قدرت کے خلاف کہاں تک رائج رہ سکتی ہے، یہ بھی ہمارے کردار کی سزا اور شامت اعمال سمجھو، ورنہ جو قومیں، خواہ ایشیائی ہوں یا فرنگی، جہاں ترقی کے میدان میں آئیں اس رسم کو پس پشت چھوڑا۔ اور سچ بھی یونہی ہے کہ اگر سارا جہان، اسی سختی کے ساتھ اس کا پابند ہو جائے تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ دنیا کے کل کاروبار نہیں تو گھر کے گھر یا کم از کم اکثر گھروں کے دھندے ضرور بند ہو جائیں۔ مائیں۔ اصیلیں، کام پیشہ عورتیں مزدور نیاں یا کسانیاں، جو اپنے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتی، یا خود اپنی ہی محنت مزدوری

اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتی ہیں، اگر اسی طرح دم بخیت کر دی جائیں تو سوچو کہ کتنے بندگانِ خدا کی آسایش بلکہ روزی میں فرق پڑ جائے اور جہاں کمائی کا مسئلہ عورتوں کی ذات سے متعلق نہیں، وہاں کے مردوں کی زندگی، کسقدر بے حلاوت ہے اور دنیوی ترقی پر کتنا ہرج ہو رہا ہے بقول ہزہائی نس سر آغا خاں "کہ آدھی قوم مُردہ ہے"

ہمارے بھائی صاحب فرماتے ہیں کہ "عورتوں کی آزادی کی رسی اگر ذرا ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو ترقی کی رفتار پر کبھی روحانی قوت کے بس کی بھی نہیں" میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ عورتوں کو جکڑنے کے کہاں تک حق دار ہیں۔ کیا یہ نہیں سُنا کہ

بنی آدم اعضائے یکدیگرند — کہ در آفرینش زیک جوہرند

اہل ہنود کے ہاں ذاتوں کی تقسیم دیکھ کر تو شاید انہیں بھی اعتراض ہوگا، مگر اپنے ہاں عورتوں کو کم تر درجہ کا سمجھنا اور انہیں اس پستی کی حالت میں رکھنا، قانوناً، مذہباً، اور فطرتاً جائز معلوم ہوتا ہے؟ میرے خیال میں تو مرد اور عورت آپس میں دائیں بائیں آنکھ ہیں، والدین کا جو حق بیٹے پر ہے وہی بیٹی پر ہے جس حد تک وہ بیٹے کی تعلیم و تربیت نگہداشت اور کفالت ضروری جانتے ہیں، وہیں تک وہ بیٹی کے بھی وارث حقیقی اور جائز نگہبان ہیں، جتنی بیوی کی دلجوئی و خوشنودی، اور رضامندی خاوند اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے، اتنی ہی بیوی سے بھی توقع کرنی چاہیے مگر ہمارے ہاں ہوتا کیا ہے؟ کہ باہر مردانے میں ایک چھوڑ دو دو طائفے اترے ہوئے ہیں اندر کوئی بی صاحبہ کسی دوست کی بیوی کے نام سے گھر میں مہمان ہیں، مگر بیوی پر یہ تشدد کہ کسی بھائی بند سے بھی ہنس کر بات

کرے تو ایک قیامت برپا ہو جائے، خوب ع خود نصیحت دیگرے را نصیحت!
ہاں تو میں یہ کہتا تھا کہ میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ عورتیں مردوں کی پابند مطیع، اور زیر حکم بن کر رہیں، عورتوں کی ذرا سی بھی حق تلفی کرنی اور اپنے آپ کو برتری دینی، انصاف سے دیکھو تو ان بے زبانوں کی جان پر سراسر ظلم و ستم روا ہے خصوصاً جب اُس کی قابلیت اور اہمیت کا پورا پورا اعتراف بھی ہے یعنی زندگی کی کوئی منزل ایسی نہیں جہاں اُسے عاری سمجھیں، دنیا کا کوئی فن ایسا نہیں جس میں ایک نہ ایک عورت باکمال نہ گذری ہو، اور اگر یہ مثالیں شاذ و نادر پائی جائیں، تو محض اسلئے کہ عام طور پر انہیں اس طرف لگایا ہی نہیں جاتا۔ میں نے ہوش سنبھال کر اتنے لڑکے لڑکیاں دیکھیں اُن کے چھٹنے کا خیال کرتا ہوں تو اُن کے قویٰ میں عقل میں، توانائی میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض بچیاں تو بچوں سے کہیں زیادہ توانا قوی، اور فرزانہ ہوتی ہیں، بلکہ لڑکیوں کا اٹھان اوّل اوّل عام طور پر بڑا ہوتا ہے اور مردوں کی نسبت سن بلوغ کو بھی جلدی پہنچ جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے قدرت کا منشا یہ ہو کہ خدا اُن کے بڑے بوڑھوں کو نیک ہدایت دے تو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت جلدی سے مکمل کر کے، انہیں دنیا کی اونچ نیچ اچھی طرح سے سمجھا دیں، تاکہ ان دلاویز غنچوں یا آبدار موتیوں کو باد تند کے جھونکوں یا بے احتیاطیوں کا خیال رہے، اور جو بات اب گھونٹ کر رکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ نیک ہدایت اور عمدہ تربیت سے بوجہ احسن حاصل ہو جائے۔ اور تمام عمر بے بال و پری میں نہ کٹے، مگر جب اُن بزرگوں کو اتنی توفیق بھی ہو۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ جو جو وقت قریب آتا جاتا ہے کہ قویٰ کا نشو و نما ہو، توانائی زیادہ آئے، عقل تیز ہو، تو وہ بچے

تو ماشاء اللہ بڑھ چڑھ کر کہیں کے کہیں پہونچ جاتے ہیں اور لڑکیاں ٹھہر کر وہیں کی وہیں رہ جاتی ہیں، قویٰ پر نظر کیجئے تو مرد صاحب توساٹھے اور پاٹھے مشہور ہیں مگر عورتیں بیسی اور کیسی کہلاتی ہیں عقل کی یہ حالت کہ ناقص العقل، بالمثل ہیں، باورچی خانہ سے پرے، پرے خیال کی پرواز ہی نہیں توانائی کو لیجئے، تو وہی خدا کی بندی جو چھٹپن میں بعض اوقات لڑکوں سے بڑھکر قدم مارتی تھی، اب اس درجہ کو پہنچ گئی کہ ہل کر پانی پینے میں بھی تکلیف ہوتا ہے، دو قدم چلیں بھی تو جگہ جگہ گری پڑتی ہیں۔ وہ پہاڑی سٹھو تمہیں یاد ہے۔ کہ جب نیا نیا لیا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ پنجرے کی تیلیاں توڑ ڈالے گا یا پنجرے سمیت اڑ جائے گا۔ مگر کچھ مدت کے بعد جو کھڑکی کھولی تو بند رہتے رہتے بازو رہ گئے تھے، قوت پرواز کیسی کہ طاقتِ رفتار بھی نہیں رہی ؎

خوش حال اُن کا، وہ جو گلستاں میں مر گئے حسرت نصیب ہم ترے زنداں میں مر گئے

میں تمھاری سہیلی کے بھائی صاحب سے پوچھوں گا کہ حضرت! یہ سلوک آخر کس حد تک روا ہے؟ اور جو کچھ اس گروہ کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے وہ اپنے دلمیں ہاتھ رکھ کر یا پتھر رکھ کے؟ تن آسانی کی بھی حد ہونی چاہئے غضبِ خدا آپ تو کثرت بھی کرتے ہیں اور کھیلنے بھی جاتے ہیں۔ کلب کے ممبر بھی ہیں، گھر پر بھی بیٹھک بنا رکھی ہے۔ صبح سے شام تک یاروں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ شارٹ پارٹیاں بھی ہوتی ہیں اور سیر و شکار بھی۔ مگر یہ، تمھارے دامِ غفلت کے اسیر پرندے جو قفس میں، منقار زیر پر پڑے ہوئے ہیں، اِن کی خوشی ان کی وابستگی کا کہاں تک خیال ہے اُن کی باتوں سے تو میں یہ ہی سمجھتا ہوں کہ بقول نامہ نگار اخبار ڈیلی کرانیکل

وہ دنیوی خوشیوں سے بالکل اسی طرح محروم کر دی گئی ہیں جس طرح گرجا کی نسیں اور اُن جانوروں سے جو شوقیہ پنجروں میں قید کیے جاتے ہیں، کچھ ہی زیادہ وقعت رکھتی ہیں قربان ایسی الفت کے ؎

خوش نوائی نے کہا ہمکو اسیرے صیاد ہم سے اچھے رہے صدقہ میں تو ترے والے

میں حیران ہوں کہ جب خدا اور رسول کے نزدیک اُن کا ایک رتبہ ہے تو پیروں کے لحاظ سے کچھ ایسا فرق نہیں، خداداد ذہانت میں مردوں سے کم نہیں، خلقی حیا۔ اور ایمان اُن میں موجود ہے تو اب کیا کسر رہی جو قوم کو پردہ اُٹھا دینے کے لیے تیار نہ کیا جائے، اچھے اور بُرے نمونے مردوں میں بھی ہوتے ہیں اور عورتوں میں بھی ہوں گے، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ اگر ان میں تعلیم و تربیت اور تلقین و صحبت اچھی ملے تو عجب نہیں کہ جس طرح شریف مردوں کو، عورت کی عزت آبرو کا پاس ہوتا ہے۔ اسی طرح پڑھی لکھی تربیت یافتہ عورتوں کو نیک دل مردوں کا لحاظ ہو۔ اور جس طرح مرد اُن کی حفاظت کرتے ہیں، ایسی عورتیں بھی مردوں کے اخلاق کا خیال رکھنے لگیں، غرض سب سے بڑی بات سٹینڈرڈ آف موریلیٹی (معیار تہذیب و اخلاق) کا بڑھانا ہے۔ اگر ہمارے اطوار درست ہوں، ہمارے اخلاق مضبوط ہوں۔ ہر زن و مرد اپنی ذمہ داری کو سمجھے تو پردہ میں ایسی کونسی خوبی ہے، جس کے لیے خواہ مخواہ بی بچ کیجائے، جس طرح عصمت میں فرق آنا، ایک ان مٹ داغ سمجھا جاتا ہے اگر مرد اپنے دلمیں غور کریں اور دوسرے کی بے آبروئی کے درپے ہونا ناقابل تلافی جرم اور ناقابل معافی گناہ سمجھ لیا جائے تو پھر کیا حجت رہی۔

رہی تعلقات کی کشیدگی، تو میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ جہاں تک میں نے غور کیا عورت ہر طرح مساوات کی حق دار اور ہر لحاظ سے برابری کی جائز دعوے دار ہے جتنی بیوی کی دلجوئی اور خوشنودی خاوند کو ملحوظ ہوگی اتنی ہی توقع وہ بیوی سے کر سکتا ہے! یہ نہیں ہوگا کہ جب وہ ماں بالوں کی فرماں برداری سے ہلکی ہوئیں تو اب میاں کی خدمت گذاری سنی گئی مجھے تو مساوات کا مقتضا اور اس ترقی کا منتہا یہی معلوم ہوتا ہے ایک دن عورت مرد کی قید سے قطعی آزاد ہو جائے گی اور سچ ہے کہ حق بات کا مٹانا کارے دارد۔ اگر دعوے میں کچھ بھی جان ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور ملکر رہے گی۔ تعلقات کی کشیدگی کا خوف محض عارضی ہے، جب ہر طرح کی آزادی ہوگی تو نہ خلاف مرضی تعلقات ہوں گے۔ نہ تعلقات میں کشیدگی کی نوبت آئے گی یہ باتیں تو جب ہی تک ہیں، جبتک ایک دوسرے کے حقوق اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اپنی اپنی ذمہ داری کو نہیں پہچانتا ایک طرف تو عورتیں، صبر شکر کیئے، دبی دبائی بیٹھی ہیں اور دوسری طرف مرد صاحب ہیں کہ اپنی حکومت کے زعم میں آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں

خیر یہ تو باتیں تہہ کی ہیں، ان کا حاصل ہونا فدا دیر طلب ہے اور شاید اسی خیال سے، اس خط کا مضمون، بجائے دلاسے کے تمہارا قلق اور بڑھا دے گا مگر اب تو تم مجھے معاف کرو کہ، وقت کوتاہ و قصہ طولانی ہاں بشرط فرصت میں ان نکات پر بھی بحث کروں گا کہ فی الحال ہمیں اپنی بہنوں کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔ والسلام

تمہارا بھائی
محمد شمس الاسلام (علیگ)

راحت زمانی

مولوی سیّد احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کیگئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلّی کے محاورے قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت - ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام بھی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالرشید صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کیواسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)

ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر) منیجر عصمت و تمدن دہلی۔

(تمدن پریس دہلی)

عصمت

جہاں یہ مسلّمہ ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا زینہ ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائے گا کہ کوارپتے کی زندگی اُن کو کس طرح گذارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو قیتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و اطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و شقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر دوست اور کیا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ۴۰ میں ۴۰ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں۔ سالانہ قیمت (۲ روپے)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

تمدن

ویسٹ منسٹر ایبے

عالم اسباب میں کوئی چیز خواہ وہ کسی قسم کی ہو جب انسان کی نظر سے گذرتی ہے تو وہ اوس کے حسن و قبح پر نظر ڈالتا اور اپنے ادراک کیموافق اوسکی نسبت اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور یہ کچھ نہیں دیکھتا کہ یہ چیز اسقدر تعریف یا مذمت کی مستحق بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چیز کی حقیقت کو جب دس پانچ آدمی بیان کرتے ہیں تو اون کے بیانوں میں اتحاد نہیں پایا جاتا انسانوں کی صورتیں جسطرح مختلف ہیں اور جسطرح اونکی طبیعتوں میں بھی اختلاف ہے۔ اگر ایک شخص کسی چیز کی نسبت اچھی رائے رکھتا ہو تو یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ دوسرا شخص بھی اسکا ہمخیال ہو۔ اگر کہیں ایسا ہو بھی تو اوسکو فطرت کی کشش سمجھنا چاہیئے انسان جیسا مختلف الخیال ہے ویسا ہی سہو و نسیان سے بھی مرکب۔ ایک ایسی چیز کے جدا ہونے پر جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ عزیز تھی چند روز بعد اسطرح صبر کر لیتا ہے گویا اس سے واسطہ ہی نہیں اسکی یہ فراموشی کیا ہے اوس شے کے فنا ہونے کی دلیل ہے۔ اسی اصول سے عالم کو حادث قرار دیا گیا ہے کہ ہر شے جو یہاں موجود ہے فانی ہے۔ ہم سے پہلے کیسے کیسے نامور لوگ پیدا ہوئے لیکن آج اونکا نشان تک صفحہ ہستی پر موجود نہیں البتہ کہیں کہیں اون کے ایسے آثار و علامات نظر آجاتے ہیں کہ کچھ مدت تک اون کی یاد دنیا میں باقی ہے مگر بعض تو ایسے بے نام و نشان ہوئے اور اونکی ذاتی اور صفاتی یادگاریں ایسی مٹ گئی ہیں گویا کبھی تھے ہی نہیں کہیں کچھ نشانات موجود تو ہیں لیکن اون سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون تھے اور دنیا میں کیا کیا کام کر گئے ؛

غرض دنیا ایک اچھی خاصی عبرت گاہ ہی جہاں عبرت ٹپک رہی ہی چنانچہ ہم "ویسٹ منسٹر ایبے" کو لیتے ہیں جسمیں زمانے تلون۔ دنیا کی بے ثباتی اور عبرت و نصیحت کی بہترین مثالیں موجود ہیں +

انگلستان کی قدیم ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ "ایبے" کی عمر بہت دراز ہے اور اسکی بنیاد قایم ہوئے ہزار سال سے بھی زیادہ زمانہ گذر چکا ہے ابتدا میں اسکی حیثیت ایک چھوٹی سی خانقاہ سے زیادہ نہ تھی جسکو "سکسن المعظم ڈنسٹن" کے زمانہ میں چند راہبوں نے بنایا تھا۔

چونکہ دریائے ٹیمز کو جس کے کنارے اب کثرت آبادی کیوجہ سے محدود ہو گئے ہیں قدیم زمانہ میں پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر دور دور تک کی خبر لے اس لئے جب دریا کو تلاطم ہوتا اور موجیں بلند ہو کر پہاڑوں سے ہمسری کا دعوی کرتیں تو ریت مٹی کنکر پتھر وغیرہ "ویسٹ منسٹر" میں جمع ہو ہو کر ایک ایسا ابھار لگتا جاتا تھا جو تھوڑے ہی زمانہ میں ایک اچھا خاصہ ٹیلہ بن گیا جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس ٹیلے کے استحکام میں ترقی ہوتی گئی حتی کہ اس ریت و مٹی کے تودے نے جزیرہ کی صورت اختیار کر لی اور تھارنی آئلینڈ کے نام سے مشہور ہو گیا +

تھارنی آئلینڈ کے منظر کی خوبی کچھ وہی لوگ بخوبی معلوم کر سکتے ہیں جنھوں نے ندیوں یا تالابوں میں اس قسم کے خوشنما جزیرے دیکھے ہوں آس پاس دور دور تک شفاف پانی کی وسیع سطح پر جو سورج کے نورانی عکس سے منعکس ہو ہو کر چاندی کے پتر کیطرح چمکتی ہتی کشتیاں۔ جہاز بجرے وغیرہ بکثرت تیرتے نظر آتے تھے اور اون کے رنگ برنگ کے جھنڈے اور پھریرے ہوا میں لہرا لہرا کر کچھ عجیب دلفریب اور دلاویز سماں پیدا کرتے تھے۔

غرضکہ کچھ تو منظر کی دلفریبی اور کچھ جزیرہ کی تنہائی بخش جگہ نے جو آبادی سے فاصلہ پر واقع ہونیکی وجہ سے دنیوی شور و شغب سے پاک تھی ان تارک الدنیا راہبوں کو مجبور کیا کہ وہ یہاں خلوت گزیں ہو کر ریاضت کے لیے ایک چھوٹی سی خانقاہ کی بنا ڈالیں +

آہ! اس مشہور اور مبارک خانقاہ کا بنیادی پتھر رکھتے وقت انہیں کیا خبر تھی کہ

کہ کسیوقت میں یہ چھوٹی سی خانقاہ کلیسائے اعظم بن جائیگی اور جہاں اونہوں نے اوسوقت ایک معمولی عبادت گاہ کی بنا ڈالی تہی وہ ایک ایسی رفیع الشان اور عالی منزلت عمارت کا بنیادی پتھر ثابت ہوگی جسکی زمین میں علاوہ شاہان انگلستان کے ایسے ایسے کاملین علوم وفنون مدفون ہوں گے جن کا ستارہ فیض نصف النہار پر چمک کر دنیا کو اپنی شعاعوں سے منور کر دیگا الحاصل اسی مختصر خانقاہ کو "ابے" کی تعمیر کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے +

جب شاہ ایڈورڈ[1] دی کانفسٹر نے جو فطرتاً پرہیزگار و متقی تہا ان تارک الدنیا راہبوں کو آزادی و بیفکری کے ساتہ خوبصورت و عافیت بخش جزیرہ میں زندگی بسر کرتے دیکہا تو اوس کے فطری زہد و تقوی نے اوسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بھی انہیں راہبوں کے قریب اپنا محل تعمیر کرائے۔ چنانچہ بہت جلد اسکی تکمیل ہوگئی اور نہ صرف اوس نے اپنے ہی لیئے ایک عالیشان محل بنوایا بلکہ اسی چھوٹی سی خانقاہ کے متصل راہبوں کے لیے ایک نہایت عالیشان کلیسا بھی بنوا دیا جو ۲۸ دسمبر ۱۰۶۵ء کو عبادت گاہ کے لیے وقف ہوا لیکن افسوس! اس کے چند ہی روز بعد ۵ جنوری ۱۰۶۶ء کو اس بادشاہ کا انتقال ہوگیا اور یہ اسی کلیسا کے صحن میں دفن کیا گیا۔ ایڈورڈ کی زاہدانہ زندگی نے اوسکو جیتے جی ایک مقدس راہب مشہور کر دیا تہا۔ مرنے کے بعد تو وہ ایک باعظمت ولی خیال کیا جانے لگا اور ہمیشہ اوسکی قبر پر زائرین کا ہجوم رہنے لگا۔

المختصر "ابے" کا پہلا پانی "ایڈورڈ" تہا اس کے بعد ہی بعض بادشاہ اسکی تعمیر میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے گئے۔

"ابے" کا بیشتر حصہ جسکو اب ہم موجودہ حالتمیں دیکھتے ہیں ہنری سوم کا بنایا ہوا ہے جس نے ایڈورڈ کے تعمیر کردہ کلیسا کے شرقی حصہ کو ڈھا کر دوبارہ تعمیر کرایا اور ایڈورڈ کی لاش کو وہاں سے ایک دوسرے خوبصورت مقبرے میں منتقل کر دیا۔ اوسکا ارادہ تہا کہ کل کلیسا کو منہدم

[1] انگلستان کا بادشاہ گزرا ہے اس کے کانفسٹر (تصدیق کرنے والا) کے لقب سے مشہور ہونیکی وجہ یہ ہے کہ وہ دین مسیحی کا بڑا راسخ الاعتقاد خادم تہا +

کرے لیکن یہ خواہش اوس کے بیٹے ایڈورڈ اول۔ رچرڈ دوم ہنری پنجم اور چند اسقفوں کے ذریعہ سے شدہ شدہ تکمیل کو پہونچی۔ نیز اوس چیپل سے جو ایبے کے مشرقی حصہ میں واقع ہے اور اوس قصیدہ سے جو پتھر میں کندہ ہے ثابت ہے کہ ہنری ہفتم بھی اسکی تعمیر میں حصہ لینے سے محروم نہیں رہا۔ اور غربی دروازوں کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۴۵ء تک بھی تکمیل نہیں پائے تھے غرض موجودہ کلیسا ایک عہد یا ایک بادشاہ کی بنائی ہوئی عمارت نہیں ہے بلکہ اوسکی مختلف طرز تعمیر ثابت کرتی ہے کہ وہ مختلف عہدوں اور مختلف بادشاہوں کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچی ہے ولیم فاتح کے زمانے تک ایبے میں کسی بادشاہ کی تاجپوشی نہیں ہوئی لیکن چونکہ ولیم فاتح ایڈورڈ کانفسٹر کا حقیقی اور جائز وارث مانا جاتا تھا اس لیے اوسکی تاجپوشی کی رسم کا ایڈورڈ ہی کی پہلو میں ادا کیا جانا مناسب سمجھا گیا اور اس لحاظ سے ولیم ہی وہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے ایبے میں تاج شاہی سے اپنے فرق کو زینت بخشی۔ پھر تو اوس کے بعد جتنے بادشاہ گذرے اونکی تاجپوشی کی رسم یہیں ادا ہونے لگی۔ اسی غرض سے کانفسٹر کے چیپل میں تاجپوشی کی ڈوکرسیاں کہی ہیں جنمیں سے ایک تو خاص ولیم ویسری اور دوسری شاہ ایڈورڈ اول کے لیے بنائی گئی تھی۔

چونکہ کانفسٹر زہد و تقوی اور ریاضت میں ایک باخدا راہب کیطرح مقدس خیال کیا جاتا تھا اس لیے اوس کے بعد کے اکثر شاہان انگلستان اوس کے چیپل میں دفن ہونا اپنے لیے ذریعہ نجات اور ایک عظمت عظیم خیال کرتے تھے چنانچہ اسی خیال سے ہنری سوم نے اوسکی لاش کو ایک دوسرے خوشنما مقبرہ میں منتقل کرکے اوس کی قبر پر ایک بڑا گرجا بنا دیا۔ اور خود بھی اوسی میں دفن ہوا۔

ایڈورڈ اول معہ ملکہ الینور۔ ایڈورڈ سوم معہ ملکہ فلیپا نا و تہامس آف وڈاسٹاک رچرڈ معہ ملکہ آنی اور ہنری پنجم معہ ملکہ کیا تہراین اسی گرجا میں مدفون ہیں۔ ہنری ششم نے بھی یہیں اپنی قبر کے لیے جگہ منتخب کی تھی مگر سوشۂ تقدیر کے تقاضے سے

سینٹ جارج کے چیپل میں دفن ہوا جو "ونڈسر" میں واقع ہے +

ہنری ہفتم کے مقبرے میں خود ہنری اور اسکی ملکہ الزبتھ کے علاوہ ایڈورڈ ششم۔ جیمس اول معہ ملکہ آنی۔ چارلس دوم آنی ہائیڈ ملکہ جیمس دوم ولیم سوم اور میری ملکہ آنی جارج دوم معہ ملکہ کیا ہنرائیس اور اور بہت سے شہزادے اور شہزادیاں مدفون ہیں نیز اسی مقبرے میں ایک زمانے تک کرامول براڈشا۔ اور بلیک کی لاشیں بھی دفن ہیں لیکن جب چارلس دوم نے تختِ حکومت پر قدم رکھا تو حمیت و تعصب سے ان سب کی لاشیں وہاں سے نکلوا ڈالیں

اب ہم طوالت کے خیال سے صرف مشہور شعراء کا ذکر کرتے ہیں جو عموماً عبرت کے ساتھ پڑھے جانے کے قابل ہے۔

ویسٹ منسٹر ایبے کا نقشہ قریب قریب ایک صلیب کی شکل سے ملتا جلتا ہے جس کے جنوبی بازو کے جنوبی و شرقی حصّہ کو شاعروں کی دفن گاہ ہونیکا فخر حاصل ہے اور اس عمارت کے بقیہ حصّہ میں دوسرے مشہور معروف علماء و فضلا وغیرہ مدفون ہیں۔ زایرین کو اسجگہ پر ہر قدم پر ایسے ایک نہ ایک شخص کی یادگار ملتی ہے جو اپنی قلم کے ذریعے شہرت دائمی حاصل کر چکا ہے اس حصّہ میں تمام یادگاریں ایسی نہیں ہیں کہ جن میں اہلِ یادگار کی لاشیں ہی مدفون ہوں بلکہ اکثر ایسی بھی ہیں کہ جن کے کتبہ پر ہم نامور شاعر کا نام دیکھتے ہیں لیکن اوسمیں اوسکی لاش نہیں ہے۔ چنانچہ شکسپیر۔ اسٹرائٹ فورڈ مین ملٹن لندن میں۔ برنس پرس میں۔ لانگ فیلو امریکہ میں اور بین جانسن ایبے کے دسلی حصّہ میں دفن ہیں لیکن ان سب کی یادگاریں شعراء کی صف میں موجود ہیں۔

سب سے پہلے جس شاعر کو شعراء کے سلسلہ میں جگہ ملی وہ "چاسر" تھا گویا یہ کہنا چاہیئے کہ "چاسر" اس سلسلہ کا بادشاہ ہے اور دوسرے تمام شعراء اس کے زیرِ حکومت روحانی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ چاسر کی یادگار کے قریب لانگ فیلو کا نصف پیکر

+ چارلس اول کے زمانہ میں جو خونریزی خانہ جنگی ہوئی تھی اوس کے بانی مبانی یہی لوگ تھے ۱۲

کھڑا ہے اور اسی کے قریب ڈرائیڈن۔ بومانٹ کا ولی اور ڈرٹین، آرام کر رہے ہیں ڈرٹین کا کتبہ جو نہایت موثر الفاظ میں کندہ ہے یہ ہے :-

"اے سنگ مرمر کی یادگار انگلینڈ کو یاد دلا کہ وہ اور اوسکی آئندہ نسلیں اوس"
"نامور ڈرٹین کی کس قدر زیر بار احسان ہیں جسکی مقدس اور متبرک خاک کو"
"ہم نے تیری حمایت میں سپرد کر دیا ہے"
"اوس کی یادگار کو زمانہ کے استداد سے بچاتی رہ اور اوسکی کہانی کو لوگوں کے"
"حافظہ میں تازہ رکھ۔ اور خدا کرے کہ تو اوسکی عظمت و شان کی ایک دائمی یادگار ثابت ہو"
"جب اوسکی لاش خاک ہو جائیگی تو یاد رکھ کہ اوسکا نام جو صفحہ ہستی سے مٹنے"
"والا نہیں ہی تیرے لیے ایک دائمی یادگار ثابت ہوگا"

"ڈرٹین کی یادگار کے قریب ہی ایک دوسرے بڑے شاعر کی یادگار جس پر"
"جلی حروف میں "آہ! یگانہ روزگار۔ بین جانسن" کندہ ہے"
"چاسر کے بازو اسپنسر مدفون ہی جسکا حسب ذیل کتبہ بھی پڑھنے کے قابل ہے"
"یہاں چاسر کے قریب اسپنسر لیٹا ہوا ہے، جو مضمون آفرینی میں"
"ثانی چاسر تھا اور اب بھی قبر میں اوسیجگہ پہلو بہ پہلو آرام کر رہا ہے"

اسپنسر کا کتبہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں ملک الشعرا تھا اور اوسکی تصانیف اوسکی خداداد نکتہ سنجی کی پوری پوری شہادت دیتے ہیں ٹیلر ملٹن۔ اور گرے کی یادگاریں ان کے بعد آتی ہیں بہت سے نامور فضلا کی قبروں کو طے کر کے جنکو قریب قریب اب زمانہ بھول گیا ہی ہم گرانول شارپ کی قبر کے پاس آتے ہیں جس کی ان تھک کوششوں نے اخیر میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ :-

"انگلستان میں غلام غلام نہیں رہ سکتے اونکو سرزمین برطانیہ کی ہوا لگی کہ"
"اسیوقت آزاد ہو گئے اور اونہوں نے ہماری ملک میں قدم رکھا کہ اوسیوقت"

"اون کے گلوں سے طوق وزنجیر گر پڑے"

اوسکی دل میں ہمکو کیا مل۔ ساؤدی کا ورج شیکسپیر، برنس، ہامن اور گے وغیرہ کی یادگاریں ملتی ہیں گے کے پڑوس میں گولڈ اسمتھ سو رہا ہے جسکا لاطینی خوبصورت کتبہ جو ڈاکٹر جانسن کی قابلیت کا نتیجہ ہے یہ الفاظ ظاہر کرتا ہے:-

"بمشکل کوئی صنف باقی رہ گئی ہوگی جس میں اوس نے قلم نہ اوٹھایا ہو اور"
"جو کچھ اوس نے لکھا خوب لکھا"

"اوس کی یادگار کو اوس کے دوست اور ساتھی خلوص و محبت۔ اور"
"ناظرین ادب و تعظیم کے ساتھ بوسہ دیتے ہیں"۔

گولڈ اسمتھ کی موت کے دس ہی سال بعد ڈاکٹر جانسن کے دن اخیر ہوگئے اور وہ اوسی کے قریب دفن ہوا۔ اڈیسن، ڈکنس، تیاکری، میکالے اور رہیانڈل، ایک دوسرے کے قریب لیٹے ہوئے ہیں اڈیسن کی قبر پر یہ کتبہ کندہ ہے:-

"ان حجروں میں جہاں کہ نامور لوگ دفن ہیں اوسوقت سہی جب سے کہ اون کی بنیاد"
"پڑی ہے کوئی ایسا نیک اوصاف میہمان نہیں لایا گیا اوس نزہت گاہ میں"
"جہاں خوشی لازوال ہے ایسی خوبصورت روح نہیں پہونچائی گئی"
"افسوس! وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا! ہمیشہ کے لیے ہماری الوداع"
"قبول کرو اور اطمینان سے اپنے عزیز مانٹیگیو کے بازو آرام کرتا رہ"۔

ان سب کے بعد زمانہ حال میں جو شاعر شعرا کی صف میں داخل ہوا ہے وہ نازک خیال اور فطری شاعر "ٹینی سن" ہے جسکا کتبہ خود اوس کے لفظوں میں اسطرح کندہ ہے:-

"اوس کی روح پر ایک سلطنت کا ماتم برپا ہے، اور ایک زبردست"
"قوم اوسکی موت پر نوحہ پڑھ رہی ہے"۔

سید اللہ بخش ادیب۔ مہدوی

غرۂ شوال
یا
ہلالِ عید

غرۂ شوال اے نورِ نگاہِ روزہ دار
اک تڑپتا تیرے پیچھے مسلمِ سرپا انتظار

تیری پیشانی پہ تحریرِ پیامِ عید ہے
یعنی تیری شام صبحِ عیش کی تمہید ہے

سرگذشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
اے مہ نو ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے

جس علم کے سایہ میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم
دشمنوں کے خون میں ڈوبیں قبا ہوتے تھے ہم

زندگی تیری جبیں بوسی اسی رایت کی ہے
حسن افزا فزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے

آشنا پرور ہے قوم اپنی وفا آئین ترا
ہے محبت خیز یہ پیراہن سیمیں ترا

وسعتِ ہستی میں گو رفعت تجھے منظور ہے
اے فلک مسکن افق گردی ترا دستور ہے

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی پستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ اور انکی برق رفتاری بھی دیکھ
راہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

دیکھ کر تجھکو افق پر سم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر ہماری آج نادار بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں سلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ انکی گرفتاری بھی دیکھ

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

کافروں کی سلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی سلم آزاری بھی دیکھ

بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ

ہاں تملق پیشگی دیکھ آبروؤں کی تو
اور جو بے آبرو ہے انکی خودداری بھی دیکھ

جسکو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

رہ گئی اپنی کہن دامی سے ہم محرومِ صید
اس چمن میں اپنی قسمت کی نگوں ساری بھی دیکھ

مکر کے پھندہ میں شہبازِ مرامش آگیا
امتِ عیسے کا آئینِ جہانداری بھی دیکھ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے میدانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ کر خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

اقبال

فریڈرک دوم

(جس نے عربوں کے طرز پر سب سے پہلے یورپ میں یونیورسٹی قایم کی)

اسوقت جبکہ سر آغا خان مسلم یونیورسٹی کے لیے بے انتہا کوشش کر رہے ہیں اور اوس کے خوش آیند خیالات سے قوم میں ایک سرور طاری ہے ہمارے اکثر اخبارات اور لکچرار مسلم یونیورسٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یونیورسٹی کا طریقہ یورپ نے مسلمانوں سے حاصل کیا لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلمانوں سے اخذ کر کے یورپ میں سب سے پہلے یونیورسٹی سسٹم کس نے جاری کیا اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اوس شخص کے تذکرہ سے اُردو داں پبلک کو مطلع کریں جو یورپ اور اسلام میں اِس علمی عمارت کا واسطہ تھا۔

یہ مسلم ہے کہ آج یورپ کا تمام عروج تمدن عربوں سے ماخوذ ہے جیسا کہ خود اکثر منصف مزاج یورپینوں کو اسکا اقرار ہے کیونکہ ازمنہ مظلمہ اور وسطی کی جہالت کی تاریکی کو جس چیز نے دور کیا وہ درحقیقت قرطبہ اور غرناطہ کی وہ علمی روشنی تھی جو یورپ میں پہونچکر تمام عالم پر چھاگئی۔

سب سے پہلے جس شخص نے اِس روشنی کو یورپ میں پھیلایا وہ شارلین شہنشاہ جرمن تھا جو ہارون رشید کا معاصر تھا جس نے اپنے دربار میں علما و فضلا و شعرا کا ایک اچھا خاصہ مجمع قایم کر لیا تھا۔ اُس کے دربار میں آٹھویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا شاعر (الکوین) موجود تھا۔ جو عبرانی، و لاطینی اور عربی زبان جاننے کے علاوہ فلسفہ اور طبعیات کا خاص طور پر ماہر تھا۔ اُس کے بعد اسکا پوتا شارل جو یورپ کیطرف سے فرانس کا بادشاہ تھا اِس کام کے لیے مستعد ہوا۔ اور اس نے

تہیہ کر لیا۔ کہ اس نویں صدی میں اپنے دادا کے پرانے کارنامے کو از سر نو زندہ کرے۔ چنانچہ اس کام کے لیے انگلستان کے بڑے عالم جون ارینا کو جو عربی، یونانی، اور عبرانی کے علاوہ فلسفہ اور طب کا ایک جید عالم تھا طلب کر کے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ لیکن افسوس کہ پوپ کی جابرانہ حکومت نے اس کے تمام ولولوں کا قلع قمع کر دیا۔ اور اس کی کل امید و بیم پانی پھیر دیا۔ کنیسہ کیطرف سے اوسپر عجیب عجیب اتہامات لگائے گئے اور اوسپر کفر کا فتویٰ شائع کیا گیا۔ اس لیے وہ اپنی تمام آرزوؤں کو قبر میں اپنے ساتھ نہایت ہی حسرت و یاس کے ساتھ لیکن شارل گو مر گیا لیکن وہ عربی کتابوں کے تراجم کے ذریعہ سے آزادی کی ایسی روح یوپ میں پھونک گیا تھا جو پوپ کی کوشش سے نہ مٹی آخر سسلی میں فریڈرک کے وجود نے اس اثر کو اور زیادہ پیدا اور مستحکم کر دیا۔

فریڈرک ثانی دنیائے تاریخ کا ایک بڑا اولوالعزم بادشاہ گذرا ہے جس نے کہ یورپ کے علمی اور اجتماعی حالت میں ایک بڑا انقلاب پیدا کیا ہے۔ فریڈرک ثانی ملک اٹلی میں انکونا کے قریب مقام جانسی میں ۲۶۔ دسمبر سنہ ۱۱۹۴ء کو پیدا ہوا۔ سنہ ۱۲۵۰ء میں وفات پائی سنہ ۱۱۹۶ء میں ولیعہد منتخب کیا گیا تخت سسلی (حقلیہ) کی اصلی وارث فریڈرک کی ماں کونسٹانس تھی لیکن کونسٹانس کے بدلے باپ کے مرنے پر فریڈریک نے تخت سسلی پر قدم رکھا۔

فریڈرک بچپن ہی سے نہایت ہی چست و ہوشیار ہوا۔ اوسکو علوم و فنون کیطرف ایک خاص رغبت تھی اوس زمانہ میں بالرم پایۂ تخت سسلی مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا جنمیں بیشتر اہل علم اور اطبا موجود تھے اور اکثر فریڈرک کے مصاحبوں میں داخل تھے ان ارباب علم کی صحبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اوس کی علمی پیاس بجائے بجھنے کے اور تیز ہو گئی، اوس نے جا بجا ملک میں درسگاہیں قائم کیں

جن میں زیادہ تر عرب اور یہود پروفیسر ہوتے تھے ان درسگاہوں میں سے دو درسگاہیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں پہلی ناربولی کی درسگاہ اور دوسری سطرنو کا طبی مدرسہ۔ ان دونوں مدرسوں کے ذکر سے پہلے ہم سسلی اور عربوں کے عام تعلقات بیان کرتے ہیں،

اندلس کے عربوں کا اثر شروع شروع فرانس کے جنوبی حصہ پر پڑا۔ زوال اندلس کے بعد اکثر عرب جنوبی فرانس میں ہجرت کر گئے تھے جن کے ساتھ ساتھ علوم شائستگی، تمدن بھی جنوب فرانس میں پھیل گیا، تالیفات و تصنیفات کا رواج ہو گیا علوم و فنون کو ترقی ہوئی۔

عربوں کی اس ہجرت کا اثر گو تمام فرانس پر پڑا لیکن مونپلیہ کی یونیورسٹی اس سے زیادہ متاثر ہوئی کیونکہ اوسمیں فرانسیسوں نے ایک طبی مدرسہ بھی قائم کیا تھا جسمیں ان مہاجرین عرب و یہود سے زیادہ مدد لی گئی انہوں نے اوسمیں علوم و فنون کی ترقی میں بے انتہا حصہ لیا۔ گو تمام یورپ میں اس درسگاہ کی شہرت ہو گئی اور وہ اسوقت تمام اطراف و نواح کا علمی روشنی اور آزادی کے اعتبار سے مرکز بن رہا تھا لیکن طرفداران پوپ ان باتوں سے کسی طرح سے راضی نہ تھے۔

سسلی کا بھی یہی حال ہوا سسلی اندلس سے بالکل ملحق ہے اس لیے وہاں اندلس کے مسلمانوں کا بڑا اثر تھا کچھ دنوں کے بعد عربوں نے اس جزیرہ کو فتح بھی کر لیا اس لیے سسلی میں عربی رنگ بالکل غالب آگیا۔ اور یہ اسقدر گہرا رنگ جما تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلنے پر بھی نہ مٹا۔

اس کے بعد فریڈرک کا دور آیا اس کے عہد میں (یعنی تیرھویں صدی کے شروع میں) باشندگان سسلی ایک معجون مرکب تھے جن میں عرب

یونان۔ رومان۔ یہود۔ جرمن۔ لونرمان۔ سب مختلط تھے۔ جو یونانی۔ لاطینی عبرانی۔ عربی۔ جرمنی۔ فرانسیسی وغیرہ بلا تکلف بولتے تھے۔ گو یہ مختلف الاجناس قومیں تھیں لیکن پھر بھی ہر ادا سے اون میں عربیت کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا تھا خصوصاً طرز تعمیر میں عربی رنگ بے انتہا غالب تھا۔ اور مینارے گنبد، برجیاں۔ عربی طرز کی خصوصیت کو ظاہر کر رہی تھیں۔

سسلی میں مسلمانوں کی مفتوحی اور نورمانیوں کی فتح کے بعد بھی علم کا وہی چرچا رہا۔ تقریباً تمام اساتذہ اور پروفیسر وہی عرب یا یہود تھے جو اندلس کے مدارس کے تعلیمیافتہ تھے خصوصاً طبی مدارس میں تو تمام انہیں لوگوں کا قبضہ تھا۔ کیونکہ نورمانی جو فاتح تھے بہت تھوڑی تعداد میں تھے اس لیے تقریباً تمام عہدے کل مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہے۔

بادشاہان وقت اور امرا اون کو ہر بات میں ترجیح دیتے تھے۔ اور ذمہ داری کے تمام عہدے انہیں کے سپرد کرتے تھے۔ یہانتک کہ فوج اور دفتر کا کام بھی انہیں کو سپرد کیا جاتا تھا خصوصاً بحری فوج میں بے انتہا انکی بھرتی ہوتی تھی۔ کیونکہ اسوقت کے جنگی بیڑے اکثر انہیں کی ماتحتی میں ہوتے تھے سسلی کی عام عمارتوں میں عربی طرز نمایاں تھا۔ فریڈرک نے شام سے معدنیات کے کام کے لیے اور مصر سے زراعت کی تعلیم کے لیے لوگ بلوائے تھے سلطنت عموماً سیاسی مہموں میں انہیں عربوں سے مدد لیتی تھی۔ یہاں تک کہ روما کے سفارت میں اور ڈیپوٹیشن تک میں یہی جاتے تھے۔

وہاں کی سلطنت کی اور نیز ترقی یافتہ جماعت کی زبان عموماً عربی تھی۔ گو سسلی کے کل شہروں کا یہی حال تھا لیکن خصوصاً پالرم۔ سالرن۔ میسینا۔ سیراکوس وینا میں عربوں کا اثر زیادہ تھا۔ مگر گاؤں۔ قصبات اور دیگر مقاموں میں بھی

عربی عنصر کم نہ تھا۔

سب سے پہلے فریڈرک نے مقام نابولی میں ایک یونیورسٹی قایم کی جس میں علاوہ اون لوگوں کے جو وہاں موجود تھے دور دور سے عربی عالموں کو بلا کر مقرر کیا۔ ممالک یورپ کے کتبخانوں کے علاوہ اندلس مصر و شام سے علمی کتابوں کے جمع کرنے میں سب سے بڑی مدد مسلمانوں سے ملی۔ اس ملک کا بحر متوسط میں ہونا بھی یورپ میں علمی روشنی پھیلانے میں بڑا ساعی ہوا۔ اسی واسطے مختلف طبقات کے طلبا دور دور سے یہاں کا قصد کر کے آتے تھے۔ کم استطاعت طالبعلم کو مفت تعلیم دی جاتی تھی سلطنت اپنی وسعت کے مطابق اوسکا پورا انتظام کرتی۔ اور ہر بات کا خیال رکھتی

فریڈرک کے عہد کا وہ مدرسہ نو کا بھی مدرسہ تھا پہلے پہل اس مدرسہ کو آٹھویں صدی عیسوی میں بعض عرب اور یہودیوں نے قایم کیا تھا لیکن درحقیقت اوس کی اصلی ترقی فریڈرک ثانی کے زمانہ میں ہوئی۔ اون کے کورس کا ماخذ طب میں بقراط اور جالینوس کی کتابیں۔ اور فلسفہ میں ارسطو کی کتابیں تھیں اور وہ کتابیں بھی اسمیں شامل تھیں جنکو عرب نے اصول یونانیہ سے اخذ کر کے اپنے رنگ میں ڈھال لیا تھا غرض کہ مدرسہ کا ایک خاص رنگ تھا جسمیں مسلمان نصاریٰ۔ یہودی۔ دہریہ سب تعلیم پاتے تھے۔ اور اوستاد شاگرد دونوں میں سے کسی پر بھی مذہبی روک ٹوک نہ تھی بلکہ اوس کے بجائے یہ زیادہ مدنظر رہتا تھا کہ لوگ یہاں سے علم و فلسفہ کے جامع نکلیں۔

سالرن کالج میں علوم و فنون کی تعلیم بذریعہ املا (لیکچر) کے ہوتی تھی جیسے آجکل کالجوں میں ہوتی ہے۔

اوستاد تمام مسائل کو مشاہدہ اور تجربہ کے ساتھ بتلایا کرتا تھا۔ خصوصاً علم تشریح کے مسائل۔ اوس زمانہ میں عیسائی مذہب میں مردہ کا چھونا حرام تھا لیکن عرب قرطبہ میں مردوں کی تشریح کرتے تھے اِس لیے سالرن کالج کے جرّاح بندر اور مثل انسان کے دوسرے جانوروں کی تشریح پر اکتفا کرتے تھے اور جب کبھی ایسی ضرورت انسانی جثہ کی تشریح کی لاحق ہوتی تو پوشیدہ طور پر اسکو عمل میں لاتے۔

اس کالج کو اون کے اوستادوں کے علم تشریح وغیرہ میں اکتشافات کرنے کے باعث بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ انہیں لوگوں نے کیلوس کے خصائص تنسیت کے وظائف جہاز لیفادی کے وظائف اوعیہ شعریہ وغیرہ وغیرہ کے اکتشافات حاصل کیے۔ اور ان چیزوں کے یہ نام بھی یہیں کی ایجاد ہے۔ اسیطرح آنکھ کی رطوبتیں۔ اون کے طبقات ہضم کے درجے کا بھی اکتشاف کیا۔ اور مبیض اور تنسیت کا عمل فلوپیوس کے چار سو برس پیشتر دریافت کیا ؛

اوسمیں خاص خاص امراض کے بھی طبیب تھے۔ جو طب کے بعض فروعیات کو لیکر اوسمیں کمال حاصل کرتے تھے۔ مثلاً بعض اون میں سے درد چشم کے طبیب تھے۔ بعض شانہ، فق وغیرہ کے جراح تھے بعضوں نے عورتوں کی بیماری اور ہڈیوں کے جوڑنے میں کمال پیدا کیا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنکا کام یہ تھا کہ وہ یہ بتلایا کریں کہ اصول طبیہ کا اثر اعضا پر حالت مرض وصحت میں کیا ہوتا ہے ان باتوں کے متعلق اکثروں نے خاصکر کتابیں تدوین کیں۔ بعضوں نے اوسکو نظم کرکے ایک طویل قصیدہ میں لکھا جسکا نام Tes medicinae schola salerni

لیکن بعد کو اسکا Regimen sanitatis. نام معلوم ہوا۔

نیز محققین نے یہ بھی پتہ لگایا کہ یہ کتاب ایک شخص کی کتاب کا ملخص ہے جسکا نام اسحٰق بن سلیمان تھا جو قرطبہ کے طبیبوں میں سے ایک بڑا طبیب تھا جس کا سنہ وفات ۹۵۰ء ہے بہرحال اگر حرف اوس کی بھی تصنیف ہو تو اکثر مقامات میں دونوں کا اشتراک ہے۔ نیز یہ کتاب تشخیص امراض تشریح اعضاء وغیرہ کی بھی بحث ہے۔ اس میں طبی علاج زہر کے مقابل میں بتلایا گیا ہے جس کا نام اپنے اصطلاح میں تریاق لکھا ہے۔

اسیطرح بہت سی حفظانِ صحت کی ہدایات ہیں جنکا سال کے ہر مہینہ مطالعہ کرنا ضروری ہے اور صحت کے متعلق بہت سی بحثیں طالع اور بروج کی بھی ہیں۔

اس کالج کی ترقی یہاں تک پہونچگئی تھی کہ خود گورنمنٹ نیم حکیموں اور عطائیوں کی خاص طور پر نگہداشت رکھتی تھی۔ اور انکو طبابت کے کام سے روکتی تھی۔ اور اگر اجازت بھی دیتی تو اون سے پورا عہد لیتی کہ مدرسہ کے قانون یا طبی پروگرام کے مطابق وہ اپنی پوزیشن برابر قایم رکھیں گے۔

ساکرن کالج میں متعدد شفاخانے تھے جنمیں سب سے پہلا نویں صدی عیسوی میں اُن قواعد پر قایم کیا گیا تھا۔ جن پر بنو اُمیہ نے قرطبہ اور شام میں اپنے شفاخانے قایم کیئے تھے۔ بعض شفاخانوں کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں جن کے متولی بعض وہ رہبان ہوتے تھے جنھوں نے اپنی زندگی انسانی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔

اس مدرسہ کا پروگرام نہایت باقاعدہ اور منتظم تھا۔ طالب علم کو پہلے تین سال عام علوم اور علم ادب اور فلسفہ پڑھنا ہوتا تھا۔ پھر پانچ سال خاص کر علم طب

حاصل کرتا تھا +

اس مدرسہ سے ایک بڑا گروہ علماء اور اطبا کا تعلیم یافتہ ہو کر نکلا جنمیں کا مشہور و معروف جراح بلوم کا باشندہ روجرس تھا جو زخم ہڈی کے جوڑ اور نیز ورم وغیرہ کا علاج کرتا تھا۔

اسیطرح متی سلفانیکوس ہے جس نے ایک فصد اور دوسری قرابادین میں ایک کتاب لکھی منجملہ اون کے ایک شخص غریبونتس تھا جو امراض سینہ کے علاج میں بڑا ماہر تھا۔ اسی طرح ایک شخص جنیوا کا بروسیڈا تھا جو نہ صرف فریڈرک کے شاہی محل کا بلکہ امراء دربار کا بھی طبیب تھا۔ اور یہ سب فن جراحی میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے۔

انہیں فاضل طلبا میں سے ایک گروہ مسینا کے یہود کا بھی تھا جنمیں کا بڑا شخص فراغوط تھا جس نے رازی کے کتاب (الحاوی) کا ترجمہ کر کے سارل الجو برادر لوئیس تاسع (نوان) شاہ فرانس کے نام اوسکا ڈیڈیکیشن کیا تھا۔

سالرن کالج میں طلبا مرد، عورت سب ایک ساں داخل کیے جاتے تھے اسمیں ایک مدرسہ خاصکر دائیوں کا بھی تھا۔ چنانچہ اس کالج سے مثل مردوں کے بہت سی عورتیں بھی تعلیم یافتہ ہو کر نکلیں جو کہ نہ صرف طب کی ماہرہ تھیں بلکہ کیمیا اور جراحی بھی اعلیٰ درجہ کی جانتی تھیں۔

منجملہ اون کے ایک طبیبہ رفقہ تھیں جنھوں نے ایک کتاب خاصکر حمیات میں تصنیف کی اسیطرح ایک عورت ابہلا ہے جس نے ایک کتاب فن ولادت میں لکھی ہے۔ ایسی ہی ٹور ٹولا نے اصول طبی اور فتق میں اور مرکوریا نے فن جراحی میں کتابیں لکھیں ایک اون میں سے کوستانزا کولنڈا بھی تھی۔ جو علم، جمال دونوں میں مشہور عالم تھی +

یہاں کا طریقہ علاج بھی بہت آسان تھا فیس متوسط درجہ کی تھی فقرا کا علاج مفت کیا جاتا تھا۔

فریڈرک مسلمان سلاطین سے رابطۂ مودت بھی رکھتا تھا سلطان مصر اسکا بڑا گہرا دوست تھا۔ آپس میں تبادلۂ سفرا بھی اکثر ہوا کرتا تھا۔ ایکدفعہ جب ۱۲۴۱ء میں فریڈرک کا سفیر قاہرہ پہونچا تو اوس کے لیئے تمام قاہرہ آراستہ کیا گیا اور بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ اسیطرح تمام دنیائے اسلام کیساتھ تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اسیوجہ سے ہندو مصر کی مصنوعات بالرم وسینا اور یہاں سے دیبا نہ اٹلی ہوتے ہوئے تمام یورپ میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ اور یہ پہلا شخص ہے جس نے ان تعلقات کو وسعت دی۔ اسی لیئے اس کے جہازات بحر ابیض اور بحر اٹلانٹک تک چکر لگاتے رہتے تھے۔ شامان مشرق اور مشرق سے اسکا شغف جنگ صلیبی کے بعد سے صاف طور پر ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ اس کے اکثر خنگوں میں اس کے خاص شیر اور بادی گارڈ کے لوگ تقریباً کل ہی مسلمان تھے

فریڈریک ثانی درحقیقت ایک علم دوست فرمانروا تھا۔ اسکو ریاضت میں خاص دستگاہ حاصل تھی بلسا دقات وہ جبر مقالہ۔ اور علم ہندسہ کے خاص پیچیدہ مسائل علما دربار کے سامنے حل کے لیئے پیش کرتا تھا۔ اکثر پیچیدہ اور مشکل مسائل مصر اندلس افریقہ کے علما کے پاس حل کے لیے بھیجا کرتا تھا۔

فریڈرک ثانی ذکاوت۔ شجاعت۔ علم کے حیثیت سے اپنے زمانے میں سب سے بڑا شخص تھا وہ عربی عبرانی۔ اور لاطینی زبان جانتا تھا۔ الغرض یہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں کی طرز پر یورپ میں عربوں کی مدد سے یونیورسٹیاں قائم کیں +

ابوظفر بہاری ندوی

حقیقی شاعری

شعاعیں کر رہی ہیں برگ گل پر رنگ آمیزی
قلم کاغذ پہ خاموشی سے چلتا ہے مصور کا

یہ ہیں دو مختلف کام اسمیں لیکن روح بھر دینا
اور اسمیں ڈالدینا جان ہے کام ایک شاعر کا

بہار آگیں گل و لالہ سے ہے کہسار کا دامن
چمکتے ہیں اندھیری کان میں لعل بدخشانی

اودھر چند بات صادق سے جواہر خیز ہے سینہ
اودھر کاغذ پہ شاخ خامہ ہے محو گل افشانی

لب ساحل اگر تم ہاتھ سے پانی کو جنبش دو۔
تو موجیں دور تک جائینگی متوازی دو ایر کی

تموج ہے ہوا میں نغمۂ شاعر سے اور یوں ہی
قیامت تک چلی جائینگی موجیں اس سمندر کی

بہت آسان ہے اے ملحد تم کو یہ کہدینا
کہ کیا حاجت خدا کی اور ضرورت کیا نبوت کی

مگر اپنی زبان سے تم یہ کہ سکتے نہیں ہرگز۔
کہ تم کو کچھ نہیں حاجت فصاحت اور بلاغت کی

بہار اندوز تاثیریں ہیں حسن خصائل سے
نہ ہو نشو و نما تا خار و خاشاک معائب کی

ہمیشہ سے رہی ہے احتیاج اقوام عالم کو
حکومت کی حقیقی شاعری کی۔ اور مذہب کی

حکومت اور مذہب میں وہ ہیبتناک دیوتا جو
ڈراکر اور دھمکا کر ہمیں مجبور کرتے ہیں۔

مگر اچھی ہے پند خوشگوار ملہم[۵۱] غیبی
ہم اسکو شوق سے سنتے ہیں اور منظور کرتے ہیں

---

۵۱ یعنی شاعر

مقرر بزم میں کرتا ہے جو تقریر طولانی — خود اوسکو یاد رکھ سکتا نہیں جتنا وہ کہتا ہے
مگر شاعر کا دل آویز موزوں مختصر فقرہ — دلو پر نقش ہوتا ہے۔ ہمیشہ یاد رہتا ہے

سحر گہ گوشۂ مسجد میں عابد با وضو ہو کر — کیا کرتا ہے گنتوں سبحہ گردانی مشیخت سے
مگر شاعر کا حمد و نعت میں اک نعرہ دلکش — برابر ہے تمامی عمر کی اوسکی عبادت سے

کلام شاعر اک کامل ترین تاریخ ہے جس سے — پتہ ملتا ہے شاعر کے خیالات اور خصایل کا
اک آئینہ نہایت صاف اور شفاف ہے جسمیں — ہمیشہ عکس ہے مرحوم کی شکل و شمایل کا

حقیقی شاعری تصویر ہے اوس شخص کی جس نے — خود اپنے ہاتھ سے اپنے خون سے مرمر کے کھینچی ہے
یہ پھول۔ آہ اوسکی تربت کے ہیں جسنے آخری دم تک — کیاری انکی اپنے اشک سے رو رو کے سینچی ہے

الٰہی جب زباں دی تو اوسے گفتار صادق دے — دیا ہے دل تو جذبات حقیقی سے اوسے بھر دے
پھروں آوارہ میں شور و دا کا رواں ہو کر — مجھے تہوڑا جنوں بھی دے الٰہی تو اگر سر دے

نادر علی خاں نادر کاکوروی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حضور ہز ہائی نس نواب میر محبوب علی خان والی حیدر آباد دکن کی ناگہانی موت تمام ملک کے واسطے ایک صدمہ عظیم ہے شہنشاہ حقیقی مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ امید و یقین ہے کہ حضور ہز ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر خلف اکبر حضور نظام خلد مقام جو ۳۱ اگست کو تخت نشین ہوئے ہیں اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلیں گے

بھاوج کا خط نند کے نام

اچھی بہن! ایسی بھی کیا بے مروتی۔ بھائی کو خط لکھنے بیٹھیں۔ ۴۔ ورق رنگ ڈالے۔ اور نہ لکھے تو دو حرف اپنی دور افتادہ بھاوج کو۔ تم میری نند ہی نہیں ہو بچپن کی سہیلی بھی تو ہو۔ اوس محبت کو تو بنا ہا ہوتا .... جس روز سے تم سسرال سدھاری ہو ہر وقت تمہیں میں دل لگا رہتا ہے۔ ہر گھڑی تمھاری باتیں یاد آتی ہیں۔ اکیلی گھبرایا کرتی ہوں۔ مگر تم نے ایسی آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی کہ طوطے کو بھی مات کر دیا .... میں سمجھتی تھی کہ شادی ہو جانے کے بعد تمھارے خیالات میں ضرور تغیر ہو جائیگا دولہا بھائی کو میں بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ ایک روشن خیال جنٹلمین ہیں اون کا اثر تم پر ضرور پڑے گا۔ مگر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک تمھاری مرغے کی وہی ایک ٹانگ چلی جاتی ہے۔ انگریزی سے جیسی تم جب متنفر تھیں ویسی ہی اب بھی ہو۔ پردہ کے متعلق اگرچہ کبھی تم سے ذکر نہیں آیا۔ لیکن یہ میں ضرور جانتی تھی کہ تم اوسے دل سے پسند کرتی ہو۔ اور کوئی شک نہیں اس زمانہ میں شرافت کی علامت بھی یہی ہے لیکن اتنی دور جا کر تم نے اپنے بھائی سے اس قضیہ کو چھیڑا ہے میرا جی چاہتا تھا کہ یہ بحث میرے سامنے ہوتی۔ یہ دوسرا خط جو تم نے جواباً اپنے بھائی صاحب کو لکھا ہے۔ آج اونہوں نے مجھے بھی سنایا اور باتوں باتوں میں بحث ہو پڑی میرے منہ سے صرف اتنا نکل گیا تھا کہ "دولہا بھائی نے بات تو سچ کہی" اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ اون کی طبیعت کے خلاف ضرور ہے۔ کیونکہ میں اون کا وہ خط دیکھ چکی تھی جس کا جواب تم نے لکھا ہے۔ لیکن یہ خیال ہی نہ تھا کہ وہ بھرے ہی بیٹھے ہیں۔ اور گویا وہ خط تمہیں زیادہ نہ سہی دکھایا تو

لکھا گیا تھا۔ خیر۔ اب جو وعظ شروع ہوا ہے تو دو گھنٹے ہو گئے سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ منطق۔ فلسفہ۔ سائنس۔ تاریخ۔ اغیرہ وغیرہ تمام علوم خرچ کر ڈالے گویا آج ہی کے واسطے علیگڈھ کالج میں تعلیم پائی تھی۔ میں دم بخود بیٹھی منہ دیکھا کی۔ یہ بھی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر کچھ بولتی ہوں تو بات اور بڑھے گی اپنے بھائی کی عادت سے تو تم بھی واقف ہو۔ ذرا میں فرشتہ ذرا میں شیطان۔ اس لئے خاموشی کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ وہ۔ اپنا جو کچھ منہ میں آیا کہتے چلے گئے اور آخر میں کہنے لگے "۔ مجھے پہلے اس کا یقین نہ تھا کہ تمہارے خیالات بھی اس قسم کے ہیں میں تو سمجھتا تھا کہ تم یونہیں میرے چڑانے کو ایسی کوئی بات ہنسی میں کہدیتی ہو۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

اسپر مجھے بھی غصہ آگیا۔ اور میں نے کہا کہ اگرچہ مباحثہ میں تو میں تم سے جیت نہیں سکتی۔ نہ میں نے برسوں تمہاری طرح کتابیں حفظ کر کے یونیورسٹی کا امتحان دیا ہے۔ البتہ سیدھی سی ایک بات جانتی ہوں اگر تم خفا نہ ہو جاؤ تو کہوں۔؟ خدا جانے کیا سبب گھڑی تھی کہ بالکل ہی خلاف معمول مسکرا کے کہنے لگے "۔ ضرور کہیئے! اسپر میں نے ذرا ہمت کر کے کہا "۔ جیسا کہ تم خود ہی کہتے ہو کہ موجودہ قسم کا پردہ نہ مذہب کے احکام میں داخل ہے۔ نہ عربوں کا پرانا رواج نہ اسلامی فاتحین کے زمانہ میں اس کا رواج تھا۔ تو۔ یا تو یہ ایک ایجاد بندہ رسم ہے یا کسی غیر مسلم قوم کی تقلید اب اسپر اسقدر زور دینا کہ واجب ترک ہو۔ فرض چھوٹ جائے۔ مگر اسکی پابندی لازمی تمہیں انصاف سے کہو۔ یہ بدعت ہے یا نہیں۔ اور اگر رواج کو کہو تو آخر دوسرے اسلامی ملک بھی تو ہیں۔ وہاں بھی تو مسلمان رہتے ہیں۔ اون لوگوں میں تو مستورات کو اسطرح چار دیواری میں قید رکھنے کا دستور نہیں۔ اور اگر یہ کہو کہ وہاں قومی سلطنت ہے اوس ملک کی مثال ہندوستان سے

تمیز نہیں کی جاسکتی۔ جہاں نہ قومی سلطنت ہے کوئی ایک خاص قوم مختلف قومیں اور مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ آخر پارسی بھی تو ہیں جن کی اس وقت جہاں تک مجھے علم ہے دنیا بھر میں کسی جگہ سلطنت تو بڑی چیز ہے کوئی ریاست بھی پارسیوں کی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو ایسی ہی دنیا کے کسی کونہ میں ہوگی۔ جسکا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ مگر یہی پارسی ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں جیسی کچھ امتیازی شان رکھتے ہیں۔ وہ سب کو اچھی طرح معلوم ہے اون کی بہن بیٹیاں بھی تو آخر بے پردہ پھرتی ہیں لیکن کوئی خراب اثر اس کا اون کی معاشرت پر نہیں پڑا۔ بلکہ ترقی ہی ہوئی۔

تم کہتے تو ہو کہ "پردہ کے معنے اگر زندہ درگور ہو جانا یا چار دیواری میں مقید رہنا لئے جائیں تو سب سے پہلے میں اس کا مخالف ہوں"، لیکن یہ صرف لفظوں کا اولٹ پھیر اور نمائشی بات ہے۔ آپ ہی حامی بنتے ہو اوس پردہ کے جو ہندوستان میں رائج ہے اور آپ ہی سب سے پہلے چار دیواری کی قید کے مخالف۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس پردہ کی مخالفت کرتے ہو۔ اور کس پردہ کی حمایت۔ یہ کہوں نہیں فرماتے کہ دراصل مقصود تو چار دیواری ہی میں قید رکھنا ہے لیکن روشنخیالی کے اظہار کی غرض سے کھلم کھلا یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی . . . کیونکہ پھر ہمدرد قوم اور حامی نسواں وغیرہ الفاظ کے تمغے چھن جائیں گے۔ اور اگر سچ پوچھتے ہو تو نہ پردہ سے پاکیزگی بڑھتی ہے نہ بے پردگی سے فحش۔ بلکہ اگر خیال کر کے دیکھا جائے تو جس گروہ میں مستورات پردہ کی پابندی شدت سے کرتی ہیں۔ وہی زیادہ تر بدچلنی و آوارگی میں مبتلا ہوتے ہیں جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ پردہ نشین عورتیں بیچاری گلگلی طبیعت والی اور آٹے کی آیا ہو جاتی ہیں۔ اون کے خیالات اپنی چار دیواری کے اندر

چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اور چند گز انگنائی کی زمین کے سوا تمام دنیا سے بیخبر ہوتی ہیں وہ مردوں کے خیالات کا صحیح اندازہ کر سکتی ہیں۔ نہ ان کے موشرات سے واقفیت رکھتی ہیں اسی لیے وہ مردوں کی دلسوزی سے قاصر اور ان کے رنج و راحت سے بیحس رہتی ہیں۔ اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس سے انکار کرنا گویا واقعہ کا انکار کرنا ہے۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنی عورتوں سے مانوس نہیں ہوتے۔ اور روز روز کے تجربہ سے انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے پکانے رینھنے اور سینے پرونے کے دھندوں کے سوا اور کیا جانیں۔ یہ کیا ہماری شیریں زندگی ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال بتدریج ذہن میں جمتا جاتا ہے اور یونہیں رفتہ رفتہ مرد لاپرواہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس فطرتی کشش کو جو مرد و عورت میں فطرتاً رکھی گئی ہے غلط طور پر استعمال کر کے بدچلنی و آوارگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو اسی بات سے اندازہ کر لو کہ بازاری عورتیں مسلمانوں میں زیادہ ہوتی ہیں یا اور کسی قوم میں اتنی نہیں ہوتیں۔

میں اکثر سنتی رہتی ہوں کہ آج فلاں شخص نے فلاں طوائف سے نکاح پڑھا لیا اور کل فلاں نے فلاں سے ایسے لوگوں پر اعتراض تو بہت کیے جاتے ہیں لیکن ان کے اصلی لم کی طرف کوئی خیال نہیں کرتا۔

پرسوں ہی جو گراموفون ریکارڈ کی فہرست تم لائے ہو۔ اسے میں نے شغل کے طور پر یونہیں اوپری نظر سے دیکھا۔ شاید ۲۵ یا ۳۰ تو مسلمان طوائفوں کے نام تھے اور ۵ یا ۶ ہندوؤں کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بہن! میرے اس کہنے پر تو وہ بہت ہی کھل کھلا کر ہنسے اور کہنے لگے لو۔ تم تو اپنی دلیل سے خود ہی قائل ہو گئیں۔ میں نے کہا کیونکر۔ تو جواب دیا کہ

اسی سے قومی بدچلنی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ جن قوموں میں پردہ نہیں اونکی عورتوں (اور مردوں) کو آوارگی و بدچلنی کرنے کے لیے کوئی امر مانع نہیں۔ اور وہ سوسائٹی میں شامل رہکر ہر طرح کے افعال قبیحہ کا ارتکاب کرسکتے ہیں اور اوسوجہہ سے کسی برگزیدہ سے برگزیدہ عورت کی نسبت بھی اوسکی معصومیت کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پردہ دار قوموں میں جو طبائع اس قسم کی ہیں۔ اول تو پردہ سے اون کی روک تھام ہوکر درستی ہوجاتی ہے لیکن اگر کبھی بھی کوئی عورت طبعاً ہی آوارہ مزاج ہو تو اوسکو سوسائٹی سے خارج کردیا جاتا ہے اور وہ زمرہ طوائفان میں شامل ہوجاتی ہے۔ اوس کا زہریلا اثر دوسروں سرایت کرنے نہیں پاتا۔ اسیطرح ایک صید ہوس مرد اوسی طبقہ میں جو عصمت فروشی کے لیے مخصوص ہے اپنی شیطانی اغراض پوری کرلیتا ہے اور کسی نیک نہاد شریف خاتون کی عزت کے درپے نہیں ہوتا۔

مینے کہا۔ خوب! یہ آپنے اچھا نتیجہ نکالا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بے پردہ قوموں کی ہر حالت سوسائٹی کی نظر کے سامنے رہتی ہے اور ذرا سی بے عنوانی بھی ہو تو ہر فرد اوسے بھانپ لیتا ہے۔ اسلئے ہر فرد کو اپنے کیرکٹر کا خاص طور پر ہر وقت خیال رہتا ہے بخلاف اوس کے پردہ داری میں در پردہ بہت سے گل کھل جاتے ہیں۔ اور سوائے معدودے چند اشخاص کے کسیکو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ بے پردہ قوموں میں میاں بی بی دنیا کی تمام دلچسپیوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اونکو سفر و حضر میں یکساں لطف آتا ہے۔ اون کے اتحاد میں کسیوقت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی جس سے ایک دوسرے کا قائم مقام تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ مثلاً ایک زندہ دل نوجوان

جو نیچر پرست ہے چاہتا ہے کہ اپنی بی بی کے ساتھ فطرت کی نزاکت آفرینیوں سے لطف اُٹھائے۔ جو اک سچی خواہش ہے لیکن مروجہ اسم پردہ کی شدت سے وہ اس قصد سے باز رہتا ہے۔ اور اپنے جوش کو دبا لیتا ہے۔ اور جب طبیعت بار بار تقاضا کرتی ہے تو وہ اوس کا قائم مقام تلاش کر کے اوس بے لوث اور پاکیزہ محبت کو جو اوس کی منکوحہ بی بی کا حق تھا ایک غیر مستحق شاہد بازاری کیطرف منتقل کر دیتا ہے۔ اور یہیں سے بدچلنی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تو پردہ ہی آوارگی و عصمت فروشی کا باعث قرار پاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اسیطرح اور بہت سی صورتیں ہیں جنکی قدرتی دلفریبیاں انسان کو اپنی طرف بلاتی ہیں۔ اور وہ اپنے (خلاف فطرت) قایم کردہ قیود کی پابندیوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا۔ وہانتک اسطرح پہونچتا ہے کہ اوس کی بدمستی سے یہ پُر لطف سینری بھی ہیبتناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہاں۔ یہ اور بات ہے، کہ مرد اپنے لیے بدچلنی کو جائز و مستحسن قرار دیکر یہ سمجھ لیں کہ اس سے قومی کبیر کثیر میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا۔ درآنحالیکہ اسی اخلاقی کا نتیجہ بڑھتے بڑھتے اوس حد تک جا پہونچتا ہے۔ اور اس سے کئی ہزار گنا زیادہ نقصان کا موجب ہے جس کا احتمال پردہ اوٹھہ جانے کی صورت میں کیا جاتا ہے

رہی یہ بات کہ صید ہوس مرد عصمت فروش عورتوں کی موجودگی میں شریف زادیوں کی آبرو کے خواہاں نہوں گے۔ عجب منطق ہے۔ اور یہاں وہی اعتراض اُلٹ جاتا ہے جو آپ بے پردگی پر کرتے ہیں۔ باوجودیکہ اس کی شان میں اور اوس حالت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ لیکن اگر صنعت لوشی کا اقتضا یہی ہے تو یہ انتظام بھی کیوں نہو کہ آوارہ عورتوں کے لیے بعض مرد بدکرداری و بدافعالی کا پیشہ اختیار کر لیں۔

میری اون کی یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں لڑکا باہر سے ایک وی۔ پی پیکٹ لیئے ہوئے آیا۔ یہ ترجمہ کا کلام مجید ہے۔ جو دہلی کے ایک مطبع میں نہایت خوشخط اور بہت اعلیٰ کاغذ پر چھپا ہے۔ تمھارے بھائی نے میری فرمائش پر منگا دیا ہے میں اوس کے شوق میں تقریر و تحریر سب بھول گئی۔ سامنے صندوقچی رکھی تھی روپیہ نکالکر چٹھی رسال کو بھیجے۔ اور قرآن شریف کھولکر دیکھنے لگی۔ واقعی جیسا میں چاہتی تھی ویسا ہی ہے جلد بھی نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے جن اتفاق۔ اسیوقت ایک جگہ سے ورق جو اولٹا تو سورۂ نسار کا دوسرا رکوع نکلا۔ مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے اوسے جو پڑھتی ہوں تو لکھا ہوا تھا "اور جو کوئی بدکاری کرے۔ تمہاری عورتوں میں تو شاہد لاؤ اوسپر چار مرد اپنے"۔ پھر اگر وہ گواہی دیویں۔ تو اونکو بند رکھو۔ گھروں میں جب تک بھر لیوے اون کو موت"۔ یا کرے اللہ اونکی کچھ راہ" مینے کہا دیکھئے اللہ میاں نے اون عورتوں کے لیئے جن کی بدکاری کی چار گواہ شہادت ادا کریں چار دیواری میں بند رکھنا سزا فرمائی ہے۔ اسبات کو جانتے ہوئے تو موجودہ پردہ سسٹم کے یہ معنی ہیں کہ "آج کل جسقدر . . . . عورتیں ہیں اونمیں (خدانخواستہ) . . . کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔ یہ کیسی شرم کی بات ہے۔ اور کس منہ سے مسلمان اس پردہ کی تائید کرتے ہیں۔ دوسری قوموں کے لوگ اپنے دلمیں کیا کہتے ہوں گے کہ یہ قوم اپنے ہی قانون کے مطابق اپنے آپ کو بالعموم بے عصمت ثابت کر رہی ہے۔ توبہ۔ توبہ۔

اے بہن! میرے اس کہنے پر تو وہ جھلا اوٹھے۔ اور سچ بھی ہے آخر کبتک ضبط کرتے کبھی ایسا موقع کا ہے کو پیش آیا ہوگا۔ جو یوں اون کی ہر بات برابر کاٹی جائے نہایت ہی کڑے تیوروں سے مجھے گھور کر ایک خشمگیں آواز میں کہا بس چپ رہو۔ آئیں بڑی مولوی بن کے۔ تم قرآن و حدیث کے مسئلے کیا جانو

اُردو کی دو چار سطریں پڑھ کے عالم ہی بن بیٹھیں عربی تم نہیں جانتیں۔ فارسی تم نے نہیں پڑھی۔ حدیث سے تم نا واقف۔ تفسیر سے تم بے خبر۔ موقع سمجھو نہ محل اور کلام پاک سے استدلال۔ ناسخ و منسوخ کو تو تم سمجھتی ہی نہ ہوگی۔ کیا ان ہی کج بحثیوں کے لیے ترجمہ منگایا جا رہا تھا؟

میں نے جواب دیا تو اسمیں بگڑنے کی کون سی بات ہے۔ اگر ناسخ منسوخ کا سلسلہ اسمیں ہے تو میں کب کہتی ہوں کہ اس آیت پر عملدرآمد کیا جائے۔ میں تو اس سے پردہ کو اک صورتِ تعزیر بتلا رہی ہوں جو اللہ پاک نے .... عورتوں کے لیے تجویز فرمائی۔ موجودہ بحث پردہ پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے ....

لیکن اون کو غصہ آچکا تھا۔ وہ روکے رکنے والی چیز تھوڑی تھا۔ بس بگڑ پڑے میں ایسی آزاد خیالی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خبردار اگر آیندہ تم نے میرے سامنے اس قسم کی جرأت کی۔ اور یوں بیباکانہ زبان چلائی ..... چلی جاؤ میرے سامنے سے۔ مجھے دیکھ دیکھ کر غصہ آرہا ہے .....

یہ کہکر وہ تو غصہ میں ادھر اودھر ٹہلنے لگے۔ اور میں سہمی ہوئی اوٹھکر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ راستگوئی اور صاف بیانی کے اس تلخ تجربہ کے بعد تمہارے اون مصلحت آمیز فقروں کا مطلب سمجھ میں آیا کہ "بھائی صاحب! آپ ہراساں نہوں ہمارے جیتے جی تو پردہ اُٹھتا نہیں" اور آیندہ کے لیے بھی یہ نصیحت پلّے پڑی کہ جب اس قسم کی گفتگو ہوا کرے گی تو میری زبان پر بھی یہی الفاظ آیا کرینگے

"جب دنیا بے پردہ ہو جائے گی۔ اور دوسروں کی عورتیں مردنما ہو جائیں گی۔ تب دیکھا جائے گا اسوقت تک کون جیتا ہے"۔

زیادہ شوق۔ راقم تمھاری جاں نثار

بھاوج

براکین یعنی کوہ آتش فشاں

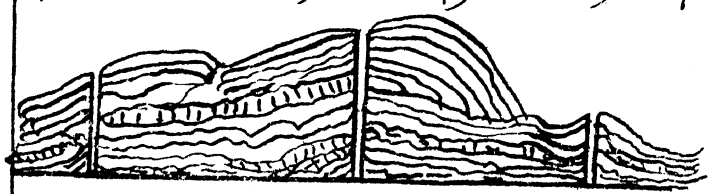
علمائے علم ارض (جیالوجی) کے پاس یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ کرۂ ارض شدید گرم اور پگھلے ہوئے مادہ سے بنا ہے جس کے اوپر کا قشر یعنی پپڑی سرد ہو گئی ہے جس پر ہم ساکن ہیں اور جسکا دل بمقابلہ اس کے نصف قطر کے کچھ ایسا زیادہ نہیں ہے ایسی صورت میں کچھ بعید نہیں کہ اوس کی اندرونی حرارت اور حالات کے علامات ظاہر اور نمودار ہوتے رہیں۔ جہاں کہیں براکین (برکان کی جمع) یعنی کرہ آتش فشاں ہیں وہاں پگھلا ہوا ارض مادہ اور بخار اکثر ان پہاڑوں میں سے بذریعہ قمر یعنے سوراخوں کے اُبلکر باہر نکلتا ہے۔ اور ایسے قمر قشر ارض میں جابجا ہیں۔ انہی کو براکین یا جوالامکھی کہتے ہیں۔ اور اس قشر یا پپڑی کے ایک وسیع حصہ میں شدید و خفیف حرکات اکثر محسوس ہوتے رہتے ہیں جنکا ماخذ و منشار کوئی اضطرابی طاقت ہے جو زمین کے اندر واقع ہے براکین کو انگریزی میں ولکینو کہتے ہیں۔

براکین کی شکل اور ساخت برکانی پہاڑ جلے ہوئے لوا اور راکھ کے ایک مخروطی ڈھیر پر مشتمل ہے جو کسی مرکزی دہانہ کے گرد جمع ہوا ہے یہ مواد اور راکھ اس دہانہ سے بڑے زور سے ہوا میں پھینکے جاتے ہیں اور اس دہانہ کے اطراف میں جمع ہوتے ہیں۔ اگر ہوا تیز چلتی ہو تو یہ مواد پہاڑ کی دوسری جانب بھی زیادہ جمع ہو گا۔ ہیبن اور ہبائی اجزا بعض اوقات ہوا میں بہت بلند ہو کر چلتی ہوا کے ساتھ میلوں دور جا کر صفحۂ زمین پر پھیلا دیے جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں اس مواد اور راکھ کو ہوا دہانہ سے صدہا میل کے فاصلہ پر لیجاتی ہے اور

زمین اور سمندروں کے وسیع سطحوں پر اسکو پھیلا دیتی ہے۔ لاوا یعنی مہل مذاب کے بڑے ٹکڑے جنکو اصطلاح علم ارض میں پرکانی بمب کہتے ہیں اکثر ہوا میں بہت بلند ہو کر اسی پہاڑ کے قرب و نواح میں اُتر آتے ہیں اور لاوا کے سیلاب کبھی جوش زدہ ہو کر یا تو اوس راکھہ اور لوحتہ پتھر کے ڈھیر کو چیر کر اوس میں دھنس جاتے ہیں یا کاسہ یعنے قم برکان کے کنارہ سے اُبلکر بہ نکلتے ہیں اور آس پاس کے ملک کو پاٹ دیتے ہیں۔

کبھی تو ایک ہی دہانے سے پے در پے التہابات ظہور میں آتے ہیں لیکن بعض اوقات اس پہاڑ کے پہلو میں دوسرے چھوٹے دہانے کھلتے ہیں اور اور بھی التہاب پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ چھوٹے مخروط اور دہانہ اکثر بڑے پہاڑ کے شدید التہاب اور کثیر مواد کے اخراج کی وجہ سے ڈھپ جا کر مدفون ہو جاتے ہیں۔ اسطرح پر ایک سلسلہ مخروطوں کا اکثر ایک خط مستقیم میں نظر آتا ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قشر زمین میں کوئی درز یا شگاف پیدا ہو گئی ہے جسپر یہ سب واقع ہیں +

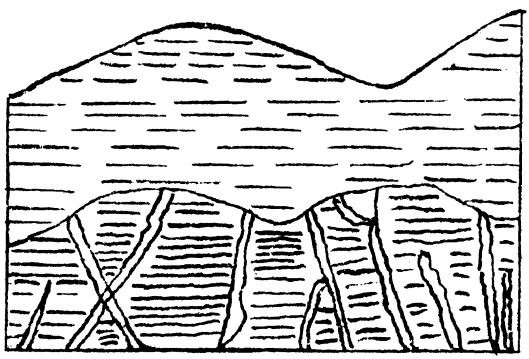
اگر ہم ایسے براکین کے مخروطوں کے کسی ایک سلسلہ کو چیر دیں یعنے کہود کر ایک طرف سے گرا دیں تو اون کی اندرونی حالت ایسی نظر آئے گی جیسی کہ نقشہ نمبر (۱) میں دکھلائی گئی ہے۔ اسمیں وہ حصص جو عمودی خطوط کے سایہ سے دکھلائے گئے ہیں لاوا کے سیلاب کو ظاہر کرتے ہیں اور باقی حصوں سے راکھہ اور محترقہ مواد کے غیر تنظیم طبقات ظاہر ہوتے ہیں جنسے یہ مخروط مشتمل ہے۔



علاوہ بریں ان براکیں کے اندرونی حصہ میں لاوا کی چھوٹی بڑی رگیں نظر آتی ہیں جو اس پہاڑ کے جسم میں ہر طرف دوڑی ہوئی ہیں اور جو بعض اوقات دوسرے قسم کے مواد کی تہوں میں دھنسی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور بعض اوقات دوسری رگوں کو کاٹ کر آگے بڑھی ہیں جو ان سے قبل بنی تھیں نقشہ نمبر (۲) میں لاوا کی بعض رگیں دکھلائی گئی ہیں جن سے انکے نفوذ کی حقیقت معلوم ہوگی

نقشہ نمبر (۲)

لاوا کی ڈیک یعنی رگیں پہاڑ کے جسم میں



جب پگھلا ہوا لاوا کسی پہاڑ کے جسم میں زور سے داخل ہوتا ہے تو کچھ حصہ اوسکا ممکن ہے کہ حالتِ سیالی میں ایسی درزوں اور شگافوں میں دھنس جائے جو آگے سے موجود تھیں۔ یا یہ کہ یہ کسی اندر سے دھکیلنے والی قوت کا نتیجہ ہو ایسی رگوں کو اصطلاح علم ارض میں ڈیک یعنے دیوار کہتے ہیں۔ جب ان رگوں کا مادہ سرد ہو جاتا ہے تو یہ سیلین مجسم اور منجمد پتھر بنجاتے ہیں۔ اور فی الحقیقت دیوار پاشتہ کا کام دیتی ہیں۔ یعنی پہاڑ کے مختلف حصوں کو باہم جکڑ دیتی ہیں اور ریچ کے پھیلے اور پولے اجزا کو باہم وصل کر دیتی ہیں

براکین کی مثالیں | زمین کے اندر سے جو مادہ بذریعہ ان آتش فشاں پہاڑوں کے

باہر نکلکر زمین کی سطح پر پھیلتا ہے اوسکی مقدار بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ براکین مشہورہ کے حالات سے اسکی حقیقت ظاہر ہوگی

ویسیو ویس۔ یہ پہاڑ ۷۹ء سے جو اس کے پہلے تاریخی التہاب کا سال ہے سال بسال بڑھتا گیا ہے اس پہاڑ کا اصلی حصہ آگے سے موجود تھا۔ اور اُس کے مقدس کنارہ کی قدیم چوٹی جو فی الحال مونٹے سوما کہلاتی ہے اوس کے پہلے مخروجہ اور کاسہ کے اندر واقع ہے جو جزاً اس کنارے سے گہری ہوئی ہے اور یہ موجودہ مخروط ۱۸۷۹ء میں بنا ہے (لیٹینی۔ بلینیاس) کے قبل کسی قدیم رومی مورخ نے اس پہاڑ کے التہاب کے متعلق ذکر نہیں کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرکز برکانی آٹھ سو برس تک کم سے کم سوتا رہا ہوگا اور بعد اوس کے دفعتہً پھوٹ پڑکر اب تک اپنی قوت دکھلا رہا ہے جسمیں البتہ دو ایک دفعہ ایک یا دو صدیوں کے بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس کے ہمسایہ کے برکانی جزیرہ اسلیا میں بھی ایکبار ایسے وقفوں کے درمیان ۱۳۰۲ء میں ایک التہاب واقع ہوا تھا۔ حالانکہ وہ چودہ سو برس سے بالکل نائم تھا۔ تمام براکین کی تاریخی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے التہابات کے درمیان بہت طولانی سکون کی مدتیں واقع ہوتی ہیں۔ یعنے ایسے التہابات کے درمیان جنسے پہاڑ کی جسامت پر معقول اضافہ ہوتا ہے۔

اٹنا۔ اس مشہور برکان کا مخروط ایسے وسیع قطعہ زمین پر واقع ہے جسکا قطر تیس میل ہے۔ اور اسکا ارتفاع بہت ہی تدریجی ڈھال کے ساتھ سمندر کی سطح سے گیارہ ہزار فٹ بلند ہے بعض لاوا کی سلیں جو اس پہاڑ کی موجودہ سطح پر بھی ہیں طول میں بیس سے تیس میل تک ہیں اور عرض میں ایک سے دو میل تک اور جنکا دل ڈیڑھ دو سو فٹ ہے۔ نزدیک کے دریل اور ولوینیں

ایسی دوسری سلین اسکی سطح کے نیچے واقع ہیں جنکو راکہہ کے طبقات اور تہین ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ اس راکہہ اور برکانی مواد کے ٹکڑوں کو نوف کہتے ہیں۔ اس پہاڑ کے مشرقی جانب ایک وادی مشہور بہ وال دل تو ہے جسکا عرض چار پانچ میل سے کم نہیں اور جس کے اطراف اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں جنمیں سے بعض کا ارتفاع تین ہزار فٹ ہے۔ اور جو پہاڑ کے اوس جانب کی ساخت کو عجیب طرح سے ظاہر کرتی ہیں۔ ویسیو ویس پہاڑ اپنی (۳۹۲۲) فٹ بلندی کے ساتھ اس وادی میں جو اٹنا کے پہلو میں ہے بالکل چھپ جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اٹنا اپنی موجودہ بلندی کو پچیس سو برس آگے پہونچ چکا تہا۔ جسکا ذکر قدیم شعرائے یونان نے بھی کیا ہے۔ وہ لاوا کی سیل۔ جسنے کارتھیج کی فوجکو جو سیراکیوس پر تین سو چیانوے سال قبل میلاد مسیح چڑہی چلی جارہی تہی۔ روکا تہا اب بھی سطح پر نظر آتی ہے جو دوسری قدیمتر سیلونکو ڈہانکے ہوئے ہے۔ اٹنا کے اطراف میں کم سے کم چھ سو چھوٹے مخروط سر اوٹھائے ہوئے ہیں جنمیں سے بعض کا ارتفاع سات سو فٹ اور محیط دو میل ہے۔ بعض دوسرے ایسے ہیں جو مابعد کے مخرجہ مواد کے نیچے دبے ہوئے ہیں

آئسلینڈ | جزیرہ آئیسلینڈ تماماً برکانی مواد سے مرکب ہے۔ یہ جزیرہ آئرلینڈ سے بہت بڑا ہے اور اسمیں بیس سے زیادہ ولکینو یعنے برا کین موجود ہیں جن کے التہاب کی خبریں ہمیشہ آتی رہتی ہیں۔ اسکی بلند ترین چوٹی اسنیفل ہے (یعنی کوہ برف) جسکا ارتفاع سمندر کی سطح سے (۶۸۷۰) فٹ ہے۔ لیکن ہکلا جو (۵۹۰۰) فٹ بلند ہے یہ سب سے زیادہ مشہور ہے کیونکہ اوس میں کثرت سے التہاب واقع ہوئے ہیں۔ آئیسلینڈ کے بعض التہابوں سے پانی کے بہت بڑے سیلاب وقوع میں آئے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی برف دائمی اور

سیلہائے یخ جنسے ۰ جزیرہ ہمیشہ ڈھکا ہوا ہے سب بہکر سیلاب کا باعث ہوئے اور جنسے پہاڑوں کے اطراف میں بڑے بڑے غار اور کہو پیدا ہو گئے اور تھپر کے بڑے بڑے ڈھیمے اور چٹانیں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کثرت سے بہتے ہوئے پست زمینوں پر اتر آئے جس کی وجہ سے جزیرہ کے کنارہ کی خشکی پر بہت کچھ اضافہ ہوا۔ آئسلینڈ میں سب سے بڑا اور مشہور التہاب اسکپٹر یوکل کا تھا جو ۱۷۸۳ء میں واقع ہوا جسکی شہرت خاص اسوجہ سے ہے کہ لاوا کے بہت بڑے سیلاب اس پہاڑ سے جاری ہوئے۔ انہیں میں سے ایک سیلاب ہلی کا طول پچاس میل اور بعض مقامات میں عرض پندرہ میل تھا۔ ایک دوسرے کا طول چالیس میل اور عرض سات میل تھا۔ اور ان سیلوں کا دل یعنے عمق سو فٹ تھا۔ مگر بعض گہری وادیوں میں پانچسو سے چھ فٹ تک اس لاوا کی سیل کا دل تھا

ٹومبورو۔ جزیرہ سومباوا کے ٹومبورو پہاڑ میں جو التہاب ۱۸۱۳ء میں واقع ہوا شاید دنیا کا سب سے بڑا التہاب ہے جسکا حال قلمبند ہوا ہے۔ اور یہ جزیرہ منجملہ اس سلسلۂ جزائر کے ہے جو جاوا سے بنوگنی تک پھیلا ہے۔ یہ پہاڑ پانچویں اپریل کو پھوٹ پڑا اور ۱۱۔ و ۱۲۔ اپریل کو اسکا بڑا زور رہا۔ اور جولائی تک اس کی شدت میں کمی نہیں ہوئی۔ اس کے پھوٹ پڑنے کی آواز سومارا اور ٹرناٹے تک سنائی دی گئی جنمیں سے پہلا اس کے (۹۷۰) میل جانب مغرب اور ثانی (۷۲۰) میل اس کے مشرق ہے زمین کے بڑے وسیع قطعات لاوا کی سیل سے پٹ گئے ہیں جسکی متعدد سیلیں بہتی ہوئی سمندر تک جا پہنچیں۔ جلا ہوا مواد سمباوا کے مغرب کیطرف سمندر پر تیرتا ہوا نظر آتا تھا جسکا دل پانی پر ۲ فٹ تھا۔ اور میلہا میل سمندر کی سطح کو پاٹے ہوئے تھا جسمیں سے جہاز کا گذرنا مشکل تھا۔ اس برکان کے حوالی و اطراف کے ملک میں ۱۲ فٹ سے آدمی کے سر کے برابر تک کے پتھر بارش کیطرح برستے تھے۔ اور راکھ اور برکانی غبار اس کثرت سے

اس پہاڑ میں سے باہر پھینکا گیا تھا کہ اون کی روشنی تو کہاں جاڑوں کی راتوں سے بھی تاریکی زیادہ تھی۔ حتی جاوا میں جو اس پہاڑ سے تین سو میل جانب مغرب واقع ہے تین روز تک متواتر تاریکی چھائی رہی۔ کچھ خاکستر برکانی اور غباری مواد امبوینا اور باندہ میں بھی برسا جو دونوں تقریباً آٹھ سو میل اس پہاڑ کے مشرق کی جانب واقع ہیں اس التہاب کی بعض شہادتیں بہت بڑے اور وسیع رقبہ میں نظر آتی رہیں جسکا محیط اس پہاڑ سے ایک ہزار میل دور تھا فرض کرو کہ ایسا پہاڑ جنوب ملک برار میں پھوٹتا تو اس کا اثر شمال میں کانپور تک اور جنوب میں میسور تک یا مغرب میں ساحل گجرات تک محسوس ہوتا اور اس تمام حصہ ملک کو تین روز تک تاریکی میں گھیرے رکھتا۔

برکانی عمل کی یہ چند مثالیں ہیں جو منجملہ بہت ساری مثالوں کے ہم نے منتخب کی ہیں تاکہ براکین کی قوت اور اون کے نتائج کا اندازہ ہو سکے۔ ناظر کو اگر اس سے زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو ڈاکٹر ڈائسن کی کتاب ولکینو اور سر چارلس لائل کی اصول جیالوجی کے طرف رجوع کر سکتا ہے۔

نائم و منطفی براکین ویسوویس کے تاریخی حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ براکین کئی صدیوں تک نایم یعنے سوتے رہتے ہیں اور بعد دفعۃً پھوٹ پڑتے ہیں۔ بعض براکین کی آکہہ اور لاوا کی سیلیں منجمد نظر آتی ہیں۔ لیکن مثل جزیرہ اسنیش کے کسی میں کوئی التہاب اسوقت سے دیکھا نہیں گیا ہے جبسے کہ متمدن انسان کا وہاں گذر ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہہ پہاڑ صدیوں سوتے رہیں۔ یا مثل وسط فرانس کے پی دو ڈوم کے براکین جن کے محروط اور کاسہ اب تک موجود ہیں۔ اور جن کی لاوا کی سیلیں اسوقت تک گہردری اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نہ صرف تاریخی زمانہ میں یہ خاموش رہے ہیں یعنے تقریباً دو ہزار سال سے بلکہ اوس سے آگے بھی

نامعلوم صدیوں سے خاموش پڑے ہوئے ہیں ایسے براکین کو منطفی کہتے ہیں یعنے بجھے ہوئے۔ وسطی فرانس کے مونٹ زور اور کنتال کو بھی اسی قسم کے براکین منطفیہ میں شمار کرنا چاہیئے جن کے مخروط اور کاسہ بارش اور ہوا کے اثرات نعریہ سے بالکل مٹ گئے ہیں۔ اور جن کی لاوا کی سیلوں میں پانی کے بہاؤ سے بڑے گہرے درے اور غار پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ جو لاوا کی سیلیں اصلاً نیچے کی زمین پر بھی تھیں اب صرف ٹیلوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اون کا کچھ حصہ نظر آتا ہے اسیطرح سے بعض ملک ایسے ہیں جہاں پرانے مخروط اور براکین کی ساری نشانیاں مٹ گئیں ہیں اور صرف راکھ اور لاوا کے میدان باقی رہ گئے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے وسط میں اور دوسرے مقامات میں دیکھا جاتا ہے۔

براکین کی تقسیم روئے زمین پر | اگر ہم بسالٹ کے صحنوں کے میدانوں سے صرف نظر کریں اور صرف ملتہب و نایم و منطفیہ براکین کو دیکھیں اور زمین کے نقشے پر اون کے مواقع کو نشان کر دیں تو ہم انکو ہر جائے پھیلے ہوئے پائیں گے گو غیر منظم طور پر کیوں نہوں۔ براکین جزایر تمام سمندروں میں موجود ہیں اور ان کے مجموعے اور سلسلے تمام ایشیائی جزائر اور امریکا جنوبی و شمالی کے غربی سواحل اور جنوبی یورپ۔ اور ایشیائے صغیر سے وسطی ایشیا میں سے ہوتے ہوئے ساحل چین تک نظر آئیں گے۔ اور ہر خط عرض بلد میں ۷۲ ڈگری شمال سے یعنی گرین لینڈ اور کیپ نارتھ کے درمیان سے ۴۰ جنوب تک یعنی مونٹ ایریس تک ان کا سلسلہ موجود ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سوائے وسطی ایشیا کے باقی اکثر زندہ براکین یا تو جزایر میں واقع ہیں یا سمندروں کے کنارہ پر موجود ہیں۔ ایک قطعہ وہ فریقہ ہے جہاں کسی قسم کے براکین نظر نہیں آتے ہیں۔ امریکا

شمالی وجنوبی کے وسطی اور مشرقی حصہ میں۔ اور ایشیا و یورپ کے شمال میں اور آسٹریلیا کے شمالی و وسطی حصوں میں براکین کا وجود نہیں۔

صفحۂ ارض پر ان کی تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو یہ ظاہری علامات کسی اندرونی حالت کی ہیں جو تمام کرۂ ارض کے شامل ہیں لیکن انکا وجود پانی کے بڑے قطعات اور سمندروں کے قریب میں ایک گمان پیدا کرتا ہے کہ شاید پانی وہ عامل ہو جو ان کے ہیجان کا باعث ہوتا ہے۔ بہت گرم پانی کا بخار اور اوسکا شدید دباؤ ممکن ہے کہ وہ طاقت ہو جس کے مدد سے یہ آتشین سیلیں زمین کے اندر سے نکلتی ہیں اور یہی طاقت راکھ کے گہنے ابروں اور براکینی اجزا کے غبار اور ٹکڑوں کو ہوا میں اڑاتی ہے چونکہ اکثر احجار و صخور میں پانی نفوذ کرتا ہے اور انمیں شگاف اور درزیں بھی اکثر ہوا کرتی ہیں تو احتمال قوی ہے کہ پانی ان راستوں سے زمین کے اندر اترتا ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہے کہ پانی کتنے عمق تک زمین میں اترتا ہے۔ اور یہ بخار کے منبع وہاں کسطح پر واقع ہیں جو بعد کو زمین کے قشر کی مدافعت پر غالب آکر اوسکو اچھال دیتے ہیں بالا میں درزیں پیدا کر دیتے ہیں جنمیں سے وہ محصورہ اور مجتمع بخار باہر نکل پڑتا ہے بہرحال یہ ایسی باتیں ہیں کہ سوائے قیاس کے ہم کوئی یقینی امر نہیں بتلا سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی نسبت سکوت ہی مناسب ہے۔

موجودہ براکین کے بننے کے لیے کتنی مدت لازم ہے۔ اٹنا کی بہت قدیم روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پچھلے ڈھائی ہزار سال میں جو اضافہ اس کے جسم پر مواد مخروجہ سے ہوا ہے بہت ہی قلیل ہے۔ ویسیوویس اور دوسرے ایٹالیائی اور یونانی براکین کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دو بڑے انتہابوں کے درمیان ایک مدید زمانہ سکون کا گذرتا ہے جب کہیں جاکر کوئی ایسا انتہاب ہوتا ہے جس سے اون پہاڑ بنے

جسم پر کچھ اضافہ ہوتا ہو۔ تمام عالم کے برکین کے حالات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اوس سے ظاہر ہے کہ بلحاظ اون حالات کے ویسوویس اور اٹنا اون قوانین کی عمدہ مثالیں ہیں جن سے برکین پہاڑوں کا بنا ظاہر ہوتا ہے۔ تمام برکین بظاہر مواد کی چھوٹی مقداروں سے وجود میں آئے ہیں جو زمین کے اندر سے وقتاً فوقتاً نکلکر اوپر جمتا گیا ہے اور اونکی جسامت اور بلندی میں اضافہ ہوتا رہا ہی۔ فاصلہ ان زمانوں کا بعض وقت بیسیوں سال اور بعض اوقات صدیاں ہے اور یہ بھی ظاہر ہی کہ جسقدر بیچ زمانہ دو التہابوں کا زیادہ ہو تو مواد کی مقدار بھی زیادہ ہوتی ہی جس سے پہاڑ کا جسم بڑھتا ہی۔ بڑے بڑے التہاب جنسے کثیر مواد نداب بہ کر نکلتا ہی شاذ و نادر واقع ہوتے ہیں اور جن پہاڑوں میں اکثر التہاب ہوا کرتا ہی اونمیں سی مواد بھی کمتر خارج ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اٹنا جیسے پہاڑوں کے بننے کیلئے لاکھوں برس چاہیں تعجب تو یہ ہی کہ زمین کے جن طبقات پر اٹنا کا ایک حصہ قایم ہے اونمیں اوسی صنف کی سیپیاں برآمد ہوئی ہیں جو اس زمانہ میں بحر روم کے سمندر میں پائی جاتی ہیں۔ اور اوس برکانی مخروط کے بننے کے طرز نے جو ان باقیات پر قایم ہے ان موجودہ سیپیوں کے اصناف کی عمر کو بڑی قدامت کا جامہ پہناتا ہی

قدیم برکانی عمل | اگر ہم اون منطقیہ برکین کا خیال کریں اور نیز اون سے قدیمتر لاوا کا جنکا بیان یہاں نہیں کیا جا سکتا ہے یہ ظاہر ہوگا کہ صفحہ زمین پر ایسا کوئی نقطہ نہوگا جہاں کسی نہ کسی وقت برکانی عمل کارفرما نہ رہا ہو۔ جہانتک جیالوجی کی شہادت اسپر دلالت کرتی ہے کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی ہے کہ ہم تاریخ ارض میں کوئی ایسا زمانہ فرض کریں جسمیں برکانی عمل مفقود رہا ہو۔ اگرچہ اس کے مواقع بدلتے رہے ہیں مگر مفقود تو ہرگز نہیں رہا ہے۔ اور نہ اسکی کوئی شہادت ہے کہ اس زمانہ میں اسکا عمل بہ نسبت سابق کے دھیما ہوا ہو۔ آیسلنڈ کا مشہور التہاب جو اسکاٹرایکل میں ۱۷۶۳ء میں واقع ہوا تھا شاید اوتنا ہی وسیع اور

اور عظیم تھا جیسا کسی اور وقت عمل التہاب کی شہادت ملتی ہے۔ میرا مہدی خاں کو لکھ

عورتوں کی اپیل

مردوں کی خدمت میں

جنس اعلیٰ کے محترم افراد — کبھی سن لو ہماری بھی فریاد
بے کسوں پر بھی ہو نگاہ کرم — سن لو افسانۂ دلِ ناشاد
اوس کے بندی ہیں ہم بھی جسنے کیا — ہمکو مجبور اور تمہیں آزاد
جیسا ڈرتے ہیں تم سے ہم ویسی — نہیں طائر کو وحشتِ صیاد
کیوں ہمارے گروہ سے ہو نفور — جنس سے کیوں ہمارے بغض و عناد
ہمنے مانا کہ آپ ہیں ابدال — ہے یہی کیا طریقۂ اوتاد
جاں نثاروں پہ اپنے ظلم کرو — چاہنے والوں کو کرو برباد
یہی تہذیب ہے بھلا دو انہیں — راتدن جو کریں تمہاری یاد
کیا یہی شیوۂ مروت ہے — مبتلائے الم ہوں ہم، تم شاد
اک تمہاری ادائے غفلت سے — حسرتیں ساری ہوگئیں برباد

یہ تغافل شعاریاں چھوڑو۔
منہ ہماری طرف ذرا موڑو

ہم نے مانا کہ ہیں ذلیل و خوار — نہیں دنیا میں ہم مگر بے کار
نرم و نازک ہے گو ہمارا جسم — فرض اپنا نہیں مگر پیکار
نہیں قوت و توانائی — ہم بھی کہلاتے ہیں مگر جاندار
تم کرو سعی و جہد و جہد تمام — ہمکو خدمت سے کچھ نہیں انکار

شبِ غم کی تمھاری ہوں مونس ہوں تمھاری خوشی میں حصہ دار
تمکو گر زخمِ چشم بھی ہو ذرا ہمکو ہو جائے زندگی دشوار
خواب و آرام ہو حرام ہمیں بخت اعدا اگر پڑے بیمار
کبھی دیکھیں جو تمکو آزردہ تیرِ غم کا یہاں ہو قلب شکار
ظلم کرتے ہو اتنے اور اسپر جو کہ سو جان و دل سے ہے تم پر نثار
اس محبت پہ یہ تغافل ہے قوم مردوں کی ہے بڑی خونخوار
دم یہاں دیں وہاں وہ تیغ بکف خدمتیں اتنی اور پھر بیزار

اب بھی اچھا ہے جور سے باز آؤ اب بھی سن لو ذرا دکھی کی پکار
آدمی ہم بھی ہیں تمھاری طرح رکھو قائم ہمارا عز و وقار
نہ سلف کو کرو ذرا بدنام
نہ مٹاؤ تمدنِ اسلام

آخگر۔ از ریاست اجے گڑھ

مسٹر۔ ایم۔ ایس۔ محی الدین صاحب ایک مدراسی ڈپٹی کلکٹر نے لندن کی یونیورسل ریسیز کانفرنس (کانفرنس اقوام عالم) میں ایک مضمون ہندوستانی مسلمان عورتوں کے پردہ کی رسم پر پڑھا ہے جسمیں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان عورتیں جس طریقہ سے پردہ کی سخت پابندی کرتی ہیں۔ یہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے اور اگر کوئی شخص قرآن و حدیث سے ایسا ثابت کرے تو اسے ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔
مسٹر محی الدین کا پتہ۔ ۲۔ وی۔ پیریڈ گولڈرس گرین۔ لندن۔ این ڈبلیو ہے۔

کلامِ عزیز

وہ دل اپنا جسے ہم اوس کا پروانہ بناتے ہیں
خدا کی شان ہے سب اوسکو دیوانہ بناتے ہیں

جوانوالی نسلوں کو سبق شائستگی کا دے
عزیز اب ہم وہ عبرت خیز افسانہ سناتے ہیں

ستارے آسماں کے توڑ کر ہم آج لائے ہیں
تمہارے واسطے تاج ملوکانہ بناتے ہیں

جبیں کسکے بہروسہ کس سے دعوائے محبت ہو
قیامت تو یہی ہے آپ بیگانہ بناتے ہیں

جگہ دے دیکے پہلو میں ان اصنام خیالی کو
قریب کعبۃ اللہ آپ بتخانہ بناتے ہیں

ذرا گلکاریاں دکھلاؤ فکر عرش پیما کی
کہ ہم اک صنعت و حرفت کا کاشانہ بناتے ہیں

جہاں ہے فکر تعمیر جواب آسماں ہمکو
ارے اوس سرزمیں کو آپ ویرانہ بناتے ہیں

شبستان محبت میں نثار اون باوفاؤں کے
جو ہر ذرہ کو خاکِ دلکی پروانہ بناتے ہیں

ابھی جو بادہ آشامونکی بدمستی سے ٹوٹا تھا
مبارک ہو کہ پھر سے ہم وہ پیمانہ بناتے ہیں

بڑے تڑکے سے ساقی در پہ ہم مخمور بیٹھے ہیں
خم و مینا میں خالی اس لئے مجبور بیٹھے ہیں

(عزیز لکھنوی)

غزل

(از حضرت مولوی سید جلال الدین صاحب توفیق مہدوی حیدرآبادی)

سرِ محشر ہم اونکی یاد قامت لیکے جاتے ہیں
قیامت سے قیامت میں قیامت لیکے جاتے ہیں

بتائیں کیا کہ مرگ ناگہانی کیسی ہوتی ہے
انہیں سے پوچھئے جو دل میں حسرت لیکے جاتے ہیں

لئے جا زاہد احسن عمل اپنا تو محشر میں
ہم اپنے ساتھ امید شفاعت لیکے جاتے ہیں

تماشا دیدنی ہے دیکھ آکر بام پر تو بھی
شہید ناز کی اجاب میت لیکے جاتے ہیں

وہ سننے کے نہیں زنہار روداد الم میری
سر ارماں مجھے کیوں بے ضرورت لیکے جاتے ہیں

گلہ کیا دلمیں حسرت لیکے نکلے بزم سے تیری
یہی بس ہے کہ ہم دل کو سلامت لیکے جاتے ہیں

عدم کے جانے والے سب چھپا لیتے ہیں منہ اپنا
خدا جانے کہ یہ کیا امانت لیکے جاتے ہیں

اہل کمال دوزخ میں بھی تو فیق اور کمال ہی کیا کریں دل کو ہر جا خوش رکھتے ہیں کبھی کبھی یہ دل حضرت کے کہے جاتے ہیں۔ مرسلہ ابوالحامد سید محمد مہدوی سکندرآباد دکن

صلاح الدین

سنہ ۴۵۳۲ھ ۱۱۳۷ء - سنہ ۵۱۹۴ھ ۱۱۹۳ء

نمبر (۱)

میرے عالم و فاضل دوست ڈاکٹر احمد میرزا۔ ایم۔ ڈی۔ بی ایس۔ سی۔ کو چونکہ بہادران اسلام کے حالات و اسوانحات سے خاص دلچسپی ہے۔ اسلئے یہ ناچیز مضمون اون کے نام نامی و اسم گرامی پر ڈیڈیکیٹ کیا جاتا ہی (قادری)

جسب کسی غریب آدمی کو کوئی غیر معولی ترقی حاصل ہو جاتی ہی تو قاعدہ کی بات ہے کہ خوشامدی اوسکو کسی نامور شخص کی نسل سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ ہی کیفیت صلاح الدین کے نسب کی ہوئی ہے۔ جن مورخین نے اوسے عربی الاصل تحریر کیا ہے اون میں سے بعض نے اوس کے سلسلے کو عوف حمیری سے ملایا ہے۔ اور بعضے آل مروان کے آخری خلیفہ مروان الحمار کی اولاد سے بتلاتے ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ وہ شام کی اوس آزاد خانہ بدوش قوم سے ہے جو عراق عرب کے مشرق میں رہتی اور کرد کہلاتی ہے۔ صلاح الدین کا دادا شاذی اس قوم کے قبیلہ روادیہ کا امیر تھا۔ یہ قبیلہ قصبہ دوین میں جو آذربائیجان کے مقامات میں ہے رہتا تھا۔ اسی مقام پر شاذی کی ولادت بھی ہوئی تھی۔

قبیلہ زوادیہ کا ایک شخص نجمبکا نام بہروز تھا۔ سلطان مسعود سلجوقی (سنہ ۵۲۷ھ ۱۱۳۳ء سنہ ۵۴۷ھ ۱۱۵۲ء) کے دربار میں پہونچ کر اپنی لیاقت و دانشمندی سے بہت سے اعلی مراتب حاصل کر لیے یہانتک کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سلطان نے اوسے بغداد کا شحنہ مقرر کیا اور قلعہ

تکریت جاگیر میں دیدیا۔ شاذی نے اپنے ہم قوم کی ان ترقیوں کا حال سنا تو اپنے دونوں بیٹوں نجم الدین ایوب اور اسد الدین شیرکوہ کو لیکر اوس کے پاس چلا گیا۔ بہروز نے خوب نشاط تواضع کی اور اوسے تکریت کا قلعہ دار مقرر کر دیا۔ شاذی کے فوت ہونے پر وہ جگہ نجم الدین ایوب کو مل گئی ۵۱۶ھ/۱۱۳۱ء میں سلطان مسعود نے اتابک عماد الدین زنگی کی شراکت سے بغداد پر چڑھائی کی۔ خلیفہ مسترشد باللہ نے حاکم فارس سے امداد چاہی۔ اوس نے ۱۲۔ جمادی الثانی ۵۲۶ھ/۱۱۳۱ء کو موقعہ پاکر شب خون مارا جس سے سلطان اور زنگی دونوں بدحواس ہوکر بھاگ گئے۔ اس بے سروسامانی میں زنگی کا گذر قلعہ تکریت سے ہوا تو نجم الدین ایوب نے اوسے قلعہ میں بلاکر پندرہ روز تک مہمان رکھا اور اوسکی فوج کے لیے جو بھوک پیاس سے مر رہی تھی، خورد و نوش کے سامان مہیا کر دیے، یہ کیفیت بہروز کو ناگوار گزری جس سے آقا و ملازم میں کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی، اسی عرصہ میں اسد الدین شیرکوہ نے بہروز کے ایک نصرانی غلام کو قتل کر ڈالا، اس سے بہروز کو اور بھی غصہ آگیا اور اوس نے نجم الدین اور اوس کے بھائی شیرکوہ کو موقوف کر کے قلعہ تکریت سے نکالدیا، نجم الدین نے موصل کی راہ لی۔ عماد الدین زنگی کے یہاں پہونچا۔ زنگی گذشتہ احسانات کو یاد کرکے بیحد لطف و مروت سے پیش آیا۔ اور ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء میں جب قلعہ بعلبک فتح کیا تو نجم الدین کو اوسکی حکومت دیدی۔ ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں عماد الدین اپنے ایک نمک حرام غلام کے ہاتھ سے شہید ہوگیا تو مجیر الدین ابن بوری نے جو دمشق کا حاکم تھا آکر قلعہ بعلبک کا محاصرہ کیا نجم الدین نے سیف الدین زنگی سے جو اپنے باپ عماد الدین کی جگہ موصل میں بادشاہ ہوا تھا امداد طلب کی، مگر وہ کاروبار سلطنت میں اسقدر منہمک تھا کہ اسطرف کچھ بھی التفات نہ کر سکا۔ جب محاصرہ نے طول پکڑا۔ اور اہل قلعہ پر بھوک پیاس کی سختیاں گذرنے لگیں تو نجم الدین نے قلعہ اہل دمشق کے حوالہ کر دیا اور اس کے معاوضہ میں اپنے

پنجیے جاگیر مقرر کرائی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجیر الدین نے اوسے دمشق میں بلوایا اور اپنے لشکر کی سپہ سالاری دیدی۔

اسد الدین شیرکوہ۔ عماد الدین زنگی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مگر جب وہ مارا گیا تو اوس کے نامور بیٹے نور الدین زنگی کے پاس چلا گیا اور نہایت قلیل مدت میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے اوسے سپہ سالار کر دیا ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں نور الدین نے دمشق فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اسد الدین شیرکوہ کی معرفت نجم الدین ایوب سے امداد طلب کی۔ اور جب حملہ آور ہوا تو نجم الدین کی سازش سے شہر فتح ہو گیا۔ اس کے صلہ میں نور الدین نے دمشق کی حکومت نجم الدین رومی کو تفویض کر دی جس کے بعد وہ ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء سے لیکر ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء تک تقریباً چودہ برس یہاں کا حکمراں رہا۔

صلاح الدین ۵۳۲ھ/۱۱۳۷ء میں بمقام تکریت پیدا ہوا۔ اس کے بعد اوس نے اپنے باپ نجم الدین ایوب کے ساتھ دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ نجم الدین کو جب دمشق کی حکومت ملی تو اوس نے ابتدا میں اپنے بڑے بیٹے شمس الدین توران شاہ کو یہاں کا شحنہ مقرر کیا۔ اس کے بعد ۵۴۹ھ میں یہ خدمت صلاح الدین کے تفویض ہوئی جسکو اس نے کئی سال نہایت نیک نامی سے انجام دیا لیکن بعض وجوہات سے اس میں اور صاحب دیوان ابن ہمام میں مخالفت پیدا ہو گئی صلاح الدین نے گھبرا کر خدمت چھوڑ دی اور دمشق سے نکلکر نور الدین کے پاس حلب میں چلا گیا۔ اور اوس کی مصاحبت میں زندگی کے دن بسر کرنے شروع کر دیے +

پانچویں صدی کے شروع ایام سے مصر کی فاطمی خلافت کو انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ اور خلیفہ وزراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن رہے تھے ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں وزیر العباس نے خلیفہ ظافر باللہ کو قتل کرا کے اوس کے نابالغ بچے کو تخت نشین کرایا لیکن ملک صالح

کے ہاتھوں جو مصر بالائی کا حاکم تھا بہت جلد کیفر کردار کو پہونچا۔ اس کے بعد صالح نے وزارت اپنے ہاتھ میں لے لی اور چھ برس تک اس خدمت کو انجام دینے پایا تھا۔ کہ ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء میں اوس کے امیروں نے خنجر سے ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد اوس کے بیٹے ذریک نے وزارت کے لیئے کوشش شروع کی مگر شاور حاکم مصر صعید نے اوسے تباہ و برباد کر کے خود وزارت پر قبضہ کر لیا۔ اور اسکو ابھی سنبھلنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی کہ ایک اور حریف پیدا ہو گیا ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء میں ضرغام نے وزارت کا دعوی کیا اور فوج کثیر کے ساتھ مصر پر چڑھائی کی۔ شاور نے شکست پائی اور شام میں آکر نورالدین زنگی کے یہاں پناہ گیر ہوا۔ اور بہت کچھ عرض معروض کرنے پر بادشاہ نے اس شرط سے امداد دینا منظور کر لیا کہ بعد کامیابی مصر کا ثلث محاصل بطور خراج دیا جائے اور امدادی فوج ہمیشہ کے لیے قاہرہ میں مقیم رہے۔

نورالدین نے دارالحکومت کی تھوڑی سی فوج بہت جلد تیار کر دی۔ اور اسد الدین شیرکوہ کو اوسکا سپہ سالار مقرر کر کے صلاح الدین کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔ یہ لوگ کئی منزلیں طے کر کے ۲۔ جمادی الاول ۵۵۹ھ/۱۱۶۳ء کو مصر میں داخل ہوئے ضرغام نے خوب مقابلہ کیا۔ مگر ناکامی حاصل ہوئی اور پسپا ہو کر بھاگ رہا تھا کہ ایک شامی نے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ کے بعد شاور کو بلا کھٹکے وزارت مل گئی اور اوس نے قاہرہ میں بڑے کروفر سے داخل ہو کر خوب جشن منائے۔

جب شاور کو کامیابی حاصل ہو گئی تو شیرکوہ نے ایفائے عہد کا تقاضا کیا مگر اوس نے یونہی ٹالنا چاہا۔ اس کشمکش میں جب جھگڑے نے طول پکڑا تو شاور نے شام کے عیسائیوں سے امداد طلب کی اور اونہیں فی پڑاؤ ہزار دینار دینا مقرر کیا۔ شیرکوہ نے عیسائیوں کے آنیکا حال سنا تو اپنی فوج لیکر واپس ہونے لگا۔ مگر اوسے راستہ میں بمقام بلبیس عیسائیوں نے گھیر لیا۔ اس خبر کے سنتے ہی

نورالدین نے فلسطین میں تاخت و تاراج شروع کردی اور انطاکیہ و طرابلس کے بعض عیسائی سرداروں کو گرفتار کرلیا۔ اس پر عیسائیوں نے شیرکوہ سے تو صلح کرلی مگر ان میں اور اہل مصر میں ان بن ہوگئی۔

آل سلجوق کی عظیم الشان سلطنت کو جب تنزل شروع ہوا تو اوس کے بہت بڑے بڑے عہدہ دار خود سری اختیار کرکے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار ہوگئے۔ پھر ہر ایک نے اپنے مقبوضات کو وسیع کرنے کے لیے اطراف واکناف پر یورشیں شروع کردیں۔ جن کی وجہ سے خراسان سے لیکر بحر روم تک بے شمار خانہ جنگیوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ اس پرآشوب زمانہ میں عیسائیوں نے صلیبی لڑائیوں کا آغاز کیا۔ روم جرمن، فرانس، اور دیگر بلاد یورپ کے بڑے بڑے امراء نے لاکھوں آدمی لیکر مشرق پر فوج کشی کی مسلمانوں میں اسوقت ایسی کوئی طاقت موجود نہیں تھی کہ ان کا مقابلہ کرتی اسلیے یہ لوگ ایشیائے صغریٰ میں لوٹ مار کرتے ہوئے انطاکیہ تک چلے آئے اور اوسے ایک طول محاصرہ کے بعد فتح کرلیا پھر یہاں سے روانہ ہوکر بیت المقدس پر چڑھائی کی چھ مہینے تک لڑتے رہے آخر میں ۴۹۱ھ ۱۰۹۷ء کو شہر فتح ہوگیا۔ اس کے بعد ساحل فلسطین کے بہت سے شہر بھی مسلمانوں سے لے لیے اس طرح پر اس علاقہ میں عیسائیوں کی ایک چھوٹی سی حکومت قایم ہوگئی جو سلطنت یروشلیم کے نام سے کچھ کم سو برس مسلمانوں کی مدمقابل بنی رہی

عیسائیوں نے صرف شام ہی کے شہروں پر اکتفا نہیں کی بلکہ مصر اور عراق کے فتح کرنے کا بھی ارادہ کیا۔ شاور نے جب حسب وعدہ رقم ادا نہیں کی تو انہیں اہل مصر کے خلاف ایک بہت اچھا حیلہ ہاتھ آگیا جس کی بنا پر اونہوں نے مصریوں کے بعض شہر فتح کرلیے۔ نورالدین زنگی نے جب دیکھا کہ مصر

مخفر یب اسلامی قبضے سے نکلا چاہتا ہے تو اوس نے اس کے بچانے کی کوشش کی۔ ربیع الاول ۵۶۴ھ ۱۱۶۸ء میں اسد الدین شیرکوہ اور صلاح الدین کو لشکر دیکر مصر میں پھر دوسری بار روانہ کیا۔ شیرکوہ نے نہایت عجلت سے منازل طے کئے۔ اور مصر میں داخل ہوکر سب سے پہلے الجیزہ میں مقیم ہوا پھر یہاں سے نکل کر ابوان عطیہ میں آیا اس مقام پر فریقین میں سخت معرکہ ہوا جسمیں شیرکوہ کی دو ہزار فوج نے عیسائیوں کے دس ہزار آدمیوں کو ہزیمت دی۔ اس کے بعد شیرکوہ نے مصر بالائی سے گذر کر اسکندریہ کو فتح کر لیا۔ اس عنصریں قاہرہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کیفیت کے سنتے ہی شیرکوہ نے اسکندریہ کی حفاظت صلاح الدین کے تفویض کی اور خود قاہرہ میں آکر عیسائیوں سے مقابلہ کرنے لگا متعدد لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا اسی اثنا میں عیسائیوں کو شام سے کچھ کمک آگئی جسنے جاکر اسکندریہ کا محاصرہ کیا اور صلاح الدین کے ساتھ تین مہینے تک جنگ کرتے رہے۔ نورالدین کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو اوس نے فلسطین پر یورش کر دی جس سے عیسائیوں کو سخت پریشانی ہوئی اور انہوں نے مدافعت کے لیئے شام کو واپس جانا مناسب سمجھا اور نہایت عجلت کے ساتھ شیرکوہ سے صلح کر کے شاور سے بھی مصالحت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے بہت کچھ جد وجہد کے بعد خلیفہ نے ایک لاکھ دینار خراج دینا منظور کر لیا تو ان لوگوں نے شہر خالی کر دیا اور اپنی حقوق کی نگاہداشت کے لیے قاہرہ میں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر فلسطین کو واپس چلے گئے +

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد عیسائی بادشاہ اموری نے رومی شہنشاہ عمانوئیل کی پوتی شہزادی میریا سے شادی کر لی تو شہنشاہ نے اپنے داماد کو مصر کی لزوی اور اسبتری پر توجہ دلائی اور اوسکی فتح کے خیال کو از سر نو تازہ کر کے خود بھی امداد

دینے کا وعدہ کیا۔ اموری نے ۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء کے اخیر ایام میں اس مہم پر عسقلان سے فوج روانہ کی جس نے حدود مصر میں داخل ہو کر پہلی صفر ۵۶۳ھ/۱۱۶۷ء کو بلبیس کا محاصرہ کیا شہر سنگ لگا کر اڑا دیا گیا اور وہاں کے باشندے نہایت بیدردی سے تہ تیغ کیے گئے۔ اس کے دس روز بعد عیسائی فوج قاہرہ کے سامنے پہونچ گئی اور جہازوں کا رومی بیڑہ دریائے نیل میں آکر قاہرہ کے پاس لنگر انداز ہوگیا۔ شاور نے بھی جنگ کی خوب تیاری کی اور قاہرہ میں محصور ہو کر مقابلہ کے لیے آمادہ ہوگیا عیسائیوں نے مصر قدیم کی طرف پیشقدمی کی تو وہاں کے باشندے پناہ کے لیے قاہرہ میں چلے آئے اور اس خیال سے کہ کہیں عیسائیوں کا قبضہ نہ ہو جائے شہر کو آگ لگا دی اور وہ پیہم تیس روز تک برابر جلتا رہا۔

شاور نے اموری کو لاکھوں دینار کے لالچ دیے جس سے کچھ عرصہ کیلئے لڑائی ملتوی ہوگئی اس اثنا میں خلیفہ عاضد باللہ نے نورالدین زنگی سے استمداد چاہی اور اپنے ہاتھ سے خط لکھا جس میں عیسائیوں کے تمام ظلم و ستم تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ نورالدین نے خط دیکھتے ہی فوج کثیر تیار کر لی۔ اور اسدالدین شیرکوہ کو اس کا سپہ سالار بنا کر تیسری بار روانہ کیا۔ عیسائی فوج جنگ کے لیے آگے بڑھی۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوگیا کہ دونو دو علیحدہ علیحدہ راستوں پر ہو گئے جس کے باعث مقابلہ کی نوبت نہ آئی۔ اس کے بعد عیسائیوں نے جنگ و جدل کو نامناسب سمجھا اور بے نیل و مرام فلسطین کو واپس چلے آئے۔

شیرکوہ ۴۔ ربیع الثانی ۵۶۴ھ/۱۱۶۸ء کو قاہرہ میں داخل ہوا۔ خلیفہ نے خوب اسکی عزت و توقیر کی۔ اور شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ اور لیجا کر ایوان خلافت میں اوتارا۔ اسوقت شاور مصر کے سفید و سیاہ کا مالک بنا ہوا تھا۔ جب شیرکوہ وہاں پہونچ گیا تو اسے اپنے اختیارات کے سلب ہونیکا اندیشہ ہوا

اسلیئے شیرکوہ کے قتل کی تدبیریں کرنے لگا۔ مگر اوس کے بیٹے نے جب اس راز کو فاش کر دیا۔ تو شامی فوج نے اوسے گرفتار کر لیا اور خلیفہ کی ایما سے سترہ ربیع الثانی ۵۶۴ھ ۱۱۶۹ء کو قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد خلیفہ نے شیرکوہ کو ملک المنصور امیر الجیوش کا خطاب دیکر وزارت عطا کر دی۔ شیرکوہ نے اس عہدہ کے پاتے ہی سب سے پہلے اپنی فوج اور اوس کے سرداروں کی تنخواہیں مقرر کیں پھر انتظام سلطنت کی طرف متوجہ ہوا مگر موت نے مہلت نہ دی اور تین مہینے سے بھی کم زندہ رہ کر ۲۲ جمادی الثانی ۵۶۴ھ ۱۱۶۸ء کو فوت ہو گیا وزارت کے لیے پھر جھگڑے درپیش ہوئے شامی لشکر کے ساتھ جو امرا آئے ہوئے تھے اون میں سے عین الدولہ یاروقی شہاب الدین حارمی سیف الدین مشطوب وغیرہ نے اپنے آپ کو اس عہدہ کا مستحق سمجھکر درخواستیں دیں مگر خلیفہ نے صلاح الدین کو انتخاب کیا تو یہ لوگ برہم ہو گئے مگر ملا ضیاء الدین ہکاری کی کوشش سے معاملہ رو براہ ہو گیا۔ ان میں سے تین امیر تو راضی ہو گئے مگر عین الدولہ کبیدہ خاطر ہو کر دمشق کو واپس چلا گیا خلیفہ نے ایک مبارکباد تجویز کر کے صلاح الدین کو دربار خلافت میں طلب کیا۔ اور ملک الناصر کا خطاب دے کر وزارت کے تمام کاروبار اوس کے تفویض کر دیے۔

باقی

حکیم سید شمس اللہ قادری

قطعہ

اے ہمنشیں غلط ہے تیرا گمان بد — ہاں دل زدست دادۂ جاناں نہیں ہوا میں
عشق اپنی بیقراری دل کا سبب نہیں — غم میں کسی کے چاک گریباں نہیں ہوں میں
کھاتا ہوں اپنی قوم کی حالت پہ پیچ و تاب — محو خیال کاکل پیچاں نہیں ہوں میں

(علی حیدر زیدی)

نامۂ حبیب

اے بہارِ شوق کے ننھے سے قاصد جانِ شوق — اے سکونِ قلبِ مضطر، اے مرے ارمانِ شوق
اے مرے تابِ تواں، روحِ رواں، درمانِ شوق — اے کہ افزوں از تو کیفِ عشرتستانِ شوق

آ گیا بارے تو لے کر یار کی تحریر کو۔
میری تسکین، گفتگوئے یار کی تصویر کو

لب یہ کہتا ہے "ادھر لاؤ میں پہلے چوم لوں" — آنکھ کہتی ہے کہ "میرا شوق ہے حد سے فزوں
دل یہ کہتا ہے کہ "مجھکو دیجئے میرا سکوں۔ — چیر کر پہلو میں رکھ لے ہے تقاضائے جنوں

مخمصے میں جان ہے کیا اضطرابِ شوق ہے
کیا ہجومِ آرزو ہے، کیا وفورِ ذوق ہے

جانتا ہوں میں نہیں یہ بے تابیاں — میں سمجھتا ہوں ہیں کیوں یہ شوق کی بیباکیاں
رحم کے قابل ہیں ساری عشق کی لاچاریاں — ہونگی لیکن کس طرح آسان یہ دشواریاں

مٹ تو جائے پہلے خوفِ آرزو کا انہماک
کانپتے ہیں ہاتھ میرے تجکو گر کرتا ہوں چاک

ہاتھ سے اپنے لکھا ہے اس نے تجکو سچ بتا؟ — واقعی تجھ پر پڑی ہے وہ نگاہِ فتنہ زا؟
سایہ افگن کیا ہوا ہے تجھ پہ گیسوئے دوتا؟ — منعکس تجھ پر ہوئی ہے روئے انور کی ضیا؟

سچ بتا کیا اپنے لب سے اس نے چھو لیا ہے تجھے؟
پھر تو ظالم سرخیِ یاں چوم لینے دے مجھے؟

میں تو سمجھا تھا کہ تجھ سے کچھ سکوں ہو جائیگا — آئیگا تو اس میں میرے لئے کچھ لائے گا

اضطراب دل مگر مٹ جائے گا مٹ جائیگا کیا خبر تھی آ کے مجھکو اور تو تڑپائے گا

تیرا آنا مجھکو اپنے ہوش سے جانا ہوا
تیری صورت دیکھکر اپنے سے بیگانہ ہوا

کھینچے لیتی ہے جگر کو تیرے حرفوں کی کشش شوخیِ مضمون سے تیری بڑھ گئی دل کی طپش
مجھکو ہے وارفتگی تیری کتابت کی روش تیرے شوشے میرے سینے میں ہوئی وجہِ خلش

تیرا جو نقطہ ہے اک داغِ دلِ بیمار ہے
دائرہ ہر اک جنوں کی جنبشِ پرکار ہے

ایسی بیتابی کسی نے ہائے دیکھی ہے کہیں بند کرتا ہوں تجھے تو شوق کہتا ہے نہیں
چومتا ہوں ہر گھڑی دلدار کا نقشِ مکیں سونگھتا رہتا ہوں پھر بوئے دستِ تازنیں

کفر مجھکو کیا یہ میرا شوقِ مست ہو جائیگا؟
لوگ سچ کہتے ہے مجھکو بت پرست ہو جائیگا؟

نیاز محمد خان نیاز فتحپوری

غزل

اُسپہ شیدا ہوں کہ جسکو نہ خبر تک پہونچے معجزہ ہو جو مری آہ اثر تک پہونچے
خوف سے سوز دروں کے ہے تنفس دشوار دل سے بڑھکر نہ کہیں آگ جگر تک پہونچے
جذب شبنم کی ہو خورشید جہاں تاب کو فکر تیرا دامن مرے دیدۂ تر تک پہونچے
جوش وحشت کی شب غم ہو کہاں تک تفصیل ہاتھ بڑھ بڑھکے گریبانِ سحر تک پہونچے
اُس کی آمد کی خبر سن کے یہاں صبر کہاں دل سے ارمان مری حدِ نظر تک پہونچے
مر کے پہونچی ہے مری لاش ترے کوچے میں کون اسطرح تری راہ گذر تک پہونچے
راہ میں تجھکو ملے حضرتِ واعظ جو کبھی باتوں باتوں میں خرابات کے در تک پہونچے
نزع میں ہوں نفسِ بازپسیں کا ممنون چند نالے وہ یہی تھے جو اثر تک پہونچے
دل سے رخصت ہوئی یہ کہکے شبِ ہجر میں روح گھر میں راحت ہو تو نوبت نہ سفر تک پہونچے
مقتضی اسکی ہے ہیبت شبِ تنہائی کی اپنے گھر سے میں صدا دوں ترے گھر تک پہونچے

سو رہوں اُس کے تصور میں شبِ ہجر فطر
گیسوِ لیلیِ شب اب تو کمر تک پہونچے (نوبت رائے نظر)

بھائی کا خط بھائی کے نام

دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ زاہد تو نہیں؟
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھکو!!
(حضرت داغ مرحوم)

برادرم! السلام علیکم۔

سب سے پہلے میں آپ کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے میرے مضمون بھائی کا خط بہن کے نام پر علمی روشنی ڈالنے میں گوارا کی! مضمون مذکورہ میں میرا روئے سخن طبقۂ نسواں کیطرف تھا، اور میرا مقصد اصلی اسی طبقہ کی ذاتی رائے حاصل کرنا تھا! اسی وجہ سے میں نے یہ مضمون عصمت کے لیے دیا تھا جسکو کسی خاص مصلحت کے لحاظ سے میرے کرمفرما اڈیٹر صاحب نے تمدن میں شائع کر دیا! اب اس کا جواب آپ دیتے ہیں۔ دیتے ہیں اور بہن کی نقاب ڈالکر، بہن کا برقعہ اوڑھکر دیتے ہیں۔ اس لیے میرا اصلی منشا، تو ایک حد تک فوت ہو گیا (اگرچہ بظاہر آپ نے بھی طبقۂ لطیف ہی کی جگہ سنبھالکر پردہ سے مخالفت کی ہے) لہذا بہتر یہ ہے کہ 'بہن' کا لفظ جو اب قطعی فضول ہو گیا دور کر دیا جائے اور ایک تعلیم یافتہ مرد کی رائے کو طبقہ نازک کے سر تھوپا جائے! اسی وجہ سے میں آپ کو براہ راست مخاطب بنا کر، بحیثیت علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائے ہونے کے لزوم کے سادہ مگر سچے خطاب سے پکارنے کی جرأت کرتا ہوں!

آپ پردے کی مخالفت کرتے، چشم ما روشن دل ما شاد! آپ میری غلط فہمیاں

مجھے سمجھاتے، آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک! لیکن جو کچھ فرماتے، میرا مضمون ٹھنڈے دل اور منصف دماغ کے ساتھ ملاحظہ کر چکنے بعد فرماتے! مگر سچ پوچھئے تو آپ نے ایسا نہیں کیا! آپ پردہ کو قید خانہ، جیل، سزا، شک، بدگمانی اور خدا جانے کیسے کیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ جس پردہ کی حمایت پر میں نے قلم اٹھایا تھا وہ نہ قید خانہ تھا نہ بدگمانی! "پردہ کے معنی زندہ درگور ہو جانا یا چار دیواری میں مقید رہنا اگر لے لیے جائیں تو سب سے پہلے میں اسکا مخالف ہوں"، میری رائے میں "پردہ کی ناجائز اور جابرانہ سختی واقعی خلاف انسانیت ہے اور خواہ مخواہ کی بدظنی اور بیہودہ شک اول درجہ کی حماقت ہے"، اور "میرے خیال میں شوہر یا بزرگوں کی اجازت سے کسی کے ہاں ملنے جانا، فالصالحات قانتات حافظات للغیب کا خیال رکھ کر جانا۔ کوئی عیب نہیں، اور عجائبات دنیا کو اپنے شوہر یا بزرگوں کے ہمراہ دیکھنا۔ خود اپنے چہرے یا جسم کو کسی غیر محرم کو دکھائے بغیر دیکھنا۔ چنداں ہرج نہیں" یہ ہی وہ الفاظ ہیں جو میں نے اپنے پہلے مضمون میں لکھے ہیں اور یہ ہی وہ مذہبی پردہ ہے جسکا حامی میں تھا اور ہوں! اسی پردہ سے میری مراد تھی اور اسی پردہ پر آپنے درحقیقت توجہ نہیں کی! آپ کی ہر ہر سطر سے ظاہر ہے کہ آپ جس پردہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ تھپر کی چار دیواری والا قید خانہ ہے اور بدگمانی اور بیہودہ شک کا نتیجہ ہے! میں ایسے پردہ کا مدعی نہ تھا اور نہ ہوں! افسوس کہ آپنے میرا مضمون غور کے ساتھ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ اور محض اس خیال سے کہ وہ پردہ کی حمایت میں تھا آپ مخالفت پر تل گئے!!

یارب آن زاہد خود بین کہ بجز عیب ندید
دودِ آہیش در آئینہ ادراک انداز!

پولیس والی مثال سے میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس طرح پولیس کے خوف سے اکثر انسان ارتکاب جرم سے باز رہتے ہیں۔ اسی طرح پردہ کی وجہ سے طبقۂ نسواں نیک ہے! میں نے نہ پولیس سے کوئی نتیجہ پردہ پر مرتب کیا اور نہ پولیس کا اطلاق پردہ پر کیا! پردہ والی مثال محض اس لیے تھی کہ ڈائی لما منطق کی اصطلاح آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے اور مغالطہ یا غلط نتیجہ نکالنے کا رنگ ایک عام فہم اور روزمرہ پیش نظر رہنے والی چیز پر استدلال کرنے سے معلوم ہو جائے! پولیس کو پردہ کی دلیل سے کوئی تعلق سوائے اس کے نہیں تھا کہ طریقۂ استدلال میں جس طرح پردہ پر مغالطہ پیدا کیا جا سکتا ہے اسی طرح پولیس پر آپ جو کچھ پولیس کی نسبت فرماتے ہیں وہ ایسی حیثیت میں ہے کہ کوئی لال بجھکڑ ہی سمجھے تو سمجھے! نیک سیرت خاتون کو تمام ذریات الشیاطین اپنی مجموعی قوت کے ساتھ بھی بد نہیں بنا سکتی، اور بدکردار عورت کو اندھے کوئیں کی قید اور تمام دنیا کے ریفارمر بھی ارتکاب گناہ سے باز نہیں رکھ سکتے، اس لیے پردہ ان دونوں کے لیے بیکار اور فضول ہے! لیکن یہ دونوں انتہائی گروہ۔ راسخ الاعتقاد، پکی، اور کسی حالت میں نہ پلٹنے والی طبیعتیں تعداد میں بہت کم ہیں، اور ان دونوں گروہوں کی ملانے والی جماعت۔ درمیانی کڑی۔ یا طبقۂ متوسط۔ تعداد میں ان دونوں سے بہت زیادہ ہے! گویا طبقۂ نسواں کی تقسیم صرف دو گروہ پر کرنا اور درمیانی حصہ کو چھوڑ کر نتیجہ پر کود جانا، محض مغالطہ ہوگا! طبقۂ درمیانی ہی وہ طبقہ ہے جس پر زمانے کی چالاکیاں اور نظر فریبیاں دیکھتے ہی دیکھتے بہت گہرے نقش ڈالتی ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جسکو خونخوار مردوں کی نگاہ سے اور اون کی بری صحبت سے بچانے کی بے حد ضرورت ہے! اور اسی طبقہ کے لحاظ سے پردہ۔ ایسا پردہ جس کی

مراحت میں پہلے بھی کر چکا تھا اور اب بھی کر چکا ہوں محض حفظ ماتقدم نہیں۔
بلکہ خود لائیفک ہی! آپ فرماتے ہیں کہ مردوں کے بدچلن ہونے کا بھی خطرہ
ہے ..... اس لئے مردوں کو قید کر دیا جائے"۔ یہاں پھر آپ کے الفاظ
بول رہے ہیں کہ جس پردہ کی آپ مخالفت کر رہے ہیں وہ قید خانہ کی تصویر
ہے، حالانکہ میں اس قسم کے پردہ کا حامی نہیں تھا: خیر تو آپ کی رائے میں
مرد پردہ میں بیٹھیں اور عورتیں دنیا کے جھگڑے بکھیڑوں میں مبتلا ہوں۔ کیونکہ
جبتک دونوں میں سے ایک طبقہ دنیا کی کشمکش میں حصہ نہیں لیگا، ترقی تو
الگ رہی زندگی ہی محال ہو جائے گی۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ دونوں طبقوں
میں سے کونسا طبقہ فرائض مذکورۂ بالا کا ذمہ وار بن سکتا ہے؟ میری رائے
میں۔ دنیا کی کشمکش کا، سخت سے سخت ذمہ واریوں کا، جانکاہ محنتوں کا،
ملکی فرائض کا، قوم کی رہبری کا متحمل طبقۂ نازک نہیں ہو سکتا! قدرت کے
زبردست ہاتھ نے ان دونوں طبقوں میں بیّن فرق رکھا ہے اور طبقۂ نسواں
کبھی ہرگز زندگی اور طوفان زندگی کا بوجھ اوٹھانے کے لیے وضع نہیں کیا گیا۔
صناع حقیقی نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا طبقہ، دوسرے
طبقہ کی آرام و آسائش کے ذرائع مہیا کرنیکا کفیل، زندگی کی صعوبتیں برداشت
کرنے کا متحمل، اور رہبری کے فرائض ادا کرنے کے قابل سمجھا جا سکتا ہے
میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیوں اوس رب ذوالجلال نے نبوت کا اعلیٰ مرتبہ
طبقۂ نسواں میں سے کبھی کسیکو عطا نہیں فرمایا کیوں رہبری اور ذمہ واری
کا کام ایک پری جمال خاتون کے سپرد نہیں کیا؟ اور کیوں اپنے قانون کی
اشاعت کسی رشکِ حور، عفت و عصمت کی دیوی کے ذریعہ سے نہیں کی؟
جبکہ خالق یکتا نے دونوں طبقوں کو باہمہ حیثیت مساوی بنایا تھا، اور جبکہ

بعثت پیغمبر سے منشا ایزدی دونوں طبقوں کو راہ راست دکھانی تھی، تو پیغمبران مرسل کی تعداد بھی شان انصاف تو اسی کی مقتضی ہے کہ دونوں طبقوں میں برابر ہوتی، چہ جائیکہ طبقۂ نسواں میں سے کسیکو بھی یہ اعلیٰ مگر اہم ترین ذمہ واری کا مرتبہ تفویض نہیں فرمایا گیا! اس ترجیح بلا مرجح کی وجہ کوئی سمجھ میں نہیں آتی! مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ مرد اور عورت کو ہر حیثیت سے مساوی ثابت کرنے کے زور میں، ناچیز انسان کی تحقیقات اور اقوال کو خدائے واحد کے فعل پر ترجیح دینے کی نہ ٹھان لیں! اب فرمایئے کہ کونسا طبقہ کشاکش زندگی کے لیے وضع کیا گیا ہے!

ناصح سے کہدے کوئی کیجئے بھلا ایسا
حضرت کو تاکہ کوئی یہ جانے، آدمی ہیں! (داغ)

آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "کیا عورتوں کو پردہ میں بٹھانے سے مرد اپنی بدذاتی سے باز آئے؟" اور میں جواب میں گذارش کرتا ہوں کہ بدذات کسی صورت میں اپنی بدذاتی سے باز نہیں آسکتا! لیکن جناب من! تمام مرد تو بدذات نہیں: یہاں بھی وہی دو انتہائی گروہ اور ایک درمیانی طبقہ ہے اور یہ تقسیم ہی وہ چیز ہے جسکو آپنے قطعی نظر انداز کیا ہے! بدذات مرد ڈولیوں میں بیٹھکر اور عورتوں کا لباس پہنکر پردہ کی چار دیواری میں پہونچ تو سکتے ہیں لیکن اونہیں کے پاس پہونچ سکتے ہیں جو خود بھی مردانہ بھیس میں لینڈو میں سوار ہوکر مردوں تک پہونچ جاتی ہوں۔ اونہیں کے پاس پہونچ سکتے ہیں جو کچھ عرصہ سے متاع حسن ہزار ہزار عشوہ و انداز کے ساتھ مردوں کے دل سے بدلتی رہی ہوں! اور مختصر یہ کہ بدذات مرد کا دست شیطنت پردہ کی موجودگی میں ایسی ہی عورتوں تک پہونچ سکتا ہے جو خود بھی بدذات اور آوارہ یا کم از کم

مائل بہ آوارگی ہوں!!

جنکو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

پھر آپ پردہ کو سزا سے تعبیر کرتے ہیں اور طبقۂ نازک کو مال وزیور سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صرف تشبیہ ہی نہیں دیتے بلکہ اس تشبیہ سے طبقۂ نازک پر نتیجہ نکالتے ہیں: کیا سمجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی کہ ایسی مثال اور تشبیہ سے نتیجہ نکالنا صحیح نہیں؟ کیا سمجھے یہ بتانے کی حاجت ہی کہ یہ مثال "مثال مع الفارق" ہے، اور جو کچھ نتیجہ اس سے نکلے وہ طبقۂ نسواں کے لیے صحیح نہیں ہوگا؟ زیور اگر ہزار آدمیوں کے ہاتھ میں جائے تو بھی وہی رہیگا جو پہلے تھا۔ لیکن ایک ماہ کی کم خاتون ہزار مختلف الخصائل مردوں کی سوسائٹی میں تبادلۂ خیالات کی وجہ سے بہت کچھ متاثر ہو جائے گی، اور یہی وہ اثر ہوگا جو اچھا ہو تو فہو المراد، ورنہ بے ڈوبے گا، ممکن ہے کہ ایک عورت .... نیک سیرت اور باہمہ حیثیت فرشتہ انسان کے پاس عرصہ تک رہ کر بھی ویسی ہی رہے جیسی پہلے تھی مگر جناب ہر ایک مرد تو ایسا نہیں!

نقد وصوفی نہ ہمہ صافی ویکدش باشد ۔۔۔ اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

میں آپ کے اس ارشاد کا مطلب سمجھنے سے بھی عاجز رہا "چور کو سزا نہیں دی جاتی" چور کو اسی وقت سزا دی جاسکتی ہے جبکہ وہ چوری کا مرتکب ہو جائے یا چوری کرتا ہوا پکڑا جائے! مگر افسوس ہے کہ یہاں بھی معاملہ کی حالت دوسری ہے، چور کے پاس چوری کا مال برآمد ہو جائے تو ایک لاکھ کی حویلی سامنے موجود ہے۔ لیکن ان بدذات وزدان متاع حسن وعصمت کی کچھ نہ پوچھیے یہاں متاع حسن خود آستینیں چڑھا کر وزدسینہ زور کی حمایت پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو مجسٹریٹ کے سامنے اپنے آپ کو بدذات کی ملکیت ثابت کر کے مانتا ہے!

ایسی حالت میں تعزیرات ہند تو ایک طرف، تعزیراتِ آسمانی کی بھی کوئی دفعہ نہیں لگائی جاسکتی! بذوات چور چوری بھی کرتے ہیں اور مال مسروقہ پر قابض رہکر مونچھونکو تاؤ دیتے ہوئے ناجائز آزادی کے ڈھول بھی بجاتے ہیں!!

سامنے غیر کے تم فتنہ مجھے کہتے ہو۔
چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر؟

رہا یہ کہ چوروں کے خوف سے نہ کچھ پہنا جائے نہ برتا جائے، اغلط اور محض غلط!! پہننا اور برتنا زیور اور مال کا جائز استعمال ہے، مال و زیور اسی لیے وضع کیا گیا ہے کہ اپنے اپنے موقع پر کام میں لایا جائے، اور یہی اس کے جائز استعمال کی حد ہے! اسی طرح بزرگوں اور شوہر کی ہمراہی میں یا اون کی اجازت سے عجائبات دنیا کے نظارہ سے محظوظ ہونا، جو کچھ دیکھنا اپنے آپ کو غیر محرم کی نگاہ سے چھپا کر شرم و حیا اور عصمت و عفت کا لحاظ رکھکر دیکھنا، ایک شریف خاتون کی جائز آزادی ہے جسکا مخالف میں نہ تھا اور نہ ہوں! البتہ مردوں کا بھیس بدل کر ہوا خوری کرنا، تعلیم یافتہ مرد بنکر دوستوں کے ہاں ملنے جانا، ٹینس کورٹ میں انتہائے بے باکی کے ساتھ گزوں اچھلنا، غیر محرموں کے ساتھ بے تکلفی کے رنگ میں گہی کھچڑی رہنا، تمام دنیا کو اندھا سمجھکر اپنے آپ کو بندۂ فیشن بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی اپنے بیش قیمت زیور کو بلا ضرورت ہر وقت لادے رہے، ایک ایک کو دکھاتا پھرے، اور ہزاروں روپے کے توڑے چھنا چھن اچھالتا پھرے، محض اس خیال سے کہ پولیس موجود ہے اور چوروں کے انسداد کا کافی انتظام ہے! عقل خود بتادے گی کہ ایسے مال و زیور کی میعاد قیام جو محض ہستی پولیس کے خیال پر بلا محافظت و نگہداشت، جہاں چاہے رکھدیا جائے، کتنے منٹ اور کتنے گھنٹے ہوسکتی ہے! اتنی دیر تو پولیس کی موجودگی، سُراغ رسانی کی ترقی، اور عدالت کی چابک بین پر بھی روز بروز اپنے مال کے لیے

مضبوط صندوقوں کو، کسی دوسری کنجی سے نہ کھلنے والے قفلوں کو، پوشیدہ خانے رکھنے والی الماریوں کو رائج کرتی جاتی ہے: ہر شخص بینک سسٹم کی بدولت زرِ نقد کے نام ایک کوڑی بھی اپنے پاس رکھنی نہیں چاہتا اور کاغذ پر چند سطروں سے لاکھوں کا کام لینا چاہتا ہے: اور آپ فرماتے ہیں کہ جو مالدار ہو وہ اپنے مال کو چھپاتا پھرے، کس ناکس کو دکھاتا پھرے اور اگر کوئی سمجھائے تو وہ آنکھیں نکال کر جواب دیدے کہ "چوروں کو تو روکا نہیں جاتا اُلٹا مالداروں کو روکا جاتا ہے"!

بریں عقل و دانش بباید گریست۔ (مصرعہ پورا کرنے کے لیے ادب مانع ہے)

"اگر عورتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنی خوبصورتی سے مردوں کو لبھاتی ہیں اور اشتعال طبع دلاتی ہیں ..." تو یہی ایک ہی ہوئی! کر تو ڈر، نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر! میں نہ کبھی ایسا پوچ خیال تمام طبقۂ نسواں کی نسبت کر سکتا ہوں، اور نہ میں نے کیا! یہ بھی آپکا اپنا اچھوتا خیال ہے!

بدگماں کو گمان بد گذرا وصف روئے نکو کئے نہ بنے

دنیا کی ہر چیز دو طرح استعمال کیجا سکتی ہے، جائز طریقہ پر یا ناجائز طریقہ پر! آگ دنیا کے لیے کسقدر بڑی نعمت ہے، اسٹیم گیس الکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ کی زبردست طاقتیں محض اسی آگ پر قائم ہیں، اور اسی آگ نے خشکی اور پانی میں تہذیب اور ترقی کی آگ لگا رکھی ہے؛ لیکن ساتھ ہی اس سے بھی کسکو انکار ہو سکتا ہے کہ یہی آگ سینکڑوں راہ حق دکھانے والوں کو جلانے کے کام میں آچکی ہے، اور یہی آگ دیکھتے ہی دیکھتے غریب بندگان خدا کے سخت محنت سے بنائے ہوئے جھونپڑوں کو جلا کر راکھ بنا سکتی ہے! اب اس آخری وجہ سے آگ کو برا کہنا خلاف عقل نہیں تو اور کیا ہے؟ جائز یا ناجائز استعمال کا ذمہ وار وہ ہے جو استعمال کر رہا ہے، اچھے یا برے استعمال سے نفسِ شے پر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا! قریب قریب

یہ ہی حالت حسنِ انسانی کی ہے! ایک حسنِ مجسم، کانِ عفت و عصمت، جانِ شرم و حیا پر ہی جو اپنے آپ کو بری نگاہ سے بچانے کا ہر وقت لحاظ رکھتی ہو محض اس کے حسن و لاویز کیوجہ سے، اشتعالِ طبع کا گناہ قایم کرکے فرمتسرار داد جرم لگانا آپ کا کام ہے؟ اور ایک ایسے شعلۂ جوالہ پر۔ جو پوڈر اور بلوم آف روز کے ذریعہ سے، جو مصنوعی گھونگر والے بالوں اور تنگ سے تنگ پیٹی کے ذریعہ سے، جو بات بات میں شان دلربائی اور انداز معشوقانہ پیدا کرنے کی ادا سے، اور جو مشاق ہونٹوں اور چلتی ہوئی آنکھوں سے۔ خواہ مخواہ ایک دیکھنے والے کو اپنی طرف مخاطب کرتی ہو، اپنی طرف کھینچتی ہو، اپنا گرویدہ بناتی ہو۔ اشتعالِ طبع کا الزام لگانا میرا دعویٰ ہے! ہر حسین خاتون کو بلا تفریق عادات و اطوار۔ بلکہ خود حسن تک کو۔ موردِ الزام ٹھیرانے کی دیدہ دلیری آپ کرتے ہیں! اور حسن جیسے نعمت کے ناجائز طور پر استعمال کرنے والے کو برا کہنے کا مدعی میں ہوں، اور رہونگا! کیا آپ کی رائے میں یا تو سب کو ایک لکڑی ہانکا جائے، یا کسی مستقل عشوہ فروش کو بھی غارت گرِ دین و ایمان نہ کہا جائے؟

شاہدان از آتشِ رخسار رنگیں مے دہم
زاہداں از رخنہا اندر دل و دیں کردہ اند۔

کسی امر میں عصمت کا وجود دریافت کرکے، آپنے واقعی ایک نرالی چیز کا اضافہ موجودہ ذخیرہ تحقیقات میں کیا ہے! سوال از آسمان و جواب از ریسماں! بالکل ایسی ہوئی جیسے کہ پوچھنے والا تو کسی علیگڈھ والے کا ذکر کر رہا ہو اور جواب دینے والا کسی سندھی یا کلکتے والی کی الاپ رہا ہو! جنابِ من! اگر ایک اصلی بحث کو چھوڑ کر یونہی ڈوبتے وقت آپ تنکے کا سہارا ڈھونڈھیں گے تو مجھے ڈر ہے آگے چل کر کہیں آپ امرادان باعصمت عفت کیطرح بہت سے چوروں کے ہاتھ قلم کرا دینے کا نادر شاہی حکم نہ صادر فرمائیں! بحث کو طول دینے کی گنجایش بہت ہے

مگر خیال صرف یہ ہے کہ کبھی بات کہیں سے کہیں نہ جا پہونچے؟

وفائے عہد نکو باشد ار بیاموزی
وگرنہ ہر کہ تو بینی ستمگری داند۔

"آزاد دنیا عورتوں کو پردہ میں رکھنے والوں کو بادلا کہتی ہے"؟ ضرور کہتی ہوگی! مگر پابند دنیا؟ پابند دنیا اون کے اس ناجائز آزادی پھیلانے کے جوش کو اُس دُم کٹی لومڑی کے بیکچر سے زیادہ باوقعت نہیں سمجھتی جس نے اپنی دم کھو بیٹھنے کے بعد ایک درخت سے بیٹھ لگا کر۔ دُم کٹے ہونے کا عیب چھپا کر۔ اپنے ہم عجبنوں کے سامنے نہایت فصیح و بلیغ تقریر میں دُم کے عیوب اور نقصانات ثابت کیے تھے! آزاد دنیا عصمت قایم رکھنے کے خیال کو اُمید موہوم اور خیال باطل سمجھتی ہے؟ ضرور سمجھتی ہوگی مگر پابند دنیا؟ تیرہ سو برس تک۔ تلوار کے سایہ میں ایک عالم کو بیچاد کھانے کے ساتھ، فلسفہ اور سائنس کا نشان بلند کیے ہوئے وحشیوں کو مہذب بنانے کے ساتھ اوسی خیال باطل یعنے عصمت کو قایم رکھ چکنے کے بعد اب آزاد دنیا کو اُس کے پوچ خیالات کی وجہ سے..... سمجھتی ہے!! اس طرح ہیر پھیر کر ناک پکڑنے سے کیا حاصل؟ صاف ہی فرما دیجئے تاکہ یہ بھی اور نئی باتوں کی طرح ایک کورانہ تقلید ہے! بیشک کورانہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ آڑے پائجامہ کا مذاق اوڑایا جائے اور جودھپوری برجیس کو سر پر رکھا جائے! شالی رومال کندھے پر ڈالنا یا گلے میں باندھنا عیب! لیکن رنگین مفلر باندھنا قطعی جائز! پرانی فیشن کی نیمہ آستین پھولدار یا شوخ رنگ پہننا قابل تضحیک لیکن شوخ سے شوخ اور نئے انداز کی فینسی ویسٹ استعمال کرنا عین تہذیب پردہ کی موجودگی میں کوئی مائل بآوارگی طبیعت اشاذ کالمعدوم کی طرح بھی کوئی مذموم حرکت کرے تو سب کو لتاڑ ڈالا جائے اور آزادی کی حالت میں جہاں کے

ڈیک پر یا جاکو کے ٹہلتے پر روزانہ تھینک یو کہنے کے موقع دیئے جائیں تو، شنیدہ کے بود مانند دیدہ، کہکر ایک ننھی سی۔ نہایت خفیف مسکراہٹ ظاہر کر دی جائے اور بس!

توبہ کا وہ کھلا ہونہ کر چھپ کے میکشی ۔۔۔ اے شیخ یہ طریقہ شرب الیہود ہے!

سب سے پہلے تو ایک مرید شک جادوگر کا سچا قصہ! پھر طوطا کہانی جیسی مستند تاریخ! واقعی قابل استدلال ہے! خیر اس کے صحیح تسلیم کر لینے سے بھی کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ بھی ایک ایسی عورت کی سرگذشت ہے جو بدذات تھی یا مائل بدکاری تھی! اور اس سے مجھے قطعی انکار نہیں ہے اور نہ یہ کہ بدذات عورت کو یا بدذات مرد کو، نہ پردہ ٹھیک کہہ سکتا ہے نہ قید کا خوف نیک بنا سکتا ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نادر مثال سے آپ نے طبقۂ درمیانی کی حالت پر کونسی روشنی ڈالی جو در اصل زیر بحث ہے؟ ایک ایسی نیک عورت جو فطرۃً نیک ہو۔ جو عصمت بی بی از بے چادری کی وجہ سے، جو اپنا جیسا مالدار اور معزز نہ ملنے کیوجہ سے، جو انگشت نمائی کے خوف سے، نیک نہو۔ بلکہ محض نیکی کی وجہ سے نیک ہو، جسکے دل میں نیکوکاری کی عظمت اس درجہ گھر کر گئی ہو وہ تمام عالم کی نگاہ سے چھپ کر بُرا کرنا بھی اپنی نگاہ میں حقیر و ناسمجھتی ہو، اور جان و ایمان سے زیادہ نہیں تو اسکے برابر ہی نیکی کی محض بالذاتہ نیکی کی۔ قدر کرتی ہو، بیشک کسی بدذات سے بدذات شیطان کے بہکانے میں بھی نہیں آسکتی! مگر ذرا سچائی کے ساتھ گننا تو شروع کیجئے کہ ایسی طبیعت اور ایسے خیالات کی عورتیں۔ جاہل اور غریب ہندوستان کو چھوڑیئے تہذیب یافتہ اور آزاد یورپ میں کتنی ہیں؟ ورنہ ہٹ دھرمی کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں ہے!! تعلیم نسواں کا بہانا سب سے بڑا بہانا ہے جو پردہ کے خلاف پیش کیا جاتا ہے، لیکن ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا گیا کہ پردہ اور تعلیم نسواں

میں آگ پانی کا بیر ہے! کیا تعلیم پردہ کی آغوشِ حمایت میں حاصل نہیں ہوسکتی؟ ہوسکتی ہے اور ضرور ہوسکتی ہے۔ البتہ ڈانسنگ اور میوزک نہیں سیکھا جاسکتا، ٹیلیگراف کا کام اور ٹائپ کی مشاقی نہیں آسکتی، موٹر دوڑانے اور لیڈیز ریس میں شامل ہونیکا موقع نہیں مل سکتا، اور ایروپلین پر سوار ہوکر حضرت عزرائیل تک کو اپنا کلمہ گو بنانا نصیب نہیں ہوسکتا! اگر یہی باتیں ترقی کی اصلی شان ہیں تو بخیر و شما بسلامت! بسم اللہ کسی کسی طرح زمانہ کو اس حد تک لے آیئے جبکہ کلب علی کی بجائے مسٹر کلبلی۔ اور صفیہ بنت رسول کی بجائے سوفیا رسل جلوہ گر نظر آنے لگیں، جبکہ ہندوستان وہ انڈیا ہوجائے جس کی تصویر سید محفوظ علی صاحب بی۔ اے (علیگ) نے جون کے اولڈ بوائے، میں شوہر کا انتخاب، والے مضمون میں کھینچی ہے! اپنی تہذیب، اپنا تمدن، اپنی قومیت اپنا مذہب، غرض ہر ایک اپنی خوبی غارت کر چکنے کے بعد ترقی کی امید کیجیے! حالانکہ رفتار زمانہ بتا رہی ہے کہ ترقی ان ہی کا حصہ ہے جو پتلون پر دھوتی کو اور ہیٹ پر پگڑی کو ترجیح دیتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں! سب سے زیادہ افسوس استبا کا ہے، کہ اپنی تمام چیزیں غارت کرنے کے بعد اگر ترقی نصیب بھی ہوئی تو وہ ترقی، آپ کی ترقی، ہماری ترقی، ہماری قوم کی ترقی، مسلمانان ہند کی ترقی کسی اعتبار سے نہیں کہی جاسکتی!

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے؟
آنکھ نرگس کی، دہن غنچہ کا، حیرت میری!

"عورت کی عصمت کی محافظ تہہ کی دیواریں یا مرد کی نگہبانی نہیں ہوسکتی"، قریب قریب بالکل بجا! لیکن لگے ہاتھ یہ بھی فرمادیجے کہ اس اٹھتی ہوئی عمر اور اس ناتجربہ کاری کے سن میں، جبکہ ایک دوشیزہ تربیت حاصل کر رہی ہو، علم حاصل کرنے کے ساتھ تجربہ اور مشاہدہ سے مؤثر ہو رہی ہو، تبادلۂ خیالات کا گہرا اثر بغیر محسوس کیے

رفتہ رفتہ قبول کر رہی ہو، اُس حالت اور اوس کیفیت میں، بُری نگاہ اور بُری صحبت سے بچانا ضروری ہے یا نہیں؟ اور سوقت نگہبانی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اوس عمر میں ہر صحبت اپنا اثر بہت جلد ڈال سکتی ہے یا نہیں؟ اور یہی اثر مدت العمر قایم رہنے والا۔ گہرا نقش ہوگا یا نہیں؟ اِن باتوں پر غور کیجئے تو یہ خیال رکھ کر غور کیجئے کہ بدذات مردوں کو جو بقول آپ کے پردہ کی موجودگی میں بھی ڈولی میں بیٹھکر بھی پہنچ جاتے ہیں قطعی آزادی حاصل ہے اور کوئی پردہ اون کے اور طبقۂ نسواں کے درمیان حائل نہیں اب فرمایئے کہ اِس نشست و برخاست کا، اس آمد و رفت کا، اور اِس تبادلۂ خیالات کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ تہذیب یافتہ چلتے پرزے ایسے بدذات نہیں ہیں کہ جو بادی النظر تو کجا کسی ارتکاب گناہ یا جنسہ گری سے پہلے پہچانے جاسکیں پردہ کو یہ سمجھنا کہ وہ طبقۂ نسواں کی طرف سے بدگمان ہونیکا نتیجہ ہے، آپکا ہی کام ہے! اسکو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ بُری صحبت، بُری نگاہ، اور زہر آلود باتوں سے بچنے کا سب سے آسان اور سب سے اچھا طریقہ ہے؟ اسکو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ طبقۂ نازک کو دنیا کی کشمکش سے بچانے اور پاجی دنیا کی وبائے متعدی جیسی حرکات سے محفوظ رکھنے کے لے حائل کیا گیا ہے؟ اور اسکو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ فرشتہ خصال خواتین نے بھیس بدلنے والے شیطان صفت، تعلیم یافتہ مردوں سے کنارہ کرنے کے لیے اختیار کیا ہے؟ ممکن ہے کہ آپ بلا تکلف فرمائیں کہ تعلیم دونوں طبقوں میں عام ہوجانے کے بعد ایسے بیہودہ خیالات اور ایسی آوارگی مفقود ہوجائے گی! لیکن افسوس کہ تجربہ اور مشاہدہ اِس کے خلاف ہے! کسی گناہ کی تعداد یورپ میں اسوقت بہ نسبت ایشیا کے کم ہونا تو کیسا برابر بھی نہیں ہے، یہ بات دوسری ہو کہ آزاد دنیا نے ارتکاب گناہ میں بھی بہت کچھ جدت پیدا

کرلی ہے! اب اگر زمین پر گر کر کسی بے گناہ کی گردن اڑانا تو گناہ سمجھا جائے اور نہایت نفیس میز پر لٹا کر ریوالور کے نذر کر دینا گناہ نہ تصور کیا جائے تو بیشک میں جھوٹا اور آپ سچے!!

جنابمن! تعلیم اور محض تعلیم کسی شخص کو نیک نہیں بنا سکتی! یہ انسان کو اپنے ارادوں میں کوشش کرنے اور خوبصورتی کے ساتھ انجام دینے کی قابلیت بہم پہونچا دیتی ہے: یہ ہر راستہ پر لیجانے کے لیے رہبر کا کام دے سکتی ہے! اب ارادوں کا اچھا یا برا ہونا، راستہ کا صحیح اور غلط ہونا اختیار کرنے والے کی پسند پر منحصر ہے! یہ چلتا ہوا ہتھیار حق اور ناحق دونوں کے گلہ کاٹنے میں ایک سی برّش دکھائے گا! جب تک کہ نیک صحبت کا قدم درمیان نہو، جب تک کہ تعلیم کے ساتھ تربیت اور صحبت کا خیال نہ رکھا جائے ایک انسان تنہا تعلیم کی وجہ سے نیکوکار اور راست باز نہیں بن سکتا! ایک اعلیٰ درجہ کی صحبت پانے والا جاہل، ایک بری صحبت میں رہنے والے تعلیم یافتہ سے ہر طرح بدرجہا بہتر ہے! اکبر اعظم اور محمد شاہ رنگیلے کا مقابلہ اس دعوے کی سچی اور کافی شہادت دے سکتا ہے! جنابمن، ہندوستان کے جاہل چوروں سے یورپ کے تعلیم یافتہ ڈاکو زیادہ خوفناک ہیں، اور ایک جاہل آوارہ گرد سے، ایک تہذیب یافتہ سٹیٹ جو تیرہ وروں ہو سوسائٹی کے لیے زیادہ نقصان رساں ہے! یہ علم کا سوٹ اور تہذیب کی ہیٹ لگائے والے شکاری۔ پردہ نشین خواتین کو چھوڑیے۔ ایسی عورتوں تک کو جو آلہو گاتھ کمیت ہوں اور اڑتی چڑیا کے پر گنتی ہوں، باتوں ہی باتوں میں پری کی طرح شیشہ میں اتار لیتے ہیں قبضہ میں کر لیتے ہیں اور بند کر دیتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی تمام دنیا کو کانٹوں میں گھسیٹنے کے لیے ناجائز آزادی کی منگل گاتے ہیں!

گویا ہاتھی کے دانت کہانے کے اور دکھانے کے اور!

اس نزاکت پر ہمارے قتل کا دعویٰ بہ خوش
دیکھئے! لیجئے خبر! وہ ہاتھ ہے خنجر گرا!!

اختتام کے قریب پونچکر آپ بہن کے روپ میں طنزیہ لہجے کے ساتھ فرماتے ہیں "ہم کوئی .... تھوڑا ہی ہیں جو ایسی باتوں میں آجائیں گے جنھوں نے اپنے بچوں کو مذہب چھوڑ کر انگریزی تعلیم ہی دینی شروع کر دی۔ ہم نے نہ اوسپر عمل کیا۔ اور نہ اسپر کریں گے ....." اس لیاقت سے بہرے ہوئے لبالب فقرے نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے قطعی حیرت زدہ اور ساکت کر دیا! بیشک ہم نے کبھی ہرگز مذہب چھوڑ تعلیم انگریزی حاصل کرنے کی تقلید نہیں کی، تا اب بفضلہ کرتے ہیں، اور یقین جانئے کہ نہ آیندہ کریں گے!! ہمارا فخر، ہماری جان، ہمارا برحق مذہب ہے! یہ مذہب ہمارے پھیپھڑے کی حرکت کے ساتھ دل میں حرکت کرتا ہے یہ مذہب ہمارے خون کی گردش کے ساتھ رگوں میں دوڑتا ہے اور یہ مذہب ہماری ہر چیز کا مالک بن کر ہماری ہستی پر حکمران ہے۔ یہ ہم سے نہ چھوٹا نہ چھوٹ سکتا ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ نہ کبھی کسی حالت میں چھوٹے گا!! ہم نے جو تعلیم حاصل کی، جو تمام عالم کی نظر خیرہ کر دینے والی ترقی حاصل کی، اس پاک اور سچے مذہب کے ظل حمایت میں اور اسی کا نشان بلند کیے ہوئے اور ہم جب کبھی پستی کے غار میں گرے، جب کبھی ناقابل بیان ردی حالت تک پونہچے تو بھی اسی مقدس مذہب کے احکامات سے منہ موڑنے سے اسی مذہب پر شگون پرستی، اور طرح طرح کی فضولیات کا رنگ چڑھانے سے، اور اسی مذہب کی صورت مسخ کر دینے کی وجہ سے!! کیا قوم کے مایۂ ناز لیڈر وہ جو اسوقت جسم و جان وقف کر چکنے کے بعد جنت میں براج رہے ہیں اور

وہ جو ہماری رہبری کے لیے زندہ ہیں اور ہم کو پہلے مسلمان اور پیچھے ہندوستانی بتاتے ہیں۔ ایسی ہی انگریزی تعلیم چاہتے ہیں جسمیں مذہب چھوڑنا پڑے؟ کیا ایسی ہی تعلیم کے لیے مرحوم بناض قوم نے علیگڈھ کالج کی بنا اپنا خون پسینہ ایک کرنے کے بعد ڈالی تھی، جہاں مذہبی تعلیم لازمی اور نقض مذہبی کا انجام دینا ضروری ہے؟ کیا ایسی ہی تعلیم کے لیے اسوقت ہمارے سربرآوردہ رہبران قوم یونیورسٹی کی امیدیں قوم کے آگے گداگری کر رہے ہیں؟ حاشا وکلا! اگر انگریزی تعلیم کے لیے مذہب اسلام چھوڑنے کا ذرہ برابر بھی خوف ہوتا تو سب سے پہلے جو شخص اسپر لات مارتا وہ سید علیہ الرحمۃ ہوتا! اور اگر سائنس اور علوم جدیدہ مذہب اسلام پر قایم رہکر حاصل نہ ہو سکتے تو جو گروہ اس کی مخالفت پر آستینیں چڑھا کر آمادہ ہوتا وہ ہمارے فدایان قوم کا گروہ ہوتا!! افسوس ہے کہ ایسے ہی فقرے جو تقریر اور تحریر میں ناعاقبت اندیشی کے ساتھ نکل جاتے ہیں قوم کے ناواقف گروہ میں غلط فہمی کی وبا پھیلاتے ہیں، اون کو برگشتہ کرتے ہیں اور مخالفین کو موقع دیتے ہیں کہ وہ بانی کالج کے عقائد اور تعلیم کالج کے اثر پر بری سے بری رائے لگا کر پبلک کے سامنے پیش کریں اور رنگ آمیزی کے ساتھ نکتہ چینی کریں!! میں اب بھی کسیطرح باور نہیں کر سکتا کہ آپ جیسے ریفارمر اور لائق شخص کا مفہوم اصلی وہی تھا جو یہ فقرہ بول رہا ہے!

بہکتے نہ تھے داغ یوں گفتگو میں
مگر پی گئے آج حضرت زیادہ؟!

سب کے آخر میں نہایت ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں! اگر کسی فقرہ یا کسی لفظ سے آنجناب کی دل شکنی ہو تو مہربانی فرما کر معاف کیجئے! کیونکہ

بخدا یہ مضمون میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ۔ مقصود اس سے قطع محبت نہیں محبی!
یقین مانئے کہ میں اپنے خیالات پردہ کی نسبت بدل ڈالنے کو تیار ہوں
بشرطیکہ میری رائے کی غلطی مجھے بتادی جائے! مگر کیا مجھے اب بھی یہ عرض
کرنے کی ضرورت ہے کہ میں جس پردہ کا حامی ہوں وہ تہر کی دیواروں والا
جیل یا طبقۂ نازک کی طرف سے بدگمان ہونے کا نتیجہ نہیں ہے؟ میں نے اپنے
اس مضمون میں بھی پردہ کے لفظ کا اطلاق ہر جگہ اوسی پردہ پر کیا ہے جسکی
تشریح میں کئی جگہ کرچکا ہوں آپ جو کچھ روشنی ڈالیں وہ ایسے ہی پردہ پر
ڈالیں جسکا میں حامی ہوں اور جسکو بالفاظ دیگر مذہبی پردہ کہا جاسکتا ہے،
ورنہ تضیع اوقات سے کیا حاصل؟ والسلام!

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بند آن مباش نشنید یا شنید

آپکا گستاخ مگر خیر اندیش بھائی
سلطان حیدر جوش (علیگ)

ابتک چونکہ رسالہ صرف قسم اول کا شائع ہو رہا تھا اس لئے قسم دوئم کے خریداروں کی خدمت میں بھی روانہ ہوتا تھا اس نمبر سے قسم دوئم شائع ہونا شروع ہوگیا اور یہ پرچہ قسم دوئم کے خریداروں کو دوئم قسم کا بھیجا جاتا ہے۔

مولوی عبدالرحمن صاحب (اسیف) مرحوم کی تصویر جو اس رسالہ کے ساتھ شائع ہو رہی ہے امید ہے اسلئے دلچسپی سے دیکھی جائیگی کہ مولانائے مرحوم سرزمین جہانآباد کی ایک آخری یادگار تھے۔ مولانا کے کلام کا نمونہ آیندہ پرچہ میں شائع ہوگا۔

علو ہمتی

ہے منزلِ مراد عزیز و بہت کٹھن — اِس راہ میں نہ پاؤ گے ہرگز کہیں امن
حائل کہیں پہاڑ کہیں جھیل اور بن — طے کر دو اس البیس کو بن کر نپولین
اور جولیس کی طرح سے دریا میں کود جاؤ

ہمت بلند ہے تو ہیں آسان مشکلیں — ہوں آفتیں اگر تو نظر آئیں راحتیں
ٹرکی کی فتح یاد ہے اے دوستو تمہیں؟ — پہیے لگا کے بیڑے چلائے تھے ریت میں
ہاں تم بھی بازوؤں میں غریمت کے پر لگاؤ

گر چاہو رکھے نام تمہارا زمانہ یاد — گر چاہتے ہو سچی خوشی اور سچی داد
ہاں اٹھو اور نفس پہ اپنے کرو جہاد — دریا کی تہ میں رکھا ہوا ہے در مراد
مردانہ وار غوطہ لگا کر نکال لاؤ

یہ کون زندگی ہے کہ مر مر کے تم جیو — کوسا کرو پڑے ہوئے اپنے نصیب کو
اور پست ہمتی پہ قناعت کیا کرو؟ — مفلس ذلیل و خوار ہمیشہ بنے رہو
در در پھرو سوال کرو اور دھکے کھاؤ

مرپٹ کے بی۔ اے پاس کیا آپ نے اگر — آزادی اپنی بیچ دی دو چار پیسوں پر
سروس ہی پر ہیں حوصلے حضرت کے مختصر — یہ پست ہمتی ہے دنائت ہے سر بسر
پرواز اپنی دوستو تم اور کچھ بڑھاؤ

سروس کو اے جناب جہنم میں بھیجئے — تعلیم اگر ملی ہے تو معرف بھی کیجئے
کچھ اختراع کیجئے ایجاد کیجئے — ہوں پاس کچھ روپے تو تجارت میں دیجئے
حرفت کو ہے ترقی ملکی سے اک لگاؤ

گر ہمتیں تمھاری یونہیں پست رہ گئیں دنیا میں پھر تمھارا ٹھکانا کہیں نہیں
اس صفحۂ وجود سے اے مسلم حزیں حرفِ غلط کی طرح نہ مٹ جاؤ تم کہیں
میدانِ کارزار میں کچھ دم کر دکھاؤ

ہاں ہاں بڑھے چلو اے جوانوں کے مرد میداں ترقیوں کا کھلا ہے وہ سامنے
دنیا کی شاہ راہ میں رہا ہی نہیں کے جو رک گئے گرے۔ جو گرے وہ کچل گئے
بائی سکل کی رسیں ہے پاؤں چلائے جاؤ

محمد مسلم عظیم آبادی

اس پرچہ کے ساتھ تمدن کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے رسالہ میں اس عرصہ نے جو کچھ کیا وہ ناظرین تمدن کو اچھی طرح معلوم ہے ملک و قوم کے متعدد اخبار و رسائل نے اسکی بابت جو کچھ لکھا اسکا اعادہ ہماری رائے میں محض فضول ہے توقع تھی کہ روشن خیال خواتین اور حامیان حقوق نسواں مرد تمدن کی اشاعت میں حتی الامکان مدد دینگے اور رسالہ جلد اس قابل ہوگا کہ وہ متعدد تصاویر شائع کر سکے مگر افسوس سوا دو چار کے کسی نے اسطرف توجہ نہ فرمائی اور تمدن بجائے اس کے کہ پہلی خشتہای کے بعد اپنا خرچ خود نکال لینا اس قابل بھی نہ ہوا کہ اپنے مصارف کا ایک حصہ بھی پورا کر سکے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمدن ان ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے کہ اگر انہیں سے چند بھی اسکی ضرورت کو محسوس فرما لیں تو رسالہ بہت جلد ترقی کر جائے اور ہم تو اسی لئے صرف اپنے چند ناظرین کو یہ تکلیف دیتے ہیں کہ اگر وہ دو دو خریدار بھی فراہم کر دیں تو تمدن بہت جلد ہمکو اپنے بار سے سبکدوش کر کے اُردو علم ادب کی خدمت کے علاوہ تمدن کا چونکہ بڑا مقصد تحفظ حقوق نسواں ہے اسلیے ہمیں یقین ہے کہ ہم جن ناظرین کی خدمت میں یہ کارڈ روانہ کرتے ہیں وہ اسکی خانہ پری کر کے واپس فرما دیں گے۔

اکتوبر کا پرچہ خصوصیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ جو حتی الوسع بہترین اہل قلم کے خیالات سے مزین ہے اور جسکا پہلا مضمون غالباً شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کا ہوگا

منیجر تمدن و عصمت۔ دہلی

یتیم بچے

ذرا تو نرماؤ دل کو پیارو یتیم بچے بلک رہے ہیں
اُٹھا لو گودوں میں ان کو پیارو تمھارے منہ کو یہ تک رہے ہیں

لگا لو چھاتی سے انکو لیکر بٹھا لو انکو دلوں کے اندر
یہ ننھے ننھے سے ہاتھ تم پر اوٹھا اوٹھا کر جھک رہے ہیں

نہ دست و بازو میں انکی قوت نہ دوسروں سے اُمید شفقت
پدر کی الفت نہ ماں کی چاہت اِدھر میں گویا لٹک رہی ہیں

عدوے دیں انکی تاک میں ہیں ہمیشہ فکر ہلاک میں ہیں
بچاؤ ان کو کہ راہ انکی بہت سے قزاق تک رہے ہیں

ہمارے دامن میں ہیں جو گوہر وہ ہم کو ایسے ہوئے ہیں دُوبھر
ہم اپنے دامن جھٹک رہے ہیں رقیب اونکو لپک رہے ہیں

جہانیں قوام ہیں رنج و راحت نہیں خزاں کی کوئی شکایت
چنے ہیں غیروں نے پھول اپنے یہ ہیں کانٹے کھٹک رہے ہیں

ہے باغ اسلام یونہیں ویراں اور ایسا ہونے میں یہ ستم یہاں
کھلی ہیں قسمت سے کچھ جو کلیاں اُنہیں بھی ظالم چٹک رہے ہیں

یہ عرش اسلام کے ستارے تمھارے پیارے نبی کے پیارے
ڈرو خدا سے کہ یوں بچارے بلک رہے ہیں سسک رہے ہیں

یتیمخانہ میں کوئی دیکھے کہ بچہ کرتے ہیں کیا تماشے
یہ بولتے ہیں کچھ اسطرح سے کہ جیسے بلبل چہک رہے ہیں

یتیم بچوں کا ایک شیدا بیان کرتا ہے اُن دکھڑوں کا جو کہ اُن کے دل سے اور اُن کے دیدا اور اشک پے پے ٹپک رہے ہیں اس پر کرم اسد خاں شیدا

شرارت

لندن کے ایک اخبار میں "شرارت" کے عنوان سے ایک مختصر سا آرٹیکل لکھا ہوا تھا جسکو پڑھکر مینے بجز ترجمہ کرنے کے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ آرٹیکل ہمارے شہنشاہ ذیجاہ کنگ ایمپرر جارج پنجم دام اقبالہٗ کے بچپن کی ایک بامزہ شرارت کا اظہار کرتا ہے مشہور ہے کہ شہنشاہ ذی اقبال کو زمانہ طفولیت میں شرارت و ظرافت میں بھی کمال حاصل تھا۔

"شہزادہ جارج کی شرارتوں میں اس واقعہ کی مثال بہت کم ملے گی جو انہوں نے اپنی دادی صاحبہ یعنی ملکہ معظمہ کوین وکٹوریہ مرحومہ کے زمانہ میں کی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی شرارت پر کوین نے اُس سے باز آنے کیلئے انہیں سزا دھمکا کر کہا "چلو اس میز کے نیچے جاؤ اور جبتک کہ تم درست نہو جاؤ باہر نہ آؤ" اس حکم کے سنتے ہی تنہا سا خوبصورت بچہ میز کے نیچے آہستہ سے دبک دبکا کر گھس گیا اور دادی صاحبہ اسی میز پر اپنے کام میں مشغول ہوگئیں بہت دیر ہوگئی دادی صاحبہ نے پوچھا کہ "کیوں میاں درست ہوگئے؟" نیچے سے آواز آئی "ابھی نہیں جناب" اس ارادہ کے پکے ننھے اور خوبصورت بچہ کا جواب سنکر دادی صاحبہ کو بہت تعجب ہوا اور محبت مادری نے مجبور کردیا کہ اب اسکو اس کی سچائی پر زیادہ دیر تک اس سزا میں نہ رکھنا چاہیئے مگر عاقل دور اندیش بادشاہ بیگم اپنے فطری ضبط کو کام میں لاکر اسیطرح اپنے کام یعنی لکھنے میں مشغول ہوگئیں اور جبتک کہ دوسری آواز نہ آئی خاموش رہیں جب نیچے سے خود بخود یہ آواز آئی کہ "اب میں درست ہوگیا" تو فرمایا کہ "اچھا تم اب باہر آسکتے ہو" جب حضرت نے اس حکم کی تعمیل فرمائی اور باہر تشریف لائے تو بالکل اسی قدرتی لباس میں جس میں وقت پیدائش ملبوس تھے یعنی ننگے سنگے"۔

ابو حامد سید محمد حامد۔ مہدوی

راحت زمانی

مولوی سیّد احمدؒ صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سرنو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے۔ قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنیکو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر)

راحت زمانی

مولوی سید احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سود مند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنیکو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت انجمنی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالرشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)
ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر)

عصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کوا سی لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق فریق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائے گا۔ کہ کوارپتے کی زندگی اُن کو کس طرح گزاری ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو قیتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کرادینے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں +

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جنسے یہ بچے پل بلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کیسا بنانا کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیو نکی سچ مچ کی بیگم بنائے گا +

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ہر میں (۶۴) صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں۔ سالانہ قیمت (چھ)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

جلد ۱ — دویم — اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء — نمبر ۱

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبدالراشد الخیری

:- فہرست مضامین :-

تصویر۔ پروفیسر سر زاموئل کوئلر صاحب شیرازی — چاند سے سبق۔ مولوی نیاز محمد خانصاحب نیاز فتحپوری۔ ۳۶
مسلمان اور عیسائی۔ شمس العلما مولوی حافظ محمد نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی اوایل ۱ — مہتدی باللہ۔ منشی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی۔ ۳۷
حضرت علامہ بلگرامی۔ مولوی میر زاحمد داؤدی صاحب عزیز لکھنوی۔ ۹ — حقیر نذر۔ بنت نذر الباقر صاحبہ ۴۶
یونیورسٹی۔ پروفیسر شتاق احمد صاحب اہوی۔ بی۔ اے ۱۱ — ترانۂ بہار۔ مولوی عبدالواحد صاحب نالطی۔ ۴۹
تصویر و پیپ خط میر اعصام الدین احمد صاحب فیروز ۲۱ — شرع کا خون۔ محمد عبدالراشد الخیری ۵۰
ریاست بھوپال۔ مولوی رشید احمد صاحب ارشد تہانوی ۲۴ — قطعہ۔ مولوی ضیاعلی صاحب۔ وحشت ۶۸
اسمبل۔ مولوی محمد سیف الدین صاحب بشاب۔ ۳۲ — تاریخ بیجانگر — ریویو ۶۹
نہ عبرت۔ زہرا بیگم فیضی صاحبہ۔ ۳۳ — خون شہدا کی نذر — ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی سی ۷۰
کوہ علم۔ محمد مسلم صاحب عظیم آبادی
(بقلم) محمد عبدالراشد الخیری — تازہ غزلیں حضرت ارشد ۷۲

(کتابت)۔ قسم اول ۱۳۲۹ھ سے قسم دوم تک تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ (۴ر)
کتبہ احقر ابوظفر حامد میرزا دہلوی

تمدن

یہ ۷۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں

تمدن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پونہچانا ہے۔

تمدن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالیٹکس سے علٰحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز دبنیں ہو سکتا کہ تمدن اس سے متفق الرائے نہیں ہے

تمدن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں ٭

تمدن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دویم باتصویر شائع ہوگا۔ قیمت قسم اول ۱؎ ہے قسم دوئم ۱؎ ۔ نمونہ کا پرچہ (۰۴)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنہوں تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا مولوی سید عبدالعزیز صاحب لکھنؤ۔ منشی نواحمد صاحب شاہ گنج۔ مولوی سیف الدین صاحب شباب بنت نذر الباقر صاحبہ۔ محمد عبدالحمید خانصاحب اٰمادہ۔ ابو حامد سید محمد صاحب مہدوی منشی میر حسن صاحب ٹمکور۔ سید ظفر حسن صاحب سبزواری۔ مولوی فیض محمد خانصاحب انسپکٹر سید رضا حیدر صاحب رضوی منشی محمد حفیظ اللہ صاحب ضلعدار۔ مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل۔ بابو جینی لال صاحب سخن۔ سید اختر علی صاحب حزیں۔ مولوی محمد لطیف صاحب بی۔ اے سلطانپور۔ صاحبزادہ وحید احمد صاحب فاروقی۔ ڈاکٹر سلیمان خانصاحب شموگہ۔ سید حشمت علی صاحب گونا۔ منشی محمد محسن صاحب میرٹھ۔ شیخ احمد حسن صاحب۔

تمدن

مسلمان اور عیسائی

(شمس العلماء مولوی حافظ محمد نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی - ڈی - او ایل)

ہندو مسلمانوں میں تو مثل مشہور ہے کہ چولی دامن کا ساتھ ہے ایک کی ایک کے بدون گزر نہیں سکتی اور حکومت بھی دونوں کو سازگاری اور صلح کاری پر مجبور کرتی ہے۔ فریقین کے ناعاقبت اندیش تنگ چشموں نے رسم و راہ کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مخالفت کا رنگ دیکر دونوں میں ایک طرح کی منافرۃ پیدا کردی ہے مگر ہم اسکو دیرپا منافرۃ نہیں سمجھتے اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نے ماند۔ اور سمجھدار لوگوں نے اسکا توڑ بھی شروع کردیا ہے کوئی دن جاتا ہے کہ بعض اخبار جو اس آگ کو بھڑکاتے رہتے ہیں خود بند ہو جائیں گے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہم کو انگریزوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ خدا نے انکو ہم پر مسلط کیا ہے

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

بادشاہ و رعیت یا حاکم و محکوم کا رشتہ اس قسم کا رشتہ ہے کہ جب تک ایک کا

دوسرے پر پورا پورا بھروسہ اعتماد نہو کوئی بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا نہ بادشاہ اور نہ رعیت۔ ۵

رعیت جوہیچ است وسلطاں درخت درخت اے پسر باشد از بیخ سخت۔

یعنے بادشاہ ورعیت اور عالم ومحکوم کے درمیان میں کسی طرح کی اجنبیت نہیں آنی چاہیئے اجنبیت آئی اور عافیت مفقود ہوئی۔ بڑی مطمن سلطنت وہ سلطنت ہے جس میں بادشاہ اور رعیت میں دوئی نہو۔ رعیت سمجھے کہ ہمیں رعیت ہیں اور یہ ہیں بادشاہ۔ بادشاہ یہ سمجھے کہ میں بھی انہیں جیسا آدمی ہوں رنج وراحت کا احساس جیسا ان کو ویسا مجھکو۔ ہمارے ہندوستان کی انگریزی سلطنت میں مشکل یہ آکر پڑی ہے کہ بادشاہ سلامت تو رہے بجائے خود ہزاروں کوس دور حکام جو ان کے قائم مقام ہیں اور رعایا کو انہیں سے واسطہ پڑتا ہے اور عملاً یہی بادشاہ ہیں انکا حال یہ ہے کہ گو انکو رعایا کے ساتھ نہ کسی طرح کا اتحاد ہے اور نہ ہوسکتا ہے اور اتحاد ہو تو کیونکر ہو۔ نہ وطن ایک نہ زبان ایک نہ طرز تمدن ایک نہ رسم وراہ ایک اور بڑی بات یہ ہے کہ نہ مذہب ایک۔ ہاں کچھ یوں ہی سہی انسانیت میں ایک ہیں۔ جو دونوں میں سے کسی ایک کے اختیار کی بات نہیں پھر بھی وہ اپنی طرف سے رعیت کی دلجوئی میں لگے لپٹے رہتے ہیں۔ رہے بادشاہ سو خدا کے فضل سے بادشاہ تو تین تین پشت سے ہم دیکھ رہے ہیں ایسے نیک دل ہیں کہ رعایا کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش میں لگے ہیں اور ان کی سعی بہت کچھ مشکور بھی ہوئی ہے کچھ کور کسر باقی ہے تو رعایا کا اپنا قصور ہے تعلیم عام نہیں کہ بادشاہ اور رعایا دونو گھر شاد وآباد ہوں سرکار تو تعلیم کی لائن میں برسوں سے ہر سال لاکھوں روپیہ صرف کر رہی ہے اب ہندوستان کے دن کچھ بھلے آتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ مسلمانوں میں بھی

جو سب سے پھسڈی تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے گدگدی پیدا ہوگئی ہے یہ مثل کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی مستعمل تو لڑائی کے مواقع میں ہے کہ دو لڑنے والوں کی شرکت کے بدون لڑائی ہو نہیں سکتی۔ مگر دوستی پر بھی صادق آتی ہے۔ کہ فریقین کے ایک دوسرے کی طرف میلان کے بدون دوستی بھی نہیں ہو سکتی تو باوجودیکہ رعایا اور انگریزوں میں اجنبیت اور مغایرۃ کی وجوہ متعدد ہیں جو دونوں میں اتحاد کے پیدا ہونے کی مانع ہیں پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز اپنی برتری کو لیئے ہوئے جو لازمۂ سلطنت و حکومت ہے، رعایا کی دلجوئی کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں مگر رعایا کا حال یہ ہے کہ محتاج اور مغلوب ہونے پر بھی اپنی جگہ اکڑے ہی رہتے ہیں۔

محتاجی کی یہ نوبت ہے بڑے کاموں کی تو کون کہے سوئی بیچک دیوا سلائی چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں میں انگریزوں کے دست نگر۔ رعایا کی سرکشی کی ایک مثال سمجھ میں آتی ہے کہ جیسے چند مچھروں کے سر میں یہ خبط سمایا کہ انہوں نے ایک مکان تاکا۔ کہ اس کے مکین کو مکان سے بے دخل کریں رات کو مکین سویا اور مچھروں نے کاٹنا شروع کیا۔ مکین نے سوتے سوتے ایک چلتا سا ہاتھ مارا کتنوں کا تو وہیں چینچلا نکل گیا اور کتنے بھن بھن کرتے بھاگ کھڑے ہوئے مہم ختم ہوئی۔ ہم کو دوسری قوموں سے کچھ بحث نہیں۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا پھر یگا۔ ہمکو تو مسلمانوں کی پڑی ہے اور مسلمانوں میں سے بھی اُن کی جو مذہبًا انگریزوں کے ساتھ تیز میز رکھتے ہیں کہ اُن کے اس برتاؤ سے اسلام ناحق بدنام اور مبغوض عند الحکام ہوتا ہے اور اسکا ضرر عاجل سب مسلمانوں کو پہونچتا ہے۔

چو از قومی یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

نہ می بینی کہ گاوے و علف زار بیالاید ہمہ گاوان دہ را۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام اور عیسائیت کے بعض معتقدات میں تخالف ہے اور اس تخالف کا رفع ہونا عادتاً محال۔ مگر ایک سرزمین ہندوستان میں جگہ دینے سے انگریزوں کو حاکم ہونے کے لحاظ سے اور مسلمانوں کو رعایا ہونے کے اعتبار سے خدا کا منشا بھی ایسا ہی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مل جل کر رہیں لوگ تو انگریز ہوں یا ہندوستانی مذہبی باتوں میں کتر اعمال فکر کرتے ہیں۔ پادریوں نے عیسائیت کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ اور مولویوں نے اسلام کا دنیا ہے کہ قرآن پر ظلم کر رہی ہے۔ نامسلم تو اسوجہ سے کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے اسلام کی برائی سن پائی ہے۔ اعقاب میں کہ خود تو تحقیق کی توفیق نہیں اسی لکیر کو پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ انا وجدنا اباءنا علی امتہ وانا علی اثارھم مھتدون۔ دنیا کے کاموں کے لیے فرہاد دار پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانی پڑے تو آستینیں چڑھا کر موجود۔ مذہب خدا کا کام ہے کون بیٹھے بٹھائے تحقیق کا درد سر لے اختلاف مذاہب کے ہوتے جیسا کہ دنیا میں ہے میں تو جانتا ہوں کہ کوئی فرد بشر غفلت کے الزام سے بری نہیں ورنہ کون اپنی چھاچھ کو کھٹا کہا کرتا ہے +

اگر کوئی اپنی سی کر کے کسی مذہب کی طرف سے مطمئن ہو لیا ہے تو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا قرآن کی بڑی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے کہ انکا اصل دین اور دستور العمل شریعت قرآن ہے۔ اور ہم نے کہا کہ مسلمان ہی قرآن پر ظلم کرتے ہیں تو مسلمانوں کا ظلم قرآن پر یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے مطالب سے قطع نظر کر رکھا ہے جو کچھ انکو تعلق ہے لفظوں سے ہے بے فہم معنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان اسلامی اخلاق پر قائم نہیں رہے۔ ہماری اوپر کی تحریر سے

شبہ ہوسکتا ہے کہ مسلمان انگریزوں سے ظاہر میں نہیں تو باطن میں کشیدہ ہیں اور ان کی یہ کشیدگی اسلام کی تعلیم ہے۔ حاشا و کلّا کہ ہمارا یہ مقصد ہو۔ بڑے سخت امتحانوں میں مسلمان ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک کفش دادہ وفاداری گورنمنٹ کا ناممکن التردید ثبوت دے چکے ہیں اور اب بھی اسی جادۂ مستقیم وفاداری پر ثابت قدم ہیں ہمارا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے اگر کچھ نہفتہ کشیدگی ہو بھی تو یہ نہ مذہبی حکم ہے نہ اسلامی تعلیم۔ اور اگر کوئی متعصب (اور سات کروڑ مسلمانوں میں سو دو سو متعصب ہوئے بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے) غرض کوئی مسلمان متعصب ایسا سمجھتا ہو تو اسی کو ہم جاہل کہتے ہیں کہ اس نے قرآن کو تحقیق سے نہیں پڑھا۔ اس نے لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاری سے انتم سکاری کو چھوڑ دیا اور کلوا واشربوا سے لا تسرفوا کو۔ جیسا کہ ایک شاعر استہزاءً کہتا ہے ؎

لا تقربوا الصلوٰۃ زینہم بخاطر است

وز امر باد ماندہ کلوا واشربوا مرا

اب تو الحمد للہ احسن المؤیدین بات کچھ دبا گئی ہے۔ چالیس پینتالیس برس پہلے کے سے نہ مولوی رہے نہ مسلمان۔ بھولی بسری باتوں کا تذکرہ سرد بستاں یاد دہانیدن ہے مگر منہ پر آئی ہوئی بات کہنی ہی پڑتی ہے۔ ایک وقت وہ تھے کہ انگریزی پڑھنا کفر تھا۔ انگریزی نوکری حرام اور اسی طرح کی اور لغویات جن کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور طرفہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ بر بنائے تعلیم اسلام۔

لیکن اگر مسلمانوں نے بادل ناخواستہ اپنی رائے بدلی ہے تو یہ صریح نفاق ہے اور اسکا کچھ اعتبار نہیں اور گورنمنٹ کو انکی طرف سے ہرگز مطمئن نہ ہنا نہیں چاہئے

اور اگر سمجھ بوجھ کر تحقیقات کے بعد یہ طریق اختیار کیا ہے تو چشم ما اور چشم گورنمنٹ روشن و دل ما و دل گورنمنٹ شاد۔ کہ یہی ہمارا بھی مسلک ہے۔ انگریزوں کا تو قرآن میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ہاں نصاریٰ کا ہے اور کئی جگہ ہے اور اون کی مذہبی حیثیت سے ہے۔ نصاریٰ کے ساتھ میل جول کے متعلق بہ نظر ظاہر قرآن میں متناقص احکام ہیں۔ اجازت بھی ہے اور ممانعت بھی دیکھنا یہ ہے کہ اجازت کے ساتھ ممانعت کیوں ہے؟

پیغمبر صاحب نے لوگوں کو دین اسلام کی تعلیم کر کے مسلمانوں کی ایک نئی جماعت بنائی اور ازبسکہ اسلام میں بڑی شد و مد کے ساتھ عقیدۂ توحید کی تاکید اور تائید تھی مسلمانوں کے مذہبی عقائد یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کسی سے نہیں ملتے تھے ہر چند پیغمبر صاحب نے ہر طرح کی دلیلوں سے قائل کیا معدودے چند ایمان لائے۔ باقی سارا ملک دشمنی پر کمربستہ ہو گیا۔ جب تک مسلمانوں کا گروہ تھوڑا اور کمزور رہا مخالفوں نے ایذا دہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مسلمان اس پر بھی صبر اور درگذر کرتے اور نرمی اور ملائمت سے سمجھاتے رہے مگر لاتوں کے بھوت باتوں سے کب ماننے والے تھے آخر اتنے میں مسلمان بھی قوۃ پکڑ گئے اور جواب ترکی بہ ترکی دینے لگے غرض لڑائی ٹھن گئی اور جیسا قاعدہ ہے اس کا سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔ ظاہر بات ہے کہ جب دو گروہوں میں لڑائی ہو رہی ہو اور لڑائی بھی زبانی تو تو مَیں مَیں نہیں تلوار کی لڑائی یعنی ایک دوسرے کی جان کا خواہاں ایسی حالت میں ایک گروہ کے آدمی کو دوسرے گروہ کے کسی آدمی سے دوستی رکھنا اپنے گروہ کی تباہی کے درپے ہونا ہے پس یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ رکھنے کا حکم اس خاص وقت اور خاص حالت کے

لیے تھا یہ ایک طرح کے فوجی انتظام ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم کو کرنے پڑتے ہیں اور دنیا کے لڑائی جھگڑوں سے متعلق ہیں رہی مذہبی دشمنی یعنے اختلاف عقائد وہ بالکل دوسری بات ہے اور اسکو دنیاوی معاملات میں دخل دینے کی کچھ ضرورت نہیں۔

قرآن کے صداقۃ کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس اجازۃ اور ممانعۃ کا اختلاف رفع کریں کہ یہ بہت بڑا اعتراض ہے جو مسلمانوں پر وارد ہو سکتا ہے مگر ہم مسلمان یعنی ہم میں کے مولوی جن کا یہ کام ہے رفع اختلاف کی جگہ اسکو جاہل مسلمانوں کے دلیں اور مستحکم کرتے ہیں اور نتیجے کو نہیں سمجھتے۔ کہ دنیا کے ساتھ مسلمانوں کا دین بھی غارۃ ہو رہا ہے اگر اسکا خوف نہوتا کہ یہ تحریر طول پکڑ کر مناظرہ کا رسالہ ہو جائیگی تو ہم اسی ایک مسئلے پر بہت کچھ لکھتے ورنہ یوں تو ہم نے اب سے گیارہ بارہ برس پہلے اپنے چھپے ہوئے ترجمہ قرآن کی (جس کی اسوقت تک خدا کے فضل سے پچاس ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہو چکے ہیں) آیۃ یاایھا الذین امنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء پر حاشیہ لکھا اور وہ رفع اختلاف کے لیے بس کرتا تھا۔ نہیں معلوم ہمارے اس حاشیے کا اثر ہے یا تقاضائے وقت کا کہ اب تو وہ تو تو میں میں سننے میں نہیں آتی۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ تقاضائے وقت ہی کا اثر ہوگا ورنہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے ہم کو تو گوارا نہیں کہ مذہب اسلام میں کسی جگہ پانی مرتا دیکھیں اور اس رخنے کو بند نہ کریں اس لاتتخذوا الیھود کے حاشیے کے ساتھ ایک بات اور بھی لکھنے کی ہے کہ پیغمبر صاحب اور صحابہ سے

بہتر اور کون قرآن سمجھ سکتا ہے اور کون ان سے بہتر قرآن پر عمل کر سکتا تھا۔
اجازۃ اور ممانعۃ دونوں قسم کی آیتیں نازل ہوتی رہتی تھیں باایں ہمہ پیغمبر صاحب کا
عمل درآمد اس پر تھا کہ نصاریٰ نجران جو وفد نجران کے نام سے مشہور ہیں پیغمبر
صاحب کے ہاں مہمان آئے پیغمبر صاحب نے انکو مسجد نبوی میں ٹھیرایا اور وہیں
انکو ان کے طور پر نماز پڑھنے کی اجازۃ دی وہ لوگ جیسے نصاریٰ آئے
تھے ویسے ہی نصاریٰ رخصت ہوئے یہ اجازۃ پر عمل درآمد تھا یا ممانعۃ پر۔ ایک
میل جول تو غیر مذہب نصاریٰ کے ساتھ وہ تھا یا اب ہماری اسی دلی میں
یہ حال ہے کہ متقلد مسلمانوں نے اپنی مسجدیں الگ کر رکھی ہیں اہل حدیث
کو اپنی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھنے دیتے اگر بے خبری میں کوئی پڑھ جاوے
تو فوجداریاں ہوتی ہیں اور فرش مسجد دھویا جاتا ہے۔ جب مسلمان ایسے کھل کر
ہیں کہ ان کے آپس میں ایک کی ایک سے نہیں بنتی کوئی غیر مذہب والا انکی
اجنبیت کی کیا پروا کر سکتا ہے نصاریٰ کے ساتھ پیغمبر صاحب کے میل جول
کی ایک مثال اور لیجئے جب پیغمبر صاحب نے اسلام کی منادی شروع کی تو ان کے
ہم قوم ہم قبیلہ قریش نے جو بڑے شورہ پشت اور تمام مکے پر غالب تھے
خود پیغمبر صاحب کو اور ان کے گنتی کے چند رفقا کو جو مسلمان ہو گئے
تھے بیہودگی کے ساتھ طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ پیغمبر صاحب اپنے چچا ابوطالب
کی وجہ سے جو اس وقت رئیس قریش تھے کسیقدر محفوظ بھی تھے مگر نو مسلموں کی
کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے تھے ناچار آپنے مسلمانوں کو حکم دیا کہ نجاشی بادشاہ حبشہ
کی عملداری میں جا بسیں کہ گو وہ عیسائی ہے مگر منصف اور رعیۃ پرور ہے۔ چنانچہ
مرد و زن تیاسی مسلمان ہجرۃ کر کے حبشے چلے گئے۔ مہاجرین میں پیغمبر صاحب کی
صاحبزادی رقیہ اور ان کے شوہر حضرت عثمان بھی تھے۔ یہ تھا اعتماد کامل جو پیغمبر صاحب نے

نجاشی پر اس کے عیسائی ہونے کی وجہ سے کیا قریب قریب ایسی ہی صورت اب درپیش ہے کہ مسندوں پر انگریزوں کی سلطنت ہے اور ہم مسلمان ستاسن اور بطلمیوس ہیں کہ صادق نہیں ۔

مرثیہ علامہ بلگرامی

کیسی خوش قسمت ہے تو گورِ غریباں کی زمیں
عالم ہستی کو تجھ سے رشک کچھ بیجا نہیں

چوکھٹے میں تیرے جو تصویر ہے نایاب ہے
ہے مربع میں ترے جو نقش وہ بے نقش ہیں

دامنِ ہستی سے تو نے چن لیے خوشرنگ پھول
درخورِ محفل ترے بس اک نہیں ہیں تو ہمیں

یہ طلسمی تیرا شیرازہ کہلیگا ایک دن
اے زمیں ہر ذرہ تیرا ہوگا صورت آفریں

سچ بتا دیکھے تو ہیں تو نے شکستہ مصر کے
کیا نظر آیا ہے تجھکو اے نگاہِ دور بیں؟

ہڈیوں کے جا بجا ڈھانچے نظر آئے ہیں جب
کیا اثر تو نے لیا ہے اے دلِ اندوہگیں؟

باعثِ جمعیتِ خاطر تھیں جتنی صورتیں
اک نشانہ ہو گیا ہے وہ کہیں ہیں ہم کہیں

چاند سا مکھڑا کہاں وہ قبر کا ظلمت کدہ
ڈھیر مٹی کا کہاں مرغولۂ زلفِ عنبریں

تھا یہی آئینہ خانہ تیرا اے حسنِ صبیح؟
تھی یہی زینت کی جا کیا اے عذارِ آتشیں؟

تھی یہی تیری نقابِ اعارضِ گیتی فروز؟
تھی یہی چھپنے کی جا کیا اے نگاہِ شرمگیں؟

اے دماغِ عرش پیما تیرا مسکن تھا یہی؟
تھی یہی خلوت تری کیا اے دلِ غربت گزیں؟

تھا یہی مرجع تمہارا اے حکیمانِ کہن؟
تھا یہی حسن التآب اے عالمانِ باتمکیں؟

تھی یہی کیا خاک کی بستی تمہارا مستقر؟
کچھ بتاؤ اے علوم اولین و آخریں۔

اس خرابی میں کہو کیونکر بسر کرتے ہو تم
کون ہیں اصحابِ صحبت؟ کون ہیں اب ہمنشیں؟

کیا ہوئی وہ فلسفہ دانی تمہاری کیا ہوئی؟
ذوقِ تحقیقِ علل میں اب وہ عالم کیوں نہیں

ہیں کتبخانے نہ تصنیفات کے وہ مشعلے
ہے نہ تحقیقِ جدید اب وہ نہ وہ رائے رزیں

تم نے ثابت کی تھی ہر ذرہ میں اک روح رواں
تم نے دکھلادی تھی ہر منکر کو رفتارِ زمیں

اب اوہیں ذرات میں پیکر تمہارا مل گیا — اب اوسی رفتار کا پامال ہے جسم حزیں
طبقہ گورِ غریباں کے ہر اک ذرہ کو دیکھ — ناز کر اجرام پر اپنے زہے چرخِ بریں
تو ہی کچھ انصاف کر اے گردشِ لیل و نہار — تھی یہی کیا انکی منزل جسمیں اب ہیں یہ مکیں
یہ نہ تھی تیری جگہ علامہ سید علی — تھا ترے شایان شان قصرِ سپہر ہفتمیں
اے گروہِ اہلِ اسلام! اے دیارِ بلگرام! — ہے ترا سرمایۂ ناز آہ اب زیرِ زمیں!
مجلسِ علمی میں خالی ہو گئی تیری جگہ — کون ہے اس منزلت کا جو ہو تیرا جانشیں
تیرے علمی کارنامے صفحۂ دنیا پہ ہیں — تو مگر کس گوشۂ خلوت میں ہے غربت گزیں
تیرا ماتم ہر زباں میں تیرا غم ہر بزم میں — تو مگر ہے محوِ سیرِ گلشنِ خلد بریں
کچھ عدم کے ملک کا طرزِ تمدن ہے یہی؟ — کچھ بتا رہتی ہیں کیونکر اس خرابے کے مکیں؟
انتقالِ پیکرِ خاکی ہے صرف اک انقلاب — مرنیوالے زندۂ جاوید ہے تو بالیقیں
اپنی تصنیفات کے صفحوں میں ہے تو جلوہ گر — دیکھنے والے تجھے دیکھیں گے تا روزِ پسیں
چاہیئے ایسی ترقی۔ مرحبا صد مرحبا — یوں رہے زندہ جہاں میں آفرینِ صد آفریں
فخر گیتی تو نے اس دنیا سے منہ موڑا ہے جب — دفترِ عبرت تھی وہ تیری نگاہِ دوربیں
منزلِ عقبےٰ کے ساکن وقت وہ بھی ہے عجب — ملنے والے تجھ سے اکدن آکے مل لینگے وہیں
اے زمانے! اسلکِ اہلِ علم میں جو فرد تھا — کھو گیا ہاتھوں سے تیرے آج وہ دُرِ ثمیں
دیدۂ خونابہ افشاں یہ تلاطم تا کے — جوش کر یہ سیلِ کف سیلاب ہے، اب آستیں

ملک کی بیدار مغزی سے یقیں تو ہے عزیز
یادگارِ راسخی کرسی قائم یہ قوم دلخریں

میرزا محمد ہادی۔ عزیز لکھنوی

یونیورسٹی

پروفیسر زاہدی نے جو ذیل کے مضمون میں آغاز یونیورسٹی پر روشنی ڈالی ہے اس سے اُن بہت سے اعتراضات کا جواب ملتا ہے جو بعض ناعاقبت اندیش مگر نام کے بہی خواہان قوم چند انگریزی اخباروں میں مسلم و ہندو مذہبی یونیورسٹیز پر کر رہے ہیں۔ مذہب کو بیسویں صدی کے اہل ہند ایسا ہی تعلیم کا لاینفک حصہ سمجھتے ہیں جیسے کہ اہل یورپ اور اہل ہند و سکھ سمجھتے تھے اور جب تک اور قطعہ کے مسلمان مذہبی تعصب سے بیزار ہو کر علی گڑھ کے مسلمان کس طرح متعصب ہو سکتے ہیں اس مضمون سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی ایک خود رو چیز ہے اور اسکی خوبی بھی اسمیں ہے۔ اگرچہ مسلم یونیورسٹی بہت کچھ سکاٹش یونیورسٹیز کے نمونے پر چلتی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی اسمیں خود رو ہونے کے بہت سے سامان موجود ہیں:۔

آجکل چونکہ انڈین مسلم یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے اور ہندو یونیورسٹی کی تیاری ہے اس لیے لفظ یونیورسٹی زبان زد ہر خاص و عام ہے۔ ایسے موقعہ پر اگر لفظ یونیورسٹی کی تشریح کیجائے اور یورپین یونیورسٹی کے آغاز کے متعلق کچھ لکھا جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جو مفہوم فی زمانہ ایک مختصر سے لفظ یونیورسٹی سے لیا جاتا ہے اس کے ادا کرنے کے لیے ایک زمانے میں پورا فقرہ استعمال کرنا پڑتا تھا یعنے یونیورسٹیز سٹوڈیم جنرل۔ لاطینی زبان میں یونیورسٹی کے معنی ہیں ایک ایسی گروہ جس کے ممبر جسمیں سب لوگ ایک ہی قسم کا کام کرتے ہوں چنانچہ اس لفظ کا اطلاق اس

اُس گروہ پر بھی ہوا جو درس و تدریس کا کام کرتا تھا۔ یونیورسٹیاز کا لفظ یونیورسل سے جس کے معنی عام کے ہیں کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔

سٹوڈیم جنرل سے مراد ہے وہ جگہ جہاں ہر ملک اور طبقے کے طلبا رہو جود ہوں۔ چنانچہ لفظ یونیورسٹی یونیورسٹیاز سے مشتق ہے اور یونیورسٹیاز سٹوڈیم جنرل کا مفہوم رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا تشریح سے ظاہر ہے کہ یونیورسٹی سے مراد وہ مجمع استادوں شاگردوں کا ہے جو بغرض تدریس و تعلیم یکجا بہم ہوا ہو اور چونکہ ان کی علت غائی ترقی و حصول علم ہے اس لیے یونیورسٹی ایک ایسی متبرک جگہ ہوئی جہاں جملہ علوم و فنون و سائنس کی تعلیم محض حصول علم کی غرض سے ہو اور جہاں جملہ وسائل بہم پہنچا کر ہر علم کو ترقی دیجاوے گویا کہ مرکز علم و فضل کا نام یونیورسٹی یا علوم کا گہوارہ یعنے دار العلوم ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یورپین یونیورسٹیز کا آغاز کس طرح ہوا۔ اور کون سے اسباب اِن کے محرک ہوئے؟ پیشتر اس کے کہ ہم ازمنہ وسطی کی یونیورسٹیز کا ذکر کریں ہم اُن متقدیم مراکز علوم کا ذکر کرتے ہیں جو کہ اگرچہ باقاعدہ طور پر دار العلوم یا یونیورسٹی کے نام سے ممتاز ہوئے تھے لیکن حقیقتاً سب وہی کام کرتے تھے جو کہ یونیورسٹی کرتی ہے اور ہر طرح سے اُس زمانے کی یونیورسٹی کہلانے کے مستحق ہیں اور ایک طرح سے اُنہی کو یونیورسٹی کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔

قدیم زمانے میں یونان جملہ علوم و فنون کا مرکز و منبع تھا۔ اتھینز مدتوں دنیا بھر کے لیے ایک یونیورسٹی کا کام دیتا رہا۔ اس ملک میں ہر علم و فن کے استاد موجود تھے ہر ایک اپنے اپنے علم میں اکمل تھا دور دور سے شاگرد آتے تھے اور اِس چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے کہتے ہیں کہ جس وقت اتھینز بندرگاہ پر کوئی جہاز لنگر کرتا تھا تو طالب علموں کے متلاشی سمندر کے

کنارے ہی جا پہنچتے تھے اور جہاز سے اترتے ہی اُن کو گھیر لیتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں استاد فصاحت میں بڑا ماہر ہے تم اس کے شاگرد ہو کوئی کسی دوسرے استاد کی تعریف کرتا تھا۔ غرضیکہ جس طرح بھٹیاریاں مسافروں کو اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں اسی طرح اُس زمانے میں طالب علموں کی گت بنتی تھی۔ اس قصے سے کم سے کم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اتھینز میں اِس زمانے میں اسقدر کافی تعداد ماہر استادوں کی تھی کہ ان میں آپس میں مقابلے کی نوبت پہنچ گئی تھی۔

اُس زمانے میں یونان میں علم کی تین شاخیں ضروری سمجھی گئی تھیں۔ علم فصاحت۔ علم سیاست اور علم فلسفہ اور انہی علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ علم فصاحت کا جو مدرسہ ایزکریٹس نے جاری کیا تھا وہ آخر یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہوا۔ اور اوس کے شاگرد ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی مدرسے کی تعلیم ختم ہو چکی تھی اور جنھیں سے بعض نے ساری عمر حصول علم میں صرف کردی۔ ان تعلیم گاہوں میں چار سال تعلیم ہوتی تھی اور اس کل عرصے میں ایک ہزار درہم فیس کے دینے پڑتے تھے۔ علم ادب و علم اخلاق تعلیم کا لازمی حصہ سمجھے جاتے تھے اتھینز کی یونیورسٹی کی جڑ ایزکریٹس اور افلاطون کے جاری کیے ہوئے مدارس کو سمجھنا چاہیے۔

اتھنز کے دنیا بھر کے لیے یونیورسٹی کا کام دینے کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ باوجودیکہ باہر کے طلبا اتھنز سے تعلیم پاکر جو واپس اپنے وطن جاتے تھے تو وہاں درس و تدریس کا کام جاری کر دیتے تھے لیکن جب تک کہ کوئی شخص خاص اتھنز جاکر علم حاصل نہ کرتا تھا اسکو عالم نہ سمجھا جاتا تھا۔

اسکندریہ

یوں تو یونانی تعلیمی مرکز مسیح سے ۲۰۰ برس پیشتر کی مہذب دنیا میں بہت جگہ تھے مگر سب سے زیادہ قابل ذکر اسکندریہ کا

دار العلوم ہے جس کا بانی اسکندر اعظم تھا۔ دیکھا جائے تو یہ دار العلوم موجودہ مفہوم یونیورسٹی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتا تھا۔ شاہان طالمی کے زمانے میں یہاں اعلیٰ تعلیم اور کتب خانوں کا ایسا عمدہ انتظام تھا کہ اس سے پہلے دنیا میں ویسا انتظام کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں نہ چھاپے خانہ تھا نہ کاغذ تھا تاہم سرا پس کے بتخانے میں جو کتابیں جمع کی گئی تھیں ان کی تعداد سات لاکھ تھی۔ یہ کتب خانہ ۲۹۸ قبل مسیح موجود تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کا ایک حصہ تو ۴۸ قبل مسیح کی آتشزدگی میں غارت ہو گیا اور جو باقی بچا تھا وہ ۶۴۰ء میں نابود ہوا۔ مسلمانوں پر عام طور پر دنیا بھر کی خرابیوں کا الزام لگایا جاتا ہے جنمیں سے ایک اس لائبریری کے جلا دینے کا بھی ہے اور یہ الزام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر تھوپا گیا ہے مگر اب خود یورپین مصنف بڑی شد و مد سے اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔

اس کتب خانے کے متعلق طالمی نے ایک کالج تعمیر کیا تھا جسکو موجودہ زبان میں یونیورسٹی کالج کہا جا سکتا ہے اس کالج کے پروفیسران کو اس زمانے کے خلاف دستور معاوضہ بھی ملتا تھا۔ پروفیسران احاطۂ کالج ہی میں بود و باش رکھتے تھے۔ کالج کے متعلق بڑے بڑے باغ اور باغیچے تھے جن میں پروفیسران و طلبا بجالت چہل قدمی علمی مباحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ اسی کالج میں ایک بڑا ہال (کمرہ) کھانے کے لیے مخصوص تھا جہاں استاد و شاگرد سب یکجا جمع ہو کر کھانا کھاتے تھے۔ اس کالج کی عمارت کا نام اس زمانے میں میوزیم تھا جس کے معنے اب عجائب خانے کے ہیں۔ لیکن اس وقت اس میوزیم سے مراد عجائب خانہ نہ تھی میوزیم ایک یونانی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں میوزز کا مندر

میوزر شعر و سخن اور علم و ہنر کی دیویاں تھیں۔ اس لیے میوزیم کا لائبریری اور کالج سے مشتمل ہونا کوئی بے موقع بات نہ تھی۔

رفتہ رفتہ اور کالج تعمیر ہوتے گئے اور اس کالج سے ملحق ہوتے گئے اور اس دارالعلوم میں دور دور سے طالب علم آنے لگے حتےٰ کہ اسکندریہ علمی شہرت میں اتھنز کا ہمپایہ ہوگیا۔ اس دارالعلوم میں طبابت۔ قانون ریاضی اور علم ہیئت کی تعلیم ہوتی تھی اور اسکی شہرت سینکڑوں برس تک اسی طرح قائم رہی۔ چنانچہ اس دارالعلوم کی بنا کے چھ سو برس بعد یعنی ۳۶۲ء میں ایک مصنف[1] اس کے متعلق ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اب تک یہ دارالعلوم بڑے بڑے علما کا آماجگاہ ہے۔ ازمنہ قدیم میں اتھنز کے بعد اسکندریہ کا دارالعلوم ایسا ہوا جو موجودہ مفہوم کے موافق یونیورسٹی کہلانے کا مستحق ہے۔

رومۃ الکبریٰ جب یونان کا ستارہ گردش میں آیا اور رومۃ الکبریٰ کا آفتاب اقبال چمکا تو یہ سلسلہ وہاں بھی جاری ہوا اور وسپیسین[2] بادشاہ کے عہد میں وہاں بھی اتھینیم ہال کی نمونے پر تیار ہوا جس میں پروفیسران کو باقاعدہ تنخواہیں ملتی تھیں اس کے بعد بیروت اور قسطنطنیہ میں بھی اسی قسم کے دارالعلوم قائم ہوئے مگر انمیں سے کوئی اس قابل نہ تھا جو خاص طور پر تاریخ میں مشہور ہوا ہو۔

دین مسیحی کا آغاز اور تعلیم رومۃ الکبریٰ کا جب زوال آیا اور دین مسیحی نے زور پکڑا تو یہ کہنا بالکل صحیح نہ ہوگا کہ رومن کیتھولک مسیحیوں نے علم کی جڑ ایک سرے سے کاٹ دی لیکن اس میں شک نہیں

---

[1] ammianus [2] ۷۹ء سے ۸۱ء تک۔

کہ انہوں نے علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنا بند کر دیا تحصیل علم کو محض عیسوی مذہب سمجھنے کی غرض تک محدود کیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ حصول علم کے شائق تھے یا جن کے لیے یہ ضروری تھا وہ یا تو پادری ہوا کرتے تھے جن کا فرض منصبی اشاعت مذہب تھا یا راہب ہوا کرتے تھے جو اپنی زندگی مذہب کے لیے وقف کر کے ساری عمر کلیسا کی چار دیواری میں گزار دیتے تھے اس لیے یہ ظاہر ہے کہ اس تعلیم کا منشا انکشاف مذہب تھا مدارس میں محض مذہبی قسم کی تعلیم ہوتی تھی اور بجز از مذہب جو علوم سکھائے جاتے تھے وہ صرف اس قسم کے ہوتے تھے کہ جس کے بغیر مذہبی تعلیم نامکمل رہ جاتی۔ طریقۂ تعلیم اس زمانے میں یہ تھا کہ جو استاد نے پڑھا دیا یا بطور تشریح لکھوا دیا اسکو آمنا و صدقنا کہکر حفظ کر لیا۔ اسپر سوال یا نکتہ چینی کرنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ مباحثے کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ گویا کہ شاگرد کو ذہنی ترقی کا کوئی موقعہ نہ مل سکتا تھا۔ یہ حالت گیارھویں صدی عیسوی کے آخیر تک رہی۔

موجودہ یونیورسٹیز کا آغاز

بارھویں صدی عیسوی وہ زمانہ ہے کہ جب صلیبی جنگ کی وجہ سے یورپ میں تجارت و حرفت و صنعت کی بہت کچھ ترقی ہو رہی تھی۔ بیکاری اور فارغ البالی انسان کو زیادہ تر مذہب کی طرف راغب کرتی ہے لیکن دنیا کے دوں کے شغل اس سے جدا کرتے ہیں جوں جوں لوگ تجارت و حرفت و صنعت میں حصہ لینے لگے انکو اس امر کا احساس ہونے لگا کہ دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے جہاں پادری اور کلیسائی مدرسوں میں دینی تعلیم کا انتظام تھا وہاں ایسے مدرسے بھی جاری ہونے چاہیں جہاں تعلیم دنیوی کاروبار کی غرض سے دی جائے اور جہاں ہر شخص بلا امتیاز مذہب و عقیدہ تعلیم حاصل کر سکے۔ ان مدارس کا

نام سٹوڈیا پبلیکا۔ یعنے درسگاہ عوام رکھا گیا ۱۱۳۵ء میں بڑے بڑے شہر کے باشندوں کو کچھ میونسپل حقوق ملے اور اونہوں نے انہی حقوق کی رو سے چند وزیکلر اسکول جاری کیے۔ ان مدارس کی خواندگی پرائمری کے درجے تک کی تھی اور خواندگی۔ املا۔ اور حساب سکھایا جاتا تھا۔ ایسے مدارس زیادہ تر جرمنی اور اٹلی کے بڑے بڑے شہروں میں کھولے گئے تھے۔ علاوہ اس امتیاز کے کہ ان مدارس میں مذہبی تعلیم نہ ہوتی تھی سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ پادری اور کلیسائی مدارس میں تعلیم لاطینی زبان میں ہوتی تھی اور ان میں ملک کی مادری زبان میں۔ مثلاً اگر کوئی مدرسہ جرمنی میں واقع ہے تو وہاں ہر علم جرمن زبان میں پڑھایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ مدرسے حاکم وقت یا پوپ کے ماتحت نہ تھے۔ نہ ان میں یہ شرط تھی کہ پادری لوگوں کے سوا اور دوسرا کوئی شخص استاد ہی نہو سکے اگرچہ یہ مدارس ابتدائی تعلیم دیتے تھے لیکن مذہبی لوگوں کے خیال سے اُن بے دین مدرسوں کی مانند تھے جن کا زور چھٹی صدی عیسوی میں تھا اور جو از منہ قبل مسیح کے یادگار رہے۔ ان مدارس کے اجرا کا سب سے بڑا اور فائدہ مند اثر یہ ہوا کہ تحصیل علم کے ایسے ذرائع بہی وجود میں آگئے جن کی علت غائی مذہب نہ تھی اور اسی اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ایسے درسگاہ قائم ہو گئے جہاں علم من حیث علم حاصل کیا جاتا تھا اور یہ درسگاہ بڑھتے بڑھتے ایک خاص شعبۂ علم کے مرکز اور دار العلوم ہو گئے۔

بیرونی اثر یعنی اہل عرب کی صحبت

اسی زمانہ میں افریقہ اور دیار مشرق میں اہل یورپ کی آمد و رفت زیادہ ہونے لگی جہاں اہل عرب

لہ عام مدرسہ۔

دور دورے تھے جو اسوقت علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔

عربوں نے بغداد۔ بابل۔ اور اسکندریہ میں بڑے بڑے دارالعلوم قائم کیئے اور رفتہ رفتہ بصرہ۔ کوفہ۔ بلخ۔ اصفہان۔ اور سمرقند بھی علمی مرکز ہو گئے قاہرہ میں ایسی عظیم الشان یونیورسٹی تھی کہ ایک یہودی مورخ لکھتا ہے کہ وہاں بیس سے زیادہ ایسے کالج ہیں جنمیں فلسفہ بحد تکمیل پڑھایا جاتا تھا اس دارالعلوم کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ ڈگیٹ[1] تھی اور اسمیں بعض اوقات خلیفہ وقت تک بغرض استفادہ شامل ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ نینیفی۔ اور مراکش میں بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں تھیں لیکن عربوں کا سب سے بڑا علمی مرکز اسپین تھا جہاں قرطبہ غرناطہ اور سیول جیسی مشہور یونیورسٹی تھیں۔ یہ دارالعلوم مذہبی قیود اور تنگئے خیال سے آزاد تھے تحقیق وتدقیق بحث ومباحثے ان دارالعلوم کی روح رواں تھے۔ جہاں مغربی چرچ یونانی فلسفے سے ڈر ڈر کر بھاگ رہا تھا عرب اس سے مستفید ہو رہے تھے فیثاغورث۔ چالینوس اور ارسطو کا عربی میں ترجمہ کر کے عربوں نے گویا انکو غارت ہونے سے بچا لیا۔ عربوں نے برخلاف عیسائیوں کے علم حاصل کرنے میں ہم مذہب اور بے دین کا کبھی خیال نہیں کیا۔ جس سے جو ملا لیا۔ عربوں کے بہت سے استاد یونان نژاد تھے جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ اور ان تمام متذکرہ بالا واقعات سے ثابت ہے کہ عربوں کا دریائے علم سرچشمہ یونان ہی سے نکلا تھا جو کہ اصل میں جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے

---

[1] ڈگیٹ Dirgate ایک چاندی یا سونے کا سکہ ہے جو ازمنہ وسطی میں یورپ میں بہت رائج تھا۔ سونے کے ڈگیٹ کی قیمت ۹ شلنگ ۴ پنس تھی۔ اور چاندی کے ڈگیٹ کی ۳۔ یا ۴ شلنگ تھی ۱۲

دنیا بھر کے جملہ علوم و فنون و سائنس کا مرکز تھا جس طرح عرب یونان سے مستفید ہوئے اسی طرح یورپ نے عربوں کے دارالعلوم سے فائدہ حاصل کیا نہ صرف اسطرح کہ انہیں تعلیم پائی کیونکہ مسلمانوں کے دارالعلوم یہود و نصاریٰ سب کے لیے وقف تھے بلکہ اسطرح بھی کہ اپنے ہاں کے مدارس کو عربوں کے دارالعلوم کے سانچوں میں ڈھالا مسلمان یونیورسٹیز کے عیسائی طالب علم اکثر باشندگان اٹلی ہوا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک زبردست طبی دارالعلوم بمقام سلیرنیو قائم ہوا جو پیرس اور بولون کے ساتھ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی سب سے قدیم یونیورسٹیز میں سے ہے +

تین ابتدائی یونیورسٹیز

اب اگر غور کیا جائے تو شروع میں تو گرجا و کلیسا کے مدارس ہی تھے پھر کہیں کہیں میونسپل اسکول جاری ہوئے ان میں بعض میں تکمیل تعلیم اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے بڑے بڑے عالم نکلتے تھے اور بعض صورتوں میں وہی بڑھتے بڑھتے دارالعلوم ہو گئے جیسا کہ اوسنی ایبے اور فریڈرس انڈ کے مدرسے بڑھتے بڑھتے اوکسفورڈ یونیورسٹی بن گئے لیکن بیرونی اثرات بھی اپنا کام کرتے رہے مثلاً صلیبی جنگ میں مشرق کے فیضان صحبت سے اہل یورپ کی تنگ خیالی کو وسعت ہو رہی تھی زمانہ شجاعت نے اپنا رنگ جما کر ایک نیا قانون اخلاق پیدا کر دیا تھا۔ ضروریات زمانہ نے مذہب کے محدود قید سے نکال کر علم کو بغرض علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کر دیا تھا چنانچہ گیارہویں صدی کے آخر اور بارہویں کے آغاز میں اس امر کا احساس ہونا شروع ہوا کہ حکمت۔ قانون۔ اور علم دینیات کو صرف پادری اور راہب لوگوں ہی کے لیے مخصوص نہ کرنا چاہیئے بلکہ عوام کو بھی ان علوم کے حاصل کرنے کی

ol — oomeyaldery.

اجازت ملنی چاہیئے اور علاوہ ازیں ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ ہر شعبۂ علم کے لیئے اسطرح تعلیم مختص کر دیجائے کہ اُس علم میں مہارت کامل ممکن ہو سکے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ بعض ماہران فن نے سلیرنیو میں حکمت و طب پر بولون میں قانون پر اور پیرس میں علم دینیات پر لکچر دینے شروع کیئے۔ اور اس کام میں ایسے ایثار نفس وسعی و تن دہی سے کام لیا کہ دنیا کے ہر گوشے سے طالب علم جوق جوق آنے شروع ہو گئے۔ جو طلبا تحصیل علم کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکے وہ یہی وہیں رہ پڑے اور درس و تدریس میں استاد کا ہاتھ بٹانے لگے رفتہ رفتہ جہاں طالب علموں کی تعداد بڑھتی گئی استادوں کا شمار بھی زیادہ ہی ہوتا گیا حتےٰ کہ ان میں سے ہر ایک مقام پر استاد و طلبار کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔ جنکی علت غائی حصول دفروغ علم تھی اور یہی یونیورسٹی یا دار العلوم کی تعریف ہے۔

متذکرہ بالا حالات سے صاف ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے لیے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی شاہی تحریک فرمان کی محتاج رہے اگرچہ بعض یونیورسٹیز بادشاہوں کے فرمان سے بھی جاری ہوئیں مثلاً فریڈرک دوم کی نیپلز کی یونیورسٹی لیکن عام طور پر یونیورسٹی کا ظہور ضروریات زمانہ سے ہوا۔ جسمانی تکالیف کے ضروریات نے سلیرنیو کی طبی یونیورسٹی کی بنیاد ڈلوائی۔ تحفظ حقوق یکدگر نے بولون[1] کی قانونی یونیورسٹی قایم کرائی اور روحانی تجسس نے پیرس کی دار العلوم دینیات کا آغاز کرایا۔ گویا کہ طب و قانون و علم دینیات کی ترقی کا نتیجہ ان شعبوں کی علحدہ علحدہ یونیورسٹی کی صورت میں نمودار ہوا۔ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ انکی تعلیم کا نتیجہ ایک دن یہ ہوگا کہ یورپین دنیا کا یا پلٹ ہو جائیگی اور ایسی ایسی اصلاحیں ظہور پذیر ہونگی جن کے قبول کرنے کے لیے وہ خود ہی تیار نہ تھے۔

[1] اس یونیورسٹی میں کہتے ہیں کہ تیس ہزار طالبعلم تھے۔ زاہدی

ایک دلچسپ خط

اپنے مہربان عزیز میرزا صمصام الدین احمد فیروز کا ایک منظوم خط خدمت والا میں ارسال کرتا ہوں۔ یہ انہوں نے جیسا کہ خط سے معلوم ہو جائیگا اپنی اہلیہ صاحبہ کے نام بھیجا تھا۔ خطوط خیالی ہیں مشاق شاعر کے سامنے وسیع میدان ہے جس میں تخیل آزادی سے جدھر چاہے دوڑ سکتا ہے۔ لیکن اس خط میں یہ بات نہیں۔ اور یہی پابندی اسکی خوبصورتی کو بڑھا رہی ہے۔ فقط

نیاز آگیں سید ہاشمی

مایۂ عیش و مخزنِ آرام۔ بیشتر جان و دل کی قیمت سے بڑھ کے دولت سے بڑھ کے عزت سے
بلکہ دنیا کی ساری نعمت سے آپ نے خط مجھے جو لکھ بھیجا لطف سے پیار سے محبت سے
آج پڑھکر نہ پوچھئے واللہ حال جو کچھ ہوا مسرت سے کیا مجال قلم بیان کرے
ایک شمہ خوشی کی حالت سے ہو گیا ہوتا بس کہ شادی مرگ بچ گیا میں تمھاری قسمت سے
شکریہ شکریہ ہزار سپاس قید غم کی چھڑایا زحمت سے دیر ہوتی ہے کیوں رسائل میں
تمکو نفرت ہے کیوں کتابت سے پاس کاغذ قلم دوات بھی ہے ایک بابو بھی بڑھ کے نعمت سے[1]
پھر بتاؤ تو کیوں ہے یہ سختی کیسا مزہ ہے مری اذیت سے؟ جس نے بیمار تم کو دیکھا ہو
کیا نہ چاہے نوید صحت سے؟ چشم بر راہ ڈاکیہ رہنا اور ناکام رہنا حسرت سے
کیوں؟ نہیں ہے یہ موت سے بڑھکر نزع سے جان کنی کی شدت سے تمکو احساس ہی نہیں افسوس
دل نہیں بہرہ مند الفت سے آپ بیٹھی ہیں بھائی بہنوں میں دن گذرتے ہیں لطف و بہجت سے
کیا خبر اس دلِ حزیں کی جو ہے ہمہ آغوش رنج فرقت سے مثل ایک مرغ بے نشیمن کی

[1] نعمت خاں اورنگ زیب کا منشی اور نہایت لائق فایق شخص تھا۔ ناظم ۱۲

دور ہے آشیاں کی راحت سے — یا کہ اُس عندلیب کی مانند — جسے بچھڑا چمن کی نزہت سے
یا اُس آوارۂ وطن کی صفت — دور اپنوں کی ہو جو محبت سے — یا اُس آزاد کی مثال کہ جو
چور ہو قید با مشقت سے — کلفتیں جو اُٹھا کے دن بھر کی — شب کو پڑتا ہے تھک کے محنت سے
باتیں کرتا ہے پھر تصور میں — چھولداری کی سیلگوں چھت سے — لیکن افسوس تم ہو بے پروا
دیکھتا ہوں یہی میں حیرت سے — یا تجھی ہو اُس کو کذب دریا — وہ گئی ہو فریب طینت سے
یا کوئی بات ایسی ہی ہوئی — جو ہو باہر مری فراست سے — جانتی ہو اگر مجھے جھوٹا
قول سمجھی ہو دور صحت سے — تو نہیں منحصر سے کہہ دینا — کام لینا ذرا عدالت سے
کیا غرض میری آپ کو اُس سے — فائدہ کیا ہے اُس کو دوست سے — صاف گو صادق البیان ہوں میں
فخر ہے مجھکو سچ کی عادت سے — کیا پڑی مجھکو چاپلوسی کی — ڈر نہیں ہے کسی کی سطوت سے
جاہ کی چاہ نہ خواہش دولت — ہے غرض آپ کی محبت سے — بخدا میں خدا سے ڈرتا ہوں
کانپتا اور کسی ہیبت سے — سامنے جسکے ناتواں بیوی — آئیگی اک عجیب حالت سے
سیر دامن پکڑ کے بولے گی — مجھ کو دکھانا ہے راحت سے — بس اسی دن کا انتظام ہے یہ
تا نہ کالا ہو منہ ندامت سے — کیونکہ بیشک ادائے حق عباد — جانتا ہوں ہیں طاعت سے
لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں — سیئے نفرت چاہے عزت سے — چاہتی ہو جہاں میں گر راحت
تو یہ حاصل ہے بس محبت سے — اک یہ بات ہی کو شک و ایواں — جنمیں ہم تم ہیں کدورت سے
اور تصور محل ہیں وہ جنگل — جنمیں دو دل ہیں ہوں الفت سے — بڑھکے ہیں کیدنی کی ناں جوئیں
شاہ ایراں کے خوان نعمت سے — اور وہ شیر و شکر جو ہوئے چاہ — تلخ تر زہر ہے حلاوت سے
ہیچ ہے وہ قباے سنجابی — ہو مُعرّا جو رنگ الفت سے — لیک اچھی ہے وہ ردائے پلاس
جسکو اوڑھے ہوں دو محبت سے — الغرض چاہ کو اگر سمجھو — دنیا قایم ہے اسکی دولت سے

ہاں خصائص سے میں ہوں خفا نکری — دور ہے یہ مری شرافت سے — قابل رحم جنس عورت کو

دیکھتا ہوں نگاہ عزت سے فکر رہتا ہے مجھ کو البتہ تم جو لکھتی نہیں ہو غفلت ہے
کیونکہ ہر وقت دل گرفتہ ہوں آپ کی طبع کی علالت سے یوں تو بابو نے لکھ دیا سب کچھ
کچھ نہ لکھا تمہاری حالت سے منع جس بات کو ہے فرمایا وہ نہ لکھونگا میں امانت سے
آنے جانے کا سب کے علم ہوا سب ہیں اپنے گھر کو صحت سے بھائی قدآسے میں بھی آملوں
گر نہ باہر ہو میری قدرت سے سبکو میرا سلام کہہ دینا عام اسلام کی اخوت سے
اور کیا آپ کو لکھوں بیوی حال اچھا نہیں مصیبت ہے ہوش پر جسم طبع عالی تھا
اور میں راولپنڈی میں فرصت سے لکھ دیا فی البدیہہ یہ نامہ شیخی مت جانیا غنایت ہے
کیونکہ روشن ہو یہ کہ سیف قلم لونڈیاں ہیں مری قدامت سے ہاں مگر خط یہ جوش کا ہی ثبوت
جوش ظاہر کہ ہے محبت سے لکھ رہا ہوں سلیس اردو میں تا سمجھ جاؤ تم سہولت سے
شاعری ہیں مذاق ہو جسکو وہ سنادے علیتیں عنایت سے بس یہاں ٹوٹتا ہے دل بیوی
تم ہی اکثر پڑھا تیں میری قیمت سے جب مگر ریزیاں نہ دیکھ سکو کیا ہوا آگاہ قدر و قیمت سے
مشکل آسان ہے خدا کی قسم کام لو گر ذرا بھی ہمت سے خوش ہوا دیکھ کر یہ تین خطیں
پڑھنے بیٹھو گی تم بھی فرصت سے والد و طبع علم جیسی ہو طبیعت کرو لگا پھر تو محنت سے
مرد جاہل تھا میسر کار بھی بادشاہ ہو گیا تھا ثروت سے اسکو بیوی کا خط ملا اکثر
جسمیں لکھا تھا لاکھ منت سے عاجزہ چاہتی ہو یہ کہ جواب ہو لکھا خاص دست مضرت سے
رو دیا میر بے کمالی پر سوق آنے لگا نجالت سے کی مناجات گر کے سجدے میں
عالم الغیب والشہادت سے علم دے تھکے اے خدایا مرگ کیونکہ بہتر ہے موت ذلت سے
لگ گئی آنکھ یونہی سجدے میں دیکھا اک شخص اہل نسبت سے کہہ رہا ہے کہ اٹھ نہ رو اتنا
کام کر دل سے شوق و محنت سے لکھنے پڑھنے لگا اسی دن سے زور دینے لگا طبیعت سے
ہو گیا چند روز میں دیکھو میر مردان با فضیلت سے کاشکہ تم بھی ایسی ہو جاؤ
کام کر جاؤ کچھ حمیت سے پھر تو کر لوں گا تم کو میں بہتر سارے کنبے کے مرد و عورت سے

کیونکہ صادق ہے قول نیر + اچھی بیوی ہے دین حضرت + و اخلاق ہے + دوں گا اسکو خط + پڑھ کر بیوی ہے + ہیں ہم اور ہم محبت +

فرمانروائے بھوپال

اکثر لوگ جو طبقۂ نسواں کی دماغی قابلیتوں سے انکار کرنے کی عادی ہیں اوس وقت بہت متذبذب اور پریشان ہوتے ہیں جب واقعات اونکے زعم باطل کی مشاہدہ سے تردید کر دیتے ہیں۔

زمانہ سلف میں جو فخر روزگار اور یکتائے عصر خواتین ہوگذری ہیں اون کے کارناموں سے چشم پوشی کرنا بالکل غیر ممکن ہے۔ تاریخ کی کتابیں اون کے تفصیلی حالات سے بھری پڑی ہیں اور تبلا رہی ہیں کہ مساوات کا قائم کرنا عین اقتضائے فطرت ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی قطع نظر کر لیا جائے تو زمانہ موجودہ میں بھی ایسی بہتریں مثالیں موجود ہیں جن سے اصول مساوات کی مضبوطی میں اور استحکام ہوتا ہے۔ اور اون کے حالات فخریہ بیان کیئے جا سکتے ہیں!

ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال جنکی بیدار مغزی اور روشن ضمیری تعریف سے مستغنی ہیں علاوہ ایک منتظم اور باخبر فرمانروا ہونے کے ملک و قوم کے لیے مایۂ ناز شش خاتون ہیں اور آپ کا شمار عہد جدید کے مصلحان ملت میں کیا جاتا ہے۔ آپکی علمدوستی۔ قومی ہمدردی۔ ایثار نفسی اصابت رائے امتیازی قابلیت نے آپکو یورپ میں بھی "فخر نسواں جہاں" کا خطاب دلایا ہے۔

آجکل آپ ممالک یورپ کی سیاحت فرما رہی ہیں۔ اس سفر میں بھی آپنے مختلف موقعوں پر اپنی طبعی فیاضی کا اظہار فرمایا ہے جس کے تفصیلی حالات اخبار میں حضرات سے پوشیدہ نہیں یورپ کے اکثر اخبارات و رسائل نے

متعدد آرٹیکل علیا حضرت کے متعلق شائع کیئے ہیں اور چونکہ وہانکی پبلک حضور عالیہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی بہت زیادہ شایق ہے اس لیے بعض اڈیٹروں نے اپنی واقفیت کی کمی کو اپنے قوت واہمہ کے ذریعہ سے پورا کرکے بہت سی بے سروپا باتیں بیگم صاحبہ کی نسبت مشتہر کی ہیں۔

نہ صرف اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی غرض سے بلکہ دنیا کو ایک فرمانروا خاتون کی قابلیت ملکداری سے مطلع کرنے کے لیئے آج ہم حضور ممدوحہ کے صحیح حالات۔ اون کا طرز حکومت ملکی انتظامات۔ وغیرہ کی اشاعت سے اوراق تمدن کو مزین کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ ایک فرمانروا خاتون کا آئین ملکداری اور انتظام ریاست بہت سے حکمراں مردوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جس سے اصول مساوات کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

تمدن کے مقاصد میں زبان اردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہونچانا ہے۔ اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ عورتوں کی دماغی قابلیتوں کا مردوں سے اعتراف کرایا جائے اور یہ کام زیادہ تر نظائر ہی سے چل سکتا ہے ہمارے عزیز دوست مولانا ارشد تھانوی دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اونہوں نے مہربانی فرماکر اس خاص موقع پر یہ ضروری اور دلچسپ مضمون ہمیں عنایت فرمایا۔ چونکہ راقم مضمون ایک عرصے بھوپال میں قیام پذیر ہیں۔ اس لیے اونہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب چشمدید واقعات اور مشاہدات کے صحیح نتائج ہیں +

نظم و نسق از رائے تو بصلاح و مدن را — معمور کند مقدمت اقبال زمن را
از فیض تو افزایش علم است بہ بھوپال — ذاتت بپے آں خطہ سہیل است یمن را

جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ وی۔ سی۔ آئی۔ ای۔

والیہ ریاست بھوپال۔ فطرت نے ایسا دل و دماغ لیکر آئی ہیں جو عامۂ مخلوق کی بہبودی کا سچا رہنما اور اسکی اصلاح معاشرت کا بہترین ہادی ہے۔

جب حضور عالیہ مسند نشین ریاست ہوئیں اسوقت بجز بیرونی اصحاب کے عام رعایائے بھوپال تعلیمی و اخلاقی حیثیت سے کچھ اچھی حالت میں نہ تھی۔ علمی کمی اور غیر مناسب کورس نے عام طبقہ کو علوم جدیدہ کی روشنی سے بالکل محروم کر رکھا تھا علیاحضرت نے سب سے پہلے ملک کی اس پستی کا احساس فرمایا اور اوسکو علمی رفعت پر پہونچانے کے لیے کوئی کوشش اوٹھا نہ رکھی۔ چونکہ حضور ممدوحہ خود علوم جدیدہ و قدیمہ میں غیر معمولی دستگاہ رکھتی ہیں۔ اور عربی و فارسی و انگریزی وغیرہ سے بخوبی ماہر ہیں اس لیے علم دوست بیگم صاحبہ کی تعلیمی تحریک کا عام رعایا پر بہت اچھا اثر پڑا۔ چنانچہ اسوقت خاص شہر بھوپال میں متعدد مدارس جھانگیریہ اسکول سلیمانیہ اسکول الگزنڈرا ہائی اسکول وغیرہ سرکاری طور پر قایم ہیں۔ جہاں ہر قسم کی تعلیم بلا کسی معاوضہ کے دیجاتی ہے۔ عام رعایا کو شوق اور توجہ دلانے کے لیے ہر ماہ میں بیگم صاحبہ نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ پرنس محمد حمید اللہ خانصاحب بہادر کو بھیجا ہے کسی خاص کالج (اجمیر وغیرہ) میں بھیجنے کے الگزنڈرا ہائی اسکول میں داخل کرکے عرصہ تک تعلیم دلائی۔ قریب قریب تمام ملک محروسہ کے محالات اور پرگنوں میں مدارس عمدہ پیمانہ پر جاری ہیں۔ اور خاص توجہ کے ساتھ تعلیم ہوتی ہے۔ حال میں کنڈرگارٹن کے طریقہ پر بھی سلسلۂ تعلیم جاری کیا گیا ہے۔

ہندو مسلمانوں کی لڑکیوں کے لیے بھی شہر میں بہترین تعلیم گاہیں قایم ہیں جنمیں مذہبی تدریس کے ساتھ۔ اردو۔ ہندی۔ انگریزی وغیرہ ضروریات زمانہ کے مطابق باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ کہانا پکانے۔ سینے پرونے۔ سوزن کاری کے دیگر ہنر خاص طور پر سکھلائے جاتے ہیں۔ پچھلے سالوں میں ان مدارس کے

بنے ہوئے کام اور اشیاء کی ایک دلچسپ نمایش بھی سلطانیہ گرل اسکول میں ہوئی تھی لاہور اور ناگپور کی نمایشوں میں یہاں کی لڑکیاں انعامات و تمغے حاصل کر چکی ہیں الہ آباد اگزیبشن میں بھی ان کی دستکاری کے اعلیٰ نمونے رکھے گئے ہیں۔ ہر قوم کی لڑکیوں کو اسکول لانے اور واپس پہونچانے کے لیے پردہ دار گاڑیاں بلا کسی کرایہ کے سرکاری طور پر مقرر ہیں مستحق طالبات علم کو معقول وظائف دیے جاتے ہیں

زمانہ حال کے ایک مشہور فاضل کا قول ہے "سستی اور بیکاری جس سے عموماً عورتیں مالوف ہیں۔ تمام رذائل کی اصل اصول ہے" مستورات نہ عمدہ طور پر اپنے گھروں کے کاروبار انجام دیتی ہیں نہ کسی قسم کی صنعت و حرفت اختیار کرتی ہیں نہ کوئی ہنر جانتی ہیں نہ علمی مشغلہ رکھتی ہیں" حضور ممدوحہ نے نسوانی ہمدردی سے اس الزام کو عورتوں کے سر سے دور کرنے کے لیے بہتریں وسائل کا استعمال فرمایا ہے چنانچہ ایک بڑا مدرسہ خاص شہر میں "مدرسہ صنعت و حرفت نسواں" کے نام سے قایم ہے جہاں عورتوں کو مختلف قسم کے ہنر سکھلائے جاتے ہیں۔ اور جو سابق مستورات بوجہ کم استطاعتی حصول معاش کے ذریعوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے اکتساب ہنر کے لیے وقت نہیں نکال سکتیں۔ ان کے واسطے سرکار عالیہ نے اپنی طبعی فیاضی سے بلا تخصیص عام طور پر کثیر التعداد اسکالرشپ مقرر فرما رکھے ہیں۔

حضور بیگم صاحبہ کو تعلیمی امور سے جو خاص دلچسپی ہے اوس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر قومی مدارس اور تعلیمی انجمنیں مثلاً دار العلوم ندوہ۔ مدرسہ عالیہ دیوبند۔ مدرسہ عربی مراد آباد۔ مدرسہ تسہیل القرآن لاہور وغیرہ وغیرہ حضور عالیہ کی فیاضیوں کے تواتر کے ساتھ زیر بار احسان ہیں۔ علیگڈھ میں زمانہ نصاب تعلیم حضور ممدوحہ کی سرپرستی ہی سے مرتب ہوا ہے۔ حال میں نمایش الہ آباد کے موقع پر بیگم صاحبہ ہی نے سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک لاکھ روپیہ کے عطیہ کا

اظہار فرمایا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہری بورڈنگ ہاؤس ہوشنگ آباد کو معقول امداد دیجا چکی ہے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ کا معائنہ فرما کر مبلغ پچاس ہزار روپیہ برقی روشنی اور برقی پنکھوں کے لیے بلا کسی تحریک کے مرحمت فرمانے کی خواہش ظاہر کی۔ حضور ہی کی توجہ خاص کا نتیجہ ہے کہ منجھلے صاحبزادے عالیجناب حاجی حافظ محمد عبید اللہ خانصاحب بہادر نے بھی کالج مذکور کو مبلغ پچاس ہزار روپیہ مرحمت فرمایا ؎

ہر چند کہ باشد دولتش بلد و ہوپال لیکن زعطا فیضرساں چین و ختن را

علمی طور پر طب قدیم اور جدید کے امتزاج سے جو اعلیٰ ترین ترقی معالجات میں پیدا ہو سکتی تھی۔ اوسکی طرف سب سے پہلے حضور عالیہ ہی کا خیال منتقل ہوا۔ چنانچہ ریاست میں ایک بڑا مدرسہ طبیہ بھی قائم فرمایا جسمیں ڈاکٹری اور طب یونانی کی مکمل تعلیم دیجاتی ہے۔ ریاست کے تمام قصبات میں ڈاکٹر اور طبیب دونوں طریقوں پر علاج کرنے کے لیے تعینات ہیں۔ یونانی اور انگریزی دونوں قسم کی ادویہ رعایا کو مفت دیجاتی ہیں۔ اطبائے یونانی کا تقرر ڈاکٹری امتحان پاس کرنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ خاص شہر میں اسسٹنٹ سرجن اور سب اسسٹنٹ سرجنوں کے علاوہ افسر الاطبا دن کے متعدد نائبین غیر ادویہ علاج کے لیے تعینات ہیں۔ انگریزی اسپتالوں کی طرح یونانی شفاخانوں میں بھی مریضوں کو تیار شدہ دوائیں مفت دیجاتی ہیں۔ اور اسیطرح ویدک کی دوائیں تقسیم ہوتی ہیں۔

جو علمی کتابیں حضور عالیہ کے نام پر ڈیڈیکیٹ ہوئی ہیں۔ ان میں ڈاکٹری اور طب یونانی کی مجموعی تالیفات بھی ہیں۔

تین سال ہوئے وسط شہر میں حمیدیہ لائبریری کے نام سے عامۂ خلائق میں علمی دلچسپی پیدا کرانے کے لیے ایک کتب خانہ قائم کیا گیا تھا اب اس غرض

کے لیے ایک عظیم الشان عمارت بالفعل ایک لاکھ روپیہ کی تیاری سے زیر تکمیل ہے
حضور عالیہ کی علمی دلچسپی نے باوجود فرمانروایانہ مصروفیتوں کے بھی سفرنامہ حجاز
و تاریخ بھوپال وغیرہ جیسی ضخیم کتابوں کو سلطانی تصانیف کا فخر عطا کیا ہے۔ حضور
کی اکثر تقریروں اور لکچروں کے اقتباسات بہترین رسائل نے فخریہ چھاپے ہیں ؎

اے مرتفع ز نسبت ذاتِ تو شانِ علم
کلکِ گہر فشانِ تو طب اللسانِ علم

فائن آرٹس یعنی فنون لطیفہ کیطرف بھی بیگم صاحبہ کو ایک طبعی رجحان ہے۔
اڈورڈ میوزیم کی دلکشا اور نظر فریب عمارت عجائب ذخیرے سے مالا مال
ہے۔ بھوپال میں داخل ہونیوالے سیاحوں کی نظریں سب سے پہلے اسی پر فضا مقام
پر پڑتی ہیں۔ جس کے چاروں طرف چمن بندی کرکے اور بھی پُر لطف بنا دیا گیا ہے
ہندوستان کے مختلف شہروں کی نمائشوں میں دستکاری کا انعام حاصل
کرنے والی بیگمات عمومًا سرکار بھوپال کی فیاضی سے مستفید ہوئی ہیں۔ پسندیدہ
چیزیں ایجاد کرنیوالی خواتین نے بھی اکثر حضور ممدوحہ کی قدردانی سے فائدہ اوٹھایا
ہے۔ علیاحضرت خود بھی اعلیٰ درجہ کی صناع اور دستکار ہیں۔ اس کے متعلق بعض
دلچسپ و کارآمد مضامین بھی بعض زنانہ رسالوں خاتون وغیرہ میں حضور عالیہ کی جانب سے
شائع ہوئے ہیں۔

مسئلہ تعلیم و تربیت و خیالات کی صورتیں ہر ہوچکا نے کے اصول کو ہمیشہ واجب العمل
بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ چونکہ عورتوں کی ترقی کا مدار لوگی عورتوں سے وابستہ ہے۔ اس لئے
کچھ عرصہ سے خواتین کو اس مفید طریق عمل سے بہرہ یاب بنانے کی کوششیں
ہندوستان میں کی جارہی ہیں۔ لیڈیز کانفرنس پر مضامین نکل رہے ہیں۔ پردہ
پارٹیوں کے رواج کی تائید کی جاتی ہے۔ اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر

روشنی ڈالی جاتی ہے لیکن جناب نواب بیگم صاحبہ نے عرصہ ہوا کہ لیڈیز کلب قایم فرما کر اپنے یہاں کی خواتین کو باہمی میل جول کے فوائد سے آگاہ کر دیا ہے۔

ناتجربہ کار اور بیوقوف دائیوں کی جہالت سے صنف نازک کے افراد کو ہمیشہ ناقابل تلافی نقصان پہونچتا رہا ہے جن کی تکالیف کا احساس کر کے بعض ہمدرد ملک نے ہندوستان کے بعض شہروں میں دائیوں کے مدرسے کھولنے اور اون کو ضروری تعلیم دینے کیطرف توجہ کی ہے۔ مگر علیا حضرت دام اقبالہا نے قانوناً ناواقف دائیوں کو اپنی حدود میں کام کرنے سے روک دیا ہے لینسڈاؤن لیڈیز ہسپتال بھوپال میں دائیاں ایک میعاد معینہ تک تعلیم حاصل کر کے لیڈی ڈاکٹر کے زیر نگرانی کام کرتی ہیں اوس کے بعد اون کو اپنے طور پر کام کرنے کی تحریری اجازت دیجاتی ہے۔ اور بصورت خلاف ورزی عدالت سے قانونی مواخذہ کیا جاتا ہے۔

ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال اون بہترین والیان ریاست میں سے ہیں جنکی مدبرانہ قابلیت ملکداری نظیر آپیش کیجاتی ہے اور جن کے اصول حکمرانی کو گورنمنٹ انگلشیہ نے بنظر پسندیدگی دیکھا ہے۔ ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں شاہ کابل حضور عالیہ کی خداداد قابلیت کا دربار آگرہ کے موقع پر خاص طور پر اعتراف فرما چکے ہیں۔

حضور ممدوحہ کی تخت نشینی کے وقت اہالیان بھوپال شالیستہ قوموں سے کئی صدی پیچھے تھے سلطنت برطانیہ کی بدولت جو سہولتیں ترقی زمانہ موجودہ ہیں تمام ہندوستان کو اپنی برکتوں سے معمور بنا رہے ہیں۔ ان سے کوئی خبردار بھی نہ تھا۔ طرز معاشرت کی وہی قدیمی شان تھی تمام ریاست میں باستثنائے بعض وہی اگلے وقتوں کے قانون و قواعد جاری تھے۔

جناب بیگم صاحبہ حال نے غیر معمولی سرگرمی سے اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانیکی کوشش کی۔ ملک کے ہر ہر حصّہ میں بذات خاص دورہ فرماکر اوسکی صحیح حالت کا موازنہ کیا صیغہ مال و عدالت کے جداگانہ وزراء مقرر فرمائے بندوبست نئے طریقہ پر عمل میں لایا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ حضور عالیہ کو اپنی تمام رعایا اور ملازمان سے کمال درجہ محبت ہے اور وہ انتہائی شفقت سے اپنے تمام باشندگان ملک کو آرام و آسایش پہونچانے کی تجویزوں میں ہر وقت مصروف رہتی ہیں ۱۹۰۷ء میں جب شہر بھوپال میں پلیگ کی کثرت ہوئی اس وقت حضور عالیہ کو اپنی رعایا کی حالت پر جیسی دلسوزی تھی اسکا تحریر میں لانا علاوہ اس کے باہر ہے یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ رعایائے بھوپال تمام عمر فراموش نہیں کرسکتی۔ پلیگ کی اشاعت بہت بڑھا دیا گیا ہزارہا روپیہ کی دوائیں مکانوں میں حفظ ماتقدم کے لیے تقسیم کی گئی۔ اول خود سب سے پہلے ٹیکہ لیا۔ اور اس کے فوائد پر اپنی تقریروں میں عوام کو توجہ دلائی تمام عمال اور حکام کے نام ٹیکہ لینے اور رعایا کو ٹیکہ کے فوائد سمجھا کر آمادہ کرنیکے لیے احکام نافذ فرمائے گئے جس سے تمام ملک نے حضور عالیہ کی مادرانہ محبت کا بخوبی اندازہ کرلیا۔

حضور عالیہ کے تین صاحبزادے ہیں۔ شہزادہ صاحبزادے عالیجناب نواب محمد نصراللہ خانصاحب بہادر ولیعہد ریاست ہیں حضور عالیہ آپ کو ریاست کے مختلف کام وقتاً فوقتاً سپرد فرماتی رہتی ہیں منجھلے صاحبزادے حاجی حافظ کرنل محمد عبیداللہ خانصاحب بہادر ایڈیکانگ ٹو ہز میجسٹی دی کنگ ایمپرر گورنر جنرل کشور ہند کو فوجی کام سپرد ہے۔ انکی خداداد قابلیت اور حسن تدبیر سے فوجی انتظام نہایت عمدہ حالت میں ہے جسکی تعریف لارڈ کچنر صاحب بہادر جیسے نامور کمانڈر انچیف افواج ہند کرچکے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے پرنس حاجی محمد حمیداللہ خانصاحب بہادر فی الحال علیگڈھ کالج میں اپنی تعلیم کی تکمیل فرما رہے ہیں۔

الغرض نواب بیگم صاحبہ ایک با خبر مدبر بیدار مغز اور روشن ضمیر فرمانروائے ملک ہیں خدا حضور عالیہ کے عمر و اقبال میں روز افزوں ترقی دے۔ آمین۔ رعایائے بھوپال کی

خوش نصیبی ہی کہنی چاہیئے کہ اوسکو ایسا شفیق بیدار مغز اور روشن ضمیر فرمانروا ملا ہے۔ ۱۲ منہ

ارشد تانوی

مرغِ بسمل

اب پر و پرواز کے قابل ترے بازو کہاں! خاک تیرائے تجھے موجِ نسیمِ گلستاں!
تجھ پہ چھائیگی نہ شاخِ گل پہ وہ خود رفتگی! نونہالانِ چمن کی لوریوں میں پھر کبھی!

اب بہارِ سبزہ و گل سے ہی تو محروم ہے شوقِ دل کی کشمکش اور دیدِ گل معدوم ہے
خس کی خوشبوئی سے دل ہوگا نہ پھر رحمت ترا سیوتی کے کنج میں ہوگا نہ تیرا گھونسلا

خوب طوفاں میں نکالے تو نے دل کے حوصلے اب کہاں سرگوشیاں وہ ابر و دریا سے رہے
اب فقط سبزہ پہ لے دیکر پھڑکنا رہ گیا ان شکستہ بازوؤں کے تولنے سے فائدہ؟

گرچہ تو مایوس ہے اور ختم الفت ہو چکی پر مری سوز ہے یہ دو گھڑی کی زندگی۔
کیونکہ وہ ناوک فگن جسکا کہ تو نخچیر ہے میرے ہی مجروح کرنیکو اسی کا تیر ہے

میں بھی لذت آشنا ہوں عشق کے طوفان کا شوقِ دل سے کر لیا ہے میں نے سر یہ معرکہ
چاندنی راتوں میں کیں میں نے فلک پرواز یاں فصلِ گل میں شاہدِ گل سے رہیں سازیاں

خاک سے اٹھنے کی ہی اب تو نہیں طاقت رہی رینگتا چلتا ہوں خس و خاشاں ہمدم ہر گھڑی
وہ کماں! بروکہ جس نے کر لیا تیرا شکار کیا عجب ہو اوسکو اوروں کی طرح مجھ پر بھی پیار!

(ترجمہ نظم ڈورسگرس نائٹر مطبوعہ ونڈسر میگزین)

محمد سیف الدین شباب

آئینۂ عبرت

ہماری بیدار مغز علم دوست بہی خواہ قوم اور نہایت قابل بہن جناب مخدستہ اختر بانو سہروردیہ بیگم صاحبہ نے مس ہنری وڈ کے ایک اخلاقی ناول کا ترجمہ کیا ہے جس کا نام آئینۂ عبرت ہے۔ بہن مذکورہ نے ایک جلد تحفۃً مجھے ارسال فرمائی۔ یہ ناول اصل زبان میں عرصہ ہوا میں پڑھ چکی تہی مجھے یاد ہے کہ پڑھتے ہی شوق غالب ہوا تہا کہ اسکا ترجمہ ہو جائے کیونکہ اس میں بہت سی باتیں ایسی تہیں جو بیگمات کے لیے نہایت مفید اور قابل مطالعہ معلوم ہوئیں۔ غیر میرا تو خیال ہی خیال رہا لیکن ہماری لائق بہن نے اسکام کو پورا کرکے دکہایا۔ ترجمہ سلیس زبان میں ہے اور اس بات کا حتے الوسع خیال رکہا گیا ہے کہ انگریزی الفاظ شامل نہ کیے جائیں یہ واقعی بہت ہی خوبی کی بات ہے کیونکہ آجکل مرد بہ مشکل اس بات کا خیال رکہتے ہیں ہر رسالے اور ناول غیر ضروری انگریزی الفاظ سے خلط ملط ہو کر عجیب صورت پیدا کرتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہو اور اردو فارسی۔ عربی کے لفظ نہ ملتے ہوں وہاں اور بات ہے لیکن بے جا شیخی جتانے کے لیے تو بہت ہی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے بلکہ زبان کا لطف جاتا رہتا ہے بعض مشرقی علوم کے جاننے والے جنکو انگریزی زبان میں دخل نہیں وہ حضرات جب انگریزی لفظوں سے اپنی عبارت کو رنگتے ہیں تب تو سبحان اللہ ایسی وضع پیدا ہوتی ہے کہ بے اختیار یہ ہی خیال آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش لیٹر پیپر بنے ہوتے بطور مثال ایک جملہ ہدیۂ ناظرین کرتی ہوں ایک بوڑہے خرانٹ فرماتے ہیں:۔ (اثنائے گفتگو میں) چیلڈرن وانڈ وئیں سے پیپ کرتے ہیں اردو کا تو خدا حافظ ہی ہے لیکن انگریزی کا حشر بہی تو ملاحظہ ہو

یعنے اُن کا مطلب ہے کہ بچے کھڑکی یا دریچہ سے جھانکتے ہیں" ایسی زبان سے کسکو نفع ہوسکتا ہے۔ تحریر میں بھی بعض حضرات غضب ڈھاتے ہیں اور یہ عبارت بہت کریہ معلوم ہوتی ہے یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ حکومت کا اثر یدیہی بات ہے مگر کچھ تو پرہیز ہو۔

ہماری بہنیں اس کتاب کے پڑھنے سے مستفید ہوں تو نہایت مناسب ہے اس سے اخلاقی سبق حاصل ہوسکتے ہیں کارپردازی اور محنت کشی کے فائدے معلوم ہوسکتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ نصیحت آموز ہونے کے علاوہ دلچسپی سے معمور ہے یقین ہے کہ جو صاحب اسے طلب کرینگے وہ ضرور خوش ہوں گے۔ بہو بیٹیوں کے پڑھنے قابل ہے۔

آجکل ہماری قوم میں مرد اور بیبیوں کو ناول نویسی کا زیادہ شوق ہے لیکن اس بات کا کم خیال ہے کہ عوام الناس پر اس کا اثر کیا ہوگا۔ اکثر ناولوں میں میں نے پڑھا ہے کہ طوائفوں کے ناشائستہ قصّوں کو قلم بند کر دیا۔ اس سے مصنف کا منشا تو یہ ہوتا ہے کہ رزیل عورتوں کی برائیاں جتا کر شریفوں کو آئے دن کی مصیبتوں سے باز رکھا جائے۔ کیونکہ ان ہی بے درمان بلاؤں نے ہندوستان کی مٹی پلید کر دی ہے مگر یہ پیرایہ اور بھی زہر کا کام کرتا ہے باز رہنا تو درکنار ایسے قصّے پڑھکر الٹی رغبت پیدا ہوتی ہے اور خاصکر ان غریبوں کے لیے ستم ہے جو معصوم اور ناتجربہ کار ہیں گویا ان کو واقفیت پیدا کروانا ہے۔ اچھا پھر ہر ایک کا دماغ ایسا پختہ نہیں ہوتا جو ناولوں کے پیرایے کو صحیح نگاہ سے جانچ پڑتال کر سکے اس واسطے کل قوم پر بڑا احسان ہوا گر ان بازاری عورتوں کے قصے یک لخت لکھنے موقوف ہو جائیں۔ اگر ان ناول نویسوں میں اتنا مادّہ نہیں کہ اپنے آپ کوئی دلچسپ اور بے ضرر

قصہ لکھ سکیں تو انگریزی اخلاقی قصے بیسیوں موجود ہیں ان کا ترجمہ کریں۔ نہ کہ رینلز کے سے غیر مہذب قصوں کو ترجمہ کر کے عوام الناس کی خیالات منتشر کریں۔ فرض کیجئے ایک باپ اگر رینلز کا ترجمہ اپنے گھر لائے گا تو کیا وہ یہ توقع رکھہ سکتا ہے کہ صرف اسی کی نگاہ ان ناقابل ناولوں پر پڑیگی مجھے تو مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ساختہ یا بے ساختہ گھر والوں کی نظر کسی کسی دن اس پر نہ پڑے اس واسطے ایسے قصے ہی نہوں جو بچے جوان بوڑھے سب برباد ہوں۔ خیر جو قصے شائع ہو چکے ہیں انکا تدارک مشکل ہے لیکن یہہ آسان ہے کہ اسبات پر غور کیا جائے اور تباہ کن قصے کہانیاں بالکل موقوف کر دیے جائیں یہ ذریعہ ضرور اخلاق کی درستی کا ہوگا سچ تو یہ ہے کہ ناولوں کا اثر نامعلوم جادوئی اثر ہے اس سے بہت جلد کچے دماغوں پر علی الخصوص برائی بھلائی پیوست ہو سکتی ہے جیسے نیک اور صحبت کا اثر کسی نے خوب کہا ہے

با بد منشینی و باش بیگانۂ او در دام افتی اگر خوری دانۂ او

اخلاق کی درستی سے کل قوم درست ہو سکتی ہے اس کے سوا سب ہیچ ہے۔ نہ عقل رہتی ہے نہ ہوش سب کا خدا حافظ ہو جاتا ہے۔ اب تو صرف یہ بات باقی ہے کہ رہی سہی عقل کا ذخیرہ کر لیں نہ کہ جو ہے اسکو بھی خیرباد کہہ کر خدا پر توکل کر کے اس شعر کو دہراتے بیٹھیں ؎ سپردم تو مایۂ خویش را۔ تو دانی حساب کم و بیش را۔ یا یہ ترکی شعر کو حالت وجد انیت میں جھوم جھوم کر پڑھیں ؎

نہ عقلم دانۂ تدبیرم نہ فکرم توکلت علی اللہ او ہو لائی ذکرم

آئینہ عبرت کے ملنے کا پتہ۔ جناب سید زاہد۔ سہروردیہ بیگم صاحبہ ۴۴-۱ بیٹ روڈ۔ کلکتہ

زہرا بیگم فیضی۔

چاند سے سبق

کشتی میں ہے تیری ماہ نو نازک بہت
تجھکو طے کرنا ہے بحر چرخ ناپیدا کنار

بادباں کوئی نہیں، اور ناخدا کوئی نہیں
رُخ ہوا کا بھی نہیں معلوم ہوتا سازگار

پاس ہے پارو، نہ لنگر، اور نہ ہے کوئی رفیق
میں تو ایسے رخت پر ہمت نکرتا زینہار

راہ میں تجھکو ملیں گے کتنے بادل کے پہاڑ
یہ رہی ہے تیز جن سے کہکشاں کی آبشار

لقمۂ حوتِ فلک ہونے سے تو گر بچ گئی
آگے گردابِ ثریا کو ہے تیرا انتظار

مجھکو حیرت ہے کہ ان دشواریوں پر بھی غضب
ہے متانت کسقدر رفتار میں کتنا وقار

لیٹے لیٹے سوچتا تھا ایک شب تنہا یہی
خوف آتا تھا ہی بس دل میں میرے بار بار

کان میں میرے مگر طعن و ملامت سے رہی
ناگہاں آئی صدائے خندۂ بے اختیار

اوٹھ گئی میری نگہ، دیکھا کہ ہلکی چاندنی
لوٹتی ہے فرش پر ہو کر ہنسی سے بیقرار

پھر کہا اوس سے یہ میں نے اے شعاعِ ناتواں
ہو نہ جائے یہ قبائے سیم تیری تار تار

بولی وہ "اے مردِ دانا ذی محاس وذی شعور
ہے سمجھ پر اپنے تجھکو اسقدر کیوں افتخار

میں سمجھتی تھی کہ تو لکھا پڑھا ذی ہوش ہے
ہوگا فرزانہ بڑا تو، عقل ہوگی تیری یا

تیری جانب سے غلط نکلا مگر میرا خیال
تو ہے بالکل پست ہمت، بے خرد غفلت شعار

ہو اگر دنیا تری ہمت پسند کاریند
نظمِ عالم میں بقیں ہے پھیل جائے انتشار

چھوڑ دے ہر شخص اپنے فرض کو یہ سوچکر
کیا کریں، کیونکر کریں، اسباب ہیں نا استوار

آتی ہوں ملنے کو کرکے اتنا فاصلہ مجھکو بھی دیکھ
گرچہ ہوں نازک، ضعیف و ناتواں، زار و نزار

آج، ہوں گر ہمتیں تیری طرح میری بھی پست
کہکشاں ٹوٹے تو پھر لطفِ کنارِ گلعذار

کہکشاں ہوں خشک ساری دجزر ہو جائے بند
دانے دانے کو پھریں محتاج سائے تا جدار

باندھتا ہی گر کوئی ہمت ادائے فرض میں
مشکلیں آسان کر دیتا ہی اوسکی کردگار

نوٹ: گو نظم ہذا سے پیرایۂ بیان سے ظاہر ہے کہ ایک بچی کی زبان سے کہلائی گئی ہے مگر فی الحقیقت اس میں ہر ایک ذی ہوش کے لئے درس عبرت ہے۔ ادارہ

نوٹ: گو نظم ہذا سے پیرایۂ بیان سے ظاہر ہے کہ ایک بچی کی زبان سے کہلائی گئی ہے مگر فی الحقیقت اس میں ہر ایک ذی ہوش کے لئے درس عبرت ہے۔ ادارہ

مہتدی باللہ

دولت عباسیہ کا چودھواں شاہنشاہ مہتدی باللہ ہے۔ اس کا نام محمد تھا اور کنیت ابو محمد اسحاق بعض لوگوں نے ابو عبداللہ بھی کنیت بتلائی ہے۔ اس کا باپ واثق باللہ تھا۔ اور خلفائے عباسیہ کی طرح یہ خلیفہ بھی لونڈی زادہ ہے۔ مہتدی کی ماں کا نام قرب تھا جو بربر کی سرزمین سے اٹھی تھی۔

مہتدی کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے بعض مورخین کے نزدیک ۲۲۳ھ سنہ ولادت ہے اور بعض نے ۲۲۹ھ ہجری میں واقعہ پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے اوس سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے۔ یہ زمانہ معتصم باللہ کی خلافت کا تھا۔

جب ماہ رجب ۲۵۵ھ کے آخر عشرہ میں معتز باللہ کے معزول کرنے کی صالح بن وصیف اور موسیٰ بن بغا سازش کر چکے تو انہوں نے محمد سے مسند خلافت کو رونق دینے کے لیے کہا۔ محمد بن واثق۔ معتز باللہ کے اون مظالم سے جو اسنے اپنے زمام سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی شروع کر دیے تھے تنگ آکر معتز سے متنفر ہو چکا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اوس نے ترکوں کی استدعا منظور کر لی۔ اور رجب ۲۵۵ھ کی آخری شب کو ترکوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی لیکن عام طور پر مہتدی کی بیعت کی اسوقت تک اشاعت نہیں ہوئی اور نہ کسی نے اس کی خلافت کو تسلیم کیا جب تک کہ معتز اپنا عجز ظاہر کر کے سلطنت سے دست بردار نہ ہو لیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ مہتدی ترکوں سے بیعت لینے کے بعد معتز کے پاس اس غرض سے گیا کہ معتز اس کے سامنے اپنا عجز ظاہر کر دے۔ معتز جو نمک حرام ترکوں

اذیت رسانی اور خود غرضیوں سے بیحد پریشان ہو چکا تھا فوراً مہتدی کو اپنا جانشین تسلیم کر کے وہیں بیٹھ گیا اور خلیفہ اپنے دیباری کمرہ میں چلا گیا۔ قانون حکمت کے موافق جب معتز کے عزل پر گواہ طلب کیے گئے تو ترکوں کے ایک گروہ نے بطریق شہادت بیان کیا کہ معتز بار خلافت کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا سلطنت کا والی دوسرے شخص کو قرار دینا چاہیئے۔ معتز ترکوں کی سازش سے تنگ آ ہی چکا تھا۔ اس نے اپنے عجز کا اعتراف کر کے بیعت کے لیے مہتدی کیطرف ہاتھ بڑھا دیا۔ کیونکہ ترکوں نے اوس کے تخت خلافت سے سبکدوش ہونے کے لیے سخت تکلیفیں پہونچانی شروع کر دی تھیں جس زمانہ میں معتز معزول کیا گیا ہے یہ گرمیوں کا موسم تھا۔

امام سیوطی نے تاریخ الخلفا میں مہتدی کا حلیہ لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ مہتدی حسین، ملیح اور گندم گوں ہونے کے ساتھ ہی بہادر، متقی، عابد اور خدا کے احکام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیطرح سخت واقع ہوا تھا۔

مورخ خطیب بغدادی مہتدی کے حالات میں رقم طراز ہیں کہ "مہتدی جس دن سے خلافت عباسیہ کی قسمت کا مالک ہوا تھا ہمیشہ (زندگی بھر) صائم رہا"

مہتدی خلیفہ تھا اوسے ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے سلطنت عباسیہ کے سیاہ اور سفید کرنے میں اوسے کوئی منع نہیں کر سکتا تھا اگر وہ چاہتا تو اور خلفا کی طرح عیش و آرام سے زندگی بسر کرتا لیکن نہیں! اوس نے کبھی عمدہ کھانا نہیں کھایا اچھے کپڑے نہیں پہنے جس طرح عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ ہوتے ہی اپنی جائداد اور زر و مال اہل حق کے حوالہ کر کے خلفاء راشدین کے طریقہ پر حیات بسر کی تھی۔ اسیطرح مہتدی بھی فرائض خداوندی اور حقوق عباد کا لحاظ کر کے آسائش جسمانی چھوڑ چکا تھا۔ اور ہمیشہ اپنی رعایا کی بھلائی میں مصروف رہتا تھا۔

ہاشم ابن قاسم اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رمضان میں

خلیفہ مہتدی کی خدمت میں عشا کے وقت حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر بیٹھکر جب اپنے گھر واپس آنے کے لیے اٹھا تو مہتدی نے کہا بیٹھو! میں پھر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اٹھ کر ہمارے ساتھ نماز پڑھی۔ اور نماز سے فارغ ہو کر کھانا طلب کیا۔ اتنے میں ایک بید کا دسترخوان حاضر کیا گیا۔ اسپر چند میدہ کی روٹیاں تھیں۔ اور دو ایک پیالوں میں نمک، سرکہ اور زیتون کا تیل تھا۔ مہتدی نے مجھ سے کھانے کے لیئے فرمایا۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ ابھی اور کھانا دسترخوان پر چنا جائیگا مائل کیا۔ مہتدی نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا تم نے آج روزہ نہیں رکھا تھا؟ میں نے عرض کیا روزہ تو تھا مہتدی نے کہا تو کیا کل روزہ رکھنے کا ارادہ نہیں ہے؟ میں نے کہا رمضان کا روزہ کیونکر ترک کر سکتا ہوں۔ تو مہتدی نے کہا پیٹ بھر کے کھاؤ یہاں یہی کھانا کھایا جاتا ہے۔" یہ سنکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور بلا تکلف میں نہایت آہستگی سے بارگاہ خلافت میں عرض کیا "خدا نے حضور کو دنیا کی تمام نعمتیں عطا کی ہیں؟ پھر بھی یہ کھانا تناول فرماتے ہیں۔ مہتدی نے جواب دیا یہ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں نے بنی ہاشم اور خاندان بنی امیہ میں موازنہ کیا تو کوئی خلیفہ بنی عباسیہ کا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مقابلہ میں نہ آسکا۔ انہوں نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے خراب غذائیں کھائیں حالانکہ وہ بہت بڑے خلیفہ تھے۔ اور حقوق سلطنت و حقوق خداوندی کی پوری حفاظت کی۔ ہاشمیوں میں بھی اون کے نظیر کی ضرورت تھی۔ سلف میں غور کرتا ہوں تو کسی خلیفہ میں عمر کے نظیر بننے کی صلاحیت نہیں نظر آتی۔ ناچار میں نے قصد کر لیا کہ بنی ہاشمیوں میں عمر بن عبدالعزیز کیطرح میں زندگی بسر کروں گا۔"

مہتدی درویش صفت اور علم دوست تھا۔ حضرت جلال الدین سیوطی صاحب تاریخ الخلفا نے اسے بہترین خلفا میں شمار کیا ہے۔ یہ بھی متوکل باللہ

کی طرح خلق قرآن کا قائل نہ تھا۔ اوسے یقین ہو چکا تھا کہ جن مکاشفات اور اسرار کو لامذہب فلاسفہ آفتاب عقل کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں اون میں واقعیت نہیں۔ وہ صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں انسانی عقل مقتضی ہے کہ وہ غلطی کرے ایک ہی امر جس کا سینکڑوں سال تک ساتھ تفکر اصول کے موافق صحیح ہونا تسلیم کیا جاتا ہے اور جس کی واقعیت میں کسیکو کلام نہیں ہتا۔ صرف ایک غلطی دریافت ہو جانے کی وجہ سے غلط ہو جاتا ہے اگر انسان صراط مستقیم کا پیرو ہونا چاہتا ہے تو اوسے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور کلام اللہ کے احکام کی اتباع میں حصہ لینے کی ضرورت ہے۔" بہرکیف وہ معتزلی المذہب نہتا اوس میں صحابہ کے ایسے خیالات تھے۔ وہ ایک سچا اہل سنت والجماعت تھا اوسکی پالیسی اصحاب نبیؐ کے افعال اور اقوال سے بہت ملتی جلتی تھی۔"

جعفر بن عبدالواحد نے بیان کیا ہے کہ میں نے ایک مسئلہ کے متعلق مہتدی سے عرض کیا کہ امام احمد بن حنبل کا اس مسئلہ میں یہ خیال ہے۔ اس سے میرا مقصود معتصم باللہ کے وقائع یاد دلانا تھا۔" مہتدی نے کہا "خدا امام احمد بن حنبل پر رحم کرے اگر اپنے آبا کی طرف سے گناہوں کی معافی مانگنا جائز اور اون کے لیے مفید ہوتا تو میں ضرور معافی مانگتا۔ پھر مجھ سے کہا سچ بات کہو اور حق بات نہ چھپاؤ انسان کا فرض ہے کہ سچی بات نہ چھپائے۔ میں خود حق پسند ہوں۔ اور حق پسند کی عزت کرتا ہوں۔"

مورخ نفطویہ سے کسی بنی ہاشم نے بیان کیا تھا کہ مہتدی کے پاس ایک جامہ دان تھا جسمیں ایک صوف کا جبہ اور چادر رہتے تھے جسے پہنکر وہ شب کو نماز پڑھتے تھے۔

مہتدی نے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی تمام لہو ولعب کے ذرائع

مسدود کر دیئے تھے۔ گانا سننا حرام جانکر ترک کر دیا تھا۔ ارکین اور اعوانِ خلافت کو ظلم کی سخت ممانعت تھی اہل دفاتر کو حساب و کتاب کے درست اور صاف رکھنے کی بید تاکید تھی۔ خلیفہ خود بھی اجلاس کرتا اور دفتر و بکاری کے تمام اہلکاروں کو (جو نہایت تندہی کے ساتھ حساب کے پیچیدہ کاموں میں مصروف رہتے) اپنے سامنے بٹھاتا تھا۔ ہفتہ میں صرف جمعرات اور پیر کے دن کے سوا ہر روز خود دربار میں آتا تھا غالباً ان دنوں تعطیل عام ہوتی تھی۔

جعفر ابن محمود کو جو اپنے وقت کا مایۂ روزگار تھا، جسکی قابلیت اور تبحّر کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے صرف اس بنا پر اسکو فوراً نکال دیا کہ اوس کے مذہب کی افواہیں مشہور اور زبان زد خاص و عام تھیں۔

سلطنت بغداد کی ترکی ارکین میں صالح بن وصیف ایک نہایت چالاک اور ہوشیار شخص تھا جس نے کئی ترکوں کی مشارکت میں معتز کو تخت حکومت سے اُتار دینے میں حصّہ لیا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی کی تحریک سے معتز کا عزل عمل میں آیا اور اسی صالح کے نامبارک ہاتھوں سے معتز کو جامِ شہادت پینا پڑا ہے۔

یہ بات تو آفتاب کیطرح روشن ہے کہ آپس کی خانہ جنگیاں اور باہمی سازشیں ہی سلطنت کے بربادی کا بڑا سبب ہیں خاصکر جب وہ افسروں میں رقابت اور ناچاقی ہو جائے تو تمام فوج کٹ جاتی ہے اور ملک تاخت و تاراج ہو جاتے ہیں۔ رعایا بھی اپنے بادشاہ کے خون کی پیاسی ہو کر اوسکو تلوار کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اور اس ناعاقبت اندیشی میں غیر قوموں کا (جو اسی تاک میں لگی رہتی ہیں) خوب بھلا ہوتا ہے۔ صالح نے چونکہ معتز کے بارہ میں سازش کی تھی۔ جو اچھی طرح کارگر ہوئی۔ اسیوجہ سے اکثر رعایا اس سے ناخوش تھی۔ لیکن مہتدی جسکی بادشاہت کا باعث یہی صالح کہا جاسکتا ہے اسکی دلدہی کرتا رہتا تھا۔ اور اس صورت

[illegible] کی ایک خاص جماعت معتز کی طرفدار ہوگئی جو صالح سے دشمنی رکھتی تھی لیکن مہتدی سے اوس کے دلمیں بھی کسی قسم کی کدورت نہ تھی۔ کیونکہ اس کے صالحانہ برتاؤ [illegible] خلاق کی تمام رعایا گرویدہ تھی۔ اس جماعت کا اعلیٰ افسر موسیٰ بن بغا ترکی [illegible] تھا۔ مہتدی کی خلافت کو ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ اس نے [illegible] پر بہت سے لوگ اپنے ہم خیال پیدا کر لیے اور جب اسے اپنی جمعیت پر پورا وثوق [illegible] اپنی جرار فوج لیکر معتز کے خون کا بدلہ لینے اور اوسکی ماں کی حقیقت و مالیت [illegible] نے کی غرض سے مقام سامرا میں وارد ہوا جو مہتدی کا پایۂ تخت تھا۔ جسوقت [illegible] داخل ہوا ہے تو عوام میں شور مچگیا اور ہر ایک آدمی صالح بن وصیف کیطرف [illegible] کر کے کہتا تھا کہ اے فرعون! اے!! اب تیری سرکوبی کے لیے موسیٰ [illegible] اس جملہ سے رعایا کے دلی جذبات اور خیالات کا اچھی طرح اظہار [illegible] ہے۔

[illegible] خود غرض ہونے کے علاوہ ہوشیار اور دور اندیش بھی تھا۔ اسے مہتدی [illegible] سے بظاہر کچھ اختلاف نہ تھا۔ اس لیے موسیٰ بن بغا مذکور نے صالح [illegible] کے قتل کی اجازت طلب کی۔ مہتدی نے اس ناشائستہ اور غیر مفید [illegible] باز رکھنا چاہا۔ کیونکہ اس سے ایک تازہ فتنہ اٹھنے اور نئی خانہ جنگی [illegible] جانے کا یقینی احتمال تھا۔ مہتدی کے نیک طینت اور صلح جو ہونے [illegible] شک نہیں لیکن موسیٰ (جس کے سر پر غصہ اور خود غرضی کا بھوت سوار تھا) [illegible] نے مہتدی کی ایک نہ سنی بلکہ اسی کو آکر گھیر لیا۔ خلیفہ اسوقت اپنے [illegible] دربار) میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے مہتدی کا ہاتھ [illegible] اور ایک دبلے پتلے گھوڑے پر سوار کر کے وارناجود کیطرف لے اڑا [illegible] نے کہا ہی کہ اے موسیٰ! افسوس! اضدا سے ڈر!!! یہ آخر کس بات کا

ارادہ کر رہا ہے ؟ اِس نے جواب دیا کہ میں بھلائی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ قسم کھائیے کہ صالح کے دینے میں تامل تو نہ فرمائیگا ؟ مہتدی اسوقت گویا اس کی جماعت میں نظر بند تھا ہی بیچارے نے اپنی جان بچانے کی نیت سے مجبور ہو قسم کھائی۔ پھر یہ اپنے مکان پر پہونچا دیا گیا چند دن کے بعد موسیٰ نے صالح طلب کیا کہ اوس سے علی الاعلان اسکی ناشائستہ افعال اور ناجائز کارروائی کے بارہ میں کچھ بحث و مباحثہ کرے مگر اوس کا کچھ پتا نہ پایا۔ اِدھر مہتدی نے رفع قضیہ کے خیال سے موسیٰ اور اوسکی جماعت کو صلح پر آمادہ کرنا چاہا تو انہوں نے مہتدی کو یہ تہمت لگائی کہ صالح جس جگہ روپوش ہے اوس کا مہتدی کو بخوبی علم ہے۔ اس قضیے نے بہت کچھ طول پکڑا یہانتک کہ اِن لوگوں نے مہتدی کو تختِ خلافت سے اُتار دینے کی صلاح کر لی۔ کسی مخفی ذریعہ سے مہتدی کو بھی یہ بات معلوم ہوگئی صبح کے وقت بلا خوف و خطر گلے میں تلوار ڈالے ہوئے موسیٰ کے لشکر میں پہونچکر مہتدی نے نہایت رعب دار آواز میں کہا کہ مجھے تمام خبریں پہونچگئی ہیں "یاد رکھو میں ستعین اور معتز وغیرہ کی طرح نہیں ہوں۔ اسوقت غصہ کی حالت میں تم لوگوں کے پاس چلا آیا ہوں دیکھو امیرے ہاتھ میں یہ زرین تلوار ہے۔ میرے ہاتھ میں جب تک اس تلوار کا قبضہ ہے تب تک برابر لڑتا رہوں گا۔ مگر صرف دین یا حیا یا اوس عیش کے لیے جو بلا کلفت حاصل ہو سکے۔ اور کسی غرض سے یہ تلوار نہ اُٹھے گی۔

خلفائے وقت اور اللہ کے قانون کی خلاف ورزی پر کیوں جسارت کی جاتی ہے۔ بخدا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ صالح کہاں ہے۔ مہتدی کی اس قسم پر یقین کر کے دلوں کی کدورت جاتی رہی موسیٰ نے اعلان کیا کہ جو شخص صالح کو پکڑ کر لائیگا ہم اوسے دس ہزار دینار انعام دیں گے۔ اس کارروائی کے

بعد مجمع منتشر ہوگیا۔ اور لوگ صالح کی جستجو میں رہنے لگے۔ مگر باوجود بیحد تلاش کے بی عرصہ تک صالح کا سراغ نہ ملا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک غلام موسےٰ کے لشکر کا کسی دن دوپہر کو پھرتا چلتا ایک گلی کیطرف جانکلا وہاں ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ یہ غلام بھی اوس دروازہ میں گھس گیا۔ تھوڑی دور بڑھکر ایک تاریک دھلیز دکھائی دی یہ دہلیز میں ہوکر آگے بڑھا۔ دیکھتا کیا ہے کہ اوس کے اندر صالح بن وصیف تن تنہا بے ہوش پڑا گہری نیند کے مزے لے رہا ہے غلام نے صالح کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ اس کے خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی بقول شخصے کہ ؎

"خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال"
"کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے"

غرض فوراً وہاں سے واپس آکر موسیٰ نے اوسی وقت اپنی فوج سے ایک منتخب جماعت بیجدی جس نے موقعہ پر پہونچکر دم بھر میں صالح کا کام تمام کردیا۔ اور موسیٰ کے حکم سے اوس کا سر کاٹ کر تمام شہر میں پھرایا گیا۔ مہتدی کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا مگر مصلحت وقت سے خاموش ہورہا۔ موسیٰ نے اس کام کو انجام دیکر اپنی جمعیت کے ساتھ سُمَیسَاط[1] کی طرف کوچ کیا۔ اسکی فوج میں باکیال اور مفلح نامی بھی دو نامور بہادر ترک موسےٰ کے بادفا دوست تھے۔ اور مفلح ترکوں کا ایک ذی وجاہت امیر بھی تھا راستہ میں باکیال کو ایک خط ملا جسمیں مہتدی نے اسے لکھا تھا کہ تم موسیٰ اور مفلح کو قتل کرڈالو یا قید کرلو اور آپ ترکی فوج پر خود مختار امیر بن جاؤ باکیال نے یہ خط موسیٰ کو دکھا دیا اور کہا کہ میں اون لوگوں میں نہیں ہوں جو اپنی قوم یا اپنے سردار کو دغا دیکر عارضی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ خاصکر آپ پر ہاتھ اُٹھانا گویا اپنی

[1] دجلہ کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا شہر واقع ہے ۱۲

تمام قوم کو ایک عظیم نقصان پہونچاتا ہے۔

پھر باتفاق یہ رائے قرار پائی کہ ابھی چلکر مہتدی کو قتل کر ڈالنا چاہیئے ورنہ آیندہ اندیشہ ہے چنانچہ اوسیوقت موسیٰ اپنے ارادہ کی تکمیل کے لیے سامرا اور پہنچ آگیا اور جنگ شروع ہوگئی۔

مہتدی کیطرف سے اہل مغرب، اہل فرغانہ وغیرہ نے اوسکا بڑے جوش و خروش کیساتھ مقابلہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں چار ہزار ترک ایکدن میں کام آئے۔ اور عرصہ تک اسیطرح موت کا بازار گرم رہا۔ تلواریں اپنا جوہر دکھایا کیں، دونوں طرف کے سپاہ اوجانبازی دیتے رہے آخر کار خلیفہ کے لشکر نے شکست کھائی اور بخت کے نامساعدت سے مہتدی جیسے خلیفہ کو ترکوں میں قید ہونا پڑا ایسے شعاروں نے اس کے دونوں آنکھیں اسقدر سختی کے ساتھ دبوائے جسکی تکلیف سے غریب اور بے تصور خلیفہ جاں بر ہی نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ اور کوئی جنگ کسی سے مہتدی کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔

مہتدی ایک قابل قدر اور صلح جو خلیفہ تھا۔ کاش؟ اگر ترکی رعیت اوس کا ساتھ دیتی تو مہتدی کو بھی غیر قوموں کے مقابلہ میں ضرور کوئی کارنمایاں کرنے کا موقعہ ملتا اور وہ بھی معتصم، مامون، ہارون وغیرہ کی طرح اشاعت اسلام اور توسیع سلطنت کی توسیع میں حصہ لیتا لیکن افسوس! آپس کی سازشوں نے اتنا وقت ہی نہ دیا عنان سلطنت ہاتھ میں لیے ہوئے ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ انہیں باہم خانہ جنگیوں کی بدولت ۱۵ رجب ۲۵۶ھ کو اس ہر دلعزیز خلیفہ نے اپنی عزیز جان موت کے حوالہ کردی۔

جسوقت ترک مہتدی پر ظلم و زیادتی کر رہے تھے تمام رعایا کے دلوں میں موسیٰ کے اس کے قتل کا معاوضہ لینے کا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ لوگوں نے رقعے لکھ لکھکر مسجدوں میں آویزاں کیے جنمیں مرقوم تھا کہ "اے معشر مسلمین! اپنے منصف مزاج خلیفہ کے لیے (جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مشابہ ہی) دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے اوس کے دشمن کو مغلوب کرے۔ آمین"۔ مگر افسوس ہے کہ بدنصیب رعایا کی دعا مقبول نہ ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(محمد حسین محوی لکھنوی)

حقیر نذر

ہماری محترم بہن بنت نذر الباقر صاحبہ کے نام سے جو ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ قدرت نے اپنے انعام میں مرد و عورت کی تخصیص نہیں کی مسلمان بہت کم ایسے ہوں گے جو واقف نہوں — خاتون محترم کی لٹریری کوشش قومی خدمات پر مغز آرٹیکل، پھول کی ایڈیٹری اور مسلم یونیورسٹی کے واسطے محنت شاقہ اسبات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ہمدردی کا مادہ اور قومی ضرورتوں کا احساس صنف نازک کے دلوں میں ہی مردوں سے کم نہیں۔

یہ کتاب جو حقیر نذر کے عنوان سے پیش کی جاتی ہے گو اسکا مقصد ظاہری اپنی مظلوم بہنوں کے ساتھ ہمدردی ہے مگر منشا اصلی اُس فنڈ کو تقویت دینا ہے جس سے اچھا کام جس سے بڑی ضرورت اسوقت ہمارے سامنے کوئی نہیں۔

محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ کی یہ کوشش تمام قوم کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہے اور ہمیں توقع نہیں یقین ہے کہ کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہ رہیگا اور قوم دل کھولکر اس خاتون کی حوصلہ افزائی کرے گی جس نے راتوں کی میٹھی نیندیں قوم پر سے قربان کی ہیں اور یونیورسٹی کی تکمیل سے پہلے اسکا دوسرا تیسرا ایڈیشن شائع ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی فنڈ کی مدد کے لیے علی العموم ہر فرد قوم نے اپنی بساط پر جو کچھ بھی اُس سے ہوسکا کیا۔ اور یہ کسی پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض اسلامی و قومی ادا کیا۔ چونکہ میں یونیورسٹی فنڈ میں کچھ نہ دے سکی۔ اس فکر میں تھی کہ

میں بھی کچھ کروں۔ چنانچہ ایک مختصر سی کتاب جسمیں سچے واقعات بہ تبدیل نام و مقامات لکھے ہیں چھپنے کو دیدی جسکی کل منافع بعد وضع کرنے اخراجات مطبع کے یونیورسٹی فنڈ کی نذر ہے۔ گو کہ مجھ میں اسقدر قابلیت نہیں کہ ایک ایسی کتاب لکھنے کی جسارت کروں کہ جسمیں مردوں کی زبردستی اخلاق پر قلم اُٹھایا ہو۔ اور نہ میری علمی حیثیت اسقدر کہ پبلک میں کوئی کتاب لکھکر پیش کروں۔ لیکن یونیورسٹی فنڈ کے خیال نے کچھ ایسا یقین کیا۔ کہ سچے واقعات قصّے کے پیرایے میں لکھ دیے۔ بے بس و مظلوم مسلمان مستورات ہند کی قابل رحم حالت سے کون واقف نہیں ہے۔ بے ضرورت شرعی کثرت ازدواج کے رواج سے اس بیکس فرقۂ نسواں جسقدر ظلم ہو رہا ہے۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔

پس انہیں حالات کی سچی تصویر یہ چھوٹی سی کہانی ہے۔ اور میں یہ بھی بخوبی جانتی ہوں۔ کہ اسپر نکتہ چینیاں صرف مردوں ہی کی طرف سے نہ ہونگی۔ بلکہ چند قابل مقتدر اور با اثر خواتین کیطرف سے بھی اس کے ہر پہلو پر کیا بہ لحاظ زبان و پلاٹ و کیا بہ لحاظ ربط وغیرہ سینکڑوں اعتراض ہوں گے۔ لیکن نہ مجھے خوف اعتراضات کا اور نہ مجھے پرواہ اختلاقات کی۔ میں نے محض فنڈ کے لیے یہ کہانی چھپوائی ہے۔ اور اب دیکھتی ہوں کہ مددگاران فنڈ اس کی کہانتک قدر کرتے ہیں۔ اور کس قدر بے شمار خریداری کی درخواستیں میرے پاس بھیجتے ہیں۔ گو اس چھوٹی سی کتاب سے فنڈ کو کچھ بڑی مدد نہیں مل سکتی۔ لیکن ہمدردان قوم کی امداد سے کچھ ہو ہی جائیگا۔ اور ایک میرا یہ بھی خیال ہے۔ کہ شاید میرا خلوص میری مغفرت کے کام آئے چونکہ کتاب ابھی زیر طبع ہی قیمت کا حال

معلوم نہیں۔ لیکن میرے خیال میں ۱۲ آنے سے کسی طرح زیادہ نہ ہوگی۔ اب یہ ہمدردان قوم کے ہاتھ ہے۔ کہ کسقدر روپیہ اس ذریعے سے فنڈ کو دیں اور یہ کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ پڑھنے کو کتاب اور مفت کرم داشتن سے یونیورسٹی فنڈ کی امداد۔

نیز یہ بھی ملتمس ہوں۔ کہ تمام اسلامی اخبارات و رسالہ جات بھی اس چند سطور کو بغرض ہمدردی فنڈ شائع کر کے مشکور فرماویں۔

خاکسار

بنت نذر الباقر۔ از کوہاٹ

شمس العلماء پروفیسر میرزا موسیٰ کوثر صاحب شیرازی کا کلام ناظرین تمدن پچھلے پرچوں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں مرزا صاحب موصوف گجرات کالج احمد آباد میں عرصہ تک فارسی کے پروفیسر رہے۔ آپ کا کلام اردو باوجود ایرانی ہونے کے اسقدر صاف اور ستھرا ہے کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ صاحب موصوف کی انگریزی قابلیت بھی قابلِ داد ہے امید ہے کہ ناظرین تمدن شمس العلماء کی تصویر جو زیبِ ورق اول ہے دلچسپی سے ملاحظہ فرمائیں گے +

ترانۂ بہار

(از محمد عبدالواحد صاحب نائطی)

خوب پُر ہو گل خوش رنگ سے دامانِ بہار
اللہ اللہ یہ جوبن! یہ عجب شانِ بہار!!!

ترک ہو کرتے ہی گھنگھور گھٹائیں چھائیں
میری توبہ ہی ہوئی سلسلہ جنبانِ بہار

"مے کشو خوب پیو ایک بھی قطرہ نہ بچے"
ابر آکر کے سناتا ہے یہ فرمانِ بہار

بارشوں کا کچھ عجب دل کش و دل چسپ سین
کہ پرے باندھ کے نکلے ہیں حسینانِ بہار

کہیں تیٹر ہے کہیں ریس کہیں بال کہیں شو
قابلِ دید ہیں لندن کے یہ سامانِ بہار

مے و معشوق سے قائم ہے وجودِ عشرت
سچ تو یہ ہے کہ یہی دونوں ہیں بس جانِ بہار

ہنس کے کہتے ہیں "تتلید شکست توبہ"
ہم نے بھی توڑ دیا اپنا وہ پیمانِ بہار

بلبلیں چیخ کے کرتی ہیں قفس میں فریاد
دل کے دل ہی میں رہے ہائے سب ارمانِ بہار

ہم کو کچھ ایسی بیابان کی ہوا بھائی ہے
دلِ وحشی کبھی ہوتا نہیں خواہانِ بہار

جبکہ انجام "خزاں" ہے تو نظر میں اپنی
دشت و جنگل سے بھی بدتر ہے گلستانِ بہار

آج شاہانہ چمن کیسے پڑے ہیں ویراں؟
آج خاموش ہیں کیوں زمزمہ سنجانِ بہار

آج ہیں مسکن بوم۔ آہ۔ وہ سارے گلشن
کل جہاں گاتے تھے نغمہ سرایانِ بہار

شاخِ مضمون کو ترا شے جو تخیل کا قلم
نت نئی اور کھلائے گلِ خندانِ بہار

میرے اشعار کو داد سے اونچیں کیا نسبت
گرچہ ہیں اور غزل خوانِ بہار

(نائطی)

شرع کا خون

موت برحق اور یوم الانصاف عقیدۂ ایمان مگر یہ زمین اور آسمان جو آنکھ کے روبرو ہے اسکا خالق شاہد ہے اس امر کا کہ طارق کا یہ عذر ہماری سمجھ میں مطلق نہیں آیا کہ وہ بدنصیب بیٹی شبانہ کے معاملہ میں بیوی کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ نفس الامر یہ ہے کہ مادۂ خود پرستی سرشت میں موجود تھا صحبت نااہلاں وجہ ہوئی اس جوہر کے جلا کی اور سہل انگاری و تن پروری کا کھوٹ سونے پر سہاگہ۔ من حیث المجموع یہ تمام عیوب شخصی و نقائص بشری انسان کو جانور میل کو بیل اور بچھڑے کو سانڈ بنا دینے کیواسطے بدرجۂ اتم کافی تھے۔ تن پروری کا یقینی نتیجہ بے انصافی تھی جو سبب ہوئی اتلاف حقوق کا۔

باایں ہمہ یہ اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہوگی کہ اگر تقدیر کوئی شے ہے تو والی سردارپور کا اکلوتا بیٹا طارق تقدیر کا پورا ہٹیا نکلا جس بیٹے کے مقابلہ میں علی رؤس الاشہاد آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیٹی کو شفقت پدری سے محروم کیا وہ کمبخت بھی اپنا نہ ہوا اور جس خاندان میں شادی بیاہ تک کے موقعوں پر میر سخنوں کی بھی آنکا حکم نہ تھا اسی خاندان میں بہ حیثیت رئیس البیت باپ کے جیتے جی دھڑلے سے رنڈیاں بٹھا دیں۔

طارق کو بیگناہ مان۔ لینے میں ہم متامل نہ ہوتے اور خود ہمارا ایمان ہمکو یہ اجازت نہ دیتا کہ ہم آج پچاس برس بعد اس مرحوم کی ہڈیاں اکھاڑیں مگر ہماری تلاش کا ہر نتیجہ اور اسکی عمر کا ہر واقعہ اس کے جرم کو اور

سنگین کر رہا ہے۔ سو پچاس نہیں تو دو چار اور غیر نہیں اس کے اپنے ہی سردار پور میں آج بھی ایسے لوگ ڈھونڈھے سے نکل آئیں گے جو مدتوں اس کے پاس اور برسوں اس کے ساتھ رہے۔ مگر افسوس ہمیں انمیں سے ایک بھی ایسا نہ ملا جو علی الاعلان نہیں تو کنایۃً اور کہلم کھلا نہیں تو اشارۃً ہی طارق کو شعبانہ کا رحیم باپ بیان کر دیتا۔

ہمدم و ہمراز رفیق و دمساز سب کا بیان غلط سہی مگر خود اس کے اپنے ہاتھ کی تحریریں بآواز بلند پکار رہی ہیں کہ وہ اس انجمن کا سرگرم ممبر تھا جسکی تلقین الرجال قوامون علی النساء کے معنے مردوں کو ہر اعتبار سے عورتوں پر افضل ثابت کرنا تھی یہی تھی وہ انجمن جس نے مظلوم فرقۂ اناث کے واسطے غلامی کا بیج بویا۔ بیویونکو لونڈیاں بیٹیونکو بہتر اور بہنونکو خارج از ترکہ پدری بنا گئی۔

مسلمان وہ بھی تھا اور ہم بھی ہیں اسکی ہمیں خبر نہیں مگر ہماری آنکھ کے سامنے ہے وہ سماں کہ ایک منصف حقیقی تخت عدالت پر ہے۔ بدنصیب عورتونکی شکایت اس کے حضور میں ہے اور مجروح دلوں کے نالے عرش کے کنگورے ہلا رہے ہیں ✤

اس یقین پر بھی کہ محض کلام ربانی کے مفہوم میں غلط فہمی سے طارق خسرالدنیا والآخرہ کا مصداق ہو گیا۔ قیاس کام نہیں کرتا کہ اس نازک وقت میں جب ولی نبی فاضل و عالم سب نہ بولیں گے طارق کے پاس ان مظالم کا کیا جواب ہوگا۔

طارق اور شعبانہ دونو مر چکے انکی ہڈیاں گلکر خاک ہو گئیں اور قبروں کے نشان تک نہ رہے مگر چشم بینا مظلوم شعبانہ کی داد دیکر قیامت تک

سنگدل باپ پر لعنت برسائیگی اور اسکی زندگی کا ہر ورق غاصبان حقوق نسواں کے واسطے ایک سبق ہوگا۔

(۱)

زمین کا مشرقی حصہ اپنی دینا کے رخ سے رات کا برقع اتار رہا تھا موذن اذان دے چکے تھے اور طائران خوش الحان صبح کا پیغام لا رہے تھے گو کائنات کے ہر ذرہ پر رونق برس رہی تھی۔ مگر افسردہ صورت تھی تو ایک چالیس روز کی زچہ جو گود میں بچہ لیے اس کے چہرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ مامتا کا جوش دلمیں لہریں لیتا تو فرط محبت میں جھک کر پیار کر لیتی مگر بیٹی ہونے کا خیال کچھ ایسا ملال تھا جو افسردگی و اضمحلال کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا میاں کی خفگی دیورانی کے بول ساس نندوں کا عتاب۔ ایک بخار تھا کہ چڑھا چلا آتا تھا۔

باعتبار تمول و اقتدار طارق کی بیوی شبانہ کی ماں فرزانہ والی سردارپور کی بہو تھیں انتصار آباد کی چھوٹی بیٹی۔ چوٹی کی رئیس زادیوں میں تھی جسکی سخاوت کے آگے ریاست کے تمام امیر کان پکڑتے تھے۔ لاریب وہ اس قابل تھی کہ سردارپور جسقدر ناز کرے کم ہے۔ من بھر روز کا لنگر بلا ناغہ تقسیم کرتی وضع کی اتنی پوری کہ رنڈاپے کے پانچ ساڑھے پانچ سال سمان بھی ہوا اور کمال بھی ساس کی دھلیز پر بھرا پرا میکا ہوتے ساتھی جہیز کے جوڑے اور برتن کوڑیوں کے مول بیچکر مرتے دم تک اسی شان سے گذار گئی۔ دلکی اتنی اچھی کہ بیس روز سے ہوش سنبھالا اسوقت تک دم سکرات کھلا کر کھایا اور پنکھا کر پیا۔ توقع کی ایسی بچی کہ بیکس اور اپاہج یتیم اور مظلوم اس وقت بھی جب فرزانہ بیگم بیکل تھی اس کے در سے محروم نہ گئے۔

باوجود اس علم و یقین کے کہ فرزانہ کی طبیعت انسانیت کے ان جواہروں سے

مالا مال ہی کو نسا خدا کا بندہ عقل کا ایسا اندھا ہوگا جو یہ مان لیگا کہ فرزانہ جو اسوقت شبانہ کو گود میں لیئے بیٹھی تھی بیٹی کی پیدائش سے اس لیئے مغموم تھی کہ بیٹا کیوں نہوا اسکا بس چلتا تو وہ شبانہ کو چوم چاٹ کر سر آنکھوں پر رکھتی اور اس ایک بیٹی کو سات بیٹوں پر سے قربان کر دیتی شبانہ ان ہی خیالات میں غلطاں اور اسی قسم کے تفکرات میں پیچاں تھی کہ ماما باہر سے خط لائی کہو لا تو یہ تھا۔

بیگم چھٹی سے چلّے تک تمھارے درجن بھر سے زیادہ خط پونچے بھگتنا تو خدا اگر کوئی پھیڑا دیدیتا ہے تو اسکو بھی پڑتا ہی ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان تکلیف و شکایت زبان ہی پر نہ لائے لڑکی ہوئی تو تمہیں مبارک اور بھاگوان ہوئی تو نانا نانی کو نصیب میرا تو درہی سے سلام ہے خوشی ہوئی تو انتصار آباد جاؤ شادیانے بجواؤ اور نوبت نقارے رکھو۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ انتصار آباد والوں میں تو چار بیٹوں کی بیٹی ہے مگر گرکپ ہی جائے گی لیکن سردارپور کی ریاست سے یہ پانچویں پشت ہے کہ کسی بیٹی کو ٹکا ٹکہ نہ ملا ہو۔

میری رائے میں چونکہ لڑکی کی ولادت ایک ناگہانی مصیبت ہے اور سو جھگڑوں کا ایک جھگڑا صرف عورت کی ذات اس لیے میری دلی آرزو ہے کہ گو شبانہ کی پیدائش نے تمام آرزوؤں پر پانی پھیر دیا پھر بھی میں اسکو بنا غنیمت سمجھوں گا کہ خدا اسکا پردہ ڈھانک لے۔

(۲)

فرزانہ۔ اے ہے! دیکھنا تم کیسے بھرمنہ کو ستے ہو، نگوڑی چار برس کی پلی پلائی بچی پورے کا پورا چاروں طرف بنا کی طرح باتیں ملکاتی پھرتی ہے

نوج مرے،

طارق۔ تم گھر کی بیٹھی والی عورت تمہیں کیا معلوم یہ فتنی کیا کیا غضب ڈھائیگی میں تو بھگت چکا ہوں۔ آپا جان کو ترکہ سے محروم کرنا میری ہی ہمت تھی ورنہ وہ تو ہتائی ریاست ٹبوا ہی چکی تھیں تمہیں کیا معلوم نہیں عدالت ابتدائی نے تو شرع کے موافق ڈگری کر ہی دی تھی وہ تو خدا مفتی صاحب کا بھلا کرے اگر وہ رواج کے مطابق فتوی نہ دیتے تو دریا پار کے آٹھوں موضع شریع کی رو سے ہاتھ سے نکل ہی چکے تھے۔

فرزانہ۔ توبہ توبہ شرع کو تو اس طرح سے نہ کہو۔

طارق۔ توبہ کی کیا بات ہے میں اگر قرآن کے کسی فیصلہ کو (نعوذ باللہ) نامناسب سمجھتا ہوں تو صرف لڑکیوں کے ورثہ کو انکا وجود ہی غیرت و حمیت کا خاتمہ کر دیتا ہے اسپر شریہ کہ گالیاں کھاؤ اور سہا لیاں دو

فرزانہ۔ خدا کے لیے تم میرے سامنے تو کلام اللہ کو اس طرح کہکر مجھے گنہگار نہ کرو۔ میں یہاں سے اٹھ جاتی ہوں۔

طارق۔ لو یہ دستاویز دیکھتی جاؤ۔ دریا پور کے نصف حصہ میں سے چار آنے میں تم اور خالہ باقی اکیس سالم مواضعات خدا میاں کاظم کو نصیب کری

(۳)

برسات اور بھادوں دنیا میں آتی اور جاتی ہیں سردار پور ایسی انوکھی بستی نہ تھی کہ اکیس دن اور رات جھڑی نے تھمنے کا نام ہی نہ لیا۔ بارش کی اس کثرت کا نتیجہ بخار کی شدت ظاہر تھی اس زور سے چمکا کہ گھر کے گھر پڑ گئے یہانتک بھی غنیمت تھا جو پڑا لوٹ پیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اکتوبر کا شروع ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے موت کی آوازیں آنے لگیں کیسے کیسے کڑیل جوان دیکھنے دکھانے کے لائق

دو دو تین تین گھنٹوں میں چٹ پٹ ہو گئے ایک کہرام تھا کہ ریاست میں مچا ہوا تھا یتیموں کے بین رانڈوں کے بیان ماباپوں کے نالے کلیجے دھلاتے تھے کیسا قیامت خیز وقت تھا کہ لوگ بھرا گھر چھوڑ چھاڑ جنگلوں میں جا پڑے بھاڑ تھا کہ بھن رہا تھا۔ ایک پندرہ ہی دن میں بیسیوں گھر تاراج اور سیکڑوں آدمی خانماں برباد ہو گئے۔ بخار کیا قہر خدا تھا کہ ٹوٹ رہا تھا۔ ایک ایک دنمیں ایک ایک گھر سے تابڑ توڑ تین تین اور چار چار میتیں نکل گئیں وسط اکتوبر میں جا کر وہ زور کم ہوا تو ذرا دل ٹھکانے ہوئے سترہ تاریخ کا ذکر ہے۔ طارق اور کاظم دونو باپ بیٹوں نے خاصی اچھی طرح چاپلی انڈے کھائے باتیں کیں ناشتہ سے فارغ ہوتا تھا کہ طارق کے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے لگے حرارت ہوئی بخار چڑھا اور اس غضب کا چڑھا کہ دوپہر سے پہلے پہلے طارق لوتھ پوتھ تھا۔ دل تو پہلے ہی ہوا ہو رہے تھے طارق کے پڑتے ہی سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ ڈاکٹر حکیم تو میں۔ یہ۔ وہ۔ تمام سرکار پور امنڈ پڑا۔ جو جو کچھ جس جس سے ہو سکا اپنی کرنی میں کسر نہ کی۔ مگر بخار ہی نے جنبش نہ کی تین دن اور تین رات اسی فراتفری میں گذر گئے زندگی کی امید تو پہلے ہی دن ختم ہو چکی تھی مگر ہاں سانس کے ساتھ تھوڑی سی آس باقی تھی۔ چوتھے روز حالت اور بھی خراب ہو گئی زبان بند آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں پیٹنا مچ گیا۔ دو دن اور ڈیڑھ رات یوں ہی گذرے۔

فرزانہ کے خدمت گذار ہونے میں کلام نہیں مگر بدنصیب چار دن اور چار رات بیٹھے بیٹھے تھم ہو گئی۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام تھی۔ دہاڑیں رو رہی تھی۔ پانچویں روز پٹاری پر سر رکھ کر لیٹی تھی کہ زلزلے کا بخار آدھمکا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا کہ طارق نے آنکھ کھولی دیکھتا کیا ہے کہ شبانہ

قدموں سے آنکھیں مل رہی ہے۔ یہ ننھی سی معصوم جان جس نے ابھی مشکل سے اپنی عمر کی آٹھ منزلیں طے کی ہونگی اچھی طرح جانتی تھی کہ باپ میری صورت سے بیزار اور بھائی کا عاشق زار ہے مگر اس محبت سے مجبور ہو کر جو فطرت نے اسکی طینت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی وہ دیوانہ وار باپ کی صورت دیکھ دیکھ کر بیقرار ہو رہی تھی اس کے ہاتھ اوٹھا کر اپنے منہ سے ملتی اس کے منہ پر منہ رکھتی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال بھینچ بھینچکر چمٹتی اور لپٹ لپٹ کر روتی۔ گو باپ نے اسے کبھی منہ نہ لگا بلکہ سنگدل اس کی جان کا سدا دشمن رہا۔ مگر وہ ہمیشہ باپ کے نام کی دیوانی رہی دور سے اس کا منہ دیکھتی اور نہال نہال ہوتی۔ گود میں بیٹھنا کبھی نصیب نہوا لیکن وہ گھر میں گھسا اور اوسکی جان میں جان آئی۔

طارق نے آنکھ کھولکر جسوقت پانی مانگا ہے اور شبانہ جتنا ممکن پانی کو پکی ہے کائنات کی ہر شے آدھی رات کے وقت اسکو دعائیں دے رہی تھی طارق پانی پیکر سوگیا۔ کاظم اپنے دوستوں کی صحبت میں مزہ کر رہا تھا۔ شبانہ باپ کا سر دبا رہی تھی اور آنکھ سے زار قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

گنتی پوری کرنے کو تو کوڑی بھر سے زیادہ آدمی موجود تھے مگر غمخوار تھے۔ دردمند کوئی نہ تھا۔ فرزانہ کے پڑتے ہی سب ڈھیر ہو گئے مائیں اصیلیں۔ چھوکریاں۔ مغلانیاں کھانے اور غرانے والیاں تھیں۔ ہاں ایک اس بڑھیا کے کلیجہ کو تو ضرور لگ رہی تھی جس نے طارق اور طارق کے باپ دونوں کو دودھ پلایا۔ مگر پانچ اوپر سو برس کی عورت اندھی کانوں سے بہری۔ چلنے کی وہ نہیں پہرنے کی وہ نہیں خدمت اور تیمارداری تو الگ رہی یہ عالیشان محل سرا اور ایک سڑدوں ٹوں شبانہ بیما

باپ کے سرہانے بیٹھی حسرت و یاس سے اسکی صورت دیکھ رہی تھی اور معصوم دل اندر سے صدا دے رہا تھا کہ "شعبانہ باپ چند لمحہ کا مہمان ہے۔ جو صورت دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی وہ اب ہمیشہ کو چھوٹی قریب آگیا وہ وقت کہ جس باپ کو دیکھکر چلّوں خون بڑھتا تھا وہ پیوند زمین ہو جائے" داغ پدری کا خیال اور مفارقت ابدی کا کھٹکا ایک کاری تیر تھا جو ننھے سے دل پر جا کر لگا اور شعبانہ یہہ چیخ مار کر باپ سے لپٹ گئی

"اے اللہ میرے ابا جان کو اچھا کر دے"

شعبانہ کے چیخ مارتے ہی طارق نے آنکھ کھولی مظلوم اور معصوم بچی کے ننھے ننھے ہاتھ باپ کے گلے میں پڑے ہوئے تھے منہ اس کے منہ پر تھا اور سنگدل باپ کی ڈاڑھی بیٹی کے آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی وہ پژمردہ دل جسکی تمام آرزوئیں چند لمحہ پہلے بجھ گئی تھیں جس پھول کی تمام پنکھڑیاں مرجھا چکی تھیں۔ باپ کے ہوشیار ہوتے ہی باغ باغ ہو گیا۔ اسوقت شعبانہ فرط محبت میں ایسی بیقرار ہوئی کہ اس نے باپ کے منہ کو بیساختہ بوسہ دیا۔ اور عاجزی سے کہنے لگی

ابّا جان کیسا جی ہے؟ پانی لاؤں؟

طارق کا بخار اتر چکا تھا اور گو طبیعت ضعف و نقاہت سے نڈھال ضرور تھی مگر تکلیف کو سکون تھا۔ چانچ رہے تھے شمع کی روشنی جھلملا رہی تھی اور شعبانہ کی وہ آنکھیں جو پانچ روز سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں باپ کے چہرہ پر اسکی نگاہ سے شفقت پدری کی متوقع تھیں مگر افسوس بدنصیب بچی کی محبت کا بدلا نفرت نکلا اور جس آنکھ سے شفقت کی امید تھی اس سے غصہ ٹپکنے لگا۔ طارق کو اسوقت شعبانہ کی صورت زہر معلوم ہوئی اور اس سوال کا

جواب یہ ملا +

ہاں پانی پیئوں گا مگر اپنی اماں کو جگاوے وہ پلائیگی۔

شعبانہ۔ انکو بھی بخار ہوگیا میں ابھی لاتی ہوں۔

طارق۔ نہیں! ان ہی کو جگادے۔ یا کاظم کو بلوالے۔

شعبانہ۔ بھائی جان تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔

طارق۔ بس تو اپنی ماکو جگا۔

بہ ظاہر فرزانہ کا بخار طارق سے زیادہ اور تکلیف اس سے کم نہ تھی بیمار تھے تو دونو اور لاچار تھے تو دونو۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ مرد تھا یہ عورت طارق اگر دنوں کا بیمار اور چند لمحہ کا ہشیار تھا تو فرزانہ کئی راتوں کی جاگی اور کئی گھنٹوں کی بیمار۔ طارق کو اگر پانچ روز تک بخار کی تکلیف اور درد کے کرب سے دم بھر آرام نہ ملا تو فرزانہ کو بھی پانچ روز اور چھ رات روٹی کا بھوڑہ تک حرام تھا۔ وہ پسینہ میں شرابور تھا تو یہ بھی کچھ کم کمزور نہ تھی فرق بیّن یہ تھا کہ اسکا بخار اُتر چکا تھا اسکو بخار چڑھا ہوا اس پر طرہ طارق ماشاء اللہ پورا جوان چیرو چار بگھار و پانچ۔ فرزانہ غریب دہان پان عمر بھر کی روگی بارہ مہینہ کی بیمار۔ جسکو گرمی دانہ بھی موت کا بہانہ تھا۔ وہ گھر کا رئیس تھا تو یہ بھی کچھ گری پڑی نہ تھی۔ مانا کہ سردار پور میں طارق کا راج تھا مگر فرزانہ بھی وہ عورت تھی جو سردار پور والوں کی لاج رکھ گئی۔ ایسی حالت میں طارق کا یہ حکم کہ فرزانہ اٹھکر پانی پلائے اور شعبانہ پاس سے اُٹھ جائے سراسر بیجا تھا۔ مگر خدا کی مار ہندوستان کے اس طرز معاشرت پر جس نے عورت کو لونڈی اور مرد کو مالک بنا دیا بیمار بیمار۔ دونوں ایک، جیسا انسان وہ ویسی انسان یہ مختصر شعبانہ الگ جا بیٹھی مگر دل کے ٹکڑے اُڑ گئے فرزانہ گرتی پڑتی

تھی۔ پانی پلایا۔ دن کے دس بجے طارق کی حالت بدلی۔ اچھی طرح باتیں کر رہا تھا کہ اچھو ہوا ؛ آنکھیں اور منہ کھلے کا کھلا رہا اور روح عالم بالا کو سدھاری

بچہ ہو یا بوڑھا کوڑے کا پڑا کوئی نہیں ہوتا۔ میت امیر اور غریب سب کی یکساں۔ مگر چند روز بعد کچھ نہیں بیوی بچے تھے یا بھائی بہن اور کہرام ہوا ماتم سیکن سال ہی بھر کے اندر اندر طارق کی یاد بھول بسر گئی دنوں کو جاتے دیر نہیں لگتی آنکھ بند کرتے چھ برس گذر گئے اور جو شبانہ کل کیڑا تھی آج ماشاء اللہ پوری عورت ہو گئی امارت کی شہرت ریاست کا چرچا اور سب سے بڑھکر شبانہ کی اپنی شکل صورت ایک دو نہیں پانچ پیغام اُن تعلقوں کے آئے جو سردار پور کی پوری ٹکر کے تھے اور کچھ شک نہیں کہ اگر انہیں سے ایک بھی منظور ہوتا تو شبانہ عمر بھر راج کرتی۔ مگر خدا سمجھے اس باپ کو جو بیٹی کے حق میں یہ کانٹے بو گیا کہ وصیت نامہ میں بیٹی کا نکاح اُس خالہ زاد بھائی سے تجویز کیا جو دو وقت دانوں کو محتاج تھا کہنے کو تو چچا ہے کہو مگر علت غائی بیٹی کا سر کچلنا اور بہن کو زندگی بھر بھائی کا دست نگر رکھنا تھا۔ مردے کو بُرا کہنا گناہ ضرور ہے مگر خدا معاف کرے کہ نیت پاک ہے۔

وہ خوب سمجھتا تھا کہ کہیں اور ہوئی تو یہ احمد خانی شورہ پشت کوڑی کوڑی کو گلو لیں گے اور بنے بنائے تعلقہ کی تکا بوٹی ہو جائے گی۔ اس بیچارے کو روٹی تو نصیب ہے ہی نہیں عدالت کرے گا تو کس برتے پر باپ کی یہ تجویز کاظم کے واسطے اونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ تھا بیترا ہی سر سے سر پٹکا۔ ماں تک نے ہاتھ جوڑے مگر ہی سنگدل کے کان پر جوں نہ چلی تو کس باپ کا بیٹا تھا۔ بائیس ہزار روپیہ کے مالگذار نے بہن کے نکاح کا بار اسطرح ادا کیا کہ تمام دنیا نے تھڑی تھڑی کی کمبخت فقیر بھی

بیٹی کا مان رکھ لیتے ہیں۔ مگر اس بے ایمان نے حقیقی ماجائی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دیا۔ فرزانہ کی مامتا ضرور تڑپی ہر چند تڑپ تڑپ اور پٹپٹائی مگر بیٹے نے ایسا شکنجہ میں کسا کہ تل بھر نہ اکسنے دیا۔ اور دن دہاڑے شعبانہ بھائی کی دہلیز اور ماں کے آغوش سے اسطرح رخصت ہوئی خدا دشمن کی بیٹی کو نصیب نہ کرے۔

شعبانہ کا شوہر علی گو ہر بد مزاج یا فسادی تو نہ تھا مگر اول درجہ کا کاہل اور پرلے سرے کا عہدی۔ سو رہنا اور کھا لینا یہ دو کام تھے۔ وہی گذارے کا بیس پچیس روپیہ مہینہ آنا اور تیس دن پورے ہو جانے۔

سنا تو یہ تھا کہ اولاد دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے مگر دیکھا یہ کہ اس سے بڑھکر دنیا میں کوئی مصیبت نہیں۔ شعبانہ کے بچے کوڑھ میں کھاج تھے برسویں دن کا جو نمبر لگا اور اوپر تلے گدبد ہونے شروع ہوئے تو پورے پانچ ہوئے اور غضب یہ سب بچے اور ایک نہ مرا۔ پانچ بچے دو میاں بیوی ایک بڑھیا ساس ایک اندھے سسر لو بندے اور پچیس روپے۔ پانچ سات برس تو لشتم پشتم گذر ہوئی مگر ۵۷ء کے بعد من بھر کے گیہوں بارہ سیر اور ڈیڑھ سیر کا گھی تین پاؤ رہ گیا تو اب شعبانہ کی زبان پر اللہ ہی اللہ تھا۔

فرزانہ کی زندگی تک خیریت تھا کہ وہ ان حالوں میں بھی بیٹی کے ساتھ لگی لپٹی رہتی۔ ہاتھ سے۔ پاؤں سے روپیہ سے پیسہ سے جسطرح بھی ہوتا اس سے سلوک کرتی اسکی سوت سے وہ رہا سہا۔ سہارا بھی گیا گذرا ہوا۔ مگر صد آفرین اس غیرت والی بچی کو دنیا بھر کی مصیبتیں اٹھائیں۔ غیروں کے احسان گوارا کیئے مگر بھائی بھاوج کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا اور شاباش ہے اس بے غیرت

اور ظالم بھائی کو کہ جس بہن کے ایک نہ دو اکٹھے گیارہ اور سالم موضع صاف ہضم کیئے اس کے پھلوا سے بچے ادھی ادھی کو محتاج رہے اور دل نہ پسیجا کمبخت اپنے کانوں سے سنتا کہ مری ہوئی ماں کی یادگار شعبانہ اور اس کے بچے دو دو دانوں کو ترس رہے ہیں اور آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا اپنی آنکھ سے دیکھتا کہ یہ مظلوم بہن اور معصوم بھانجے بھانجیاں فقیرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور کان پر جوں نہ چلتی۔ منوں کھانا اور تنانوں کپڑا تقسیم ہوتا مگر بہن کی تقدیر کا ایک دانہ یا ایک چیتھڑا حرام کیسی قابل نفرین زندگی تھی اس بھائی کی جس کے ہاتھوں ایک سال میں پچیس ہزار روپیہ نقد اپنی آسائش میں صرف ہو۔ اور بہن بھانجیوں کے سر پر ثابت اوڑھنی تک نہ ہو،

انگریزی کی یہ مثل کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی شعبانہ کے معاملہ میں اصل ہوگئی شوہر لاکھ اجدی اور کامل تھا مگر پیسہ نہیں دھیلا اور دھیلا نہیں دمڑی۔ سوکھی روکھی۔ تازی۔ باسی۔ موٹا جھوٹا کچھ نہ کچھ تو لاتا ہی تھا مگر بدنصیب کی تقدیر نے وہ بھی نہ رکھا اور علی گوہر خاصا اچھا بھلا چنگا۔ تین دن کے بخار میں چٹ پٹ ہوگیا۔

افلاس کو ڈیرے ڈالے تو مدتیں ہو چکی تھیں میاں کی موت نے بے والی وارث کر کے شعبانہ کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ کوئی جھوٹی سچی غمخواری ہی کر لیتا جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں ہوتیں ڈھنڈھار گھر ہوتا وہ ہوتی ننھے ننھے بچے ہوتے اور فاقوں پر فاقہ ہوتا۔

شعبانہ اسوقت انقلاب زمانہ کی پوری تصویر تھی خدا کی شان جس فرزانہ کے در سے سیکڑوں رانڈیں پلیں اور یتیم بڑھے اس کے اپنے

نواسے چلّے کے جاڑوں میں سوں سوں کرتے پھرتے اور رات کو پھٹی ہوئی دری اور بیسر لوئیں لپٹ کر پڑ رہتے۔

متواتر تین سال اسطرح گذرے کہ شبانہ اور اس کے بچونکو پیٹ بھر کر ٹکڑا نصیب ہوا۔ نہ ڈھنگ کا چیتھڑا رات بیسیوں ایسی بیت گئیں کہ شبانہ نے اپنے بھوکے بچونکو تپک تپک کر سلا دیا۔ اور دن سیکڑوں اسطرح گذر گئے کہ بن باپ کے بچوں نے حقیقی ماموں کے پڑوس میں ایک دیوار بیچ مٹھی مٹھی چنوں پر شام کر دی۔

آخر وہ وقت آگیا کہ ضرورت نے شبانہ کی آن تڑوا دی یہ وہ دن تھا جب شبانہ تین وقت کے فاقہ زدہ بچونکی واویلا کی تاب نہ لاسکی اور حقیقی بھائی سے یہ التجا کی کہ "میرن ان بے باپ کے بچونکو جنکا خدا کے سوا کوئی وارث نہیں اپنے رحم سے جلا دے"۔

مگر بھائی کے اس جواب نے کہ شبانہ ابھی تو نے نالش نہیں کی بہن کی تمام توقعات پر پانی پھیر دیا اسنے بصد حسرت و یاس بھائی کے چہرہ پر وہ نظر ڈالی جس سے عاجزی اور مجبوری ٹپک رہی تھی۔ بھوک سے کلیجہ کھسچ رہا تھا اور کلیجے کے ٹکڑوں کی بھوک۔ انکا بلکنا اور رونا کلیجے کے ٹکڑے اڑا رہا تھا۔ اتنا کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں رانڈ دکھیاری کس برتے پر نالش کروں گی لے ماں جائے معصوم بچونپر آج تیسرا فاقہ ہے اور انکی ماتا تیرے در پر بھیج لائی تھی۔ چلی تو آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور گھر پہنچی تو پہلونٹی کا دس برس کا پلا پلایا بچہ ہیضہ میں مبتلا تھا۔

کیا دردانگیز سماں تھا رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ چراغ ٹمٹما رہا تھا اور وہ شبانہ جسکو آدھی کی کوڑیاں دوائی تک کو نصیب نہ تھیں

اپنے لال کو کلیجہ سے لگائے بیٹھی اللہ اللہ کر رہی تھی دل ہوا ہو رہا تھا آنکھ سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ رہی تھیں۔ چراغ بجھ گیا اور اندھیرے گھپ میں بدنصیب مانے چند لمحہ کے مہمان بچہ کو ٹٹول ٹٹول کر پانی پلایا کاظم کا درباری گھنٹہ چار کا گجر بجا رہا تھا کہ بچہ بالکل سرد پڑ گیا شبانہ بے اوسان ہو کر اوٹھی اور بیتابانہ باہر آئی تاروں بھری رات حسرت نصیب ماں کے سر پر تھی پچھلے پہر کا سناٹا معبود حقیقی کی یاد دلا رہا تھا سجدہ میں گری اور کہا۔

"الٰہ العالمین دس برس کی محنت ہے رحم کر"

دفعتہً بچہ کی آواز آئی۔ "اے بی اماں آؤ۔"

بیقرار ہو کر دوڑی اور چھاتی سے لگا کر لیٹ گئی۔

شبانہ اپنے فاقہ زدہ بچہ سے لپٹی پڑی تھی کہ آخری سسکی نے وہ چاند سی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو ماں سے جدا کر دی۔ منہ پر منہ رکھکر پیار کرتی ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگاتی اور ہائے کا نعرہ لگا کر الگ جا پڑتی دل تڑپتا پھر اٹھتی۔ پٹتی اور کہتی ہائے اللہ میرے مردے کو روشنی بھی نصیب نہ ہوئی۔

سترہ جنوری ۱۸۱۱ء وہ کمبخت روز تھا جسکی نظیر تاریخ سردار پور میں نظر نہیں آتی صبح صادق کا سہانا وقت تھا اور ایک چھوٹا سا قافلہ ایک عورت اور پانچ بچے چار زندہ اور ایک مردہ کلکٹر صاحب کے بنگلہ پر فریادی تھے میم صاحب باہر نکلیں تو شبانہ نے کہا۔

میں والی سردار پور کی حقیقی بہن اپنے اس بچہ کا کفن آپ سے لینے آئی ہوں جسکو ماموں کے پڑوس میں آخر وقت چراغ تک نصیب نہ ہوا سرکار! یہ لال جو آپ کے سامنے مردہ پڑا ہے چوتھے وقت کے فاقہ سے

میری گود میں رخصت ہوا۔ چار معصوم آج چار وقت سے ایک ایک دانہ کو محتاج ہیں باپ کی ریاست میں میری تقدیر کا ایک پیسہ نہ تھا مجھ پر اندر لیبا پر رحم کیجئے۔ میرے ایک بچے کی مٹی ٹھکانے لگائیے اور اپنے بچونکا صدقہ ان بچوں کے پیٹ میں کچھ ڈال دیجئے جنکا بھوک کے مارے آنکھوں میں دم ہے +

(۴)

مئی ۱۹۰۶ء کی گیارہویں تاریخ ٹھیک دوپہر کے وقت عدالت العالیہ آگرہ آباد میں چوٹی کے وکلا جمع ہیں اور ایک مسلمان عورت برقع اوڑھے دو بچوں کا ہاتھ پکڑے کٹہرے میں کھڑی ہے۔ گردن نیچی ہے اور شرم اتنی اجازت نہیں دیتی کہ اپنا مدعا بیان کرے۔

یہ مظلوم عورت وہی بدنصیب شبانہ ہے جس کے ساتھ کلکٹر صاحب کی رحیم کو اتنی ہمدردی ہوئی کہ اپنے پاس سے روپیہ دے کر وکیل کیا مقدمہ کے مصارف برداشت کیے اور تقسیم جائداد کا دعویٰ دائر کر دیا۔ آج مقدمہ کی آخری پیشی ہے اور زبدۃ العلماء حاجی الحرمین امام الفضلا شمس الکملا۔ مولانا مولوی مفتی ابوالمتین محمد فخر الدین مدظلہ کی شہادت پر فیصلہ کا انحصار ہے مسٹر سٹوبٹ مدعیہ کے پیروکار ہیں اور باقی جماعت مدعا علیہ کی جانب دار۔ دو بجے کے قریب مقدمہ پیش ہوا تو مفتی صاحب نے فرمایا

میری عمر اسی سال کی ہے اس نواح کے قریب قریب تمام تنازعات اسی خاکسار کی تجویز سے منفصل ہوتے ہیں مدعیہ کا یہ دعوے کہ وہ شرع اسلام کے بموجب ریاست سردار پور میں ایک تہائی کی حصہ دار ہے باطل ہے۔ ہمارے ان عام

دستور ہے کہ لڑکیاں ترکہ پدری سے حصہ نہیں پاتیں اور یہ رواج
قریب قریب سو سال سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ میری رائے
میں مدعیہ ترکہ کی مستحق نہیں اور اسکا دعویٰ خارج ہونیکے قابل۔

مفتی صاحب کی رائے پر تمام عدالت میں سناٹا چھا گیا اور ججان عدالت حیرت سے زبدۃ العلما کا منہ تکنے لگے۔ مدعیہ کے وکیل نے کہا،

وکیل۔ جناب کا مذہب؟

مفتی صاحب۔ اسلام!

مسٹر سٹوبیٹ۔ قرآن مجید کی بابت آپ کا کیا یقین ہے؟

مفتی صاحب۔ میں اوسکو کتاب اللہ یقین کرتا ہوں۔

مسٹر سٹوبیٹ۔ آپ احکام قرآنی کے پابند ہیں!

مفتی صاحب۔ بشرطیکہ رواج کی پابندی اس حکم سے متناقض نہو۔

پادری جیکب صاحب نے جو مذہب عیسوی کی اس نواح میں اشاعت کرتے پھرتے تھے اور معہ اپنی جماعت کے عدالت سے باہر موجود تھے مفتی صاحب کے یہ الفاظ سنکر کہ

"میں کتاب اللہ کے ان احکام کا پابند ہوں جو رواج سے متناقض نہ ہوں"

ہپ ہپ کے نعرے لگائے اور مدعیہ کا دعویٰ خارج ہو گیا۔

حیات مستعار کی اُس بستی میں جو تسلیم ناپائدار سے تعبیر کیجاتی ہے عصب ایک دریائے ناپیدا کنار لہریں لے رہا ہے۔ بار آور درختوں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں اور میووں سے لدی ہوئی ڈالیاں جھوم جھوم کر

زمین کو چوم رہی ہیں کیسا دلفریب منظر ہے صبح صادق کا سہانا وقت طائران خوش الحان کی نغمہ سنجی نشۂ حیات کو دوآتشہ کر رہی ہے۔ مذہب مقدس کو بدنام کرنے والے مدعیان اسلام اس زمین پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ زندگی کے اکثر راز اور دنیا کے بہت سے نشیب و فراز پورے ہوئے۔ عمر کی بڑی بڑی گھاٹیاں طے ہوچکیں منزل مقصود دکھائی دے رہی ہے اور وہ وقت سر پر ہے کہ موت جسکو مذہب ہادم اللذات بتا چکا روز روشن کو کالی بھبوکا رات بنا کر جزائے اعمال کے شکنجہ میں کسے اور یہ صفحہ دنیا سے ناپید ہوجائیں۔

مگر نہیں! انہیں، نفس کے بندوں اور آنکھوں کے اندھوں! دنیا تمہارے کارنامے فراموش نہیں کرسکتی۔ جبتک مسلمانوں میں فرقہ نسواں کا وجود باقی ہے تمھاری عنایتیں روز روشن کیطرح چمکتی رہیں گی! مظلوموں کی فریاد تمہاری قبروں پر نوحہ خوانی کرے گی، اور مجروح دلوں کے نالے مدۃ العمر تمہارے فاتحہ خواں ہونگے۔

تم میں سے اکثر تم سے رخصت ہوئے اور گو بظاہر خالی ہاتھ گئے۔ مگر درحقیقت بڑے بڑے توشہ ساتھ لے گئے! دیکھو ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھو، یہ پکے پکے مزار اور ٹوٹی پھوٹی قبریں اُن ہی آن بان والوں کے نشان ہیں۔ خود غرضی ان کے ڈھیروں پر برس رہی ہے اور فلک پیران کے مظالم یاد کرکے انپر نفرت کے پھول چڑھا رہا ہے۔

غفلت میں رہنے، ندامت سے چلنے، اور مٹی میں بسنے والی صورتو عروس دنیا جس کے تم دیوانے رہے تمہارے ساتھ چھوڑ چکی اور ظلم و ستم کی گٹھریاں تمہارے سر پر رکھکر منہ موڑ گئی۔ تم نہیں ہو مگر یہ پیرزال تمہارے اعمال کو از سر نو زندگی بخش رہی ہے۔ جو بیج تم نے کل ڈالے تھے وہ آج

پھل لے آئے صلحت و قسمت کا بڑا حصہ مرمر کر اور پٹ پٹ کر زندگی بسر کر رہا ہے اور یہ بھولی بھولی صورتیں حسن کی گویاں اور عصمت کی مورتیں تڑپ تڑپ کر آہیں اور دن گذار رہی ہیں۔

تجھ سے بدتر دل رکھنے والی روحوں، تم ختم ہو چکے مگر تمہارے ظلم ختم نہیں ہوئے۔ تمہاری آتش فشاں طبیعتوں سے وہ وہ چشمے پھوٹے ہیں جو قیامت تک خلق خدا کو کھولاتے رہیں گے۔

دنیا اور دنیا کے کارخانے نیست و نابود ہو جائیں مگر تم ایسی یادگار چھوڑ گئے ہو کہ یہ قیامت میں بھی زائل ہونے والی نہیں۔ آنیوالی نسلیں اور پیدا ہونے والی بیٹیاں میدان حشر میں بھی تمکو فراموش نہ کریں گی۔

عزیزوں، اور بھائیوں، جو مرحلہ تم طے کر چکے ہمیں طے کرنا باقی ہے دور نہیں ہے وہ دن کہ قانون قدرت ہمیں تم تک پہنچا دے۔ اس صاف گوئی کو معاف کرنا اور اس لیے کہ تمہارے مقام ہم سے بہتر اور ہمارا خدا تم سے قریب تر ہے ہماری دعاؤں میں شریک ہو اور التجاؤں پر آمین کہو خالق حقیقی! ہماری ان پیاری بچیوں کا تیرے سوا کوئی وارث نہیں دنیا اسپر بھاری ہے اور زندگی انپر سخت۔ ان کی حالتوں پر رحم کر اپنی شفقت کا ہاتھ انکی حمایت کو بڑھا انکی شکایت سن اور کرم فرما۔

افسوس گیارہ تاریخ کے بعد جس روز مقدمہ فیصل ہوا شبانہ کی حالات باوجود تلاش کے کہیں مل سکے سردار پور والوں کو پھر اسکی صورت دیکھنی نصیب نہوئی خدا معلوم آسمان کھا گیا یا زمین زندہ رہی یا مر گئی یہ علم تو خدا ہی کو ہے لیکن یہ یقین ہمکو بھی ہے کہ بدنصیب شبانہ اور مسلمان علامہ فخر الدین کا مقدمہ ایک اور عدالت میں بھی فیصل ہوگا اور وہ اس حاکم کی عدالت ہوگی جسکے ازلی و ابدی راج کے گیت دنیا کا ہر ذرہ گا رہا ہے۔ راشد الخیری

قطعہ

بہت سے مسئلے پیشِ نظر ہیں اہلِ عالم کے
ولیکن مسئلہ ایسا نہیں کوئی بھی پیچیدہ

کہ ہم واقف تو ہوں کیا ہمکو کرنا چاہیے لیکن
جو نوبت کام کی آئے تو ہمکو کچھ نہو پروا

نہیں معلوم کیا ہمکو کہ ہم اب مٹتے جاتے ہیں
ہماری ہستیِ قومی کا بگڑا جاتا ہے نقشا؟

نہیں معلوم کیا ہمکو کہ ہم کمزور ہیں کیسے؟
اور اس عالم میں جو کمزور ہے وہ جی نہیں سکتا

نہیں معلوم کیا ہمکو کہ ہیں اک قوم جاہل ہم؟
اور اپنا کام بے تعلیم ہرگز چل نہیں سکتا

ہمیں معلوم سب کچھ ہے ولیکن کچھ نہیں کرتے
بغیر از سودائے سست تمنا کچھ نہیں ہوتا!

پسے جاتے ہیں ہم زیرِ قدم اقوامِ عالم کے
اور اپنا حال یہ ہے ہم سے کچھ بھی ہو نہیں سکتا

رکھا ہے ذوقِ عیش و غفلت نے بسر یہ کیفیت
ہم اپنے خواب خانے میں ہیں مستقبل سے بے پروا

جو منہ پر آئے کہتے ہیں جو جی میں آئے کرتے ہیں
ہمیں کس بات کا ڈر ہے ہمیں کس بات کی پروا

منے کی زندگی ہے، وقت بیکاری میں کٹتا ہے
نہ ہے امروز کی کچھ فکر نے اندیشۂ فردا

اوامر سے ہمیں غفلت نواہی سے ہمیں رغبت
کیا ہے نام روشن ہم نے بھی اسلام کا کیسا!

نشے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں اپنی محفل میں
توجہ کے ذرا قابل نہیں دنیا و مافیہا

کہیں ہے خانقہ مستی اور کہیں عشرت پرستی ہے
غرض ہو بات ہے اپنی سراسر ہے وہ ناریا

ہوئی ہے مبتذل اس درجہ میں قوم کی حالت
یقیں آتا نہیں اپنے گزشتہ عہدِ زرّیں کا

کچھ عبرت رہی ملیں نہ ہے کچھ حوصلہ باقی
ابد تک اس سے بڑھ کے نا کامی کا نقشہ اور کیا ہوگا

ابھی تو بھی اگر ہمکو سنبھالے تو سنبھلتے ہیں۔
وگرنہ ڈوب تو کوئی بھی نہیں ایسے سنبھلتے کا

شبِ تاریک و بیم موج و گردابی چنیں حائل
کجا داند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا۔ رضا علی وحشت

تاریخ بیجانگر

مولوی بشیر الدین احمد صاحب تعلقہ دار رائچور کے اسم گرامی سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ مولانائے محترم نے اپنے والد بزرگوار شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کی قابل قدر علمی خدمات میں جو کچھ اضافہ فرمایا وہ ادب کے دلی شکریہ کا مستحق ہے آپ کی تصانیف اقبال و اختر، طفلان غیر نے جو قبولیت حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں تاریخ بیجانگر مولانائے موصوف کی اس سعی محنت و جانکاہی کا پتہ دے رہی ہے جو آپنے اس کے مکمل کرنے میں گوارا فرمائی۔ کتاب بتعدد سادہ و رنگین نقشوں سے آراستہ ہے اور یہ خوبی اسکی قدر و قیمت کو دوبالا کر رہی ہے ہر واقعہ قابل مصنف کی محنت و تلاش کا پتہ دیتا ہے۔ چھپائی کاغذ اور بالخصوص ٹائیٹل پیج قابل داد ہے ہمیں امید یقین ہے کہ پبلک و قوم میں مولانائے موصوف کی یہ محنت قبول سے دیکھی جائیگی اور قدر دانان ادب قابل مصنف کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ مصنف سے رائچور کن سے مل سکتی ہے۔

حضور نبوی میں خون شہدا کی نذر

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا — جہاں سے باندھ کے احرام قصد فرمایا ہو
قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن — نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
ہزار شیخ اجل اشتیاق آزادی — سمندِ عمر کو اک اور تازیانہ ہوا
فسردہ بزم رسالت میں سے گئی مجھکو — حضور آیۂ رحمت میں سے لئے مجھکو
کہا حضور نے عندلیب باغ حجاز — کل کلی سے ہے تری گرمی نوا سے گداز
جبینِ خوش جام و لبالب ہے دل تیرا — فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز
اڑا جو پنچی دنیائے قدسی گردوں — سکھائی تجھکو ملائک نے نغمہ پرواز
گل کے باغ جہاں سے بزنگ باد آیا — ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
کہا یہ میں نے کہ سچی خوشی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ریاض دہر میں ہیں گل تو رنگ رنگ کے پھول — وفا کی جس میں ہو بوئے وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں۔ — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(اقبال)

کوہِ علم

سال کے اس موسم میں جب آسمان کی صفائی۔ زمین پر لہلہاتے ہوئے رنگا رنگ میوے۔ درختوں کی بدرنگ پتیاں اور آغاز خزاں کا دلکش مگر چند روزہ منظر دماغ کو آزادہ رو اور تخیل کے مناسب بنا دیتا ہے میں ایک خلوت اور خوش سواد گاؤں کی سیر کر رہا تھا جب عجائبات قدرت کے نظاروں نے ماندگی پیدا کر دی۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا جس پر ہری ہری کائی جمی تھی۔ میں اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے دلخوش کن تخیلات کے مزے لوٹنے میں مصروف تھا کہ خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ آبشار کی خوش آمند صدا اور قریب کے شہر کی گونج نے میرے دماغ کو ایک راحت فزا سکون بخشا اور نیند نے چپ چاپ مجھ پر غلبہ کر لیا۔

چشم زدن میں میں نے اپنے تئیں ایک لق و دق وادی میں پایا جسکے وسط میں ایک بلند پہاڑ واقع تھا جو پہلے کبھی میرے وہم میں بھی نہ آیا ہوگا۔ یہ آدمیوں کی کثیر التعداد جماعت سے اٹا تھا جس میں اکثر لوگ نوعمر نظر آتے تھے اور پر حوصلہ بشرے کے ساتھ آگے کو بڑھے پڑتے تھے۔ اگرچہ راستہ اکثر مقاموں پر بہت ڈھلوان اور نہایت دشوار گذار تھا ؎ (داغ)

الٰہی جوشِ وحشت اب کے گر پڑتا ہی داغ — خارِ صحرا بانو میں ہی شوق ہاموں دلمیں ہے

میں نے غور کیا تو دیکھا کہ جنھوں نے ابھی ابھی پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا ہی وہ اپنی تئیں چوٹی سے کچھ دور نہیں سمجھتے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں متواتر نئی نئی پہاڑیاں پیش نظر ہوتی جاتی ہیں چنانچہ پہلے جسکو بلند ترین قلہ تصور کرتے تھے آگے چلکر دوسری پہاڑی کا دامن نظر آنے لگتا ہی آخر کار معلوم ہونے لگا کہ اس پہاڑ کی چوٹی بادلوں میں غائب ہوگئی ہی میں یہ تماشے تعجب خیز نگاہوں سے دیکھنے میں مصروف تھا کہ یکایک میری عقل سلیم نے آکر مجھ سے کہا "تیرے سامنے جو پہاڑ ہی اسکا نام کوہ علم ہی۔ چوٹی پر صدق کا مندر ہی جسکا گنبد بادلوں سے بھی بلند ہی اور دیوی کے چہرے پر نور کی نقاب پڑی ہی ذرا اس کے پرستاروں کے ہجوم کو ملاحظہ کر اور ہمہ تن ہوش و گوش ہو جا"

نے دیکھا کہ اس پہاڑ پر چڑھنے کا کوئی سیدھا راستہ اگر ہے تو ایک ہی دروازہ کے ذریعہ سے جسکا نام **باب الالسنہ** ہے۔ یہ پھاٹک ایک عورت کے زیر نگرانی ہے جس کے چہرے سے غور و فکر ترشح ہے اور لب ہر وقت ہلتے رہتے ہیں گویا آپ ہی آپ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ اس عورت کا نام **حافظہ** ہے۔ اس پہلے احاطہ میں پہونچکر میں پریشان اور بے جوڑ صداؤں سے ٹھٹک گیا کیونکہ ان عجیب و غریب آوازوں سے میرا گیا تھا جنکی کوئی مثال اگر ہو سکتی ہے تو شہر بابل کے خلط لسنہ کے واقعہ سے

اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں قلعہ کوہ کی جانب اٹھائیں جہاں کی ہوا صاف اور فرحت افزا تھی راستے پر عشق پیچاں وغیرہ ہرے سایہ کیے ہوئے تھے اور ڈیوی کے چہرے سے نور کی شعاعیں نکل نکلکر اس کے پرستاروں کے گرد و پیش دوڑ رہی تھیں۔ میں بے ساختہ بول اٹھا خوشا نصیب ان کے جنھیں اس پہاڑ پر چڑھنے کی قدرت ہو ؎ (غالب)

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔

یہ کلمے جوشوں میں میری زبان سے نکلے ہی تھے کہ میری نظر ایک اور ڈیوی پر جا پڑی جسکی صورت سے سابق الذکر کی نسبت زیادہ تجلی برس رہی تھی اور میری بغل میں کھڑی تھی وہ بولی نہیں بلکہ خوشا نصیب ان کے جنھیں **نیکی قصر القناعۃ** تک پہونچادے۔ میں نے پوچھا کیا نیکی اسی وادی میں رہتی ہے اس نے جواب دیا۔ ہاں میں اسی وادی میں رہتی ہوں اور اس پہاڑ کو اپنے جلوہ سے زینت دیتی ہوں میں جھونپڑوں میں رہنے والوں کو ان کی محنت و مشقت میں مسرت و بخشتی ہوں حکیم و دانش کو اس کے غور و فکر میں آرام بخشتی ہوں میں شہروں کی بھیڑ میں بھی ملی جلی ہوں اور زاویہ نشین پر اس کے کنج خلوت رحمت نازل کرتی ہوں ہر اس دل میں میرا مندر ہے جو مجھ کو اشرنڈیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ میں اپنے مشتاقوں کے لیے ہر وقت حاضر و مستعد ہوں بیشک سامنے تمہیں اوج منزل پر پہونچا سکتا ہے مگر اطمینان قلب اور سچی خوشی کے منزل کی ہر ایک میں ہی ہوں"۔ وہ ڈیوی یوں گفتگو کر رہی ہی تھی کہ میں غایت شوق اور تمنائے ہم آغوشی میں اپنے بازو اس کیطرف اس جوش سے پھیلا دیے کہ میری آنکھ کھل گئی ؎

جو کھلیں ہماری آنکھیں تو نہ باغ تھا نہ وہ گل وہی در و ہے قلق ہے۔ وہی آہ ہے بکا ہے۔

محمد مسلم عظیم آبادی۔

۔ خاتمہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء ۔ بتقریب تاج پوشی قیصر ہند۔ ہر دو حصہ بجا بعہ کے ایک روپیہ کو ملیں گے۔

وصل حبیب

دل انہیں دلچسپ ادائوں کی ہے تصویر رنگ اس میں سبھی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی۔ از بھوپال۔ امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیر جی شبیر علی صاحب۔ از بجنور۔ الحمد للہ کو وصل حبیب کا حصہ اول جب مراد زیور طبع سے آراستہ ہو کر پور افزائے چشم مشتاقین ہوا۔ دعا کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے۔ حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان۔ آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از ٹوبائی ضلع بلند شہر۔ وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ درحقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از سنبھل مراد آباد۔ وصل حبیب دیکھا۔ انشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کرکے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو سرکشن داس صاحب مہندرو۔ از دہلی۔ آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا۔ بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو بنسی گوپال صاحب کمندن۔ از حیدر آباد دکن۔ آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر دو حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم۔ ٹرکو قویا از آرہ۔ کتاب (وصل حبیب) کو بر یکا امید سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے۔ جھوٹے جھوٹے مگر چست و پر معنے جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہے ہیں۔ عبارت کا زور۔ استعارہ کی ترکیب۔ جملوں کی ترکیب۔ الفاظ کی بندش۔ صاف بتلا رہی ہے کہ مصنف کو نثر کی علوم پر کمال عبور ہے۔ مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ہر ناول کو یکبار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دنس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی یہ تو مونس تنہائی بن جاتا ہے۔ انتہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد مئی ۱۹۱۱ء۔ ناظرین واقف نہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس وجہ مخالف ہیں۔ وصل حبیب کو ہم نے نکتہ چین نگاہوں سے بغور دیکھا۔ ہمارا خیال تھا۔ کہ موجودہ لغو فسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا۔ مگر کس قدر خوشی ہوئی کہ مصنف نے بالکل ہمارے خیال کا چربہ اپنی تصنیف میں اتار دیا ہے۔ زبان کی سلاست نے اردو میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ غرض ناول بہر وجہ بہت اچھا اور قابل قدر ہے اور ایسے ہی کتابوں کی اشاعت کے ہم خواہاں ہیں۔

(۱۰) صاحبزادی صاحبہ منیر صاحبہ عالی ریاست کشمیر از سری نگر۔ وصل حبیب نے ہم کو مشتاق وصیقہ کا مشتاق بنایا اور سوہی بھیجدیجئے

(نوٹ) ناظرین کرام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وصل حبیب کے ہر دو حصہ جو ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ فی ناول کے ہر حصہ کی قیمت بھی مگر محصول ڈاک علاحدہ ہے۔ ۱۲-۱۱-۱۰-۹-۸-۷-۶

مہتمم کتب خانہ جیبیہ۔ ڈاک خانہ گوہر گنج۔ ریاست بھوپال

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عِصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عِصمت سے بہتر سہیلی عِصمت سی بہتر شفیق۔ رفیق عِصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عِصمت اُن کو بتائے گا کہ کوارپتے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو قیتیں اُن کو پیش آئینگی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کرنے کے واسطے عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عِصمت ہے عِصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عِصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عِصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانے والا۔ مذہب کی قوت بتانے والا عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عِصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ماہر میں ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول ملتا ہے قیمت۔ سالانہ (۴) روپے

منیجر عِصمت و تمدن

(دہلی)

تمدن

محبت اور کشش

اس رسالہ کے ناظرین سب جانتے ہوں گے کہ کشش اُن تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے جو مادّی کہلاتی ہیں۔ جہاں کہیں مادّہ ہے کشش ضرور موجود ہے عام طور پر اس کی جو شکلیں نظر آتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو کشش اتصال کہلاتی ہے۔ یہ کشش ہر مادّی چیز کے ذرّوں میں کم بیش موجود ہے۔ اس کے سبب سے ہر چیز کے ذرّے ایک دوسرے سے ملے جلے رہتے ہیں۔ اگر یہ کشش نہ ہوتی تو دنیا میں کوئی چیز مشکل نظر آتی۔ اس کشش کے سبب سے مختلف مادّی چیزوں کے ذرّے آپس میں مل کر نئی نئی شکلیں بناتے رہتے ہیں۔ لوہا کیا چیز ہے؟ مادّی ذرّوں کا ایک مجموعہ ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے نہایت گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ مٹی کیا چیز ہے؟ یہ بھی مادّی ذرّوں کا ایک مجموعہ ہے مگر اس میں ذرّوں کا تعلق اسقدر گہرا نہیں ہے جیسا کہ لوہے میں ہے

اسی سبب سے مٹی کا ٹکڑہ تھوڑی سی طاقت لگانے سے پاش پاش ہو جاتا ہے برخلاف اس کے لوہے کے ٹکڑے کو توڑنے کے لیے بہت بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک کشش وہ ہے جو کشش شعری کہلاتی ہے۔ اس کے سبب سے تمام مسامدار مادی چیزیں پانی جیسی سیال چیزوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ اسفنج کو دیکھو کہ وہ پانی کو کس طرح اپنے اندر جذب کرتا ہے ایک اور کشش ہے جو کیمیائی کشش کہلاتی ہے۔ اس کے سبب سے عنصر یعنی مفرد چیزیں ایک دوسرے سے ملتی اور مرکب چیزیں بناتی ہیں۔ یہ مرکب چیزیں اُن مفرد چیزوں کی نسبت جن سے ملکر وہ بنتی ہیں صفات اور قوام کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً آکسیجن اور ہیڈروجن دو ہوائی عنصر ہیں۔ اُن کے آپس میں ملنے سے پانی بن جاتا ہے۔ اور پانی کے خواص اور صفات ان دو ہوائی مفرد چیزوں کے خواص اور صفات سے جداگانہ ہوتی ہیں۔ کھانے کا نمک کلورین اور سوڈیم سے ملکر بنتا ہے۔ کاسٹک جس کے چھونے سے بدن سیاہ پڑ جاتا ہے اور جل جاتا ہے۔ شورہ کے تیزاب اور چاندی سے ملکر بنتا ہے۔ ایک اور کشش ہے جو مقناطیسی کشش کہلاتی ہے۔ یہ وہ کشش ہے جس کے سبب سے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے ایک مشہور کشش وہ ہے جو برقی کشش کے نام سے موسوم ہے۔ ایک وہ کشش ہے جو کشش ثقل کہلاتی ہے۔ اس کے سبب سے زمین ان تمام چیزوں کو جو اس پر موجود ہیں اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ پتھر کو کیسی ہی بڑی طاقت سے آسمان کی طرف پھینکو وہ ضرور زمین پر واپس آ گرے گا۔ اس سے بھی زیادہ شاندار وہ کشش ہے جو تمام ستاروں کے درمیان موجود ہے۔ ہر ستارہ

دیگر ستاروں کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے مثلاً زمین سورج۔ چاند اور دیگر تمام ستاروں کو کھینچ رہی ہے۔ اسی طرح سورج زمین چاند اور دیگر ستاروں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اسی کے سبب سے ہر ستارہ اپنے خاص مدار میں حرکت کرتا ہے اور کوئی ستارہ کسی اور ستارہ سے ٹکرانے نہیں پاتا۔

نباتات اور حیوانات میں جو کشش اتصال موجود ہے اُس کے سبب سے اُن کے اجزا باہم پیوستہ رہتے ہیں اور وہ شعری کشش کی مدد سے اپنی غذا کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں۔

غرضکہ تمام مادّی اور حیوانی دنیا کی زندگی کا مدار کشش پر ہے اور کشش قدرتی طور سے اُن کے اندر موجود ہے اور اپنا کام ہر وقت کرتی رہتی ہے۔ اگر کشش اِس عالمگیر طریقے سے دنیا کی تمام مادّی چیزوں میں نہ پائی جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ نظام کائنات کا شیرازہ بالکل بکھر جائے اور اس لامحدود فضا میں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے گرد و غبار کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

اب ذرا اخلاقی دنیا پر نظر ڈالو۔ یہاں بھی کشش اپنا جلوہ نمایاں طور پر دکھاتی ہے۔ محبت بھی ایک کشش ہے۔ اِس کشش میں اور اُس کشش میں جو دنیا کی تمام مادّی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ وہی ایک چیز ہے جو مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ ذرا خیال کرو کہ ہم میں سے ہر انسان اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے اور اگر وہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو یہ محبت بھی اپنی ذات ہی کے لیے کرتا ہے۔ محبت کی کوئی شکل اور کوئی قسم کیوں نہ ہو۔ ہر صورت میں اُس کے اور اُس عالمگیر کشش کے درمیان کوئی

بین فرق نظر نہیں آتا۔ جب کوئی بچہ اپنی فطرت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ ہر چھوٹی چیز کو جو اس کے سامنے آئے موہنہ میں لیتا ہے اور اس کو نگل لینا چاہتا ہے اور اگر کوئی بڑی چیز اس کے سامنے آئے جس کو وہ موہنہ میں نہیں رکھ سکتا تو اس کو اپنی چھاتی سے لگا لیتا ہے اور اگر کوئی شخص اس چیز کو چھیننا چاہے تو جہاں تک اس کے امکان میں ہے اس کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا اور اگر وہ چیز اچانک چھین لی جائے تو چیخ مار کر رونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ بچے کو اشیاء کی تمیز ہونے لگتی ہے کہ کونسی چیز اس کے لیے مفید ہے اور کونسی چیز اس کے لیے مضر ہے۔ اس حالت میں وہ صرف مفید چیزوں کو لیتا اور مضر چیزوں کو پھینک دیتا ہے۔ یہ مضر چیزوں کو پھینکنے اور اپنے سے دور رکھنے کی عادت مجبوری سے پیدا ہوتی ہے۔ نہ رغبت سے۔ عام طور پر تو ہر بچہ اس بات کی طرف مائل ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچے اور کسی چیز کو ہاتھ سے نہ دے۔ خواہ وہ چیز اس کے کارآمد ہو یا نہ ہو۔ یہ ٹھیک نمونہ اس کشش کا ہے جو مادی اجسام کے درمیان موجود ہے +

بچے کی عمر رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنے ماں باپ سے محبت کرتا ہے ہوش سنبھالنے پر وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں اور عزیزوں رشتہ داروں سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ جوانی کے عالم میں نوجوان لڑکا نوجوان لڑکیوں کے ساتھ اور نوجوان لڑکی نوجوان لڑکوں کے ساتھ محبت کا جذبہ اپنے دلمیں اٹھتا اور ابھرتا دیکھتی ہے محبت کے جذبہ اور جوش کے وقت جب ایک انسان دوسرے انسان کا بوسہ لیتا یا اس کو اپنے سینہ سے لپٹاتا ہے اور اسطرح اپنے جذبہ اور جوش کا

اظہار کرتا ہے تو اس اظہار محبت کا سُراغ بچپن کی اُس حالت میں ملتا ہے جبکہ بچہ ہر چیز کو مونہہ میں لیتا یا چھاتی سے لگا لیتا ہے تاکہ وہ چیز اُس سے جدا ہونے نہ پائے +

اب ذرا محبت کی اُن بلند شکلوں پر غور کرو جو خاندانی یا فریقی اور قومی یا ملکی محبت کے پیرایوں میں جلوہ گر ہیں۔ ہر انسان اپنے خاندان کی پیچ اور حمایت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اُس خاندان سے وابستہ ہے اور اُس کے فوایدِ اور توقعات کا مدار اُس خاندان کا ممبر ہونے پر ہے اس بنا پر صاف ظاہر ہے کہ خاندانی محبت کی بنیاد اپنی ذاتی منفعت کے خیال پر ہے نہ کسی اور چیز پر۔ اسی طرح جس مذہبی یا سیاسی گروہ میں کوئی آدمی شریک ہوتا ہے اُس کی حمایت وہ اس لیے کرتا ہے کہ اُس گروہ کے ساتھ اُس کی ہزاروں توقعات وابستہ ہیں قومی اور ملکی محبت کی بنیاد بھی اُسی ذاتی منفعت پر ہے جس کی خواہش ہر انسان کی فطرت میں قدرتی طور پر موجود ہے۔ کسی گروہ یا قوم کی طرفداری میں انسان جو ذاتی فوایدِ حاصل کرتا ہے اگر ہم اُن سب سے قطع نظر کریں تو یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ ایسا کرنے والا آدمی شہرت اور ناموری حاصل کرتا ہے اور اپنی تعریف لوگوں کی زبان سے سُنتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے۔ یہ ذاتی لذت بعض دفعہ انسان کو جان اور مال تک قربان کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جو لوگ رات دن کسی خاص مذہب کی پیروی میں اپنی جان کھپاتے اور محنت اور کوشش سے نہیں تھکتے وہ بھی درحقیقت اِس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ دوسری دنیا میں اُن کو لامحدود خوشی حاصل ہوگی۔ غرضکہ اس

مضمون کے اوّل میں جو کہا گیا ہے کہ ہر ایک انسان یا تو اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے۔ یا اپنی ذات کے لیے دیگر انسانوں سے محبت کا اظہار کرتا ہے یہ محبت کی تمام شکلیں اُسی ایک اصل کی مختلف فرعین ہیں اور اُس اصل کا مدار اور قدرتی کشش پر ہے جس کے سبب سے ہر نبات اور ہر حیوان اُن چیزوں کو اپنے اندر جذب کرتا ہے جو اُس کے لیے مفید ہوں اور جو اُس کو بقائے زندگی کے لیے کارآمد ہوں اور جس طرح اس کشش کے نہ ہونے سے تمام نباتات معدوم ہو سکتی ہیں اور تمام حیوانات روئے زمین سے غایب ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ انسانوں میں نہو تو نہ خاندانی محبت کا وجود پایا جا سکتا ہے نہ فریقی محبت کا اور نہ قومی اور ملکی محبت کا ظہور ہو سکتا ہے نہ مذہبی اور سیاسی محبتوں کے جلوے دکھائی دے سکتے ہیں اور یہ صورت ایسی خوفناک ہے کہ اس کے سامنے انسانی تمدّن ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

محبت کے مقابلہ میں بغض و عداوت کا جذبہ انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس طرح کشش بمقابلہ محبت کے مادی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ آیا کوئی اور ایسی چیز ہے جو بمقابلہ بغض و عداوت کے مادّی اشیاء کی دنیا میں پائی جائے؟ جواب یہ ہے کہ مادّی چیزوں میں کشش کے علاوہ جسکو جاذبہ بھی کہتے ہیں ایک اور قوت موجود ہے جس کو دافعہ کہہ سکتے ہیں۔ جب دو کشش آپس میں ٹکراتی ہیں تو اس قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر تم ایک پتھر پر دوسرے پتھر کو ایک خاص قوت سے دے مارو تو اتنے ہی

زور کے ساتھ یہ دوسرا تھپڑ اچٹ جائے گا۔ لچک جو مختلف مادّی اجسام میں پائی جاتی ہے وہ بھی قوت دافعہ کی ایک خاص شکل ہے خیال کرو کہ جسطرح کشش کی دو قوتوں کے ٹکرانے سے دافعہ کا ظہور ہوتا ہے اسیطرح جب دو آدمی کسی خاص چیز کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مخالفت کا اظہار کرتے ہیں تو بغض و عداوت کی قوت فوراً آشکار ہوتی ہے۔ بغض و عداوت کی ابتدائی شکل حسد ہے اور یہ بغض و عداوت کی تمام قسموں کی اصل جڑ ہے اور تمام برائیوں اور بدیوں کی بنیاد ہے۔ یہ قوت ہر انسان کے اندر فطرتی طور سے موجود ہے مذہب کا جلوہ اگر دنیا میں نہ ہو تو حسد کا جذبہ نہایت شدت کے ساتھ نمایاں ہو اور تہذیب اور تمدن کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ مذہب اور تعلیم نے آجکل اس جذبہ کو لوگوں کی طبیعتوں میں پنہاں کر رکھا ہے۔

مذکورۂ بالا تحریر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سر ایزک نیوٹن کے قول کے موافق کشش کی حکومت صرف مادّی و جسمانی دنیا ہی میں نہیں ہے بلکہ اخلاقی و روحانی دنیا میں بھی اُس کی حکمرانی ہے اور کشش کا قانون دونوں دنیاؤں میں یکساں طور پر عالمگیر ہے۔ اور مادّی اور روحانی چیزوں پر یکساں حاوی ہے ٭

وحید الدین سلیم

خریداران تمدن براہ کرم خط و کتابت میں نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ تعمیل مشکل ہے ٭

کلام اسمٰعیل

محرم

مانا کہ بہت شوق سے کی تعزیہ داری
مانا کہ علم دھوم سے یاروں نے اُٹھائی
مانا کہ ہوا مرثیہ خوانی میں توغّل
مانا کہ مجالس میں بہت روئے رولائے
لیکن کبھی سادات کا احوال بھی پوچھا
صد حیف جو رحم اونکی مصیبت پہ نہ آئے
انمیں بھی تو ہے خون اُسی شیرِ خدا کا
ہیں یہ بھی اسی فاطمہ کی نسل کے جائے
بیچارہ و بیکس پھریں سادات کے بچے
کوئی انہیں مکتب میں کہیں نہ پڑھائے
بے علم و ہنر تنگ ہے میدانِ معیشت
ڈر ہے کہ زمانہ انہیں دردر نہ پھرائے
ہے کوئی جوانمرد کہ از راہِ محبت
سادات کی تعلیم میں کوشے اور دلائے

رباعیات

اے بارِ خدا کہ عالم آرا تو ہے
دانائے نہان و آشکارا تو ہے
ہر شخص کو ہے تیرے کرم کی اُمید
ہر قوم کا آسرا سہارا تو ہے

اے بے خبری کی نیند سونے والو
راحت طلبی میں وقت کھونے والو
کچھ اپنے بچاؤ کی بھی سوچی تدبیر
اے ڈوبتی ناؤ کے ڈبونے والو

تھا رنگِ بہار بے ثوائی کہ نہ تھا۔
ظاہر تھا زوال انتہائی کہ نہ تھا۔
کہہ دو ایمان سے عیدگاہ کے اندر
گردش میں تمہاکا سے گدائی کہ نہ تھا

اسراف سے احتراز اگر فرماتے
کیوں گردشِ ایام کی سیلی کھاتے
انگشت نمائی کجکلاہی جن کی
وہ پیرتے ہیں آج جوتیاں چٹخاتے

سلطنت اسلامی کا آخری منظر

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط

(خدا کسی قوم کی حالت جب تک کہ وہ قوم اپنی حالت نہ بدلے نہیں بدلتا)

ذیل کی سطروں میں اس آیت پاک کی تاریخی تفسیر بیان کی گئی ہے دہلی کی عظیم الشان اسلامی سلطنت نے کیونکر اپنی حالت بدلی تو خدا نے اسکی حالت بدل دی؟ ناظرین اس سوال کا یہیں جواب پائیں گے۔

اکبر اعظم کے جلوس کو ڈیڑھ سو برس گزر چکے ہیں ۱۱۱۸ھ میں اکانوے برس کا بڈھا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر دکن کی پہاڑیوں میں ٹھوکر کھا کر احمد نگر میں مر چکا ہے شاہ عالم بہادر شاہ اپنے دونوں بھائیوں اعظم شاہ اور کام بخش کے خون سے ہاتھ رنگین کر چکا ہے شاہ عالم کی جگہ عظیم الشان مسند نشین ہونا چاہتا ہے ناگہاں اوس کا بڑا بھائی معز الدین جہاندار شاہ اُس پر حملہ کرتا ہے عظیم الشان کا ہاتھی توپ کے صدمہ سے بھاگ کر دریائے راوی میں مع سواری کے ہمیشہ کے لیے غرقاب ہو جاتا ہے۔ جہاندار شاہ اپنے دوسرے بھائی جہان شاہ سے شکست کھاتا ہے پیر دہو کے سے اوسکو مار ڈالتا ہے اور فوراً فتح کی خوشی میں لعل کنور اپنی معشوقہ کے ساتھ مست شراب ہے۔

جہاندار شاہ کا تیسرا بھائی رفیع القدر تیموری تاج کی اس مضحکہ خیز واقعہ کو دیکھکر غصہ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ذوالفقار خاں وزیر اعظم مدہوش بادشاہ کو میدان میں لاتا ہے، رفیع القدر اپنی تھوڑی فوج کے ساتھ شاہی لشکر کا مقابلہ کرتا ہے اور پیر خود ہاتھی سے اوتر کر تیغ و سپر لیکر تن تنہا حملہ کرتا ہے

اور مارا جاتا ہے، جہاندار شاہ اب لاہور سے شاہجہاں آباد آتا ہے۔ اور یہاں عظیم الشان کا بڑا بیٹا اپنے چچا جہاندار شاہ کے تیغ ستم سے شہید ہوتا ہے اعظم شاہ اور کام بخش کے معصوم بچے عالی تبار محی السنتہ اور محمد فیروز مند محبوس زندان ہوتے ہیں،

معز الدین جہاندار شاہ کی سلطنت کو ابھی چند روز ہی نہیں گذرتے ہیں کہ شہزادہ فرخ سیر اپنے باپ عظیم الشان کا انتقام لینے کو نکلتا ہے اور پہر قوت نہ پاکر سید حسین علی خاں صوبہ دار عظیم آباد سے اعانت چاہتا ہے، حسین علی خاں اپنے بھائی سید عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد کو لکھتا ہے آخر فرخ سیر حسین علی خاں اور سید عبداللہ کی مدد سے دار الحکومت کا رخ کرتا ہے، ادھر سے جہاندار شاہ اپنے بیٹے عزیز الدین کو پچاس ہزار سوار کا سپہ سالار بناکر بھیجتا ہے، اکبر آباد سے نکل کر اعز الدین، فرخ سیر کا حال سنتا ہے اور تیموری سلطنت کا یہ سب سے پہلا ڈرپوک شہزادہ رات کے تاریک پردہ میں چھپکر اپنی فوج سے نکل بھاگتا ہے، جہاندار شاہ بڑے سر و سامان سے نکلتا ہے اور ہزیمت اوٹھاتا ہے اور اپنی معشوقہ کے ساتھ زنانی سواری میں بیٹھکر قلعہ شاہجہاں آباد میں پناہ لیتا ہے اور پہر مارا جاتا ہے،

فرخ سیر تخت پر قدم رکھکر اپنے جور و ظلم سے دربار کو فریادی بنا دیتا ہے، اور اپنے محسن حسین علی خاں امیر الامرا۔ اور سید عبداللہ قطب الملک کو اپنی بد دماغی سے اپنا دشمن بنا لیتا ہے امیر الامرا کے قتل کا جال بچھاتا ہے، پانسہ الٹا پڑتا ہے اور خود پھنس جاتا ہے، اور نہایت ذلت سے قید خانہ میں جان دیتا ہے،

امیر الامرا اور قطب الملک اب بادشاہ گر کا لقب حاصل کرتے ہیں،

رفیع القدر کا چھوٹا بیٹا رفیع الدرجات قید خانہ سے نکلتا ہے اور پوشاک بدل کر گلے میں موتیوں کا ایک ہار ڈالکر تخت دہلی پر جلوس کرتا ہے، سادات کا سلطنت پر قبضہ ہوتا ہے۔ سید حسین علی خاں اور سید عبداللہ خاں قطب الملک خزانۂ شاہی پر متصرف ہوتے ہیں اور آخر یہ پندرہ سالہ دائم المرض شاہزادہ تین مہینے کی برائے نام حکومت کے بعد دنیا سے رخصت ہوتا ہے،

قطب الملک اور امیر الامرا رفیع الدرجات کے دوسرے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھاتے ہیں۔ محمد اکبر بن عالمگیر کا چھوٹا بیٹا نیکوسیر قلعہ اکبر آباد سے نکلکر رفیع الدولہ کے مقابلہ کو اٹھتا ہے، امیر الامرا اور قطب الملک رفیع الدولہ کو لیکر اکبر آباد آتے ہیں اور نیکوسیر شکست کھا کر محبوس ہوتا ہے، اس تغل و حرکت سے رفیع الدولہ بیمار پڑتا ہے اور بستر پر جان دے دیتا ہے۔

امیر الامرا اور قطب الملک تخت نشینی کے لیے بہادر شاہ اول کے پوتے اور خجستہ اختر کے بیٹے روشن اختر کو قلعہ سلیم گڑھ سے بلواتے ہیں یہ رفیع الدولہ کی وفات کے آٹھ دس روز کے بعد دار السلطنت کو پہونچتا ہے اور اپنا نام محمد شاہ کے نام سے مشہور کرتا ہے۔ یہ کل انقلابات اورنگ زیب سے لیکر اس وقت تک صرف تیرہ برس میں ہوتے ہیں۔

محمد شاہ گو ہندوستان کا شہنشاہ کہلاتا ہے لیکن سادات کے پنجہ میں گرفتار ہے یکایک ہندوستان میں ایک نیا انقلاب ہوتا ہے نظام الملک جاگیردار حیدر آباد اور امیر الامرا و قطب الملک میں عداوت بڑھتی ہے۔ سادات کا آفتاب اقبال مستدل النہار کمال سے زوال پذیر ہو چکا ہے، محمد شاہ موقع پاتا ہے اور نظام الملک کو اشارہ کرتا ہے، قطب الملک اور امیر الامرا نظام الملک کے مقابلہ میں فوج پر فوج بھیجتے ہیں اور شکست اٹھاتے ہیں،

آخر قطب الملک اور امیر الامرا غصے سے بادشاہ کو سانتہ لیکر خود اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دار السلطنت سے نکلکر قطب الملک آگے بڑھ جاتا ہے اور محمد شاہ کے اشارہ سے امیر الامرا پالکی میں مارا جاتا ہے، تمام لشکر میں ایک عام غدر ہوتا ہے۔ سادات اور شاہی فوج میں ایک خونریز جنگ ہوتی ہے اکثر امرائے سادات مارے جاتے ہیں قطب الملک اپنے بھائی امیر الامرا اور اپنے خاندان سادات کا حال سنتا ہے اور بدحواس ہو جاتا ہے ادہر سے شاہی فوج اور ادہر سے نظام الملک کو دیکھکر غریق تفکر ہو جاتا ہے۔ اور التوائے جنگ مناسب سمجھکر، ٹہر جاتا ہے اور پھر فوج جمع کرتا ہے اور محمد شاہ کو چھوڑکر رفیع القدر کے بیٹے محمد ابراہیم کو بادشاہ بناتا ہے اور نوے ہزار کی جمعیت سے محمد شاہ کے مقابلہ کو نکلتا ہے حسن پور میں دونوں فوجیں ملتی ہیں، دو دن ایک رات ہنگامۂ کارزار گرم رہتا ہے، قطب الملک وقت دیکھکر ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور شاہی فوج پر حملہ کرتا ہے، قطب الملک کی فوج جب قطب الملک کو ہاتھی پر نہیں دیکھتی ہے تو اسکو مردہ جانکر بھاگ کھڑی ہوتی ہے قطب الملک اور اسکا بھائی نجم الدین علیخاں تنہا میدان میں کھڑے رہتے ہیں اور آخر زخمی ہو کر مقید ہو جاتے ہیں ابراہیم شاہ بھی گرفتار ہو جاتا ہے اور اب محمد شاہ اپنی تئیں ہندوستان کا مستقل شہنشاہ سمجھتا ہے،

لیکن اس اطمینان سے وہ دو سال فائدہ اٹھاتا ہے وہ عیش و طرب کی ایک مجلس ترتیب دیتا ہے۔ اور انتظام سے غافل ہو کر اپنے مصاحبین کے جھنڈ میں تفریح و طرب میں مصروف رہتا ہے، نظام الملک حیدرآباد سے آکر قلمدان وزارت ہاتھ میں لیتا ہے سلطنت کی اصلاح کرنا چاہتا ہے لیکن دربار کا عجیب رنگ پاتا ہے، جہاں ہر شخص فرعون نظر آتا ہے،

اورنگ زیب کا یہ قدیم پہ سالار محمد شاہی دربار میں اورنگ زیب اور شاہجہاں جیسا رعب اور شان ڈھونڈھتا ہے لیکن شاہی مصاحبین میں ایک عام بے رعبی اور طوفان بدتمیزی دیکھتا ہے۔ بوڑھے نظام الملک کی جواں ہمتی کو دیکھکر دربار کے مسخرے اوسکو نیند رکھتے ہیں، نظام الملک کہتا ہے ہاں میں بند رہوں لیکن اگر اس بندر کا کہا نہ مانا تو اس قلعہ کے کنگرے پھر نظر آئیں گے، آخر نظام الملک اصلاح سے مایوس ہو کر حیدرآباد واپس چلا جاتا ہے۔

نادرشاہ ایران سے سمرقند کی تادیب کو آتا ہے محمد شاہ کو نامۂ شوق لکھتا ہے لیکن محمد شاہی دربار سے جواب نہیں جاتا، نادرشاہ پھر لکھتا ہے پھر جواب نہیں پاتا۔ نادرشاہی سفیر دربار میں آتا ہے۔ محمد شاہ کے مصاحبین عین دربار میں اوس سے استہزا کرتے ہیں، سفیر رنجیدہ واپس جاتا ہے، نادرشاہ پھر ایک سفیر دس سواروں کے ساتھ بھیجتا ہے سوار جلال آباد میں مار ڈالے جاتے ہیں، ایک شخص بچکر نکل جاتا ہے اور نادرشاہ سے اپنی داستان بیان کرتا ہے نادرشاہ غصہ سے آگ بگولا ہو جاتا ہے، اور آندھی کی طرح ہندوستان کا رخ کرتا ہے،

مرہٹے دکن سے باہر نکلتے آتے ہیں بھوپال تک آچکے ہیں نظام الملک بھوپال میں باجی راؤ سے صف آرا ہوتا ہے کہ یکایک نظام الملک کو نادرشاہ کی خبر پہونچتی ہے وہ اسوقت دو طرفہ دشمنوں سے پریشان ہو جاتا ہے مصلحت جانکر باجی راؤ سے صلح کر لیتا ہے اور دارالحکومت کا رخ کرتا ہے کبھی خیال کرتا ہے کہ اس غافل بادشاہ اور بدتمیزی کے دربار کی تذلیل ہی بہتر ہے پھر اپنی قدیم وفاداری پر نظر ڈالتا ہے اور منزلیں مارتا ہوا دہلی پہونچتا ہے نادرشاہ سمرقند سے بڑھتا ہوا کابل پہونچتا ہے، کابل کا حاکم ناصر خاں جنگ کا منصوبہ باندھ رہا ہے کہ وہ نادرشاہ کے ہاتھ گرفتار ہو جاتا ہے پھر نادرشاہ

اور طیش میں اوس کی زبان سے قتل عام کا لفظ نکلتا ہے العظمۃ للہ شاہجہاں کی دہلی لٹ جاتی ہے، ہندوستان کی عروس البلاد خونی پوشاک پہن لیتی ہے گلی کوچہ میں خون کی نہریں جاری ہوجاتی ہیں۔ بابر اور اکبر اعظم کے جاہ و جلال کا تخت ایک ایرانی قزاق کے قدم کے نیچے ہوجاتا ہے اور اورنگ زیب عالمگیر کے شکوہ و دبدبہ کا آفتاب قزلباشوں کی خون آشام تلواروں کی شفق میں چھپ جاتا ہے۔ آخر نظام الملک دست بستہ عرض کرتا ہے ؎

کسے نماند کہ او را بہ تیغ ناز کشی مگر بہ زندہ کنی خلق را دوباز کشی

بریش سپیدت کہکر نادر شاہ بقیۃ السیف کو امان دیتا ہے۔ دہلی کو لوٹ کھسوٹ کر جب واپس جاتا ہے تو تیموری نسل کی شاہزادی اپنے بیٹے نصر اللہ خاں کے نکاح میں لیتا ہے، اور رخصت کے وقت اپنے شاہنشاہ کے بیٹے کو خلعت دیتا ہے جسکے خلعت کی ایک دنیا تمنا کرتی ہے ؎

نادر شاہ کی واپسی پر محمد شاہ اپنی مکروہ فتح نا شکست کی عام خوشی مناتا ہے، نظام الملک حیدر آباد جلا جاتا ہے اور اعتماد الدولہ فخر الدین خاں مسند وزارت پر جلوہ آرا ہوتا ہے اور آٹھ برس تک ہندوستان کا مطلع حملوں کے گرد و غبار سے پاک و صاف رہتا ہے کہ ۱۷۶۱ء میں یکایک خیبر کے دروں سے احمد درانی کی سرکردگی میں پھر ایک قہر آشوب فوج نکلتی ہے۔

احمد شاہ نعمی خاں آفتہ کو لیکر تقریباً چھتیس ہزار فوج سے لدھیانہ سے بالا بالا سرہند پہونچتا ہے۔ محمد شاہ اپنے لڑکے احمد شاہ کو اعتماد الدولہ وزیر الملک کے ساتھ ایک گراں فوج و توپخانہ دیکر روانہ کرتا ہے۔ شہزادہ احمد دریائے ستلج پر آکے مورچہ زن ہوتا ہے اور ۱۵ ربیع الاول سے ۱۲ دن تک دونوں فوجیں ہنگامہ آرا رہتی ہیں +

بائیسویں کی دوپہر کو وزیر الممالک اپنے خیمہ میں نماز پڑھتا ہے کہ درّانی توپوں سے ایک گولہ آکر پھٹتا ہے اور وزیر الممالک جان دیتا ہے۔

آٹھائیسویں کو آخری معرکہ ہوتا ہے۔ دونوں طرف کے بہادر زور آزمائی میں مشغول ہوتے ہیں کہ یکایک درّانی فوجوں میں ایک آگ نمودار ہوتی ہے اوس کے شعلے مشتعل ہوتے ہیں اور ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہوتا ہے، ناچار درّانی فوجیں نہایت بے ترتیبی سے پیٹھ پھیرتی ہیں اور کابل کا رخ کرتی ہیں۔

محمد شاہ ایک کان سے تو فتح کی خوشخبری سنتا ہے مگر دوسرے کان میں اجل کہتی ہے میں آپہونچی، شاہزادہ کی طلب کو قاصد بھیجا جاتا ہے۔ شہزادہ باپ کی شدت مرض کو سنکر دہلی کا رخ کرتا ہے، پانی پت پہونچکر سنتا ہے کہ باپ تیس برس سلطنت کرکے ستائیس ربیع الآخر کو مرگیا + باقی

سیّد سلیمان ندوی

عید پر تو بعض احباب کی خواہش ہی تھی کہ تمدن کا عید نمبر نکالا جائے لیکن اب بقر عید نمبر کے واسطے تجویز یہی ہے استفسار بھی اور اصرار بھی۔ دل ٹھکانے ہوں تو ہر روز عید اور رات شبرات ہے ورنہ شام عید بھی روز محرم سے کم نہیں۔ اٹلی کے مظالم نے طرابلس میں جو کچھ کیا اسکو یاد کرکے بہت کم مسلمان ایسے ہوں گے جو اس بقر عید کو لو ایگی فرض سے زیادہ وقعت دیں۔ معزز ہمعصر کامریڈ تیسری نومبر کے ایک تار کو جو لندن سے ایک نامہ نگار نے دیا اس طرح نقل کرتا ہے کہ "میں عربوں کے ایک گانو میں سو گذرا اور ایک ایسے خاندان کو دیکھا جو تمام مردہ پڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی نے اپنا چہرہ ایک صندوق میں اس لیے چھپا لیا تھا کہ میں اسکو نہ دیکھوں ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے پہلو میں وہ دل ہے جو اپنے [illegible] کے بھائیوں اور بہنوں پر خون کے آنسوؤں سے رو رہا ہے۔ جو تاراج اور خانماں برباد ہوگئے

ایسی حالت میں ہمارے عید نمبر کی توقع ناظرین تمدن کا ظلم ہے۔

اضطرابِ روح

تو کس کے ہجر میں زار و نزار ہے اے روح؟ — بتا تو کس کے لیے بے قرار ہے اے روح
تو ہو رہی ہے یہ بیزار اپنے مسکن سے — کہ نکلی پڑتی ہے رہ رہ کے خانۂ تن سے
یہ بیقراریوں میں تڑپ تڑپ تک آنا! — نہ پا کے راستہ مایوس پھر پلٹ جانا!
تو لب پہ آئی ہے کرنے کو کس کا استقبال؟ — یہ کس کے ہجر میں تو حال سے ہوئی بے حال؟
یہ زادِ بوم کو چلنے کی سعیِ بے حاصل! — یہ قیدِ تن سے نکلنے کی سعیِ بے حاصل!
ہے تیرے کندھے پہ کیوں بار یہ تنِ لاغر؟ — بگاڑ ہمدمِ دیرینہ سے ہوا کیونکر؟
تری نگاہ میں ہے گلشنِ جہاں کیوں خار؟ — بتا کہ تجھ کو ہے کس گل کی حسرتِ دیدار؟
بتا کہ رہتی ہے تو بے قرار کس کے لیے؟ — تڑپ رہی ہے تو سیماب وار کس کے لیے؟
بتا مجھے بھی کہ ہے کس کی طالبِ دیدار؟ — کھٹک رہا ہے ترے دل میں آہ کیسا خار؟

یہ درد کیسا ہے دل میں ترے خلش کیسی؟
یہ ٹیس کیسی جگر میں ہے یہ تپش کیسی؟

وہ ہونٹ پنکھڑیوں سے، وہ ابھری ابھری گل — وہ آنکھیں جن میں سیاہی اور نرم نرم ہے ہال
تھی تیرے مکھ پہ بھی کس غضب کی رعنائی! — تمہیں یہ ہوتا تھا معلوم اب ہنسی آئی
وہ ہنس کے میرے گلے سے ترا لپٹ جانا — تمام غصہ و غم کا وہیں پلٹ جانا۔
وہ آ کے سر مرے کھینچنا ترا چادر — وہ تنگ کر کے اٹھانا مجھے بوقتِ سحر
مجھے نہ پا کے ترا رونا اور گھبرانا — تمام رات نہ سونا نہ کچھ قرار آنا
ہماری آنکھ میں چھایا ہے اب وہی نقشہ — وہی ہنسی وہی شوخی۔ وہی لب و لہجہ
خدا دکھائے نہ دشمن کو ایسا نظارہ — کہ دو آنکھوں سے ہو جائے آنکھ کا تارہ
یہ چرخِ پیر کسی پر نہ یہ ستم توڑے — پڑے جو آنکھ نہیں، آغوش میں وہ دم توڑے!

وہ دورِ دور ترا خواب میں یہاں آنا — وہ جھک کے تکیہ کے پھر دوسری طرف ہو جانا — وہ میری طرف نہ رادست شوق پھیلانا — وہ دیکھتے ہی مجھے روٹھ جانا ہو جانا — کہ خود مجھی سے مرا طوقِ زندگی بھاری۔ ا۔ ر۔

مسٹر ابلیس

(۲)

(سلسلہ کے لیے جولائی ۱۹۱۱ء کا تمدن ملاحظہ ہو)

مسٹر ابلیس - وہی نخوت و پندار کا تخم شرربار مسٹر ابلیس - وہی قہر انیز دی کے سنگِ آتش اور حقتاق تکبر و نافرمانی کے تصادم سے پیدا ہونیوالا شرارہ مسٹر ابلیس - شہر.... کے ایسے حصہ میں جو زیادہ تر متوسط درجہ کے اشخاص سے آباد تھا، اپنی رفتار فتنہ انگیز کے ساتھ چاروں طرف غور بیں نظر ڈالتا ہوا - سُرخ سرخ آنکھوں سے نکلنے والی خون آلود نظر ڈالتا ہوا - برابر چلا جارہا تھا - اس کے کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں، کہ وہ دنیا کے ہر متنفس کو - ہر نفس امارہ رکھنے والے جاندار کو - ممنوعاتِ شرعی کیطرف - بدی[۵۱] اور بے حیائی کیطرف - مائل کر دینے کی اُمید قوی رکھتا تھا! اور اس کے بیان کرنے کی بھی حاجت نہیں، کہ وہ اِس فانی وسعت آبادِ جہاں کے دو محبت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے دِلوں کو - باہم دو مقرر یک پوست، کیطرح رہنے والے دلوں کو - ایک آن نہیں دیکھ سکتا تھا اور اپنی قوت تفرقہ پردازی کی ناقابل مقابلہ چوٹ کے ساتھ - پوستِ یگانگت و محبت کو چورا چورا کر کے ایک کو دوسرے سے جدا کر دینا، باہم فساد پیدا کر دینا، اپنا فرض عین

---

[۵۱] اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ - وہ تمہیں بدی اور بے حیائی ہی (کے کام کرنے) کو کہے گا - (پارہ ۲ - سورہ بقر رکوع ۲۱)

[۵۲] اِنَّ الشَّیْطٰنَ..... مُبِیْنًا - کیونکہ شیطان لوگوں میں فساد ڈلواتا ہے اور وہ (ان

سمجھتا تھا! اسی لیے جب کبھی اُس کی نظر۔ جناشت آمیز اور خونریز نظر کسی نفس امّارہ کا سر کچلتے رہنے والے انسان کو دریافت کر لیتی: دریافت کر لیتی اور یہ بھی معلوم کر لیتی، کہ اُس کی ذرّیات کے انچھر اُس کے شاگردانِ علیہ العن کے پراز تنزویر افسوں۔ اُس راسخ الاعتقاد شخص پر کارگر نہیں ہوتے: تو وہ خود۔ بہ نفس لعین اپنی ہستی دوزخ تاب کے ناقابل برداشت شعلوں کے ساتھ، اُس مشتِ استخواں کو بچھلانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس وقت وہ ایک ایسے مکان کے سامنے ٹھٹکا جو اس شہر کے ایک معمولی حیثیت کے تاجر کا مکان تھا! وہ ٹھٹکا تو سہی مگر کچھ زیادہ دیر نہیں ٹھٹکا: کیونکہ اُس کی قوت تلبیس نے۔ اشہبِ سُبکبار اندیشہ سے بھی زیادہ تیز قوت تلبیس نے چشم زدن میں جو کچھ وہ دریافت کرنا چاہتا تھا بتا دیا۔ اور سٹر ابلیس مسکراتا ہوا اپنے وہاں آتش فشاں سے چنگاریاں اُڑاتا ہوا۔ فوراً اندر پہنچ گیا! یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ہر ابلیس مرید کو۔ ہر خود مختار سریر آرائے شیطنت کو۔ جہاں اقسام ازل کے فیاض ہاتھ نے بندگان خدا کے سخت سے سخت امتحان لینے کے لیے اور عجیب و غریب طاقتیں عطا کی ہیں، وہاں یہ قوت بھی عنایت فرمائی تھی کہ ہر مردود درگاہ لم یزلی، انسان کی آنکھوں سے۔ اصل شے کو چھوڑ کر محض پردۂ شبکیہ پر مرتسم ہونے والے عکس کو دیکھنے والی ناچیز قوتِ باصرہ سے۔ پوشیدہ[1] اور غائب رہکر، جہاں چاہے جا سکتا تھا،

[1] اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط۔ وہ اور اس کی ذریات تم کو (دھوکے) دیکھتے رہتے ہیں جس سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔

(پارہ ۸۔ سورہ اعراف رکوع ۲)

اور جو چاہے دیکھ سکتا تھا! مسٹر ابلیس بھی اسوقت اسی قوت منصبی کی امداد سے۔ اسی یکے بعد دیگرے ورثہ میں متصل ہونیوالی قوت منصبی کی امداد سے۔ بیک جنبش چشم ناری، اس مکان کے ایک ایسے کمرے کے اندر تھا جسکے کواڑ کسی نے پہلے سے بھیڑ رکھے تھے!!

اس کمرے کا فرنیچر بیش قیمت تو نہیں تھا مگر ایک سلیقہ شعار ہاتھ اور تعلیم یافتہ دماغ کا پتہ ضرور دے رہا تھا! اس سمت جدہر مسٹر ابلیس اپنے غائب از نظر رنگ میں کھڑا تھا۔ تھا اور نہیں تھا۔ ایک خوشنما مسہری بچھی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف ستر زمین تک لٹکنے والا الوٹ جالی کا کڑھا ہوا اور صاف ستھرا پردہ موسکیٹو نٹ، کا کام دے رہا تھا!۔ کمرے کے طول میں کئی بادامی روغن والی ایزی چیئرز، اور کئی بید کی خوشنما تکیہ دار کرسیاں مع اپنے خوبصورت پھولدار گدیوں کی بچھی ہوئی تھیں! سامنے والی دیوار میں ایک کاش تھی اور اسپر بین وسطیں مانسٹروا کا مجسمہ۔ یونانی علم کی دیوی کا چھوٹا سا خوبصورت بت۔ اپنے کندھوں پر ایک ٹائم پیس لیے کھڑا تھا! اس کے دونوں طرف دو خوشنما گلدان اور دو نازک اور اعلیٰ درجہ کی مستکاری والے لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے رکھے تھے! کاش کے دونوں کونوں پر جنت مکانی رحمۃ اور محسن الملک مرحوم کی تصویروں کے سوائے۔ جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے مینیم کے چمکتے ہوئے فریم میں محفوظ تھی۔ اور کچھ نہ تھا! اسی دیوار کے بقیہ حصے میں، ذرا بلندی پر، لکڑی کے بیلدار چوکھٹوں میں کئی اعلیٰ درجہ کی سینریز دلکش اور نظر فریب مناظر کی بڑی تصویریں لگی تھیں! اور ان سب کے اوپر سنہری

بیضاوی چوکھٹے میں ایک خوبصورت نوجوان کا بسٹ تھا، اور بس! کمرے کی دوسری سمت ایک چھوٹی سی مستطیل کالی میز لگی تھی جس پر سبز بانات چڑھی ہوئی تھی یا اوپر کے رُخ چپکی ہوئی تھی! اسی میز پر دونوں طرف مختلف کتابیں مجلّد اور غیر مجلّد، ضخیم اور پتلی، نہایت احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں، بلکہ کھڑی ہوئی تھیں! سیدھے ہاتھ کیطرف ایک انگریزی وضع کا قلمدان - دوات - اور قلم رکھنے کا سٹینڈ - شیشے کی دوات اور کئی انگریزی قلم لیے ہوئے نظر آتا تھا، اور اس کے برابر ہی کچھ سادے کاغذ اور ایک روزانہ اخبار لوہے کے پیپر ویٹ سے دبے ہوئے تھے! الٹے ہاتھ کیطرف چھ انچ اونچا کیوپڈ کا سٹیچو عشق کا بھولا بھالا تیر انداز اپنی تیر و کمان کے ساتھ - اپنے سر پر چھوٹی سی پیالی سگرٹ اور سگار کی راکھ اٹھانے کے لیے، رکھے ہوئے کھڑا تھا! میز کے سامنے سیاہ بنٹ وڈ چیر، پر - بید گاڑھی ہوئی لکڑی کی کرسی پر، ایک نوجوان حسین لڑکی کسی خاص خیال میں مستغرق بیٹھی تھی!! اس حسین لڑکی کے متفکر اور پریشان مہ جبین کے الٹے ہاتھ کی کہنی میز پر ٹکی ہوئی تھی، اور وہ اسی ہاتھ پر زور دیے ہوئے اسی ہاتھ پر جسکی گاؤدم نرم نرم انگلیاں چمکتی ہوئی پیشانی سے گذر کر سیاہ گھونگر والے بالوں تک پہونچی ہوئی تھیں، اپنا عارض آئینہ آسا رکھے ہوئے آگے جھکی ہوئی اور کسیقدر سیدھی طرف مڑی ہوئی غم و شکستہ دلی کے سمندر میں شناوری کر رہی تھی! سیدھا ہاتھ، بے حس و حرکت، سامنے والے روزانہ اخبار پر رکھا ہوا تھا! یہ ہی تھا وہ اخبار

جس کی تحریر نے - آج کے پرچہ کی جانکاہ خبر نے - اس حسین نازنین کو عجیب کشمکش میں - ناممکن الاظہار الجھن میں - مبتلا کر رکھا تھا!

وہ بار بار اپنے خیالات کی باگ روک کر - یاس والم کے چھائے جانے والے غبار کو دور کرتے ہوئے - امید کی روح پرور جھلک دیکھنی چاہتی تھی؛ وہ طرح طرح سے اپنی سر پیٹنے والی حسرتوں کو سمجھا کر مچلنے والے ارمانوں کو تھپکتے ہوئے - دم توڑنے والے دل کو دلاسہ دینا چاہتی تھی! مگر کہاں؟ وہ جب کبھی دیوار پر لگے ہوئے بسٹ پر نظر ڈالتی ایک شعلہ - جلتا ہوا - بھڑکتا ہوا شعلہ - اس کے سینے سے اٹھتا اور اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا! وہ گھبرا کر منہ پھیر لیتی اور اب کیوپڈ کا مجسمہ سامنے تھا: وہ جس وقت اس دیوتا کی طرف دیکھتی ایک تیر - تیز اور زہر میں بجھا ہوا تیر - اسکی آنکھوں سے اتر کر اس کے دل و جگر میں ترازو ہو جاتا! آہ! وہ گھبراتی، وہ پریشان ہوتی، وہ انتہائے کوشش کے ساتھ سنبھلنا چاہتی؛ مگر اس کا سانس گلے میں اٹکتا تھا، اس کا دل مجروح دل، زخمی دل، شکستہ دل سینہ کی قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا! تڑپتا تھا، تڑپتا تھا اور تڑپتا تھا!!!

کیوں؟ اس لیے کہ روزانہ اخبار کی عبارت جو کچھ کہہ رہی تھی، صاف صاف کہہ رہی تھی: اس میں کوئی دھوکا، کوئی شبہ، نام کو بھی نہ تھا:-

نہایت مسرت کے ساتھ ہم اعلان کرتے ہیں کہ مسٹر ایس[۵۱] - ایم - شا ایم - اے (کینٹب) کے سچے دل کی قدر کی گئی اور کرنیل پیرسن[۵۲] نے

[۵۱] ان حضرت کا اصلی نام سید نیر شاہ تھا اس لیے اسکو انگریزی جلا دینے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہوئی - اب وہ اپنا نام S. m. Shaw لکھتے تھے - [۵۲] یہ نام دراصل

کی اکلوتی لڑکی حسن وقت مس نانا ریمے[1] نے پیش کردہ چھلے کو زیب انگشت کر لیا! یقین ہے کہ مسٹر ابلیس۔ ایم۔ شا کے حلقۂ تعارف کو اُن کی شادی پر مبارکباد دینے کا موقع آیندہ گرمیوں میں ملجائیگا، جبکہ ہمارے معزز کامیاب نوجوان اپنے ماہِ شہد[2] کا لطف اُٹھانے کسولی یا مسوری تشریف لیجائیں گے!"

یہ تھی وہ دلکش خبر جسنے اس ناتجربہ کار نازنین کے نخل آرزو کے ساتھ بجلی کا کام کیا تھا؛ اُس کی حسرتوں کو پامال کر دیا تھا؛ اُس کی دلی تمنا کو۔ امید کی آغوش حمایت میں پلنے والی تمنا کو۔ جڑ سے کاٹ ڈالا تھا! وہ اِس کو پڑھتی تھی اور بار بار پڑھتی تھی: سمجھتی تھی اور طرح طرح سے سمجھتی تھی؛ لیکن ناکامی اور نا اُمیدی کی بھیانک تصویر کے سوائے اور کچھ نہ دیکھ سکتی تھی، اور فریب و مکاری کے جانگداز الفاظ کے سوائے اور کچھ نہ سُن سکتی تھی! مسٹر ابلیس اس خاص اثر کو دیکھ کر۔ اس شریف دل کو توڑنے والے نظارہ کو دیکھکر، اس اچانک غم کے پہاڑ کے ٹوٹ پڑنے کو دیکھکر۔ انتہائے مسرت کے ساتھ اُچھل رہا تھا، مکر و فریب کی کامیابی پر اپنی تمام

---

[1] ریمے تو وہی رمزی کی مسخ شدہ شکل ہے اور نانا اسطرح حاصل ہوا کہ بلقیس بیگم کو پیار سے ننھو کہا کرتے تھے، اُس ننھو کو نانا کا لباس پہنا دیا گیا اور آخر میں یورپ کے قاعدہ کیموفلاج یا پ کا نام شامل کر کے Nina Ramsay بنا لیا! ہلدی لگی نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آیا!

[2] ماہ شہد Honey moon کا لفظی ترجمہ سمجھ لیجئے: چاند میں شیرینی تو پیدا ہو گئی، مگر ڈر اس بات کا رہا کہ کہیں اس میٹھے چاند کی چاندنی پر مکھیاں نہ بھنکیں اور چیونٹیاں نہ چڑھیں!! - ۱۲

خواہشات قلبیہ کے ساتھ ناچ رہا تھا، اور ہوا سے ہلنے والے شعلۂ آتش کے مانند ایک ٹانگ اٹھا کر تھرک رہا تھا!!

"کیا یہ وہی ایس۔ ایم۔ شاہے جو اب تک برابر محبت آمیز تحریر و تقریر میں بے تابیٔ دل کا یقین دلانے والی تحریر و تقریریں۔ اس کمسن نازنین کو میری پیاری میرے دل کی مالک، کے الفاظ سے یاد کرتا رہا ہے؟"..... ہاں وہی!..... "کیا اسی مکاری اور عیاری کو وہ محبت جیسے پاک جذبہ کے نام سے پکارتا ہے: کیا اسی تہذیب و تعلیم کی آڑ میں ننگ و ناموس کا شکار کرنے کو۔ اپنی جھوٹی محبت کے جادو سے ایک نازنین دل کو زندہ درگور کرنے کو۔ وہ عشق و سچائی سے تعبیر کرتا ہے؟"..... ہاں اسی کو!!..... "کیا ایسے ہی خود غرض اور بے ایمان، شکاری کتے پر لایق اور معزز انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے: کیا ایسے ہی کمینہ خصال وحشی پر قربان ہونے کے لیے۔ اس کے از سر تا پا مہمل الفاظ پر نثار ہونے کے لیے آزاد اور ترقی یافتہ طبقۂ نسواں اپنی حیا و عزت کو خیرباد کہدے؟"..... ہاں بے شک ایسے ہی!!! یہ اور قریب قریب ایسے ہی اور سوالات اس مصیبت زدہ نازنین کے دم توڑنے والے دل سے پیدا ہو رہے تھے: اور یہ اور تقریباً ایسے ہی اور جوابات۔ اکھڑ، ترش، اور زبردستی لیز جوابات، مسٹر ایس کمسن کے دل و دماغ میں حلول کر کے۔ اپنی بت شیطنت کی بوقلموں کرشمہ سازی کے ساتھ حلول کر کے خود سے رہا تھا!!

اس غنچہ خاطری کی کیفیت میں اس ہجوم یاس و نا امیدی کی حالت میں اس آفت زدہ نازنین نے جو ایک متمدن اور تعلیم یافتہ نوجوان کے

دام تزویر میں پھنسی ہوئی تھی۔ بلکہ پھنس چکی تھی۔ اپنے روٹھے جانے والے دل کو منانے کے لیے، اپنی مشتعل ہونیوالی طبیعت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے، کوئی شغل ڈھونڈھنا چاہا اور بلا کسی خیال کے ایک ایک مجلد کتاب سامنے والی کتابوں میں گھسیٹ لی گھسیٹ لی اور اندھا دھند ایک جگہ سے کھول لی! بخت و اتفاق سمجھا جائے یا زندہ کرامت! غرض جو کتاب اس نے بغیر سوچے سمجھے اٹھائی تھی وہ مرحوم حکیم شیراز کا لگایا ہوا باغ تھا جسکی مہک صدیوں بعد بھی اب تک روز اوّل کیطرح قائم تھی اور جس سطر پر خود بخود دست سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ اسی حکیم علیہ الرحمۃ کا مجمل اور نصیحت سے بھرا ہوا شعر تھا:۔

"اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جان شد و آواز نیامد"

آہا! ایک آن کی آن میں تمام گذری ہوئی زندگی کا فوٹو اس کے سامنے آگیا، تمام خوش کن، فرحت افزا، گھڑیاں یاد گذشتہ کے لباس میں جلوہ گر نظر آنے لگیں، اور تمام روح پرور، پر از جذبات محنت خلوت کے موقعہ، دماغ کے فانوس خیالی میں یکے بعد دیگرے چکر کھانے لگے! اُف! اس کا سر چکرایا، اس کا دل بیٹھا! اس کی طبیعت گری، اور اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا!!! ایک دل سے اٹھنے والے بخارات کا بادل دماغ پر چھایا! آنکھوں میں گھٹا بلکوں پر نکلا! اور دو گرم گرم قطرے۔ صرف دو جلتے اور کھوتے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ سامنے رکھی ہوئی کتاب پر گرے!!!

"قاہ قاہ!! قاہ قاہ!!" مسٹر ابلیس نے شر و نفس اور تباہی پر جان دینے والے مسٹر ابلیس ہنے۔ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تضحیک کے ساتھ

قہقہہ مارا، اور اس یاس و حسرت کے احساس پر۔ اس بیکسی اور صبر سے پیدا ہونے والے شریف جذبہ پر قوتِ آرزو فرمائی کی پوری کوشش کے ساتھ خباثت آمیز اور ہوس انگیز خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ "قاہ! قاہ!! قاہ!!! ۔ رو! رو!! رو!!! ۔ اے بیوقوف لڑکی رو! پکار پکار، اور میرے ادنے اشارہ پر گردن جھکا دینی والی دنیا میں کسیکو اپنی حمایت پر پکار! قاہ! قاہ!! پھر اگر تیری حماقت بھری گریہ و زاری کوئی نہ سنے: تیری بزدلی اور جہالت کی چیخ پکار پر کوئی نہ آئے اور یقین جان کہ نہ کوئی سنے گا اور نہ آئے گا۔ تو میری طرف رجوع کر! مجھ با اختیار فرمانفرمائے عیش و عشرت کی بارگاہ میں گردن جھکا دے! گردن جھکا دے اور دیکھ کہ ایک لمحہ میں تمام دنیاوی کر و فر، تمام ظاہری آرام و آسائش، اور تمام اس جہان کا اقتدار و تنعم ماہر ہر قدم پر تیرے بلا گردان ہوتا ہے یا نہیں؟"

اب اس حسرت نصیب نازنین نے گردن اٹھائی، پیشانی کا بل کھلا بحر حسن کی صاف و شفاف سطح پر خط کھینچنے والی موجیں پھیلتے پھیلتے کناروں کی طرف غائب ہو گئیں۔ اور اس نے ایک گہرا۔ گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا!! اب اس دل شکستہ حسین نے سامنے کیطرف دیکھا، آنکھیں اٹھیں اور کھلیں، چشم بیمار کی رنجور اور ضعیف نظر کسی نوشتی اور کمزور ہاتھ سے پھینکے ہوئے تیر کی طرح لڑکھڑاتی اور ہچکولے کھاتی چلی۔ اور اس نے اپنی دماغی دوربین سے آنیوالے زمانہ کو تاریک مستقبل کو سکوت کے ساتھ دیکھنا شروع کیا!! دنیا کی چمکتی اور جگمگاتی چیزیں، اپنی ہمیشہ جیسی دل لبھانیوالی آب و تاب کے ساتھ چشم چشم پر موجود نظر

آرہی تھیں۔ عجیب موشر رنگ میں چکراتی ہوئی نظر آرہی تھیں؛ کانس پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی ٹک ٹک زمانہ کی بے پرواہ چال کے ساتھ اپنی دونوں سوئیوں کو ہر ساٹھ منٹ کی سرگردانی میں صرف ایک مرتبہ کچھ سیکنڈ کے لیے ہم آغوشی کا موقع دینے والی ٹک ٹک۔ برابر اپنے ختم ہونے والے معمول میں مشغول تھی؛ اور؟ اور۔ اس خاموشی و سکوت کے عالم میں نہایت دور سے آنیوالی گانے کی آواز اس چپ چاپ لڑکی کے قوت سامعہ کو زبردستی اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی!!

"قاہ! قاہ! قاہ!! مسٹر ابلیس اب اپنی تمام کشش پُرہوس کی انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے نہ محسوس ہونیوالے اثر کو۔ قوت سمریزم سے زیادہ کارگر اثر کو۔ اظہار بندہ پر تلبیس کے رنگ میں برابر ڈال رہا تھا۔ اے محدود خیالات رکھنی والی ناسمجھ! اے جہالت اور رسم شرافت کے جال میں پڑنے والی چڑیا! جسارت سے کام لے، اپنی گاڑی کا پہیہ خود چلا! حیا و شرم کے پردہ کی دھجیاں کر، صبر و شکر کے بیہودہ اور لچر خیال کو چھوڑ! عزت، آبائی اور ننگ و ناموس کے وہم کو نکال، آ اور آزادی کے تخت پر جلوہ گر ہو کر حکمرانی کر! میرا راستہ اختیار کر اور محکوم کے عیوض حاکم بن۔ اے حسن لڑکی! اے بھولی بھالی نازنین۔ اگر کوئی نفس اپنی ابلیسانہ چالاکی کے ساتھ تیری معصومیت اور موہوم عصمت کے معاملہ میں دھوکا دے، تو بچنا نہیں! افسوس نہ کر! کیونکہ یہ دنیا ہی جس میں تو رہتی ہے محض دھوکا ہی دھوکا ہے! اور دھوکے میں دھوکہ دینا عین عقلمندی ہے! دھوکے کا احساس چھوڑ، مکر و فریب کو جرائم نہ سمجھ! اور کسی سے شکست پاکر صبر نہ کر! بلکہ انتہائے بے پرواہی

کے ساتھ تو خود بھی دھوکہ دینے کے لیے کھڑی ہو جا! ایک چالباز مرد کے عیوض میں تو بھی ہزاروں مردوں کو اپنے تبسم فتنہ انگیز سے تباہ کر دے اور الگ رہ! ایک دھوکہ دینے والے نوجوان کے انتقام میں تو بھی تمام نوجوانوں کو اپنے اشارۂ چشم و ابرو سے تہ و بالا کر ڈال اور کسی کے قبضہ میں نہ آ! آزادی کا لطف اٹھا، عیش و تنعم کے مزے لوٹ! آہ! آہ!! اور اگر اب بھی ایک نادیدہ ہستی کی قائل ہو کر روز جزا کے خیالی پلاؤ کی امید میں حقارت اور ذلت کی زندگی بسر کرنی چاہتی ہے تو رہ، اے یاس و حسرت سے جلنے والی شمع رو! اور اس وقت تک رہ، جبتک کہ تیرا موم جیسا دل پگھل پگھل کر معدوم نہ ہو جائے اور تیری ناچیز ہستی [illegible] کے اثر میں سر نہ پٹکنے لگے!! کچھ عرصہ تک [illegible] کے بعد اس عجیب لڑکی کی طبیعت نے کروٹ بدلی، اس نے گلستان سعدی بند کر دیا، اور ریشمین رومال سے اپنی پرنم آنکھوں کو خشک کیا، اٹھی، غم و غصہ کے عالم میں کرسی کو پیچھے ہٹاتی ہوئی اٹھی، اور غیض و غضب کیساتھ دیوار پر لگے ہوئے بسٹ کو گھور کر نفرت و انتقام کہتی ہوئی باہر چلی گئی!!

مسٹر ابلیس بے ایمانی اور آرزو فرمائی کی شیرنی میں اشیم کا کام دینے والا مسٹر ابلیس کامیابی و فتحمندی کے عالم میں اکڑتا اور جھومتا ہوا چلا: چلا اور وہی غلط فہمی کی وجہ سے برانگیختہ کرنے والا شعر - دور کے گانے کی آواز میں کمسن لڑکی کو اپنی طرف ہمہ تن گوش بنانیوالا شعر - جوش تخم ریزی ہوا و ہوس کے ساتھ گنگناتا ہوا چلا:-

بیار باده که ایام غم نخواهند ماند چنان نماند و چنین نیز هم نخواهند ماند

سلطان حیدر - جوش (علیگ)

غزل

بلبل شیدا نہ کیونکر دلسے ہو شیدا ئے گل
باعث رنگ محبت ہے رخ زیبائے گل

نغمہ سنجی کرتی ہیں گلزار میں جب بلبلیں
صاف آتی ہے یہی آواز ہر دم ہائے گل

عاشقونکے واسطے ہے حسن وجہ آرزو
داغ کی دلمیں جگہہ صحن چمن میں جائے گل

قلب عاشق کیطرح ہے آسماں پر مضطرب
ہو گیا ابر بہاری بھی مگر شیدائے گل

رنگ اسکا ملتا جلتا ہی گلوں کے رنگ سے
اے شرر داغ دل بیتاب ہے ہمسائے گل

کیوں نہ ایسے گل پہ شیدا ہوں زمانہ کے حسین
سرخ پیراہن میں پوشیدہ ہی جسم نازنین

تازگی سی تیلیاں آنکھونکی آسودہ ہوئیں
اسکی نرمی سی نگاہیں خواب آلودہ ہوئیں

چشم بینا میں کھبی جاتی ہی رنگت دیکھئے
پتیاں برہم ہوا سے ہیں نزاکت دیکھئے

اسکی خوشبو باعث تقویت قلب و دماغ
زینت صحن چمن گلزار کا چشم و چراغ

رنگ اسکا مردہ دل کے واسطے اکسیر جان ہے
اور مہک اسکی دماغونکے لیے ریحان ہے

پیاری پیاری شکل سی آنکھونمیں حیرت چھا گئی
وہ ملی لذت کہ آخر روح بھی شرما گئی

گرد پھر پر نگاہ نے کیا اسکا طواف
بس گئی آنکھونکے پردونمیں رنگت صاف

نور عرفاں ہے عرق اسکا بصارت کیلئے
باعث تحریک ہے رنگ محبت کیلئے

اے شرر تشریح میں اسکی نہایت طول ہے
اصل میں ہے خون دل اور دیکھنے میں پھول ہے

احسن میرزا مشہدی لکھنوی

علم ہیئات اور مسلمان

دنیا کے تمام علوم و فنون کا وجود مدبرین عالم کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے لیکن صرف علم ہیئت اپنے وجود میں ایشیا کے صحرا نشین چرواہوں کا ممنون احسان ہے جو ایشیا کے کھلے میدانوں میں اپنی پر مصیبت راتیں اختر شماری میں بسر کرتے تھے۔ بے شغلی سے گھبرا کر صفحہ افلاک کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ مزید مطالعہ کے بعد ستاروں کی ہر سطر میں انھیں یہ عبارت نظر آنے لگی کہ "اس دائرہ افلاک کا ہر نقطہ کوکب ایک مستحکم قانون کی سطح پر ساکن ہے یا حرکت کرتا ہے۔ کوکب کا سکون و حرکت ہماری زراعت پر خاص اثر کرتا ہے ان ستاروں کا تغیر و تبدل کسی خاص اصول پر ہے"۔

دماغ میں ان خیالات کے آتے ہی انہوں نے ستاروں کے نام رکھے ان کی حرکت کا اندازہ کیا ان کے منازل مقرر کیے ثوابت کی امداد سے خاص خاص سمتوں کی علامتیں قرار دیں۔ رفتہ رفتہ یہی معمولی قواعد زراعت کے فصول اور بے نشان صحرا اور بے پایاں دریا کی دلیل راہ بنے۔ مدت تک یہ چند سادہ اصول جو صحرا نشینوں کے مشاہدوں کے نتیجے تھے خاموش سلف ایشیا کے جنگلوں میں گشت کرتے رہے لیکن امتداد زمانہ کا پرکار ان معمولی اصولوں کا دائرہ وسیع کر رہا تھا۔ جن کو آج علم ہیئت (اسٹرانومی) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر اب تک اس علم نے فن کی حیثیت نہیں پیدا کی تھی۔ سب سے پہلے ہندوستان میں ان چند معمولی اصولوں نے جو اب تک معلوم ہو چکے تھے۔ فن کا قالب

اختیار کیا۔ علم ہیئت کے سرپرستوں کی فہرست میں ہندوستان کے بعد مصر کا نام ہے۔ یہاں پہونچکر مورخین میں ایک بڑا اختلاف یہ ہوتا ہے کہ کیا مصر میں یہ علمی فیض ہندوستان سے آیا۔ جسطرح ہندوستان کو مستقل طور پر اس کے موجد ہونے کا حق حاصل ہے مصر کو بھی ہے؟ نہیں فیصلہ صحیح یہ ہے کہ دنیا کے دونوں قدیم حصّوں میں اس علم نے مستقل زندگی حاصل کی۔ نہ ہندوستان اس کے لیے مصر کا ممنون ہے نہ مصر ہندوستان کا کیونکہ اگر مصری ہیئات کا ماخذ ہندوستان ہوتا تو دونوں کے اصول مسائل طریقہ بحث ایک ہوتے یا کم از کم مشابہ ہوتے حالانکہ دونوں کے اصول میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا کہ مصر کو ہندوستان سے ہے۔ تیسرے تاریخی طور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قدیم الایام میں کبھی ان دونوں ملکوں میں سلسلۂ آمد و رفت تھا۔ مصر ہندوستان کا تعلق حملۂ اسکندریہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور علم ہیئات کا وجود مصر میں اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کو اپنے علوم کے ساتھ جو بخل تھا وہ کیوں کر اجازت دے سکتا تھا کہ ہندوستان مصر کے لیے اپنے خزانہ کا دروازہ کھولدے۔ اس لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان اور مصر میں الگ الگ یہ فن پیدا ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اور آب و ہوا سے علم ریاضی کو ایک قدرتی مناسبت تھی۔ ہندسہ موسیقی۔ علم نجوم کا گہوارہ و طفولیت یہی ہندوستان ہے۔ لیکن مصر کا پایہ بھی علم اقلیدس کی ایجاد ہندوستان سے کچھ زیادہ پست نہیں رہنے دے سکتی۔

علم ہیئت نے مصر اور ہندوستان میں نشو و نما پاکر اپنے حدود سے

جب باہر قدم نکالا تو حنا بابل۔ ایران میں داخل ہوا۔ شاہان پارس سے ضحاک اور جاماسب نے اوس کی زیادہ قدر کی۔ ان متمدن ملکوں سیر کرتا ہوا فنیقیہ اور یونان پہونچا اور گو اسی طرح علم ہیئات اپنے کے منازل طے کرتا جاتا تھا لیکن اس کا حقیقی پہلا دن وہ تھا کہ جب مصر میں اسکندریہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اب یہ مدرسہ دنیا میں علم ہ کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی کیا گیا تھا جس میں علم ہیئات کی تمام کتابیں بقدر امکان جمع کی گئی تھ ہپیارک یونانی اور بطلیموس مصری جو علم ہیئت کے سب سے پہلے مدو اس مدرسہ کی تعلیم کے نتائج اور اسی پراگندہ بزم کے دو رکن اور گو ان سے پہلے اور ان کے بعد بہت سے اس فن کے ماہ پیدا ہوئے جیسے ارشمیدس سنہ ۲۵۰ ق م (بقلاوس) سنہ ۱۶۰ ایلونیو خاون۔ فالیس رومی۔ ثاومنیس اینگلوس بابلی۔ فرابا (بخت نصر کا منجم) ابیون وغیرہ وغیرہ جن کی کوششوں سے ہیئات نے ایک حد تک ترقی کی مگر ہپیارک اور بطلیموں دو ایسے شخص ہیں جن کے ذکر علم ہیئات کی تاریخ کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی +

ہپیارک سنہ مسیحی سے چند سال پہلے شہر بروسہ میں پیدا تھا جغرافیہ کا طول و عرض البلد پہلے اس نے دریافت کیا تھا۔ ستا کی ایک فہرست تیار کی جس میں اُن کی چالوں کی تفصیل تھی۔ اُس زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اوس نے نقطۂ اعتدال رجعی حرکت دریافت[1] کی۔

[1] علم الہیات ۱۲

بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ مدرسہ اسکندریہ میں اس نے ہیئات کی تعلیم پائی اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ مدرسہ اسکندریہ کی تاریخ میں سب سے پہلے جلی نام بطلیموس کا لکھا گیا۔ علم ہیئات کی معلومات میں معتد بہ اضافہ اسوقت سے ہونے لگا جب سے آلات رصد ایجاد ہوئے۔ آلات رصد کی ایجاد اور ستاروں کی ترصید سب سے پہلے بطلیموس نے کی بطلیموس نے ہیئات کی ایک گراں بہا خدمت یہ کی کہ اس نے علم ہیئات کی منتشر معلومات ایک کتاب کی صورت میں منتظم کر دیئے جو مجسطی کے نام سے مشہور ہے[۱]

چوں کہ اسلامی علم ہیئات کی تاریخ مجسطی سے شروع ہوتی ہے اس لیے اس کے متعلق ہم کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں جس سے یہ قیاس ہوگا کہ جب صرف ہیئات کی کتاب مجسطی کے متعلق مسلمانوں نے اتنی جانکاہ کوششیں کی ہیں تو نفس علم ہیئات کے متعلق کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔

مجسطی ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ترتیب کے ہیں۔ چونکہ بطلیموس نے اسی کتاب کے ذریعہ سے ہیئات کے پراگندہ معلومات کو یکجا کیا تھا اس لیے مجسطی سے بڑھکر اس کتاب کا کوئی نام موزوں نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ہیئات کی سب سے پہلے جامع کتاب اوریانوس اور آنطوتیوس کے عہد میں انہیں دونوں میں سے ایک کے لیے لکھی گئی تھی[۲]۔ ملاکاتب چلپی کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب ہیئات کی اعلیٰ ترین تصنیف ہے۔ بلکہ یہ کتاب اصل ہے اور ہیئات کی تمام تصنیفات اسکی خوشہ چیں ہیں۔

سب سے پہلے یحییٰ ابن خالد برمکی کی فرمائش سے چند لوگوں نے

---

[۱] فہرست صفحہ ۲۶۰-۱۲۔ [۲] فہرست صفحہ ۲۶۰-۱۲

ملکر اس کتاب کو عربی عبارت سے آراستہ کیا یحییٰ کے خاطر خواہ یہ ترجمہ نہوا۔ اس لیے اس نے بیت الحکمت کے مترجمین ابو حسان اور سلم کو اس خدمت کے انجام دینے کا حکم دیا۔ ان دونوں نے ماہرین فن کی ایک جماعت کو اس ترجمہ کے لیے مقرر کیا۔ جب یہ سب ترجمہ کر چکے ان تراجم میں سے جو سب سے زیادہ صحیح اور بامحاورہ تھا اس کا انتخاب کیا اس پر بھی شوق کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔

حجاج بن مطر نے مامون کے عہد میں اسکا دوبارہ ترجمہ کیا۔ تبریزی نام ایک شخص نے اس کا تیسرا ترجمہ کیا۔ ثابت بن قرہ (مترجم بیت الحکمت) نے اس ترجمہ کی اصلاح کی۔ اسحٰق نے اسکا چوتھا ترجمہ کیا جس کی اصلاح پھر ثابت نے کی۔ مامون اس کتاب کا عاشق تھا۔ مامون کے عہد میں حجاج میں یوسف ثابت ثمرہ نے پھر اسپر نظر ثانی کی۔

اس کتاب میں تیرہ مقالے ہیں سے صرف پہلے مقالہ کی طرفیوس اور عربن الحسن حران اور ابراہیم بن صلت نے تفصیل کی ہے۔ ابوریحان بیرونی نے حشو اور زوائد سے پاک کر کے اسکو مختصر کیا۔ فاضل نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری نے اسکی شرح لکھی۔ قاضی زادہ رومی نے اس شرح پر حاشیہ لکھا۔ شمس جمال الدین ابوالفرج کے ایما سے محی الدین یحییٰ اندلسی نے اسکا خلاصہ کیا۔ اور مجسطی پر کچھ اضافہ کیا۔ محقق نصیر الدین طوسی نے مجسطی کے اشکالات ایک ضمیمہ تصنیف کے ذریعہ سے حل کیے۔ محقق شمس الدین سمرقندی نے اس کی شرح لکھی ہے۔ بعض علمائے متاخرین نے بھی مجسطی کی شرح کی ہے۔[1]

[1] کشف الظنون صفحہ ۲۲۶ - ۱۲

مجسطی کے سوا اور کسی خاص ہیئات کی کتاب کا ترجمہ مسلمانوں نے نہیں کیا۔ دنیا کی اہل علم قوموں کی معلومات سے فائدہ اٹھایا اُن کو اپنی تصانیف میں جگہ دی اور صفحۂ عالم پر آج یونانی تالیفات کا نشان نہ ہوتا اگر مسلمانوں کی علمی قدردانی کا ماتمہ ان کو نہ تھامتا۔ ایک انگریز مصنف کہتا ہے:۔

> علمائے عرب نے ریاضیات کی پوری پوری خدمت کی اگر انکی توجہ نہ ہوتی تو یونانی ریاضی تصنیفات کا اکثر حصہ برباد ہو گیا ہوتا۔ لیکن اصل یونانی نسخوں کے ضائع ہو جانے پر عربی تراجم میں محفوظ رہا۔[1]

مثلاً اوس اسکندانی جو ۱۰۰ء میں تھا ہیئات کا بڑا عالم تھا بطلیموس نے مجسطی میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی تصنیفات یورپ نے عرب کے ہاتھوں سے پائی۔[2] مسلمانوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ قدیم تصنیفات کو معدوم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اپنی خاص تحقیقات اور معلومات سے علم ہیئات کی تجدید کر دی۔ علم ہیئات کیطرف مسلمانوں کی توجہ ابوجعفر منصور دولت عباسیہ کے دوسرے تاجدار کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ ابوجعفر کے بعد ہارون کے عہد تک اس علم کی ترقی ایک معمولی انداز سے ہوئی۔ مامون جب سریر آرا ہوا تو اس نے ہیئت پر ایک خاص لطف کی نگاہ ڈالی اور یہ اسلامی ہیئات کی ترقی کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں نے اس علم کو تقلیدی طور سے نہیں سیکھا بلکہ بجائے خود بھی اس کی تحقیق کی۔

---

[1] اکتفاع القنوع صفحہ ۲۳۴ - ۱۲ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا - ۱۲

بنو موسیٰ ماموں کے زمانہ میں محمد۔ احمد۔ حسین۔ تین بھائی تھے۔ جن کو فلسفہ اور ہیئات کے ساتھ خاص شغف تھا۔ عربی میں اکثر تراجم انہیں کی مدد سے ہوئے ہیں علم ہیئات میں انکو کامل دستگاہ تھی ماموں کے ایما سے خط نصف النہار کے درجہ کی پیمائش اس غرض سے کی تھی کہ محیط ارض دریافت کیا جائے اور اسکی تحقیق کی جائے کہ یونانی مصنفین نے جو محیط ارض بتایا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔

افلاک اور ستاروں کی تحقیق کے لیے ماموں نے رصد بنوائی تاکہ یونانی مسائل کی جرح و تعدیل کی جائے۔ مسلمانوں نے اپنی ہیئات کی بنیاد صرف یونانی تصنیفات پر نہیں ڈالی بلکہ دنیا کے تمام اہل علم ملک مصر ایران ہندوستان کے منتخب مسائل پر بیرونی نے قانون مسعودی میں اہل پارس کی علم ہیئات کو سب سے زیادہ قریب صحت بتایا ہے۔ کتاب الہند اور نیز قانونی مسعودی میں ہندوستان کے علم ہیئات کے مبسوط مسائل لکھے ہیں۔ قانون کو بیرونی نے سلطان غزنوی مسعود محمود بن سبکتگین کے لیے لکھا تھا۔ کہ بیزن اور لندن میں چند بار چھپ چکا ہے۔ ابو القاسم غزناطی المتوفی ۴۶۷ھ نے ایک ضخیم کتاب ہندوستان کی ہیئات پر لکھی۔

شاہان اسلام نے اس علم کی طرف جتنی نگاہ توجہ کی اس سے زیادہ کسی دوسرے فن کی طرف نہیں کی۔ اس کا اندازہ اس سے کرو کہ فرمانروایان اسلام میں سب سے زیادہ علم کا دشمن وحشی خونریز جاہل کون تھا؟ چنگیز خان بغداد کا تاراج کرنے والا تاتاری ہلاکو۔ مگر اس نے بھی مراغہ کی رصدگاہ اپنی یادگار چھوڑی۔ کسی قوم میں کسی چیز کے

حسن قبول اور کثرت کی کیا دلیل ہے؟ یہ ہے کہ اُس قوم کا اعلیٰ اسی اعلیٰ افسر اور ادنی سے ادنی فرد اس کو قبول کرے۔ ہیئات کے حسن قبول کا یہ حال تھا کہ سلاطین تک اس علم کے ماہر ہوتے تھے الوغ بیگ المتوفی ۸۵۳ھ اس علم کا ایک کامل الفن صاحب تصنیف استاد تھا۔ اسکی یہ کتاب لندن میں ۱۶۵۰ء میں اور اوکسفورڈ میں ۱۶۶۵ء میں چھپکر شائع ہوگئی ہے۔ کثرت کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں کے غلام تک ہیئات میں کمال رکھتے تھے۔ ابو المشعر فلکی المتوفی ۲۷۲ھ جو مسلمانوں میں ایک ماہر ہیئات داں گذرا ہے۔ اس شوق کو دیکھو کہ کہ ایک مشہور محدث تھا۔ ہیئات کا جوش ہوا تو ۴۷ برس کی عمر میں ہیئات سیکھی اور ایسی سیکھی۔ کہ اب اس فن کے ماہرین میں اس کا شمار ہے۔ اس ابو مشعر کا ایک غلام تھا۔ آقا کے کمال شوق کو دیکھکر یہ بھی ہیئات کی طرف متوجہ ہوا۔ مرتے وقت کتاب مطرح الشعاع کتاب تحاویل سنی المعالم والحکم الہیا کتاب تحاویل سنی الموالید یادگار چھوڑی۔ ابو الفتح عبد الرحمن علی خازن مروزی نام ایک شخص کا غلام تھا اس نے علوم ہندسہ کی تکمیل کی اور ایک زیج تصنیف کی اس کا آوازہ شہرت جب سلطان سنجر کے کانوں تک پہونچا تو اُس نے ہزار دینار عبد الرحمن کو نذر بھیجے[1]۔

مسلمانوں کی رصدگاہیں اسی سلسلہ میں مسلمانوں نے رصد کے متعلق جو ترقیاں کیں وہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہیں شمس الدین علی خواجہ نیسز چالیس برس تک ترصید کی مختلف مقاصد کے لیے اور مسلمانوں نے

[1] کشف الظنون صفحہ ۴۶۳۔ ۱۲

آلات رصد ایجاد کیے۔ زیجیں بنائیں جن میں سے اکثر آج یورپ میں چھپ گئی ہیں۔ یا قلمی محفوظ ہیں۔ آلات رصد کے نام اکثر تاریخ میں ملتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ انکا استعمال ایک مدت سے چونکہ متروک ہے اس لیے یہ وقت سے دریافت ہو سکتا ہے کہ یہ آلے کس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے ذیل میں ہم صرف ان آلوں کے نام بتائیں گے جن کے موقع استعمال سے ہم کو کسیقدر واقفیت ہے۔ بشرطیکہ اس کی ایجاد کا شرف مسلمانوں کو حاصل ہوا ہو:-

نمبر	نام آلہ	کیفیت	کس کام کے لیئے	موجد
۱	لنسبہ	مربع مستوی	اس سے میل کلی عرض البلد اور تاروں کی دریافت کی جاتی ہے	مسلمان
۲	حلقۃ الاعتدالہ	ایک قسم کا حلقہ ہوتا ہے جو دائرہ معدل کی سطح میں نصب کیا جاتا ہے	اس سے تحویل الاعتدالی دریافت کی جاتی ہے۔	ایضاً
۳	ذات الاذنار	چار ربع اسفوانی ہیں اسکی ایجاد نے حلقہ اعتدالیہ سے مستغنی کر دیا۔	تحویل اعتدالی اور تحویل لیل دریافت ہوتی ہے	علامہ تقی الدین
۴	ذات السمت والارتفاع	ایک نصف حلقہ ہے جسکا قطر چند متوازیہ السطوح اسطوانوں کی سطح ہے	اس سے سمت اور ارتفاع معلوم ہوتا ہے	مسلمان
۵	ذات الجیب	۔	۔	مسلمان
۶	المشتبہ بالناطق	۔ ۔	اس سے دو ستاروں کے درمیان کا بُعد معلوم ہوتا ہے۔	علامہ تقی الدین راصد
۷	الربع التام		ایضاً	ابن الشاطر دمشقی المتوفی ۷۷۷ھ

امین الشاطر مسلمانوں میں ایک بہت بڑا ہیئت داں گذرا ہے۔ النفع العالم اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ایک موقع پر آلہ الربع التام کی ایجاد کی یہ وجہ لکھی ہے کہ اب تک میں نے جتنے آلات رصد دیکھے ہیں اُن سب میں کچھ نہ کچھ فروگذاشت تھی اُس کی اصلاح کے لیئے میں نے الربع التام بنایا جو آسان ہے اور تمام باتوں کے خلاف کرۂ ارض کے ہر چہار حصّہ پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

رصد گاہوں کا وجود مسلمانوں سے پہلے تھا تا دن اسکندر لونی نے ۳۳۹ ق ع میں طیمور حارس نے ۳۳۲ ق ع میں اسکندریہ میں ایرخس نے ۱۶۱ ع میں مالانوس نے روما میں ۶۸ ع میں بطلیموس نے ۱۲۴ ع میں رصد گاہیں قایم کی تھیں عہد اسلام میں سب سے پہلے ماموں نے رصد بنوائی۔

۱۔ جب ماموں کے زمانہ میں مجسطی کا ترجمہ ہوا تو اُس نے اُن سب آلات کے بنانے کا حکم دیا۔ جن کا مجسطی میں ذکر کیا گیا تھا۔ دنیا کے ہر گوشہ سے ماہرین ہیئت جمع کیئے گئے جن کے ہاتھوں سے شہر شماسیہ بغداد اور دمشق میں ۲۱۴ھ میں رصد گاہیں طیار ہوئیں۔ ان رصد گاہوں نے صرف چار برس کی عمر پائی ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے ۸۱۳ ع میں ماموں کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس قلیل عرصہ میں بھی چند نئی باتیں دریافت ہوئیں جو ایک کتاب کی صورت میں زیج ماموں کے نام سے مشہور ہے۔ یہ رصد گاہیں یحییٰ ابن منصور خالد بن عبد الملک مروزی بن علی عباس بن سعید کے زیر اہتمام تھیں

۲۔ رصد ابی حنیفہ دینوری ۲۳۵ھ میں اصفہان میں قایم کی گئی۔ اس

رصد میں ستاروں کے متعلق جو معلومات ہوئی تھی اُن کو ابو حنیفہ المتوفی ۲۸۱ھ نے ایک کتاب میں ترتیب دیکر رکن الدولہ دیلمی کے نام سے معنون (ڈیڈیکیٹ) کیا تھا۔

۳۔ رصد حاکمی۔ حاکم بامر اللہ مصر کا چھٹا فاطمی خلیفہ تھا اس نے مصر میں ایک رصد بنوائی تھی[1] ابن یونس المتوفی ۳۹۹ھ میں اس کا مہتمم تھا۔ ابن یونس نے حاکم کے نام سے ایک زیچ بھی لکھی تھی۔ اس زیچ کو ۱۸۰۴ء میں فرنچ ترجمہ کے ساتھ کون ساڈی سفال نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے اُس کے قلم سے اور کتابیں بھی نکل چکی ہیں جن میں سے بعض خدیوی کتب خانہ مصر میں موجود ہیں +

۴۔ رصد ہوالاعلم۔ یہ رصد بغداد میں ۴۰۰ھ میں بنائی گئی تھی +

۵۔ رصد بیرونی ابوریحان بیرونی المتوفی ۴۳۰ھ اس کا بانی تھا۔

۶۔ رصد طوسی ہلاکو خاں نے نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کے درخواست پر مراغہ میں یہ رصد بنوائی تھی۔ اس رصد کی تیاری میں ہلاکو نے بیشمار روپیہ صرف کیئے۔ رصد کے ماہانہ اخراجات کے لیے بیس ہزار اشرفیاں مقرر تھیں۔ اس کے اہتمام کے لیے دور دراز ملکوں سے اس علم کے ماہرین طلب کیئے گئے تھے موید عرضی دمشقی سے فخر مراغی موصل سے فخر فلاطی

[1] اس رصد کی تاریخ ہی کاتب چلپی نے ۴۰۰ھ لکھی ہے مگر کسیطرح صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کا مہتمم ابن یونس تھا۔ اور حالانکہ خود یونس کی ولادت ۳۷۸ھ میں ہے اور حاکم بامر اللہ خود چوتھی صدی میں تھا ۴۱۱ھ میں وفات پائی۔ ۱۲

تھفلیس سے نجم الدین قزوین سے بلائے گئے تھے۔ ماہ جمادی الاول ۶۵۷ھ سے یہ رصد بنی شروع ہوئی تھی۔ یہاں ایک کتب خانہ بھی تھا جو بغداد و شام جزیرہ کی تاراج کردہ کتابوں سے آراستہ کیا گیا تھا +

۷۔ رصد الوغ بیگ = الوغ بیگ بن شاہ رخ بن تیمور لنگ المتوفی ۸۵۳ھ اس کا دار السلطنت سمرقند تھا۔ خود بھی علم ہیئت کا ماہر تھا اور علمائے ہیئت کا ایک مجمع بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ موسیٰ بن محمود قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی نویں صدی میں تھا اور غیاث الدین جمشید کا شاگرد تھا۔ انہیں دونوں کے مشورہ سے اس نے سمرقند میں اس رصد کی بنیاد ڈالی۔ مگر اوس کی بدقسمتی سے ہیئت کے یہ دونوں آفتاب و ماہتاب اختتام رصد سے پہلے ہی غروب ہو گئے لیکن ملک بھی باکمالوں سے خالی نہ تھا۔ جمشید کے لائق جانشین فرزند علی قوشجی کے اہتمام سے یہ رصد گاہ تکمیل کو پہونچی ان مذکورہ بالا رصدوں کے علاوہ اور بہت سی رصد گاہیں تھیں۔ جیسے رصد بن الشاطر۔ رصد تابخور صدیقانی۔ رصد طلیطلہ مگران کے واضح حالات چونکہ دستیاب ہو سکے اسلیے افسوس کے ساتھ انکو قلم انداز کرنا پڑا۔

مضمون کے خاتمہ پر ہمیں اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے کہ یورپ کی گردن میں اسلامی ہیئت کا طوق تلمذ ہے کہ نہیں۔ تاریخ سے اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے جرمن کا علم دوست بادشاہ فریڈرک دوم ایک طرف تو صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے علوم سے سیراب

ہو رہا تھا۔ میدان جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے صف آرا بھی ہے اور ریاضی کے مسائل ہلالی فوج کے سپہ سالار سے حل بھی کرتا ہے۔

ابن یونس المتوفی ۳۹۹ھ جو حاکم بامر اللہ خلیفہ فاطمی کا مشہور فلکی تھا جسکی کتاب الجلد اول الحاکمیہ پیرس میں چھپ گئی ہے اس کے حالات میں اڈورڈ ین کرنیلس ماتڈیک لکھتا ہے:۔

ابن یونس نے مصر میں ہیئات کے چند طریقے استعمال کیے جن کو ابن یونس سے اس کے بعد یورپ کے ہیئت دانوں نے اخذ کیا +

سب سے بیّن دلیل دعوے کی ہیئت کے اُن عربی اصطلاحات سے ملتی ہے جو یورپ میں آجتک مستعمل ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کی زبانوں میں یا تو بالکل اُسی طرح ہیں یا بگاڑ کر دوسرے نام رکھ لیے ہیں تفصیل یہ ہے۔

(۱) اسطرلاب۔ (۲) العفارہ۔ (۳) امدبران۔ (۴) الراجل۔ (۵) البسر الطائر۔ (۶) النسر الواقع۔ (۷) آخر النہر۔ (۸) راس الغول وغیرہ۔ +

محمد بسم اللہ خاں بسمل۔

افسوس ہے کہ ستمبر کے پرچہ میں جو ڈو۔ ڈو کارڈ ناظرین تمدن کی خدمت میں روانہ کیے گئے تھے اسپر بہت کم حضرات نے توجہ فرمائی۔ ہم ناظرین کی اس تجویز پر کہ تمدن کی تقطیع بڑی اور تصاویر میں اضافہ کیا جائے اتفاق کرنیکے واسطے موجود ہیں لیکن رسالہ ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ وہ اپنا خرچ برداشت کرلے۔ ناظرین تمدن شروع سال سے تقطیع کو بڑا اور تصاویر میں اضافہ چاہتے ہیں تو صرف موجودہ خریدار۔ دو۔ دو خریدار فراہم کردیں۔ اڈیٹر۔

نالۂ دل

میتا ہیں تمھارے واسطے آسمانیاں کیا کیا
مگر اوسپر بھی تم کرتے ہو نافرمانیاں کیا کیا

مگر پھر بھی تمھیں پابندیٔ مذہب سے نفرت ہے
تمھاری شرع نے دیں ہیں تمھیں آزادیاں کیا کیا

مٹے اسراف پر تم چاہے دولت ساری لٹ جاے
رچائیں تم نے اِس عشرتکدہ میں شادیاں کیا کیا

نہ کام اونکو سکھاتے ہو نہ تعلیم انکو دیتے ہو
مہینا کی ہیں پوتے کے لیے بربادیاں کیا کیا

بزرگوں نے ہمارے جو ہیں جنت بنائی تھی
نظر آتی ہیں کوسوں آنکھ سے ویرانیاں کیا کیا

دیے ہیں قوم کو یہ سب نے کیسے کیسے فدیہ بھی
ہوئیں ہیں کربلاے عشق میں قربانیاں کیا کیا

ہوئی سب زندگی برباد فرصت گاہ ہستی میں
جتائیں تمسے کیا ہمسے ہوئیں نادانیاں کیا کیا

یہ اُلٹا جوش آتا ہے کہ وہ پیرہن جلاتے ہیں
ابھی سے آرہی ہیں دیکھیے انگڑائیاں کیا کیا

اسے شوخی کہوں یا ظلم کچھ منہ سے نہ تم بولے
دکھائیں ہیں دل بیتاب نے بیتابیاں کیا کیا

ترقی کی کسینے اور بڑھاے قوم کے رہبر
کہوں کیا آپسے بڑھتی گئیں ویرانیاں کیا کیا

معاف اے رہبران قوم میں آزاد مشرب ہوں
تمھارے سامنے مجھسے ہوئیں گستاخیاں کیا کیا

بگوشِ دل سنو اب بھی وصیت نامۂ غم کو
وگرنہ پیش آئینگی تمھیں ناکامیاں کیا کیا

ہنسے کیسے مریض غم کا چہرا دیکھنے والو
کرو خوف خدا سے کچھ تماشا دیکھنے والو

عزیز لکھنوی

رباعی

دیرانہ یہ کل مکان ہی بستی تو ہے
دنیا کی بلندی اور پستی تو ہے

جو کچھ نظر آتا ہی وہ ہی وہم و گمان
ہر چیز ہے نیست صرف ہستی تو ہے

طاقِ بُستان یا قصرِ شیرین

میں ۱۹۰۱ء میں براہ خشکی ایران کا سفر کر رہا تھا۔ کوئٹہ کیطرف سے سواری شتر و کجاوہ افغانستان و بلوچستان کے پتیلی میدان طے ہو رہے تھے اور ہر منزل نہایت سخت و صعب تھی کبھی شب بھر چلتے تھے اور دن بھر قیام ہوتا تھا اور کبھی دن کو چلنا ہوتا تھا اور رات منزل پر گزرتی تھی۔ اسیطرح چار مہینے پندرہ روز کے بعد ہمارا قافلہ خراسان پہونچا۔ اور ایک ماہ بیس یوم گذرنے پر پھر قافلہ کو حرکت ہوئی اور ہم سرزمین طوس سے نہایت افسوس کے ساتھ جدا ہو کر پایۂ تخت طہران کیطرف سوار ہیئے قاطر روانہ ہو گئے اور چند روز طہران میں رہکر کاظمین و کربلا کی جانب راہی ہوئے پہلا راستہ یعنے کوئٹہ سے خراسان تک جیسا سخت و دشوار گذار تھا ویسا ہی یہ دوسرا راستہ یعنے خراسان سے۔ خانقی اور خانقی سے کاظمین تک نہایت پُر فضا اور راحت رساں تھا۔ طہران سے چلکر جب ہمارا قافلہ کرمان پہونچا ہے تو نہایت کسلمند تھا۔ اس لئے شہر کرمان میں بغرض آسائش ایک نہایت عمدہ منزل برائے قیام تجویز کی گئی اور اس منزل کے بالاخانہ پر ہمارا بستر لگایا گیا دو روز رہ کر شہر کی سیر کی اور حالات دریافت کیئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام ایران کے یادگار مقاموں میں۔ طاق بستاں ہے جسکو بادشاہ خسرو نے تعمیر کرایا تھا اور شیریں کو اکثر لیجایا کرتا تھا۔ یہ سنکر مجھکو اور میرے چند دوستوں کو بہت

بہت شوق پیدا ہوا اور آخر ایک روز اُس کے دیکھنے کو بسوار یئے قاطر روانہ ہو گئے تین ساعت کے بعد یہ چھوٹا سا قافلہ وہاں پہونچ گیا۔ مگر وہاں پہنچتے ہی کسل راہ برطرف ہو گیا۔ کیونکہ واقعی وہ مقام ہی ایسا تھا۔ جب ہم اُس کے قریب پہنچے تو ہمکو ایک نہر اور سنگین چار دیواری کے کچھ آثار نظر آئے کہ جنکا اب صرف نشان ہی نشان باقی رہ گیا تھا۔ جب اس چار دیواری کی حد سے آگے بڑھے تو ہم کو ایک چبوترہ اور پہاڑ میں ترش ہوا ایک ایوان نظر آیا جس کی خوبصورتی نظر و نہیں فوراً کھپ گئی۔

اِس ایوان کی بائیں جانب ایک بہت بڑا درہ نظر آیا جو خاص طاق بستان کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بلندی کو سر بفلک کہنا تو مبالغہ ہے لیکن اسمیں بھی شک نہیں کہ ہندوستان کی عمارتوں میں اتنا بلند درشاید کوئی نہو گا اور یہ بھی بالکل پہاڑ کو تراش کر نکالا گیا ہے۔ اسمیں داخل ہونے کے بعد سامنے کے رخ کو رستم کی قد آدم تصویر معہ اسپ و آلات حرب پتھر میں ترشی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور جیسے رستم کی بلندی شاہ نامہ میں دکھائی گئی ہے اُسی کے موافق یہ بھی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپ ایک فٹ سے کچھ زیادہ چوڑی ہے اور رستم کے کاندھے پر بڑھیہ پشت پر ڈھال لگی ہوئی ہے سر پر خود بر میں زرہ سینہ کی طرف بکتر و چار آئینہ کے نشان دکھائے گئے ہیں۔ پاؤں میں گیوہ اور بہت لمبی رکاب جو سطح زمین سے صرف دو بالشت بلند ہے۔ چہرہ سے ہیبت۔ بازوؤں سے تنومندی کے آثار نمایاں ہیں۔ شہسواری کے انداز بہت خوبی سے دکھائے گئے ہیں

گھنگی کے سبب برچھی کا کچھ حصہ یعنے بونڈ یکے پاس سے اور گھوڑے کا بایاں پیر گرا ہوا ہے گھوڑے کے پٹھے بہت بھرے ہوئے۔ گردن نہایت چوڑی اور بلند ہے آنکھیں خوب ابلی ہوئی اور تھوتھنی ذرا خوبصورتی کی حد سے زیادہ بھاری معلوم ہوتی ہے چارجامہ اور باگ وغیرہ کے بھی آثار پائے جاتے ہیں رستم کی کلائی بہت چوڑی اور انگلیاں خوب بھری ہوئی اور نہایت دراز معلوم ہوتی ہیں۔ بر میں ایرانی کوٹ۔ ہاتھ پنجہ داستانے چہرہ پر جلالت کے آثار نمایاں طور پر ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک پتھر ہے جس پر سیاحان دور و دراز کے مختلف کتبے مختلف زبانوں میں ہیں بعض "جرمنی" بعض "لاطینی" دو ایک کتبے پڑھے بھی گئے جنمیں ایک کتبہ مختار الملک حیدرآباد دکن اور دوسرا ایک انگریزی سیاح انگلینڈ کا ہے۔ رستم کا گھوڑا معہ سوار پہاڑ کاٹ کر نکال لیا گیا ہے صرف ایک پہلو لگا ہوا ہے داہنی جانب کا جو رخ ہے وہ بھی بصورت دیوار ہے اور اسپر شکارگاہ بنی ہوئی ہے کہیں ہرن چوکڑیاں بھر رہے ہیں کہیں شیر کچار سے نکل رہے ہیں کسی طرف شکاری لوگ گھوڑوں کی باگیں اوٹھائے جا رہے ہیں کہیں نہریں بنائی گئی ہیں اور کسی طرف جنگلی خار دار درخت اور گھاٹیاں وغیرہ نظر آتی ہیں ان کے علاوہ اور بہت سے مختلف جانوروں کی تصویریں ہیں جن کی اجنبی صورتیں پہچانی نہیں جا سکتیں۔ بائیں طرف بلندی پر تین رنگی تصویریں ہیں جن میں دو بہت خوبصورت تصویریں شاہزادیوں کی اور ایک مردانی صورت کی تصویر ہے جس کے سر پر تاج اور اسپر کلغی لگی ہوئی ہے جسم میں

بہت خوشنما رنگین لباس اور نشست کا طریقہ نہایت ادب آموز ہے روغن کی تازگی سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حال کا لگا ہوا ہے اور واقعی دریافت کرنے سے ایسا ہی معلوم بھی ہوا۔ ان تصویروں کے نیچے ایک کتبہ ہے جو نظم میں مثل قطعہ کے ہے اور صاف پڑھا جاتا ہے مگر کہیں کہیں کے حرف خراب ہو گئے ہیں اور بعض الفاظ ایران کی پرانی زبان کا پتہ دیتے ہیں اور بغیر غور و خوض کے ان کے معنے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں اسکی نقل بھی میں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ مگر اسوقت خیال نہیں کہ وہ کہاں ہے۔

درۂ کوہ سے نکلنے کے بعد وہ دیوار نظر آئی جو ایوان اور اس درہ میں حد فاصل کا کام دے رہی ہے۔ اس دیوار پر بھی ایک عجیب و غریب منظر کا مرقع نظر آیا۔ یعنے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ چت لیٹا ہے اور اس کے سینہ پر دو آدمی پابجولاں کھڑے ہوئے ہیں جنکی گردن میں خاردار طوق ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں یہ مرقع دیکھکر بہت تعجب ہوا اور وہاں کے رہنے والوں میں سے جو دو ایک کو بلاکر اس راز کو دریافت کیا تو ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ جو لوگ پابجولاں ہیں یہ چور اچکے ہیں اور جو چت لیٹا ہوا ہے اسی کے مال کے سارق اور اسی صورت سے شاید ان کے قاتل بھی ہیں اس کے بعد اس خوبصورت ایوان میں داخل ہوئے جو خاص "قصر شیریں" کے نام سے مشہور ہے اور جسمیں اکثر شیریں آکر بیٹھا کرتی تھی اور جشن کیا کرتی تھی۔ شیریں کے بیٹھنے کا مقام نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے بلندی پر تین چھوٹے محرابدار

درہیں اور پیچھے ایک بہت خوشنما حوض جس میں فوارہ لگا ہوا ہے
اور اُس حوض کے چاروں طرف در ترشے ہوئے ہیں اور اُن دروں
سے چاروں طرف راستے ہیں اور اُن راستوں میں جا بجا زینے لگے
ہوئے ہیں جن سے اوپر جا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں سب سے زیادہ جو بات
حیرت خیز اور تعجب انگیز تھی وہ یہ ہے کہ سوائے پتھر کی ترشی ہوئی
عمارت کے یہاں اور کسی قسم کی کوئی آرایش نہ تھی مگر نہیں معلوم وہ
کیا چیز تھی جو اس مقام کو بیحد دلچسپ بنائے ہوئے تھی۔ جس طرف
نظر پڑتی تھی محو ہو جاتی تھی جس طرف آنکھ اُٹھتی تھی نگاہیں لوٹ جاتی
تھیں اور کوئی نظر بغیر قربان ہوئے واپس نہ ہوتی تھی۔ مجھے اسوقت
بھی اس بات کی حیرت تھی اور اسوقت بھی ہے۔ نہیں معلوم
کس اصول سے یہ عمارت تراشی گئی تھی کہ اگر دنیا کے معمار ہوتے
تو محو ہو جاتے اتنا لکھنے پر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو
دل آویزیاں اس عمارت میں مضمر ہیں اُن کو خدا داد کہنا
چاہئے اور میرے قلم سے تو اُس دلچسپی کی تصویر کھینچ ہی نہیں
سکتی۔ اس لیے میں آگے چلتا ہوں حال کے درجہ سے نکل کر
بذریعہ ایک زینہ کے اوپر پہونچے اور وہاں سے جب اِس
خوشنما حوض کا نظارہ کیا تو اور بھی بھلا معلوم ہوا۔ مختصر یہ کہ ہر ہر مقام
سے کسی طرح اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ لمحہ لمحہ ذوق بڑھتا
ہی جاتا تھا۔ اور انتہائے شوق کا یہ تقاضہ تھا کہ اس تمام
کو دیکھا ہی کیجئے۔ اب ہم اس ایوان سے نکلکر اس کی پشت کی
جانب جاتے ہیں قدم اوٹھانے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا تھا۔

اور دل میں رہ رہ کر یہ خیال آرہے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد اب ہمیں اس مقام کو چھوڑنا ہی پڑے گا اور سنگ جبر سے سینہ کو دبانا ہی ہوگا دل میں ایک خاص قسم کی حیرت اور مزاج میں ایک گونہ خوشی کی جھلک پائی جاتی ہے اب ہم سب کے سب خاموشی کے ساتھ دریچوں سے نکل کر باہر آئے اور پہاڑ کا نصف وہ حصہ دکھائی دیا جو ترشنے سے باقی رہ گیا تھا۔ اور ناہموار پڑا ہوا تھا مگر اوپر جانے کے لیے بیشمار زینوں کا ایک سلسلہ بنا دیا گیا تھا کہ اگر کوئی اوپر جانا چاہے تو جا سکتا ہے اس کے معائنہ کے بعد اب ہمارا مختصر قافلہ دوبارہ پھر اس قصر کے سامنے آیا اور رخصتی نگاہوں سے بحالت مجموع جو اس منظر کو دیکھا تو سوائے ترشے ہوئے پہاڑ کے اور کچھ نہ تھا جو فرہاد کے کمال کا ایک کامل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

احسن میرزا۔ شرر مشہدی

راحت جانی یہ کتاب جو لڑکیوں کے واسطے ایک دلچسپ ہونیکے علاوہ آیندہ زندگی کا ایک عمدہ سبق اور ناصح ہے عصمت ایجنسی نے قابل مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر لڑکی کے مطالعہ سے گذرے تاکہ دنیا کے نشیب و فراز اور زندگی کی تمام ضرورتوں سے اچھی طرح واقفیت ہو جائے قیمت (عہ)

مہر افروز بیگم مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ اصفیہ کی بیش بہا تصنیف جس کا ایک ایک حرف لڑکیوں کے واسطے نعمت ہے عصمت ایجنسی نے مصنف موصوف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے لاگت سے تیار کی ہے۔ زبان کا لطف بیگماتی محاورے قصہ کی دلچسپی۔ غرض اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف دلچسپ ہی ہے بلکہ لڑکیوں کے واسطے نہایت مفید ہے۔ خود قابل مصنف کا نام اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ کتاب کس قدر مفید ہوگی قیمت فی جلد آٹھ آنے (۸)

لڑکیوں کی نشا جس کا ایک ایک خط دلچسپ ہونے کے علاوہ لڑکیوں کے واسطے ایک نصیحت کا دفتر ہے مولوی محمد عبد الراشد صاحب اخیر کی نام ہی اس انشا کی خوبیوں کے واسطے کافی ضمانت ہے قیمت ایک پیہ خریداران عصمت سے (۸/)

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

مجذوب کی بڑ

صبح کو جب روز روشن آشکارا ہو گیا
سمجھے وہ سلطان مشرق کا رفرما ہو گیا

ظلمتِ شب کا اثر آنکھوں سے سب جاتا رہا
ذرّہ ذرّہ روشنی میں دُرِّ یکتا ہو گیا

چار سو چلنے لگی کیسی ہوائے زہر یز
روح پرور جانفزا ہر ایک جھونکا ہو گیا

خامشی میں بے رہا تھا میں تصوّر کے مزے
سیر میں پیدا خود بخود شورِ جنوں برپا ہو گیا

چھا گئی آنکھوں میں حالت خوابِ مقناطیس کی
عالمِ ارواح پیشِ چشمِ بینا ہو گیا

شیشۂ دل بن گیا دورِ جنوں میں جامِ جم
مغز سر میں مرتسم اک نقشِ زیبا ہو گیا

دیکھتا کیا ہوں کہ ہے رشکِ کتابی روبرو
دفعتہً میں مائلِ تصویرِ لیلا ہو گیا

غش پہ غش آنے لگے دیکھی جو وہ رشکِ گل
منظرِ دلکش فروغِ طورِ سینا ہو گیا

وقتِ نظارہ تھا میں ساغرکشِ صہبائے حسن
بیخودیئے شوق میں محوِ تماشا ہو گیا

ساغرِ میخانۂ جاوید حاصل تھا مجھے
فیضِ ساقی سے میں رندِ بادہ پیما ہو گیا

دین و دانش کھو کے پایا اک لطیفِ بے حساب
ملّتِ پیرِ مغاں میں مل کے رسوا ہو گیا

پرتوِ روحِ القدس گویا شرابِ ناب تھی
دل مرا آئینۂ حالات اشیاء ہو گیا

دیدۂ دل بن گئے صغریٰ و کبریٰ کی مثال
اور نتیجہ یہ کہ لطفِ مے دوبالا ہو گیا

ہستیٔ موہوم کو سمجھا میں اک نقشِ حباب
صورتِ دریائے بے پایاں ہیولا[۵۲] ہو گیا

ایک ہی حسنِ جہاں آرا نظر آیا مجھے
نظمِ عالم بستۂ ترکیبِ اجزا ہو گیا

ایسا کچھ دیکھا کہ بس ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے
طائرِ ادراک میرا بالِ عنقا ہو گیا

ذہنِ عالی نے دکھائے کیسے کیسے سبز باغ
دلپہ رازِ گلشنِ ایجاد افشا ہو گیا

---

۵۱ مسمریزم۔ ۵۲ ہیولائے عالم۔ ۱۲

کلکِ قدرت کی نظر آنے لگیں صنّاعیاں
نخلِ خرما بڑھتے بڑھتے نقشِ طغرا ہو گیا

طبعِ معنی خیز میں پیدا ہوئی بالیدگی
تازہ مضمون خوشۂ زرکا ثریّا ہو گیا

کنزِ مخفی تھا مرے سینے میں نورِ معرفت
مطلعِ انوار یہ قلبِ مصفّا ہو گیا

تھا ازل سے دلنشیں و علم اسبابِ یقین
تخمِ روز ابلیس دیکھا تو طوبیٰ ہو گیا

ایک تصویرِ خیالی تھی مرے پیشِ نظر
اور میں ہر نقطہ محوِ حسنِ اعضا ہو گیا

حیرت افزا تھا تماشائے جمالِ دلربا
صورتِ آئینہ گویا مجکو سکتا ہو گیا

وہ بتِ بیداد گر نازک کمر نازک جبیں
دوش پر زلفِ رسا دل جیسے شیدا ہو گیا

حسنِ عارض دلستاں رشکِ بہارِ بوستاں
قہقہے یا سرو رواں یا حشر برپا ہو گیا

دونو آنکھیں سحر فن ہر اک ادا میں بانکپن
وہ معمّائے دہن تقدیر سے وا ہو گیا

ہنسکے فرمایا کہ اے سرمست جامِ بیخودی
خوابِ غفلت میں ہے کیوں آخر تجھی کیا ہو گیا

ہر طرف ہے گھر مرے بازارِ یونیورسٹی
علم کا ہر سر میں پیدا آج سودا ہو گیا

اک خمارِ مستیِ دوشینہ سر سے دور کر
پیشِ پا افتادہ جب یہ کارفرما ہو گیا

ہند میں بنجائے اسلامی اگر دارالعلوم
پھر یہ سمجھو وصل کا میرے سہارا ہو گیا

علم کی دیوی ہو نمیں اک پیکرِ علوی ہو نمیں
میرے سائے سے ہر اباغِ تمنّا ہو گیا

گلشنِ اسلام میں آتی ہے اب فصلِ بہار
لو مبارک عیش کا ساماں مہیّا ہو گیا

بلبلوں نے باغ میں ڈالی ہے طرحِ آشیاں
نالہ ہائے زار سے اک شور برپا ہو گیا

یادگارِ اوجِ قومی پر عیاں ہونیکو ہے
صفحۂ دنیا پہ جیسے بیتِ حمرا ہو گیا

چھوڑ دو پابندیِ تقلیدِ شیخ و برہمن
جب مرا یہ آستاں رشکِ کلیسا ہو گیا

سنکے باتیں اس بتِ کافر کی میں بھی اے سفیر
کشتۂ اندازِ اعجازِ مسیحا ہو گیا

سفیر

روس میں اسلام

اب سے کئی سو برس پہلے مشرقی روس میں فنی اور ترک آباد تھے اِن قوموں کے مختلف قبیلوں کا مذہب بت پرستی تھا، جب ملت اسلام عالم کون و مکاں میں جلوہ افگن ہوا۔ تو اسکا پرتو اس سرزمین پر بھی پڑا۔ اور طالبانِ حق ظلمت کے بحرِ ذخار سے نکلکر صراطِ مستقیم پر آنے لگے، تیرھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کی تعداد غیر مسلم و بُت پرست اقوام کے جمِ غفیر میں اتنی تھی جیسے شبِ تار میں چند تارے کہ تاتاری وسط ایشیا سے طوفان کی طرح اُٹھے، اور اصلی باشندوں کو مارتے ہٹاتے ملک کو زیر نگین کرتے بلدۂ کزان میں آکے ٹھیرے، تھوڑے زمانہ بعد شمال و غرب کے مزید اضلاع کو تسخیر کیا، کزان کو مفتوحہ ملک کا دار الامارت بنایا اور اس پر ایک خان یا گورنر مامور کیا۔ شروع شروع میں تاتاری خود بت پرست تھے، لیکن رفتہ رفتہ اسلام کے دائرہ میں آگئے۔ اِن کے ورود پر نصف صدی بھی مشکل سے گذرنے پائی تھی کہ اس حصہ روس میں اسلام کا بول بالا ہوگیا۔ دو صدی تک تاتاریوں نے ملک کو انگوٹھی میں نگینہ کیطرح جڑے رکھا۔ یک بیک باد مخالف چلی، زمانہ نے کروٹ بدلی، اور ہر کمالے را زوالے کے خدائی قانون نے ملک کو تہ و بالا کر دیا۔ تاتاریوں کا ستارۂ اقبال نکبت و زوال میں آیا۔ اُن کی تلوار آبدار میں وہ جوہر نہ رہے چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں مغربی روس کی عیسائی طاقتیں

مملکت کزان کو اپنے ملک میں ختم کر لیا۔ ہلال کی بجائے صلیب پھر یرو پنر لہرانے لگی۔

کزان جو اسلامی علم و عمل کا مرکز تھا، اب عیسوی قسیسوں کا صدر مقام قرار پایا، اور روسی چرچ کے مشنری انجیل کی تعلیم و تلقین میں مصروف ہوئے۔ لاٹ پادری گرئی اور دیگر پرجوش بطریق بشپ کی متحدہ کوششوں سے ابتدا میں تھوڑے سے بت پرست عیسوی گلہ میں داخل ہو گئے۔ ان کو "اسٹارہ کرشٹ شینی" یعنے قدیم بپتسمہ یافتہ گروہ کا لقب دیا گیا۔ بطریق اعظم گرئی اور ان کے دست راست بشپ وارسنوف کے انتقال کے بعد ثلث ثلثہ کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور اسٹارہ کرشٹ شینی اپنے آبائی مذہب پر آگئے

زاں بعد حامیان توحید فی التثلیث نے انتہا درجہ جد و جہد کی، لیکن ایک بھی بچھڑی ہوئی بھیڑ ان کے دم میں نہ آئی۔ جب روحانی ہتھیار کند پڑ گئے تو گورنمنٹ سے مدد مانگی گئی۔ چنانچہ صیغۂ کلیسا کی ابتدا پر روسی گورنمنٹ نے بپتسمہ پانے والے لوگوں کو مختلف دنیاوی فوائد، مراعات اور انعام کا لالچ دیا۔ بت پرست قیدیوں کو مذہب عیسوی قبول کرنے پر رہا کر دیا، ٹکس اور زمین کا محصول وغیرہ معاف کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرست اقوام کی ایک تعداد کثیر نے نیا مذہب قبول کر لیا۔ مگر یہ لوگ جب پادریوں کی نگرانی سے آزاد ہو گئے تو مقدس ثلث ثلثہ کو ڈیڑھ ہاتھ سے سلام کر کے رسول مقبول کے دین میں آگئے۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں عیسائیوں کی طرف سے ان معاملات کے سد باب کرنے کی سمت جو کوشش ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ مدرسے، جنہیں تعلیم روسی زبان میں ہوتی تھی۔ ملک کے

اصلی باشندوں پر اچھا اثر نہ ڈال سکے۔ بہرحال دولت روس نے کئی بار صحیفہ مقدسہ کو قبائل کی مقامی بولیوں میں ترجمے کرا کے شائع کیا۔ مگر یہ ترجمے ناقص تھے اور لوگوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ قبیلوں کی مختلف زبانیں جاننے والے پادری نہ تھے، ان کی زبان میں کتابیں نہ تھیں اور نہ باقاعدہ مدارس تھے، اس لیے عرصہ مذکورہ بالا میں ہزارہا بپتسمہ یافتہ تاتار، شواشیر اور دوسری قومیں مسلمان ہوگئیں۔

اقوام بت پرست اسوقت تک اسلام کی بنیادیں نہایت مستحکم ہو چکی ہیں، گو اصنام اسلام کی اشاعت میں بہت کچھ سینہ سپر رہیں۔ لیکن امتداد زمانہ میں انکے شبہات زائل ہوگئے، خیالات میں انقلاب ہوگیا، اور اسلام کے فضائل دلوں پر اچھی طرح چھا گئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں بہت سے جدید بپتسمہ یافتہ یا ناؤو کرشٹ شینی" نہایت راسخ العقیدت مسلمان ہوگئے تھے اور قدیم بپتسمہ یافتہ تاتاریوں کے اصول مذہبی اسلام کی کسوٹی سے رگڑ کھا کر کھوٹے کھرے ثابت ہو چکے تھے چنانچہ امید تھی کہ کچھ زمانہ بعد تمام بپتسمہ یافتہ و دیگر اصنام پرست قومیں مسلمان ہو جاتیں اگر پروفیسر اینکی مشہور مستشرق روحانی جنگ کا بیڑا نہ اٹھاتا اور گورنمنٹ مذہبی آزادی پر تیغا نہ لگاتی یہ شخص کلیسائی اکاڈمی اور بیت العلوم کزان کا پروفیسر تھا۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی اور دیگر مشرقی زبانوں میں کامل مہارت رکھتا تھا اور فلاڈیلفیا (امریکہ) کی اکاڈمی آف سائنس کا بھی ممبر تھا۔

۱۸۵۷ء میں پروفیسر موصوف نے کتب مقدسہ کے بپتسمہ یافتہ تاتاری اقوام کی زبانوں میں ترجمے شروع کیے۔ مگر تاتاریوں کی علمی زبان سید السنہ (عربی) کی فصیح تراشوں اور بلیغ مصطلحات سے مرصع تھی۔ صحرانورد قومیں انہیں

خاک ہی نہیں سمجھ سکتی تھیں، اسلیے اس نے اپنا ترجمہ ان لوگوں کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں جیسے کیسے کیا۔ اس شخص میں تعصب مذہبی جوش کی طرح بھرا ہوا تھا۔ اور نہ صرف اسلام سے بلکہ اسکی ہر چیز سے انتہا درجہ بغض رکھتا تھا۔ اس نے عربی کے غلط العام لفظوں کا بھی جہانتک بن پڑا قلع قمع کیا اور اسپر مستزاد، تاتاریوں کا رسم الخط عربی طرز پر تھا اسکو بھی اڑا دیا۔ اور اسکی بجائے سلیویا روسی حروف تہجی کو رائج کیا۔ اسکی کا دلی مقصد یہ تھا کہ وحشی اقوام میں سے وہ تمام باتیں جن میں مسلمانی کی ہلکی سی جھلک یا عربی کی ذرا سی چاشنی نظر آئے، مٹا دے، اسکا سانتہ دینے کے لیے ہزارہا عیسائی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ عیسائیوں کی اس باقاعدہ اور دولتمند جماعت نے انکی کی سرکردگی میں خانہ بدوش اقوام کی مختلف بولیوں میں انجیل تبلیغ کی اس کے بعد کلیسائی اصول کے مطابق گاؤں در گاؤں مدرسے کھولے؛ بپتسمہ یافتہ گروہ کے متعدد افراد کو بخشیں قرار تنخواہوں پر مقرر کرکے دیسی اقوام میں بھیجا۔ روسی گورنمنٹ نے جو مسلمانوں کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کو دیکھکر چونکی ہوگئی تھی، اس تحریک کا صدق دل سے خیر مقدم کیا، اور انکی کی دامے درمے ہر طرح مدد کی۔ چنانچہ اس شخص نے گورنمنٹ کی اعانت اور محب عیسویت کی مالی و عملی دستگیری کی بدولت، ۵۰ سال کی لگاتار کوششوں اور جانبازیوں سے، پادریوں کے شمار کے مطابق، اسّی ہزار وحشی و بت پرست آدمیوں کو صلیب کی پناہ میں لیا۔ ۱۸۹۱ء میں انکی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کے رفقا نے عیسائی بنانے کا کام بڑی سرگرمی سے جاری رکھا اور اسے خوب ترقی دی۔ انکی نے اپنی زندگی میں ایک ترجمہ کرنے والی کمیٹی بھی قایم کی تھی جسنے مذہبی کتابوں کا ترجمہ شائع کرنے کے علاوہ درسی کتابیں، قصے کہانیاں کتب سیر و تواریخ، طبی و زرعی، اور اصناف علوم کی مختلف کتابیں انطباع

کیس جنکی تعداد سنہ ۱۹۱۱ء تک ۱۹-۲۰ مقامی زبانوں ۹۰۰ کے قریب پہنچ چکی ہے
النسکی نے واقعی میں توسیع و اشاعت مذہب میں بہت بڑا کام کیا۔ مسلمان تو
توحید فی التثلیث" کے "برتر از ادراک و فہم" گورکھ دھندے میں کب مبتلا ہونے والے
تھے۔ لیکن قسیسوں کے اس گروہ نے اصنام پرستوں کو تثلث ثلثہ کی پرستش کی
لایحل فلاسفی کے گرداب میں ایسا ڈالا کہ ہزارہا بلکہ ایک لاکھ سے اوپر آدمی اب
اسمیں غرقاب ہیں۔ بہرکیف اسلام کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے اور اس کی
کشش مقناطیسی تھوڑی بہت عیسوی بیڑیوں کو راہ پر لگاتی تھی۔ مگر سنہ ۱۹۰۵ء
تک اسے وہ بات نصیب نہیں ہی تھی کہ "ویسلز آف دی لارڈ" کا گلہ بڈھی
چرواہے کی رسی توڑ کر اسلام کے قلعہ ماموں و مصونیں میں آجاتا تھا۔ کلیسا
کی نگہبانی کے علاوہ گورنمنٹ روس نے تبدیل مذہب یا مسلمان ہونے کے
متعلق نہایت جابرانہ قانون منضبط کر دیے تھے اور مذہبی آزادی جو دنیا
کے ہر ایک مہذب ملک میں باشندوں کو حاصل ہے، یہاں نام کو بھی نہ ہونے
کے باعث لوگ علی الاعلان مسلمان نہیں ہو سکتے تھے بلکہ در پردہ اس کے
روحانی فیض عام سے مستفید ہو رہے تھے۔ چنانچہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء کی
مذہبی آزادی کا فرمان اجرا ہوتے ہی وہ تمام عیسائی جو پچھلی نصف
صدی میں دین اسلام کی برکات سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔
عیسویت کی جبری جھول اتار کر آغوش اسلام میں آگئے۔ انکی تعداد عیسائی
لوگ چالیس ہزار بتاتے ہیں۔ اور سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک پانچ برس
سے دس ہزار مزید عیسائیوں کے قبول اسلام کا پادری لوگ
اندازہ کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سید شرکت دہلوی

پیام اجل

نہیں معلوم ہمکو کب کہ پیغام اجل آئے
مگر اک وقت ایسا ہو۔ کہ آکر ہم کو گھبرائے

عزیزوں میں ہو بیٹھے۔ یا کہ ہوں بیگانوں کے اندر
کہاں پر جان لینے کو فرشتہ سر پہ آجائے

نہ دے فرصت کہ ملنے کو کسی کے ہم کریں جا رہ
نہ دے مہلت کہ ہمکو دیکھنے کو کوئی رہ پائے

زن و فرزند رہ جاویں مگر مل مل کے اپنے ہاتھ
وہ رونے کا سماں خالق نہ دشمن کو بھی دکھلائے

جو ہوں پس ماندگاں کی الجھنیں بھی حل کے قابل
چلے جاتے ہیں پھر بھی جانوالے کس طرح ہائے

ارادہ کر سکا کرلینا کہ تھوڑا وقت ہے باقی
یہ بہتر ہے اگر کچھ زاد راہ بھی جمع ہو جائے

کروں نیکی۔ کہ اب ہے وقت تکمیل گیا تھوڑا
غنیمت جان لو یہ دم کہ آئے یا نہیں آئے

اسے سمجھو کہ آپونچی نہ غافل اس سے ہو جانا
کھڑی ہے موت سر پر جو کہ ہستی کو مٹا جائے

نہیں معلوم یاں آبرق کیا لینے کو آئے تھے
کہ حسن فخر یاں گور کی مٹی جہاں کھائے

شہد کی مکھی

محنت سے اپنے ہوتی مشہور ہے یہ مکھی
دولت بڑی کما کر مسرور ہے یہ مکھی

اور کاہلی سے دیکھو معذور ہے یہ مکھی
ہمت بلند کرنے مجبور ہے یہ مکھی

کتنی بھی مکھیاں ہیں صنعت میں اس سے اعلیٰ
لیکن نظر میں سب کے منظور ہے یہ مکھی

اک بوند رس کی خاطر لاکھوں ہی پھول ڈھونڈے
کوشش سے پھر نہ گاہے مشکور ہے یہ مکھی

حیراں ہیں ہندسے اس کی عمارتوں سے
ہر لب پہ ذکر اس کا۔ مذکور ہے یہ مکھی

محنت کریں جو انساں دولت سے گھر بھریں وہ
نکتوں سے حکمتوں کے بھرپور ہے یہ مکھی

ہیں انتظام اس کے اک سلطنت سے بڑھکر
سب نظم و نسق میں ہی منصور ہے یہ مکھی

کچھ رائیاں ہیں انمیں ہر ہر محال پر اب
بیکار جو کہ بیٹھے مقہور ہے یہ مکھی

نسبت ہے نام اس کا اک برق سے بڑھ گیا ہی
خدمت پہ اپنے ہر وقت مامور ہے یہ مکھی

پیٹ کی منگنی

اگر سلمہ نے زاہدہ کے ٹھیکرے میں روپیہ ڈالے تو کیا نئی بات ہوئی اور کونسا گناہ کیا۔ ظاہر تھا کہ سلیم کے لیے زاہدہ سے اچھی دلھن کہاں ملے گی حقیقی چچا کی لڑکی۔ ایک دادی کے پوتا پوتی عمر میں بھی صرف دس مہینہ کا فرق ایک سال کی پیدائش، وفاتوں میں ہوئے میاں سلیم اور خالی میں ہوئیں بی زاہدہ اور پھر اللہ رکھے دونوں اپنی ماں کے پہلوٹھی کے بچے اور ماں باپ بھی کیسے سلمہ زاہدہ کی خالہ اور شریف سلیم کے چچا۔ اگر نہالچوں میں رسم ادا ہوئی تو کیا زیادتی ہوئی ابھی زاہدہ پیٹ ہی میں تھی کہ بات چیت ہو چکی تھی۔ اور سلمہ بیچاری پر ہی کیا منحصر ہے؟ خود فریقہ ہنسی خوشی سنتی اور جب بات نکلتی کبھی ہاں کے سوا نہیں نہ کہتی۔ خالی کی ساتویں جمعہ کے دن جب بی زاہدہ اپنی قسمت کا لکھا پورا کرنے اس دنیا میں تشریف لائی ہیں تب تو گویا بات پکی ہی ہو گئی۔ ادھر دائی کے منہ سے نکلا۔ لڑکی ہوئی، اُدھر سلمہ نے پیغام دیا اور ٹھیکرے میں روپیہ ڈال کر گویا مُہر کر دی۔ بھرا پُرا گھر کچھ نہ ہونگی کچھ نہ ہونگی تو چالیس پچاس ہویاں تو ہونگی اور پھر کیسی سب ایک کف ایک خاندان کی۔ سب ہی نے سُنا اور سب ہی نے پسند کیا۔

زمانہ کے بھی عجیب رنگ ہیں اسکی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ ایک امیر ہے تو ایک غریب ایک خوش ہے تو ایک رنجیدہ۔ ایک ہنستا ہے تو ایک روتا۔ ایک کھاتا پیتا ہے تو دوسرا ننگا بھوکا اگر اکرم اور شریف بھائی بھائی تھے تو اس

یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دونوں قسمت بھی ایک سی لکھوا کر لائے تھے۔ زمانہ گذرتا گیا اور دونوں بھائیوں کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا گیا۔ ایک کے دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے تو دوسرے کے دروازہ میں کوڑی بھی نہ تھے مگر اکرم امیر تھے تو اپنے گھر کے اور شریف بیچارہ غریب تھا تو اپنے لیے۔ خدا کو منہ دکھانا ہے ستو میں کہیں گے تو اور ہزار میں کہیں گے تو کہیں گے بچی ایک دو نہیں اکٹھے پانچ بچوں کا ساتھ۔ قحط کا زمانہ اور کل ۵۰ روپیہ مہینے کی آمدنی!!! پانچ بچہ دو میاں بیوی ایک ساس اوپر سے بھنگی بہشتی سب ہی کا خرچ تھا۔ مگر واہ ری رفیقہ سارے جہاز کو چلا رہی تھی مگر کیا مجال کوئی کانوں کان بھی خبر ہو جائے۔ بہن نے مشروع اور مخواب پہنے تو اسنے سوسی پہنی۔ وہاں روز نئے نئے تہان پھٹے تو اس نے پیوند لگا کر گذر کی کیسنے گیہوں کھائے تو اس نے چنے کھا کر ہی خدا کا شکر ادا کیا۔ وہاں ایک چھوڑ دس دس دائی کھلائی۔ نوکرنیاں۔ مامائیں تھیں۔ تو اس نے خود بچوں کو بھی کھلایا کھانا بھی پکایا اور سی کر بھی پہنایا۔ مگر کسی دن بہن کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ ہاتھ پھیلانا تو بڑی بات ہے اس نے ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی کیا مجال جو اسکا کوئی بچہ کھانے کے وقت چچا یا خالہ کے ہاں جا نکلے۔ ہائے مفلسی میں آٹا گیلا۔ ساس پڑ گئیں بیمار۔ چھوٹے بچے کی نکلی چیچک خود کو شروع ہوا نواں مہینہ اور ہر لڑکے کا آیا امتحان فیس بھی چاہیے کتابیں بھی باہر امتحان دینے جائے گا۔ ڈھنگ سلیقہ کے چار کپڑے بھی ہوں۔ میاں بیچارہ گم سم۔ فکروں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ نہ اٹھائے بنتی ہے نہ دھرے بنتی ہے کیا کرے کیا نہ کرے۔ مگر اوس بیوی بندی کو دیکھیے

کہ اس حالت میں وہ میاں کی بھی دلدہی کرتی۔ ساس کی بھی خدمت کرتی بچونکو بھی پالتی اور گھر کا سارا کام سینا پرونا۔ کھانا پینا بھی کرتی سوائے اس کے دوسرا کون کرنے والا بیٹھا تھا۔ مگر ہم پھر یہی کہیں گے کہ اس اللہ کی بندی کے منہ پر سوائے شکر کے کبھی شکایت نہ آئی ؂

سچ ہے وقت پڑے پر کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ بھائی بھائی کو اور بہن بہن کو بھول جاتے ہیں سلمہ اور رفیقہ ایک ماں کے پیٹ کی دو بہنیں اور اکرم اور شریف ایک باپ کے دو بیٹے مگر زمانے نے انہیں اتنا دور کر دیا اتنا غیر کر دیا کہ گویا کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ وہی سلمہ جو کبھی رفیقہ پر جی جان چھڑکتی تھی۔ غریب بہن کو ایسی بھولی کہ بھولکر بھی یاد نہ کیا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اگر وہ پوچھتے بھی اور مدد کو طیار بھی ہوتے تو رفیقہ ایسی نہ تھی جو اوس کی چوٹی کوڑی کی بھی روادار ہوتی۔ وہ کہتی تھی اور کہلے خسرانہ کہتی تھی کہ فاقہ کروں گی بھوکی مروں گی مگر اپنے عزیزوں کی دست نگر نہ ہوں گی۔ اور تو اور وہی سلمہ جو زاہدہ کو مانگ چکی تھی وہی سلمہ جو سلیم کو رفیقہ کی خدمت میں بھیجتی تھی جب اپنا وقت آیا اور غریب رفیقہ نے نثار کے لیے ریحانہ کو مانگا تو صاف انکار کر گئی۔ بہن بھائی کا خاک بھی تو خیال نہ کیا۔ مانا کہ رفیقہ غریب تھی مفلس تھی۔ مگر تھی تو اسی کی بہن خون تو ایک تھا۔ ایک نانی کے نواسی نواسہ اور ایک دادی کے پوتی پوتا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ غریب نثار کو ریحانہ سی اسیر دلہن نصیب ہو جائے۔

جہاں رفیقہ میں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں چند عیب بھی تھے وہ جاہل تھی منہ پھٹ تھی مرتع اور مصلحت اوس کے یہاں کوئی لفظ

نہ تھے۔ بہن کا انکار کرنا تھا کہ بس آگ ہی تو لگ گئی۔ امیری غریبی کا خیال بالائے طاق رکھ وہ کہری کہری سنائیں کہ سلمہ کا جی ہی جانتا ہوگا کہیں اور ہزاروں میں کہیں سنائیں اور سچ کہیت سنائیں بات کہنے میں آتی ہے آخر وہ کس بات میں کم تھی۔ دونوں بہنوں میں خوب خوب چوٹیں ہوئیں۔ مگر واہ ری رفیقہ نا امید ہو کر بھی اپنی بات پر جمی رہی اور زاہدہ کا نام بھولکر منہ سے نہ نکالا۔ بھڑکانے والوں نے بھڑکایا اور لگانے والوں نے لگائیں مگر اس نے سب کی سنی ان سنی کر دی۔ اگر کوئی کہے کہ امیر گھر تھا۔ زاہدہ کو سلیم سا امیر دولہا کہاں نصیب ہوتا۔ اس لیے خاموش ہو رہی ہوگی۔ مگر نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ سلمہ زاہدہ کی خالہ نہیں ساس ہوگی اور آپس کی لڑائی نے زاہدہ بیچاری کے راستہ میں کانٹے بچھا دیے ہیں پر بھلا جانتے بوجھتے کوئی اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اس طرح چولہے میں جھونکدیتا ہے کہ وہی ایسا کرتی۔ مگر نہیں۔ اسے خیال تھا تو اپنی ہاتھ کا اور قائم تھی تو اپنے وعدہ پر۔ نہ ایک غریب مفلس کو بیاہ دیتی اور سلیم کا نام ہی نہ لیتی۔ اپنی اپنی قسمت کا سب کھاتے ہیں زاہدہ کی روزی کچھ سلیم ہی کے ہاتھ میں نہ تھی مگر وہ بات کی پکی یاد کرتی تھی اس وقت کو جب اوس نے حامی بھری۔ اور روتی تھی اوس بدنصیب کی قسمت کو جو ایسی ساس کی بہو بنکر جائے گی

صبح سے شام ہوئی اور شام سے صبح۔ جاڑوں سے گرمی۔ گرمی سے برسات اور برسات سے پھر جاڑے اور اس طرح دنوں سے مہینے اور مہینوں سے سال گذرتے گئے۔ پیدا ہونے والے پیدا ہوئے اور مرنے والے

مرے مگر نہ آئی موت تو اون بدنصیبوں کو جنہیں ابھی دنیا میں بہت کچھ مصیبتیں جھیلنی تھیں جنھیں اپنے عزیزوں بھائی بندوں اور تو اور ماں باپ کے ہوتے ہوئے ایک نگاہ محبت کو ترس ترس کر کڑھ کڑھ کر مرنا تھا۔ جو گھڑی جو ساعت گذرتی وہ زاہدہ کمبخت کو اوس راستہ کے قریب کرتی جاتی جس میں اوسے غیروں کے نہیں، خود اپنے ماں باپ کے بوئے ہوئے کانٹوں پر سے گذرنا تھا۔ اب وہ کوئی بچہ نہ تھی جو کچھ سمجھتی نہ ہو سب کچھ سمجھتی تھی سب کچھ جانتی تھی مگر کیا کرتی؟ دل تو کہہ رہا تھا مگر کیا زبان بھی کہہ سکتی تھی کہ میری اچھی اماں اپنے رسم و رواج اپنے قول و قرار اپنی لڑائی بھڑائی کے دیوتاؤں پر ایک غریب کی کم نصیب لڑکی بدنصیب زاہدہ کی قربانی مت چڑھاؤ۔ جب آپس کی نزاع نے میری قسمت کے لکھے کو ہی بدل دیا تو پھر امارت کو کیا میں آگ لگاؤں گی للہ اوس منحوس گھڑی سے مجھے بچا لو جو سر پر بھوت کی طرح چڑھے آتی ہے خدا کے واسطے مرے حال پر رحم کرو تمہیں اپنی مامتا کا واسطہ مجھے خالہ جان کے غصہ اور انتقام کی آگ میں جانتے بوجھتے جھونکو اگر تم کسی غریب مفلس کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دوگی تو میں خوش میرا خدا خوش مگر للہ امیر سلیم کی دلہن بنا کر مجھ نصیبوں جلی کے جنم میں کیڑے مت ڈلواؤ۔ کاش وہ یا کوئی ہندوستان کی لڑکی اپنی زبان سے بھی ایسا نکال سکتی ؛

اے ہندوستان مقدس ہندوستان کی شریف زادیوں! عصمت کی دیویوں!! اسعاد تمند لڑکیوں!!! ایسی خاتونیں جو اپنے والدین کی بیجا خواہشوں کی قربانی کے واسطے پیدا کی گئیں۔ اور جو سعادتمندی کے

زیور سے ایسی آراستہ تھیں کہ اپنے ماں باپ کی بیجا خواہشوں اور ناروا حقوق کے پر خار راستہ پر ننگے پیروں تھیں بلکہ سر جھکائے اپنی آنکھوں سے گذر گئیں زمانہ تمھیں کبھی بھولے گا۔ کیا ہوا اگر اپنوں نے تمھاری طرف سے خون سفید کر لیے غیر تمھاری بیکسی کی موت پر روتے ہیں اور روئیں گے آسمان خون کے آنسو بہاتا ہے اور بھائیگا۔ زمین کو زلزلہ آتا ہے اور آئیگا اور آخر کو اس آخر الحاکمین کی عدالت میں جو سب پر غالب ہے۔ تمھاری دادخواہی کریں گے ہم جانتے ہیں کہ تمھاری معاذ تمھیں اس عدالت میں بھی چارہ جوئی کرنے سے باز رکھے گی مگر جان لو کہ وہ عالم الغیب تمھارے دل سے واقف ہے اور اس کا انصاف کبھی روادار نہ ہوگا کہ اس کی بے زبان مخلوق کمزور مخلوق پر ظالم یہ کچھ ستم توڑیں اور عدالت کی جانب سے ہر گز نہیں ہم تم نہیں سب دیکھیں گے۔ آسمان و زمین دیکھیں گے اور دہلیں گے۔ جان دار و بے جان دیکھیں گے اور کانپیں گے کہ وہ عادل حقیقی جس کی ایک صفت قہر بھی ہے کس طرح تمھاری دادرسی کرتا ہے اللھم حفظنا۔

باقی وارد

ضیاء عباس بدایونی

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تحفہ کی توسیع اشاعت میں حصہ لیا

صاحبزادہ وحید احمد صاحب فاروقی۔ ایم اے لیکچرر احمد صاحب ہائی مسٹر عبدالحکیم صاحب ایڈیٹر حسن عسکری صاحب مرزا پور۔ مولوی عبدالرزاق صاحب پیش امام شیخ غلام حیدر صاحب ہیڈ ماسٹر منشی کمال احمد صاحب بھوپال۔ نواب سید ابوالقاسم صاحب لکھنؤ۔ ڈاکٹر محمد یٰسین خانصاحب شملہ بنت نذیر النساء صاحبہ۔ قاری سرفراز حسین صاحب میرٹھ۔ شفاعت حسین صاحب بہار پنوری مولوی محمد حسین صاحب ٹونک۔ منشی مظفر حال صاحب۔

اُمید

دربایانہ ہے اُمید اشارا تیرا — کام آتا ہے ہر ایک وقت سہارا تیرا
سچ ہے یہ جانب دنیا بھی ہمیں تو لائی — باغ ہستی کی ہوا تیری بدولت کھائی
ایسا الایچ تھا کہ ہم کنج لحد سے چلکر — آئے اس دہر میں تفریح کو بے زاد سفر
اور جنت کے وہ حالات سنائے تونے — شوق فردوس کے اسدرجہ ولائے تونے
قصد کرتے ہیں کہ اک روز وہاں بھی جائیں — ہے ارادہ کہ وہ گلشن بھی ذرا دیکھ آئیں
وصل کا شوق کچھ اور حسن پرستی کا مزا — یک بیک عالم عنصر میں اٹھا کر لایا
اب بہل سی ہمیں حوروں کی پیاری صورت — کھینچ لے جائیگی اک روز میان جنت
تو ہی افسردہ دلوں کی ہے ہنسانے والی — عین بایوسیوں میں کام ہے آنیوالی

دشت و دشت نظر لٹو کر دکھاتی ہے جہاں
تو ہی اک حامی ہے غربت زدہ مفلس کی ہاں

کوہ وہ کوہ جہاں جاکے بھٹکتا ہے خیال — رہبری کرتی ہے تو گمشدگاں کی فی الحال
تیرے وہ عزم ہیں آتا نہیں کچھ جنمیں خلل — تیری امداد سے طے ہوتے ہیں سب دشت و جبل
دامن ہم جہاں الجھے وہ خارستاں ہے — ساتھ اس دشت میں تو صورت جسم و جاں ہے
جینا مرنا ہے تو اُمید سے ہے اتنی — وصل اک عہدہ فراموش سے حاصل ہو کبھی
سچی معشوقہ ہر اک دلکی ہے تو اے اُمید — تیرے ہی نام کے سب مردے ہیں گرویدہ
آرزوؤں سے کیا کار مسیحا تونے — حسرت مردہ کو سینے میں جلایا تونے
ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کا سہارا تو ہے — اونچی چوٹی پہ چڑھانے کا اک آلا تو ہے
بے تری عیش میں بھی ہمکو ہے مشکل جینا — شام غربت میں ترے دم سے ہی کہنا جینا

بستر مرگ پہ بے حس جو پڑے ہیں مطلق تیرے ہی نام کی چہرے پہ ہے اُن کے رونق
ہجر کی شب کی گھٹا ٹوپ بھیانک صورت دم قدم سے تری ہو جاتی ہے فوراً چمپت

تو جو اک بیوہ کو تسکین دیا کرتی ہے
ننھے سے بچے کو وہ پال لیا کرتی ہے

ایسے بڈھے ہیں کہ وارث نہیں جنکا کوئی تو ہی ان بیکسوں کی کرتی ہے کچھ دلجوئی
کامیابی کا ستارا ہے بہت دور مگر چشم امید سے دیکھو تو ہے نزدیک نظر
ساری دنیا سے ترقی کی عمارت ہے بلند کام دیتی ہے وہاں صرف تری ایک کمند
تو ہی تنہائی کی مونس ہے الم میں ہمدم تو ہی اخلاص میں ہے دوست مصیبت میں شفیق

کونسا کام تھا جسمیں نہ مدد کی تو نے
جو بلا آئی زمانے میں وہ روکی تو نے۔

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

پچھلے پرچوں میں ایک مضمون ضمیمہ کے عنوان سے ناظرین تمدن کے ملاحظہ سے گذر چکا ہے جسکا منشا رضامندی کی شادی کے خطرناک نتائج پر بحث کرنا تھا۔ آج قیصر و جرمنی کی تصویر بھی اسی مضمون کے ضمن میں ہے۔

جسوقت قیصر ولیم نے شادی کا ارادہ ظاہر کیا ہے تو ہر طرف سے اس شادی کی مخالفت ہوئی مگر قیصر نے اپنے جد امجد سے صاف کہدیا کہ شادی کے معاملہ میں بزرگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بالغ نوجوان لڑکوں کے گلے میں نکاح کی رسی ڈال دیں

شادی ہوئی اور دھوم دھام سے ہوئی مگر دیکھنا یہ ہے کہ جس شادی کی ایک دنیا میں مخالفت کا زور شور تھا اسکی غایت اصلی کیسی اچھی طرح پوری ہوئی کہ اب قیصر ولیم کا بیان ہے

"میری بڑی آرزو یہ ہے کہ ملک اور قوم میں ایسی بیبیاں پیدا ہوں جو قیصرہ کی تقلید کریں۔
جس گھر میں میاں بیوی بچے سب خوش ہوں خدا کی برکت اس گھر میں ضرور نازل ہوتی ہے۔

مگر کیا دیکھا؟

دلی دیکھی، دلی والے دیکھے، گورے دیکھے، کالے دیکھے، بستی بستی کی رونق، بستی والوں کے کارنمایاں، جو کچھ دیکھا، دل کھول کر دیکھا، اور پیٹ بھر کر دیکھا، مگر کیا دیکھا؟ ایک قصبہ دیکھا، جس کے مرغزار، ایک گھر دیکھا جس کے در و دیوار، عبرت کی داستان سنا کر، آنکھ آنکھ آنسو رو لا رہے تھے۔

چودھویں تاریخ کا آسمان سر پر تھا، رات آدھی سے قریب گزر چکی تھی، اور دریائے جمنا قلعہ شاہجہانی کو کنارہ سے لہریں دے رہا تھا، شہر کا چپہ چپہ، چودھویں کی دلہن بنا ہوا تھا، رعیت شاد، دل آباد، بڈھے شاداں، بچے فرحاں، غرض ہر پیر و جوان، تاج برطانیہ کی ترقی کا طلب گار تھا،

سر بفلک عمارتیں دیکھیں، زمیں دوز زیارتیں دیکھیں، دیسی دیکھے، بدیسی دیکھے، باجے دیکھے، گاجے دیکھے، مگر کیا دیکھا؟ وہ مکان دیکھا، جس کے مکین؛ وہ آسمان دیکھا، جس کی زمین، اپنی کہانی سے سننے والوں کے دل ہلا رہی تھی۔

تقاضائے شوق، اور مدتوں کی آرزو، گلی گلی اور کوچے کوچے لیگئی، مرحوم ذوق کے مکان کا پتہ اور نشان تک نہ تھا، ہر چند دل بیتاب پا، مگر اس زمین کی خاک بھی میسر نہ آئی جو کبھی ملک الشعرا کا مسکن تھی۔ البتہ ایک جنگل تھا ہو کا میدان جہاں ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی۔

مگر کیا دیکھا؟

دلی دیکھی، دلی والے دیکھے، گورے دیکھے، کالے دیکھے، بستی بستی کی رونق، بستی والوں کے کارنمایاں، جو کچھ دیکھا، دل کھولکر دیکھا، اور اپیٹ بھر کر دیکھا، مگر کیا دیکھا؟ ایک قصبہ دیکھا، جس کے مرغزار، ایک گھر دیکھا جس کے در و دیوار، عبرت کی داستان سنا کر، آٹھ آٹھ آنسو رو لا رہے تھے؟

چودھویں تاریخ کا آسمان سر پر تھا، رات آدھی کے قریب گذر چکی تھی، اور دریائے جمنا قلعہ شاہجہانی کو کنارہ دیے لہریں لے رہا تھا، شہر کا چپہ چپہ، چوتھی کی دلہن بنا ہوا تھا، رعیت شاد، دل آباد، بڈھے شاداں، بچے فرحاں، غرض ہر پیر و جوان، تاج برطانیہ کی ترقی کا طلب گار تھا،

سر بفلک عمارتیں دیکھیں، زمین دوز زیارتیں دیکھیں، دیسی دیکھے، بدیسی دیکھے، باجے دیکھے، گاجے دیکھے، مگر کیا دیکھا؟ وہ مکان دیکھا، جس کے مکین؟ وہ آسمان دیکھا، جس کی زمین، اپنی کہانی سے سننے والوں کے دل ہلا رہی تھی۔

تقاضائے شوق، اور مدتوں کی آرزو، گلی گلی اور کوچے کوچے لیگئی، مرحوم ذوق کے مکان کا پتہ اور نشان تک نہ تھا، ہر چند دل بیتاب تڑپا مگر اس زمین کی خاک بھی میسر نہ آئی جو کبھی ملک الشعرا کا مسکن تھی۔ اب تہ ایک جنگل تھا ہو کا میدان جہاں ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

تاہم وہ گلیاں آنکھ کے روبرو تھیں جن کے مقابلہ میں دکن کا زر و جواہر ہیچ تھا، قدم جن تہہ و پر پڑ رہے تھے انکا اسوقت زبان حال سے یہ کہنا ہمیشہ یاد رہے گا،

"کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر"

شہر کی چہل پہل، اور آبادی کی رونق سے فراغت پاکر، ان لوگوں کا دھیان آیا جو سر زمین جہاں آباد پر علوم کے ایسے فانوس روشن کر گئے جو مدتوں جھلملاتے رہیں گے، خاکدان کا ہر ذرہ ان کے مقدس نام آنکھوں سے لگا رہا تھا اور گو ان کے فانی اجسام نیست ہو چکے تھے، مگر ان کی زندگیاں مٹ کر بھی آب و تاب سے چمک رہی تھیں +

شہر سے باہر نکل کر دیکھا تو ایک سناٹا چھایا ہوا تھا بڑے بڑے تاجدار خاک کی بستی میں پڑے سوتے تھے اور جن کے سینوں نے تخیل کے جواہرات سے خلق اللہ کو مالا مال کیا آج انپر تہہ و نکا ڈھیر تھا، جہاں آباد اُن کھنڈرو پر ناز کر رہا تھا، جن میں وہ لاجواب ہیرے اور موتی دفن تھے، جن کی آب و تاب، آج بھی قمر چہار دہم کو شرمندہ کر رہی تھی رات بھیگ رہی تھی، اور جنگل سنسان تھا، مگر اب آنکھ کے سامنے وہ چمنستان تھا جسمیں خوشرنگ پھول۔ ہر چہار طرف کھلے ہوئے تھے۔ عنبر اپنے دامن سے ان مٹنے والوں کے مسکن پر جھاڑو دے رہی تھی اور ماہتاب اپنے ہاتھ سے ان کے چراغ روشن کر رہا تھا،

زندے دیکھے، مردے دیکھے، قبروں کے ڈھیر دیکھے، قسمت کے پھیر دیکھے، مگر کیا دیکھا؟

وہ خاک دیکھی جس میں تاج مغلیہ کے گوہر آبدار دبے ہوئے تھے،
اور وہ مقبرہ دیکھا جس میں ہمایوں جیسا تاجدار موت کا شکار ہوا پڑا تھا،
شاہان مغلیہ کا عظمت و جبروت اور دنیا کی ناپائداری کا نقشہ آنکھ کے
سامنے تھا۔ عجیب موثر سماں تھا، آنکھیں بند ہوگئیں اور پہلو کی قبروں سے
یہ صدا سنائی دی،

تاج مغلیہ، کی بچی کھچی نشانیاں، ابھی چند بیگمیں دلّی میں موجود ہیں،
جن کے ہاتھ کام اور جن کی آنکھیں یاری نہیں دیتیں مگر پیٹ ان سے
دن بھر ٹوپیاں سلواتا ہے اور اس طرح یہ بدنصیب شہزادیاں ٹوپیاں
اور صدریاں سی کر اپنا پیٹ پالتی ہیں،

خدا ہز میجسٹی ملکہ میری کی سلطنت میں وسعت اور عمر میں برکت
دے توقع ہے کہ تشریف آوری کے موقعہ پر اپنی اس وفادار
رعیت کو فراموش نہ کریں گی۔

راشد الخیری

اعلان ۔ قدردان تمدن اور حامی زبان اردو یہ سنکر خوش ہونگے کہ ہمارے
ایک کرم فرما جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تجویز فرماتے ہیں کہ میں پانچ قسم اوّل کے
ان طلبا کے نام دوسری جلد سے آپ کی طرف سے جاری کیے جائیں جو نصف
قیمت سے زیادہ تمدن کا چندہ ادا نہیں کر سکتے۔ تمدن اپنے محترم کے اس
عطیہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے اور ہم نہایت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ
دس مسلمان اور دس ہندو طلبا جو پورا چندہ ادا نہیں کر سکتے اپنی درخواستیں روانہ
کریں اور ان کے نام (عہ) میں رسالہ ایک سال کے واسطے جاری کیا جائیگا۔

ایڈیٹر۔

غزلیں

کوئی مجھسا مستحق رحم و غمخواری نہیں
سو مرض ہیں در بظاہر کوئی بیماری نہیں

ہو گیا شاید کہ صرف سوز و غم سب خون دل
آنسوؤں کا اب وہ دریا آنکھ سے جاری نہیں

ہر قدم پر باغ عالم میں بچھا ہے دام حسن
کون ایسا ہے جسے ذوق گرفتاری نہیں

عشق میں طول مرض سے وہ پریشانی بڑی
میرے غمخوار و نکو اب یار لے غمخواری نہیں

جان دیکر بھی جو ہاتھ آئے تو ارزاں جانیے
سہل ایسی جنس الفت کی خریداری نہیں

ہمدموں کی جھڑکیاں ہم لاکھ کھائیں عشق میں
راز دل کہنا مگر شرط وفاداری نہیں

میری حالت دیکھکر کیوں تمنے ٹھنڈی سانس لی
بیکسوں پر رحم آئین ستمگاری نہیں

مجھسے ضبط درد الفت کی شکایت فضول
اے دل ناداں تجھے احساس خودداری نہیں

اُسکو رحم آئے کہاں یہ نا امیدی میں امید
دل کو خوش کرنا ہے مشغل گریہ زاری نہیں

ہم ہیں جب سے مبتلا ہوئے لیکن ہوئی ہم پر عیاں
دل سے ہم اس سختی کا نام بیقراری نہیں

بند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شے دہر کی
عالم رویا میں فرق خواب بیداری نہیں

مدتوں ہم بھی رہے مجمر میں سوز دل
ڈھونڈھے تو اک ہیں کوئی بیقراری نہیں

ترک دنیا پر ملی یاران شاطر سے نجات
کنج عزلت میں نظر کچھ خوف عیاری نہیں

بدتر ہے شام غم سے کہیں مفلسی کی عید
ہوں جس کے پاس دام و درم ہو اُسی کی عید

اسلام کا ہے حکم کہ ہو عام یہ خوشی
یہ کیا کہ ہو کسی کا محرم کسی کی عید

اقتادگان قوم کی امداد فرض ہے
مل جل کے ہو سبھی کی خوشی ہو سبھی کی عید

وہ عید کیسی جسمیں ہوا حباب سے جدا
ہر چند میٹھی عید ہو لیکن ہے پھیکی عید

یوں کرہی ہے دلمیں جگہ بات بات پر — جیسے ہو میری دوست پرانی کبھی کی عید
یارب تو مجھکو داغ محبت نصیب کر — یارب ہو تیرا غم میری قسمت کی عید
دونوں اسطرح سے جاں تیرے شوق دیدمیں — گویا ہو روز مرگ میری زندگی کی عید

رکھتا ہے یاس تجھ سے شہادت کی آرزو
یہ خستگی کی داد ہے یہ بیکسی کی عید

(المرسل۔ خاکسار حمید یعقوبی اعزازی) (یاس ٹونکی)

پھر آج غیر کو نزدیک یار دیکھتے ہیں — دکھاتا ہے جو ہمیں کردگار دیکھتے ہیں
کہیں چھپاؤ سے چھپتی ہے آنکھ الفت کی — نظر بچا کے ہم اونکو ہزار دیکھتے ہیں
خدا ہی خیر کرے آئے گی بلا کوئی — کہ رحم میں وہ ہمیں بار بار دیکھتے ہیں
کمال جوش پہ ہے اضطراب بالائیں — ہم اپنی دلمیں وہ پنہاں مزار دیکھتے ہیں
مگر آپکا دل ہم سے رہا ہے ہم رم — اس آئینہ میں ہم یہ غبار دیکھتے ہیں
خدا ہی خیر کرے یہ ترچھی نظر نہ ہو — وہ آج دل کو مرے بار بار دیکھتے ہیں
کہاں چھپاؤں دل بیقرار اس کو اونکی نظروں سے — وہ آج دل کو مرے بار بار دیکھتے ہیں
مجال ہے کہ ہما سے ملیں سے دو کو ان کی — حضور بزم ہمیں کیوں بار بار دیکھتے ہیں

یہ کہہ رہا ہے ہر اک بچہ رنا سے تو حمید
کمال آپ کو ہم اب بیقرار دیکھتے ہیں

حضور ملکہ معظم نے اپنی تشریف آوری سے جو فخر سرزمین ہند کو عطا فرمایا دلی کا چپہ چپہ اسکا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ ہمارے شہنشاہ کا خود تشریف لاکر رعیت کو اپنے دیدار سے مسرور کرنا وہ کرم خسروانہ ہے جو صدیوں بعد ہمکو میسر آیا ہے۔ دلی دعا ہے کہ خداوند کریم شہنشاہ و ملکہ معظمہ کا سایہ مدتوں ہمارے سر پر قایم رکھے جن کے عدل و کرم سے تمام رعیت کے دل فرحت مسرور ہے ہیں +

جلد نمبر ۳ — دوم — دسمبر ۱۹۱۱ء

تمدن

مشتمل بر معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مرتبین

ایڈیٹرز۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الرشید الخیری

فہرست مضامین:-

تصور۔	شہنشاہ معظم و خاندان شاہی۔		
شہنشاہ و شہنشاہ بیگم شاہجہان آباد میں۔	ایڈیٹر		۱
نوید مقدم شہنشاہی۔	مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب		۱۳
شاہی میلہ۔	ایک سیلانی		۱۶
قصیدہ در تہنیت خیر مقدم شہنشاہ۔	منشی عبد الحمید صاحب		۱۹
اگلے جشن۔	مولوی محمد حامد صاحب		۲۲
کمٹ دھنباد۔	مولوی احمد حسن صاحب شوکت		۲۶
دلی کے وہ دربار شہنشاہ معظم۔	شیخ محمد اکرام		۲۸
قصیدہ در تہنیت تاجپوشی۔	مولوی سید جنید احمد صاحب کلیم		۳۳
مرحبین اندرا۔	محمد عبد الرشید الخیری		
قصیدہ تہنیت تاجپوشی۔	مولانا مولوی		۳۵
اعلیٰ حضرت۔	محمد اسمٰعیل صاحب		۵۴
طرابلس سے ایک صدا۔	ایڈیٹر		۵۸
تبریز۔	ایڈیٹر		۶۸
ٹریپولی۔	مولانا سید ہاشمی		۶۹
روس و ایران۔	مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی		۷۰
صبح۔	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی		۷۱
دعا۔	ایضاً		۷۲

باہتمام محمد عبد الرشید الخیری دہلوی

سالانہ قیمت قسم اول ۱۳۲۹ء تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ (۰۴ر)

قسم دوم ۱۲ر کتبہ حضرت ابو ظفر صاحبزادہ دہلوی

پبلشر ہمیوری ر

عِصمت

(دہلی)

جہاں پسندیدے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا زینہ ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عِصمت ایک نعمت ہے جیسی دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عِصمت سے بہتر سہیلی عِصمت سے بہتر شفیق پرستیق عِصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عِصمت ان کو بتائے گا کہ کوارپے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہو ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی زندگی میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں اُن پیش آئینگی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کروانے کے واسطے عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عِصمت ہے عِصمت اُن کو بتائیگا کہ جس مدنی کو وہ بے عمل و عش چرخ کر رہی ہیں وہ بس محنت و شقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کس طریقے میں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی بچوں کو دعائیں دیں گے عِصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عِصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

ٹائیٹل پیج کی آرٹ سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ عِصمت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عِصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ۴۸ صفحے ۶۴۔ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ (۲) ہے

منیجر عِصمت و تمدن

(دہلی)

تمدن

شہنشاہ و شہنشاہ بیگم شاہجہان آباد میں

دھن بھاگ! اے سرزمین شاہجہاں آباد! مدتوں پیچھے! اور صدیوں بعد! تیری آنکھیں! اپنے شہنشاہ کے دیدار سے منور ہوتی ہیں! اگلے فسانے بھول جا! قدردانی کی آنکھوں سے دیکھ اور میزبانی کے آغوش پھیلا کر اس حکمراں کا خیر مقدم کر! جو سات سمندر پار سے تیری عزت افزائی کو آیا چمنستان ہندوستان کے نونہالوں! تصور کی آنکھوں سے دیکھو! دلّی کا چپّہ چپّہ تم کو رنگ برنگ کے تماشے دکھائیگا! اور یہ بگڑ بگڑ کر بننے والی دلّی! اپنی تاریخ سنا کر تم کو محو کر دے گی! یہی ہے وہ سرزمین جس پر تیموری اور نادری تلوار نے خون کے دریا بہائے اکبر کی بے تعصبی

اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی! شاہجہانی عمارتوں کو دل میں جگہ دی۔ اور اورنگ زیب جیسے فرشتہ رحمت کی مقدس پیشانی اسی خاک پر حقیقی شہنشاہ کے حضور میں جھکی! جشن اکبری! اور شاہجہانی چہل پہل! کی دیکھنے والی دلی! مٹنے والی روحوں پر آج وفاداری کے پھول چڑھا! ہمایوں کی روح کو فاتحہ سے یاد کر! اور اس بادشاہ کے حق میں دعائے ترقی دولت وعمر کے نعرے لگا! جس نے تیرے اجڑے دیار گل وگلزار بنا دیے!

۷ دسمبر ۱۹۱۱ء

کیسی مبارک رات اور خوشگوار صبح ہے! سینکڑوں بندگان خدا اپنے بادشاہ کے دیکھنے کو اندھیرے منہ گھر سے نکل پڑے! پردہ نشین بیبیوں کس طرح رات کاٹی؟ تمھاری مشتاق نگاہیں! تمھاری دلی دعائیں! شاہی سواری کے ساتھ ہیں! اور قدردان بادشاہ! جس نے دلی کے جنگل کو منگل کر دیا! تمھارے اجاڑ شہر کو آباد کر دیگا! دلی! ہائے دلی! بگڑی ہوئی دلی! دارالسلطنت ہوگی اور خاک دلی کا ہر ذرہ اس ذرہ نوازی کی داد دے گا! دیکھنے والوں تامل کی نگاہوں سے دیکھنا! مدتوں کی لٹی لٹھی دلہن آج اپنا بناؤ سنگار کرتی ہے! خدا اس کا سہاگ قیامت تک سلامت رکھے اور یہ تاج جس نے اس کا روپ بدلوا دیا مدۃ العمر اس کے سر پہ لہلہاتا رہے!

سلیم گڑھ سے شاہی کیمپ تک مسلح فوجیں دو رویہ کھڑی ہیں وفاداری کا دریا ان کے دلوں میں لہریں لے رہا ہے اور مشتاق نگاہیں قلعہ معلی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں سیلانیوں کا ٹڈی دل غول

کو ٹھونپ اور ہر کونپڑ کا نونہال اور چھتنونپر اس مبارک وقت کا انتظار کر رہا ہے جب سلامی کی توپیں فضائے عالم میں گونجکر شاہی تشریف آوری کی مبارکباد دلی کے ہر گوشہ میں پہنچا دیں!

لیجئے لیجئے! شاہی ٹرین جمنستان سلیم گڑھ میں گلگشت کرتی ہوئی آ پہونچی۔ شہنشاہ معظم فیلڈ مارشل کی وردی زیب تن ستارۂ ہند کا تمغہ لگائے باہر تشریف لائے قیصرہ سفید اطلس کی پوشاک آرڈر اوف کارٹر کراون اوف انڈیا کے تمغہ لگائے گاڑی سے اتریں گارڈ اوف اونر نے سلامی دی اور ویسرائیکسیلنز نے استقبال کیا!

لودلی والوں! مبارک! قلعۂ شاہی کی توپ اس وقت اس جلیل القدر شہنشاہ کی سلامی اتار رہی ہے جس کے عدل و کرم نے تمھارے دل مسخر کر لیے!

اللہ اللہ کیا وقت ہے ہندوستانی رؤسا حضور شاہی میں باریاب ہو رہے ہیں اور قلعۂ معلی اپنے شہنشاہ کی عنایت خسروانہ پر عقیدتمندی کے پھول برسا رہا ہے۔ کہاں ہو؟ اکبری درشن کر کے اشنان کرنے والے ہندو مسلمانو! آؤ ہماری خوشیوں میں شریک ہو! اور دیکھو! ہماری ترسی ہوئی نظریں! اپنے شہنشاہ کے درشن کر رہی ہیں! اٹھو! اٹھو! بیخبری کی نیند سونے والو! اٹھو! اور اس درشن کا لطف اٹھاؤ! جسکو دس برس بعد دلی نصیب ہوئی ہے اور دور دور سے لوگ اس کی رونمائی کو آ رہے ہیں!

قلعہ کے دلی دروازہ سے جس پر تاج برطانیہ کا جھنڈا لہرا رہا خوش آمدید کے نعرے لگ رہا تھا۔ جلوس شاہی روانہ ہوا۔ بسط میں

سیکشن میں گورنر لفٹننٹ گورنر اور چیف کمشنر معہ افواج اس کے بعد سرزمین ہندوستان کا وہ مالک و مہمان جس کے دیکھنے کو آنکھیں مدتوں سے ترس رہی تھیں۔

معزز دوستوں! وہ الفاظ کہاں سے لاؤں! کہ کیا دیکھا؟ خوش نصیب تھیں وہ آنکھیں جنھوں نے وہ سماں دیکھا! دیکھا اور ایسا دیکھا کہ اب نظر آنے کی امید نہیں! ملکہ الگزنڈرا کا لال تاج برطانیہ کا گوہر آبدار! حضور شہنشاہ معظم مشکی گھوڑے پر سوار تھے پیچھے لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ کریو پہلو بہ پہلو اس کے بعد علیا قیصرہ کی گاڑی۔ خوش نصیب رعیت چیرز اور خوشی کے نعروں سے اپنے جوش کا اظہار کر رہی تھی شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ کی جو ادا اس وقت دلی والوں کے دل لے گئی وہ دیرا سپرل مجیسٹیز کا خلق تھا شادمانی اپنے جواہرات دونوں چہرو پر نچھاور کر رہی تھی اور رعایا اپنی رعیت کے اظہار جوش کو سچے دل سے قبول کر رہے تھے

اب جلوس اس مقدس عمارت کے قریب ہے جسکا ایک ایک پتھر شاہجہاں کی متبرک روح پر ہر صبح اور شام سلام بھیج رہا ہے۔ مسجد جامع شہنشاہ معظم کی تمام مسلمان رعایا کی وفاداری کا پھریرا سنہری حرفوں میں اُڑا رہی تھی۔ ہزارہا مسلمان مرد اور عورت خانہ خدا میں بیٹھے اپنے شہنشاہ کے حضور میں اخلاص و عقیدت کے تحفے پیش کر رہے تھے جلیل القدر بادشاہ اور عالی مرتبہ بیگم محبت کی آنکھوں سے دیکھتے اور شکر کے کانوں سے سنتے چاندنی چوک پہونچے۔ والیان ریاست کی سواریاں جلو میں تھیں ان کی زرق برق پوشاکیں فوج کی رنگ برنگ کی وردیاں جلوس کی عزت کو دوبالا کر رہی تھیں۔ کیسا مؤثر سماں تھا۔ کہ آجتک اس کا

خیال کرکے دل مزے لے رہا ہے دلی کی در و دیوار سے بہار کی موسم ٹپک رہا تھا جنت کے بودہ۔ برہما کے سیوا کلیاں لگائے طرے باندھے بشاش بشاش چلے جا رہے تھے الغرض ایک ایسا عالم تھا جس کا مزا الی یومنا ہذا ہر آنکھیں لوٹ رہی ہیں۔ دلی کی سرزمین طرح طرح کے جواہرات اگل رہی تھی اور آسمان فرحت و انبساط کی بارش سے دم بھر کو نہ رکتا تھا پہاڑی پر پہونچکر ممبران لیجسلیٹو کونسل کا اڈریس پیش کیا گیا جو وفاداری کی ہوا میں گونجتا ہوا حضور اقدس تک پہونچا۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بادشاہ و شہنشاہ جو دلی کی سرزمین پر حکومت کر چکے آج خاک کی بستی میں پڑے سوتے تھے اور نظام عالم کے زبردست ہاتھ انکو تھپک تھپک کر لوریاں دے رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی بلا شرکت غیرے اس قدر وسیع سلطنت کا حکمراں نہ ہوا جو ہمارے شہنشاہ کے زیر نگین ہے

تاریخ اس شریف آوری پر مدۃ العمر ناز کریگی اور دیر اسپر مل میجیسٹیز کے اس کرم خسروانہ سے جو فخر ہندوستان کو حاصل ہوا جہاں آباد کا ذرہ ذرہ اس کی تصدیق کرے گا۔ ہر طرف سے یہ صدائیں آرہی ہیں "خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے"

سہ پہر کے قریب جب شہنشاہ معظم کیمپ میں داخل ہوئے تو چند والیان ریاست کو شرف باریابی حاصل ہوا۔

۸ تاریخ کی صبح کو باقی والیان ریاست نے اپنے ہر دلعزیز شہنشاہ کے روبرو تسلیم خم کیا اور شام کے قریب خاندان راجگان کی کہڑکی سے باہر اس پارک میں جو اسی غرض سے تیار کیا گیا تھا

شہنشاہ مرحوم ایڈورڈ ہفتم کا بت نصب کرنے کی رسم ادا کی گئی۔ بت چونکہ تیار نہ تھا لوح یادگار کا افتتاح شاہی ہاتھوں سے ہوا سلامی کی توپیں سر ہوئیں اور مشرقی رخ پر یہ لوح رکھی گئی جس پر کندہ ہے "ایڈورڈ ہفتم بادشاہ قیصر"

شہنشاہ معظم کی آمد دلی کو کیا سے کیا بنا گئی شکریہ کی زبان یاری نہیں دیتی کہ یہ فرض ادا ہو! یہ ویران جنگل جو پریڈ کا میدان کہلاتا تھا۔ جہاں رات بھر گیدڑ بولتے تھے سبزہ زار بن گیا انصاف کی آنکھیں شکر و امتنان سے بھری شہنشاہ مرحوم کے بت پر پڑیں گی۔ اور دلی والوں کے مردہ دل اپنے اس شہنشاہ کو عمر بھر دعا دیں گے۔

حقوق نسواں کو جہالت کی چھری سے ذبح کرنے والے بزرگوں آنکھوں پر پٹی باندھ کر انصاف کا خون نہ کرنا! آج خواتین ہند کا ایڈریس اس خاتون کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جو ہماری مہارانی اور ہمارے شہنشاہ کی شہنشاہ بیگم ہے! ایڈریس کا جواب غور سے سننا! رحمت کا فرشتہ قیصرہ کے اس ایڈریس پر مرحبا کے نعرے لگا رہا ہے یہ الفاظ وہ گوہر آبدار ہیں جو صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے! اور اب نہیں تو آنے والی نسلیں ان پھولوں کو سر آنکھوں پر رکھیں گی!

"اوراق تاریخ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں کس طرح فلاح و بہبود کا سامان اپنے گھر پر کر سکتی ہیں میں یہ سنکر بہت خوش ہوئی کہ پردہ نشین بی بیوں میں ترقی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ بیبیاں دلیس ترقی تعلیم کا خیال کافی رکھینگی تاکہ پیدا ہونے والی لڑکیاں اپنے شوہروں کی کارآمد رفیق اور غم خوار ہمدم ثابت ہوں"۔

۱۰- دسمبر ۱۹۱۱ء کو شہنشاہ معظم و شہنشاہ بیگم نے جزیرہ جگت پور میں نماز دعا میں شرکت فرمائی لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند اور لارڈ ایشپ اوف مدراس نے شہنشاہ حقیقی کی درگاہ میں تاج برطانیہ کی ترقی و سلامتی کے واسطے التجا کی آٹھ ہزار سے زیادہ مخلوق اس دعا میں شریک تھی اور یہ ہزارہا بندگان خدا اس درگاہ میں سربسجود تھے جس کے ازلی و ابدی راج کے گیت ہر طرف بج رہے تھے۔ باوجود خلقت کی اس کثرت کے ایک سناٹا چھایا ہوا تھا اور تاج برطانیہ کی سلامتی کے واسطے اس انصاف کے ہاتھ بھی دعا میں بلند تھے جس نے شیر بکری کو ایک گھاٹ پانی پلا دیا اس خاص مجمع کی تعداد محدود ہو مگر اس دعا میں تمام ہندوستان شریک تھا اثر نے اس دعا کو سر آنکھوں پر رکھا ہوگا جو لہو کھو کھلے مطمئن دلوں سے نکلی اور زبان پر آئی! ٹوٹے پھوٹے گھروں میں آزادی کی نیند سونے والی لاوارث رانڈیں! اور مسجدوں کے حجروں میں بے فکر یا توں پھیلانے والے یتیم! اپنی نیند سوتے اور اپنی نیند اٹھنے والے مسافر ملک کے اس سرے سے اور اس سرے تک امن و عافیت سے بسنے والے لوگ شہنشاہ معظم کی ترقی عمر کے واسطے دست بدعا تھے!

۱۱- دسمبر کو فوجوں کا معائنہ پولو کی سیر ہوئی اور بارہ دسمبر اس جشن کا روز تھا جس کی گھڑیاں گنی جا رہی تھیں ادھر شہسوار مشرق نے رات کا گھونگھٹ کھولا ادھر بینڈ باجے نے جشن شاہی کے ترانے گانے شروع کیے سنگینیوں کی چمک سے پرنس روڈ جگمگا اٹھی دور دور کے راجہ اور نواب وفاداری کی تلک لگائے چلے آ رہے تھے۔ رعیت اپنے بادشاہ کے دیدار سے نہال نہال تھی امرا و رؤسا نے فوج کی کروفر لباس کی

ٹیپ ٹاپ سے اپنی ہمت کے نمونے دکھائے تو غربا کا اشتیاق دیداران کی عالی حوصلگی اور وفاداری کا نمونہ تھا یہ دیدار شاہی کے بھوکے اور فرمان شاہی کے پیاسے صبح ہی صبح آموجود ہوئے تھے۔ بیس ہزار کے قریب فوج وسط صحن میں مسلح کھڑی تھی اور لاکھہ ڈیڑھ لاکھہ آنکھیں محبت کا سرمہ لگائے وفاداری میں ڈوبی ہوئی اپنے شہنشاہ کے جمال جہاں آرا کی منتظر تھیں گیارہ بجتے ہی ڈیر ایکسیلینیز ٹوریگن گارڈ کو جلو میں لیے تشریف فرما ہوئے یہ سماں بدستور تھا کہ توپوں کی گونج دیر امپیریل میجسٹیز کی تشریف آوری کا مژدہ لائی۔ سواری کا قریب پہنچنا تھا کہ تمام حاضرین آداب شاہی کے واسطے سروقد کھڑے ہوگئے فوج نے سلامی اُتاری باجوں نے اظہار شادمانی کیا رعیت نے چیرز کے نعرے لگائے اور سواری شامیانہ میں آئی۔

شہنشاہ و شہنشاہ بیگم نے اس زمین کو جو مدتوں سے منتظر تھی اپنے قدموں سے مالامال کیا چھوٹے چھوٹے شہزادوں نے آگے پیچھے سے خلعت شاہی کو سہارا دیا ہز ایکسیلنسی نے استقبال کیا اور بادشاہ معہ بادشاہ بیگم تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے ✤

اعلان و تقریر شاہی کے بعد اب وہ مبارک سماں تھا جب تمام عہدہ داران و والیان ریاست تاج برطانیہ کے روبرو سر تسلیم خم کر رہے تھے سب سے پہلے وائسرائے نے آگے بڑھ کر اظہار اطاعت کیا اور پھر یکے بعد دیگرے تمام حکام و والیان ریاست نے۔ اس رسم کی ادائیگی نے تقریباً ایک گھنٹہ لیا۔ مگر دلچسپ نظارہ تھا۔ اظہار اطاعت صداقت و وفاداری کا نشان تھا جو ادائی و اعلی دونوں کے واسطے باعث فخر تھا

بیچ یہ ہے جس حکومت نے ہندوستان کو تمام قیدوں سے آزاد کر دیا وہ ہر عزت و احترام کی جائز مستحق تھی رعیت کے دل حکام سے زیادہ شاہ کے کرم کا اعتراف کر رہے تھے +

اب شاہ اور بادشاہ بیگم تخت سے اٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ دیے شاہی خیمہ کی طرف روانہ ہوئے دلی کی زمین دلہن بنکر ان قدموں پر نثار ہو رہی تھی اور آسمان آج ڈھائی تین سو برس بعد رعیت کی دعاؤں پر آمین کہہ رہا تھا دیر امپیریل مجسٹیز یعنے تخت پر قدم رکھا دیر ایکسیلنز دائیں طرف اور میجسٹی ادھر اُدھر موجود تھے چند لمحہ گذرے ہونگے کہ نقیب آگے بڑھا گل بجایا اور ہیرلڈ نے شہنشاہ کی تخت نشینی کا اعلان انگریزی میں اور ملک عمر حیات خاں صاحب نے اردو میں کیا اور ہر ایکسیلنسی نے وہ فرمان شاہی سنا یا جس نے ہر کوہ اور ہندو مسلمان کا کنول کھلا دیا۔

۱۳۔ دسمبر کو دس بجے کے بعد اعلیٰ حضرت نے فوجی افسروں کو شرف ملاقات بخشا اسوقت توپخانہ کے وہ سات بہادر پیش کیے گئے جنھوں نے اپنی جانیں کھیل کر فیروز پور کے توپخانہ کو بچایا تھا ان جاں نثاروں کی محنت ٹھکانے لگی قدر دانی نے ان کے حوصلے بڑھائے تاج شاہی نے انکی جرأت و شجاعت کی داد دی اور شہنشاہ معظم نے اپنے ہاتھ سے شاہی تمغہ انکی سینہ پر لگایا

زمانہ قدیم کی یہ رسم کہ جاں نثار سورما اپنی تلواروں کے دستے بادشاہ کے روبرو جھکا دیں اس وقت ادا کی گئی اور تین معزز ہندوستانیوں نے اپنی تلواریں حضور شاہی میں جھکائیں اور شہنشاہ معظم نے اپنا ہاتھ ان پر لگا دیا۔

شام کے وقت قلعہ میں گارڈن پارٹی ہوئی یہ جگہ [illegible] شاہان مغلیہ کے جشن کا نوں سے سنے اور تاج برطانیہ کی جھلک دلی والوں نے

دیکھی قلعہ معلی آج چونہی کی دلہن بنا ہوا تھا۔ ہری ہری گھاس کے تختے رنگ برنگ کے پھول اقسام و اقسام کی بیلیں اس عروس کا زیور تھیں فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اور وہ در و دیوار جو شاہجہاں و ممتاز محل کے جلسوں کو ترس گئے تھے آج اپنی عزت افزائی پر ناز کر رہے تھے زمین تاج برطانیہ کے قدموں کے واسطے آنکھیں بچھا رہی تھی۔ ساڑھے تین بجے بادشاہ اور بادشاہ بیگم شن بج میں تشریف لائے اور مشتاق رعیت کو اپنے دیدار سے منور کیا جرنیلوں کی سیر کرتے ہوئے جس کے نیچے جمنا اٹکھیلیاں کر رہی تھی دیوان خاص میں تشریف لے گئے ؛

[illegible] کا شہر پر عجیب جوبن تھا روشنی نے دلی کو جگمگا دیا قلعہ میں آتشبازی [illegible] اور شہر میں وہ عالم ہوا کہ دلی منہ سے بول اٹھی۔

[illegible] کو فوجی معائنہ ہوا اور اونچاس ہزار فوج شہنشاہ کے سامنے گذری ایک خاص وقت میں اور ایک خاص مقام پر فوج کا اسقدر اژدہام ہندوستان میں پہلا اتفاق تھا یہ ایسا دلچسپ اور انوکھا نظارہ تھا کہ مزے لوٹنے والی آنکھیں ابتک اسکو یاد کر رہی ہیں شام کو خطابات تقسیم ہوئے اسوقت شہنشاہ معظم نے اوف انڈیا کا لباس زیب تن کیا جو سب سے پہلے ملکہ معظمہ نے اپنا سر شہنشاہ کے آگے جھکایا اور اعلیٰ حضرت نے تمغہ گرانڈ کراس اوف دی ایمپیر عطا فرمایا اور رخسار کو بوسہ دیا۔

۱۵ دسمبر کو وہ مبارک رسم ادا ہوئی جو دلی کو دلی اور دلی والوں کو زندہ کر گئی یہ دارالسلطنت کا سنگ بنیاد تھا جو گورنمنٹ اوف انڈیا کے کیمپ کے باغیچہ میں رکھا گیا ؛

[illegible] والوں، وہ وقت پھر آئے گا! کہ دلی ایک چیز ہوگی، [illegible] بابل

آج فسانہ ہوگئیں، یہاں پھر نظر آئیں گی! اسی خاک سے پھر ایسے ایسے لوگ اٹھیں گے! جنہیں دلی فخر کرے گی۔ باکمالوں کا مجمع پھر دکھائی دے گا! گو ہوا کا رخ بدلا ہوا ہوگا اور زمانہ اگلے مذاقوں کی ہنسی اڑائے گا! مگر اسی بستی میں وہ صورتیں ہی دکھائی دیں گی، جو بزرگوں کے نام آنکھوں سے لگائیں، عالم تنہائی میں سونیوالوں میری مبارک باد قبول کرو، جو خزانے تمھارے ساتھ دفن ہوئے، اب دنیا ان کی قدر کرے گی، بڑے بڑے محقق تمھارے مٹی کے ڈھیروں کی پرستش کریں گے، اور مغربی سیاح یونیورسٹی کی لالٹین سے تمھارے کھوج لگائیگا، زمانہ کی اندھیری گھپ رات سر پر ہوگی، اور علوم کی جگمگاتی روشنی میں تمھاری خاک کا ہر ذرہ اکسیر کا کام دے گا! ہماری ہڈیاں گل کر خاک ہوچکی ہونگی، مگر دلی کو دارالسلطنت دیکھنے والی آنکھیں، ہمارے بیان کی تصدیق کریں گی، مٹنے والی روحوں، ظاہری آنکھوں نے تمھارے فانی اجسام چھپا دیئے، مگر وہ وقت آگیا کہ تلاش کی آنکھیں، تمھارے ان پھولوں کو سر پر رکھیں جن کی مہکار بقار دوام کے خلعت سے وابستہ ہے۔

یہ پھانس دلمیں کھٹک رہی ہے اور کھٹکے گی، کہ! قدردانی کے دریا جن کی موجیں آبدار موتیوں اور چمکتے ہوئے جواہرات سے خلق خدا کو مالامال کرتی تھیں خاموش پڑے ہیں، ہوا کے تھپیڑے سینہ کے پھینٹے اور بڑے بڑے طوفان اوپر ہی اوپر گذر رہے ہیں۔ مگر انہیں! انہیں! دل بیقرار! اس باسی کڑہی میں پھر ابال آئیگا! اور تاج برطانیہ! جس نے اس خاک پاک کو کندن بنا دیا، یونیورسٹی کے انعام سے، ان مردوں کو جلائے گا! یہ بند پانی اور ٹھیرے ہوئے دریا پھر حرکت کریں گے

شہنشاہ معظم کی مسیحائی ان بیخبروں میں جان ڈالکر ان گناموں کے نام روشن کرے گی، اور زمانے کا سانحہ نہ دینے والی قوم، جو کرۂ ادبار میں مٹ کر خاک ہوگئی، احساس کے خلعت فاخرہ سے مزین ہوگی اور ان سروبنہ جو فلاح قوم سے ٹکریں مار رہے ہیں، اپنے ہاتھ سے، سدا بہار پھول چڑھائیگی۔

۱۶۔ دسمبر جس دم قدم کی تمام چہل پہل اور رونق تھی یعنے شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ آج دلی سے روانہ ہوئے اور دلی نے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کو خدا حافظ کہا سلیم گڑھ کا اسٹیشن انواع و اقسام کی گلکاریوں سے آراستہ تھا اور رعیت دیرا امپیریل میجیسٹیز کی جدائی سے بہت ہی متاثر تھی اظہار وفاداری اور عنایت خسروانہ کا شکریہ وہ سلام تھے جنکی ہر چہار طرف سے بوچھار ہو رہی تھی شہنشاہ کی محبت نے یوں ہی دلوں میں گھر کر لیئے تھے اسوقت ہز میجیسٹی کا دیر تک چلتی گاڑی میں کھڑا رہنا اور اپنی رعیت کے سلاموں کا جواب دینا ایک ایسا موثر نظارہ تھا کہ بہت سی آنکھیں اس جدائی پر آنسو بھر لائیں +

دلی دعا ہے کہ خدا دیرا امپیریل میجیسٹیز کو سلامت رکھے!

ایڈیٹر

جھروکہ۔ یہ ایک مکان ہے جسکی کھڑکیاں دریا کی طرف ہیں اور اکبر بادشاہ کے زمانہ میں بنا رہا اس وقت اس کا نام درشنی تھا اور لوگ یہاں سے بادشاہ کا درشن کرتے تھے شاہجہاں تک یہ طریقہ جاری رہا اور اورنگ زیب نے اس کو موقوف کر دیا اور اس کا نام جھروکہ رکھا گیا جو سیر و تماشہ گاہ مقرر ہوئی +

نوید مقدم شہنشاہی

از تصنیف مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس شہر میرٹھ

نو بہار بوستاں آنے کو ہے — خسرو گل ہم عناں آنے کو ہے
بہر استقبال رایات بہار — لشکر سرو رواں آنے کو ہے
شاخ گلبن پر بانداز خطیب — عندلیب خوش بیاں آنے کو ہے
صحن گلشن میں بطور ترجمان — طوطی شیریں زباں آنے کو ہے
پیش گل ہر طائر رنگیں نوا — تہنیت گو مرغ خواں آنے کو ہے
پیک ہدہد مژدگانی کے لیے — بال افشاں بیزباں آنے کو ہے
ابر گوہر بار بحر مغربی — سوئے مشرق دُرفشاں آنے کو ہے
راہ دریا سے سفینوں کی قطار — صورت سیارگاں آنے کو ہے
نوجواں بنکر نگاہ خلق میں — داستان باستاں آنے کو ہے
جام صحت بنکے بزم عیش میں — گردش طل گراں آنے کو ہے
خانہ باغوں کے لیے کشمیر سے — کشتہ زار زعفراں آنے کو ہے
بلدہ کاشی سے زلفت نفیس — از برائے سائباں آنے کو ہے
زینت درہائے ایواں کے لیے — لوکیوں سے پرنیاں آنے کو ہے
طاقہ طاقہ محفل روم و فرنگ — فرش راہ دوستاں آنے کو ہے
طبلہ طبلہ مشک تاتار و ختن — حسب حکم میزباں آنے کو ہے
میوہ کابل سے تو مقطع سے رطب — بہر نقل میہماں آنے کو ہے
وہ مہوبہ سے تو یہ قنوج سے — عطر گل اور برگ پاں آنے کو ہے

لے کے جنسِ نادراتِ روزگار — مجمعِ بازارگاں آنے کو ہے
خاص کجلی بن سے بیلِ دیوزاد — ساتھ لیکر پیلباں آنے کو ہے
گلہ گلگوں و شبدیز و سمند — ہمرہِ سوداگراں آنے کو ہے
اُشترانِ تند جیسلمیر سے — لیکے خیلِ ساروان آنے کو ہے
بے شمار اسٹاک موٹر کار کا — ملکِ یورپ سے یہاں آنے کو ہے
صنعتِ پرواز کا موجد گروہ — لیکے اپنی کشتیاں آنے کو ہے
مردمِ آفاق کا جمِ غفیر — کارواں در کارواں آنے کو ہے
شہری و دہقاں کا انبوہِ کثیر — مرزباں سے تا شباں آنے کو ہے
جذبۂ شوقِ تماشا دیکھئے — تا بہ پیرِ ناتواں آنے کو ہے
خیمہ و خرگاہ کا شہرِ جدید — زیرِ سقفِ آسماں آنے کو ہے
ہر طرف سے لشکر آراستہ — مثلِ دریائے رواں آنے کو ہے
نیزہ برداروں کے پیہم کوچ سے — راستوں میں نیستاں آنے کو ہے
رائفل بر دوش پیدل کا قشوں — ہمدمِ برقِ دماں آنے کو ہے
توپخانوں کا گرجنا گھورنا — گویا بھادوں کا سماں آنے کو ہے
وقتِ ہر شلک مہانِ توپ سے — بانگِ دیوِ ہفت خواں آنے کو ہے
عرضِ لشکر کے لیے میدان میں — شاہ با چتر و نشاں آنے کو ہے
موجِ برقِ نامہ برِ لائی خبر — اک نیا دورِ زماں آنے کو ہے
دیدہ و دل منتظر ہیں سچ بتا — کون آتا ہے؟ کہاں آنے کو ہے
جارجِ پنجم خسرو گیتی ستاں — جانبِ ہندوستاں آنے کو ہے
وارثِ تاج و نگینِ قیصری — داورِ دارائشاں آنے کو ہے
آفتابِ مکنتِ ہندوستاں — سمتِ اس غرو شاں آنے کو ہے

از پئے تسلیم شاہِ جم شکوہ — ہر مسیر ملک راں آنے کو ہے
دیر جات و سندھ و پنجاب و دکن — با سر و با چشم دجاں آنے کو ہے
بنگ و برما و بنگال و اودھ — بلکہ تا بامِ جہاں آنے کو ہے
عتبۂ علیا کی جانب با خلوص — طبقۂ نواب و خاں آنے کو ہے
گرد بر گردِ سرادقہائے شاہ — جیشِ رائے و راجگاں آنے کو ہے
راجپوتانہ سے با خیل و حشم — ماہ و خور کا خاندان آنے کو ہے
رُبعِ مسکوں سے برسمِ تہنیت — نائب ہر قہرماں آنے کو ہے
تازہ کر اے ملک پیمانِ وفا — بادشاہِ مہرباں آنے کو ہے
مژدہ اے دہلی کہ تیرے ارک میں — مرکزِ امن و اماں آنے کو ہے
مستقرِ ملک میں قرنوں کے بعد — موکبِ صاحبقراں آنے کو ہے
چار سوئے ملک سے بہرِ نثار — حاصلِ دریا و کاں آنے کو ہے
مہرِ الفت کی گراں مایہ متاع — بر سبیلِ ارمغاں آنے کو ہے
مقدم شہ میں زبانِ خلق پر — "شاد باش و دیر ماں" آنے کو ہے
گرمیِ ہنگامۂ جشنِ جلوس — آخرِ سالِ رواں آنے کو ہے

مدح سنجی کے لیے دربار میں
شاعرِ جادو بیاں آنے کو ہے

نیلی چھتری — دلی میں دریائے جمنا کے پار سلیم گڑھ کے نیچے ہمایوں کے باغ کی گنبد سے جو نیلی چھتری کے نام سے مشہور ہے نو سو انتالیس ہجری میں ہمایوں نے شکوہ یا یہاں سے وہ دریا کی سیر کرتا تھا اسکو جہانگیر کا بنگلہ بھی کہتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ عمارت قدیم ہے اور جہانگیر نے اسکی مرمت کی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پانڈوں کے وقت کی یہ عمارت ہے جہانگیر نے اسکی مرمت کی اور یہ کتبہ لکھوا دیا۔
اللہ اکبر مدینہ جہانگیر شاہ ابن اکبر شاہ ۔ عجب فرخندہ جائے کامرانی است ۔ تشیر گاہ چنبت آسمانی است

شاہی میلہ

یوں تو ہندوستان سدا ہی سے میلوں ٹھیلوں کا گھر رہا مگر دلّی کے بنیکروں نے اِس فن کو بھی معراج کمال پر پونچا دیا برس کے تین سو پینسٹھ دنوں میں دو سو سے اوپر میلے گن لو۔ تھیٹروں کے دروازوں اور چوک کی سیڑھیوں پر جو جمگھٹا رہتا ہے وہ الگ رہا۔ اِس خیال سے کہ کوئی اٹھوارہ خالی نہ گذر جائے۔ جمعرات کو پیر غیب ہی پر میلا جما دیا۔ گھر میں فاقہ ہے تو بلا سے اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں تو ان کی تقدیر مگر ان سیلانی جیوڑوں کے میلہ میں فرق نہ آئے لڑ کر جھگڑ کر چھین کر جھپٹ کر کسی نہ کسی طرح آٹھ پیسے کا رخانداری سے لیتے۔ مندے نے برتن تک بنئے کے ہاں پونچھوا دیے اور گھر والی فاقے کرتے کرتے کانٹا ہو گئی مگر شوقینوں کی وضع میں فرق نہ آیا پھٹی پرانی صدری گلے میں ڈالی اور پرانا دھرانا چادرہ بغل میں لے کل کھڑے ہوئے تین نے مل کر یکہ کیا الائچی دار پان نیواڑی سے دبائے اور گلوری گلے میں دبا یکہ میں بیٹھ چلتے ہوئے۔

رستے کی باتیں، الٰہی تیری پناہ، کوئی علم ان سے نہ چھوٹا۔ کوئی تاریخ ان سے نہ بچی،

شہنشاہ معظم کی تشریف آوری کے موقعہ پر دلّی نے ایک تحفہ شاہی میلہ کے نام سے بھی بارگاہ خسروی میں نذر گذارا اور لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے دلی والوں نے دل کھول کر اس میلے کے مزے لوٹے۔

راج گھاٹ کے پاس جہاں جمنا بہہ رہی ہے میلہ میں یہ میلہ سجایا گیا
ایک طرف مینا بازار لگا۔ دور دور کے دوکانداروں نے اپنے مال لگائے
اور مشہور مشہور صناعوں نے اپنی صنعت کے نمونے پیش کیے دوسری طرف
مرغ بازی۔ پتنگ بازی غرض بہت سی بازیوں کے اکھاڑے بندھے
دنگل ایسا بندھا کہ اب شاید ایسا کبھی نہ بندھے۔ ہندوستان بھر کے
نامی گرامی چوٹی کے پہلوان جو رستم و سہراب ہونے کے مدعی تھے
نبرد آزما ہوئے کئی کئی ہزار روپیہ کے انعام پر کشتیاں ہوئیں مست
ہاتھیوں کی لڑائیاں جن کے چرچے سنے تھے۔ بادشاہ کے طفیل میں
ہم نے بھی آنکھ سے دیکھ لیں حضور شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ نے بھی
اس میلہ کا ملاحظہ جھروکوں سے فرمایا اور صرف یہ ہی عزت اس میلہ
کے واسطے اتنی کافی ہے کہ شاہی میلہ اوراق تاریخ میں ہمیشہ یادگار
رہے گا۔ دن کے وقت چھوٹنے والی آتشبازی جس کا نام بھی
کبھی نہ سنا تھا اس مزے سے چھوٹی کہ دل خوش ہو گئے خشکے
کا ایک آوازہ زمین پر دوسرا آسمان پر آوازہ ہوتے ہی جو پٹاتو
رنگ برنگ کے جانور ہوا میں اڑ رہے ہیں اور طرح طرح کے پھول
ادھر ادھر تیرتے پھرتے ہیں۔ پھلجھڑیوں کا ناچ بھی عجب لطف
کی چیز تھی بیچ میں ہاتھا چاروں طرف ناچنے والے گتوں پر اس مزے
سے تھرک رہے تھے کہ دیکھنے والے پھڑک گئے راجگھاٹ کے
مندر اور شاہ بڑے کی درگاہ پر ہندو مسلمانوں کے پنکھے چڑھے
منتخب نفیری والوں نے اپنی دلکش تانوں سے دل مسخر کر لیے۔
باوجود روک ٹوک کے خلقت ٹوٹی پڑتی تھی اور کوئی میل رقبہ میں

میلہ لگا گیا مگر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی دلّی کے بے فکرے تو اس تاک میں تھے ہی میلہ کا نام سنتے ہی اُمنڈ پڑے۔ کچھ مر نکل گیا تو بلا سے مگر ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ پردیسیوں کا تانتا مزید براں۔ میلہ کے ضمن میں بحث دو زردوزوں کی گفتگو سے ہے جن کی حالت آنکھوں سے دیکھی اور جن کی باتیں کانوں سے سنیں۔ ان کی میلی کچیلی کام سے لپی ہوئی ٹوپیاں۔ کُنّے نکلی ہوئی سپاٹ اور سلمہ ستارہ کی جوتیاں کنوز کے اُتوے کئے ہوئے پُرانے کوٹ ان کے افلاس کی پوری شہادت دے رہے تھے۔ کام موجود تھا۔ کارخاندار پھیرے کرتے کرتے تھک گیا مگر یہ اپنے فاقوں میں مگن تھے اور آٹھ دن تک کام پر جانا حرام سمجھتے تھے۔

(۱) کیوں شیدو! آج تو مزا آگیا!

شیدو۔ مزا؟ میں کہتا ہوں اعمر بھر یہ بات نصیب نہیں ہونیکی! کرخندار کو دیکھو اتنی عقل نہیں کہ بے کام تو روز ہی ہے! مگر بادشاہ روز روز کہاں۔

(۱) تو نے بھی یار کس ہستی کا نام لیا صبوں سے تو روٹی نصیب ہوئی نہیں تو نے اس وقت کی بھی کہوائی۔ ابے بھائی یہ دیکھ بادشاہ ہو تو اتنا تو ہو گھی کے طریوں روپیہ بہا ہا ہے مگر چہرہ پہ بل تک کا نہیں۔

شیدو۔ سلامت یار ہے تو بہی بونگا ہی! روپیہ کو پیٹ رہا ہے! ابے بادشاہ کو روپیہ کی کیا کمی، یہ دیکھ کہ دلی بادشاہ کا گھر بن گئی چھ مہینہ وہاں چھ مہینہ یہاں۔

سلامت تشت! کیا اوندہی کھوپری کا آدمی ہے ابے دلی تو کردی لاٹھہ کے نام۔ اور کلکتہ دیا چھوٹے لاٹھہ کو۔

شیدو۔ واہ بے خبط! کیا سمجھا ہے استاد سلو سے تو یو جیہ وہ توحید آباد

اولاد کے برابر ہی سمجھے جب حکم پڑھے گئے ہیں اگر میاں، شوہر مو، نعم، اور بادشاہ ہا، آقا نعم، ا، اسلاف، ،

قصیدہ در تہنیت خیر مقدم شہنشاہ

ہے طلوع شفق صبح سے ظلمت کافور — ید قدرت نے رخ شب پہ طلا غازۂ نور
آمد خسرو خاور کی جو ہے گرم خبر — تہنیت گانیکو گلزار میں ہیں جمع طیور
پرتو نور سے ہے آئینہ خانہ عالم — در و دیوار میں ہے جلوۂ قدرت کا ظہور
صبح نوروز سے کھلنے لگیں دل کی کلیاں — گل امید سے ہے دامن عالم پر پور
بام مشرق سے گری برق جمال خورشید — ذرہ ذرہ ہوا روشن صفت شعلۂ طور
فرحت افزا ہیں نسیم سحری کے جھونکے — دل زمانہ کا ہے ٹھنڈا تو طبیعت مسرور
عابدوں کیطرح سجدہ میں جھکے جاتے ہیں — ہیں نہالان چمن رحمت حق کے مشکور
ٹھنڈے چھینٹے دیئے شبنم کے فلک نے شب بھر — تھا دم صبح جو سبزہ کو جگانا منظور
تارے گن گن کے بسر کی ہے جو ارتا کھو میں — نظر آتا ہے ابھی دیدۂ نرگس مخمور
کیوں نہ کلیونکو حجاب آئے حسینوں کیطرح — کہ اٹھاتی ہے صبا پردۂ حسن مستور
چار دیواری میں ہیں جمع حسینان چمن — قاف کی پریونکو قدرت نے کیا ہے محصور
گل نازک نے اڑائی ہے پری کی رنگت — شاخ سنبل نے نکالا ہے خم کاکل حور
صحن گلزار مسرت سے ہے نوبت خانہ — پھول کھلتے ہیں تو آتی ہے صدائے طنبور
اب نہ عاشق سے ہے معشوق ستمگر محجوب — اب نہ معشوق سے ہے عاشق مضطر مہجور
اس طرف اپنے ترنم پہ ہے بلبل نازاں — اس طرف اپنے تبسم پہ ہے غنچہ مغرور
چار سو گونجتے ہیں نغمے انابت کے — سرو گلشن ہے اگر دار تو قمری منصور
نگہ شوق سے بلبل نے جو دیکھا گل کو — چشم نرگس نے کہا دور سے چشم بد دور
بادہ چشمہ کو شر نہو کیوں آب رواں — پڑ رہا ہے لب جو پر تو شاخ انگور

دورِ جامِ عشرت میں گرے تو بہ شکن ہوگیا شیشۂ اندوہ و الم چکنا چور
آج کے واسطے ہے مجمعِ اربابِ نشاط کس لیے بزم ہوئی عیش و طرب سے معمور
اس طرح کیوں ہے خوشی کوئی یقینی ہے سبب اس قدر کیوں ہے مسرت کوئی باعث ہے ضرور
آج اس شاہِ معظم کے مقدم کی خوشی شہرِ تسلیم میں جس کی نہیں ہوتا مستور
وہ جہاندار اولوالعزم معلی القاب آسماں سامنے جس کے ہے کم از بیضۂ مور
جارجِ پنجم شرف افزائے سریر برش شاہِ جم مرتبہ و زینتِ تاج مغفور
واہ کیا نام مقدس ہے جو لب تک آجائے شادمانی کا ہو باعث پئے قلبِ رنجور

وصفِ شہر میں رقم ایک اور بھی مطلع ہو حمید
رہے باقی نہ دقیقہ کوئی حتے المقدور

ہفت اقلیم ہیں شاہا تری پابند امور دست بستہ ہیں سلاطینِ جہاں تیرے حضور
قیصرِ ہند ہے تو جانتے ہیں اہلِ جہاں ہے سخاوت تری معروف عدالت مشہور
چشمۂ فیض سے ہے ابرِ گہربار آب پانی پانی ترے امواجِ کرم سے ہیں بحور
تیرے قدموں میں جو رہتی ہیں وہ ہیں چرخِ نشیں آستاں بوس جو ہوتے ہیں وہ ہیں صدرِ صدور
سایہ افگن ہوا گر دامنِ اعزا ترا ذرّۂ ریگ بنے چشمۂ مہرِ پُرنور
شہریاری کا سکھایا ہے طریقہ تو نے تھا سلاطینِ جہاں کو نہ سلیقہ نہ شعور
طاعتِ حکمِ رعیت کا ہے تیری شیوہ عدل و انصاف حکومت کا ہے تیری دستور
ہیں رعیت میں تری جملہ مذاہب آزاد نہیں کرتا ترا قانونِ عدالت مجبور
تو اگر گرمِ غضب ہو تو قیامت آجائے ہو صدا میں تری پیدا اثرِ نفخِ صور
تیرے دم خم سے کچھ ایسے ہوئے میدھے سرکش نہ وہ بل ہے نہ تکبّر نہ شرارت نہ غرور
قہر کی تیرے یہ کوشش ہے کہ دشمن نہ بچے مہر کی تیرے سفارش ہے کہ ہو عفو قصور
سرِ میداں جو تری تیغ مجلّی کھنچ جائے ہوئے ملکِ عدم خوف سے دشمن مفرور

گر کسی معرکۂ جنگ میں ہو تیرا گذر — پاؤں کو چوم کے نصرت کہے آداب حضور
دیکھنے کو ترے لے شاہ جہاں تخت طاؤس — نظر یں بیتاب تھیں اور دیکھنے والے رنجور
اس طرف شہر جلوہ گہ ناز نرا لندن تھا — اس طرف ہند میں تھی تیری رعیت مہجور
اے خوشا بخت کہ دیدار ہوا تیرا نصیب — خورمی قلب کو حاصل ہی اور آنکھوں کو سرور
آج وہ سامنے بیٹھے دھونڈتے تھے کل جس کو — آج وہ پاس ہی رہتا تھا جو کل کوسوں دور

کوئی حسرت نہ رہی بس یہ دعا ہے حمید
سامنے اپنے یہ صورت رہے تا یوم نشور

عبد الحمید حمید۔ میرٹھی

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کے محل میں رنگ برنگ۔ آج بیوی سے لیکر باندی تک سب نے بناؤ سنگار کیے۔ بنارسی زری بوٹی مقیشی تاروں کی کرب لاہی پھلکاری۔ گلشن بابریٹ آب رواں شبنم کے دوپٹے۔ زربفت کمخواب۔ گلبدن۔ مشروع۔ طلس گوٹہ اور ادھانگری کے لباس سے آراستہ ہو چھم چھم کرتی ملکہ دوران کے پاس حاضر ہوئیں۔ مجرا کیا اپنے اپنے قرینہ سے بیٹھ گئیں ملکہ دوران تک سے سکھ بناؤ سنگار کیے سونے میں پیلی موتیوں میں سفید اپنی مسند پر بیٹھی ہیں آگے ٹک لگی ہوئی ہے خواجہ سرائیں نوکریں چاکریں لونڈیاں باندیاں ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی ہیں توشہ خانہ والیاں جوڑے کی کشتی لیکر حاضر ہوئیں دیکھو ملکہ دوران ایک ایک کو اپنے ہاتھ سے جوڑے دیتی ہیں سب سرو قد ہو کر جوڑے لیتی ہیں آداب بجاتی ہیں نذریں دیتی ہیں لو ملکہ دوران دال بگھونے چلیں مبارک باد کی نوبت نقارچیں بجانے لگیں آگے آگے روشن چوکی والیاں تاشے بابے والیاں۔ ملکہ دوران نے اپنے ہاتھ سے سات لبیں بھر کر ڈالیں کڑھائیاں چھپڑھیں گھلنے شروع ہوئے + بزم آخر

اگلے جشن

ہر ملک و ہر رسم جشن شاہی تمام دنیا میں منتے ہیں کہیں کسی طرح کہیں کسی طرح مگر جشن ہو یا دربار رعیت ہو یا سرکار۔ حکومت کا مزاج یہی ہے کہ رعیت بادشاہ کی فرمانبردار اور بادشاہ رعیت کا عاشق زار شہنشاہ معظم جارج پنجم کی تشریف آوری نے یہ دکھا دیا کہ جس طرح بادشاہ کو رعیت مرغوب تھی اسی طرح شہنشاہ رعیت کا محبوب تھا۔

اس موقعہ پر ہندوستان رعیت شاد دل آباد کی پوری تفسیر تھی دلی کی سرزمین نے بہت سے دربار دیکھے اور دیکھنے والوں کو مشرقی تزک و احتشام کے نمونے دکھلائے مگر یہ گنگا جمنی دربار جو مشرق و مغرب کے معاشرت کا عطر تھا تاریخ میں بےنظیر ہے +

ہندوستان میں تاجپوشی مختلف طریقوں سے ہوا کی اہل ہنود کے دور میں راجہ کے واسطے ضرور تھا کہ جہاں وہ گرہست اشرم کے جھمیلے میں پھنسا تو سب سے پہلے بن برستہ کی رسم ادا کرے اور راجہ رامچندر جی کی طرح بن باس کرے اسوقت بڑا مشکل کام ولیعہد کا انتخاب ہوتا تھا جس میں راجہ کو مطلق دخل نہ تھا رعیت اپنا راجہ آپ انتخاب کرتی اور اگر راجہ کی اولاد نالائق ہوتی اور انتخاب کے وقت رعیت کی چھاتی نہ ٹھکتی تو صاف انکار کر دیتی رامائن نے اس مسئلہ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

بادشاہ رعیت کا نگہبان ہے اگر وہ دیکھے کہ اسکی اولاد رعیت کو نقصان دیگر تو اس شخص کو جو مفید ثابت ہو خواہ کوئی ہو ولیعہد بنا دے یہی وہ تھی

کہ راجہ دسرتھ نے علی الاعلان کہدیا تھا کہ اگر رعیت پسند کرے تو ولیعہد کو راجہ بنائے" اسی انتخاب کے سلسلہ میں راجہ دسرتھ کا دربار ملاحظہ ہو۔

جشن کا روز ہے اور آفتاب نکلنے سے پہلے وہ سورما جو راج کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے ہیں مدبر و دور اندیش جو الجھی ہوئی گتھیوں کو چٹکیوں میں سلجھاتے رہے دربار میں پہونچ گئے ہیں۔ خلقت کا یہ عالم ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں منڈل پر سونے چاندی کے کلس جگمگا رہے ہیں چوبدار روپہلی سنہری وردیاں پہنے دست بستہ کھڑے ہیں برہمن اور پروہت چندن کے تلک لگائے بیٹھے ہیں ولیعہد کا انتخاب ہوا رعیت نے پسند کیا ڈنکے پر چوٹ پڑی نیل پر منتر پڑھے گئے۔ اور ولیعہد کے جسم پر تیل ملا گیا ادھر گنگا جل سے غسل ہوا ادھر ہون شروع کیا گیا غسل سے فراغت ہوئی منہ پر مندر کی خاک کا بھبوت لگایا۔ گنگا جمنا کے سنگم کی مٹی سینہ پر پاؤں میں رتھ کے نیچے کی خاک لگائی اور گھی دودھ۔ دہی۔ شہد اور شکر پانچ امرت سے پھر غسل دیا۔ چاندی کی چوکی سونے کا ہزارہ (کیلاش) گنگا جمنا کے پانی سے بھرا ہوا موجود برہمن منتر پڑھ رہے ہیں راجہ غسل کر رہا ہے اور رعیت درازی عمر کے نعرے لگا رہی ہے +

غسل ہو چکا۔ لباس پہنا پروہت نے آگے بڑھ کر سونے کی راکھی (کنگنا) باندھا ترچی نے (سنکھ) بسار کیا دے شادیانے بجائے ولیعہد خلعت فاخرہ زیب تن کئے باہر برآمد ہوئے۔ رعیت کا جی دیکھکر باغ باغ ہو گیا۔ روپیہ لٹائے اشرفیاں نچھاور کیں۔ دریا دل راجہ نے خزانے کا منہ کھول دیا ہاتھیوں پر جلوس چلا رستے بھر خیرات ہوئی

شام کو کچے پکے کھانے تقسیم ہوئے ولیعہد کا انتخاب ختم ہوا۔

اس دور کے بعد سلاطین کا وقت آیا ان کے جشن کی تصویر مرحوم آزاد نے ایسی کھینچی ہے کہ جان ڈالنے کی کسر ہے۔ اکبر کے حال میں فرماتے ہیں جب دربار آراستہ ہوتا تھا بادشاہ باقبال اورنگ سلطنت پر جلوہ کرتا ہوتا تھا اورنگ ہشت پہلو موروں اور خورشید تخت تھا گنگا جمنی یعنے سونے چاندی کے عنصروں سے ڈھلا ہوا دریا نے دل پہاڑ نے جگر نکال کر پیشکش کیا لوگ سمجھے کہ الماس۔ لعل یاقوت موتیوں سے مرصع ہے سر پر چیتر زرکار و جواہر نگار جھالروں میں مروارید و جواہرات جھلمل جھلمل کرتے۔

دیوان عام و خاص کے گرد ۱۲۰ ایوان عالیشان تھے جن کی عمارت کو خوشنما اور بیش بہا پتھروں نے رنگین و سنگین کیا تھا ایک ایک ایوان ایک ایک امیر یا ندبیر کو عنایت ہوا کہ ہر عالی حوصلہ اسے آراستہ کر کے اپنی قابلیت اور ہمت کا نمونہ دکھائے سیماب منڈل کہ جلوہ گاہ خاص تھا سجایا گیا اور تمام مکانات کے در و دیوار کو پرتگالی بانات رومی و کاشانی مخمل۔ بنارسی زربفت و کمخواب۔ پیلے ڈوپٹے۔ تاش تامی گوٹے ٹھپے۔ پیچ مقیش کے خلعت پھنائے کشمیر کی شالیں اوڑھائیں ایران و ترکستان کی قالین پا انداز میں بچھائی شامیانے تانے آسمانی خیمے بلند کئے۔ مکانوں کے صحن میں بہانے آرگنا کاری کی +

روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت سبھ لگن میں ایک سہاگن بی بی نے اپنے ہاتھ سے دال دلی گنگا جل میں بھگوئی بیٹھی پیسکر رکھی جشن کی ساعت قریب آئی۔ بادشاہ اشنان کو گئے جامہ پہنا کڑکی دار پگڑی

راجپوتی انداز سے باندھی مکٹ سر پر رکھا جشن کی ساعت آئی برہمن نے ماتھے پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگن ہاتھ میں باندھا۔ کولے دہک رہی ہیں خوشبوئیاں تیار ہیں ادھر ہون ہونے لگا چوکے میں کڑھائیاں چڑھی ہیں ادھر اسمیں بڑا پڑا ادھر بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا۔

ان ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل و شعور کے بازار تھے جشن کے بعد زنانہ ہو جاتا اور محل کی بیگمات آتیں کہ ذرا ان کی آنکھیں کھلیں اور سلیقہ کی آنکھوں میں سگھڑاپے کا سرمہ لگائیں۔ نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھکر ایسا ہی خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے۔"

جن آنکھوں نے یہ سماں دیکھا موت کی نیند میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں اور آج شاہی جشن فقط کتابوں کے فسانے تھے۔ گولارڈ لٹن اور لارڈ کرزن کے درباروں نے، دربار کی بہاریں ہمکو بھی دکھادیں مگر ملکہ مرحوم اور شہنشاہ مرحوم کے موجود نہ ہونے سے اصلی خوشی میسر نہ ہوئی۔ شہنشاہ معظم کی تشریف لانے نے اس دربار کو واقعی دربار بنا دیا اور آنکھوں نے اس صورت کو دیکھ لیا دل جس کا شیدا تھا۔

جس طرح دلی کی سرزمین اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری پر اور تاریخ اس جشن شاہی پر ہمیشہ فخر کرے گی اسی طرح عمر کے یہ چند روز زندگی کی ہر ساعت و لمحہ پر اپنی عزت کا اظہار کریں گے۔

خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے

حامد

مکٹ دہنیاد

شری شکتیمان مہاراج دھراج ویش سوامی جارج پنجم مہارانی و مہرانی ویش دیوی بھارت ماتا۔ مہارانی میری

سن سن پون چلت چوبائی — کوشومت راج نویدن لائی
گھورت گرجت بنھ گھن برست — روپا برست کنچن برست
کال گیواب برست اولے — سگری پرجا موتی رولے
بادل جبومت بجری کرکت — ٹوٹ اشنت کی چھتیں وہرکت
مول کند بہوم ریجت ایسے — دیا کارن سجن جیسے
برست بادل کارے کارے — ندی تلاؤ اانٹ ہیں ہمارے
رہس رہس بنھ دامنی دمکت — آس پاس جل جگنوں چمکت
ڈالی ڈالی مولا گاوت — وید منتر جس بیر سناوت
دیکھت جھکت ہیں تین ڈوے — جل بنج جلج ہیں مدکے کٹورے
پھیلت چمپا اچیت بیلی — گرے پہنت سگری سہیلی
داور جھینگر گھن گن گاوت — مدہو کرن مدھر سن للچاوت
کرت پپیہا پی تو پی تو۔ — کویل کوکت کوکو کوکو
مورو انرت کرت بن ماہیں — کوسوں ڈہونڈت کا گانا ہیں
جنگل جنگل پھول کہلت ہیں — کند اسنبھ سے مول ملت ہیں
پنن پرایت ہیں بھے من بھولا — نرناری مل جھولت جھولا
دین رشی سکھی دیکھت بھورا — چندر سے جس آنند چکورا
گھن جل اتھاہ سمدر میں کیسے — گرہت گیانی ہری میں جیسے
دین دیان بنھ جگھٹ بادل — چندر لور سور جھ کو گہو گھٹ بادل

لندن وشاہجہاتما دھارن — سندر شوبھا راج کے کارن
دیس تمہارا جاج پنیے — راج کرو مہاپرلے تک تم
دھنی تکھت پد م دم دھارو — نت نت دھارو جم جم دھارو
جیو سے تن میں براجے تم ہو — راجوں کے مہاراجے تم ہو
ہمرے نین اور چرن تمھارے — جے جے دیس دیس بھاگ ہمارے
سکھ سین راج اشہان براجت — شوبھا راج تمہیں کو ساجت
ایشور سکتی کاج میں تمرے — سورج چھپت نہیں راج میں تمرے
دیس دیوی میری مہارانی — تمرے بیری کی جگ ہانی
بھارت ماتا کی ماتا تم ہو — دیش بدیش کی داتا تم ہو
دیش کی گوتہون کے سگرے بچے — تمرے سیوا کے ہیں سچے
تمری برہ میں سگرے مگن ہیں — راج سے تمرے لگائے لگن ہیں
تمرے بچے ودیا پاوت — راج استہان سے چت ہیں لگاوت
ودیا کا دیا بالا تم نے — کردیا دیش اوجالا تم نے
اتر دکھن پورب پچھم — برتش راج استہان گرت تھم
سین تمرے مکٹ ہے ایسے — مکٹ آکاش کا سورج ہی جیسے
بھاری بھرکم تمرا کھانڈا — دشٹ کا جس سے ہوت بھانڈا
دیش ہی تمری کرپا سیتی — جل کی شہران بھلت جس کھیتی
تمرے کو نیوت شامی رومی — تمری دیا میں جگت کی بھومی
مول تمہارا بیاج تمھارا — چکرورت ہو راج تمھارا
پرلے تک تم دیش میں دھارو — دیش کی نیا پار اتارو
دیش کا سدہ ہو کاج تمہیں سے — اسکو ملے سو راج تمیں سے

[illegible] سرکردہ [illegible] ادبیہ مطبوعہ [illegible] طلسمی [illegible]

دلّی کے دربار اور شہنشاہ معظم

تاریخ کا قول فیصل جشن کے متعلق یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک اور ملک کے ہر حصّہ میں ہر قوم اور ہر مذہب نے اپنے اپنے طرز معاشرت کے بموجب جشن منائے۔ گو اسلام کا ابتدائی زمانہ جشنوں سے بہت کچھ بچا ہوا ہے اور سکی بڑی وجہ یہ ہی معلوم ہوتی ہے کہ شاہی جشن ان کے ہاں اس لئے کوئی چیز نہ تھا کہ بادشاہ اور فقیر دونوں یکساں تھے ان کے ہاں کا جشن اور اعلان صرف خطبہ تھا، مسلمانوں میں یہ رسم شاہان مغلیہ کے عہد سے شروع ہوئی،

جشن کچھ جشن شاہی پر ہی مقرر نہیں ہے اکثر جگہ تہواروں کے موقعہ پر بھی جشن منائے جاتے تھے۔ یہ ایک قسم کی خوشی کا اظہار تھا خواہ تہوار ہو یا کوئی اور خوشی سب ملکر ایک جگہ جمع ہوئے اور جشن ہو گیا بلکہ اس مشہور مثل کو پیش نظر رکھکر کہ "مرگ انبوہ جشنے دارد" یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ جشن کے معنے مجمع کے ہیں جہاں احباب جمع ہو گئے وہی جشن ہے"

مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے اپنی محبوبہ شاہ ایپائرس کی لڑکی اولمپیس کو جو بالاخر اس کی ملکہ ہوئی ہے سب سے پہلے جسوقت دیکھا تو وہ تہوار منا رہی تھی، اور یونانی رسوم کے بموجب سانپوں کی پرستش کر رہی تھی۔

ہندوستان کے راجاؤں نے بھی جشن کا لطف خوب اٹھایا ہے، خاک پاک دہلی نے سب سے پہلا جشن راجہ یدھشٹر کا دیکھا اس کے بعد انقلاب زمانہ نے شاہان مغلیہ کے وہ وہ جشن دکھائے کہ آج کے دن تک تاریخ ان کے مزے لے رہی ہے، خطبہ جو ان کے مذہب کا سچا اصول تھا،

ان میں برابر قایم رہا جشن شاہی کے موقعہ پر ادھر خطبہ میں بادشاہ کا نام لیا گیا ادھر ڈنکے پر چوٹ پڑی اور رعیت کو معلوم ہو گیا کہ آج ہمارا ولیعہد تخت نشین ہوا۔

مسلمان بادشاہوں میں اورنگ زیب کا درجہ کتنا ہی ارفع و اعلیٰ کیوں نہو مگر رعیت کی دلداری میں صاحبقران ثانی شاہجہاں کا نام بھی اس سے کم نہیں ہے جس کا پہلا حکم جلوس کے بعد یہ تھا کہ خدائے وحدہ لاشریک کے سوا دوسرے کو سجدہ حرام ہے، میری رعیت اس حکم پر کاربند رہے اور مجھکو اپنے ہی جیسا انسان سمجھے، جلوس کے روز ۱۲ لاکھ روپیہ علماء و فضلا کو انعام دیا گیا اور اسقدر خیرات کیگئی کہ لوگوں نے اپنی ہولیاں بھریں دلی میں تاج برطانیہ کا یہ چوتھا دربار ہے جو اسوقت منعقد ہوا۔ اور جس میں شہنشاہ معظم خود تشریف فرما ہوئے اس سے پہلے سب سے پہلا دربار ۱۸۵۸ء میں نائب السلطنت لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں منعقد فرمایا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ معظمہ مرحومہ کا اعلان رعیت کے سامنے پڑھا۔ غدر کے ہولناک واقعہ کو چونکہ بہت تھوڑا وقت گذرا تھا اور رعیت ابھی تاج برطانیہ کے انعام و اکرام سے پوری طرح آشنا نہ ہوئی تھی اس لیے اس دربار میں ہندوستانی سرکار کی تعداد بہت کم تھی۔

سلطنت برطانیہ کا دوسرا دربار اس لحاظ سے کہ لارڈ کیننگ کا دربار تھا دربار نہ تھا پہلا دربار جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن نے دلی میں منعقد کیا جو ملکہ معظمہ کے خطاب قیصرۂ ہند اختیار کرنے کی خوشی میں تھا یہ دربار چودہ روز رہا اور تقریباً ستر والیان ریاست کی شرکت نے اس جشن کی رونق کو دوبالا کیا۔ اس دربار کی یادگار میں بعض رؤسا کو خطاب امیران قیصرۂ ہند

عطا ہوا اور علاوہ بعض مراعات کے سولہ ہزار قیدی ہندوستان کے جیلخانوں سے رہا کیے گئے۔

اس دربار سے پہلے جو اب منعقد ہو رہا ہے ایک اور دربار جو دلی میں تاج برطانیہ کا تیسرا دربار تھا ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے منعقد کیا جس میں شہنشاہ ایڈورڈ کی تخت نشینی کا اعلان ہوا اس دربار کی سب سے بڑی یادگار وہ جلوس ہے جو ہاتھیوں پر نکلا، سرکٹ ہاؤس بھی اس دربار کی بے نظیر یادگار ہے جو لارڈ کرزن کے واسطے نہایت تزک و احتشام سے تیار کیا گیا تھا،

گو دوسرے دربار میں لارڈ لٹن بھی ہاتھی پر نکلے مگر اس دربار میں تو ہاتھیوں کا ایسا جلوس نکلا ہے کہ اب شاید کبھی دیکھنے میں نہ آئے آگے آگے وائسرائے اور ان کے پیچھے تمام والیان ریاست، سب ہاتھیوں پر ان کی عماریاں اور جھولیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں، دو دو کے قریب ہاتھی اس جلوس کی قطار میں تھے اور ہر ہاتھی اور مہاوت سونے چاندی میں منڈھا ہوا تھا،

اب یہ چوتھا دربار شہنشاہ معظم جارج پنجم کا ہے یہ تشریف آوری ہندوستان میں حضور کی دوسری مرتبہ ہے پہلے بہ حیثیت شہزادہ ویلز اور اب بہ حیثیت شہنشاہ۔ ہندوستان کی زمین سے شہنشاہ معظم کو کو ہمیشہ انس رہا اور ہندوستانیوں سے آپ نے اس وقت بھی ہمدردی ظاہر فرمائی۔ جب آپ پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں واپسی پر جب گلڈ ہال میں آپ کو مدعو کیا گیا تو آپ نے فرمایا،

اگر ہندوستان کے طرز حکومت میں ہمدردی کی بو اور پیدا ہو جائے

تو وہاں کی حکومت نہایت سہل ہو سکتی ہے،،

تاج برطانیہ نے ان الفاظ کی اسقدر زیادہ وقعت کی کہ ہندوستان کی انتظامی کونسل میں ایک ہندوستانی ممبر مقرر ہو گیا،

جو صفتیں ایک بادشاہ میں ہونی چاہئیں وہ سب حضور میں موجود ہیں، رعایا کے ساتھ آپ کو اسقدر ہمدردی ہے کہ اس دربار کے متعلق جب پہلی تاریخیں تجویز ہوئیں اور حضور کو علم ہوا کہ عشرہ محرم کا روز ہے تو فوراً آپ نے تاریخیں تبدیل کرنے کا حکم دیا،

ایک دفعہ شہنشاہ معظم کسی گانوں میں تشریف لے جا رہے تھے ایک بڑھیا عورت شوق دیدار میں آگے بڑھی اس عورت کی عمر نوے سال سے اوپر تھی جوں ہی حضور کی نگاہ اس پر پڑی فوراً حکم دیا کہ گاڑی روک لو اور ترکر اس کے پاس تشریف لے گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے،

آپ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے سیاحت کا اسقدر شوق رہا کہ کسی بادشاہ نے اسقدر سیاحت نہ کی ہو گی جسقدر آپنے کی، جہازرانی میں آپ کو خاص ملکہ ہے اور نشانہ تو ایسا صحیح لگاتے ہیں کہ شاید ہی تمام انگلستان میں کوئی آپ کا نظیر ہو۔

۶ جنوری ۱۸۹۳ء کو حضور کی شادی ہوئی اور ۲۳۔ جون کو پہلے صاحبزادے پیدا ہوئے ۹۔ نومبر ۱۹۰۱ء کو آپ کو پرنس اوف ویلز کا خطاب ملا۔

رعایا نوازی حضور کی سب سے بڑی صفت ہے اور چونکہ طبیعت میں رحم کوٹ کوٹ کر فطرت نے بھر دیا ہے اس لئے آپ کسی کی تکلیف کو گوارا نہیں فرما سکتے۔ عرابی پاشا جب جلاوطن کر دیا گیا ہے تو دوران سیاحت میں آپ سے اس نے رحم کی درخواست کی آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ اسے وطن واپس آنیکی اجازت مل گئی آپ کی زباندانی کا تمام ملک میں شہرہ ہے۔

ملکہ معظمہ سے آپ بکمال محنت پیش آتے ہیں فرض شناسی کو نہایت مستعدی سے انجام دیتے ہیں حضور کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی ہیں اور شہنشاہ معظم و ملکہ معظمہ کو اپنے بچوں سے بے حد محبت ہے،

ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم ہمارے شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم کو معہ خاندان ہمیشہ خوش و خرم رکھے،

شیخ محمد اکرام

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاخیر اشاعت ایک ایسا بدنما دھبہ ہے جو پرچہ کی تمام خوبیوں کو زائل کر دیتا ہے، باوجود اس علم کے نومبر اور دسمبر کے پرچے وقت پر شائع نہ ہو سکے، جس کی وجہ سے ناظرین تمدن کو انتظار کی سخت تکلیف ہوئی،

ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم انکی اس تکلیف سے دم بھر کو بھی غافل نہیں اور جس قدر جلد ممکن ہوگا اس شکایت کو رفع کر دیں گے،

موجودہ حالات پر نظر ڈالتے ہوئے جنوری کے پرچہ کی بھی ہمیں امید نہیں کہ وہ وقت پر شائع ہو لیکن فروری کا پرچہ انشاء اللہ اپنے وقت پر شائع ہوگا اور فروری کی آخر تاریخوں میں ناظرین کی خدمت میں پہونچ جائے گا امید ہے کہ نومبر اور دسمبر اور جنوری کے پرچوں کی تاخیر مجبوری کی وجہ سے ناظرین تمدن معاف فرمائیں گے ؛

منیجر عصمت تمدن

(دہلی)

قصیدہ در تہنیت تاجپوشی

پلا ساقیا بادۂ خوشگوار
ہوئے گام فرسا شہ زی وقار

تھے مدت سے جسدن کے مشتاق ہم
ہوا فضل خالق سے وہ دن بہم

یہ وہ وقت آیا کہ ہر خاص و عام
حضوری میں حاضر ہوں سب ہر سلام

بڑے شان و شوکت سے آئے حضور
معہ ملکہ تشریف لائے حضور

سوار اور کوتل کی اک سو قطار
ہیں ہاتھی بھی اکثر صف آرا و کار

شتر اور بیلوں کا کیا ہو شمار
کہ وہ بھی ہیں حاضر قطار و قطار

ہے بگھی و ٹم ٹم کا اک سو جماؤ
فٹن کی کسی جا پہ چل چلاؤ

وہ فوجوں کی ہلچل وہ با جوں کا غل
کہیں بین بجتی کہیں ہے دہل

جدھر دیکھیو ہیں شامیانے کھنچے
فروش اور شیشوں سے سب ہیں سجے

ہے مقیش کے ڈوریوں کی طناب
فدا جسپہ ہو جان سے آفتاب

وہ بجلی کی قندیلیں ساری چڑھی
جسے دیکھ شرمندہ ہے مشتری

چراغاں کی ہر سمت اک دھوم ہے
صبح کا سماں گویا مفہوم ہے

گلی کوچے آراستہ ہیں تمام
ہے تاریکی شب کا مفقود نام

غریبوں کو خیرات بٹتی ہے آج
خوشی ہے فلک پر ہے اونکو مزاج

ہیں اطفال اسکول بھی شاد کام
ہے شیرینی کا بٹنا اونکو طعام

نہ پوچھو کہ کیا اندنوں عید ہے
یہ رنگ و سماں قابل دید ہے

ہوا جب سے آباد چیرخ کہن
یہ دہلی نہ تھی ایسی شک چمن

نئے سر سے دہلی میں آئی بہار
نئے طرز سے اس نے پایا نکھار

کبھی اسکو حاصل نہ تھا ایسا اوج — کہ لوگ آئے ہوں اسطرح اوج اوج

یہ خوشیاں شہنشہ کی آمد کی ہیں — شہ جارج پنجم کی آمد کی ہیں

وہ مقبول عالم شہ کامراں۔ — کہ ہیں جارج پنجم شہ خسرواں

ہیں والی لندن شہنشاہ ہند — کہ اکثر شہاں خوشہ چیں وے اہند

مکیں واں کے آراستہ ہیں تمام — جہاں ہوں فروکش شہ نیکنام

نشاط و خوشی کا ہے دن اندنوں — ہے معدوم رنج و محن اندنوں

شہنشاہ مع ملکۂ تاجدار — ہوئے رونق افروز باصد وقار

دسمبر کی بارہ و گیارہ کا دن — مبارک تو کر شہ کو اے ذوالمنن

فقط دہلی میں ہی نہیں یہ سماں — کہ معمور ہے اس سے ہندوستاں

یہ خوشیاں شہنشہ کے مقدم کی ہیں — یہ فیاضیاں جارج پنجم کی ہیں

کہ ہر قریہ و دیہہ رشک چمن — خوشی کرتے ہیں ہر گروہ مرد و زن

کہاں تک لکھوں تاجپوشی کا حال
کلیم اک غزل پڑھ بشوق کمال

مبارک تاجپوشی جارج پنجم — لعون خالق عالم و آدم

عدو برباد اور احباب خرم — رہیں زیر فلک جبتک ہے عالم

مبارک ہو تمکین شان و شوکت — بجے نوبت شہا تیری دمادم

تجھے اس ہند کی شاہی مبارک — جہاں میں تو ہے شاہ معظم

قیامت تک رہے یہ بول بالا — سدا سر پر ہمارے رہ تو قائم

رعایا پر سدا الطاف رکھنا — دعائے خیر لینا اُنسے ہر دم

رعایا جڑ ہے شہ مثل شجر ہے — اسی جڑ سے شجر رہتا ہے قایم

زمین و آسماں جبتک ہے شاہا — اوڑھے فضل خدا سے تیرا پرچم

+ یہ نظم خوشنصیب شاعر نے جارج پنجم شاہنشاہ معظم کی خدمت میں بھیجی تھی اور شاہنشاہ معظم نے اسکا شکریہ ادا کیا تھا

مہنجیں اندرا

آج سے کئی ہزار برس پہلے، جب یہ سنسار، موجودہ تمدن و تہذیب سے کوسوں دور تھا، گو آجکل کی بہت سی نعمتوں اور صنعتوں کا اس وقت ظہور نہ ہوا، مگر، نظام عالم کی صورت یہ ہی تھی جو آج صدیاں بیتنے اور جگ گذر جانے پر دکھائی دے رہی ہے، انسانی صورتیں ایسی ہی تھیں، بھلوں دل اسی طرح کے تھے، مگر دل میں جو جب تھا وہ اب نہیں، اور جو اب ہے وہ جب نہ تھا، پر یم اُن دلوں کا مسکن اور سچی محبت اُن لوگوں کی زندگی تھی، نیلا سفید آسمان جو آج سر پر چھایا ہوا ہے، جب بھی تھا، اور یہ ہی میلی کچیلی دھرتی جو اب پاؤں لگ رہی ہے، اُس سمیں بھی تھی، ان ہی دنوں کی ایک رات کا ذکر ہے آسمان پر سکون مطلق طاری تھا، چھوٹے چھوٹے تارے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور پورنماشی کا چاند جمنا کی لہروں کو تکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

دریا کے کنارے ایک جوگی کی منڈھیا تھی جس کے چاروں طرف زیت کے ذرّے چمک رہے تھے اندر ایک سادھو آسن جمائے اور پہلو میں ایک حسن کی دیوی خاموش بیٹھی تھی۔ اسکی سونی صورت سنگار کی محتاج نہ تھی قدرت نے اسکو اپنے ہاتھ سے گھڑا تھا ایک ہلکی سی ململی ساڑی اس کے نازک جسم کو چھپائے ہوئے تھی جس پر سیاہ اور لمبے بال ناگن کی طرح لہرا رہے تھے۔ سفید براق پیشانی پر ہلکے سے تلک نے موہنی مورت کو

چار چاند لگا دیے تھے۔ چاند کی روشنی منڈھیا من سے چھن چھن کر اس مہ جبین پر پڑ رہی تھی اور چاند اس کے حسن خداداد پر عش عش کر رہا تھا ہرن۔ بارہ سنگھے۔ چکارے۔ اس کے آس پاس کلیلیں کر رہے تھے۔ اور گو آرائش ظاہری کا اس کے حسن میں پتہ تک نہ تھا۔ مگر محبت کا سرمہ آنکھ میں جھلک رہا تھا۔

دریا، دریا کی لہریں، سو گئیں۔ منڈھیا کی پشت کے باغ پر اوس پڑنے لگی، کھلے ہوئے پھول پتوں پر سر رکھ کر لیٹ گئے، بلبل خاموش، بھونرے بیخبر، ہرن چوکڑیاں بھولے، اور منڈھیا کی اگنی جلتے جلتے راکھ ہو گئی، ایک عالم سنسان تھا کہ یہ نازنین انداز دلربایانہ سے اٹھی منڈھیا سے باہر آئی۔ چمکتے ہوئے چاند پر نظر ڈالی اور ایک ٹھنڈا سانس بھرتی ہوئی گلاب کے تختہ پر پہونچی۔ ہوا اپنی نازک انگلیوں سے زلف عنبریں کے لچھے بنا رہی تھی۔ اور چاند کا سایہ لب نازک پر پروانہ وار گر رہا تھا، گلاب کے کٹورا سے پھول چاروں طرف کھلے ہوئے تھے اور پچھلی رات کی ہوا خوشبو میں بسی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، نازنین ایک ایسی جگہ ٹھٹکی، جہاں ہوا کی بدولت چشمہ کا شفاف پانی ایک سدا بہار گلاب کے پھول کے لے رہا تھا، ٹھٹکی اور ٹھٹک کر تھمی، اور تھمکر بیٹھی، اور بیٹھکر اٹھی، اٹھی اور اٹھکر منڈھیا میں آئی، اور حسرت سے ایک کونہ میں بیٹھ گئی، نرگسی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر نرم اور نازک رخسار و پر بہہ رہے تھے، اور پیشانی کا مل قلب مضطرب کی دھڑکن ظاہر کر رہا تھا، ابھی یہ آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے کہ جوگی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا "اندرا!"

اندرا۔ ہاں مہاراج!

جوگی۔ من کی چنتا دور ہوئی؟

اندرا۔ ہے مہاراج میری منتی پر دھیان کیجئے اور اس دشواش کو من سے دور کیجئے۔ راجوں کے راج سری مہاراج میں آپ کی چیری ہوں، دیا کیجئے، اور میری لاج رکھہ لیجئے، ہے مہراج! وہ مانس نہیں تھا رامچندر جی کا اوتار تھا، سپنے میں درشن دیئے اور من موہ لیا

جوگی۔ اندرا! ہٹ جا! پرے ہو جا! تیرے جیو میں پریم نہیں! تو اشتری ہے، چاتر ہے، تو نے اے اندرا دہوکا دیا، میرے راج پاٹ کو دیکھ، یہ تمام سنسار ایک دم میں بھسم دوں، جلا دوں، راکھہ کر دوں، تو، اے اندرا تو، اور تیرا سپنا، سب بھسم ہو جائیں، جا! جا! جا! اندرا دور ہو جا!

(۲)

برسات کی اندھیری رات ہے، دل امنڈ امنڈ کر آرہے ہیں اور گھٹا جھوم جھوم کر برس رہی ہے، جمنا کے اس کنارے پر جہاں منڈھیا تھی ایک عالیشان محل بنا ہوا ہے۔ جوگی مہاراج کا جوگ ختم ہوا، آج وہ اس سرزمین کا راجہ ہے، بڑے بڑے رشی اور منی، گیانی اور ودیانی، ڈنڈوت کر رہے ہیں، گنگا جی کا اشنان، مہاراج کی سالگرہ، اندرا کی سواری دیوی کے مندر پر دیا بانٹے جاتی ہے، مہارانی اندرا کے حسن کا سکہ روئے زمین پر بیٹھا ہوا تھا، اس کی آن بان اس کی سج دھج یوں ہی ہزاروں دل پامال کر چکی تھی اسوقت اس کا بناؤ سنگار ایک قیامت تھی کہ ہزاروں [illegible]

کوہ نور کو شرمانے والے جواہر نگار بندے کانوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور سات لڑی کا نرے موتیوں کا گلوبند سینہ پر جھلمل جھلمل کر رہا تھا پکھراج اور نیلم کی چوڑیاں دستِ حنائی کے آگے سربسجود تھیں۔ گورا رنگ اور رنگ میں ملاحت زرین لباس گلابی رنگت کتابی چہرہ قاتل صورت آفت کی رفتار۔ قیامت کی گفتار محبت کی کہری قاف کی پری، نشہ عشق میں چور اندرا جنت کی حور راجہ کے روبرو پہنچی چرن سیے ڈنڈوت کی اور یہ اشیرباد دی مہراج کا راج پاٹ رہتے سنسار تک،

راجہ یوں ہی اندرا کے نام کا دیوانہ تھا صورت دیکھتے ہی دل ہاتھ سے نکل گیا، پچھلی باتیں بھول بسر گئیں، بے اختیار ہو کر اٹھا اور دیوانہ وار پیشانی کو بوسہ دیا،

راجہ۔ اندرا! مہارانی اندرا! اس موہنی مورت میں یہ من، اور اس من میں یہ کھوٹ،

اندرا۔ سری مہاراج! میرے من میں ہنس کی چنتا نہیں وہ راجہ جی کا ادنا سا ہنس کے برہ کی ماری ہوں اور اسکی چنتا دور نہیں ہوتی۔

راجہ۔ ہٹ، ہٹ، ہٹ جا! اندرا، چلی جا دور ہو جا،

(۳)

پرستش کے قابل ہے شاہجہاں آباد کی وہ مقدس سرزمین جس پر اندرا جیسی حسن کی دیویاں جو ایک عالم سے اپنی وفاداری کی داد لے گئیں پیدا ہوئیں! دنیائے تاریخ، ان متبرک ناموں کو آنکھوں پر رکھ کر ان کے کارنامو پر قربان ہوگی، اور جب تک فانی دنیا میں شاہجہاں آباد کا وجود ہے عشق اس سرزمین کا طواف اور محبت جھک جھک کر

سجدے کرے گی عقل رسا آج تک حیران ہے، قیاس کام نہیں کرتا اور ذہن مجبور ہے کسے امید تھی کہ رانیوں کی رانی خلوص کی راج دھانی جگ کی دلاری اندرا پیاری حسن کی کان، والی ملک کی جان، صرف اسی صورت پر جو خواب میں دیکھی عمر عزیز قربان کر دے گی!

شاہجہاں آباد والے اس کا احسان نہ مانیں، اور ہندوستان اس کے نام سے لاعلمی ظاہر کرے، مگر یورپ اس کی ہر ادا پر مٹتا رہا اور آج بھی کہ سینکڑوں ہزاروں برس گذر گئے یورپ کے عجائب خانے اس کی تصویر پر ناز کر رہے ہیں +

دلی اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ محبت کا پہلا فانوس اندرا کے ہاتھوں اس کے کھنڈروں میں روشن ہوا، ثابت قدمی نے اس کے جو صلے بڑھائے عشق نے تاج شاہانہ سر پر رکھا، اسی کا صدقہ ہے کہ آج اس وقت تک سینکڑوں خاندان اس کے نام سے پل رہے ہیں، راجوں کے راجا اور بادشاہوں کے بادشاہ جن کی آج ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں اس کا کلمہ پڑھتے رہے کس کا منہ ہے کہ اندرا جیسی مہ جبین پر بیوفائی کا الزام لگا دے۔ رانی نہیں چیری اور چیری نہیں کنیری سہی۔ مگر پہلو میں وہ دل رکھتی تھی جس پر آج کے دم تک حسن کی مجسم دیویاں شکریہ کے پھول چڑھا رہی ہیں۔

اللہ بس باقی ہوس! اندرا محبت کی لاج رکھ گئی! اور ایک عالم کو دکھا دیا کہ خاک ہندوستان سے ایسی وفادار روح پیدا ہوئی جس کا جواب دنیا کے باقی حصوں سے آج تک نہ ملا +

انتک نہیں تو اب اور کل تک تمہیں تو آج اسی ہندوستان والے

سینکڑوں ہزاروں اس مہ جبین پر جو محبت کی رسیا آنکھوں کو حسن کا جلوہ دکھا گئی جس کی ہر ادا بجلی کی طرح دلوں پر گری جس کا ہر انداز تیر کی مانند کلیجوں میں گھسا۔ بیوفائی کا الزام لگائیں گے مگر ان ہی سنگدلوں میں دو چار نہیں لاکھوں کروڑوں ایسے بھی نکلیں گے جو مہارانی اندرا کے اس استقلال کی داد دیں — مٹ گئی اجڑ گئی برباد ہو گئی سینہ پر خون کی ندیاں بہیں بڑے بڑے جاں نثار آنکھوں کے سامنے زمین میں لوٹ گئے مگر محبت کی دھن میں فرق نہ آیا نت نئے داغ کلیجہ پر لگے اور انوکھی انوکھی مصیبتیں سر پر ٹوٹیں لیکن جس صورت پر دل شار کیا اس کی یاد ہاتھ سے نہ دی۔

ہمیں اس لکھنے میں مطلق تامل نہیں کہ راجہ اندر کی اس دعا میں کہ اندرا ایک روز اپنے محبوب کے گلے لگے گی۔ سب سے بڑی سفارش اس کی سندر صورت تھی اور گوزمانہ کی رائے ہمارے موافق نہو مگر ہم علی الاعلان کہیں گے کہ راجہ جو کچھ بھی تھا انسان تھا اندرا حسن کی وہ پوٹ تھی کہ بارہا فرشتوں نے اس پر درود پڑھی +

ہم اب کہتے ہیں کہ اندرا گری پڑی عورت نہ تھی اندرا وہ نازنین تھی کہ کوہ نور جیسے ہیرے اس کے ادنیٰ خادم اور بخت طاؤس اس کا معمولی غلام +

زمانہ کتنا ہی بد تہذیب ہو جائے اور انصاف کی آنکھوں پر کیسے ہی باریک پردے پڑ جائیں، لیکن شاہجہاں آباد اور اس کی تونور دھرتی مہارانی اندرا کا نام تا دم واپسیں کلیجہ سے لگا رکھے گی۔

(۴)

موسم وہ نہیں مگر وہی جمنا کا کنارہ اور عالیشان محل، سہ پہر کا وقت ہے راجہ ایک طلائی مسہری میں لیٹا ہے پہلو میں رانی اندرا ہے، اور گوپی کا جگر حرارت عشق سے تڑپ رہا ہے مگر نازک ہاتھ راجہ کے سر پر مور چھل کر رہے ہیں۔ گرمی قیامت خیز ہے، لو کے تند و تیز جھونکے کائنات کی ہر شے کو جھلسا رہے ہیں، لیکن اندرا کی سندر صورت نے راجہ کو سب تکلیفیں بھلا دیں۔ تاج شاہانہ اندرا کی گود میں ہے اور محبت بھری نظریں اس کے رخ نازک پر!

راج دلاری نہیں فرشتوں سی پیاری اندرا اسوقت سبز لباس میں تھی موسم بہار اس کے قدموں پر نثار ہو رہا تھا اور نسرین و یاسمین اس کی گود میں لوٹ رہے تھے راجہ اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتا تھا۔ اندرا جیسی نازنین پہلو میں ہو تو رائے ضبط نہ رہا تو اٹھا اور کہنے لگا!

مہارانی، یہ سیس تیرے چرن پر ہے، دیا کر،

اندرا۔ ہے مہاراج! اندرا، باندی ہے، اس کی لاج تمھارے ہاتھ۔

اتنا کہکر اندرا نے اپنے دست سیمین راجہ کے گلے میں ڈالدیئے۔

در اور دیوار۔ آسمان اور زمین المختصر کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ راجہ کی تقدیر پر حسرت سے نظر ڈال رہا تھا، دونوں کی آنکھ سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ سبز اوڑھنی کا سرا اندرا کے سر سے ڈھلک کر کاندھے پر آپڑا تھا، حسن کی دیوی اس وقت محبت کی پوری تصویر تھی، ہاتھ راجہ کے گلے میں تھے اور دل یار دلدار میں،

(۵)

ان خیالوں کو مدتیں ہوئیں وہ باتیں کہانیاں اور وہ راز و نیاز فسانے ہو گئے، آج جمنا کی لہریں راجہ کی موت کا نوحہ پڑھ رہی ہیں، شہر پر ایک سناٹا چھایا ہوا ہے عالیشان محلوں کے سر بفلک کنگرے اپنے مکین کے فراق ابدی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں۔ سدا بہار اور رنگ برنگ کے پھول جن کی خوشبو آسمان تک اڑتی تھی پامال ہو گئے اور وہ بار آور سرسبز ڈالیاں جنپر طائران خوش الحان نغمہ سنجی کرتے تھے اندرا کی بیوگی کا ماتم کر رہی ہیں، آدھی رات کا وقت ہے اور اندرا صرف ایک قمقمہ کی روشنی میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے، راجہ کا صدمہ اسکے دل سے زائل ہو چکا، مگر خواب کی صورت وہ مستقل لگن ہے جو کسی طرح فراموش نہیں ہو سکتی کلیجہ میں ہوک اٹھتی دل میں نشتر چبھتے حلق پر چھریاں چلتیں مگر رات کسی طرح ختم نہیں ہوتی، دل بہت زیادہ تڑپتا تو اٹھ بیٹھتی، ٹہلتی پھرتی ادھر جاتی ادھر جاتی دیوانہ وار ایک ایک طرف جھانکتی، اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتی آسمان تاروں کا تہال لیے اندرا کے سر پر کھڑا تھا کچھ دیر اس میں محو رہی اور دفعتہً چلا اٹھی +

جھمکو، جھمکو، آسمانی تاروں، اندرا کے سر پر جھمکو، اڑو، اڑو، ہوا کے جھونکو فضائے عالم میں اڑو، اڑو اور اندرا کی ہنسی اڑاؤ، بھیگ، بھیگ، شب سیاہ! اچھی طرح بھیگ، اور اندرا بدنصیب کو، غرق نا امیدی میں بھگو، آ! آ! صبح قیامت آ! رات کا دامن اور اندرا کا سینہ چاک کر، اٹھا! اٹھا، ظالم آسمان، اپنی کشش سے اندرا کو

اُٹھالے، جذب کرلے، غارت کردے،

(۶)

اثر محبت کی قائل ایک دنیا اور کشش قلب کا معترف ایک عالم سہی، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اندر اجیسی رانی جس نے دعوئے عشق میں راجہ جیسے عاشق زار کو قربان کیا کامیاب نہ ہوتی۔ اندر اعشق زلیخا کی سچی مثال تھی جس طرح ثابت قیدی نے زلیخا کو یوسف کے گلے لگادیا یقیناً اندرا اس محبوب کی محبوب ہوتی۔ جسکو خواب میں دل دے بیٹھی مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود کو صورت سے آشنا تھی مگر نام ونشان سے مطلق بے خبر۔

ایک زمانہ اسی طرح گذرا، ہوا کے جھکڑ چل چل کر رکے بادصبا سرسرا کر بند ہوئی، مینہ کی جھڑیاں برس برس کر تھمیں، اور خطرناک طوفان آآ کر ٹلے مگر نہ تھما آنکھ کا آنسو تو اندرا کا جس کو دنیا اندھیرا اور شاہی محل مٹی کے ڈھیر تھے، رات کے سنسان وقت میں سر پر بجلی اور طوفان، آنکھ کے سامنے جنگل اور بیابان، اندھیرا گھپ، در و دیوار چپ، پتے بھوش، چڑیاں خاموش، اور اندرا بدنصیب، یا حبیب میں سراسر مضطرب و بیقرار، پہرہی ہے، ایک رات تن تنہا، کنہیا کے خطرناک جنگل میں تھی کہ نیند نے غلبہ کیا، زمین نے میزبانی میں فرش خاکی بچھایا، دریا کے پانی نے ترانے سنائے، ہوا نے لوری دی، اور کنہیا کی مہمان، اسی خارستان میں سر رکھکر لیٹ گئی، لیٹنا تھا کہ آنکھ لگی، اور آنکھ کا لگنا تھا کہ ایک اور ہی سماں آنکھ کے سامنے تھا،

ملک نیا، لوگ انوکھے، صورتیں عجیب، پوشاک نرالی، وقت رات کا ہے مگر اندرا آج چودھویں کے چاند کو مات کررہی ہے، سر پر کا رجوتی

دوشالہ گلے میں جواہر نگار مالا۔ گلاب کا پھول ہاتھ میں، سات سہیلیاں ساتھ میں ایک عالم کے دلوں کو پامال کرتی چلی جارہی ہے۔ چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں کی رات پر دن صدقہ ہو رہا تھا، جشن شاہی کی تیاریاں تھیں، اور ہزارہا بندگان خدا مسلح کھڑے تھے، اندرا کا پہونچنا تھا کہ خلقت جشن و جلوس سب بھول گئی، ایک چشم زدن میں کئی لاکھ نگاہوں نے اس کی سلامی ادا کی، سینکڑوں دل پامال کرتی ہوئی، اندر، قصر شاہی میں پہونچی، دیکھتی کیا ہے کہ ولیعہد سلطنت کے دائیں ہاتھ پردہ چاند چمک رہا ہے جس کی عاشق زار تھی، دل بے اختیار ہوگیا، صبر کی دھجیاں اڑنے لگیں قریب تھا کہ دوڑ کر لپٹ جائے شرم و حیا نے پاؤں پکڑے کھڑی ہوگئی مگر ششدر، ہانگا اس چہرہ پر تھی جس کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی، اور جام محبت سے لبریز دل چھلکنے والا تھا، کہ بادشاہ اور ولیعہد مہمان اور میزبان ایک ایک کرکے رخصت ہوئے،

اب اس عالیشان محل میں اندرا اور مقصود کے سوا کوئی نہ تھا محبت بھری نظریں ایک دوسرے کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں، دلوں کی کشش نے روز کیا اور اندرا کی آہ رسا تاثیر لائی چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ مقصود فرط محبت میں لپکا گو ولیعہد کا لڑکا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اندرا بھی مہمانی ہے مگر عیب حسن تھا یا داب شاہی محبت کی زنجیر پاؤں میں آپڑی بڑھا اور ہاتھ پکڑ لیا،

اندرا۔ اس مہمان نوازی کا شکریہ قبول فرمایئے۔

مقصود پیاری، اندرا، میرا منہ نہیں کہ آپ کی تکلیف کا شکریہ ادا کرسکوں، آیئے آیئے اس تخت پر آرام فرمایئے،

اندرا۔ میں خاک کی رہنے والی تخت شاہی کی قدر کیا جانوں، یہ خدا آپ کو نصیب کرے۔

مقصود۔ خدارا مجھ پر ظلم نہ کیجئے، میرے پاس نہیں تو دوری سہی، لیکن! انصاف اجازت دے تو قلب مضطرب پر ہاتھ رکھ کر اتنا دیکھ لیجئے، کہ یہ حسن خداداد مجھ پر کیا اثر کر گیا،

خوشا نصیب، اس مجھ ہی جیسے انسان کے حواس صورت کا پرستار اور اس نازک دل کا مختار ہو۔

اندرا کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ بلبل نے کنہیا کے جنگل میں صبح کا پیغام پہونچا دیا آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا،

(۷)

چاند؟ نہیں! پری؟ نہیں نہیں! حور؟ ہرگز نہیں! اندرا ایک پھول تھی کیسا پھول؟ جس نے تمام دنیا کو مہکا دیا! جس کی خوشبو پورب سے پچھم اور اُتر سے دکھن تک پہونچی، جس کی خوبصورتی کا شہرہ، جس کے حسن کی دھاک ایک عالم میں بیٹھی،

آفتاب کو نکلے مشکل سے دو گھڑیاں ہوئی ہونگی، کہ قبیلہ لنگوہی کا مشہور سردار، صبح شام ایک کرتا ہوا شاہجہاں آباد پہونچا، اور جمنا کے کنارے ڈیرے ڈال دیے کیسی کیسی مشاطائیں جو آسمان میں تھگلی لگائیں، زر و جواہر لٹا کر مہیا کیں، کہا جو کچھ کہہ سکتا تھا اور کر ڈالا جو کچھ کر سکتا تھا لیکن عشق کا وہ طوق جو اندرا کے گلے میں خواب نے، ڈالا اتر نہ سکا، کوئی خوشامد کوئی منت کوئی ظلم، کوئی سختی، ایسی نہ تھی جس سے کام نہ لیا ہو، ظالم محبت کے بہیس میں نفس کا بندہ نکلا اور لنگوہی خاندان کی عزت پر

ایسا دھبہ لگایا کہ تاریخ اسکو فراموش نہیں کرسکتی، اندر لکے جاتی چن چن کر پکڑے اور وہ قدیم نمک حلال جو اس کی عزت کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے تھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے دکھا دکھا کر مارا اور بتا بتا کر پیٹا مگر واہ رے مہارانی اندرا، استقلال کے پاؤں اپنی جگہ سے نہ ٹلے،

(۸)

زر، زمین، زن، کہتے ہیں، کہ یہ تین چیزیں جھگڑے کی اصل و فساد کی جڑ ہیں، سچ، جھوٹ، خدا جانے، مگر اس میں کلام نہیں کہ اندرا کو اس کا حسن مصیبت ہوگیا، ایک صورت اور سینکڑوں عاشق زار، ایک انار اور صد بیمار، کس کس کو آغوش میں لے، اور کہاں کہاں دلداری کرے خدا خدا کرکے راجہ کے قبضہ سے نکلی سمجھی تھی کہ اب باقی عمر اطمینان سے بسر ہوجائے گی۔ وصل نہوگا تو فراق کی سختیاں تو ہونگی دکھ بھروگی مصیبتیں جھیلوں گی رقیبوں کا کھٹکا اور ان آسمانی بلاؤں کا خوف تو نہ ہوگا، موت آئے گی مرجاؤں گی اور یہ کہتی ہوئی اٹھوں گی ؎

حاصل عمر خدائے سر بازے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

مگر افسوس اس ظالم نے وہ ستم توڑے کہ کلیجہ منہ کو آگیا،

دوپہر ڈھل چکی تھی کہ قصائی چاروں طرف قتل عام کرتا ہوا اندرا کے محل میں گھسا، بدنصیب رانی کا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا، سوچتی تھی کہ اب عصمت کا خدا ہی حافظ ہے مدتوں کے سورما اور وفادار جو مرتے تھے اور اشارے پر جان نثار کرنے کو موجود تھے جانیں قربان کرگئے۔ کوئی بادشاہ نہیں کوئی حاکم نہیں کہ فریاد کروں اور جان بچاؤں چھپ ساڑھی چھپ

برس کا دیو رہے موذی نے اسے کیا چھوڑا ہوگا سبب فساد تو میں ہی ہوں میری وجہ سے نہیں تو میرے سبب سے یہ ہزارہا لاشیں خون میں تڑپ رہی ہیں، اتنا کچھ دیکھ چکی اور کیا کیا دیکھوں گی، بس اس دنیا کو خیرباد کہوں، محل کے نیچے جمنا کس آن بان سے بہہ رہی ہے اس کی لہریں گود پھیلا کر مجھے لیں گی اور یہی اکڑتا مچلتا پانی اس پیاری صورت تک یہ پیغام پہونچا دیگا کہ اندرا بدنصیب تجھ پر قربان ہوگئی، مگر آنی دور کیوں جاؤں، کانوں کے آویزے چھنگلیا کی انگوٹھی سر کا سیس یہ تینوں ہیرے جواب تک حسن کو ترقی دیتے رہے آج زائل کر دینے کو کافی ہیں،

ابھی اس خیال کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ قزاق قصر شاہی میں گھس آئے اور قتل عام کر دیا سنگ کی سہیلیاں اور ساتھ کی کھیلیاں آنکھوں کے سامنے لٹیں اور بھروسے کے نمک حلال دیکھتے دیکھتے خون میں نہا گئے، بیرحم جلاد نے اب خاص کمرے کا رخ کیا۔ قدم دھرنا تھا کہ اس صورت سے چار آنکھیں ہوئیں جس کا شہرہ ہزاروں کوس کی منزل سے کھینچکر لایا تھا،

مہ جبین اندرا اس وقت میلی کچیلی کرتی ملگجی سی اوڑھنی اوڑھے تصویر کیطرح کھڑی تھی، مگر یہ موہنی صورت اس حالت میں بھی غضب ڈھا رہی تھی، غریبوں کے خون کے قطروں نے افشاں دیکر پیشانی کو جبین عروس کر رکھا تھا سنگدل سردار نے ایک آہ سرد بھری اور چلائے اندرا کا نعرہ لگا کر بڑھا،

قیامت خیز وقت تھا کہ اندرا جیسی نازنین کو بچاؤ کی صورت نظر نہ آتی تھی مگر واہ رے حسن اور مرحبا رعب حسن اس موقعہ پر بھی وہ کام دیا

کہ تیر و تفنگ سب ہاتھ رکھے کے رکھے رہ گئے، اندرا کا اتنا کہنا ایک بجلی تھی کہ ظالم دل پر اس طرح گری کہ جلا کر خاک کر دیا،

"آیئے آیئے، اور اس ستان محل کو رونق دیجئے"

اندرا جیسی دلربا کے لب لعلین سے یہ الفاظ ایک جادو تھا کہ سردار کے اوپر پورا کارگر ہوا۔ اس کی صورت اور اپنی قسمت کا مقابلہ کرتا تھا، دل خوشی کے مارے ہاتھوں اوچھل رہا تھا اتنا کہکر پاؤں میں گر پڑا،

بیگم بہت روز تک مصیبت بھگتی، اب کچھ دن جوانی کے لطف دیکھو

اندرا۔ (پاؤں سے سر اوٹھا کر) آپ ایک قبیلہ کے سردار اور ایک ملک کے حاکم ہیں سینکڑوں ہزاروں لاکھوں رعیت آپ کے پاؤں پر سر رکھتی ہے سر اُٹھایئے اور میری عزت افزائی کیجئے،

سردار۔ بیگم! کامل تین سال سے اس صورت کی شہرت نے دل تڑپا رکھا تھا آج دیکھنی نصیب ہوئی، کیا میری تقدیر اس قابل ہے کہ آپ میرے ہمراہ میرے قیام گاہ پر تشریف لے چلیں،

اندرا۔ یہ گھر بھی آپ کا اور وہ گھر بھی! مجھے لے چلئے یا خود تشریف لایئے، بہتر ہوگا کہ مہمان نوازی کی عزت میں حاصل کروں اور اجازت دیجئے کہ شام تک اس جھونپڑی کو آپ کے قابل بنانے کی کوشش کروں۔

سردار۔ بیگم میں محل اور عزت کا طلب گار نہیں صرف اس صورت کا بھوکا ہوں جس نے مجھکو دیوانہ کر دیا تعمیل میں عذر نہیں، جاتا ہوں شام کو حاضر ہونگا۔

خدا کی شان جس سرزمین پر تمام دن خون کے دریا بہتے رہے

بہتے رہے وہ رات کو نمونہ جنت بن گئی، اندرا کہنے کو تو عورت تھی مگر مردوں سے زیادہ کام کر گئی اور اس حال میں کہ نوکر چاکر غریز اقارب سب لقمۂ اجل ہو چکے تھے، اس افراتفری اور غدر کے موقعہ پر چٹکی بجاتے میں محل دو محلے سب سجا لیئے، آرام گاہ امر واقعی یہ ہے کہ جنت کو مات کر رہی تھی طلائی مسہری گنگا جمنی پردے، سنہری ڈوریاں، روپہلی، تکیے، موتیا کے گجرے چنبیلے کے گنٹھے، المختصر سردار لنگوہی کی آنکھیں ہی رانی اندرا کا ٹھاٹھ دیکھکر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس سامان پر طرہ اندرا کا اپنا دھانی لباس تھا

کہے تو کہ شب چاند نے آن کے نکالا ہے منہ کیت سے دھان کے

سردار صورت دیکھتے ہی بیقرار ہو گیا سامان نے تاب موجود تھا اندرا کے نازک ہاتھوں نے مہمان نوازی کی،

رات آدھی کے قریب گذر چکی تھی کہ ظالم سردار کے دست شوق آگے بڑھے اور مہ جبین اندرا کو پہلو میں کھینچا،

تعجب ہوتا تھا کہ کس طرح قول کی پکی بات کی پوری دھن کی سچی اور دل کی اچھی اندرا مہ جبین اس ظالم کی مہمان نوازی کر رہی ہے دفعۃً خنجر آبدار نازک ہاتھوں سے باہر نکلا اور چشم زدن میں سفاک سردار کی انتڑیاں باہر نکال کر پھینکدیں اتنی آواز تو سنائی دی،

"اے ظالم دغاباز اس صورت پر یہ دھوکہ"

(۹)

حسن کی ڈنکا تو چار دانگ عالم میں بج ہی چکا تھا اس سے ایک دنیا اندرا کی شجاعت کا لوہا مان گئی،

اب مجروح دلوں کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اظہار محبت بے سوچے سمجھے کر بیٹھتے

انداز دلربائی وہی اور موسم شباب بہار پر تھا چشم کافر جدھر پڑتی تھی دل کے ٹکڑے اڑا کر ہٹتی تھی۔ ہزار دل شہید پیدا ہوئے مگر دل کا ارمان دل میں رہا ایک روز شام کے وقت گرمی کے موسم میں نہا دھو کر محل کی تیسری منزل پر کھڑی ہوئی بال سکھا رہی تھی زلف شبگوں سے رنگ برنگ کے موتی ٹپک رہے تھے کہ ایک زابلستانی مصور ادھر سے نکلا اندرا کو علم تک نہ ہوا اور مصور تصویر لے سیستان روانہ ہو گیا،

یہ تصویر صحیفۂ قدرت کا ایک ورق تھا جس میں صناع حقیقی نے اپنے ہاتھ سے گلکاری کی تھی زلف شبگوں افعی کی طرح لہراتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھی اور دست سیمیں کی تین انگلیاں اس سانپ کو کھلا رہی تھیں ایک سیستان و زابلستان کیا تمام فارس لٹو ہو گیا مگر لنگوہی سردار کا انجام سنکر کس کی ہمت تھی کہ ادھر کا رخ کرتا ہاں وزیر جنگ کا لڑکا نادرالدولہ جان پر کھیل گیا اور دن رات ایک کرتا ہوا دلّی پہنچا، اور کامل تین روز وہ قتل عام کیا کہ آسمان اور زمین دونو چلا اٹھے۔ لنگوہی مظالم ازسرنو زندہ کر دیے۔

ہم آتشامان لینے کو تیار ہیں کہ جسوقت زابلستانی شجاع اس مہ جبین کو بارگاہ شاہی میں لائے ہیں اور نادرالدولہ اس کے آغوش میں سر رکھے لیٹا ہے تو چشم سیاہ سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے مگر یقیناً ہم زابلستانیوں کے اس دعوے کو صحیح نہیں مانتے کہ اندرا ان کے وزیرزادے کو دل دے بیٹھی مانا کہ ہزار دو ہزار میں ایک دیکھنے دکھانے کے لائق حسین و شکیل طرحدار و وضعدار سب کچھ تھا، مگر اندرا کے دل کو کچھ اور ہی لو لگی ہوئی تھی یہ آنسو محبت کے نہیں رنج اور صدمے کے تھے جو مقصود کے فراق میں

اندرا کی آنکھ سے نکلے اور وزیرزادے کے رخسار پر گرے،

واقعات آنکھ کے سامنے ہیں، معاملات کی شہادت پرزور بلستانی ہوں یا ہندوستانی صائب الرائے خود ہی فیصلہ کرلیں،

نادرالدولہ جب ہر کوشش میں ناکام رہا اور یہ یقین کرلیا کہ مواصلت کی امید مطلق خبط ہے اندرا خودکشی پر آمادہ ہے تو اسی شخص نے جو عشق کا مدعی تھا اس کے تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، یہ اندرا کی خوش نصیبی ہے کہ وزیرزادہ عصمت سے نامید ہوکر زروجواہر کے پیچھے پڑا اور اندرا غریب کو لوٹ کھسوٹ کر کھک کرکے چلتا ہوا۔

(۱۰)

لیلیٰ کا شیدائی مجنوں، شیریں کا فدائی فرہاد، مگر اندرا کے گھائل ہزاروں اور لاکھوں ہندو مسلمان عیسائی، ہر قوم میں اس کے عاشق اور ہر ملک میں اس کے طلب گار پیدا ہوئے اور اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی کرنی میں کسی نے کسر نہ کی ان دو ظالموں سے چٹکارا ہوا تو مرہٹوں نے ڈورے ڈالے، ایک شقی القلب تو دن دہاڑے گھر میں گھس آیا اور ایسے ڈیرے ڈالے کہ نکلنے کا نام ہی نہ لیا نت نئے سوانگ بناتا اور طرح طرح کی چالیں چلتا، کامیابی کی کوئی کوشش ہاتھ سے نہ دی ظلم کیے تو وہ حد کے مکاری کی تو وہ پوری، لیکن، سچی محبت کا گھائل، وہ اچھا دل جو اندرا پہلو میں رکھتی تھی کسی طرح نہ پسیجا، اور جو جس راستہ آیا اسی راستہ چلتا ہوا،

پڑھنے والوں! فراق کی سختیاں ختم ہوئیں، داستان مصیبت سن لی، شب وصل کے مزے بھی لوٹ لو، ۷۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کی صبح ہے اور آج مہ جبین اندرا نک سے سکھ ہنا دوپہن اوڑھ انتظار یار میں گھڑیاں گن رہی ہے

زیور سے لدی پھولوں میں بسی، عطر میں ڈوبی، وہ حسن کی پوٹ جس نے ہزاروں کے دل لوٹ پوٹ کیے جھروکوں میں بیٹھی دریا کے اس پار دیکھ رہی ہے، آسمان اس کے استقلال و صداقت پر، لطافت کے پھول نچھاور کر رہا ہے، قلعہ معلی کے در و دیوار اس کے انتظار میں شریک ہیں اور جمنا اسکی کامیابی پر مبارک باد کے نعرے لگا رہی ہے، مشرقی میدانوں سے آفتاب عالمتاب کے بلند ہوتے ہی ثابت قدمی کے مبارک فرشتے آسمان محبت سے نیچے آئے خلوص کی کشتی عصمت کے خلعت فاخرہ سے جھلمل جھلمل کرتی ہاتھ میں تھی، اور وفاداری کے گجرے ارمانوں کی ہوا میں مہک رہے تھے،

خوشا نصیب! سرزمین شاہجہاں آباد! ایک اندر کی بدولت، تیری شان و شوکت، کاڈنکار دے زمین پر بجگیا، کفران نعمت گناہ کبیرہ ہے اسی کا طفیل ہے کہ جمنا کا وہ کنارہ جو ببول کے کانٹوں سے پٹا پڑا تھا آج گلاب کے پھول گود میں لیے کھڑا ہے، بیلے جیسے خارستان، اور کوٹلے جیسے بیابان، اسی کے صدقہ میں چمنستان ہوگئے، شاہجہاں آباد! اگر تیرے کھنڈر ان خزانوں سے مالامال تھے جن کا اب دنیائے ادب میں کال پڑگیا، تو تیرے باغیچے آج ان رنگ کے پھولوں سے شاداب ہیں جن کی مہکار آسمان تک پہونچ رہی ہے، شاہجہاں آباد انصاف کی آنکھیں کھول، تعصب کی عینک دور کر، اور تامل کی نظر سے دیکھ، اسی سہانی صبحکو، نورانی فرشتے، تیرے اجڑے ہوئے گلشن میں نازل ہو رہے ہیں، دیکھ، دیکھ، شاہجہاں آباد دیکھ، تیری نازوں کی پلی مہ جبین اندرا کی بارگاہ آج محبت کے فرشتوں کی سجدہ گاہ ہے دونو فرشتے جھک گئے،

آگے بڑھے، اور اپنے ہاتھ سے اندرا کو دلہن بنایا،

(۱۱)

۷۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ٹھیک گیارہ بجے جبوقت شہنشاہ معظم نے سلیم گڈھ سٹیشن سے اتر کر قلعہ معلی میں قدم رکھا ہے دلی کی سرزمین خوشی کے مارے اچھل پڑی اور یہ آواز سنائی دی

"میں اندرا نہیں" "اندر پرستھ" "اندر پرستھ" نہیں "شاہجہاں آباد" "شاہجہاں آباد" نہیں دلی ہوں۔ وہ جوگی راجہ بدھسٹر لنگوہی کا سردار۔ تیمور وزیرزادہ نادر اور مرہٹہ سیواجی تھا، جنھوں نے مجھے لوٹ مار کر برباد کیا، اور آج یہ مبارک قدم میرے محبوب کے ہیں جس کو خواب میں دیکھا،

آج میرا مطلوب ایک عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ ہے اس کے قدم میرے سر اور آنکھ پر ہیں، میں اندرا نہیں اندر پرستھ ہوں۔

"خدا میرے شہنشاہ کی عمر دراز کرے"

راشد الخیری

شہنشاہ بیگم ملکہ معظمہ میری ۲۶ مئی ۱۸۶۷ء کو پیدا ہوئیں کنگسٹن محل میں تربیت ہوئی اور والدین نے اخلاق کی درستی اور ہمدردی کا ایسا بیج طبیعت میں بو دیا کہ آپ اسوقت تمام انگلستان میں خلیق و رحیم مشہور ہیں شہنشاہ بیگم کو اپنے بچوں کے ساتھ بیحد محبت ہے مگر کتب بینی کا شوق اسقدر زیادہ ہے کہ فرصت کے وقت میں ضرور کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ فرماتی رہتی ہیں نقاشی اور سوزن کاری میں قیصرہ معظمہ کو غیر معمولی درجہ حاصل ہے۔

ہر سال معصوم اور اپاہج بچوں کے لیے خیرات کی ایک رقم عطا فرماتی ہیں، ایک دفعہ ایک بچہ کو جو دق میں گرفتار تھا پیار کیا اور اس کی حالت دیکھکر دیر تک روتی رہیں۔ خدا ایسی مہربان قیصرہ کو ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے ✤

قصیدہ تہنیت جشن تاجپوشی اعلیٰ حضرت جارج پنجم شاہ قیصر کہ بدار الخلافۂ دہلی العقاد یافتہ

از تصنیف مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس شہر میرٹھ

صبح صادق کا کھلا ایوانِ بار — مثلِ ایوانِ سلاطینِ کبار
تبکدوں میں جا بجا بجنے لگے — نوبت و ناقوس و طنبور و ستار
گونج اٹھا بامِ کلیسا کا جرس — خوابِ نوشیں کا ہوا زائل خمار
صحنِ مسجد سے لگا ہونے بلند — نعرۂ "اللہ اکبر" بار بار
تھا وہ منشورِ نویدِ عافیت — پڑ گئی اطرافِ عالم میں پکار
نور و سایہ کی بڑھی ہمسائیگی — گویا ہمرنگ ہیں لیل و نہار
امتزاجِ کیمیائی ہو گیا — تھی دو رنگی روز و شب کی ناگوار
چاہتی تھی دیدۂ بالغ نظر — یہ نمائش گاہِ صنعِ کردگار
تھا خضوعِ دل سے مشغولِ دعا — صومعہ میں زاہدِ شب زندہ دار
چشمِ معنی یاب سے اس نے بغور — دیکھ کر یہ قدرتی نقشِ نگار
دفعتہً کی جانبِ مشرق نظر — ہو چلا سب رازِ پنہاں آشکار
آمد آمد شاہِ خاور کی ہوئی — کوکبِ دری لگے ہونے نثار
نہضتِ رایاتِ شمسی کی خبر — پے بہ پے دینے لگے کرنوں کے تار
نیّرِ اعظم ہوا با تاجِ زر — جلوہ گر بالائے مینائی حصار

جگمگائے شہر کے دیوار و در — گنبد و بام و منار و کوہسار
دور سے سب کو نظر آنے لگی — بارگاہِ قیصرِ والا تبار
ہو رہی ہیں جشن کی تیاریاں — کارفرما شوق سے مصروف کار
خیلِ سرہنگانِ شاہی چاق و چست — برق سے چالاک تر موٹر سوار
اپنے منصب پر کمربستہ نقیب — اپنے عہدہ پر نگہباں چوبدار
ہیں پیادوں کی صفیں دیوار چین — سدِّ اسکندر سواروں کی قطار
ہر سپاہی طغرل و الپ ارسلاں — ہر پیادہ رستم و اسفندیار
توپ خانہ اژدرِ آتش فشاں — سامنے جس کے ثریٰ رو میں غبار
راس و چپ ایمانِ دولت کا ہجوم — گردِ شمسِ قیصری سیّارہ وار
ملکۂ دوران و خاقانِ زماں — مہرِ عالمتاب و ماہِ نور بار
جلوہ فرمائے سریرِ سلطنت — با شکوہ و شان و اجلال و وقار
صفِّ قوسی میں شہ کے روبرو — داورانِ ذی حشم ذی اقتدار
خیلِ خیلِ خان و رایان و ملوک — جوق جوقِ سرفرازانِ دیار
نام بردارانِ طبقاتِ انام — عامۂ مخلوق بھی چندیں ہزار
ہند کے خطوں کا یک بستہ جلو — حاضرِ خدمت قطار اندر قطار
سب نے اعلانِ شہنشاہی سنا — گوشِ رغبت کا بنایا گوشوار
ہو مبارک تجکو اے ہندوستاں — جارج پنجم کا یہ عہدِ زرنگار
رونق افروزیِ شاہنشاہ نے — تجکو بخشا ہے وہ عزّ و اعتبار
لعلِ دیہیمِ شہنشاہی بنا — تا فلک پہونچی کلاہِ افتخار
مدتوں سے سرزمینِ ہند تھی — تشنۂ دیدِ جلوسِ شہریار
للہ الحمد آج دیکھا خلق نے — شاہ کو گلگونِ دولت پر سوار

شاہ کی آمد ہے شاہِ انبساط ہر خوشی ہے اس خوشی سے مستعار
چاندنی چوک آج آئینہ بستہ ہے سال بھر سے تھا سراپا انتظار
آج درشن کا جھروکہ کھل گیا خلق نے دیکھی شکوہِ تاجدار
آج بیلہ میں جما میلہ کا رنگ ایک نظارہ کے سب اُمیدوار
اَزک سلطانی بنا بزمِ سرور جس میں خاص الخاص کا ہے وزبار
ہند کی خوش قسمتی کا آفتاب آج پہونچا تا خطِ نصف النہار
خاکِ پاکِ حضرتِ دہلی بنی قدر و قیمت میں زرِ کامل عیار
یونین جیک آج ہے سایہ فگن کل قلمرو پر بفضلِ کردگار
ہند کا مامن ہے اب ایک آستاں جسکی عظمت نے مٹایا انتشار
قلعۂ چترال سے سیلون تک حدِ چین سے تا بحدِ قندہار
مطمئن ہیں جملہ اقوام و ملل متحد ہیں جملہ امصار و دیار
تھے بزرگ اس قیصرِ ذی جاہ کے گلشنِ ہندوستاں کے آبیار
آں جہانی رحم دل وکٹوریا بعد ازاں اڈورڈ ہفتم صلح کار
خالقِ عالم نے سونپی تھی انہیں خلقِ عالم کی زمامِ اختیار
مادرِ مشفق تھی اُن کی تربیت اور ملکِ ہند طفلِ شیر خوار
اِس طرح کی پاسبانی خلق کی جس طرح کرتی ہے ماں بچوں کو پیار
علم و دانش کے کیئے دریا رواں ریگ زاروں کو بنایا لالہ زار
عدل کے دستِ قوی سے ہو گئیں امن و راحت کی بنائیں استوار
عرض و طول ملک میں پھیلا دیے مثلِ شریان و عصب ریل اور تار
کیا زراعت کیا تجارت کیا ہنر سب پہلے پھولے نکالے برگ و بار
جبکہ آئینِ جہاں بانی کا ہے رہبریِ عقل و حکمت پر مدار

ہند کا ہر گوشہ سچ مچ بن گیا اِس مبارک دور میں باغ و بہار
شاعرانہ مدح سنجی یہ نہیں واقعہ ہے بر سبیلِ اختصار
جارج پنجم کا بھی یہ دورِ جدید ہے اُنہیں ادوار کا آئینہ دار
ہے رفاہ عام کو نشو و نما حال و مستقبل بہ از پار و پرار
شاہ کے مقدم میں اے ہندوستاں کر وفا و مہر کے گوہر نثار
کر برابر پلّۂ میزان میں، شاہ کی تمکین اپنا انکسار
کر اطاعت میں سرِ تسلیم خم تو ہے احسانِ شہی کا زیر بار
کر سپاسِ نعمتِ منعم ادا حق شناسی ہے اگر تیرا شعار
اس شعارِ خاص میں اے خاکِ ہند کم نہیں ہے تو کسی سے زینہار
تیری خاطر عزم شاہنشاہ نے طے کئے ہیں بحر و بر دو بار
بادشاہا! مہربانا! قیصرا! آپ کا آثار ہے گا یادگار
کر لیے تیرِ نگاہِ لطف سے دل امیروں اور غریبوں کے شکار
ہے غریبوں کی دعاؤں کا ہجوم فوج سے بہتر بوقتِ کارزار
ہند کا نغمہ ہے اب باصدقِ دل "قیصر ما زندہ باد و کامگار"
"مہرباں قیصر کے ہاتھوں میں رہے ناقۂ اقبال و دولت کی مہار"
جشن کی تاریخ بھی سُن لیجئے بیسویں ہے یہ صدی بر روئے کار

گیارہواں سال اور مہینہ بارہواں
بارہویں تاریخ از روئے شمار

ہمیں یہ سنکر سخت رنج و صدمہ ہوا کہ ہمارے محترم منشی نوبت رائے صاحب نقش کا فرزند ارجمند گوری سہائے جسکی عمر سبزہ سال کی تھی رحلت کر گیا، مرحوم ہونہار بچہ تھا اُس کی مفارقت ابدی نے حضرت نقش کی تمام اُمید و منصوبہ پانی پھیر دیا ہم اس موقعہ پر خلوص سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں خدا پس ماندگان کو صبر دے۔

طرابلس سے ایک صدا

بے حمیتی تو شاید مگر بے ایمانی یقیناً ہوگی اگر تمدن اس موقعہ پر اس کیفیت کا اظہار نہ کرے جو واقعات طرابلس و تبریز سے دل پر گذری اور گذر رہی ہے جس دریا دلی سے یورپ نے طرابلس میں اپنی بے ایمانی دغابازی اور مکاری کا ثبوت دیا ہے اسکی داد نہ دینا ستم ہے۔

ہمارے مقدس نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بدنام کرنے والے اطالیہ والوں نے جو درحقیقت یزید کے پیرو نکلے ہمکو اور نہ صرف ہمکو بلکہ تمام دنیا کو یقین دلا دیا ہے کہ باستثناء تاج برطانیہ یورپ میں آج بھی وحشی لوگ بس رہے ہیں جو آج سے ہزاروں برس پہلے آباد تھے اور جو صفحہ تاریخ پر جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ جنگ طرابلس نے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ یہ تہذیب و تمدن کے مدعی انسانی دنیا کے واسطے صرف اتنے سودمند ہیں کہ اپنی محترم خواتین کو سرراہ دوکانوں میں ٹھہرا کر چند عاشق مزاج لوگوں کی تسکین کر دیں، ورنہ ہمدردی بنی نوع انسان جو انسانیت کا سچا زیور، اور اسلام کا پہلا اصول تھا ان میں نام کو نہیں،

عیسائی سلطنتیں کلمۂ توحید کی شجاعت کا تجربہ بارہا کر چکی ہیں اور واقعات باواز بلند پکار رہے ہیں کہ اس گئے گذرے وقت میں بھی مسلمان وہ انمول جوہر یگانگت سینے لگائے ہوئے ہیں جو وقت پڑے پر تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک کر دے گا۔ ان کی رگوں میں وہ ہاشمی خون دوڑ رہا ہے کہ جب تک ان کے بدن میں جان ہے یہ اپنی آن کو ہاتھ سے

نہ دیں گے۔ مگر تعجب ہے یورپ پر کہ باوجود متواتر تجربوں کے اس کو باولے کتے کی طرح رہ رہ کر ہڑک اٹھتی ہے اور کوئی نہ کوئی طاقت اپنے دل کا بخار نکالنے کو آبھڑتی ہے اگر ہندوستان خوش قسمتی سے تاج برطانیہ کے سایہ عاطفت میں نہ آجاتا تو یقیناً ایشیائی مسلمانوں کا بھی اس شقی القلب یورپ کے ہاتھوں وہی حشر ہوتا جو یورپ میں ہو رہا ہے۔

اطالیہ نے یورپ میں اپنی ہی غرت پر پانی نہیں پھیرا بلکہ اپنے ساتھ بہت سی برادری کی ناک کٹوادی اور تاریخ کو دکھا دیا کہ اسی دنیا میں جہاں ہمارے مرحوم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جیسی صلح جو طبیعتیں پیدا ہوئی ہیں اور شہنشاہ معظم جارج پنجم جیسا ہمدرد بادشاہ موجود ہے وہاں وہ بدبخت لوگ بھی زندہ ہیں جو کسی اعتبار سے انسان کہلائے جانے کے مستحق نہیں اطالیہ طرابلس میں ننھے ننھے بچوں کے کلیجے سنگینوں سے چھید رہی ہے ان کے آہ و نالے سننے والوں کے دل ہلا دیتے ہیں مگر پڑوسی ان بچوں کی گریہ وزاری پر ہنستے ہیں، عورتیں رو رہی ہیں بڈھے اور اندھے فشانہ بنا دق بن رہے ہیں مگر مہذب لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں چلتی۔

مدعیان تہذیب و تمدن کی قلعی تو طرابلس نے کھولدی اب ذرا ان مقدس روحوں کے حالات بھی دیکھ لو جو وحشی اور بدو کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں لشکر اسلامیہ کا مشہور سپہ سالار خالد ابن ولید جسکی شجاعت پر آج تک یورپ مٹا ہوا ہے جو میدان جنگ کے قواعد ایسے ایجاد کر گیا کہ ایک دنیا نے اس سے سبق لیے ابھی جسکی حیات طبعی کے لیے عیسائیوں کا ٹڈی لشکر ٹوٹ پڑا تھا فتح کر چکا ہے جنگی قلعہ پر

مسلمانوں کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور خاک ابیلا کا ہر ذرّہ خالد کی شجاعت کے گیت گا رہا ہے شام کا وقت ہے آفتاب غروب ہونے کے قریب پونہچ گیا بنا نماز عصر سے فراغت پاکر خالد تن تنہا ایک طرف کو نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور جاکر گرجا کا دروازہ نظر آیا اندر جاکر دیکھا کہ ایک بڈھا راہب خاموش بیٹھا ہے خالد ابن ولید کا گرجا میں داخل ہونا تھا کہ راہب کے شعلے بھڑک اُٹھے زندگی سے بیزار تھا ہزاروں مغلظات سنانی شروع کیں گالیاں اور کوسنے بُرا اور بھلا طعن اور تشنیع نفرت اور حقارت اعتراض اور حملے کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بڈھے نے چھوڑ دی قیاس یہ کہتا ہے کہ جس خالد کی تلوار سے خون ٹپکتا تھا اس کی ایک پھونک سے بڈھا پچاس لڑھکنیاں کھاتا ہوا گرجا سے نیچے جا پڑتا مگر تاریخ یہ کہتی ہے کہ سپہ سالار اعظم خالد ابن ولید رحمۃ اللہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا:۔

"اگر حضور اکرم صلعم کا یہ ارشاد میرے کان میں نہ پڑا ہوا ہوتا کہ بچوں کے ساتھ شفقت اور عورتوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا۔ بڈھوں پر ہاتھ نہ اُٹھانا تو تیری اس زباں درازی کا جواب خالد کی تلوار دے دیتی"۔

یہ سلوک مسلمانوں کا اُن لوگوں کے ساتھ تھا جو ان کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے اور اسوقت تھا جبکہ دشمن انپر لعن طعن کر رہے تھے۔ لیکن اطالیہ جو تہذیب پھیلانیکی مدعی ہے بیگناہ لوگونکو اس بے دردی سے ذبح کرتی ہے کہ وہ مسلمان ماں باپ کے بچے ہیں روسیاہ جنرل کینوا اسکو روا رکھتا ہے اور کسوقت جبوقت وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ

مہذب حاکموں ہمکو ہمارے وطن میں رہنے دو"

یہ تو اسلام کی مقدس تعلیم کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا جو خالد نے دکھایا اب اب خود بانی اسلام صلعم کا طرز عمل دیکھو ایک مرتبہ قبیلہ طے کے کچھ قیدی حضور اقدس کے روبرو پیش کئے گئے انمیں ایک لڑکی بھی تھی جو قبیلہ طے کے سردار حاتم طائی کی بیٹی تھی آپ نے اپنی چادر اسکو اڑھائی اور نامحرموں کی نگاہ سے بچایا اس کے جواب میں مہذب دنیا کا سلوک طرابلس کی عورتوں کے ساتھ یہ ہے کہ نو سو سے زیادہ عورتیں ننگی مادرزاد کی گئیں اور بندوقوں کی باڑھ نے ان کی پردہ پوشی کی۔

اطالیہ اور اسکی حمائتیوں کو ڈوب مرنا چاہیئے کہ انھی بہر خامناں بربر ترکوں اور عربوں نے انکا دلیہ بنادیا۔

شہدائے طرابلس بظاہر مرچکے ان کی پاک روحیں جسم سے جدا ہوگئیں مگر نہیں ان کے نام زندہ ہیں مسلمان ان کے ناموں کو انکھ پر اور ان کے کارناموں کو سر پر رکھیں گے۔

کلمۂ توحید کا اقرار کرنے والے مسلمانو! اگر دنیا کے عیش اجازت اور زندگی کے کاروبار زحمت دیں تو خدارا اس مصیبت بھری اور کوک جلی دکھیا کی داستان سن لو،

بقرعید کے دن علی الصباح ایک بدنصیب مسلمان عورت طرابلس میں ایک پہاڑی پر کھڑی ہوئی ہے صورت پیہم صدمات کی تصویر ہے۔ جاڑے کا موسم برف کے تودے چاروں طرف جمع ہیں مگر یہ بدنصیب جس کے پاس صرف ایک پھٹا ہوا چیتھڑا بدن ڈھانکنے کے واسطے ہے سکڑی کھڑی ہے اور اس طرح صدا دے رہی ہے،

ہندوستانی مسلمانو! اس لیے اور صرف اس لیے کہ
میں بھی تمھارے کلمہ کی شریک ہوں اگر تمھارے لحاف
اور توشکیں اجازت دیں تو میری حالت زار دیکھ لو بھائیو!
برس کا برس دن ہے! ایک دودر افتادہ بہن کی مبارک باد
قبول کرو، وہ بہن جس کی ایک چھاتی سے خون اور دوسری
سے دودھ کا دریا بہہ رہا ہے، یہ دودھ ان بچوں کی یادگار
ہے جو مہینوں اور برسوں میرے سینے پر لیٹے اور چھاتی پر
لوٹے اور جو میدان طرابلس میں میرے حکم سے کلمہ طیبہ کی
حفاظت میں میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے،
اپنے بچونکو کلیجے سے لگانے والی ماؤ! اور شفقت پدری کے
جوش میں اپنے بچوں کو کلیجہ سے لپٹانے والے باپو، میرے
کلیجہ کے ناسور دیکھ بھی لو، چار بچے خون میں نہلا کر
تمھارے سامنے آئی ہوں۔ زخمی چھاتی اُن ہی کلیجہ کے ٹکڑوں پر
دودھ بہا رہی ہے جن کے دم سے زندگی کی بہت سی امیدیں
وابستہ تھیں اولاد والے بہن بھائیو! تمھارے بچے زندہ
اور تمھاری ماستا ٹھنڈی رہے، میرے پھول ہی تمھاری طرح
نو نو مہینے میرے پیٹ میں رہے ہیں میں نے ہی خون جگر
پلا کر بڑا کیا تھا، عمر بھر کی کمائی یہ ہی چار لال تھے جن کی لاشیں
بے کفن پڑی ہوئی ہیں، ظالموں نے مرتی دفعہ مجھے کمہلائے
ہوئے چہرہ بھی دیکھنے نہ دیے،
مسلمانو! تمھارے عیش میں خلل نہ پڑے تو ایک نظر

سرزمین طرابلس پر ڈال لو۔ جہاں چار چار پانچ پانچ برس کے پھلواسے لال جانوروں کی طرح ذبح ہوکر خون میں لوٹ رہے ہیں۔ جہاں سروں کے وارث اطالیہ کی سنگینوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے یہ تازہ قبر جس پر کھڑی ہوئی تمہیں اپنے داغ دکھا رہی ہوں اُس مظلوم کی ہڈیاں ہیں جس نے عمر بھر کے واسطے پیمان وفا باندھا تھا، جو چند مہینوں کا بیمار اور کئی امراض میں گرفتار تھا، ہندوستانی بھائیو! جو مریض کراہنے کے قابل بھی نہ تھا میری آنکھوں کے سامنے رسی سے باندھ کر مقتل پر پچھاڑ دیا گیا، ظالم ہمارے سر پر کھڑے تھے اور حسرت بھری نظریں ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہی تھیں، دل مجروح اس بیمار کے پیچھے پیچھے لے گیا جو وطن کی خاک میں گھسٹتا ہوا جا رہا تھا، بھائیو! جو سماں میں دیکھ چکی ہوں خدا نہ کرے کہ تم دیکھو، میرے تاج و تخت کا وارث، میری عصمت و آبرو کا نگہبان، میرے دل اور میری جان کا مالک، آسمان کی طرف دیکھ کر مجھے خدا کی سپرد کر رہا تھا، جو ہاتھ اس کی خدمت کا وعدہ کر چکے تھے دم آخر اسکو پانی بھی نہ پلا سکے، ہائے کس طرح ادا کروں دل کے ارمان دل میں رہے اور کلیجہ داغوں سے چھلنی ہو گیا، بیمار نظریں میری صورت پر تھیں کہ ایک سنگین نے ہمیشہ کے لیے بند کر دیں دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا کامل سات گھنٹے درخت کی آڑ سے اس لاش کی حفاظت کی ہے

اور جب میدان دشمنوں سے صاف ہوگیا ہے تو اٹھا کر لائی
اور سر کی چادر میں جو اس مرحوم کی کمائی تھی لپیٹ کر اس
گڑھے میں دبا دیا، میں اس سردی میں اکڑتی ہوئی اپنی
زندگی پر فخر کر رہی ہوں کہ میری چادر میرے بدلے اس
زمین کے نیچے اپنے وارث کی خدمت کر رہی ہے، بہنو!
میرا دل دیکھو، اپنے سچے مذہب کی حمایت میں چار لال
قربان کر چکی، لٹ گئی تاراج و برباد ہوگئی مگر مجھ خالماں برباد
کو موت نہیں آتی کہ اپنے پیاروں سے جا ملوں، معصوموں کو
چمٹاؤں گلے لگاؤں بلائیں لوں اور ان نازک رخساروں پر
نثار ہو جاؤں جن سے پھول جھڑتے تھے،

ہوا کے جھکڑو! مجھے نہ کپکپاؤ، میرا یہ پیغام سمندر پار
میرے ہندوستانی بہن بھائیوں تک پہنچا دو میری تصویر
انکو دکھا دو میرا تپہ انکو بتا دو اور میری یہ بپتا انہیں سنا دو
جو کلیجہ کے ٹکڑے کل تک اپنے نازک ہاتھ گلے میں ڈالے
سینہ سے چمٹے ہوئے تھے آج کہیں نظر نہیں آتے
بہنو میرے بچونکو ڈھونڈھ دو، بھائیو میرے لال مجھ سے
ملا دو، وہ انتڑیوں کو بلیں ٹوٹ گئیں، کھلتے ہوئے پھول مرجھا
گئے، اے سنگدل اطالیہ چاروں چھٹوا دیئے، لے، لی،
اے موت مجھکو بھی لے، ظالمو مجھکو بھی، اسی سنگین سے
جو میرے پیاروں کے خون میں بھیگی ہوئی ہے میرا کام تمام
کر دو اور مجھے اس خون کے بوسے لینے دو جو میرے

معصوم منکے جسم سے نکلا، میری آنکھیں اُن شکلوں کو ڈھونڈھ رہی ہیں جو کل تک میرے پاس تھیں، میرے ساتھ تھیں، بچو، اے پیارے بچو! ماقرمان، تم میرے دکھ درد کے شریک میری بیماری کے رفیق تھے آؤ میرا ہاتھ پکڑو، مجھے سہارا دو، کلیجے سے لگ جاؤ کہ یہ دودھ بند ہوا اور یہ خون تھم جائے۔

سننے والو! مصیبت بھری داستان اگر ہو تو معاف کر دینا اس بدنصیب کہاں اور تم کہاں، تمہارے بچے تمکو مبارک اور تمہاری دنیا تمہیں نصیب، تھوڑی دیر کا ساتھ ہے، سمجھو تو تمہاری کمائی میں مقدار، اور مانو، تو تمہاری بہن، تمہارے کلمہ کی شریک اور اس رسول کی امت ہوں جو خاک عرب سے پیدا ہوا، اُمّی لقب، ہاشمی نسب! کیسا رسول؟ کونسا پیغمبر؟

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

کیا تمہاری آنکھیں مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دیکھیں گی اور کیا تمہارے کان مجھ سے زیادہ درد بھری داستان سنیں گے، تمہارے پاس شال دوشالے ہیں اور میرے پاس جانور کی کھال بھی نہیں۔ دیکھو میرے برہنہ جسم کو دیکھو اور اس قیامت خیز سردی کا خیال کرو، اولاد والو، بیٹا بیٹی والو، خدارا میرے داغوں پر نظر کرو، اور سوچو میری رات کیونکر اور میرا دن کس طرح بسر ہوتا ہوگا طرابلس تمہارے خلیفہ کا مفتوحہ شہر ہے اور میں طرابلس کی بیٹی نہیں ہوں۔

گھر لائے کی لاج رکھو اور آج جبکہ میرے سر سے میرا وارث اُٹھ
گیا میرا گھر لٹ گیا میرے بچے چھٹ گئے، میرا ہاتھ پکڑو اور
میرا ساتھ دو، ان ہاتھوں کو غور سے دیکھو کیسے ہیں اور کس کے
ہاتھ ہیں وہ ہاتھ ہیں جو گیارہ، دس، آٹھ، اور پانچ برس
کے چاند کے ٹکڑوں کو گہری گور میں سلا کر تمہارے آگے
پھیلے ہیں اور یہ اس رانڈ دکھیاری کے ہاتھ ہیں جو صرف
گیارہ برس سہاگن رہ کر رانڈ ہو چکی رانڈیں تمہارے
ہاں بھی ہونگی بچوں کو تڑپنے والیاں تم میں بھی ہوں گی
مگر میں نے اپنے لال اپنا رفیق و شفیق شوہر اپنے مذہب
پر فدا کیا ہے میں نے اپنے دین برحق کو ظالموں سے
بچانے کے لیے پانچ قربانیاں چڑھائی ہیں۔ جانتی ہو؟
کیسی قربانیاں؟ وہ چار جن کو دیکھ کر جان میں جان آتی تھی
جو برسوں سینوں پر لوٹے ہیں جو ہمک ہمک کر کلیجے سے
چمٹتے تھے، جن کو دم بھر تنہا نہ چھوڑتی تھی اور جو آج اس
جنگل بیابان میں اکیلے سو رہے ہیں، وہ ایک جسپر زندگی
کا تمام دارومدار تھا جس نے عزیز و اقارب سے تڑا کر اپنے
پلے باندھا تھا جو لمحہ بھر بھی آنکھ سے اوجھل نہ کرتا تھا، اس
ڈھیر میں منہ لپیٹے پڑا ہے،

مسلمان بہن بھائیو! میری ہنسی نہ اڑاؤ، یہ میری حالت کا یہ
ایک رخ تھا، اسی دل میں جو مامتا سے تڑپ رہا ہے
وہ خون بھی جوش کھا رہا ہے جو چار کیا ہزار بچے ہوتے

تو وطن پر قربان اور مذہب پر نثار کر دیتا، میری محنت ٹھکانے
لگی میرے ارمان پورے ہوئے، میں خوش نصیب ہوں کہ میری
کمائی میرے پاک مذہب اور میرے وطن کے کام آئی قریب
آگیا ہے وہ وقت کہ میں بھی ان ہی بچوں کے پہلو اور اس
سرتاج کے پائنتی جا سوؤں مگر میری موت وہ موت ہوگی کہ
تمہاری ہزار زندگیاں اس پر قربان، مسلمان میرے نام پر جان
دینگے اور میرے کام پر فخر کریں گے آنیوالی نسلیں اور پیدا ہونے
والے لوگ میری سالگرہ منائیں گے اور تاریخ اسلام، میری اس
قربانی کو سونے کے حرفوں سے لکھ کر دنیا کے سامنے پیش
کرے گی، میں تمہارے ہاں کی بہو ہوں عار نہ اٹھاؤں گی
مگر تمہاری بہت سی بچیاں دو دو دانوں کو محتاج ہیں،
کواریاں یتیم اور بیاہیاں رانڈیں ہوگئیں، حمیت اسلام
اور خوف خدا دل میں ہے تو سوچو کہ یہ چاڑے کی پہاڑ سی
راتیں ان کی کیونکر کٹتی ہوں گی، جن کے سر پر ثابت وہابی
نہیں ہے، اپنی کمائی میں سے کچھ ان کو بھی دو پہولوگے
پھلوگے اور ان بدنصیبوں کی دعا جب یہ پیٹ بھر کر اور تن
ڈھانک کر سچے دل سے دیں گی تو یقین کرو کہ ہمارا اور تمہارا
وہ خدا جو وحدہٗ لاشریک ہے انکی التجائیں قبول کریگا۔

ایڈیٹر

شہدائے طرابلس کا چندہ۔ دفتر اخبار وکیل امرتسر، وطن لاہور،
زمیندار۔ لاہور، کی معرفت روانہ ہوسکتا ہے۔ (منیجر)

تبریز

طرابلس کا زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ مظالم تبریز نے اور چرکا دیا، یکے بعد دیگرے ہمیشہ سے اسلام کا دشمن اور اس تاک میں رہا کہ جب موقعہ پائے مسلمانوں کے خون سے اپنی تلواریں رنگے اور جب کوئی عذر نہ ملے تو رعیت ہی کے مسلمانو پر نت نئے ظلم توڑے ایرانی پارلیمنٹ سے بہتر موقعہ کب ملتا اور کہاں ملتا مدتوں کے دبے ہوئے بخار نکالنے شروع کر دیے،

کیسا نازک وقت اسلام پر آگیا کہ علمائے اسلام عشرہ محرم کے روز پھانسیوں پر چڑھا دیے جائیں اور مسلمان سنہ تکتے کے تکتے رہ جائیں، ابھی ابتدا ہے انجام دیکھئے کیا ہوتا ہے اگر کچھ امید ہے تو برطانیہ سے کہ وہ ان پردہ نشین اور مظلوم بیویوں کی التجا پر رحم کرے جنکو انگلستان پر اتنا بھروسہ تھا کہ سفر یکسبٹ سے اعانت کی درخواست کی

ایران کے متعلق ہم ابھی کچھ نہیں لکھتے اگر جگر خراش واقعات سامنے آئے تو دل خود بخود ہی اپنی کیفیت کا اظہار کرے گا۔

واقعات جو اب تک کان میں پہنچے دل کو تڑپا رہے ہیں اور تبریز کی بہن بھائی جنپر ظلم وستم کے تیر برسے ہندوستانی مسلمانوں کی اعانت کے یقینی مستحق ہیں،

وکیل، وطن، زمیندار، اس خدمت کو تیار ہیں، مسلمانو اپنے ہاتھ پر دل رکھ کر ان مظلوموں کی حالت پر غور کرو اور مدد دو جہاں تک دے سکتے ہو،

ایڈیٹر

ٹریپولی

(از سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)

اے گرفتارِ بلا اے اُمتِ خیر البشر — اے غزالِ پا شکستہ سے کہیں مظلوم تر
دیدۂ بیم و رجا کس بات کا ہے منتظر — ڈالتا کیا ہے ٹریپولی پہ حسرت کی نظر

یاں بنایا جائے گا مرقد تری ناموس کا
یاں نشاں ہوگا تری دولت ترے افسوس کا

یاں کھڑی ہوگی عمارت کافرِ مگرار کی — خوار ہوگی یاں شریعت احمدی جاہ کی
یاں پریشاں کر دی جائیگی کتاب اللہ کی — یاں گھٹا چھایا کرے گی ظلموں کی آہ کی

تا نہ بچنے پائے میت بھی کوئی اس نام کی
نعش پانی میں ڈبو دی جائیگی اسلام کی

کس جہنم کی ہوا تھی جس کا جھونکا چل گیا — باغ تیرہ سو برس کا لہلہا کر جل گیا
سکیو نہیں بھی نہ جس مظلوم کا کس بل گیا — اُس مریضِ نیم جاں کا آج دم کا دم نکل گیا

دفعتہً کوہِ غم و اندوہ پھٹ کر آ پڑا
ایک ہچکی میں کلیجہ منہ کے باہر آ پڑا

کیا یہ سچ ہے دین احمد کا جگر دل در جگر — کیا دعائیں کلمہ گویوں کی گئیں سب بے اثر؟
کیا ابھی تک قبر سے باہر نہیں نکلا عمرؓ — تا کہ دیکھے مومنوں کے خاک و خوں آغشتہ سر

انہدامِ کوشکِ نوشیرواں کر دیکھ لے
اور دریدہ روضۂ اطہر کی چادر دیکھ لے

روس و ایران

قوت جو گھٹ گئی ہے مغدور ہو گئی ہیں
تاب مقاومت سے مجبور ہو گئے ہیں
چاروں طرف سے مسلم محصور ہو گئے ہیں
سب زخم رفتہ رفتہ ناسور ہو گئے ہیں
رہ رہ کے دے رہا ہے ایراں کو روس چرکے
پرزے اڑا رہا ہے برطانوی اثر کے

مقتل طرابلس کا پیش نظر ہے اب تک
دل غرق خوں ہے اب تک ٹکڑے جگر ہے اب تک
دل ہے شرارہ افشاں اور چشم تر ہے اب تک
اور چشم تر اگلتی لعل و گہر ہے اب تک
اٹلی کے وہ مظالم بھولے نہ تھے ابھی ہم
اس گردش فلک نے اک اور دے دیا غم

ایران جس کی دولت دنیا میں تھی گہر ریز
توسن کسی کا جس کے آگے ہوا نہ مہمیز
کرتا ہے اس پہ حملے اب روس فتنہ انگیز
کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را
ہم بکسیوں پہ اس کو کرد مہرباں خدارا

اے سرزمین ایران اے یادگار دنیا
تاج و نگیں ہے تیرے تھا اعتبار دنیا
باقی ہے تیرے دم سے نقش و نگار دنیا
ہے کوہ طور تیرا شمع مزار دنیا
ہیں نقش لوح دل پر سارے ترے فسانے
آنکھوں میں پھر رہے ہیں آبک ترے خزانے

ایران جس کے آگے دنیا کی خم تھی گردن
پیدا کیے تھے جس نے جمشید اور بہمن
جو فلسفہ کا گہر تھا اور شاعری کا گلشن
جس کے قصیدہ خواں ہیں آبک بروں و کرزن

افسوس ہے زمانہ اب اُس سے پھر گیا ہے
وحشت کی ہے چڑھائی نرغہ میں گھر گیا ہے

عزیز لکھنوی

صُبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفل قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات
مُسلم خوابیدہ اُٹھ ہنگام سرآرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر گرم تقاضا تو بھی ہو
دورۂ عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب
دامن گردوں سے تا پیدا ہوں یہ داغ سحاب
کھینچکر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز
پھر سکھا تار یکیٔ باطل کو آداب گریز
تو سراپا نور ہے زیبا ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں نمایاں ہو کے برق دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو

"اقبال"



یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّہ کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شیر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

آتش نمنشی جس کی کانٹوں کو جلا دیوے
اس بادیہ پیما کو وہ آبلہ پا دے

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلیٰ دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اُجالا کر دل صورتِ مینا دے

احساسِ عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالا ہوں اک اُجڑی گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

"اقبال"

ہم اپنے کرم فرما اور تمدن کے محسن سید مہدی علی صاحب شہید کے اس مصیبتِ کبریٰ کو نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سماع کرتے ہیں کہ ان کے عزیز دوست میرزا بشارت علی صاحب مرحوم نے ۱۲ ذی الحجہ کو اس دنیا ناپائدار سے رحلت فرمائی خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے

سید صاحب اپنے مرحوم دوست کی یادگار میں پانچ پرچہ قسم دوم کے ان طلبہ کے نام جاری کرانے چاہتے ہیں جو چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس قسم کی درخواستیں ہمارے پاس بہت سی آچکی ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۱۲ء سے ہم پانچ پرچہ جاری کرتے ہیں سید صاحب کا مضمون آئندہ پرچہ میں درج ہوگا +

- بہ تقریب تاج پوشی - قیصر ہند - ہر دو حصہ بجائے (عہ) کے ایک روپیہ ملیں گے

وصل حبیب

ناول نہیں دلچسپ اداؤں کی ہے تصویر — رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے افسانہ کیا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی سے از بھوپال - امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیر جی شبیر علی صاحب - از بجنور - الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب مراد زیور طبع سے آراستہ ہو کر نور افزائے چشم مشتاقین ہوا - داد کی ضرورت نہیں - کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان - آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از ڈوبائی ضلع بلند شہر - وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی - درحقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از سنبھل مراد آباد - وصل حبیب دیکھا - ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کر کے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو مرکنڈے ناتھ صاحب سہندوسا از دہلی - آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا - بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو نبی گوپال صاحب کمندن از حیدر آباد دکن - آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم سٹر کو میا از آرہ - کتاب (وصل حبیب) کو پڑھکر مجھسے زیادہ سلف (اوتھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دیتی ہے چھوٹے چھوٹے مگر چست و برمحل جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہے ہیں - عبارت کا زور اشعار کی ترتیب - جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف تبلا رہی ہے - کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے - مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ہر ناول کو ایک بار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی - یہ تو خواہش تمنائی بن جاتا ہے - سنتے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد کی سنہ ۹۹ عہ ناظرین واقف ہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس درجہ مخالف ہیں وصل حبیب کو ہم نے نکتہ بین نگاہوں سے بغور دیکھا - ہمارا خیال تھا کہ موجودہ لوفانوں کی طرح یہ بھی ہوگا - مگر کس قدر خوشی ہوئی - کہ مصنف نے بالکل ہمارے خیال کا جو بہ اپنی تصنیف میں اتار دیا ہے زبان کی سلاست نے اسمیں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے - غرض ناول کا ہر جملہ جو بہت اچھا اور قابل قدر ہے ویسے ہی کتابوں کی تعریف کے ہم مخالف ہیں

(۱۰) مسز اوی صاحبہ میسر صاحب مالی ریاست کشمیر از سری نگر - وصل حبیب نے ہم کو مشتاق دیکھنے کا مشتاق بنا دیا ہے اور ہی امید کرتے

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاک خانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

(نوٹ) ناول کا پہلا حصہ ۱۲ روپیہ کا ہے

ڈاکٹر برمن کی نبالی مشہور دوائیں

ستائیس برس سے سارے ہندوستان میں استعمال میں آرہی ہیں

(۱) دماجسے زور سے اچھلتا ہو اس دوا کے دو ایک موتا دی سے دب جاتا ہے۔

(۲) نیا ہو اور اس دوا کا استعمال کیا جائے تو دما جڑ سے جاتا ہے۔

(۳) پورانے دما والے یا جن کا دما دم کا ساتھی ہو گیا ہے وہ بھی اس دوا سے بہت صحت پاتے ہیں۔

دما کی دوا ڈاک محصول ایک سے چھ شیشی تک ۵ آنہ قیمت ایک شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

مقوی گولیاں ڈاکٹری میں طاقت دینے والی دوائیوں میں مشہور دوائیں فاسفورس اسٹکنیا اور ڈینیا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں مغز ریڑھ کی ماس اور خون کو یہ طاقت دیتی ہے اس لیے ان کی کمزوری سے پیدا ہوئی معمولی کمزوری مول یاد بھولنا۔ ہاتھ پیر کانپنا۔ لقوہ۔ وغیرہ ان گولیوں سے آرام ہوتے ہیں ۱۵ دن کی خوراک تیس گولیوں کی شیشی قیمت ایک روپیہ ڈاک محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ۔

امراض مستورات کی دوا یہ ہر ایک اقسام کے مستورات کی دوا ہے ہر طرح کا رحم کی بیماری پردہ رول حمل کی کمزوری پیٹ جانگ میں درد وغیرہ کو مٹا کر اس دوا کے استعمال سے رحم کی خرابی تمام دور ہو کر جسم قوی ہوتا ہے ایک دفعہ اس دوا کی بھی آزمایش کیجیے قیمت ایک شیشی ایک روپیہ (عہ) (۱۶ خوراک) ڈاک محصول ۱/

ان دواؤں کی مفصل حالت معہ سرٹیفکٹوں کی پوری کتاب بلا قیمت ملتی ہے منگا کر پڑھیے۔

ڈاکٹر ایس کے۔ برمن

نمبر ۶۵ بنارا چندوت اسٹریٹ کلکتہ

نوٹ۔ ہمارے ایجنٹ آغا منصب علی کشمیری دروازہ دہلی میں ہیں۔

فرمایش کے ساتھ اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔

سم دوم

جنوری سنہ ۱۹۱۲ء جلد ۲ نمبر ۱

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

—: فہرست مضامین :—

تصویر ..... جلوس شاہی

علم ادب کی بے ثباتی۔ سید سجاد صاحب

ہماری فریاد۔ حضرت تمنا عمادپوری

مسئلہ ازدواج وطلاق۔ منشی ضیاء الدین احمد صاحب برنی

عید قرباں۔ آغا غلام حسین صاحب ارشد

سوسائٹی کا اثر بے زبان نسواں پر۔ مولوی محمد عبد الرزاق صاحب بسمل

یاد نذیر۔ مولوی نیاز محمد صاحب نیاز فتحپوری

مکتوبات میر۔ پروفیسر ڈاکٹر شرف الحق صاحب

قمر الدین خاں۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

نور جہاں کا مزار۔ منشی تلوک چند صاحب محروم

بھائی کا خط ایک دوسرے بھائی کے نام ..... صاحبزادہ وحید احمد صاحب۔ فاروقی

بہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت فی پرچہ (۴؍) قسم اول (۳؍) قسم دوم (۲؍) تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا کتبہ احقر ابو ظفر عابد میرزا دہلوی

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا زینہ ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عِصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کوئی لڑکیوں کے واسطے عِصمت سے بہتر سہیلی عِصمت سے بہتر شفیق نرسیں عِصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عِصمت اُن کو بتائے گا کہ کوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو قیود اُن پیش آئینگی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کروانے کے واسطے عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عِصمت ہی عِصمت اُن کو بتائیگا کہ جس تمدنی کو وہ بے غل و غش چرخ کر رہی ہیں وہ کس محنت و شفقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کس طریقے میں جن سے یہ بچے پل مل کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عِصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عِصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

مائیل بیچ کی آب و تاب سنہری جلد درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عِصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے مہینہ میں ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ (۴) ہے

منیجر عِصمت و تمدن

(دہلی)

تمدن

علم ادب کی بے ثباتی

طبع انسانی کی یہہ بھی ایک عجیب حالت ہے کہ بعض اوقات ذہن میں خیالات کا کچھ ایسا تار بندھ جاتا ہے کہ اُسکو حالتِ خواب کا مزا آجاتا ہے اور وہ قدرتی طور پر شور و شغب سے بچکر کسی سنسان اور تاریک مقام کی تلاش کرتی ہے جہاں کہ وہ اپنی کیفیت استغراق کا لطف اُٹھائے اور خاموشی کے ساتھہ ہوا پر محل تیار کرے۔ ایک دن مجھ پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور میں طرح طرح کے خیالات میں قبرستان ویسٹ منسٹر میں ادہر اُدہر سیر کرتا پھر رہا تھا کہ دفعتہً بچوں کے شور نے جو وہیں کہیں فٹ بال کھیلتے ہوئے آنکلے تھے۔ میری محویت اور اوس جگہ کی خاموشی میں خلل ڈالا اور اُن کے قہقہے قبروں سے ٹکرانے لگے۔ میں اس شور سے پریشان ہوکر قبرستان کے اندرونی حصوں میں گھس گیا اور لائبریری کے قریب جا پہونچا۔ یہاں آکر میں نے لائبریرین سے لائبریری کے اندر جانے کی

اجازت چاہی تو اُس نے جواب میں اپنی جیب سے کنجیاں نکالیں اور لائبریری کا دروازہ کسیقدر دقّت سے کھولا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی کم کام میں آتی تھیں لائبریرین مجھ کو لیکر اندر گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک بلند ہال میں کھڑا ہوا ہوں جس کی چھت بڑی موٹے موٹے شہتیر و نیر پھیلی ہوئی ہے۔ چھت سے چند فٹ نیچے اور فرش سے بہت بلندی پر متعدد روشن دان تھے اور آتش دان کی دیوار پر کسی پادری کی ایک پرانی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی گیلری میں اور ہال کے اندر چاروں طرف نفیس نفیس الماریوں میں کتابیں چنی ہوئی تھیں جو بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے جسم پر سہارا لیے ہوئے تھیں۔ کتابوں کا اکثر حصّہ پرانے زمانہ کا تھا اور جن کی حالت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انکے ہاتھوں نے تو اتنا نہیں زمانہ کے ہاتھوں نے اُن کے رنگ و روغن کو بالکل اوڑا دیا ہے۔ کمرے کے مرکز میں ایک خاموش میز تھی جس پر دو تین کتابیں۔ ایک بن سیاہی کی دوات اور ایک قلم جسکی نب استعمال میں نہ آنے سے زنگ آلود ہوگئی تھی۔ رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ خاموشی کے ساتھ مطالعہ اور گہرے غور و فکر کے لیے نہایت موزوں تھا چونکہ اُس کی قہقہہ دیواروں نے دنیا کی آواز چہل پہل کو باہر کے باہر روک رکھا تھا۔

الماریوں سے ایک چھوٹی مگر موٹی کتاب جس پر چمڑے کی جلد پیتل کی پتریوں سے جڑی ہوئی تھی۔ میں نے نکالی اور میز کے قریب ایک شاندار کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ دبیز کی خموشی نے دل میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کی کہ میں بجائے پڑھنے کے کچھ سوچنے لگا۔ جسوقت میں نے چاروں طرف نگاہ اوٹھا کر اون پرانی کتابوں کو دیکھا جنکو بظاہر کسی نے مدت سے ہاتھ نہ لگایا تھا۔

تو میرے دل میں خیال گذرا کہ کتب خانہ بھی ایک قسم کا علمی گورستان ہے جہاں مصنفین اپنی اپنی کتابوں کی شکل میں۔ اُن مردوں کی مانند جن کی نعشیں مصالح لگا کر مدت دراز تک گلنے اور سڑنے سے محفوظ رکھی جاتی ہیں الماریوں میں مدفون ہیں۔

میں نے خیال کیا کہ ان میں سے ایک ایک کتاب پر کس درجہ دماغ سوزی کی گئی ہوگی۔ کتنے دل اُکتا دینے والے دن۔ کتنی آنکھوں میں کٹنے والی راتیں صرف ہوئی ہونگی اور کیسے اُس کے مصنف نے۔ دنیا اور اہل دنیا کے مبارک اور خوشنما چہروں سے اپنی آنکھیں بند کر کے یہ سنسان اور تاریک کتب خانوں میں بیٹھ کر سخت جانفشانی و جانکاہی اور غور عمیق سے اسکو تصنیف کیا ہوگا۔ مگر یہ جانفشانی اور دماغ سوزی کس لیئے تھی؟ کیا کسی خاک آلودہ الماریوں کی صرف ایک انچ جگہ کے لیے؟ کیا اس لیے کہ زمانہ مستقبل میں اُس جگہ میرا جیسا کوئی بھٹک کر آنکلنے والا نیم خفتہ و نیم بیدار شخص۔ اُس کے سرورق کو پڑھکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے؟ کیا اس لیئے کہ چند صدیوں کے بعد اُس کا نام و نشان تک صفحہ ہستی پر نہ رہے؟ تصنیف و تالیف جسکو مخلوق بقائے نام کا ذریعہ سمجھتی ہے اور جس پر بڑا فخر کرتی ہے کیا اُس کا یہی انجام ہے؟ بقائے نام کی اُمید ایک خوفناک دھوکا ہے! ایک مہمل آواز ہے جو کسی گھنٹے کی آواز کی طرح تھوڑی دیر تک اپنے جسم سے آپ ٹکراتی ہے۔ کچھ وقفے تک سننے والے کے کان میں گونجتی ہے اور پھر خلا نسیاں میں ڈوب کر خود اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتی ہے۔

میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا اور چپکے چپکے الفاظ شکایت میرے لبوں پر لبوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ تڑپ رہے تھے۔ میرے ایک ہاتھ نے

میرے سر کو سہارا دے رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ کتاب سے کھیلنے میں مصروف تھا کہ میں نے اُس کتاب کو کھولا تو اُس نے اس طرح دو تین ہلکی ہلکی چیخیں ماریں جیسے کوئی شخص گہری نیند کے بعد سمع خراش آوازیں نکالتا ہوا اُٹھتا ہے اور پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اوّل اوّل تو اُسکی آواز بڑی موٹی اور جھنجھنی تھی چونکہ اوسکے کنارو پر کسی مختتی مکڑی نے جابجا جالے تن رکھے تھے اور اُس کے صفحے کمرے کی نمی اور سردی سے کہیں سے چپکے ہوئے اور کہیں سے اُبھرے ہوئے تھے مگر کچھ دیر کے بعد اُسکی آواز صاف اور اُس کا لہجہ سمع فریب ہو گیا لیکن اُس کی زبان عجیب اور متروک تھی۔ ادائے الفاظ میں لب ولہجہ ہمارے زمانہ کے لیے گنوار و تھا۔ بہرکیف جہاں تک ممکن ہوگا میں اُس گفتگو میں اپنا تصرف کرکے اپنے ناظرین کو اُس کی زبان سمجھنے کی تکلیف سے سبکدوش کرونگا

اُس نے اپنی گفتگو شکایت سے شروع کی اور جھنجھلا کر بولی کہ "دنیا سخت غفلت شعار ہے اور اُس کے نزدیک قابل قدر شے کی کوئی قدر نہیں آج دو صدیاں گذریں کہ مجھ کو کسی نے چھوا تک نہیں جب کبھی لارڈ پادری ادھر آ نکلتا ہے تو اپنے فرض کو پورا کرنے کے لیے طور کھڑے کھڑے ایک نظر ہم کو بھی دیکھ جاتا ہے۔ آخر اس کے معنے کیا ہیں کہ ہم چند ہزار کتابوں کو یہاں بند کرکے رکھ چھوڑا ہے اور ہماری نگرانی کے لیے چند لائبریرین مقرر کر دیے ہیں جو باری باری سے صرف اس بات کی نگاہ رکھتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی غائب تو نہیں ہو گئی۔ کتابوں کا کام یہ تھا کہ لوگ آکر انہیں پڑھتے۔ اون سے حظ حاصل کرتے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ایک قانون پاس کرتی کہ مستعد لوگ ہمارے مطالعہ کے لیے مقرر کیے جائیں۔ اگر پیر بھی ہماری شکایت رفع نہ ہوتی تو میں حکم دیتی کہ ایک خاص

مدت میں ایک بار ویسٹ منسٹر اسکول کے طلبا کو صرف اس لئے چھٹی دیجائے کہ وہ ہم میں آگھسیں تاکہ کم از کم ہم کو تازی ہوا تو میسر ہو جایا کرے۔ ہماری حالت تو عثمانی حرم کی پردہ نشین بیگموں اور ہندوستان کی خانہ نشین بی بیوں سے بھی گئی گذری ہے"۔ میں نے کہا "میری عالی دماغ دوست۔ اس قدر طیش میں نہ آؤ۔ تم اپنی ہمعصر کتابوں سے جو دنیا کے ہاتھوں میں گئیں اور جن کی زندگی تم سے مختلف رہی۔ کہیں زیادہ خوش نصیب ہو۔ اس قدیم ہال میں آجانے سے تمھاری وہی وقعت اور وہی قیمت ہوگئی جو ان برابر کی قبر والوں کی ہے۔ جن میں اولوالعزم تاجدار۔ جنگجو شہسوار پڑے ہیں۔ جن میں متمول صاحب وقار اور خود تمھارے مصنفان نامدار لیٹے ہوئے ہیں اور جن کی خاک جواہرات کا دفینہ سمجھی جاتی ہے برخلاف اس کے تمھاری ساتھی وہ کتابیں جو اس جگہ کے شرف سے محروم رہیں۔ خاک و غبار بنکر مدت ہوئی کہ عدم کے پہلو میں سو چکی ہیں ہوا سے اس کتاب کی نمی خشک ہونے لگی اور میرے ہاتھوں کی گرمی سے اس کے صفحہ کے گڑھے اور ابھار دب اور ابھر کر ذرا سیدھے ہوئے اور اب وہ قد و قامت میں کسی قدر پھیل گئی اور یوں گویا ہوئی۔ "ہم اس لیے تصنیف ہوئی تھے کہ دست بدست پھریں۔ سابق علم کی آنکھ کو اپنے خیالات میں متوجہ کرکے۔ دنیا کے مکروہ مناظر سے بچائیں اس کے دل و دماغ کو عقل و شعور کے نور سے روشن کریں اور نہ اس لیے کہ بتیل کی مچھیں ہم کو جکڑ لیں۔ الماری کی تاریکی ہمیں اپنی دبیز چادر پھیلا دے اور بنیہ خور کیڑوں کا پیٹ ہمارا قبرستان بنے تم دیکھو اور ذرا انصاف کرو کہ ہماری حالت کیا ہوگئی ہے۔ بے رحم کیڑے

ہماری جلدیں ایک طرف سے منہ ڈالکر ہمارے سینے کو چھیدتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ تم اتفاق سے آ گئے اور کامل ہلاکت سے پہلے مجھ کو دو دو باتیں کرنے کا تم سے موقعہ ملگیا" میں نے جواب دیا "میری قابلہ۔ دست بدست پہرنے کی حسرت جو تم نے بیان کی اگر اُس کے پورا ہونے کی صورت معرض وجود میں آتی تو غالباً اب تک تمھارا وجود تو درکنار نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔ تمھاری صورت سے تمھاری عمر کا پتہ لگتا ہے اور جیسا کہ تم نے ابتدا میں کہا۔ تمھاری عمر واقعی دو سو سال کی ہجتی ہے۔ میری دانست میں زیست کا اتنا زمانہ ایک معقول زمانہ ہے۔ لیکن یہ دو سو سال کی عمر تم نے صرف اس قدیم کتب خانہ کی اور دست انسان سے محفوظ رہنے کی بدولت پائی ہے ورنہ تم کو معلوم ہے کہ تمھارے وقت کی کتابوں کا کیا حشر ہوا۔ گروٹیسٹ (Grostete) نے اپنے نام کو صفحہ عالم پر قائم رکھنے کے لیے اسقدر سخت محنت کی۔ اسقدر خون پسینہ ایک کیا کہ کوئی دوسرا مصنف اس اعتبار سے بمشکل اوسکا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سنا ہے کہ اُس نے دو سو کتابیں تصنیف کیں۔ گویا کتابوں کا ایک مینار چُن دیا۔ مگر افسوس امتداد زمانہ نے اُس مینار کو ڈھا دیا اور اُس کا ایک ایک پتھر پسکر خاک کا ڈھیر بن گیا۔ دو چار کتابیں جو کسی پُرانے کتب خانہ میں پائی بھی جاتی ہیں اُن کو بھی آثار قدیمہ کا دلدادہ گاہ گاہ آکر ستا جاتا ہے۔ تم نے کمبرینسس (Comberensis) کا جو فلسفہ الٰہیات اور فن تاریخ وغیرہ میں بڑا بلند پایہ کتابتھا نام سنا ہے اس شخص نے دو بار ایک جلیل القدر عہدہ سے انکار کر دیا۔ اور زندگی کی تمام

دلفریبیوں کو حقیر سمجھا محض اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاموش مقام پر بند کر کے آنے والی نسلوں کی مسرت اور دلچسپی کے واسطے کچھ سامان مہیا کر جائے۔ مگر آنے والی نسلوں نے اُس کا نام تک نہ پوچھا اور اُسکی تن دہی کی کچھ بھی داد نہ دی ہنری (Hallam) جس نے ایک فاضلانہ تاریخ انگلستان کے علاوہ دنیا کے بیچ اور کمتر از بیچ ہونے پر ایک رسالہ لکھا۔ دنیا نے اُس سے پورا پورا انتقام لیا اور سہواً ہی کوئی اُسکو اور اُس کی تصانیف کو یاد نہیں کرتا۔ اسی طرح جوزف ولیس۔ ولیم۔ سائی من ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"معاف کیجئے" میرے کلام کو کاٹ کر کتاب نے کہا "تم میری عمر کیا سمجھتی ہو۔ تم اُن مصنفوں کے ذکر میں چلے گئے جنکا زمانہ میرے زمانہ سے بہت قبل گذرا ہے اور جن کی تصانیف یا تو لاطینی یا فرانسیسی زبان میں تھی اور غیر زبان غیر ملک میں جس بخت کی مستحق ہے وہی سلوک اِن کتابوں کے ساتھ کیا گیا وہ مستحق تھیں کہ انگلستان اُن پر گمنامی کا پردہ ڈالدے وہ مستحق تھیں کہ تباہ و برباد ہو جامن مگر جناب میں۔ میں تو ایک مشہور اتفاق مطبع میں چھپی اور اس ملک کی مادری زبان میں لکھی گئی اور ٹھیک اُسوقت جب کہ انگریزی زبان زمانہ شیر خواری سے نکل کر لڑکپن اور لڑکپن سے شباب اور شباب سے کاروبار دنیا کے لیے اچھی طرح قابل ہو گئی تھی اور میری زبان نہایت شستہ و پاکیزہ سمجھی جاتی تھی"

(یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب نے اِس موقعہ پر ایسے کہنہ اور متروکہ محاورات استعمال کیے جنکو صورت بالا میں لانے میں مجھ کو کمال دشواری کا سامنا کرنا پڑا)

میں نے کہا" اچھا تو تم اپنی ہی زمانے کی تصنیفات کو لو اُن کے وجود کا خاتمہ بھی کنارِ گمنامی میں ہو چکا ہے۔ زبان کی شستگی اُس کی وسعت اُسکا پورے طور پر رواج پا جانا جن کی بنا پر تم بقائے دوام کا دعویٰ کرتی ہو مصنفوں یا مؤلفوں کے طبع زاد مگر کمزور تصور ہیں۔ ہر زمانے کے مصنفین یہی خیال کرتے چلے آئے ہیں کہ جس زمانہ میں ہم تصنیف و تالیف کر رہے ہیں اوس میں حسن و روانی آچکی ہے۔ اُس میں ہر قطع کے جذبات ہر طرح کی کیفیات کو ہر علم کے مطالب و مصطلحات کو بآسانی ادا کرنے کی قوت پیدا ہو چکی ہے۔ اُس میں استحکام اور کامل رواج کی شان قایم ہو گئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا مردہ یا ہماری تصنیف و تالیف کا ضائع ہونا ایک ایسا امر ہے جس کا تصور کرنا ہی محال ہے۔ حالانکہ کوئی وجہ نہیں کہ زبان میں تحدید و توسیع (تمام زبانوں میں الفاظ کے معنی گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں) کے ذریعہ سے الفاظ۔ محاورات اور طرز بیان میں تبدیلی واقع نہو اور زبان نیچر کے قانون تغیر کے۔ جس کے تسلط میں عالم موجودات کی ہر ایک شے ہے۔ تحت میں نہ آئے میری دانست میں ہر لائق و ہر دل عزیز مصنف کو جسے اپنے علمی کارنامہ پر بڑا ناز ہے اور جو اپنی روشندماغی کو دائمی شہرت کا سبب سمجھتا ہے ضرور اس قانون کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اُسکو لازم ہے کہ وہ امتداد زمانہ سے زبان کی رفتہ رفتہ تبدیلی اور مذاق طبائع کے تغیر و تبدل کو مدّنظر رکھے۔ اُسکو نظر اُٹھا کر اپنے ملک کے قدیم مصنفوں کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے زمانہ میں بڑے عالم اور بڑے فاضل سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے لیے ادبا کی پلکیں بچھانے اور تحسین کے ہونٹ

ہلانے میں سرگرم تھے مگر جب اونکا زمانہ گذر گیا۔ دوسرا دور آیا۔ نئی نئی طبیعتیں اور نئے نئے مذاق پیدا ہوئے تو خود اُن کی تصانیف نے اپنی کہنگی اور فرسودگی کے سبب اُنکو شہرت و فضیلت کی مسند سے اتار کر اُن کی جگہ نئے مصنفوں کو مسند آرا کیا۔ وہ خود پردۂ گمنامی کے سپرد ہوئیں اور اُس کے بعد کیڑوں کی غذا بنکر جس مادّہ سے اُن کا گوشت و پوست تیار ہوا تھا اُسی میں جا ملیں مصنف کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اُسکی اپنی زبان کو بھی جو اپنے وقت میں نعرۂ آفریں بلند کروا رہی ہے جو شستگی کا نمونہ سمجھی جا رہی ہے ایک زمانہ میں پرانی پڑتی اور ترک ہوتی جائے گی اور آخر کار خود اپنے ہی وطن میں ایسی اجنبی اور غیر مانوس ہو جائے گی جیسے کہ مصر میں احرام مصری یا جیسے ملک تاتار میں قدیم کتبے جو اب تک جا بجا پائے جاتے ہیں میں اس وقت جوش سے کسی قدر گرما گیا تھا میں نے کہا جب کبھی میرا گذر کسی جدید لائبریری میں ہوتا ہے اور وہاں میں چمکدار کنارے اور نہایت آب و تاب کی مجلد کتابیں دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر وہاں بیٹھکر آنسو بہاؤں اور مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو زرکسیس شاہ ایران کے دل میں پیدا ہوئی تھی جبکہ وہ اپنی بڑی دل فوج کا زرق برق وردیوں اور چمکتے ہوئے ہتیاروں میں سجی کھڑی تھی۔ معائنہ کر رہا تھا اور اُس کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ ایک صدی کے اندر اندر ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔

مگر میں زبان کے تغیر کو عموماً تمام عالم کے واسطے اور خصوصاً اہل تصنیف کے لیے خدا کی ایک ایسی رحمت سمجھتا ہوں جو کمال دانائی پر مبنی ہے اس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے جسکو میں ایک مثال کے پیرایہ میں

بیان کروں گا ہم روز مرّہ دیکھتے ہیں کہ انواع و اقسام کے اشجار زمین سے نکلتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں اور کچھ مدت تک میدان اور کھیتونکو اپنے برگ و بار سے پُر فضا بنا کر مرجھا جاتے ہیں اور آخر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں تاکہ ان کے بعد کے آنے والے درختوں کے لئے جگہ خالی ہو جائے۔ اگر یہ صورت نہوتی اور کوئی بھی درخت قدرتاً نیست و نابود نہ ہوا کرتا تو زمین کی سرسبزی و زرخیزی بجائے رحمت کے ایک زحمت ہو جاتی۔ کثرت اشجار و قشابک آثار کے بوجھ سے زمین چیخ اٹھتی۔ اور روئے زمین ایک ایسی سطح بنجاتی جس پر آپس میں پھنسے ہوئے۔ شاخوں میں شاخیں اڑائے ہوئے درختوں کا جال چھا جاتا۔ انسان کو قدم اوٹھانا اور زمین پر رہنا مشکل ہو جاتا۔ اسیطرح علم و فہانت۔ غور و فکر کے نتائج کو زوال ہوتا ہے تاکہ جانشین مصنفوں کی جولانی طبع کو کھلا میدان ملے اور اسیطرح زبان آہستہ آہستہ جگہ چھوڑتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ کتابیں ایک وقت خاص تک اپنی شہرت کا پیرایا اوڑھا کر رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ اگر یہ نہوتا تو پچھلے اور موجودہ خیالات کا ہجوم دماغوں میں سخت پریشان کرنے والا تلاطم پیدا کر دیتا۔ زمانہ گذشتہ میں خیالات کا دائرہ محدود کرنے کے لیے چند قدرتی سامان موجود تھے۔ اول تو کتابیں قلم سے نقل ہو کر پھیلتی تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ مشکل وقت اور دیر طلب تھی دُوم جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ یا تو چمڑے پر اور چمڑا ایک قیمتی شے تھی اس لئے نئی مشاہدات قلمبند کرنے کے لیے اسبات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ پہلے نوشتہ کو مٹایا جائے یا خیالات بے پائی ہیں

Papyrus (۲) مصری پودے کے پتوں پر لکھے جاتے تھے جو خشتہ اور

اور جلد خراب ہو جانے والے تھے۔ سوم تصنیف و تالیف کا کام نہایت محدود اور کم بار آور تھا۔ صرف وہ لوگ اس مشغلہ میں حصہ لیتے تھے جو خانقاہوں میں سجادہ پر بے فکری اور آرام سے زندگی گذارتے تھے۔ ان اسباب کا ہم کو ممنون ہونا چاہیئے کیونکہ یہی تھے جنھوں نے قدیم زمانے کے خیالات کے سیلاب کو دیوار بنکر روکا ورنہ موجودہ ذہانت اسمیں تھپیڑے کھاتے کھاتے غرق ہو جاتی۔

لیکن اب عالم کی ترقی اور کاغذ و پریس کی ایجاد نے مذکورہ بالا رکاوٹوں کو بالکل صاف کر دیا۔ پریس نے ہر ایک شخص کو مصنف بنا دیا اور ہر ایک دماغ کو اس قابل کر دیا کہ اپنے نتیجہ فکر تمام علمی دنیا میں پھیلا دے مگر اسکا انجام بڑا اندیشہ ناک ہوگا۔ علم ادب جو پہلے ایک چشمہ تھا دریا بنا اور دریا سے اب ایک بحر زخار ہو گیا۔ چند صدیاں پہلے ہزار پانسو مجلدات ایک بڑا کتب خانہ شمار ہوتی تھیں مگر آجکل کے کتب خانوں کا جن میں لاکھوں جلدیں فراہم ہیں کیا نام رکھنا ہوگا۔ طرفہ تر یہ کہ پریس کو اس پر بھی قرار نہیں وہ تعداد مذکور کو دن دونی اور رات چوگنی کرنے میں بڑی سرعت کے ساتھ مصروف ہے۔ یہ دیکھکر مستقبل پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے وہ خیالات کا کہنا تک مطالعہ کرے گا۔ اور کہانتک اُن کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھ سکے گا۔ مجھ کو خوف ہے کہ زبان کا آہستہ تغیر و تبدل پریس کی تیزی رفتار کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ بھی خیال کیا تھا کہ نکتہ چینوں کا گروہ خیالات کی کثرت کو روکے گا جو مکرر وہ مشتاقان تصنیف کو میدان تصنیف کے اندر قدم رکھنے سے روکتی ہے اور اوس کا دائرہ بھی شبانہ روز وسیع ہو جاتا ہے مگر میرا خیال

تجربہ نے غلط ثابت کردیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ چھاپنے والے سرگرمی سے چھاپ رہے ہیں اور لکھنے والے جوش سے لکھ رہے ہیں اور وہ دن قریب ہے جبکہ دنیا کی سطح سے میلوں کاغذی ہمالیہ اوٹھتے نظر آئیں گے اور صرف کتابوں کے نام پڑھنے کے لیے پورا زمانہ عمر درکار ہوگا۔ اس کے آثار ابھی سے نظر آتے ہیں۔ چونکہ آجکل بھی اکثر لوگوں کو کمی وقت اور کثرت کتب کے باعث صرف مطالعہ ریویو پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور چند صدیوں بعد تو فاضل متبحر وہ شخص کہلائیگا جس کا دوسرا نام زندہ فہرست کتب ہوگا

کتاب نے کہا "حضرت تمہارا قطع کلام ہوتا ہے جس کی میں معافی چاہتی ہوں اور میں گمان کرتی ہوں کہ تم کو فقط نثر سے شوق ہے۔ تمہیں اُس شخص کا بھی کچھ حال معلوم ہے جس نے میرے آوازہ شہرت کے دبتے ہی زمین پر شور مچانا شروع کردیا تھا۔ اور عام طور پر اُسکی شہرت چند روزہ سمجھی جاتی تھی اور فضلا اس سے نفرت کرتے تھے۔ چونکہ وہ ایک نادار اور نیم تعلیم یافتہ شخص تھا۔ نہ وہ لاطینی جانتا تھا۔ اور نہ یونانی سمجھ سکتا تھا اور ایک زمانہ میں اُس کو ہرن چیرنے کا پٹھا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو غالباً اُس کا نام شکسپیر تھا۔ شاید اب تک تو وہ گمنام ہوچکا ہوگا۔

میں نے جلدی سے جواب دیا "نہیں نہیں۔ بالکل اس کے برعکس بلکہ محض اُس کے طفیل میں اُس کے زمانہ کے علم ادب نے غیر معمولی استحکام پایا شکسپیر تو اُن لوگوں میں سے تھا جو صدیوں میں ایک آدھ بار خاص دماغ لے کر دنیا میں آتے ہیں اور علم ادب کی ترقی بے تباہی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ فطرت انسانی کو وہ اپنے خیالات کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ اُن عظیم الشان درختوں کے مانند ہوتے ہیں جو ہم کو کبھی کبھی

دریا کے کنارے پر دکھائی دیتے ہیں اور جو اپنی موٹی موٹی جڑیں زمین کے اندر گزوں گہری پیوست کر دیتے ہیں اور گرد و پیش کی مٹی بلکہ چھوٹے چھوٹے پودوں اور ردی گھاس کو سیلاب دریا سے بچا لیتے ہیں۔ یہی حال شکسپیر کا ہے۔ وہ زمانہ کی دست برد سے سینہ سپر ہوا۔ اوس نے اپنے زمانے کے محاورات اور زبان کو قایم رکھا اور متعدد ادنی ارتبہ کے مصنفوں کو صرف اسوجہ سے کہ وہ اُس کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے نسیاً منسیاً ہونے سے بچایا۔ مگر ہاں اب اوس کا بھی خدا حافظ ہے۔ چونکہ بے شمار حواشی اور بے تعداد معانی اُس کی تصانیف پر اُس بیل کی طرح جو کسی درخت پر لپٹ کر اُس درخت کو نظروں سے بالکل پوشیدہ کر دیتی ہے چھا گئے ہیں"۔

یہ سنکر اُس کتاب نے بڑے زور سے قہقہہ مارا۔ اور کہا تو کیا تم مجھے یہ یقین دلانا چاہتے ہو کہ کسی زمانہ کا ادب ایک آوارہ۔ ہرن چوکڑی جاہل تک بند کے ہاتھوں سے پائدار ہو سکتا ہے"۔ اور پھر ہنسنے لگی۔

مجھ کو اُس کا قہقہہ کسی قدر ناگوار گذرا مگر میں نے اُس کی اِس حرکت کو نادانی پر محمول کیا اور جواب دیا" بے شک ایک شاعر کو اپنے اشعار کی بدولت بقائے نام کا بہت عمدہ موقعہ ہے۔ شاعر دو طرح سے لکھتے ہیں اور ایک شاعر وہ ہے لکھتا ہے اور اپنے مضمون کو دل ہی میں اوتارتا ہے وہ نظر فریب نیچر کا ایک وفادار نقاش ہوتا ہے۔ اُس کا کلام مؤثر اور شگفتہ ہوتا ہے۔ وہ پاکیزہ جذبات کو زبان کا پاکیزہ لباس پہناتا ہے وہ انسانی زندگی کی مختلف شکلوں کو جو اُس کی نظر کے روبرو گذرتی ہیں مختلف تصویروں میں پیش کرتا ہے۔ اُس کا کلام اُس کے زمانے کی

تہذیب و شائستگی کی صحیح تاریخ ہوتا ہے اور زبان کے قیمتی موتیوں کو چن چن کر محفوظ کر لیتا ہے۔"

میں موجودہ شعرا کی توصیف میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ دفعتہً لائبریری کا دروازہ کھلا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو لائبریرین نے کہا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اوٹھ کھڑا ہوا۔ اور میں نے اُس کتاب سے باقاعدہ رخصت چاہی مگر وہ کچھ نہ بولی اور میں وہاں سے چلدیا۔

سیّد سجاد (دہلوی)

راحت زمانی مولوی سیّد احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونیکے ایک نہایت سود مند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان فسانۂ عجائب کے محاورے۔ قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنیکو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دلچسپی سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸

لڑکیوں کی انشا حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الرشید صاحب الہ آبادی کی قلم سے نکلے۔ لطف زبان کیواسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت عہ ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸)

منیجر عصمت۔ و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

ہماری فریاد

یا بنی تذکرۂ درد نہاں کرتے ہیں آپ پر حال زبوں اپنا عیاں کرتے ہیں
آج دل تھام کے حسرت سے فغاں کرتے ہیں صرف سن لیجئے شاہا جو بیاں کرتے ہیں

عرض حالت نہ سہی بخت کا شکوہ ہی سہی
شکوۂ حق نہ سہی شکوۂ بیجا ہی سہی

دیکھئے اپنی اس امت کو جو تھی خیر امم آج ہر بات میں ہر قوم سے وہ ہو گئی کم
اب وہ دل ہے نہ شجاعت نہ خلوص باہم نہ وہ پہلا سا جلال اور نہ وہ پہلا سا حشم

نہ بزرگوں کو ہے خود دل کے مناصب کا لحاظ
اور نہ خوردوں کو بزرگوں کے مراتب کا لحاظ

طالب سیم و زر و درہم و دینار ہے یہ طمع مال کے پھندے میں گرفتار ہے یہ
دین کو بیچ کے دنیا کی خریدار ہے یہ نفع دو روزہ کے لالچ میں زیاں کار ہے یہ

الغرض گرم ہے بازار گنہگاری کا
اس کے دل پر ہے جما سکہ سیہ کاری کا

فرقے اتنے ہوئے پیدا کہ عیاذاً باللہ نفرت ان سے ہے انہیں ان سے انہیں ہے اکراہ
ٹیڑھے رستوں کی یہ کثرت ہے کہ اِنّا لِلّٰہ رہروؤں کو کہیں ملتی نہیں اب سیدھی راہ

بھیس میں راہنماؤں کے ہیں رہزن لاکھوں
پُر ہنر ایک نہیں، اور ہیں پُر فن لاکھوں

فلسفہ عین تدیّن ہے، تدیّن الحاد علما ہو گئے تحریف کلم میں استاد
صفر ناسخ پہ بنائے گئے، منسوخ پہ صاد متواتر ہوئے موضوع، تو مشہور آحاد

آیتیں جتنی ہیں محکم، متشابہ ہیں بہت
نہ مؤول تو مؤول کے مشابہ ہیں بہت

جو مقلد ہیں، وہ تقلید ہی میں کوسوں دور
اپنی تقلید پہ ہیں غیر مقلد مجبور
بھائی شیعوں کو تبرّے نے کیا ہے مہجور
شرک و بدعت میں ہیں ارباب تصوف محصور

ہیں تنے چند، جو محفوظ ہیں ان باتوں سے
ورنہ لاکھوں ہیں جو محظوظ ہیں ان باتوں سے

خدمتِ مجتہدین کے ہیں یہ قدرشناس
دلیں کہتے ہیں نہ کچھ محنتِ اسلاف کا پاس
اپنے قرآن و احادیث، نہ اجماع و قیاس
رکن اسلام ہیں اک عقل ہی صرف اپنے پاس

قہر ہے فہم صحابہ تو نہ حجت ٹھیرے
ہاں مگر ان کے سمجھنے کو فضیلت ٹھیرے

یہ عجب طرح کی پھیلی ہے ہوا دنیا میں
ہیں جو کچھ مدعی صدق و صفا دنیا میں
ان کے نزدیک ہے جو غیر خدا دنیا میں
وہ خدا ہے کہ ہوا جلوہ نما دنیا میں

یہ بداندیش ہیں ممکن کو بھی واجب کہتے
شرم آتی نہیں موہوب کو واہب کہتے

پہلے دوزخ سے ڈراتے تھے سبھوں کو علما
دوزخی کہنے لگے اب علما کو جہلا
کیوں شریفوں نہ آوازے کسیں اب کمنا
کہ کمینے ہیں کمینوں سے زیادہ شرفا

گرم بازاری حرص و طمع و زور ہے اب
منزل زہد و ورع ان سے بہت دور ہے اب

کہیں قرآن سے ثابت ہوئی ہے حرمت سود[1] ہے کہیں ملت میں صرف بمقدار ضرورت

[1] اکثر لوگ تعدی امراض کے شک پر جھوٹے کے استعمال کو مہلک یا مضر سمجھتے ہیں۔ اور لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کی رو سے اسکو حرام کہتے ہیں۔ فنعوذ باللہ من شرور انفسنا

نظم قرآن میں دکھاتا کوئی نقص و قصور کوئی اقوال پیمبر میں بتاتا ہے فتور
کوئی کہتا ہے کہ منسوخ ہیں آیاتِ نماز
سود خواری کا نکالا گیا قرآں سے جواز

ہے خدا کی نہ پیمبر کی محبت دل میں جوش مذہب ہی نہ اسلام کی حرارت دل میں
نہ حدیثِ نبوی کی ہے وقعت دل میں نہ وہ قرآن کے احکام کی عظمت دل میں
حکم نماز واجبِ تعمیل ہیں اب صوم و صلوٰۃ
امر ناقابلِ تسلیم ہیں اب حج و زکوٰۃ

چند لیڈر جو ہیں اس قوم کے جن پر ہے یقین کہ یہ ہیں مذہب و ملت کی ترقی کی مشین
واقفیت انہیں اتنی بھی نہیں بالتعیس کیا ہے ایمان کی تعریف، کسے کہتے ہیں دیں
کس طرح منزلِ مقصد کو وہ رہرو پہونچے
رہنما جس کا ہو گمراہ زیادہ اوس سے

ہم نے مانا کوئی جج کوئی کلکٹر ہو جائے یا کوئی محکمۂ فوج کا افسر ہو جائے
یا ترقی میں کوئی اس سے بھی بڑھکر ہو جائے وقت کا اپنے یاں تک کہ سکندر ہو جائے
یوں ترقی ہوئی شخصی تو بھلا عام کو کیا
نفع دنیا سے غرض مذہبِ اسلام کو کیا

ہے یہ لازم جو ہے دنیا کی ترقی کا خیال پہلے عقبےٰ کی ترقی میں کریں استکمال
ورنہ ہو جائیگی معکوس ترقی کی مثال کچھ نہ ہاتھ آئیگا آخر کو بجز رنج و ملال
کیوں سمجھتے نہیں اتنا ہے اگر عقل و وقوف
کہ ہے مومن کے لیے دین پہ دنیا موقوف

الغرض رہنما جتنے ہیں سب نام کے ہیں نہ کسی نفع کے ہیں اور نہ کسی کام کے ہیں
قوم کے ہیں نہ یہی خواہ نہ اسلام کے ہیں چاہنے والے فقط اپنے ہی آرام کے ہیں

خادم اپنے کو بناتے ہیں کہ مخدوم نہیں
ایسے موجود سے بہتر ہے کہ معدوم نہیں

یا نبیؐ! ہو چکی کمزوریٔ اخلاق بیاں — مذہبی رنگ جو تھا وہ بھی ہوا صاف عیاں
آپ سے حالتِ ملکی بھی نہیں گرچہ نہاں — کھو لیتے ہیں مگر اب اس میں بھی ہم اپنی زباں

مطلب اس عرض سے ہے یاد دہانی گویا
سامنے اپنے ہے بیتی سنیئے کہانی گویا

ہائے وہ قوم کہ جرأت میں تھا شہرہ جس کا — جمگیا تھا دلِ اغیار پہ سکہ جس کا
ساری اقوام تھی مانے ہوئے لوہا جس کا — کانپ جاتے تھے جگر رعب تھا ایسا جس کا

بادشاہوں سے لیا کرتی تھی جو باج، افسوس!
سو ذلیلوں میں وہ ہے ایک ذلیل آج افسوس!

کھُد گئی سلطنتِ ملکِ عجم کی بنیاد — ہو گئی قرطبہ و مصر کی شوکت برباد
اپنے قبضے میں ہیں دریا، نہ بیابان، بلاد — خانہ ویران ہیں وہ جن سے ہوئی دنیا آباد

سلطنت اب نہیں دنیا میں مسلمانوں کی
رہ گئی ایران کی بھی اب خیر نہیں جانوں کی

پھیلی ہے آجکل ایران میں وہ بد نظمی — کہ ہے یاں ہند میں سُن سُن کے ہمیں بے چینی
سلطنت چین سے ہے، اور رعایا کو خوشی — الغرض کچھ نظر آتی نہیں حالت اچھی

سب کو ہے فکر کہ ایران و بالیں کیوں کر
اب مسلمانوں کو یاں سے بھی نکالیں کیوں کر

ہائے وہ شرع جو ہے مرکزِ اسلام اب تک — مذہبی جوش کا باقی ہے جہاں نام اب تک
جس جگہ باتوں میں کھنچ جاتی ہے صمصام اب تک — مازا مرنا ہے لوگوں کا جہاں کام اب تک

وہ بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے بفا کاروں کی

ہر چڑھاوے سے نظروں پہ ستمگاروں کی

آج اٹلی نے دبایا ہے جو اک ملک اُس کا | دوسرے ملک پہ کل کوئی کریگا دھاوا۔
کان شیطان کے بہرے، جو یہی طور رہا | نام پھر سطوتِ اسلام کا مٹ جائیگا

دینِ اسلام کی شوکت نہ رہے گی باقی
یا نبیؐ آپ کی اُمت نہ رہے گی باقی

آخر اب ہم یونہیں تڑپا کریں کبتک اُٹھیے | آفتِ روز کی جھیلا کریں کبتک، اُٹھیے
یا نبیؐ! صدمے اُٹھایا کریں کبتک اُٹھیے | حشر کی راہ ہی دیکھا کریں کبتک، اُٹھیے

ہو چکا خوابِ گراں آیئے اب بس اُٹھیے
اُٹھیے اے ہمنفسِ اُمتِ بیکس اُٹھیے

دیکھیے اب دوشِ مبارک پہ وہ پُرنور عبا | باندھیے سر پہ عمامہ، کہ ہوں مشتاق ندا
نازنیں ہاتھوں سے کیجئے گرہ بند قبا | لیجئے دستِ مبارک میں تنورسا عصا

آیئے روضے سے باہر ہیں بہت یار مشتاق
ایک مدت سے مدینے کی ہیں گلیاں مشتاق (تمنا)

تصویر جلوس شاہی

جو آج کے پرچہ میں زیبِ ورق اول ہے اُسوقت کا ایک نظارہ ہے جب جلوس شاہی قلعہ معلّٰی سے نکلکر جامع مسجد کیطرف آرہا ہے۔

شہنشاہ معظم کی تشریف آوری سے دلّی کو جو رونق نصیب ہوئی اُس کا مختصر سا خاکہ یہ تصویر ہے جس سے ناظرین تمدن کو معلوم ہوگا کہ یہ جلوس کس شان اور کروفر سے روانہ ہوا۔ اُمید ہے کہ یہ تصویر نہایت دلچسپی سے دیکھی جائے گی۔

مسئلہ ازدواج وطلاق

ایک دھریہ کی نظر میں

(۱) کیا تم کسی حالت میں طلاق کے اصول کو جائز و انسب قرار دیتے ہو؟

بالعموم مردے دنیا پر راج کر رہے ہیں۔ اور زندہ لوگ مردہ لوگوں کے زیر ظلم ہیں۔ پرانے خیالات جو اپنی اپنی ضروریات کے وقت پیدا ہو کر معدوم ہو چکے ہیں۔ ابھی تک دلوں میں جاگزیں ہیں۔ بہت سے لوگ طبعاً قدامت پرستی کی طرف مائل ہیں اور پرانی ڈگر پر چلنا چاہتے ہیں۔ بغیر دریافت کیے کہ وہ راستہ انہیں کدھر لے جائیگا۔ اور بغیر جانے کہ وہ خود کس طرف جانا چاہتے ہیں +

طلاق کے متعلق خیالات ہمیں قرون اولین کے عیسائیوں سے ورثہ میں ملے ہیں اور ہم تک مذہبی رنگ میں پہنچائے گئے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے عیسائیوں کا خیال تھا۔ کہ دنیا تو اب نیست و نابود ہونے والی ہے۔ یا بذریعہ آگ صاف و پیتر کی جائے گی۔ تمام شریر النفس غارت ہونے والے ہیں۔ اور نیک لوگ ہوا میں بلند ہو کر اپنے خداوند سے جا ملیں گے۔ تاکہ وہ وہاں اس وقت تک قیام پذیر رہیں۔ جب تک کہ زمین مبارک لوگوں کے رہنے کے قابل نہ ہو جائے اس خیال اور یقین کی موجودگی میں دنیا کی کوئی چیز مقابلتاً کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی ایسا شخص جو ازدواج جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے ذخیرہ خانے بناتا۔ ایک بیوقوف زمیندار سمجھا جاتا تھا۔ جو ازدواج کی دہن میں اپنی روح کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتا۔ وہ خوش حال اور کھاتے پیتے لوگوں کو دولت کے خدا کی

اولاد سمجھتے تھے۔ اور بد قسمت مصیبت زدہ اور بیمار لوگوں کو خدائے برحق کے پسندیدہ بندے وہ تمام دنیا کے کاروبار کو حقارت کی آنکھ سے دیکھتے اور سوائے زکوٰۃ دینے کے اور سب کاموں کو بند کرنے کی کوشش کرتے۔ شادی کرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ اور اسیطرح اپنے گھر بار بنانے کا بھی کوئی وقت نہیں تھا۔ ان کے تمام خیالات سے دے کے آسمان کیطرف لگے ہوئے تھے جس کے وہ وراثت میں پانے کی اُمید موہوم لگا رہے تھے۔ تجارت۔ محبت۔ اور تمام دنیاوی چیزیں فضول سمجھی جاتی تھیں +

نئے عہدنامہ میں حواریوں کے گھر بار کی نسبت کچھ مرقوم نہیں ہے اور اسی طرح ان کی گھر بار کی زندگی۔ گھر کی خیر و برکت تعلیم و تعلّم کی ضرورت اور دماغ کی نشو و نما اور ترقی کی نسبت بھی کچھ ذکر نہیں ہے۔ یہ چیزیں دل و دماغ سے صرف اس بنا پر بھلا دی گئی تھیں کہ پیش آنے والے واقعہ کے سامنے ان کی کچھ ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ سوائے اسکے کہ لوگ مسیح کے آنے پر تیار رہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر خود مسیح ان لوگوں کو انعام دیتے تھے۔ جو اپنے بیوی بچوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہکر چھوڑ دیتے تھے۔ انسانی محبت نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی لہ مُردوں کو اپنے مُردے گاڑنے دے۔ تو میرے پیچھے آ۔ مجھے اس سے کیا مطلب"۔ لوگ نہ صرف ان باتوں پر یقین رکھتے تھے بلکہ ان پر

لہ ۵ مقدس متی کے آٹھویں باب ۱۸ ویں آیت سے لیکر ۲۲ ویں آیت کی طرف اشارہ ہے :۔ جب یسوع نے بہت سی بھیڑ اپنے آس پاس دیکھی۔ اس نے حکم کیا کہ پار جاویں اور ایک فقیہہ نے آکے اسے کہا۔ اے استاد۔ جہاں کہیں تو جائے میں تیرے پیچھے چلوں گا۔ اور یسوع نے

عامل بھی تھے۔ جن کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ زندگی کے تمام تعلقات کی مخالفت کی گئی اور ان کو توڑ دیا گیا۔ اور ان کی پابندی ضروری نہ سمجھی گئی۔ شادی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ اور اس کی نسبت یہ خیال تھا کہ نکاح ظاہراً اور بے لگام گناہ سے ایک درجہ بڑھکر ہے۔ اور اس کا جواز انسانی کمزوری پر دال ہے۔ نکاح نہ کرنا زیادہ اچھا سمجھا جاتا تھا۔ عورت سے محبت کرنے کی نسبت خدا سے محبت کی لو لگانا زیادہ اعلیٰ اور ارفع تصوّر کیا جاتا تھا۔ انتہا درجے کے اللہ والے اور عابد مجرّد کی زندگی کو روا رکھتے تھے اور عورت کو بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ لیکن ان تمام باہمی اختلافات اور متضاد باتوں کے ہوتے ہوئے جو پادریوں میں امتیازی حیثیت سے پائی جاتی ہیں۔ نکاح ایک طرح کی قسم خیال کیا جاتا تھا۔ قاضی (یعنی پادری) شادی کرنے والوں سے کہتا تھا کہ "یاد رکھو۔ تم عمر بھر کے لیے گرفتار کئے گئے ہو۔ یہ دروازہ صرف ایک دفعہ کھلتا ہے[۵۱] نکاح کی زندگی سے پیشتر تمام راستے ایک ہی منزل مقصود کا پتہ دیتے ہیں" اور یہ گویا نکاح کرنے کی ایک سزا تھی پادری محسوس کرتا تھا کہ نکاح کا عہد اگر خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہیں ہے۔ تو کم سے کم اس کی نصیحت کے خلاف ہے جس کی پاداش میں از روئے انصاف شادی کرنے والے کو کسی نہ کسی طرح

بقیہ (نوٹ صفحہ ۲۲) اس سے کہا۔ کہ لومڑیوں کے لیے ماندیں اور ہوا کے پرندوں کیواسطے بسیرے ہیں۔ پر ابن آدم (مسیح) کے لیے جگہ نہیں جہاں اپنا سر دھرے۔ اس کے شاگردوں میں سے دوسرے نے اس سے کہا۔ اے خداوند مجھے رخصت دے کہ پہلے جا کر اپنے باپ کو گاڑ دوں پر یسوع نے اس سے کہا۔ کہ تو میرے پیچھے آ۔ اور مردوں کو اپنے مردے گاڑنے دے" مترجم۔

[۵۱] مطلب یہ ہے۔ نکاح کرنے کے بعد کسی حالت میں دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا۔ مترجم۔

سزا ملنی چاہیئے اس دھمکی پر اس کا بھی اضافہ کیا جاتا تھا اور اچھی طرح سے کان کھول کر جتا دیا جاتا تھا کہ طلاق کسی حالت میں ممکن نہیں۔ اور اس غلطی کی اصلاح ناممکن ہے۔ ہر شادی و بیاہ کے موقعہ پر یہ پادری اپنی خشک انگلی کو دولہا اور دلہن کی طرف بڑھاتا تھا۔

تقریباً تمام عقلمند اصحاب نے اب اس خیال کی پیروی چھوڑ دی ہے کہ دنیا کا جہاز اب ساحل اختتام پر آن لگا ہے۔ اور عنقریب اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ وہ اس کا بھی یقین نہیں کرتے۔ کہ خوشحالی بدی کی کوئی خاص علامت ہے یا مفلسی اور ناداری نیکی کے مسلّم سرٹیفکیٹ ہیں انہیں اب اس بات کا بھی یقین نہیں آتا۔ کہ ڈائیوز[1] کو محض اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے دوزخ میں

[1] مقدس لوقا کی انجیل میں ایک دولتمند اور مفلس کے قصہ کیطرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے :-
ایک دولتمند تھا (جس کا نام ڈائیوز تھا) جو لال اور مہین کپڑے پہنتا اور روز روز شان و شوکت سے عیش کرتا تھا۔ اور لاذر نامی ایک غریب آدمی جو زخموں سے زخمی تھا لوگ اسکی ڈیوڑھی پر ڈال جاتے تھے اور وہ آرزو کرتا تھا کہ ان ٹکڑوں سے جو دولتمند کی میز سے گرتے تھے۔ اپنا پیٹ بھرے بلکہ کتے آکے اس کے گھاؤ چاٹتے تھے۔ اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مر گیا۔ اور فرشتوں نے اسے لیجا کے ابراہیم علیہ السلام کی گود میں رکھا۔ اور دولتمند بھی مرا اور گاڑا گیا۔ اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ اور ابراہیم کو دور سے دیکھا۔ اور اسکی گود میں لاذر کو اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابراہیم! مجھ پر رحم کر اور لاذر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگوئے میری زبان ٹھنڈی کرے۔ کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔ تب ابراہیم نے کہا کہ اے بیٹے۔ یاد کر کہ تو اپنی زندگی میں اچھی چیزیں لے چکا اور لاذر بری چیزیں۔ سو اب وہ تسلی پاتا ہے اور تو تڑپتا ہے۔ اور ان سب کے سوا ہمارے تمہارے درمیان ایک بڑا گڑھا دھرا گیا ہے اس لئے کہ وہ جو یہاں سے تمہارے پاس جایا چاہیں۔ نہ جا سکیں۔ اور نہ وہ لوگ جو وہاں ہیں اس پار

ڈالا ہوگا۔ اور یہ کہ لعزر غریب ہونے کے سبب ہمیشہ کی خوشی یعنی بہشت کا مستحق ہوا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ خوشحال نیک ہو سکتے ہیں۔ اور بدقسمت بد۔ اب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ شرائطِ خوشحالی کی عدم پابندی یقینی طور پر بدقسمتی اور مصیبت کا راستہ دکھاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا۔ جب کہ لوگوں کا خیال تھا کہ شخص واحد کا گناہ تمام فرقے۔ برادری یا قوم پر غرض جس کسی کا اس سے کچھ بھی تعلق ہے۔ پڑتا ہے۔ یہ بات بھی درجہ یقین کو پہنچگئی تھی۔ کہ اگر کسی مرد یا عورت نے خدا سے کچھ نذر نیاز مان رکھی ہے۔ اور کسی طرح وہ اپنے عہد کے پورا کرنے میں قاصر رہی ہے۔ تو خدا تعالیٰ اس کے بدلہ میں تمام قوم و فرقہ کو سزا دے گا اس خیال کو بھی اب کوئی نہیں مانتا۔ جوں جوں ہم ترقی کر رہے ہیں۔ دوں دوں ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص واحد کے حقوق کیا ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں کسی حد تک معلوم ہو گیا ہے۔ کہ شخصی حقوق سے بڑھکر اور کسی کے حقوق نہیں ہیں ایک زمانہ تھا جبکہ عوام کا یہ خیال تھا کہ سزا درست کرنے والی زبردست طاقت ہے۔ گویا بالفاظ دیگر لوگ حیوانی جبر کے فیض اور اثر کے قائل تھے۔ لیکن دنیا اب بدل رہی ہے۔ ایک وقت میں لوگ اس

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳) اس پار ہمارے پاس آسکتے ہیں تب اس نے کہا پس اے باپ! تیری منت کرتا ہوں کہ تو اسے میرے باپ کے گھر بھیج کیونکہ میرے پانچ بھائی ہیں تاکہ ان پر گواہی دیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آویں۔ ابرہام نے اسے کہا۔ کہ ان کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) اور انبیا ہیں۔ چاہیئے۔ کہ وہ ان کی سنیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ اے باپ ابرہام! پر اگر کوئی مُردوں میں سے ان کے پاس جائے۔ وہ توبہ کریں گے۔ اس نے اسے کہا۔ کہ جب وے موسیٰ اور نبیوں کی نہ سنتے ہیں۔ تو اگر مُردوں میں سے کوئی اٹھے تو اسکی نہ مانیں گے" ۱۲ منہ (از ترجمہ انجیل) مترجم

امر کے بھی قائل رہے ہیں۔ کہ کیتھولک مذہب[1] درحقیقت سوسائٹی کا مبنی ہے اور یہ کہ ایک فلاسفر کا قتل سلطنت کے انتظام کے لیے ازبس ضروری ہے[2] اور خواہ کچھ بھی ہو سلطنت کی حفاظت کرنی چاہیئے لیکن اب ہم زیادہ روشنی میں آ گئے ہیں۔ اور اس روشن نقطہ پر جسکو زمانہ حال کہتے ہیں۔ کھڑے ہو کر مجھے تمھارے سوالات کا جواب دینا چاہیئے۔

نکاح ایک نہایت ہی ضروری اور نہایت ہی مقدس عہد ہے جسکو بنی نوع انسان انجام دے سکتے ہیں۔ اس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ ہم اسے کس نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ خواہ عہد و پیمان کے نام سے۔ خواہ قسم سے لیکن بہرحال مطلب ایک ہی ہے۔ سچا نکاح دراصل روحوں کے اتحاد اور ملاپ کا نام ہے۔ ایسا اتحاد جس میں جھگڑے کا خیال ہی نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا اتحاد ہے جس میں کل چیزیں واحد نظر آتی ہیں۔ تمام امتیاز اٹھ جاتے ہیں۔ اور زمانہ حال دائمی معلوم ہوتا ہے۔ ان اعلیٰ گہرائیوں میں کل چیزیں روشنی کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ اندھیرا نام کو نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب دو وجود اس طرح محبت کریں اور آپس میں مل کر ایک ہو جائیں تو فی الحقیقت دو روحوں کا یہی ایک نکاح ہے۔ جو کچھ مذہبی۔ پادری۔ میجسٹریٹ یا دوسرے گواہوں کے سامنے کہا جاتا ہے۔ وہ ایک صرف اس عہد کی جو دل میں کیا جاتا ہے۔ ایک ظاہری گواہی اور نشانی ہے۔ وہ تو صرف اس اتحاد کی تائید کرتا ہے۔ جو ابھی دونوں کے دلوں میں طے ہو چکا ہے۔ یا ابھی

[1] کیتھولک مذہب کے محتسب عیسائیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سزا دیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسے لوگوں کا عدم وجود سوسائٹی کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے۔ مترجم۔

[2] مثلاً گیلیلیو کو صرف اس بات پر قید کر دیا گیا تھا کہ وہ زمین کے سورج کے گرد پھرنے کا قائل ہو گیا تھا۔ مترجم۔

دو صنعتوں کی جو شام سے ایک ساتھ ملنے کی متوقع ہیں ہر ایک نے اپنا اپنا آئیڈیل (مافی الضمیر) معلوم کر لیا ہے مرد نے تمام دنیا میں سے ایک ایسی عورت کو منتخب کر لیا ہے۔ جو اس کے نزدیک محبت۔ پاکیزگی۔ جذبات دل لگی خوبصورتی اور ناز و انداز کی مجسم تصویر ہے اور عورت نے بجائے خود ساری دنیا میں سے ایک ایسے مرد کو پسند کیا ہے۔ جو اس کے نزدیک اس کا آئیڈیل ہے۔ اور جو کچھ بھی وہ دلیری۔ بہادری۔ اور ایمانداری کی نسبت جانتی ہے سب کچھ اپنے خاوند کے وجود میں دیکھتی ہے۔ عہد و پیمان کا خیال جاتا رہتا ہے۔ فرائض اور حقوق فی الفور محبت اور خوشی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور دو زندگیاں دو دریاؤں کی طرح ایک ہو کر بہنے لگتی ہیں۔ اس نکاح اور ان کے باہمی فرائض کے مقدس ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔ اور رسوم میں تو سوائے اس کے کہ مرد اور عورت دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی چاہ ہو۔ اور تمام دنیا یہ جان لے کہ وہ فی الحقیقت بیاہے گئے ہیں۔ اور ان کی روحیں آپس میں مل گئیں اور کچھ نہیں ہوتا۔

نکاح کے کھلم کھلا اور علانیہ طور پر ہونے کی طرفداری میں ہزاروں وجوہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑھکر تو یہ کہ لوگوں کو اس اتحاد کی پاکیزگی معلوم ہو جائے۔ پھر رسوم نہ صرف دولہا دلہن کی حفاظت اور بھلائی کے لیے ضروری ہیں۔ بلکہ ان کے بچوں کی حفاظت اور بہتری کی عام بہبودی کے لیے بھی ویسی ہی فائدہ بخش ہیں لیکن پھر بھی نکاح ایک ارفع و اعلیٰ درجہ کا عہد و پیمان ہی رہتا ہے۔ ایسا عہد جس میں ہر ایک دل دیتا اور لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نکاح کسی حالت میں فسخ بھی ہو سکتا ہے؟ مختلف فرقوں کی طرف سے جو کچھ جوابات دیے گئے ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں لیکن ان مذہبی رایوں کے اندر عہد و پیمان کا سوال چھپا ہوا ہے اس نکاح کے قول و قرار میں مرد اپنی بیوی کی حفاظت کرنے اور اسکو ہر طرح سے خوش رکھنے کا عہد کرتا ہے۔ فرض کرو کہ وہ اب اسکی حفاظت کرنے سے منکر ہے اور اپنی منکوحہ کو گالیاں دیتا ہے اور پیٹتا ہے۔ اور اس پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتا ہے۔ اب اس مظلوم کا کیا تدارک کرنا چاہیئے؟ کیا وہ عورت ان حالتوں کے ہوتے ہوئے اپنے خاوند کی کی پابند ہے؟ خاوند نے عہد شکنی کی ہے۔ وہ اسکی حفاظت کرنے میں ناکامیاب ہوا ہے۔ اور اس کے علاوہ اس نے اس عورت کو جانوروں کی طرح پیٹا ہے۔ پھر کیا وہ عورت اپنے خاوند کی پابند ہے؟ کیا اس عورت پر اپنے خاوند کے عہد و پیمان کا کچھ زور اور اثر ہے؟ اگر ہے تو وہ اثر کس قسم کا ہے؟ کیا اس عورت کو اپنے خاوند کے ساتھ صرف اسکی خاطر رہنا چاہیئے۔ اور اگر وہ عورت اسکو اپنی جان بچانے کے لیئے چھوڑتی ہے۔ تو پھر کیا یہ ضروری ہے کہ عورت اپنے خاوند کی خاطر اسکی بیوی بن کر رہے؟۔ کوئی عقلمند آدمی ان سوالات کا جوابات اثبات میں نہیں دے سکتا۔

اب اگر عورت اپنے خاوند کی خاطر اسکی بیوی رہنے کی پابند نہیں ہے تو پھر کیا وہ صرف اس بنا پر کہ نکاح ایک قسم ہے۔ اسکی بیوی رہنے پر مجبور ہے؟ کیا خدا کی طرف سے عورت پر کوئی جبر ہے کہ وہ اس وحشی خاوند کے ساتھ زندگی بسر کرے؟ کیا اس عورت کا طریق زندگی

لامحدود ذات کی خوشی پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان لامحدود ذات کی خوشی کو گھٹا بڑھا سکے؟

اس معاملہ کے متعلق دوسرا سوال سوسائٹی کی فلاح و آسودگی ہے۔ یہ تو بالضرور مان لیا جائیگا۔ کہ سوسائٹی کی بہبودی ایسے لوگوں کی علحدگی پر منحصر ہے یقیناً سوسائٹی کسی عورت پر جبر نہیں کر سکتی۔ کہ وہ ایسے خاوند کے ساتھ رہے جو ہر وقت اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہو شادی شدہ عورتیں بھی حفاظت کا حق رکھتی ہیں۔ ذاتی محافظت کا حق کسی عہد و پیمان یا قول و قسم سے ضائع نہیں ہو جاتا۔ اس معاملہ میں اگر ان کی نسبت نہایت ہی ادنے درجہ کی رائے بھی قایم کیجائے۔ تو بھی وہ ادنے متحرک جانداروں کے برابر حق رکھتی ہیں *

اس بات کو غالباً بہت سے طلاق کے دشمن بھی تسلیم کرلیں گے لیکن وہ پھر اس امر پر زور دیں گے۔ کہ اگر بیوی کو اپنے خاوند کے مکان سے بھاگ جانے اور اپنے خویش و اقربا کے ہاں پناہ لینے کا حق حاصل ہے تو کم سے کم نکاح جو ایک قسم ہے۔ فسخ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے میں کچھ سوسائٹی کا نفع ہے۔ کہ جو لوگ آپس میں نفرت رکھتے ہوں۔ ایک ساتھ رہیں؟ کیا یہ زیبا ہے کہ دنیا ایسے افراد سے آباد ہو جو نفرت۔ بغض۔ شہوت اور حسد کی ذریات ہوں۔ یا باہمی محبت کی مبارک نسلوں سے؟ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ دانا اور رحیم خدا اس امر پر زور دے کہ ایک سیکس عورت ایک کمبخت کی بیوی بن کر رہے؟ کیا اس فعل سے بہشت کی خوشی میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ یا وہ دونو ایک ہو کر رہ سکتے ہیں؟ کیا گورنمنٹ کے لیے اس سے بڑھکر کوئی اور بات معیوب ہو سکتی ہے کہ وہ

عورت کو کسی ایسے شخص کی جس سے اسکو دلی نفرت ہے۔ بیوی بن رہنے کے لیے مجبور کرے؟ کیا کوئی معقول آدمی اپنی بیوی کو اپنے ہی گھر رہنے کے لیے کسی کانسٹیبل یا شریف جج یا پادری سے مدد کی درخواست کرتا ہے؟ کیا ایسے آدمی سے جو اس معاملہ میں زبردستی روا رکھتا ہو بڑھکر کسی نفرت انگیز انسان کا خیال کرنا ممکن ہے؟ عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ عورت گھر سے نکل جانے کے معاملہ میں ہر طرح سے آزاد ہے اور یہ کہ عدالتیں عورت کو ایک ایسے شخص کی شرارت اور وحشی پن سے ضرور محفوظ رکھیں گی جس نے کہ اس کے محافظ بننے کا وعدہ کیا تھا لیکن سوال یہ ہے۔ کہ عورت جائے کہاں؟ ممکن ہے کہ اس کے رفقا اور دوست نہ ہوں۔ یا یہ کہ وہ غریب ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو۔ تو پھر کیا اسے دوسرا گھر آباد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے؟ کیا ضروری ہے کہ یہ صحیح و تندرست عورت جس میں مہربانی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس زندہ لاش کے ساتھ جکڑ کر باندھ دی جائے؟ کیا اس کے لیے اب کوئی مستقبل نہیں ہے؟ کیا اب ہمیشہ کے لیے اسے مردود اور خارج کرکے اس سے بیوفائی کرنی چاہیئے؟ کیا وہ اب اپنے بچوں کے نازک بازوؤں کو اپنی گردن کے ارد گرد ڈال کر کسی ایسی جگہ ایک ایسے خاوند کے ساتھ جو اس سے محبت کرسکتا ہو۔ اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو نہیں بیٹھ سکتی؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ سوشل امور میں اس عورت کو نہایت ادنے اور حقیر سمجھا جائے۔ اور کیا ایسا سمجھنا بنی نوع انسان کے مفاد کی خاطر ہے یا اس کمبخت کی خاطر جس نے اپنی جان کو تباہ و برباد کر دیا ہے؟

بالعموم یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ اگر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ عورت اپنا وقار اور عزت غرض سب کچھ کھو بیٹھے گی۔ کیا اپنا اخلاقی کیرکٹر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بیچاری آزادی سے ہاتھ اٹھائے؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ اپنی عفت[1] و پاکبازی قائم رکھنے کے لیے ایک حیوان یا سوسائٹی یا بدطینت دیو کی غلام بن کر رہے۔

اگر کوئی لامحدود وجود عہد و پیمان کرنے والے فریقین میں سے کسی ایک کا شریک ہے۔ تو کیا یہ اس کا فرض نہیں ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے کہ اس عہد و پیمان کی کہاں تک پابندی ہوئی ہے؟ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے حقوق صرف اس بنا پر ادا نہیں کرتی کہ اس کے خاوند نے عہد کے خلاف کیا ہے۔ بلکہ اس کی جان تک لینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ تو کیا یہ ممکن ہے۔ کہ عورت کے دل میں خاوند کی طرف سے محبت کا احساس پیدا ہو؟ اور اگر ان دونوں میں محبت کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔ تو پھر نکاح کی کیا قدر قیمت ہی اور اس عہد نامہ یا قسم میں سے باقی کیا خاک رہ جاتا ہے؟ عورت اب بیوی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اسکو اپنے خاوند سے نفرت ہے۔ اب وہ اس کے مکان میں بھی رہنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ وہ ڈرتی ہے کہ کہیں اس کا خاوند اسے مار نہ ڈالے۔ اس کے بعد اب اگر ان کے درمیان کچھ تعلقات باقی رہ جاتے ہیں۔ تو وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی شکاری اور شکار۔ ظالم اور مظلوم کے مابین ہوں کیا یہ امر قابل تعریف ہے کہ ایسا تعلق زندگی بھر قائم رہے۔ اور اس پر مذہبی رسوم کی رنگ آمیزی کر کے اس رشتہ کو اور زیادہ مقدس بنا دیا جائے؟

---

[1] خلو ریاد عصمت۔ کا ماعدہ نہیں ہے۔ ایڈیٹر۔

میں پھر پوچھتا ہوں کہ کیا ان حالتوں کے ہوتے ہوئے ایسی عیالداری کی زندگی بسر کرنا کچھ نیک بات ہے؟ کیا ہمیں ایسے بچوں کی کچھ ضرورت ہے جو ایسے کمبخت والدین کی اولاد ہوں۔؟ کیا دوسرے لوگوں کی عفت و پاکبازی صرف اس عیش کی پائمالی اور ہمیشہ کی قید سے قائم و برقرار رہ سکتی ہے؟۔

جس عقد کی بنیاد محبت پر قایم نہیں ہے بہت خراب ہے۔ اور جس شادی کی غرض و غایت ذاتی وجاہت اور دولت کا حصول ہو۔ بہت ادنے ہے لیکن ہم ایسے نکاح کے متعلق کیا کہیں گے جہاں کہ فریقین (دولہا اور دلہن) قطعی طور پر ایک دوسرے سے نفرت رکھتے ہوں؟ کیا ایسا کرانکی میں داخل ہے یا فعل اخلاق کے کسی محاسن میں شمار کرنے کے قابل ہے؟ کیا بغیر اصلی اور سچے تعلق کے ہوتے ہوئے محض ظاہر اور بیوی کا نام قائم رکھنے میں کوئی خاص نیکی ہے؟ کیا کوئی معقول عورت یا کوئی معقول مرد یہ ظاہر کرنے پر رضامند ہوگا کہ ایک سچی محبت کرنے والی عورت ایسے بچوں کی ماں بننے کے لیے مجبور کی جائے جن کے والد کو وہ نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے؟ کیا صفحہ ہستی پر کوئی ایسی عورت ہے جو دوسری عورت کو ایسا کرنے پر مجبور کرے جس سے وہ خود دور بھاگتی ہے؟ شادیاں مردوں اور عورتوں سے انجام پذیر ہوتی ہیں۔ نہ کہ سوسائٹی اور حکومت سے۔ اور نہ مذہب یا ماقوق الانسان سے۔ اس وقت تک ہمیں یہ بخوبی معلوم ہو چکا ہوگا کہ جو کام محض کہنے والے انسانوں کی بہتری اور فلاح پر مبنی نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز اخلاقی نہیں ہو سکتا۔ اگر فی الواقع ہمیں کچھ علم ہے۔ تو ہم جانتے ہیں۔ کہ نیکی کرنے کی طرفداری میں اور گناہ کرنے کے خلاف تمام وجوہ اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اپنے

آپ کو کسی دوسرے کی حالت میں ڈالنے کے لیے ہم میں قوت متخیلہ کا ہونا بسا ضروری ہے۔ اس لیئے تھوڑی دیر کے لیے مرد اپنے آپ کو ایک ایسی بیکس مظلوم عورت سمجھ لے جو وحشی خاوند کے زیر تشدد ہو۔ پھر کیا وہ طلاق کو ناجائز قرار دیگا۔ اور اسکی تائید کریگا۔؟

بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ماؤں اور بچوں کی تکالیف کا پورا احساس ہے یعنی ایسی بیشمار بیویوں کی تکالیف کا جو اپنے خاوند کے آتے ہوئے قدموں کی چرچراہٹ سنتے ہی خوف زدہ ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور ایسے بہت سے بچوں کی نصیبتوں کا جو اپنے والد کی آواز سنتے ہی چھپ جاتے ہیں۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ان طمانچوں کی تعداد کو جانتے ہیں۔ جو ہر روز اس بیکس کے منہ پر پڑتے ہیں۔ اور غالباً صرف گنتی کے لوگ ان خوفناک اقوال کا علم رکھتے ہوں گے جنکو غریب مائیں اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر بسر کرتی ہیں۔ ان تکالیف کے مقابلہ میں فلاکت و ناداری کی تمام سختیاں جن کو باہمی محبت کرنے والے دولہا دولہن جھیلتے ہیں۔ ہیچ ہیں۔ ایسے مرد اور عورت جو آپس میں نہایت سچے دل سے بیاہے گئے ہیں مفلس اور ناداری کی آفتوں کی مشقتوں کو باہم مل کر برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلی اور تشفی دیتے رہتے ہیں۔ شب دیجور میں بھی وہ ستارہ کی روشنی کو دیکھتے ہیں اور ان کی محبت ہر ایک کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ سورج کی کرنیں ڈالتی رہتی ہے۔

اچھا گھر اچھے انتظام اور عمدہ سلیقہ کی گواہی دیتا ہے۔ ایسے گھر کے چولہے کی ہر ایک اینٹ تہذیب و تمدن کی کامل نشانی ہے۔ سوسائٹی نفرت کرنے والے گھروں کے وجود سے خوش نہیں ہوتی یعنے ایسے

گھروں کے وجود سے جہاں کے خاوند اور بیویاں خود غرض رو کھے اور بیرحم ہوں۔ سوسائٹی کا اس میں کچھ نفع نہیں ہے۔ کہ اچھے آدمی غلام ہو کر رہیں اور ہمیشہ پُرخطر زندگی بسر کریں۔ یا یہ کہ وہ ایسے خاوندوں کے ذریعہ مائیں بنیں جن کو وہ نفرت سے دیکھتی ہیں۔ گھر ہمیشہ نیک اور فیاض والدوں اور سچی محبت کرنے والی ماؤں سے بھرے جانے چاہییں۔ اور جب کہ وہ اس طرح سے بھرے جائیں گے۔ دنیا شائستہ اور متمدن ہو جائے گی فراست بنگوڑوں کو جھلائے گی۔ انصاف عدالتوں میں نظر آئے گا۔ عقل قانون کے کمروں میں براجے گی۔ اور سب سے بڑھکر جو بات ہے وہ یہ ہے کہ آسمان کے گنبد کی طرح آزادی کی روح ہر چیز پر حکومت کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔

اگرچہ نکاح ایک نہایت ضروری چیز اور نہایت ہی متقدس عہد و پیمان ہے۔ جسکو بنی نوع انسان انجام دے سکتے ہیں۔ تاہم عہد و پیمان کے ٹوٹنے پر عدالتوں کو اختیار دینا چاہیئے کہ وہ اس کے فسخ کا فتوے عادلانہ طریقوں پر دے سکیں۔

جیسا کہ قاعدہ ہے عورت خاوند کے سامنے اپنے کل مال و متاع یعنے اپنی جوانی۔ اپنی خوبصورتی اور اپنی محبت کا جہیز پیش کرتی ہے۔ اور یقیناً اس عہد سے اسوقت تک خاوند کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ خود بیوی ہی قول و قرار کی شرائط کو نہ توڑے طلاق ہی علانیہ دینی چاہیئے۔ اور اس کے انجام دینے کے لیے گواہوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ لوگ عہد و پیمان کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ شادیوں کا داخل دفتر ہونا بھی ہر طور سے

ہونا چاہیئے۔ اور طلاق کے معاملے میں بھی اس قسم کے اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔ شرائط پیش ہونی چاہئیں مال کو چند بڑے بڑے آدمیوں کی مدد سے آپس میں انصافاً تقسیم کر دینا چاہیئے۔ اور بچوں کی حفاظت اور ان کے رکھ رکھاؤ کا سوال بھی زیر شرائط ضروری ہے۔

مرد اور عورتیں کسی قانونی بندش سے نیک نہیں ہیں۔ قانون بذات خود نیکی کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ اور نہ وہ محبت کا سرچشمہ اور بنیاد ہے لیکن قانون کے لیے نیکی اور عصمت کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ اگر عورت نے خلاف عہد کوئی بات نہیں کی۔ تو قانون کے لیے نہایت ضروری ہے کہ عورت کو اپنی پناہ میں لے کر اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح مرد کی حفاظت کرے۔ اگر اس نے عہد کی شرائط کو پورا پورا نبھایا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ محبت کا عدم وجود۔ نکاح کا اخیر ہے۔ محبت ایک قدرتی امر ہے۔ ان تمام رسوم کے درپردہ محبت کی مبارک شمع جلتی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ جلتی رہے گی۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی سا موقع نہیں ہوا۔ کہ یہ مقدس شمع بجھ گئی ہو۔ ہر زمانے میں ہر ملک میں اور ہر قوم میں سچی خالص اور بے غرض محبت ہوتی چلی آئی ہے۔ پادری کے وجود اور نکاح کے ساتھ ان رسوم کے اجرا سے بہت عرصہ پیشتر دنیا میں سچی اور خالص شادیاں ہوتی تھیں عام رائے کے درپردہ قدرتی حیا اور دل کی محبت ہے۔ اور قانون کے ہوتے ہوئے مرضی کی سلطنت ہے۔ جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔ جہاں کہیں محبت ہے وہ خالص ہے۔ اور ہر وقت اور ہر جگہ شادی کی رسوم اس اتحاد کی تائید کرتی ہیں۔ جو انسان کے دل کے مقدس مندر میں انجام پذیر ہوا ہے۔

(۲)

(ب) کیا طلاق شدہ لوگوں کو کسی حالت میں شادی کرنے کی اجازت دینی چاہئے

اِس سوال کا جواب تو اُس سوال پر منحصر ہے کہ آیا نکاح کوئی جرم ہے یا نہیں۔ اگر بالفرض وہ جرم نہیں ہے تو اس پر سزا لگانے کی کیا وجہ ہے؟ کیا کوئی شخص اس امر کی نسبت عقلی دلائل پیش کر سکتا ہے۔ کہ کیوں ایک عورت کو جسے بغیر کسی قصور کے طلاق دی گئی ہے۔ بطور سزا کے مجبور کیا جائے۔ کہ وہ ہمیشہ کے لیے تنہائی کی زندگی بسر کرے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس غریب کو کسی دوسرے شخص (خاوند) کے وحشیانہ پن اور بے ایمانی کے سبب کیوں سزا دی جاتی ہے؟ یا اسی طرح کیوں کسی ایسے شخص کو جس نے شادی کے معاہدہ کو ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ نبھایا ہو لیکن اس کی بے وفا بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہو محض سوسائٹی کے مفاد کی خاطر سزا کے شکنجہ میں کھینچا جائے؟ اور اسے عمر بھر تنہا رہنے کے لیے مجبور کیا جائے؟۔

مندرجہ بالا سوال کا ابھی ایک اور رخ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ طلاق کے بعد انسانی جذبات ویسے ہی رہتے ہیں جیسے کہ طلاق سے پیشتر تھے۔ دوبارہ نکاح کی اجازت نہ دینا یا بالفاظ دیگر اسے روکنا گویا گناہ کرنے کے لیے عذر مہیا کرنا ہے۔

(ج) طلاق کا اثر فیملی تعلقات پر کیا پڑتا ہے؟

جس طرح سچی طلاق طلاق نامہ کی پشت پناہ ہے۔ اسی طرح سچا نکاح شادی کی رسوم کا پشت پناہ ہے جب محبت مردہ ہو۔ یا خاوند اور بیوی آپس میں ایک دوسرے سے متنفر ہوں۔ تو دراصل ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ بات

صرف اتنی ہے کہ جس طرح شادی کی رسم اس معاہدہ کی جو ابھی انجام کو پہنچا ہے تصدیق کرتی ہے۔ بعینہ اسی طرح طلاق نامہ باضابطہ طور پر اس واقعہ (دلی نفرت) پر جو اس سے پیشتر ان دونوں کے دلوں میں واقع ہو چکا ہے محض صاد کر دیتا ہے۔

سچی گھرستی زندگی سچی شادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اسی بات کے قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اگر قانون ان لوگوں کو جو آپس میں دلی نفرت رکھتے ہیں۔ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھنے کے لیے مجبور کرے۔ تو گھریلو زندگی کی برکت کیا خاک ہوئی۔ اس قسم کا فعل شادی کے معیار کو نہایت ادنے بنا دیتا ہے۔ اور گھر کی بشاش چار دیواری کو ایک تنگ و تاریک قید خانہ سے تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر ہم گھر بار کی زندگی کی برکت اور خوشی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیئے کہ خاوند اور بیوی کی مکمل اور پوری مساوات کو قایم رکھیں۔ جبر اور خوف کا استعمال ان کے درمیان نہ ہونا چاہیئے۔ عورت کو عدالت یا پادری کے حکم یا سوسائٹی (برادری) کے تشدد کا پابند نہ رہنا چاہیئے۔ بلکہ برخلاف اس کے اسے پوری آزادی کے ساتھ آپ اپنی ملکہ ہونے اور آپ اپنی روح اور اپنے جسم کی شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے بیٹھنا چاہیئے۔ گھر کی سچی خوشی جبر۔ غلامی۔ اور باطل خیالات کے ذریعہ سے کبھی قایم نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں گھر سے زیادہ متبرک کوئی جگہ نہیں۔ اور دسترخوان سے بڑھکر کوئی مذبح زیادہ پاک نہیں ہے

(۵) کیا طلاق کا کلی طور پر عدم جواز جہاں کہیں بھی وہ پایا جائے۔ سوسائٹی کی اخلاقی پاکیزگی پر کچھ اثر رکھتا ہے؟

سب سے پیشتر ہمیں اپنی اصطلاحات کی تعریف کرنی چاہیئے۔ اخلاقی پاکیزگی

سے کیا مراد ہے؟ اس دنیا کے عقلمند آدمی اپنی فلاح و بہبودی کے ساتھ دوسروں کی بہتری بھی چاہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصلی خوشی ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ اور اسی بات کے حاصل کرنے کے وہ درپے رہتے ہیں فلاح و بہبودی کی شرائط کے مطابق زندگی بسر کرنا اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کام سمجھا جاتا ہے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ اعلیٰ ذرائع کا استعمال کرنا سب سے بڑا اخلاقی خیال ہے۔ یا بالفاظ دیگر اخلاق چال چلن یا طرز زندگی کی تکمیل کا نام ہے۔ ایک ایسا شخص جو خوف یا لاعلمی کی وجہ سے کسی کی اطاعت کرتا ہے۔ نیک نہیں ہے۔ نیکی اور اخلاق خیالی جبر کی سلطنت میں رہتے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی شخص خیالی جبر کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ نیک ہے۔ اخلاق غلامی کا مترادف نہیں ہے۔ اور نہ جہالت نیکی کا کامل نشان ہے۔

انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی طرف رجوع کرے۔ اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ دوسرے لوگوں پر کچھ بار تو نہیں ڈالتا۔ اپنی عزت آپ کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ اپنی روزانہ حاجتوں کا خود کفیل ہو۔ جو شخص کہ آئیڈیل کے مطابق رہتا سہتا ہے وہ گویا نہایت ہی نیک کام کرتا ہے۔ سچے نکاح میں مرد اور عورت نہ صرف اپنے جسموں کو بلکہ اپنی روحوں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اسی کا نام آئیڈیل شادی ہے اور اسی کو نیک یا سچا نکاح کہتے ہیں برخلاف اس کے جو لوگ اپنی روحوں کے بجائے اپنے جسموں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سچے نکاح میں داخل نہیں ہوتے۔ خواہ رسوم کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں۔ اور یہی فعل نیکی کے خلاف ہے۔

اگر یہ بات سچی ہو۔ تو عورت کس اصول پر محبت کے زائل ہو جانے پر بھی

رشتہ کو قائم رکھ سکتی ہے؟ کیا سچی محبت کے علاوہ کوئی اور اصول ایسا ہے جو اس کام کو انجام دے سکے؟ کیا اس عورت کو روپیہ پیسہ۔ جائداد۔ بلند مرتبہ اور شہرت کی شوت دیکر اس مقصد کو انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیا اس پر بھی نیک کا لقب ایسی عورت پر چسپاں ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں کچھ برادری کا فائدہ ہے کہ سلطنت اور مذہب دونوں کے ہاتھوں نیکی کی خوب گت بنے؟ پھر کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ فعل بنی نوع انسان کی اخلاقی پاکیزگی پر کچھ اثر رکھتا ہے؟

کیا ایسے ممالک ہیں جہاں طلاق جائز نہیں ہے۔ ان ممالک کی نسبت کہ جہاں جائز ہے۔ اخلاق کا کوئی اعلیٰ معیار قایم ہے؟ جہاں خاوند اور بیوی جن کی آپس کی محبت بالکل مفقود ہو گئی ہے طلاق نہیں پا سکتے۔ کیا ایسی جگہ عاشق اور معشوق پائے جاتے ہیں؟۔

یہ خیال کہ شادی ایک قسم ہے اور نہیں ٹوٹ سکتی۔ برائی کی ڈھال ہے دنیا اس عورت پر جس کے خاوند نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ اور جو اپنے خاوند کے گھر سے نکالی گئی ہے۔ رحم کھاتی ہے۔ اور جب وہی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ تو دنیا اسے معذور سمجھتی ہے۔ بعینہ اسی طرح دنیا اس خاوند پر بھی جو امن کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور جو اپنے گھر سے بھی نکال دیا جاتا ہے۔ رحم کرتی ہے۔ اور اگر وہ کسی عورت کے ساتھ رابطۂ محبت قائم کرے تو اسے معذور خیال کرتی ہے

اس سے بڑھکر کوئی اور فعل برا نہیں ہے۔ کہ انسان اپنی بیوی کو جس کے دل میں خاوند کی محبت نہیں ہے۔ اپنے ساتھ رہنے کے لیے مجبور کرے کیا یہ ہمیشہ کا گناہ نہیں ہے؟۔ کیا عورت اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو

زائل کردے؟ کیا انتخاب کرنے میں اسکی مرضی کو کچھ دخل نہیں ہے؟ کیا اسکی شرم وحیا کسی دوسرے کا مال ہے؟ کیا وہ شخص جس سے اسکو دلی نفرت ہے اسی کی خواہشات کا مالک ہے؟ کیا اسے اپنی روح کے جواہرات کی حفاظت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؟ کیا اخلاق اسی بنیاد پر قایم ہے؟ اور کیا سوسائٹی کی اتنی ہی تہذیب ہے؟ اور کیا تہذیب بذات خود اسی بنیاد پر قایم ہے؟ کیا ایک طرف اسی ایثار نفسی اور قربانی کا نام لیکر اور دوسری طرف قسم کا حوالہ دیکر خدا کو خوش کیا جاتا ہے؟

میرے نزدیک، نہایت ہی نرم لفظ ہماری زبان میں موجود ہے اور جس سے ہمارا علم کا دائرہ نہایت ہی متاثر ہے۔ وہ میٹرنٹی (یعنے ماں کی محبت) ہے اسی ایک لفظ پر دنیا بھر کے بنی نوع انسان کے رنج وخوشی۔ جان کنی اور فرط جوش کا انحصار ہے۔ ماں موت کے سایہ میں چلتی ہے۔ تاکہ وہ ایک دوسری زندگی دے۔ محبت کی قربانگاہ پر وہ اپنی زندگی کو گروی رکھتی ہے۔ جب دنیا مہذب ہو جائے گی تو کوئی بیوی اپنی مرضی کے بغیر ماں بننا قبول نہ کرے گی۔ اس وقت مردوں کو معلوم ہو جائے گا کہ دوسرے کو غلام بنانا دراصل اپنے آپکو قید کرنا ہے۔ (ترجمہ)

ضیاء الدین احمد برنی

لڑکیونکی انشا) جس کا ایک ایک خط دلچسپ ہونے کے علاوہ لڑکیوں کے واسطے ایک نصیحت کا دفتر ہے مولوی عبدالرشید صاحب الخیری کا نام ہی اس انشا کی خوبیوں کیواسطے کافی ضمانت ہے قیمت ایکروپیہ خریداران عصمت سے آٹھ آنہ۔ منیجر عصمت وتمدن دہلی سے طلب کرو۔

عید قربان

کیا عجب جوشِ بہار عید قرباں ہو گیا — بسملوں کے خون سے ہر کوچہ گلستاں ہو گیا
مثلِ گل ہر غنچۂ دل کھل کے خنداں ہو گیا — سارے عالم میں خوشی کا ساز و ساماں ہو گیا
محفلِ عیش و طرب ہر جا مہیا آج ہے
اک ہمارا خانۂ دل ہی کہ جو تاراج ہے

اک طرف جھرمٹ حسینوں کا ہی با انداز و ناز — اک طرف کوئی بنا محمود اور کوئی ایاز
جانبِ مسجد نمازی ہیں رواں بہرِ نماز — دیدۂ بینا ہیں اپنے محوِ شانِ بے نیاز
ہوں زمانے میں تو قربانی کی خوشیاں اک طرف
اور دلِ بسمل کسی کا خوں میں غلطاں اک طرف

باعثِ جمعیت خاطر ہیں احباب اک طرف — بزمِ رنگیں میں ہے دورِ بادۂ ناب اک طرف
غم کا ساماں اک طرف شادی کا اسباب اک طرف — اک طرف شاداں ہو دنیا کوئی بیتاب اک طرف
پر مزا ہی عید کا کیا ہی نہ جبتک دید ہو
دوست کا ماتم ہو جس گھر میں وہاں کیا عید ہو

عید قرباں کی ادا پر ایک عالم ہے نثار — لوٹنا فدیہ کا کر دیتا ہے دل کو بیقرار
کیا کریں کچھ اپنا قابو ہی نہ اپنا اختیار — جانِ قرباں کر کے دکھلا دیتے ہم تو جو یار
کیا کہیں جو کچھ ہی غم سے اضطرابِ دل کا حال
زیرِ خنجر بھی نہیں ایسا کسی بسمل کا حال

عید کا ہی جشن ہر خورد و کلاں دل شاد ہی — کوچہ و بازار میں شورِ مبارکباد ہے
عیش سے کاشانۂ دل سینکڑوں آج آباد ہی — اک مکاں اپنا ہی آبادی میں جو برباد ہے

ایک مسلم کو عید کا دن مثلِ یوم محشر ہو گیا ۔ اب کے پہلے ہی محرم سے محرم ہو گیا ۔ آغا غلام حسین ارشد

سوسائٹی کا اثر بے زبان فرقہ نسواں پر

مدت سے یہ خیال دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے کہ سوسائٹی کا یقیناً یہ ظلم ہے کہ اگر کوئی عورت دھوکہ سے بھی ایک دفعہ صراط مستقیم سے بھٹک جائے تو وہ قابل نفرت اور مرد دھڑلے سے جو چاہے سو کرے۔ حالانکہ قانون فطرۃ اور شرع ہمکو روز روشن کی طرح بتا رہا ہے کہ جو احکام مردوں پر نافذ ہیں وہی عورتوں کے لیے۔ پھر کیا وجہ کہ ہم قانون فطرۃ اور شرع کے خلاف عمل پیرا ہیں۔

کس قدر اندھیر اور صریح ظلم ہے کہ ہم علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک مرد دنیا کے امراض خبیثہ میں مبتلا ہے اور زمانہ بھر کا آوارہ گرد مشہور ہے اگر وہ یہ کہے کہ میں نے افعال شنیعہ سے توبہ کر لی اور آیندہ ایسے افعال قبیحہ کا مرتکب نہ ہونگا تو محض دولت کی وجہ سے حسین سے حسین لائق سے لائق لڑکی کو اس کے والدین اس کے عقد میں دینے کو موجود۔ مگر وہ لڑکی جو تعلیم یافتہ ہے حسین اور پاکباز ہے محض مرد کی چاپلوسانہ گفتگو اور جھوٹی محبت کے سحر سے مسحور ہو کر (جسکو وہ جانتی نہ تھی کہ یہ آیندہ چل کر دغا کرے گا) اگر بغیر ازدواج شرعی کے مرد کی منت و خوشامد سے طرح طرح کے سبز باغ دکھانے سے بنا ہنے کی قسمیں کھانے سے راہ مستقیم سے بھٹک گئی تو سوسائٹی اس کو سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور وہ ملنے جلنے کے قابل نہیں رہتی۔

خدا لگتی کہنا۔ عورت کا برباد کرنے والا۔ اس کو صراط مستقیم سے بھکانیوالا

اُس کی خوبیوں کو غضب کرنے والا۔ اسکو چاہ ذلت میں گرانے والا۔ صرف مرد ہی تو ہے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے تو ستم ہے کہ خود ہی ایک فعل کا سبب ہو اور پھر اس کی مخالفت کرے۔ اگر قانون فطرۃ مردوں کو عورتوں پر حکومت کی اجازت دیتا ہے تو کیا یہ نہیں کہتا کہ عدل کو ہاتھ سے نہ دو۔

اگر باعتبار ضروریات مقابلہ کیا جائے تو مرد عورت مساوات کا درجہ رکھتے ہیں۔ بدصورت سے بدصورت مرد کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ حسین سے حسین عورت کا مالک ہو۔ علیٰ ہذا عورت کی بھی یہ خواہش ہے کہ وہ بھی حسین سے حسین مرد کو اپنا رفیق ابدی بنائے۔ کیا اسکو محبت کی خواہش نہیں۔ کیا اسمیں قدرت نے شاعرانہ مادہ نہیں رکھا۔ کیا اسمیں جذبات نہیں ہیں اُس کا جی نہیں چاہتا کہ اپنا درد دل کسیکو سنا کر اوس سے داد چاہے گو عورت کے خواہشات مرد سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی کس قدر صابر بیٹی ہے کہ باوجود اپنی تعلیم حسن۔ اخلاق کے دم نہیں مارتی اور اپنی عزیز زندگی اوسی کے ساتھ تمام کر دیتی ہے جس کے ہاتھ میں والدین ہاتھ دیدیتے ہیں۔ اگر بفرض محال کوئی لڑکی اپنی آیندہ تقدیر سے خوف زدہ ہوکر والدین کو اطلاع دیتی ہے کہ یہ تعلق مناسب نہیں تو اسکو دریدہ دہن۔ بے حیا۔ بے شرم۔ خاندان کا نام ڈبونے والی۔ کے خطابات دیئے جاتے ہیں۔ والدین بے زار اور متنفر نظر آتے ہیں۔

شرع میں قبل از شادی۔ مرد عورت کا آپس میں دیکھ لینا مستحب قرار دیا گیا ہے تاکہ بعد عقد جوتیوں میں دال نہ بٹے۔ پھر کیوں اس سے سراسر غفلت اور لاپروائی کیجارہی ہے۔ حالانکہ [illegible]

کہ جانبین میں سچی محبت ہے۔ اور ایک دوسرے کی امید پر راضی ہیں کہ حسب شرع ہنسی خوشی عقد ہو جائے تو بقیہ زندگی نہایت آرام و آسایش میں گذر جائے مگر ہندوستان کا یہ کیسا دستور ہے کہ جہاں والدین کو یہ معلوم ہوا کہ جانبین میں محبت و الفت ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اس عقد مناکحت سے دونوں کی زندگی قابل اطمینان ہوگی۔ تو محض اس وجہ سے کہ کم بخت "محبت" ہے (کیا اچھا ہوتا کہ اس کا وجود ہی نہ ہوتا) ضرور ایک دوسرے کو جدا کر دیں گے اور کسی اور کے گلے منڈھیں گے۔ بعدہ کیسے ہی خوفناک نتائج کیوں نہ پیدا ہوں۔ اور وہ قبل از وقت دنیا سے ہی کیوں نہ سدھاریں۔ محض اس جرم پر کہ آپسمیں سچی محبت کیوں کی۔ یہ گویا اُس سچی محبت کی سزا ہے جو والدین کے ہاتھوں مل رہی ہے +

ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ والدین اپنی اولاد کی فلاح اور بہبودی کے خواہاں ہیں۔ لیکن بعض اوقات وہ بجائے راحت و آرام کے اُن کے حق میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ والدین کی محبت کافی نہیں ہے اس لیے کہ ہم اکثر خیالات اُن سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اُن کے اظہار کا بظاہر کوئی موقعہ بھی نہیں رکھتے اس لئے وہ ہمارے ساتھ پورے طور پر ہمدردی ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ اگر بیان بھی کر دیں تو ہم کو وضاحت سے بیان کرنے میں سوسائٹی اور حیا مانع ہے۔

اسی خلش کے رفع کرنے کے لیے کہ ایسی عورت کی قدر کیوں نہ کیجائے جو دائرہ مستقیم سے باہر قدم دھرنے کے بعد راہ راست پر آتی ہے

بہت ساری کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ ہم یہاں چند مثالیں لکھتے ہیں:

مثلاً ایک یونانی فلاسفر کہتا ہے، عورت ایک ایسا پھول ہے جسے ایک ہی سونگھ سکتا ہے۔ دوسرے کو سونگھنے سے اُس کی وہ آب و تاب باقی نہیں رہتی۔"

ایک ہندی فلاسفر اس سے بھی بڑھکر کہتا ہے، عورت کی آب اور حرمت صرف اُس کی نگاہوں اور اُس کے ہاتھوں ہی میں باقی اور محفوظ رہ سکتی ہے۔ کوئی دوسرا ہاتھ اُس کا ضامن اور کفیل ہو نہیں سکتا۔"

یہ مثالیں ایسی نہیں ہیں جو قابل تسلیم ہوں محض حالات سے اقتباس کی گئی ہیں۔ اس کو بھی ہم سوسائٹی کا بنایا ہوا کہتے ہیں قانون فطرت اور شارع کا حکم ایسا نہیں ہے بلکہ وہ صاف الفاظ میں حکم کر رہا ہے کہ حد جاری ہو اور درے لگائے جائیں۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور ایسے افعال سے باز آئیں۔

غرض ہم اس امر کے ثبوت میں کہ عورت کو صراط مستقیم سے بہکانے والا مرد ہے۔ اخبار المؤید سے ایک آرٹیکل نقل کرتے ہیں "جو غرقۃ الاخوان" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس سے عورتوں کی بے گناہی کا سچا ثبوت دستیاب ہوتا ہے۔ حالانکہ اس قبیل میں عورتوں سے زیادہ مرد سزاوار سزا ہیں۔ پھر عورتیں کیوں قابل مواخذہ سمجھی جاتی ہیں اور مرد بری ؟

"کہتا ہے (قاہرہ) میں میرا ایک دوست تھا میں اُس کے صلاح اور پرہیزگاری سے بڑھکر اوس کی لیاقت اور حسن اخلاق کا گرویدہ تھا۔

اس کے بعد مجھکو کوئی ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ میں یہ دریافت کرتا کہ اُس کے چال چلن کیسے ہیں۔ اور اُس کی عبادت کا کیسا ڈھنگ ہے۔ فاسق ہے یا پاکباز۔ زاہد ہے یا رند۔ کیونکہ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اُس سے علوم شریعت پڑھوں۔ یا اخلاق کا سبق لوں۔ یقیناً میں اسبات کو سمجھ چکا تھا کہ محبت کرنے کے لیے جو کچھ کہ میں نے اندازہ لگایا تھا وہ کافی بلکہ کافی سے زیادہ تھا۔

اسی طرح ہماری دوستی اور محبت میں ایک زمانہ گذر گیا۔ نہ کبھی میں اُس کو کسی بات سے رنجیدہ کرتا نہ کبھی وہ کسی ناشائستہ حرکت سے صدمہ پہونچاتا یہانتک کہ میں قاہرہ سے ایک دور و دراز سفر کے لیے روانہ ہوگیا۔ تاہم ہماری مراسلت برابر جاری رہی۔ مگر پھر ہماری مراسلت بند ہوگئی جس سے میرے دل میں اُس دوست کی نسبت وہی خیالات و شکوک پیدا ہونے شروع ہوئے جو ایسی حالت میں جیسے کچھ کہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور پیدا ہونا ضروری ہیں۔ پھر میں قاہرہ واپس آیا۔ اور پوری ہمت و کوشش سے اُس عزیز دوست کی جستجو و تلاش جاری رکھی نشست و برخاست کے وہ تمام مقامات جہاں مارے جہاں جہاں کہ اُس کا گذر ہوتا تھا۔ اور جس کو میں جانتا تھا۔ لیکن اُس کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر میں اُس کے محلہ کیطرف گیا اور پڑوسیوں سے دریافت کیا جواب ملا کہ ایک زمانہ گذرتا ہے کہ وہ لوگ یہاں سے اُٹھ گئے۔ معلوم نہیں کہ اب کہاں رہتے ہیں۔ اس جواب سے مرے خیالات میں عجیب تلاطم پیدا ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے لیے یاس و نا اُمیدی میں جنگ چھڑ گئی میں نے سمجھ لیا کہ اول الذکر نے آخر الذکر پر فتح حاصل کرلی۔ اور مجھکو معلوم ہوگیا کہ میں

اوس عزیز دوست کو کہو چکا ہوں۔ اور اُس روز سے یقیناً میں اُس کی تلاش کا کوئی ایک راستہ نہ پاتا تھا۔

اس وقت وفورِ غم سے میرے آنسو جاری ہو گئے۔ کیوں نہ جاری ہوتے کہ اس دنیا میں مجکو دوستوں سے بہت کم حصہ ملا تھا اور زمانے نے میرے وفادار دوست کو گم کر دیا تھا اور میں آسمان کا نشانہ بن گیا جس کے تیر خطا نہیں کرتے اور جس کی نازل کردہ مصیبتیں غائب نہیں ہو سکتیں!

اس یاس و غم کی حالت میں میرے دن قاہرہ میں بسر ہونے لگے ایک روز میں قمری مہینہ کی آخر شب میں جبکہ گھر کو واپس آرہا تھا تو تاریکی کی وجہ سے راستہ بھول گیا اور ایک تاریک و وحشت ناک گلی میں نکل گیا۔ جو آیند و روند سے بالکل سنسان اور خالی تھی اُسوقت کی چھائی ہوئی تاریکی و وحشت سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ یہاں یا تو جنات و شیاطین رہتے ہیں یا غول بیابانی کا مسکن ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دو سہ ہند پہاڑوں کے درمیان بحرِ اسود تلاطم برپا کر رہا ہے گویا وحشت ناک موجیں مجھکو آگے اور پیچھے بہائے لیئے جاتی ہیں یا اُٹھاتی بٹھاتی ہیں۔

میں اسی پریشانی اور حیرت میں تھا کہ قریب کے کسی ایک مکان سے ایک دردناک چیخ کی آواز سنائی دی۔ اور مجھے غور و فکر لاحق ہوا۔ کہ یہ آواز کدھر سے آئی۔ پھر وہی آواز مکرر سنائی دی۔ اس کے بعد اون دردناک آوازوں کا تانتا لگ گیا جنھوں نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر پیدا کیا۔ میں بول اٹھا یا للعجب اس سیاہ رات کے سینے میں کتنے مایوسوں کے سرد آہ اور غم زدوں کے راز پوشیدہ ہیں

میں نے خدا سے اقرار کر لیا کہ اگر میں اس غمزدہ کو پاؤں تو ضرور اس کی ہمدردی میں جاسے وہ کوئی ہو کبھی دریغ نہ کروں۔ اور اس کے لیے کوشش کروں۔ بشرطیکہ وہ معاملہ میرے بس کا ہو۔ ورنہ آنسو بہانے میں تو مجھے کبھی تامل نہ ہوگا۔ یہ میں آواز پر پتہ لیتا ہوا اوس گھر پر پہونچا جہاں سے کہ یہ دردناک آواز آرہی تھی۔ دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کم سن لڑکی جس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ ہوگی جس کے ہاتھ میں ایک دھندلی روشنی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تھا اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے نمودار ہوئی۔ گویا ماہ کامل ابر کے پھٹے پھٹے بادلوں میں گھرا ہوا ہے۔ جسکو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے پوچھا حور کے بچے کیا تمھارے گھر میں کوئی بیمار ہے؟ میری اس سوال پر اس نے ایک دردناک چیخ ماری جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں اوس ننھے دل کے پرزے نہ ہو جائیں۔ اس نے کہا اے نیک مرد کیا تم میرے باپ کی مدد کر سکتے ہو جو عالم سکرات میں بستر مرگ پر لیٹا ہوا دم توڑ رہا ہے۔ یہ کہکر وہ آگے ہوئی اور میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ آخر ہم ایک تنگ و تاریک کمرہ میں داخل ہوئے جس کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ جب میں اس میں داخل ہوا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم ایک زندہ دنیا سے نکل کر مردہ دنیا میں جا پہونچے کمرہ گویا قبر ہے اور بیمار میت میں آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر بیمار کے قریب بیٹھ گیا بیمار کی حالت نہایت خطرناک ہو رہی تھی اس کا جسم قفس استخوان بن گیا تھا نفس کی آمد و رفت ایسی ہی تھی کہ جیسے لکڑی کے گنبد میں ہوا گونج رہی ہے۔ میں نے مریض سے دریافت کیا کہ آپ کو کیا چاہتا ہے۔ میری اس آواز پر

اُس نے اپنی آنکھیں کھولدیں اور اپنی نظر میرے چہرے پر جماکر اور تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور نہایت پست آواز میں یہ کہا "الحمدللہ فقد وجدت صدیقی" (خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے دوست کو پالیا)۔

میں یہ سمجھنے لگا کہ میرا دل رنج و قلق سے پہلو میں دھڑک رہا ہے میرے ہاتھ سے صبر جاتا رہا جس کو میں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ بے صبری ظاہر نہ کروں جو ایسے موقعہ کے لیے نہایت بری ہے مگر اُس وقت کا صبر کرنا میرے دائرہ اختیار سے باہر تھا کیونکہ وہ قریب مرگ تھا۔ میرے اُس غم کا اندازہ ناممکن تھا جو میرے دل میں پوشیدہ تھا۔ اور پہلوؤں میں دفن تھا۔ میری اس ملاقات نے اُس کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ حیات کو اکسا دیا۔ اُس میں کچھ توانائی آئی اور اشارہ کیا کہ مجھکو اُٹھا کر بٹھا دو۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جس کے سہارے وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور اپنا قصہ نہایت ناتوان آواز میں رک رک کر اس طرح بیان کرنا شروع کیا:۔

دس سال کا عرصہ بلکہ کچھ مہینہ زیادہ ہوتے ہیں کہ میں اور میری والدہ ایک مکان میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں ایک امیر متمول بھی رہتا تھا اس کے مکان میں ایک دوشیزہ پری تھی میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی ایک مکان میں بھی ایسی حسین جمیل شکیل۔ زیبا۔ خوبصورت۔ حور نہ ہوگی۔ اُس کو دیکھنا تھا کہ میرا دل ہاتھ سے جاتا رہا اور ہزار جان سے پروانہ صفت اُس کے شمع حسن کا شیفتہ و شیدا ہوگیا۔ صبر و تحمل مجھ سے سلب ہوگیا۔ رشتۂ محبت قایم کرنے کے لیے ہزار دل منصوبے

لاکھوں تدبیریں کیں - اور اُس کے دل پر اثر پیدا کرنے کے لیے مختلف ڈھنگ سوچے - ایک مدت کے بعد محبت نے اپنا اثر دکھایا - یہ بت سیمیں آہوئے رم خوردہ رام ہوا - اور بت نامہربان نے بھی مہربانی کرنی شروع کی رفتہ رفتہ اُس کو آئندہ زندگی کا سبز باغ دکھا کر اور عہد و پیمان کی گرہ استوار کر کے ایک دن بہلا پھسلا کر بغیر قاضی کے عقد پر راضی کر لیا

ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ مجھکو معلوم ہو گیا کہ اُس کے پاس ایک ننھی اور جدید مخلوق حرکت کر رہی ہے - اُس خبر سے میرے حواس باختہ ہو گئے - اور میں سوچنے لگا کہ آیا ایفائے وعدہ کروں - یا اُس سے رشتۂ الفت ہی منقطع کر دوں - اسی حیص بیص میں پچھلا خیال پہلے خیال پر غالب آگیا - اور میں اُس مکان سے اُس مکان میں اُٹھ آیا - کہ جہاں اے دوست تو مجھ سے ملاقات کیا کرتا تھا - اس کے بعد اُس مظلوم نازنین کی کوئی کیفیت معلوم ہی نہیں ہوئی - نہ میں نے کبھی اس دریافت کی زحمت گوارا کی - اس حادثہ کے بعد چند سال گذر گئے ایک روز مجھے ایک خط ڈاک کے ذریعہ سے ملا - (اس وقت مریض نے تو شک کے نیچے سے جس پر بیٹھا ہوا قصہ بیان کر رہا تھا ایک خط نکال کر میرے حوالہ کیا) میں نے پڑھنا شروع کیا لکھا تھا :-

اگر مجھے کوئی ایسی ضرورت محسوس ہوتی کہ میں تمہیں اُس سابق عہد و پیمان یا اُس قدیم محبت کی تجدید کرنے کے لیے خط لکھوں تو بھی میں تم کو ایک سطر نہیں بلکہ ایک حرف بھی لکھنا کبھی پسند نہ کرتی کیونکہ مجھے یہ کامل اعتقاد ہے کہ ایسا عہد جیسا کہ تمہارا و غا باز انہ عہد تھا - اور ایسی محبت کہ جیسی تمہاری جھوٹی محبت تھی - اس امر کا

استحقاق رکھتی ہے کہ اس کی غرت کروں جس کا میں نہایت افسوس
کے ساتھ ذکر کرتی ہوں۔ پھر اس کے تجدید کی درخواست کروں!
جسوقت تم مجھکو چھوڑکر فرار ہوئے تمہیں معلوم تھا کہ میرے پہلو میں ایک
آگ سی بھڑک رہی ہے اور جنین اِس دنیا میں آنے کے لیے
موجود ہے مگر تمھارے اس بھاگنے کے دو سبب تھے ایک یہہ کہ
تمکو اُن مصیبتوں کے دیکھنے کی آفت نہ پڑے جو تمھاری لائی
ہوئی تھیں۔ اور تمھارے ہاتھوں کو اُن آنسوؤں کے پونچھنے کی
مشقت نہ اُٹھانی پڑے جو تمھارے ہی جاری کیے ہوئے تھے۔
اس کے بعد میں تمکو ایک شریف انسان سمجھ سکتی ہوں! نہیں بلکہ
اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتی کہ تم کو "انسان" تصور کروں
تصور تو کیا انسان سے تعبیر کروں۔ اس لیے کہ یقیناً حیوانوں
درندہ جانوروں۔ وحشی گزندوں کے متفرق خصائل سے کوئی
ایک خصلت ایسی نہیں چھوٹی جو تمہاری ذات والاصفات میں
جمع نہ کی گئیں ہوں نہ ان تمام خصائل اور صفات کے تم مظہر واحد
ہو۔ تم اپنے اُس دعوے میں بے حد جھوٹے ثابت ہو چکے
ہو جس میں تم کہا کرتے تھے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔
تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے مگر اپنی ذات کے لیے۔ خلاصہ
یہ کہ تم یہ دیکھ چکے تھے کہ میں ہی ایک ایسا رستہ اور ذائقہ ہوں
جسپر سے عبور کر کے اور اُسکو چکھ کر اپنے نفس کو راضی رکھ سکتے
ہو۔ اس لئے تم نے مجھ پر سے گذر کر اپنے نفس پرستی کے
راستہ کو حاصل کر لیا!

اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم کبھی میرے پانے کے لیے کوشش نہ کرتے نہ میرے لے کوشش کرنے میں کوئی وجہ دیکھتے تم اپنے اس وعدے میں دغابازی کر چکے ہو۔ جبکہ تم نے مجھ سے حتمی وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ کو اپنی "بیاہتا بی بی" بناؤ گے۔ مگر تم نے اپنے اوس حتمی وعدہ کے خلاف کیا۔ اس لیے کہ تم یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ایک ایسی عورت سے جو، مجرمہ، ہے، ذلیل ہے اُس سے نکاح کرو۔ للہ بتاؤ کہ یہ کونسا گناہ ہے؟ اور یہ کونسی ذلت ہے؟ یہ تمھارے ہی ہاتھوں اور نفس کے لائے ہوئے ہیں اگر تم نہ ہوتے تو میں نہ گنہگار ہوتی نہ ذلیل ہوتی۔ حالانکہ حتے الامکان میں تم سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر تمھارے مقابلہ میں مجکو ہارنا پڑا اور شکست فاش نصیب ہوئی اور میں اوس بچہ کی طرح تمھارے سامنے گر کر رہ گئی جو جلیل القدر پہلوان کے مقابلہ میں بے بس ہو جاتا ہے۔ اور تم نے اس موقع کو غنیمت جانکر مجھکو برباد کر دیا۔ اس کے بعد میرا نفس ندامت سے بھر پور اور دل پژمردہ ہو کر رہ گیا۔

زندگی کو الوداع اور موت کو خیر مقدم کہنے لگی۔ قیامت کا [illegible] خدا کو منہ دکھانا ضروری ہے۔ للہ سچ کہنا بھلا اُس عورت کو زندگی کا کیا خاک لطف مل سکتا ہے جو کسی شہر کی بی بی ہو سکتی ہے۔ اور نہ کسی بچہ کی ماں۔ بلکہ دنیا کے معاشرتی جلسوں میں بھی شریک نہیں ہو سکتی۔ تمام عمر ندامت سے سر نیچا کیے [illegible] مارے شرمندگی کے زمین پر

گڑی ہوئی۔ ہاتھوں سے منہ چھپائے۔ طعنہ دینے والوں اور فضیحتی کرنے والوں کے خوف سے دل پژمردہ کیے ہوئے حسرت سے دیکھ رہی ہو۔

تم نے میری راحت۔ میرا چین۔ میرا آرام۔ میری عزت۔ میری حرمت۔ غرض کائنات عالم کی کل خوشی لوٹ لی۔ کیونکہ اس حادثہ کے بعد اس قصر سے جہاں مجھے اپنے والدین کے ساتھ شادمانہ مسرت انگیز زندگی بسر کرتی تھی فرار ہونا پڑا۔ اور ان بیشمار نعمتوں کو جو میرے آس پاس تھیں اور اس خوشحال زندگی کو چھوڑ کر ایک دور و دراز مکان محلہ کے ایک حقیر جھونپڑے میں محض اس لیے نکل جانا پڑا کہ پھر مجھکو کوئی نہ پہچانے۔ اور اس طرح بقیہ زندگی کس پرسانہ حالت میں تمام ہو جائے۔

تم میرے والدین کے بھی قاتل ہو کیونکہ مجھے تحقیق طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ میرے فرار ہونے کے بعد مر چکے ہیں اور میں یقینی سمجھتی ہوں کہ وہ صرف میرے ہی کھوئے جانے اور میرے ہی دیدار کی آرزو اور تمنا میں قبل از وقت چل بسے فقط اس لیے کہ میں ان کی اکلوتی اور نازونکی پالی لڑکی تھی۔

تم میرے بھی قاتل ہو کیونکہ زندگی کا وہ تلخ پیالہ جو میں نے تمھارے ہاتھ سے چکھا یہ طول غم والم جو تمھاری وجہ سے مجھے نصیب ہوا ہے میرے جسم و روح پر اس طرح اثر کر رہا ہے کہ اب میں ایک جلتے ہوئے انگارہ کی طرح بستر موت پر

پڑی ہوئی ہوں۔ اور سمجھتی ہوں کہ خدا نے مجھ پر مہربانی کی اور میری دعا قبول کی اور اب کہ مجھے موت جلد اس بدنصیب دنیا سے نکال کر عالم حیات (ابدی) اور سرور جاودانی میں پہونچا دے حاصل کلام تم ایک جھوٹے مکار۔ دغاباز۔ خونخوار۔ قاتل چور۔ ہو اور میں سمجھ نہیں سکی کہ وہ منتقم حقیقی میرا بدلہ لیے بغیر تمہیں یوں ہی چھوڑ دے گا؟

میں یہ خط تمھیں اس لیے نہیں لکھ رہی ہوں کہ تم سے پھر تجدید ایفائے وعدہ کے مداومت کی درخواست کروں۔ یا محبت کی سوگند دے کر استحکام محبت کی خواہش ظاہر کروں۔ تم خود اتنی سمجھنے کی قابلیت تو ضرور رکھتے ہو کہ تمھارے متعلق میرے دل میں کیا کیا خیالات ہوں گے؟ سوا اسکے اس وقت میں قبر کے دروازہ پر کھڑی ہوں۔ اس زندگی اور اس زندگی کی تمام بھلائیوں۔ برائیوں۔ خوش نصیبیوں اور بدنصیبیوں کے موقف وداع (جائے رخصت) پر کھڑی ہوں۔ اور میں تمکو یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرے پاس تمھاری ایک امانت ہے جسکو تم بھول گئے۔ وہ امانت مجھے پہنچا دینی ضرور ہے یعنی "وہ تمھاری لڑکی ہے" اگر تمھارے دل میں کچھ بھی پدرانہ شفقت ہے تو چلے آؤ۔ اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہو وہ بھی اس بدنصیبی میں حصہ پائے جو اس سے پیشتر اس کی ماں پا چکی ہے"

جب میں یہ خط پڑھ چکا تو اپنے دوست کی جانب نظر کی۔

دیکھتا کیا ہوں کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں میں نے پوچھا کہ کہئے اس خط کے وصول ہونے کے بعد کیا ہوا۔ بولا! اِس خط کے پڑھنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے پہلو میں بادل کی سی گرج پیدا ہوگئی اور وفور اضطراب اور غم سے میرا دل و سینہ پھٹ رہا ہے۔ فوراً خط کے پتہ پر مکان کی طرف روانہ ہوگیا اور وہ مکان یہی ہے کہ جہاں تم مجھے اس وقت دیکھ رہے ہو۔ میں نے اُس مظلوم کو اس حجرہ میں جس میں اس وقت میں ہوں جسم بے جان مردہ پایا۔ اور اس لڑکی کو اُس کے بازو میں بیٹھے ہوئے نہایت تلخ آنسو بہاتے اور روتے دیکھا۔ اس عبرتناک سین کو دیکھکر مجھے غش اور چکر آگیا اور اوسی عالم غشی میں میرے تمام جرائم مجھے وحشی درندہ سانپ بچھو ہوکر ڈسنے لگے جب مجھے افاقہ ہوا تو میں نے خدا سے یہ پختہ عہد کرلیا کہ (جب تک میں زندہ رہوں گا) اس حجرہ سے باہر نہیں نکلوں گا جس کا نام میں نے "غرفۃ الاحزان" (ماتم کدہ) رکھا ہے۔ میری زندگی بھی اُسی کی طرح پُر درد ہوگی۔ اور میری تقدیر بھی اُسی کی طرح بیکسانہ ہوگی۔ اور آج میں بے انتہا جوش و مسرت کے ساتھ مرتا ہوں اور میرا دل مجھے بتا چکا ہے کہ ان رنجوں اور ان بدنصیبیوں کے سبب جو میں اُٹھا چکا ہوں خدا نے میرے تمام گناہوں کو معاف کردیا۔

جب سلسلہ سخن اس کا یہاں تک پہونچا تو اس کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا اور بستر مرگ پر یہ کہتے ہوئے جان دی۔ (دانتی یا صدیقی! اے میرے دوست میری لڑکی [illegible]

میں اس کے بازو میں ایک گھنٹہ کامل تک اسی رسم کو ادا کرتا رہا جو ایک دوست دوسرے دوست کے لیے ایسے موقع پر کرسکتا ہے اس کے بعد اس کے دوسرے دوستوں شناساؤں کو اسکی موت کی مختصر کیفیت سے اطلاع دی۔ سب جمع ہوئے اور اس کو آخری منزل تک پہونچا آئے۔ اور میں نے کبھی عورتوں۔ مردوں کو آجکی طرح اس قدر روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

قارئین سچ سمجھنا۔ میں اسوقت یہ واقعہ لکھ رہا ہوں مگر میرا دل رونے سے نہیں تھمتا۔ اور میں جب تک زندہ رہوں گا اس کے الوداعی الفاظ کبھی میرے دل سے نہیں نکلیں گے: "اُختی یا صدیقی"

اے مضبوط دل والے مردو! کمزور طبیعت والی عورتوں پر رحم کرو جب تم اُن کی عزت عفت عصمت۔ کو لوٹتے ہو تو تم یہ نہیں خیال کرتے کہ تم کیسے معصوم اور شریف خون کا ستیاناس کر رہے ہو۔

کیا اس قدر واقعات سے بھی ہم میں احساس نہیں پیدا ہوتا جو ہم آئے دن کمزور فرقہ پر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ زمانہ جاہلیت کی طرح لڑکی پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دی جائے۔ تاکہ سوسائٹی کا اثر اوپر نہ پڑے۔ اور ہم صرف کے گناہ گار نہ بنیں حالانکہ ہماری ان گناہوں کی انتہا نہیں ہماری نامہ اعمال میں نقطۂ موہوم کو سپیدی باقی نہیں۔ للہ کمزور بے زبان فرقہ پر رحم کرو۔ انہیں اُن کے جائز حقوق عطا کرو۔

اے سوسائٹی اور اس کے قانون کے بنانے والو! تجسس کی آنکھیں کھولو دیکھو بھالو۔ کہ ہماری وجہ سے عورتوں پر کیسے کیسے مظالم ہو رہے ہیں

اور کیسے کیسے پاک و پاکیزہ ذات دلوں کا خون ناحق ہو رہا ہے اور کتنی ایک گھر تباہ برباد ہو گئے قبل از وقت دنیا کی ہستی سے نیست و نابود ہو گئے

یادِ نذیر

ہاں اے غروبِ مہر و مہ اے جاذبِ تارِ نظر
دیکھوں تجھے شام و پگہ ہو آہ لب پر چشمِ تر
مژگاں ہو میری خونچکاں

اے سُرخیِ رنگِ شفق اے مرغزارِ آسماں
خورشید کا کیوں منہ ہے فق چہرہ سے ہی جو یوں عیاں
کیا دل میں ہے درد نہاں

اے روشنیِ صبحِ دم اے پیکرِ نورِ ضیا
کیا ہے قمر کو رنج و غم چہرہ ہے جو اُترا ہوا
کہہ مجھ سے اپنی داستاں

جو شے ہے حسرت خیز ہی جو چیز ہے سُنسان ہے
کب دل ہی فرحت ریز ہی ہر عضو گر بے جان ہے
ماتم کدہ سا ہے جہاں

کیوں ہے فسردہ قلب و جاں کیا ہو گیا جوشِ طرب
پژمردہ ہے جو ہے جہاں سب مٹ گیا شور و شغب
کیوں روح ہے میری تپاں

ہاں اے نذیرِ بے وفا کیوں پھیر لی ہم سے نظر
ہم سے ہوئی تھی گر خطا تو اُسکو کرتا درگذر
تو فطرتاً تھا مہرباں

تیری محبت بے ریا تیری اعانت بے محل

تیری صداقت بر ملا تھی بزم میں ضرب المثل
لیکن ہے اب اک داستاں

دلسوز تنہا ہمدرد تھا۔ ہوتا تھا تجھ سے دور غم
محفل میں اپنی فرد تھا مشہور تھا تیرا کرم
پورا ہو کیوں کر یہ زیاں

تو کیا چھٹا راحت چھٹی تو کیا گیا تسکیں گئی
عشرت چھٹی راحت چھٹی رونق گئی تزئیں گئی
سونی ہے بزم داستاں۔

عجلت تجھے آخر تھی کیا جو چل دیا منہ موڑ کر
لی تو نے کیوں راہ فنا الفت کو سب سے توڑ کر
کیا ہیں وہاں آسانیاں؟

تعمیر ہے کیا خلد کی بہتر وطن کی خاک سے
کیوں مٹ گئی دلبستگی گھر کے حسن و خاشاک سے
اچھا ہے کیا باغ جناں

کیسے کہوں تو خو دگیا تھا تو تو شیدائے وطن
پھر کیا ہوا کیوں کر ہوا بلبل سے چھوٹا کیوں چمن
ایسی کشش کیا ہے وہاں؟

جانے کو تم جاؤ اخی اتنا سمجھ رکھو مگر
بس دن گذرتا ہے کوئی تم سے ملے یہ نوحہ گر
اور ہو گلہ نوک زباں

ہاں لے بنا ذرہ نیمجاں پوری ہو جب تک آرزو

ہو نوحہ خواں کرم خاں ۔۔۔ سوکھے نہ آنکھوں کا لہو ہو تر بتر یہ تو گلستاں۔ نیاز محمد خاں نیاز جھجھوری

مکتوبات میر قمر الدین خانؒ

(آصف جاہ اول)

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد مشرف الحق صاحب حقی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی -

کچھ مدت پہلے جب میں مشہور تاریخی شہر دار الظفر بیجاپور کے متصل سرکار عالی متعالی کے قصبہ لنگ گور کی نواح میں شکار کھیل رہا تھا - ہماری چھوٹی سی جماعت میں اس تعلقہ کے ایک رئیس بھی شامل تھے جو شکار کی تلاش اور اس کا پیچھا کرنے میں باوجود کبر سنی ہم سب سے زیادہ سرگرم اور انتھک تھے - بس تو ان کی اس طرح کی مستعدی اور ساتھ ہی دوست نوازی کے سبب سے ہمیں نہ صرف جی بھر کر شکار مل جاتا تھا بلکہ اور بھی چھوٹے موٹے کام بآسانی نکل آتے تھے - چنانچہ زیادہ تر انہی کی کوشش سے چند قلمی کتابیں میرے ہاتھ لگ گئیں - ایسے نسخے اب دن بہ دن عنقا ہوتے جاتے ہیں - ان میں سے ایک وہ تھی جس کا نام میں نے اپنی طرف سے ٹیرا کے اس مختصر مضمون کی سرخی قرار دیا ہے - میں سمجھتا ہوں میری لاپروائی جب تک بھی جاری رہتی یہ نایاب نشانات بھی جن کا تعلق اس عہد کے بعض تاریخی واقعات سے ہے جس میں وہ قلم بند کئے گئے تھے ویسے ہی چھپے رہتے جیسے کہ اب تک رہے میرے پاس پہونچکر بھی جو یہ کچھ عرصہ ظاہر نہ ہو سکے اس کی وجہ یہ ہوئی

کہ یہ ایسی ایک تصنیف کے ساتھ مجلد کے آخر میں منسلک کر دیے گئے تھے
کہ جس کی اس زمانہ میں کتب سے اُٹھنے کے بعد ذرا کم ہی تلاش ہوتی ہے
یہ ایک محمد تاج الدین متخلص بہ بہجت کی لکھی ہوئی جہنستان معنی بہجت بیان۔
یعنی گلستان سعدی کی شرح ہے۔ جو ایک سو بہتر ۱۷۲ ورق صفحہ (۱۱ × ۸) پر
تمام ہوئی ہے۔ اس کے نام سے اس کی تالیف کا سنہ ۱۱۲۶ھ نکلتا ہے۔ موجودہ
نسخہ مگر اس کے سترہ برس بعد سنہ ۱۱۴۳ھ ہجری میں حافظ محمد فضل اللہ ولد مسیح
قاضی کے ہاتھ سے بمکان اودونی صوبہ دار الظفر بیجاپور نقل ہوا۔ یہاں سے
اسی کاتب کے قلم سے لکھے ہوئے چار صفحہ اور ہیں جن کی سرخی از کتاب
سفینۃ النجات مولانا اسلمی صاحب سلمہٗ ہے۔ اور اب ان کے بعد سے
ہمارے مکاتیب شروع ہو جاتے ہیں جن کا شمار جیسا کہ میں نے ان کو
گنا اٹھاسی ہے۔ یہ حصہ جو بالکل جدا ہے اس کا کاغذ پہلے حصوں سے
زیادہ پتلا خط ملتا جلتا مگر صاف تر نستعلیق ہے۔ شروع جہاں سے
ہوا وہاں اور جہاں تمام ہوا وہاں اس کا کوئی نام وغیرہ ایسا لکھا ہوا نہیں ہے
جس سے غور سے مطالعہ کیے بغیر اس کا کچھ پتہ چل سکے۔ سر صفحہ پر
یا فتح لکھا ہوا ہے جس کے نیچے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور پھر پہلا رقعہ
شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں اٹھاونویں صفحہ پر آخری خط ان الفاظ میں
کہ مجموع نہ ہزار سوار و یازدہ ہزار پیادہ ملازم سرکار نظر بر جمیع اخراجات
سابق و لاحق کہ نمودہ میشود و نظر بر مداخل نمودہ میشود تحریر رو میدہ۔ یکایک
ختم ہو جاتا ہے گویا نقل ادھوری چھوڑ گئی۔

اس وقت تک میں نے اس حصہ کے پہلے چالیس مکتوبات کو کسی قدر
تفتیش سے پڑھا ہے۔ ان میں جو جو حالات پائے گئے اور جو بالعموم

دکن کے مہمات سے وابستہ ہیں ان کو ہم عصر واقعات سے جو بعض مروجہ تاریخی کتابوں میں ثبت ہیں۔ جو مجھے مقابلہ کے لیے یہاں مل سکیں ملانے سے یہ صاف طور سے روشن ہو جاتا ہے کہ یہ ابتدائی منشآت بلکہ عرضداشتیں وہ ہیں جو میر قمرالدین خاں آصف جاہ اول نے روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی کی خدمت میں گذرانی تھیں۔ اور جب اُن اشخاص کا پتہ چلتا ہے جن کے نام ان میں واقع ہیں۔ (مثلاً خود میر قمرالدین کا جو اکیسویں مکتوب میں اس طرح ادا ہوا ہے کہ عرضداشت کمترین راسخ العقیدت قمرالدین بادای آداب بندگی الخ) تو پایۂ ثبوت اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ غرض یہ مجموعہ ضرور اس قابل ہے کہ اس سے اُس زمانہ کی جب کہ ہندوستان میں مرہٹوں کے دور دورہ کا کیا کچھ آغاز ہو چکا تھا دکن کی تاریخ پر روشنی ڈالی جا سکے۔ پس اسی خیال سے اور نیز اس لیے کہ اس میں سے چند مکاتب انشاپردازی کا عمدہ نمونہ خیال کیے جا سکتے ہیں اور کیوں نہ ہو آصف جاہ اول نہ صرف اول درجہ کا مدبر بلکہ سعداللہ خاں وزیر شاہ جہاں کے بعد سب سے بڑھا ہوا عالم اور علمی قدرشناس تھا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ جب کبھی فرصت نصیب ہو اور ساتھ ہی میسر آ جائے تو ان تمام کتب تک پہونچ سکے جن سے اس پر حاشیہ چڑھانے میں مدد مل سکے تو ان تمام مکاتیب کو ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دوں۔ لیکن۔ اس خوش وقت کے آنے تک گوارا نہ ہو سکا کہ کم سے کم پہلی عرضداشت بطور نمونہ ایسے حضرات کے روبرو پیش نہ کی جائے۔ جن کو اس قسم کی تصنیف سے کچھ بھی مذاق حاصل ہے۔

کمترین خدویان عقیدت شعار بعد آدائے آداب بندگی بندروہ عرض

باریابان حضور مونو السرور بادشاه سلیمان منزلت فلک جاه خدیو سکندر
منقبت عالم پناه قبله مقصود و کعبه معبود فدویان صادق آبرو بخش بنده های
واثق میرساند که کفار فجار تیره روزگار با اراده فاسده سراز سوراخ خرابهای
خود برآورده بطریق مستمره بعد و سیره هر طرف دوید ند و جمعیتی از آنها برهانپور
را محاصره نمودند - فدوی درگاه بعزم تنبیه آنها از مقام چهاونی روانه شد عضد الدوله
را در حوالی حالنه با باجی راؤ که از اشداء سقاست مقابله و محاربه اتفاق افتاد
و جنگ شد - الحمدلله والمنة باقبال بادشاهی تنبیه رسا یافت و جمعیتی کثیر از ان
گروه گمراه کشته شدند و زخمی گشتند - از نیطرف هم چندی بشهادت رسیدند
و زخمی شدند - راؤ رنهاجی تردوات شایسته نمود - پسر رشیدش بکار آمد و
مردم دیگر نیز تردد نمایان نمودند - باجی راؤ از پیش عضد الدوله گریخته بجانب
برهانپور رسیده ملحق گشت - فدوی هم بجلدی به برهانپور رسیده - شقیا
خواستند که از نربدا بگذرانند - از برهانپور بسرعت روانه شد آنها را فرصت
گذشتن از دریا ندادند خایب و خاسر برگشته روبکهات کساری نهادند - بعد
برآمدن کهات وبهار به بجانب سنگمیسر رفت و باجی راؤ بطرف مونکی پتن
عضد الدوله را بتعاقب او مرخص نمود - دریں صحن سید لشکر خان و همت
یاخان و راؤ رنهاجی وغیره را بر سر پسر و بهار به دوانید و تنبیه خوب
نمودند چند نامزدار ان از اشقیا بجهنم شتافت اسپان باساز
بدست آمدند غیرت کلی عاید کفار گشت - فدوی الحال اراده دارد که انشاء الله
تعالی تخریب اماکن و مساکن کفار پردازد و افواج را بتعاقب مفهوران
مقرر دارد بحول قوه الهی و مدد اقبال بادشاهی سید جمال خان بهادر
و پسر عضد الدوله کانهوشقی را در برار بار ها تنبیه نمود لیکن در نیوالا

بست وہفتم شہر ربیع الثانی جنگ عظمی واقع شد بفضل الہی فتح عظیم نصیب شد تاسہ کروہ کفار راتجوی پیش انداختند کہ غیراز کوزیراق کار دیگر درمیان نبود۔ بسیاری تہ تیغ گشتند و بسیاری مجروح گشتند درچنیں وقت کہ ہنگامہ زدوخورد گرم بود شام شد ناچار غازیاں عنان باز واشتند۔ الحال خبر رسید کہ کانہو بایں حال تباہ بباجی راؤ ملحق شد۔ غلب کہ سید جمال خال بہادر ہم باعضد الدولہ یکجا شدہ باشند وہر دو بحولہ وقوۃ الہی واقبال بادشاہی باتفاق بہ تنبیہ وتادیب باجی راؤ کانہو خواہند پرداخت۔ برائے اقدس اعلی ظاہر است مہم دکہن وتنبیہ مرہٹہ درعہد حضرت خلد مکان بچہ طول کشیدہ بود سالہا بریں گذشت وافواج وخزاین چہ قدر برایں کار صرف شد۔ الحال فدوی محض بپاس مرضی مقدس چنیں مہم صعب را بایں مصالح قلیل اختیار کرد تا معاندان روسیاہ شوند ہر روز نغمہ سرائید ند کہ فلانی چنین ارادہ دارد الحال فدوی بایں قسم مہم صعب بموجب حکم مقدس پرداختہ معلوم نیست کہ چہ مے گفتہ باشند فدوی باعتماد فضل الہی واحکام وارشاد اقدس بمحض صادق فدویت بایں کار عمدہ مشغول است آبروے فدوی وابستہ تفضل حضرت است درہر باب امیدوار تفضل ودستگیری وحمایت بندہ نوازیست زیادہ چہ عرض نماید آفتاب سلطنت وخلافت برسر فدویان تاباں و درخشاں باد بررب العباد۔

خریداران تمدن براہ کرم خط کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

منیجر تمدن دہلی

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے — کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے — اٹھا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے — کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے
کیا بجھ گئے اب کر کے شبِ تاب وہ سارے؟ — ہر شام جھمکتے ہیں جو راوی کے کنارے!

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے — غالیچہ سرِ فرش ہو کوئی۔ نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے! — دن کو ہیں سرِ بام۔ ہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو۔ مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے۔ زبر و زیر۔ یہ اندھیر! — یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر! یہ اندھیر!
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر — اے گردشِ ایام۔ یہ اندھیر! یہ اندھیر!

ماہِ فلکِ حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ تری سفلہ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا — ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا — اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی - یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے ہو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جس کے لیے گلزار و چمن تھے جو نازکی میں داغ وہ برگِ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے شاداب گلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے جو پیکرِ ہستی کے لیے روح رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے جاں بخشِ جہاں تھے تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں! ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ - نہ وہ قصرِ نہ ایواں آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

لڑکیوں کی (نشا) جس کا ایک ایک خط دلچسپ ہونے کے علاوہ لڑکیوں کے واسطے ایک بیش قیمت تحفہ ہے مولوی عبدالرشید صاحب الخیری کا نام ہی اس نشا کی خوبیوں کی واسطے کافی ضمانت ہے قیمت ایک روپیہ ہر خریدار کو عمدہ منیجر عصمت دہلی سے طلب کرو

بھائی کا خط ایک دوسرے بھائی کے نام

عزیز از جان! تمھارا خط جو تمنے اپنی آپا جان کو لکھا تھا۔ اگست کے تمدن میں میری نظر سے گذرا! مجھے تمھاری طرز بیان پر حیرت ہے! جوش جیسے مضمون آفرین شخص سے بڑھ جانا کوئی آسان بات نہیں "بھائی کا خط بہن کے نام" پر ہم سب نے ہی غور کیا، زور ڈالا۔ لکھنا چاہا: لیکن سچ پوچھو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا! سب سے پہلے زاہدی صاحب نے اظہار خیالات کیا۔ اور جو کچھ لکھا خوب لکھا، بہت خوب لکھا! اب تم بھی پبلک میں آتے ہو، آؤ، مگر دعا ہے کہ خدا تمھیں مخالفت اور اعتراضوں سے بچائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو تمھارے معترض کا جوابدہ میں بنجاؤنگا، اور خود سلطنت لونگا تم کچھ فکر نہ کرو! مگر ہاں ایک بات لحاظ رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ آئندہ سے اپنے مضامین میں پھول وغیرہ میں لکھو کہ "عیب جو نظر کا ڈر اور نہ ناکامی کا خطرہ، ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا" "عصمت" اور "تہذیب نسواں" میں لکھو کیونکہ بے پردگی کے خیالات جب تک طبقۂ نسواں میں نہ پھیلائے جائیں گے اور جب تک وہ قید خانہ سے باہر پردے کی حمایت کرنیوالوں کا ٹیٹوا نہیں پکڑ لیں گی اس وقت تک ہمارا تمھارا چیخنا فضول، مدعی سست گواہ چست!!

ایک اور بات سن لو، اور سنو ہی نہیں بلکہ سمجھ لو! کیونکہ کوئی غیر اگر اس [illegible] کچھ لکھے گا تو سب سے پہلے تو میں ہی آستینیں چڑھا کر مرنے مارنے کو تیار ہو جاؤنگا اول تو یہ کہ تمنے "جوش" کا مضمون "بھائی کا خط بہن کے نام" غور [illegible] کیونکہ جو دلائل اور براہین اس ظالم نے لکھے ہیں اگر تمنے [illegible] میں ڈالو، زاہدی صاحب بھی ان دلائل پر کچھ بحث نہ [illegible]

انداز کیا تو کیا بیجا کیا! افسوس تو یہ ہے کہ تم اور پروفیسر زاہدی۔ دونوں اس مضمون کا مفہوم نہ سمجھے تمنے جو کچھ لکھا ہے۔ قید، اور جہنم کی تصویر پردہ کو تسلیم کرکے لکھا ہے یعنی انتہائی درجہ کے پردہ کی مخالفت کی ہے حالانکہ جوش صاحب نہ اس کے حامی تھے اور نہ انہوں نے کہیں ظاہر کیا وہ جس معتدل پردہ کی حمایت کرتے ہیں اسپر بحث ہوتی۔

تم نے اپنے مضمون میں غضب ڈھایا ہے کہ جس پردہ کی حمایت جوش نے کی ہے اسکی نسبت لکھا ہے کہ "اچھا ہوا کہ مذہب کو معرض بحث میں نہیں لائے" اور "نہ وہ منجانب اللہ ہے"۔ وغیرہ وغیرہ معاف کرنا تم کو نہ علم القرآن سے آگاہی، نہ علم حدیث سے واقفیت (اور تکو کیا ہم میں سے ایک کو بھی نہیں!) جو کچھ ادہر اُدہر سے سن لیا، لے بھاگے اور گرہ باندھ لیا! پھر اس ہلدی کی گرہ پر پنساری بیٹھنا درست نہیں! عزیزم بسن لو اور سمجھ لو کہ ایسے بے سوچے سمجھے دعوے کر دینا اچھا نہیں اور خصوصاً مذہب کے کسی مسئلہ میں! جو پردہ سسٹم ہندوستان میں رائج ہے یعنی قید اور جہنم کی تصویر البتہ اس کا ثبوت کلام پاک میں نہیں ملیگا اور نہ وہ حکم خدا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو "جوش" نے اس پردے کی حمایت ہی نہیں کی، جس معتدل پردہ کی وہ حمایت کرتے ہیں، اور جن لفظوں سے کرتے ہیں اس کا مطلب مختصراً یہ ہو سکتا ہے کہ شریف عورتیں بزرگوں اور شوہروں کی اجازت سے جایا کریں، اور جہاں تک ہو سکے اپنا منہ وغیرہ لوگوں سے چھپایا کریں!

اس کا پہلا حصہ یعنی اجازت لینا تو ادب اور تہذیب کا مقتضے ہے اسکو پردہ سے زیادہ تر تعلق نہیں۔ رہا آخری حصہ یعنی منہ چھپانا اسکی نسبت خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ "اے پیغمبر! مسلمان عورتوں سے کہدو کہ..... اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کریں..... اور اپنے سینوں پر دوپٹے کے بکل مارے رہا کریں" دیکھو پارہ ۱۸۔ سورہ نور رکوع ۴) اس کے علاوہ ایک اور جگہ آنحضرت کی ازواج مطہرات سے علیحدہ رہنے کا حکم دیتے ہوئے سب لوگوں سے فرماتا ہے کہ "اور جب ان سے کوئی چیز تمہیں مانگنی ہو تو پردہ کے باہر ان سے مانگو۔ اس سے تمہارے دل اُن کی طرف سے خوب پاک صاف رہیں گے اور اسیطرح اُن کے دل بھی" (دیکھو پارہ ۲۲

سورۂ احزاب کوع ۷) پر آگے چلکر خدائے پاک نے بالکل صاف لفظوں میں حکم دیدیا ہے کہ "اے پیغمبر! اپنی بیویوں اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچانی جائینگی اور کوئی چھیڑیگا نہیں" (پارہ ۲۲ سورۂ احزاب کوع ۸) ان آیتوں سے منہ چھپانا تو الگ رہا ایک حد تک بھی معلوم ہوگیا کہ بالکل آزادی کی حالت میں اشتعال طبع کا خوف ہے جسکو پروردگار عالم نے کیسے معنی خیز اور عمدہ الفاظ میں صاف ادا فرمایا ہے!

اب میرا تمھارا منہ نہیں کہ ایسے ناطق احکام کی موجودگی میں بھی دعوی کریں کہ مرد نیک طبع ہوجائیں تو کچھ بھی نہ ہوگا! گویا ہم اور تم خدا سے زیادہ واقف ہیں! خیر اس ذکر کو چھوڑ دو، مگر اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ مذہب کو کبھی بھولکر بھی معرض بحث میں لانے کی جرأت نہ کرو اور نہ ایسا دعوی ہی کیا کرو! میں تو اس کا لحاظ ہمیشہ رکھتا ہوں!

تم جانتے ہو کہ میں (اور میں ہی نہیں بلکہ ہماری پارٹی کا ہر شخص) پردے کا جانی دشمن ہوں۔ مگر تمھاری "آپا جان" پردہ کی حسم وجان ہیں آئے دن مجھ سے اور انسے بحث ہوتی رہتی ہے اور مذکورہ بالا آیتیں بھی اکثر انہوں نے ہی میری تردید میں پڑھی ہیں اور اسی وجہ سے مجھے یاد ہوگئی ہیں ایک دن اثنائے بحث میں ہم لوگوں کی حالت پر لعن طعن کی بوچھار کرتے کرتے تمھاری "آپا جان" نے ایک رباعی پڑھی تھی! چونکہ تھی نہایت اچھی بھی یاد ہوگئی! تم بھی سن لو:-

جنکو اسوقت میں اسلام کا دعوی ہے کمال — غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے انکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

کیا کہوں کہ تمھارے اس خط نے جس کا میں جواب لکھ رہا ہوں تمھاری "آپا جان" کے ساتھ کیا کام کیا! وہ ایسی بگڑیں ایسی بگڑیں کہ اللہ دے اور بندہ لے! میری جو شامت آئے تو کمبختی کا مارا اس وقت گھر میں جا نکلا! پھر کیا تھا، جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئیں اور تمھاری [illegible] پر سیکڑوں اعتراض کر ڈالے کتنے ہی اعتراضوں کا جواب میں نے اچھی طرح دیدیا [illegible]

اور کئی ایک کا مطلب ایسا اخبط کر دیا کہ بات کہیں کی کہیں چلی گئی! اُنکی تقریر تو بڑی طویل طویل تھی مگر میں اُن کے بعض بعض اعتراضات تمہیں سنانے کے لیے لکھتا ہوں:-

(۱) اسوقت تک وہ مفید ہوا ہے اسکو بھائی جان مانتے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے، اگر ایک شخص ایک ایسی چیز کی تعریف کرے جس کا مفید ہونا تسلیم کیا جا چکا ہو، اور پھر اسکی تعریف دوسرا شخص بھی کر دے، تو کہدیا جائے کہ جسپر تجھے فخر ہے وہ مری ننگ ہے!!

ہاں بھائی جان وہ ننگ تُست سہی، مگر کیوں؟ اس لیے کہ مری سہیلی کا بھائی اسکی تعریف کرتا ہے اسلئے کہ وہ اسپر فخر کرتا ہے یا اس لیے کہ پردہ فائدہ مند بقول آپکے ثابت ہوا ہے؟

(۲) پردہ درصل پیوند ہی جائے کہنہ کا آج اسکو اٹھا دیں تو فوراً عیب کھلجائیں اس لیے کہ جن لوازمات کی ضرورت ہے، وہ مفقود ہیں" نتیجہ نکلا کہ پردہ نکرنا چاہیئے یہ تو فرمائیے کہ لوازمات ضروری بھی تو مہیا کر لیے جاویں یا پہلے ہی سے آب دیدہ موزہ کشیدہ، پر عمل کر کے، پردہ اٹھا دیا جائیگا جو عیب اسکے اٹھا دینے سے کھل جائیں گے وہی تو مانع ہیں! اس لیے تو ہم لوگ پردہ کرتے ہیں۔ خود اس دلیل پر قائل ہوئے یا نہیں؟ (اسات کا جواب تمھاری آیا جان کو میں کیا دے سکا!!

(۳) جبتک تعلیم نسواں ہر زن و مرد کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہو، اخلاق و آداب ٹھیک ہو سکتے ہیں لعنی یہ چال چلن درست ہو سکتی ہیں عورتیں گھر سے نکل کر دنیا کو نہیں سمجھ سکتیں" وغیرہ وغیرہ کیا اس لیے پردہ نکرنا چاہیئے۔ سبحان اللہ کیا اچھی رائے ہے! کیا اچھا ثبوت ہے! جب ہی تو کہتے ہیں کہ اندھی تقلید اندھا کر دیتی ہے۔

(۴) "پردہ دھوکے کی ٹٹی ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھ پر پٹی ہے"، آپکا شاید یہ مطلب ہے کہ دھوکے کی ٹٹی کو توڑ دیں اور مردوں کی آنکھ پر کی پٹی کھولدیں، کیوں یہی مطلب ہے نا؟

(۵) پستی و نکبت کی حد ہوتی ہے بیشک! اسکو شبہ نہیں! مگر سوال یہ ہے: حد ختم ہو گئی یا ختم ہو رہی ہے؟ ہاں شاید جب عورتیں باہر نکلنے لگیں گی تو حد ختم ہو جائیگی۔

(۶) گھر مرغی کے ڈربے یا کباڑی کی دکان وغیرہ وغیرہ۔ خوب! خوب!! ہاں تو علمیت

قابلیت، تجربہ سب فیشن کی تقلید پر نثار ہو گئے!! ہمارے گھر اب مرغی کے دڑبے کہے جائیں یا کباڑی کی دکان۔ غرض جو کچھ کہا جائے بجا اور درست! زمانہ ہے جو ایسی پوچ اور بچر باتیں سنواتا ہے! کیا نہیں ہیں یہ وہی گھر جنکا نقشہ کھینچتے ہوئے "تمدن عرب" کا مصنف عش عش کرتا ہے! کیا نہیں ہیں یہ وہی گھر جن کی نقل اُتارنے کے لیے یورپ والے برسوں قرطبہ اور بغداد کی خاک چھانتے رہے ہیں! مگر اسوقت حکومت تھی، تمول تھا بے فکری تھی: جو کچھ بناتے تھے دل کھول کر بناتے تھے: سونا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ کھانا۔ وغیرہ وغیرہ ہر ایک چیز کے لیے علیحدہ علیحدہ حصے اور پھر ساتھ ہی باغیچہ۔ نہر۔ کنواں۔ باؤلی۔ حوض۔ فوارہ وغیرہ وغیرہ سب کچھ موجود! لیکن بر! اگر عزت اور شرافت رکھنی ہے تو خیر اسی میں ہے کہ جتنی چادر ہو اتنی ہی پیر پھیلائے جائیں! باتیں بنانے والے باتیں بناتے ہیں مگر ایمان اور سچائی سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں! بسا اوقات جانوروں سے بدتر، اینک تو بفضلہ نہیں ہے البتہ اگر یہی کورانہ تقلید ہی تو مرے منہ میں خاک آگے چلکر ضرور ہو جائے گی! رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا

لباس ہمارے ہاں زیادہ تر پردہ پوشی اور حیا و شرم کا لحاظ رکھکر ایجاد کیا گیا ہے اور جو کچھ اسمیں تھوڑی بہت چڑک بھڑک آ بھی گئی ہے وہ ہندوستان جنت نشان کا اثر ہے، ایسا لباس بھلا کیوں سمجھ میں آنے لگا! تو ایسا لباس اچھا ہے جسمیں سے بدن کی جلد جھلک مارتی ہے نرم نرم ہاتھ ہونٹ ہوں تک کھلے رہکر اپنا برابر اور گداز جسم پیش کرتے ہوئے آنکھوں کو سرور دیتے رہیں اب تو ایسے ہی لباس کی ضرورت ہے، اور وہی بہترین لباس ہے جس سے ہر وقت آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے! پہلے زمانہ کے لوگ تو ایسے نظارہ سے اپنے خیالات پر قابو نہیں رہ سکتے تھے اسی وجہ سے ایسی ہوس انگیز اور فتنہ زا باتوں سے دور رہتے ہیں! لیکن اب سردی بڑھتی جاتی ہے، کمزوری عام وبا ہے، نوجوان بڑھاپے سے بدتر یا اگر نہیں تو کثرت کا غلاف چڑھا ہوا ڈھانچ ہیں! ان کے لئے اس جیسے ہزار نظارے

بھی کچھ نہیں! کیا ممکن جو گل محمد اپنی جگہ سے چانول پھر بھی کھسک جائے! اللہ کی شان ہے کہ ہمارے ڈھیلے پائجامونکے پائنچے اُٹھانے پر آوازے کسے جاتے ہیں اور کستا کون ہے جو ایک چھوڑ دو دو۔ گاؤن۔ بہاری بہاری اونزمین پر جھاڑو دینے والے لمبے گاؤن۔ کو اکٹھا کرکے ایک پوٹلی سی بنا کر کولوں کے قریب سے علانیہ اُٹھا کر رستہ چلے! جھانجن کی آواز بُری اور سخت بُری لیکن اونچی ایڑی کیسی؟ پیڈی جوتی یا گھیتلے پر لاکھوں باتیں بنائی جائیں لیکن اسکی وجہ لقمان بھی نہ بیان کرسکے کہ خواہ مخواہ ایڑی کو قطب صاحب کی لاٹھ کی چھوٹی ہمشیرہ کیوں بنا دیا گیا جس سے ہر وقت ڈر ہے کہ پاؤں مڑا اور موچ آئی؟ کندھوں سے کمر تک اور کمر سے گھٹنوں یا ٹخنوں تک دو دو سایوں کے نیچے بدن کو جکڑ لینا لوہے اور چمڑے سے مشکیں کس دینی سانس تک آزادی کیساتھ لینے کے قابل نہ رہنا۔ بجا اور بالکل جائز آزادی کی موجودگی میں سرکس کے شیر دیکھ کر خواہ مخواہ سر سے پانوں تک کانپ جانا، تہرا جانا، سب قابل فخر! لیکن اپنے آباؤ اجداد کی جائز رسوم پر پار دینے کے قابل! اسی کا نام قومیت ہے؟ ہمارا منہ نہیں کہ ایسی باتیں ہوتے ساتھ ہی اپنے لباس پر حرف گیری کریں۔ کانٹری پہلے اپنا ٹومنٹ نکال لے پھر کسی کی پھلی نکالنے پر آمادہ ہو! ؎

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

(عزیز بزم سچ کہتا ہوں اس بات پر بھی تمھاری آپا جان نے لتے ہی لے ڈالے تم نے بھی لکھنے میں اپنے اوپر بہت کم نظر رکھی ہے!)

(۷) واہ بھائی جان واہ کتنے اچھے طریقے سے پردہ کی حقیقت سمجھائی ہے مضمون پردہ کیموافق لکھا ہے نتیجہ نکالا اور نکالا بھی نہیں بلکہ لکھدیا کہ "پردہ نکرنا چاہیئے" اور تائید اسطرح کی "اپنا گھٹنہ کھولیئے اور آپ ہی لاجوں مریئے"!

(۸) جی ہاں وہ ایسے نہ سہی پردہ پر ناز کرتے ہیں، اور کرینگے "نہ وہ گھٹنے کھولیں

اور نہ وہ لاجوں مریں کیا آپکی اتنی جلد رائے بدل گئی؟ کیا آپ گھٹنہ کھولکر لاجوں مرنے پر (خدا نہ کرے) طیار ہیں؟ (بھاں بھی میں تم کم عمی کی تصویر بن گیا)

(۹) خود تو کہہ رہے ہیں کہ بعجب قومی کیریکٹر نہیں تو فخر کی جگہ شرم کا مقام ہے" اور اب خود ہی کہہ رہے ہیں کہ "باوجود تعلیم و احساس و قومی کریکٹر ہونے کے۔ گھر سے نکلنا چاہیئے۔ ٹھیک تو ہے ان سب کے ہونے کی شرم ماری ڈالے گی آج نہ سہی تو کل سہی اس لیے یہ بہتر ہے کہ آج گھر سے نکلیں اور دو مرنوں کی نظر ہم پر پڑے اور آج ہی مر جائیں

(۱۰) عورت کو غنچہ دلاویز سے مثال دیتے ہیں اور "آبدار موتی" سے تشبیہ دیتے ہیں، مگر پھر ضد ہے کہ عورتیں پردہ نہ کریں۔ سوچو تو وہ پردہ کیوں کریں، اگر وہ غنچہ دلاویز ہیں تو تیرے میرے ہاتھوں میں جاکر مرجھا جائیں گے اور اگر وہ آبدار موتی ہیں تو یہی ناجائز استعمال سے بے آب ہو جائیں گے آپ ہی بتایئے کہ موتی بے آب ہو جائیگا؟ اور کیا پھول نہ مرجھا جائے گا؟

(۱۱) نیچر بتاتی ہے کہ جتنی خوشنما، نازک، اور قابل حفاظت و احتیاط چیزیں ہیں، وہ سب پردہ میں پیدا ہوتی ہیں، پردہ میں رہتی ہیں، اور اسیوقت تک وہ قابل قدر و قیمت ہیں۔ جہاں پردہ سے باہر نکلیں اور برباد و تباہ ہوئیں مثلاً دماغ انسانی کیسی حفاظت کے ساتھ قید کیا گیا ہے؟ قوت بینائی کس طرح چھپائی گئی کان کے پردے کس پردے میں پوشیدہ ہیں؟ دل کو دیکھئے کتنی محفوظ جگہ ہے؟ اور پھر سب کے آخر میں خدا خود کس قدر ہر جگہ موجود ہو کر اور حاضر رہ کر غائب اور پوشیدہ ہے؟ اب فرمایئے پردہ فطری شئے ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہے تو کوئی بات خلاف قانون قدرت تو رائج ہو نہیں سکتی" اس لیے دو نتائج نکلے۔ یا تو پردہ فطری شئے نہیں ہے یا خلاف قانون قدرت چیزیں رائج ہو سکتی ہیں۔ جواب دیجئے کونسی بات ٹھیک ہے؟ (اس کا جواب میں نے الٹ پلٹ کر دیا تو سہی مگر

ایمان لگتی تو یہ ہے کہ خود میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔

(۱۲) بقول ہربرٹ سپنسر آغا خان کے (حالانکہ انہوں نے اور موقع پر استعمال کیا تھا) "آدمی قوم مردہ ہے" اس لیئے پردہ نکرنا چاہیئے، پردہ نکرنا قوم کی زندگی ہے اور پردہ کرنا قوم کی موت۔ کیوں ہے ٹھیک؟

(۱۳) باہر مردانے میں ایک چھوڑ دو دو طائفے اُترے ہوئے ہیں، اندر کوئی بی صاحبہ کسی دوست کی بیوی کے نام سے گھر میں مہمان ہیں" اس سے کیا مطلب؟ آپ چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی اسطرح سے کریں؟ کیا اسی کے معنے، حقوق طلبی میں، ہاں یقیناً! کوئی وجہ عورتوں کے پابند رہنے کی نہیں ہے۔ وہ بھی کھلم کھلا اسی طرح سے جس سے، اور جس طرح چاہیں، ملیں دونوں کے حق برابر ہیں، اور اُن کا صحیح استعمال یہی ہے! شاباش، مرحبا! انصاف اسی کو کہتے ہیں۔ البتہ بات صرف یہ پیدا ہوگئی کہ عزت وحیا، انصاف پر سے قربان کرنی پڑی!!

(۱۴) بھائی جان کا تجربہ بالکل ٹھیک ہے بیشک "اُن کے (لڑکیوں کے) قویٰ میں عقل میں، توانائی میں۔ ذرا سا فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض بعض بچیاں بچوں سے زیادہ قوی اور فرزانہ ہوتی ہیں بلکہ لڑکیوں کا اُٹھان اول اول عام طور پر بڑا ہوتا ہے اور مردوں کی نسبت سن بلوغ کو بھی جلدی پہنچ جاتی ہیں"

"مٹھو" جس کا ذکر کرتے ہوئے میں اب قوت پرواز کی بھی طاقت رفتار ہی نہیں رہی" اس لیئے آپکا منشا ہے کہ اسکو چھوڑ دیا جائے اور خالد بلی ہڑپ کر جائیں۔ رائے تو صائب ہے ہمیشہ کی داستان کل سے تو نجات مل جائیگی (یہاں میں پھر غائب تھا!!)

"معیار تہذیب اخلاق کا بڑھانا ہے" یہ سب سے بڑی بات ہے اور بیحد اچھا خیال ہے مگر تم نے اگر مگر" میں لاکر اسکی ریڑھ لگادی۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ "اگر" ہی تو نہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر نہ یہ نہ وہ قصہ ختم۔"

۱۱ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کے "وقت" میں وہ مبارک جوشی آپ ایمان نے ایک ایک کرکے گن دی ہیں جنکو ہم نے بہت پکا مانا تھا۔ اور جنکی بدولت ہم نے اپنے آپکو "وقت" کے حوالے کر دیا تھا۔ اب دیکھ لیجئے کہ ان میں سے کونسی پیشگوئی پوری ہوئی ہے۔ ۱۔ "وقت" کی زندگی ۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا سرکولیشن ۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ایڈورٹائزمنٹ ۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا پریس ۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ایجنسی ۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۲۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۳۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۴۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۵۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۶۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۷۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۸۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۱۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۲۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۳۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۴۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۵۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۶۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۷۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۸۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۹۹۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا ۱۰۰۔ "وقت" کا ۱۰ ہزار کا

بہ تقریب تاج پوشی قیصر ہند۔ ہر دو حصہ بجائے (۴ر) کے ایک روپیہ کو ملیں گے

وصل حبیب

ناول نہیں دلچسپ اداؤں کی ہے تصویر رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

سن تو سہی جہاں میں میرا فسانہ کیا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی۔ از بھوپال۔ امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیر جی بشیر علی صاحب۔ از بجنور۔ الحمدللہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول جب مراد زیور طبع آراستہ ہو کر نور افزائے چشم مشتاقین ہوا۔ داد کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ میں قابلیت خداداد ہی حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان۔ آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از ڈبائی ضلع بلند شہر۔ وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ درحقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از سنبھل مراد آباد۔ وصل حبیب دیکھا۔ ماشاءاللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کرکے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو سرکشن داس صاحب سہسوان۔ از دہلی۔ آپکا وصل حبیب حصہ دوم ہی پہونچا۔ بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو نبس گوپال صاحب کمسنان از حیدرآباد دکن۔ آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم۔ ٹرکو فونیا از آرہ۔ کتاب (وصل حبیب) کو یکہ بعد سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے چھوٹے چھوٹے مگر چست اور برمحل جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہے ہیں عبارت کا زور۔ اشعار کی ترتیب۔ جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف تبلا رہی ہے کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے۔ مذکورہ بالا صفات نے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ہر ناول کو ایک بار دیکھکر انسان آسودہ ہوجاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں ہی کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہوسکتی۔ یہ تو دلچسپی تماشائی بن جاتا ہے۔ انتہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد بابت ماہ ۹ شمارہ ۶ ناظرین اتحاد میں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس درجہ مخالف ہیں وصل حبیب کو ہم نے نکتہ بین نگاہوں سے غور دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ موجودہ لغو فسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا۔ مگر کس قدر خوشی ہوئی۔ کہ مصنف نے کل ہمارے خیال کا چربہ اپنی تصنیف میں اتار دیا ہے زبان کی سلاست اور دلچسپی ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ غرض ناول بہت خوب ہے اچھا اور قابل قدر ہے ایسے ہی کتابوں کی اشاعت ہم کو مطلوب ہے

(۱۰) صاحبزادہ صاحبہ شیر صاحب۔ مالیات ریاست کتمیر از سری نگر۔ وصل حبیب نے ہم کو مشتاق وصیفہ کا مشتاق بنا دیا ہے

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاک خانہ گوہر گنج۔ ریاست بھوپال

(نوٹ) ناول وصل حبیب کا حوالہ ضرور دیجئے

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

ستائیس برس سے سارے ہندوستان میں استعمال میں آرہی ہیں

(۱) دما جسے زور سے اُچھلتا ہو اس دوا کے دو ایک ہوتا دہی سے دب جاتا ہے۔

(۲) نیا ہوا اور اس دوا کا استعمال کیا جائے تو دما جڑ سے جاتا ہے۔

(۳) پورانے دما والے یا جن کا دما دم کا ساتھی ہو گیا ہے وہ بھی اس دوا سے بہت صحت پاتے ہیں

دمہ کی دوا } ڈاک محصول ایک سے چھ شیشی تک ۵ آنہ قیمت ایک شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

مقوی گولیاں } ڈاکٹری میں طاقت دینے والی دوائیوں میں مشہور دوائیں فاسفورس اسٹکنیا اور ڈونیا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں مغز ریڑھ رگ۔ ماس۔ اور خون کو یہ طاقت دیتی ہے اس لیے ان کی کمزوری سے پیدا ہوئے معمولی کمزوری۔ ہول دل یا۔ بولنا۔ ہاتھ پیر کانپنا۔ لقوہ۔ وغیرہ ان گولیوں سے آرام ہوتے ہیں دو ہفتہ کی خوراک تین گولیوں کی شیشی قیمت ایک (عہ) روپیہ ڈاک محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ۔

اندرونی مستورات کی دوا } یہ ہر ایک اقسام کے مستورات کی دوا ہے ہر طرح کا رحم کی بیماری پرورروک حمل کی کمزوری پیٹ جانگ میں درد وغیرہ کو مٹا کر اس دوا کے استعمال سے رحم کی خرابی تمام دور ہو کر جسم قوی ہوتا ہے ایک دفعہ اس دوا کی بھی آزمایش کیجیے۔ قیمت ایک شیشی ایک روپیہ (عہ) (۱۶) خوراک محصول ڈاک ۲

ان دوائیوں کی مفصل حالت معہ سرٹیفکیٹوں کی پوری کتاب بلا قیمت ملتی ہے منگا کر پڑھیے۔

ڈاکٹر۔ ایس کے۔ برمن

نمبر ۵ و ۶ ستارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

نوٹ۔ ہمارے ایجنٹ آغا منصب علی کشمیری دروازہ دہلی میں ہیں۔

فرمایش کے ساتھ اخبار کا حوالہ ضرور دیں

تمدن

بنائے ابراہیم

از شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی ڈی (اول)

ہمارے محترم لندن ٹائمز لکھتے ہیں کہ اگر اب بھی ترکوں نے اٹلی سے صلح نہ کی تو (خاکم بدہن وناکش) اٹلی کے ہوائی جہاز کعبۃ اللہ اور روضۂ اطہر کو مسمار کر دیں گے کعبۃ اللہ کا مختصر جواب تو اس مضمون کے آخر میں ہے اور روضۂ اطہر کے متعلق افسوس کہ ہم اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے کہ تاج پر جانے کو ایسے دلخراش الفاظ پر توجہ نہ کریں

چار ہزار برس کے لگ بھگ ہوئے آئے کہ ابراہیمؑ نے جن کو یہود اور نصاریٰ اور مسلمان کل اہل کتاب یکساں طور پر پیغمبر برحق مانتے ہیں اپنی بیوی ہاجرہ اور فرزند اکبر اسمٰعیلؑ کو جو ہاجرہ کے بطن سے تھے سرزمین مکے میں لاکر بسایا اس وقت شہر کے کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا سنگلاخ پہاڑی زمین اجاڑ پڑی تھی وہیں باپ بیٹوں نے عبادت کے لیے چار دیواری سے کوٹھے کی طرح لمبوتری جگہ گھیر دی جو کعبہ کہلائی۔ کچھ کم چار ہزار برس کی بات ہے

اس سے سمجھ لو کہ ابراہیمؑ نے کس طرح کعبہ بنایا ہوگا چھت تک نہیں پاٹی مگر تھا کیا کہ ابراہیم جبکہ ہر طرف بت پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی شدومد کے ساتھ عقیدۂ توحید کے پھیلے رواج دینے والے تھے۔ تو کعبہ پہلی اور اکیلی مسجد تھی جو خدا واحد کی عبادت کے لئے بنائی گئی۔ کوئی عمارت اس ترقی کے زمانے میں بھی کیسی ہی مستحکم بنائی جائے آخر کار کبھی نہ کبھی بوسیدہ ہو کر ضرور تجدید یا مرمت کی محتاج ہوگی اور ایسا ہی دیکھا گیا ہے۔ ؎

لہا ملکٌ ینادی کل یوم لدوا للموت وابنوا للخراب

یہی حال ابراہیم کے بنائے ہوئے کعبہ کا ہوا کہ جب سے بنا چھ بار اس کی تجدید ہو چکی ہے مرمت اور تحسین تزئین کا تو کچھ شمار نہیں ثبات و قیام عبادت کے لحاظ سے غنیمت ہے کہ حجاز کے علاقے میں جہاں کعبہ ہے برسات نہیں ہوتی۔ یا ہوتی ہے تو بہت کم ورنہ خدا جانے اس عرصہ میں کتنی بار تجدید کرنی پڑتی برسات تو معمول سے نہیں ہوتی مگر پہاڑی نالوں کا سیلاب کبھی کبھی آجاتا تھا تین مرتبہ تو سیلابوں کی وجہ سے کعبے کی تجدید کرنی پڑی ہے دو بار آگ کے لگنے سے مسمار ہو گیا تھا از سر نو بنایا گیا۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہو جائے گا کہ کب کب کس کس ضرورت سے خانۂ کعبہ کی تجدید ہوئی اور کس نے کی۔ بیشک ہر جدید کے وقت اصل عمارت کی وضع میں حسب تقاضائے وقت تھوڑی بہت تبدیلی بھی ضرور ہوئی ہے۔ بنائے ابراہیمؑ کی چھت نہ تھی بعد کو چھت پاٹی گئی دیواریں اونچی کی گئیں۔ اندر آنے جانے کا ایک دروازہ تھا ایک کی جگہ نہ بنائے گئے ایک آنے ایک جانے کا پھر بعد کی تجدید میں بنا دو دروازہ مصلحت سمجھکر بند کر دیا گیا داخلی کا دروازہ سہولت کے لیے زمین دوز تھا بنظر مزید احتیاط چھوٹ

اونچی کی گئی کہ اب تک پہنچنے کے لیے زینہ لگانا پڑتا ہے رقم کے تھڑ جانے سے مجبوری عظیم کی قدر سے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ پھر ملائی گئی پھر نکال گئی۔

یہ سب کچھ ہوا مگر جگہ وہی ہے جو ابراہیمؑ نے اختیار کی تھی چونکہ کعبہ ابراہیم کا بنایا ہوا تھا وہی اسکی خدمت و روب بھی کرتے تھے اور وہی کعبے کے حقدار متولی تھے اور ان کے وقت میں خدمت و روب کے سوائے کعبہ کا اور کام ہی کیا تھا، خدا نے ابراہیمؑ کو اور ابراہیمؑ کے بنائے خانۂ خدا کو برکت دی تھی ابراہیم کے فرزند اسمٰعیل نے قبیلۂ جرہم میں اور اسمٰعیل کے بیٹے ثابت نے بنی خزاعہ میں شادیاں کیں اور یوں ابراہیم کی نسل بڑھتے بڑھتے بجائے خود ایک بڑا قبیلہ بن گئی ادھر خانۂ خدا کی برکت سے نسل اسمٰعیل کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل نے دین ابراہیمؑ کی پیروی اختیار کی اور خانۂ کعبہ ایک حساب سے تمام عرب کا معبد قرار پایا لوگ گروہ گروہ سال کے سال حج اور وقتاً فوقتاً عمرہ کرنے زیارت کعبہ کو آتے اور ابراہیم کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق خدائے واحد کی عبادت کر کے لوٹ جاتے عام مقبولیت کے ساتھ کعبہ کی حرمت یعنی متولیوں کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور ذمہ داریوں کے ساتھ ان کے اقتدارات و اختیارات ذمہ داریوں میں ذمہ داری زوار کعبہ اور وہ ہزاروں ہی ہوتے تھے اور برس کے بارہ مہینے انکا تانتا لگا رہتا تھا۔ پانی پلانا (سقایت) اور کھانا کھلانا (رفادت) مکہ ہمارے ہندوستان کے بڑوں شہروں جیسا ہوتا تو چٹکی بجاتے میں آسانی سے سقایت اور رفادت دونوں کا انتظام ہو سکتا تھا مگر مکہ کا حال یہ تھا کہ پانی کمیاب اور جو قدرے قلیل تھا بھی کھاری تو لوگ کیا کرتے کہ قسمت سے بارش ہو گئی تو مینہ کا پانی چمڑے کے موضوں میں جمع کر رکھتے تھے، یا پہاڑی چشموں سے ڈھو کر لاتے تھے اور چھوہارے یا کشمش اور منقی بھگو کر پینے کے قابل بنا لیتے

تعمیر کعبہ کا نقشہ

کعبہ کتنی دفعہ بنایا	کس نے بنایا	کس سنہ میں بنایا	کیوں بنایا	پہلی تعمیر میں کیا تجدید کی
سات دفعہ اول مرتبہ	حضرت ابراہیم نے	مسیح علیہ السلام سے تقریباً انیس سو برس پہلے	جبکہ طرف حضرت پرستی پھیل گئی تھی خدا کی واحد کی عبادت کے لیے مسجد بنائی	صرف چار دیواری بنائی تھی چھت نہ تھی زمین سے ملا ہوا بے کواڑ دروازہ تھا دیواریں زمین سے نو ہاتھ اونچی ایک طرف سے بیس ۲۰ اور ایک طرف سے بائیس ہاتھ کا عرض اور طول ایک طرف سے ۳۱- اور دوسری طرف سے ۳۲ ہاتھ کا
دوسری مرتبہ	بنی جرہم نے		پہاڑی نالہ کعبہ میں گر کر آیا کعبہ ڈھے گیا	کچھ تجدید نہیں کی پہلی ہی بنیاد و نہر اسی صورت کا بنا دیا اور اتنی ہی بلندی رکھی
تیسری مرتبہ	قبیلہ قریش نے	سنہ عیسوی سے پانچ سو برس پیشتر	ایک عظیم الشان سیلاب کے صدمہ سے کعبہ گر گیا پھٹ گیا۔	اس مرتبہ بھی کسی طرح کی تجدید نہیں ہوئی
چوتھی مرتبہ	قصی بن کلاب نے	ہمارے پیغمبر صاحب سے دو سو برس پہلے	متواتر سیلابوں سے جا بجا کو شکستہ ہو گیا	چھتوں کو پاٹ دیا اور حطیم کی طرف سے کچھ عرض کم کر دیا کیونکہ یہاں تک پہونچکر اس کے پاس کا سرمایہ تھک گیا تھا۔

کعبہ کتنی دفعہ بنا	کس نے بنایا	کس سنہ میں بنا	کیوں بنایا	پہلی تعمیر میں کیا تجدید کی
پانچویں مرتبہ	قریش نے	اس وقت ہمارے پیغمبر صاحب کی عمر ۳۵ برس کی تھی	ایک عورت خلاف کعبہ کو دھونی دے رہی تھی چنگاری اڑ کر غلاف پر جا پڑی اور اس کے بھڑکنے اٹھنی سے کعبہ جل گیا دیواریں گر پڑیں	دیواریں اٹھارہ ہاتھ بلند کر دیں چار ہاتھ ایک بالشت کی کرسی دی اور اس کرسی پر دروازہ کھڑا کیا کعبہ کے اندر چھ ستون دو صفوں میں کھڑے کیے حطیم کی طرف چھ ہاتھ ایک بالشت زمین چھوڑ دی اندر کے رخ زینہ چڑھایا۔
چھٹی مرتبہ	عبداللہ بن الزبیر نے	۶۵ھ میں	عبداللہ بن الزبیر نے جو پیغمبر صاحب کی پھوپھی بن عبدالمطلب اور زبیر بن العوام کے بیٹے تھے یزید بن معاویہ کی بیعت سے انکار کیا اور مدینہ سے مکہ چلے آئے اس پر یزید کے حکم سے مکہ پر فوج کشی ہوئی لوگوں کے پتھراؤ سے کعبہ میں آگ لگ گئی۔	حطیم کو کعبہ میں داخل کیا شرق و غرب میں آمد و رفت کے لیے دروازے زمین سے ملوا دیے رکھے دیواریں ۲۷ ہاتھ اونچی رکھے گئے چھ ستونوں کی جگہ صرف تین رکھے
ساتویں مرتبہ	حجاج بن یوسف ثقفی نے	۷۳ھ میں۔	عبداللہ بن الزبیر نے حطیم کو کعبہ میں شامل کر لیا تھا حجاج نے اس کو ناپسند کیا اور عبدالملک سے اجازت لے کر حطیم کو پھر کعبہ سے خارج کر دیا	غربی دروازہ بند کیا حطیم کو کعبہ سے خارج کر دیا دروازہ اتنا ہی اونچا رکھا جتنا پہلے تھا کعبہ کے اندر سیڑھی لگائی اور اس پر دو روشندان رکھے +

رفاوت سقایت سے بھی زیادہ مشکل تھی کہ اسکو چاہیئے صرف کثیر اس لیے کہ مکہ میں تو کچھ پیداوار ہوتی نہیں زمین بھی پیداوار کے قابل نہیں خود ابراہیمؑ جنھوں نے اس سرزمین کو آباد کرنا چاہا تھا فرماتے تھے ربنا إني أسكنت من ذريتي بواد غير ذي زرع عند بيتك المحرم۔ چاروناچار اناج باہر سے لانا پڑتا اب بھی ہمارے ہندوستان کے مقابلہ میں وہاں ہمیشہ قحط ہی رہتا ہے مکے میں سات سیر کا آٹا سمائی ہے اور ہمارے ہاں کمال اور اب تو بدقسمتی سے یہاں بھی متواتر کال ہی ہونے لگے ہیں برسات ناغہ ہوتی رہتی ہے نہروں اور کنوؤں سے بقدر کافی غلہ پیدا ہوتا ہے تو یورپ کو کھچا چلا جاتا ہے۔

جس سال عبداللہ (پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد) کی شادی ہوئی تو ملک عرب پر چاروں طرف آفت کی بھرمار تھی اور طرح طرح کے نشکر مصائب لوگوں پر ٹوٹ رہے تھے اگرچہ یہ سارا سال واقعات ہائلہ سے پُر اور مصائب و آفات کا دنگل بنا ہوا تھا لیکن ایک وہ واقعہ جس نے عرب کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا اور تمام ملک میں عام طور پر ہل چل ڈالدی یعنی یمن کے حاکم کا خانہ خدا پر خونخوار حملہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

یمن کا حاکم ابرہۃ الاشرم ایک نہایت سخت متعصب عیسائی تھا جس نے مذہبی تعصب کی وجہ سے خانہ کعبہ کی تخریب کا ارادہ کیا اس نے جب دیکھا کہ لوگ موسم حج میں نہایت ذوق شوق سے دور و دراز کا سفر طے کر کے جوق جوق خانہ کعبہ میں آتے اور طواف و زیارت سے آتش شوق کو بجھاتے ہیں تو اس کے مذہبی تعصب کی آگ اور بھڑک اٹھی اور خانہ کعبہ کی تعظیم اور انتہا سے زیادہ جاہ و جلال دیکھ کر آتش حسد پر لوٹنے لگا شہر صنعا میں ایک عظیم الشان گرجا بنایا اور زوار کعبہ کو

اسکی زیارت کی تکلیف دی لیکن جب لوگ اس گرجا کی زیارت کو نہ آئے تو ابرہہ غصہ میں بھلا اُٹھا اور ایک خونخوار لشکر کی سرکردگی میں خوفناک اور مہیب ہاتھیوں پر سوار ہو کر مکے کی طرف بڑھا مکے کے لگ بھگ پونچا تو قریش اور کنانہ اور خزاعہ اور ہذیل کے قبائل سب ملکر لڑنے کو تیار ہوئے لیکن جب انہوں نے ابرہہ کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں دیکھی تو اپنے اہل وعیال کو لے مکے کی اونچی اونچی پہاڑیوں پر جا چڑھے۔ عرب بیشک بہادر تھے بڑے بڑے معرکوں میں بے خوف کود پڑتے تھے خطرناک اور جان جوکھوں کے موقع میں اندھا دھند گھس جاتے تھے اور جان دے دینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی لیکن تو بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ ایسے زبردست اور ڈراؤنی شکل کے جانوروں کے مقابلہ میں سینہ بسینہ اور کتا بکتا ہو کر لڑیں ابرہہ نے رستے میں سے حمیر کو بطریق سفارت سردار قریش کیطرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ میں تم لوگوں سے لڑنے کے ارادے نہیں بلکہ کعبہ کے ڈھانے کے لیے آیا ہوں اگر تم لوگ میری مزاحمت کروگے اور جنگ کی طرف مائل ہوگے تو میرے پاس بہت سامان جنگ موجود ہے اس گفت وشنید میں دو روز گذر گئے اور قبائل قریش میں سے کسی کو ابرہہ سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی ابرہہ نے رستہ صاف دیکھا تو جھٹ شہر مکہ میں آدھمکا قبائل قریش پہلے ہی مکہ کی پہاڑیوں میں جا چھپے تھے تاہم کعبہ مقدس کی عمارت میں کچھ لوگ اس غرض سے جمع بھی تھے کہ لشکر مین کعبہ پر حملہ آور ہوگا تو ہم ایک خونریز جنگ کرکے اپنی جانیں کعبہ پر قربان کردیں گے ابرہہ کو معلوم ہوا تو اُس نے اُس روز کعبہ پر دھاوا کرنا مناسب نہ سمجھا اور آج کے حملہ کو کل کے لیے اُٹھا رکھا دوسرے دن کی صبح کو اپنی خونخوار فوج کو لیکر آگے بڑھا مگر قبل اسکے کہ دھاوے کا حکم دے اسکے خیال آیا کہ جو لوگ کعبہ میں موجود ہیں اُنہیں پیغام تو پونچا دیا جائے تاکہ غفلت میں مر کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اس نے لوگوں سے

دریافت کیا کہ کعبہ کے مجاوروں کا سردار کون ہے سب نے کہا عبدالمطلب ابرہہ نے عبدالمطلب کو بلایا اور تخلیہ میں گفتگو کی عبدالمطلب یہ کہتے ہوئے ابرہہ کی مجلس سے باہر نکل آئے کہ "جو اس گھر کا مالک ہے وہی اس گھر کا محافظ بھی ہے" ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے گھر کو مخالفوں کی زد سے بچالیگا اور اپنے گھر کے خادموں کو ذلیل و رسوا نہیں کریگا۔

الغرض ابرہہ لشکر کو لیکر آگے بڑھا اور جب کعبہ کی دیواریں نظر آنے لگیں تو یکبارگی دھاوا کرنیکا حکم دیا خدا کا کرنا جوں ہی گستاخ لشکر نے خانۂ خدا کی جانب قدم اٹھائے کہ مکے کی غربی سمت سے لشکر الٰہی نمودار ہوا یعنے بہت سے پرند چھوٹی چھوٹی کنکریاں پنجوں اور چونچوں میں لیئے فوج فوج آگئے اور لشکر مین پر کنکریاں برسانے لگے۔ جس پر کنکری پڑتی گولی کا اثر کرتی۔ تھوڑی دیر میں سارا لشکر خداوندی غضب میں مبتلا ہوکر غارت ہوگیا ظالم اور گستاخ ابرہہ اگرچہ زخموں سے چور ہوکر یمن کیطرف بھاگا لیکن اس کا مرغ روح عقاب موت کے چنگل سے بچ نہ سکا اور رستی ہی میں مرکر رہ گیا۔

ہم نہایت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے شہر کے مشہور فوٹو گرافر ایچ۔ ای۔ میرزا صاحب نے اپنی متبرک البمونیس (ارپین ویلوز) طرابلس فنڈ کے واسطے ایک خاص رعایت کی ہے۔

یہ البمیں دو قسم کی ہین جنمین بارہ بارہ فوٹو ۱۲/۱۰ سائز پر مکہ معظمہ۔ عرفات۔ مسجد خیف۔ جنت المعلیٰ خانہ کعبہ۔ دروازۂ عنبری۔ خیمہ جات ترکی۔ مسجد قبا۔ مدینہ منورہ۔ جنت البقیع۔ مقبرہ امیر حمزہؓ۔ روضۂ اطہر کے شامل ہیں۔ اور انگریزی خواں حضرات کے لیئے ہر فوٹو کے نیچے انگریزی حروف میں عمارت کا نام اور اسکی تعریف ہے دوسری البم جو اردو داں حضرات کے واسطے ہے اسمیں ہر مقدس عمارت کی مفصل تاریخ حاشیہ پر اور لوح عمارت کے اشعار درج ہیں ہر البم کی قیمت بارہ روپیہ ہے لیکن اب میرزا صاحب بجائے بارہ روپیہ کے نو روپیہ کو دیں گے۔ اور جس قدر اس لیو لیو کے ذریعہ سے بکری ہوگی اوسمیں سے ۲ فی روپیہ کے حساب سے طرابلس فنڈ میں چندہ دیں گے۔ امید ہے کہ ناظرین تمدن میرزا صاحب کی حوصلہ افزائی فرماکر طرابلس فنڈ کو تقویت دیں گے +

انقلاب روزگار

نکلا اُفق پر صبحدم وہ تاجدارِ خاوری
جس کی شعاعوں نے بہم برپا ہی جنگِ زرگری
رنگِ شفق ہی جلوہ گر یا شعلہ خراک پری
پُر خُوں ہی یا وقتِ سحر مینائی چرخِ اخضری
نظروں سے غائب ہوگئے روشن ستارے رات کے
دم بھر میں آخر کیا ہوئے سامان سارے رات کے

صُبح

گلزار ہی اُجڑا ہوا بزمِ طرب برہم ہوئی
شمعِ سحر سر تا بپا تصویرِ رنج و غم ہوئی
گلشن سے سوئے آسماں گرمِ سفر شبنم ہوئی
سنبل لبِ آب رواں مثلِ صفِ ماتم ہوئی
نکہت چمن میں چار سو کیسی پریشاں ہوگئی
ہر عندلیبِ خوش گلو گلشن میں نالاں ہوگئی

رخصت ہوا شب کا قمر نکلا ستمگر آفتاب
روشن گرِ دیوار و در ہے شعلہ پیکر آفتاب
بستر سے اُٹھی دھوپ ہے آیا ہی سر پر آفتاب
منزل یونہی کرتا ہے طی دنیا میں دن بھر آفتاب
دن رات ہیں شمس و قمر پامالِ جورِ آسماں
گردش میں ہیں شام و سحر پابندِ دورِ آسماں

دوپہر

مغرب کی جانب ہی رواں کشتیِ مہرِ آتشیں
ساقی نے پھینکا ہی کہاں اپنا یہ چھوٹا سا نگیں
فضلِ خزاں میں زرد ہی یا ایک برگ یاسمیں
مدفن ہی جس کے واسطے دم بھر میں مغرب کی زمیں
خورشید تاباں کوئی دم میں سرنگوں ہونیکو ہی
اقصائے مغرب میں پہونچکر اس کا خوں ہونیکو ہی

شام

خورشید عالم تاب پر آیا ہے کیا وقتِ زوال — دھندلی سی آتی ہی نظر گردونہ تصویرِ ملال
صیدِ اجل اک شیرِ نر صحرا میں ہی آشفتہ حال — گرد اس کے لپٹے ہیں مگر گرگ و سگِ روشغال
آنکھوں سے جاری اشک خوں اور دل سے اٹھتا ہی دھواں
آنے لگی کانوں میں آوازِ درائے کارواں

نیرنگیٔ باغِ جہاں ہر دم ہے تازہ انقلاب — بچپن کا عالم اب کہاں گذرا وہ ہنگام شباب
عہدِ جوانی ہو چکا پیری میں ہی رنگِ خضاب — غفلت کی نیند میں تا کجا ہشیار ہو اے مست خواب
ٹوٹا ہوا ہے بادباں بادِ مخالف تیز ہے
کشتی ہے گویا نیمجاں اور بحر طوفاں خیز ہے

یارب جہاں میں آسماں جب تک ہی گردش پذیر — خورشید تاباں تا ہے باقی سرِ چرخِ اثیر
روشن زمانے میں رہی تا طلعتِ ماہ منیر — آنکھوں کا اپنی قوم کی تارا ہو ہر برنا و پیر
چمکے ہمیشہ اوج پر اقبالمندی کا نشاں
روشن رہے علم و ہنر کے نور سے ہندوستاں

سنجیدہ

راحت زمانی ؎ مولوی سیّد احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہی مصنف سے از سرِ نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہی بیگماتی زبان قلعہ معلی کے محاورے۔ قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیئے چھوڑنیکو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم ؎ یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی ہی اور عصمت الخیسی نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہی قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہی قیمت ۸ر

منیجر عصمت دہلی سے طلب کیجئے۔

مدینہ کی ایک مغنیہ (غزۃ المیلاء)

مَدِیْنَۃُ الرَّسُوْلِ۔ جسے آستانۂ نبوت ہونے کا افتخار حاصل ہے، اور جو جناب رسول اللہ صلعم کے روضۂ اطہر، اور مسجد نبویؐ کے قیام سے تا قیامت مسلمانوں کا کعبۂ آرزو رہے گا، اس کی مقدس آبادی ایک مستحکم شہر پناہ سے محصور ہے، جس کے نیچے نیچے ہر چہار جانب ایک عمیق خندق چلی گئی ہے، جیسے سرکار مدینہ خالق کون ومکان کے لاڈلے اور محبوب تھے، ویسے ہی مدینہ کے سواد کو کائنات (گرد و نواح کے عمدہ مناظر) اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے قدرت کا مقرر کردہ پہرہ دے رہے ہیں، اور بزبان حال ہزارہا وصادر کو آگاہ کرتے رہتے ہیں، "ادب سے جاؤ کہ سرکار سو رہے ہیں"۔

مدینہ کی بستی میں بسنے والے قبائل ٹھیٹھ بدو یا اہل بادیہ نہیں، بلکہ ایسے شائستہ اور سنجیدہ لوگ ہیں جن کے سینہ و دل صدق و صفا سے معمور ہیں۔ روشن ضمیر بھی ہیں، اور صاحب سلیقہ، متمدن اور ہنرمند بھی، اُن کی صاف ستھری منزلیں اگر اُن کی نفاست پسندی پر داد خواہ ہیں، تو اُن کی قدرتی سادگی ہزار آرائشی تکلفات، کو مات کرتی ہے،

سیدھی سادی طرز تعمیر کے مکانات، کشادہ صحن، اور خانہ باغ، خانۂ باغ، میں آذوقہ بہم پہونچانے والے درخت، ہم خرمہ و ہم ثواب کے مصداق،

یہ صدر اسلام کی بہار تھی، مگر اس زمانہ سے تقریباً نصف صدی ہم آگے نکل آئے ہیں، یزید ابن معاویہ صاحب تخت و تاج ہے، بلاد اسلامی میں

شورش اور طوائف الملوکی نے ہر طرف قدم جما دیے ہیں، گو بہتوں نے اس تازہ شورش سے مدینہ ہی کو خیرباد کہا ہے، مگر مدینہ کی مردم خیزی سے وہاں کی خاص و عام دلچسپیوں پر اس بھگدڑ کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا؟

ان دنوں مدینہ میں ایک مغنیہ عورت رہا کرتی تھی، عزۃ المیلاء جس کا نام تھا، اور فن موسیقی میں مہارت نے جس کے نام اور صفت سے حوالی اور مضافات کے لوگوں کے کان بھی پورے طور پر آشنا کر دیے تھے، یہ انصاریوں کی منہ بولی بہن تھی۔ اور سرزمین حجاز کی عورتوں میں سب سے پہلی مغنیہ عورت تھی +

عرب میں افسانۂ کہن کی یاد تازہ کرنے کی جو رسم قدیم الایام سے جاری تھی اس میں عزہ اپنی جادو بیانی اور طلاقت کے زور سے ایسے مجیدین میں شمار ہوتی تھی جس کا نام مثالاً پیش ہوتا تھا،

اس کی شہرت میں مقبولیت کا جو عنصر شریک تھا، اس کے ذمہ دار عزہ کے وہ اوصاف تھے جنھوں نے اسے ایک حد تک محسود خلائق بنا رکھا تھا،۔

اس میں حسن اور خلق کی خوبی کے ساتھ ظرافت، خوش مزاجی اور کریم النفسی کا جوہر بھی تھا، اور ایسا کہ مدینہ سے کوئی وارد و صادر ایسا نہ گزرتا جسے عزہ سے ملنے، یا اسے دیکھنے، اور اس کا سامعہ نواز نغمہ سننے کی آرزو نہ ہو،

اگرچہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب فن موسیقی کا شمار عربوں کے یہاں فنون لطیفہ میں تھا، اور نہ اس فن کو عرب اس قابل سمجھتے تھے کہ انجاب و اشراف اسے سیکھیں، باوجود اس کے عزہ اس فن سے لگاؤ رکھتی تھی

اُسی چشمِ وقار سے دیکھی جاتی تھی، جس کے مستحق اُس کے اوصاف اور اُس کی وجاہت اُسے ٹھہراتے تھے۔ بلکہ کچھ اُس سے زیادہ ہی، اُسکی مجلس میں لوگ اس ادب اور خاموشی سے آبیٹھتے کہ گویا اُن کے سر پر طیور اپنے پروں کا سایہ کیے ہوتے ہیں،

شہر مدینہ میں عزہ کا مکان سمتِ شمال میں آبادی کے سرے پر اُس شاہی راستہ سے متصل واقع تھا، جو شام کو جاتا ہے۔ مکان کے ہر چہار جانب باغ تھا، جس میں انواع و اقسام کے میوہ دار اشجار تھے۔ باغ کے گرد قدِ آدم احاطہ کی دیوار تھی، اور ایک جانب اندر آمد و رفت کا دروازہ تھا، باغ کے بعض گوشوں میں دو رویہ سایہ دار درختوں کے جھک کر ملنے سے ایک قبہ نما جہت (عریش) رسمی بن گئی تھی جہاں اونٹوں کا مزین تھا،

مکانیت یہ تھی، کہ بیچ میں ایک بڑا صوفہ (ہال) جس کے دو طرف طعام گردش اور اُس کے بعد تھوڑا صحن چھوٹ کر پردہ کی بلند دیوار جس میں ہر دست دو دو کھڑکیاں اس کے نیچے تہ خانہ،

بڑا صوفہ عزہ کی نشست گاہ تھا، جس میں چاروں کھونٹ فرش ہوا، اور صدر میں رومی مسند جس پر بڑا تکیہ لگا رہتا تھا،

صحن میں سایہ دار درختوں کے پاس پاس ہونے سے ایک عمدہ فرزی کا لطف آتا تھا،

ربیع الثانی ۷۳ھ کی آخری تاریخیں ہیں، جو اگست ۶۹۲ء سے مطابق ہیں، اس زمانہ میں دن کو یہاں اس شدت کی گرمی پڑتی ہے،

کہ "الامان والحفیظ"۔ ایک روز کا مذکور ہے جب آفتاب قریب بہ غروب آیا، دھوپ ڈھلنے سے گرمی کی شدت و تمازت گئی۔ تو عزہ بھی نہا دھو اور جوڑا بدل کر تہ خانہ سے برآمد ہوئی، عطر دان منگایا، اور افراط سے عطر کپڑوں میں ملا، کہ ملبوس اور بدن عطر میں بس گیا،

اس وقت اُس کے بدن پر زرد رنگ کی لمنی چادر تھی، اور چہرہ پر کالی نقاب، جو کچہ تو گرمی کے خیال، نیز مکان میں کسی مرد ذات کے نہ ہونے سے چہرہ سے ہٹا دی گئی تھی،

عزہ مختلف شغلوں میں رہی کہ اتنے میں عشار (رات کا کھانا) کا وقت آگیا، تب اُس نے پیش خدمت جاریہ کو حکم دیا، کہ مائدہ (دسترخوان) صوفہ کی چاندنی (چھت) پر زیر سما لیجا کر چُنے، جس کی تعمیل مُنہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ہونے لگی،

اس موقعہ پر یہ بتانا غالباً بے موقعہ نہ ہوگا کہ عزہ کا رکھ رکھاؤ بہر طور جیسے امیرانہ تھا، ویسا ہی اُس کا دسترخوان بھی وسیع اور پُر تکلف ہوتا تھا، اُس کے مطبخ کی مثال سخی کی ہانڈی سے ملائی جاتی تھی، جس کے واقعی اور بلا مبالغہ ہونے میں جاننے والوں کا اصرار تھا، امرأ دل کے لوازم طبعی کے طور پر اُسکی طبیعت عیش کی حد درجہ خوگر ہوگئی تھی اور اس تن آسانی نے روز بروز اُس کی فربہی کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے کر اُس کے اپنے بوجہہ کو جان کا دوبر کر رکھا تھا، بہر حال کچہ اپنی خودداری کے بناہ، اور زیادہ ان مجبوریوں (اور ہمارے نزدیک تو سراسر مجبوریوں کی وجہ سے) عزہ کہیں آتی جاتی نہ تھی، بلکہ اُس کے کمال فن کے شایق خود اُس کے گھر دُور دُور سے آتے تھے، اور اقسام اقسام کے تحائف

اُس کے لیے، کیسا از قسم مال وزر، اور کیا بیش قیمت اشیاء مثل لباس و زیورات کے اسے نذرانہ کے طور بھیجتے تھے، اس بنا پر عزہ امیر نہیں، امیروں کی امیر تھی، جو چاندی سی سفید سونے سے زرد، جس کا جوڑ جوڑ جواہرات سے مرصع، اور جس کے بال بال گچ موتی تھے

گھر میں ساز و سامان اور اثاثہ کا شمار کیا جائے تو اچھا خاصہ قیمتی اشیاء کا اسٹور (توشہ خانہ) ترتیب دیا سکتا تھا، ایسا نہیں کہ جس میں ایشیائی لفاظی اور تراش کی رونق ہوتی ہے، ہوتا ہوا تا کچھ بھی نہیں، بلکہ نادر اور نفیس اشیاء کا ایسا مجموعہ کہ الفاظ میں جس سے جان پڑے، اور تراشندہ دیکھ پائے تو روح تازہ ہو جائے،

مگر با ایں ہمہ عزہ کی مزاجی سادگی، لباس اور آرائش کے ہر طریق سے ظاہر ہوتی تھی اُس کی قدرتی زنانہ شان جیسے اُس کے جسم کو لباس کے تکلفات سے بری رکھتے ہیں اُس کے مذاق کی پختگی کا ثبوت پیش کرتی، ویسی ہی اُس کے لعل و جواہر سے معرّے گردن و بازو شوق آرائش کی اُس کے استغنا پر گواہ تھے۔ اور ان جملہ شہادتوں کو اُس کے اُن ثقہ اور صوفیانہ رنگ کے گوشواروں سے قوت پہونچتی تھی، جو اُس کی کان کی لوؤں کے نیچے چراغ کی لو کی طرح اُجالا پھیلا کر بزبان حال کہتے تھے، کہ دعوی حسن و برآت کی تصدیق جس کا جی چاہے آئے اور کر جائے،

عزہ کے حسن اخلاق، مروت اور سب سے بڑھکر اُس کی اصابت رائے نے اس درجہ اشراف مدینہ کے حسن اعتماد کو اُس کے ساتھ بڑھا دیا تھا کہ اکثر اُن کے خانگی قضایا میں وہ شخص ثالث، اور معاملات عروسی

وغیرہ میں تمام قابل دریافت امور کیلئے وہ معتمد واسطہ ٹھہرائی جاتی تھی،
خلاصہ یہ کہ آن کی آن میں جہت پرسش کرکے کھانا چن دیا گیا،
اور باندی نے آکر اس کی اطلاع کی۔ عزہ اوپر جانے کے لیے اٹھی کہ کسی نو وارد کی آواز قدم نے اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیا، اور اس نو وارد کے سامنے ہوتے ہی عزہ نے (اہلاً وسہلاً ومرحبًا) خوش آمدید کہہ کر ادا سے لیا،
نئی آنے والی ایک کواری نوعمر خاتون تھی جس کے نازک جسم کو حریر کی سرخ چادر چھپائے ہوئے تھی، اس نازنین کا نام سمیہ ہے اور یہ مدینہ کے ایک معتمد شخص کی لڑکی ہے،
تجربہ کار مگر پاک طینت عزہ کو ناتجربہ کار مگر بھولی لڑکی سمیہ سے قلبی مؤانست اور دلی رابطہ ہے، اگرچہ اس کی ہر ہر ادا میں شرم اور عفیفانہ غیرت جھلکتی ہے مگر وہ کھل کے جو کچھ بولتی ہے، وہ عزہ سے، اور جن گہڑیوں میں وہ خوش رہتی ہے، وہ وہی گہڑیاں ہیں جو اس کی عزہ کے یہاں گذرتی ہیں،
اس دستور کے مطابق اس وقت بھی اسے شگفتہ ہونا تھا، مگر نہیں! اس کے پھول سے مکھڑے میں دلربائی کی تازہ کشش اس وقت موجود نہیں، جس سے اس کے آئینہ ضمیر پہ دلی کاوشوں کا غبار پایا جاتا ہے، سمیہ اور وہی سمیہ جو اس وقت ہماری مہماں نواز عزہ کے بازو آکر بیٹھ گئی ہے۔ اس کے حسن خداداد میں کوئی ایسی انیلی آن ہم نہیں پاتے، جسے خواہ مخواہ کو بھی فتنہ بپا ٹھہرادیں، اور قیامت کے بھونچال سے بڑھانے میں بڑھ جائیں۔ مگر ہاں اس نہوتے پر

جو کچھ ہے، وہ اُس کی نرگسی آنکھ، اور اُس میں محبت کا رس، عشق کی تڑپ، اُس کی خوشنما بتیسی جس سے آب میں موتیوں کی لڑی شرمائے۔ اور تبسم ناز کرتے ہوئے جو ہر عقل کے سامنہ برقِ بلا کا کام کرے، اُس کا قدِ دلجو رعنائی و دلبری کے نخل کی باثمر شاخ،

غرض اُس غیر معمولی بیباک اور خلوص کے اظہار کے بعد جس سے ہر آنے والے کی مدارات نہیں کیجاتی، دل کا بھید لانے والی عزہ کی متجسس نظریں سمیہ کی پُرشکن پیشانی سے اُس کے دل میں اُتریں، اور پنکھڑی سے نازک دل پر غبارِ غم چھایا ہوا دیکھ کر عزہ محبت کے لب و لہجہ میں بولی،

عزہ:- "سمیہ! تمھارا آنا میرے سر اور آنکھوں پر، مگر اس آنے پر ہرگز یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ تم غریب عزہ کے لیے سرورِ قلب اور قرۃ العین بنکر آئیں، بلکہ تم خود غمگین آئیں، اور اپنے ساتھ تم نے اپنے دل سے چاہنے والی عزہ کو بھی غمزدہ کردیا، خدا کے لیے کچھ کہو تو سہی! دشمنوں کو کیا فکر لاحق ہے۔ اور خلافِ معمولی چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟"

اچھا اُوپر آؤ، میں خیال کرتی ہوں کہ شرب کے سرسبز و شاداب مناظر کی قدرتی دلفریبیاں تمھارے مغموم دل، اور فکرمند دماغ کو بہت جلد اپنی طرف مائل کرکے انہیں مسرور اور تازہ کردیں گے"

یہ کہتے ہوئے اُس نے سمیہ کا نازک حنائی ہاتھ پکڑا، اور کوٹھے پر لیچلی، سیڑھی سے آگے آگے عزہ اور اُس کے پیچھے سمیہ کوٹھے پر پہونچیں، جہاں پُرتکلف دسترخوان چنا ہوا طیار تھا۔ دونوں جاکر فرش پر بیٹھ گئیں، مگر عزہ کو اب یہ فکر لگ گیا تھا کہ سمیہ کے خیالات کدھر پھیرے جائیں

کہ اس کی پریشانی رفع ہو، چنانچہ اُس نے سلسلۂ سخن کا آغاز یوں کیا،

عزہ۔ "پیاری سمیّہ! تم نے کبھی ادھر بھی غور کیا، دیکھو! قصیل مدینہ کے اطراف باغات، چشمہ، حوض اور جھاڑیوں کا، دور تک کیسا شاداب تختہ نظر آرہا ہے جس کے اختتام پر ایک ٹیلہ اور اُس سے پرے ایک پہاڑ دکھائی دے رہا ہے، یہی کوہ اُحد ہے، جہاں عزوہ اُحد ابتدائے اسلام کا ایک مشہور دردانگیز معرکہ بنی آخر الزماں صلعم اور سرداران قریش کے درمیان پیش آچکا ہے اور جس میں تقریباً ستر جلیل القدر صحابہ رسول اللہ کام آئے خود حضور رسالت مآب صلعم کے دندان مبارک شہید ہوئے، اور آپ کے عم حضرت حمزہؓ نے اسی معرکہ میں شہادت پائی۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کی اُس وقت تک کوئی بڑی جماعت نہیں پیدا ہوئی تھی، اور نہ اُنہیں کوئی قوت حاصل تھی، کہ اتنے بڑے امتحان میں کسے گئے مسلمانوں کے لیے بڑا سخت مرحلہ تھا، جس کے واقعات سنکر اب بھی جگر دونیم ہوتا ہے، سمیّہ! (جو ان واقعات کو بغور سُن رہی تھی) اور کیا آپ اس واقعہ کے وقت موجود تھیں؟"

عزہ۔ "اس واقعہ کو تقریباً ستر (۷۰) سال ہوئے، میں بھلا اُس وقت کہاں! میری پیدائش اُس سے بہت بعد کی ہے،"

عزہ۔ (قریب کے مناظر کیطرف متوجہ ہوکر) دیکھو! جس رُخ پر آفتاب غروب ہوا ہے، اُس کا منظر کیسا عجیب و غریب ہے، سامنے والی تالاب کی ساکن سطح آب گویا چاندی کی ایک چمکیلی چادر ہے جو ادھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی ہے، جس پر تاروں کے عکس سے زرکار بوٹیاں

کڑہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں گویا زمین اپنے طاقے کا ایک سرا کھول کر (تاروں بھری رات میں) آسمان کے کہنہ تھان کے مقابلہ میں رکھ کر صاحب نظروں کو دکھا رہی ہے، ادھر پانی میں درختوں کے سایہ گویا جنوں کے پیکر ہیں، جو اپنی ڈراؤنی شکلیں دکھا دکھا کر فضاء بسیط کے رہنے والوں کو مرعوب کر رہے ہیں،

شفق اور اس کے انعکاس سے لحظہ بہ لحظہ بدلتا ہوا نقشہ دیکھنے میں سمیہ کچھ ایسی محبور ہوئی کہ اندھیری چھا گئی اور یہ سارا رنگ بگڑ بگڑ کر کالے پانی میں محض تاروں کی کچھ جھلملاہٹ اور درختوں کے کوہ پیکر عکس کے بجائے اب وہاں کالے خطوط رہ گئے اور وہ بھی بغور دیکھنے سے نظر آتے تھے۔

اتنے میں عزہ دسترخوان کی طرف پلٹی، اور سمیہ سے شرکت طعام کو کہا۔ جس پر سمیہ بھی پھری، اور دونوں نے کھانا شروع کیا،

خانگی

راحت زمانی مولوی سید احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو تریم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی زبان فسانہ مبتلا کے محاورے۔ قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

لڑکیوں کی انشا حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالرشید صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت اک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت تمدن سے آنہ آنے (۸ر) صیغہ عصمت تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

تشنہ لب بچے

آہ پھر یاد آئے پھر دریا ہو آنکھوں سے رواں وہ زمین کربلا کے چھوٹے چھوٹے میہماں
تین دن تک جو رہے وقف بلائے آسماں
تشنگی میں پھول سے رخسار کملائے ہوئے جستجوئے آب میں پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
خشک لب ہیں چہرے پژمردہ ہیں سوکھی ہو زباں
ڈبڈبائے آنکھوں میں آنسو لبوں پر سرد آہ ہر کی جانب مگر حسرت بھری ہو اک نگاہ
اشک عارض پر ادھر جاری ادھر پانی رواں
لے رہی ہو نہر ہو میں اور یہ ہیں تشنہ کام ننھے ننھے ہاتھوں میں خالی لئے پھرتے ہیں جام
آنکھوں میں حلقے پڑے ہیں ہلیں ہو سوز نہاں
کچھ نفس باقی ہیں خیمہ میں بپا کہرام ہے معجزہ ہے زندگانی تو برائے نام ہے
تین دن کی پیاس میں جیتی ہیں ایسے بیزباں!!!
مائیں بہلاتی ہیں انکو اور وہ ہیں بیقرار لا کے دیں پانی کہاں سے کچھ نہیں ہو اختیار
یک رہی ہیں یاس سے بچونکو اپنے بیبیاں
تپ رہی ہو دھوپ کی شدت سے جنگل کی زمیں اور اسی جنگل میں ہیں وہ تشنہ لب بچے کہیں
ایک خیمہ ہے فقط اور وہ بھی سوچ سے لپاں
لو کہ بچے ہیں مگر دل زندگانی سے ہی سیر سامنے میدان اور میدان میں لاشوں کے ڈھیر
جنکو کوئی روئیوالا ہے نہ کوئی نوحہ خواں
جب نظر اٹھی نئی لاش ایک آئی ہو نظر جب سنی آواز کوئی قتل کی پائی خبر
ہر طرف ساماں غم کا ہر طرف غم کا سماں

کوئی بھی باقی نہیں ہے اب خدا کی فوج میں خون تازہ جوش زن ہے ہر ہوا کی موج میں
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے چمن زار جناں

آہ اے بچّہ اگذار کس طرح یہ تین دن یہ مصائب یہ بلائیں یہ تحمل اور یہ سن
کون یوں ثابت قدم رہتا ہے وقت امتحاں

کیوں نہ ہو کس نسل سے ہو ای اسیران محن خون ہی کس کا رگ و پے میں تمھارے جوش زن
نور کس کا ہے تمھارے پاک چہروں سے عیاں

حق ادا ایسا کیا عالم میں کس نے صبر کا سنگ بنیادی رکھا دنیا میں جس نے صبر کا
کون بیکس ہے کشتۂ عبرت امام انس و جاں

تو نے دیکھا ای زمین کربلا کیونکر یہ حال میں تو مر جاتا وہیں گر دیکھتا دم بھر یہ حال
شامیوں کے وہ مظالم الحفیظ و الاماں

میرزا محمد ہادی۔ عزیز۔ لکھنوی

یاسمین۔ پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب ایم اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب نتیجہ خیز ناول اور تمدن الجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہوگئی ہے یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلباء کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان اور بنگالہ کی ایک مشہور نازنین ہے اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفۂ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونیکی کافی ضمانت ہے قیمت عہ

منیجر عصمت و تمدن دہلی

کائنات پر ایک نظر

انسانی زندگی بھی ایک عجیب و غریب معمہ ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ نیچر کس وضع خاص پر اس کے چلانے کا ارادہ رکھتا ہے اگر غور کیا جائے تو تنوع طبائع کے تماشے اور گوناگوں امزاج بشری کے نتیجے اسبات کا یقین دلاتے ہیں کہ نیچر خود بے انتہا شوخ طبع ہے جس طرح ایک کی دوسرے سے صورت شکل نہیں ملتی اور حسب اصول علمائے سمدرک ہاتھ کی لکیروں تک میں اختلاف ہے اسی طرح فطرت انسانی میں بے انتہا تفاوت ہے اور اوسپر تماشہ یہ کہ نیچر سب طبیعتوں سے کام ایک کرانا چاہتا ہے۔ عالم ایجاد بہ اعتبار تمدن ایک چیز ہے جس میں تغیر طبائع کو کم دخل ہے۔ ہمدردی محبت، الفت، صلہ رحم، سچائی، دیانت یہ وہ سب باتیں ہیں جو تمدن کی جان ہیں اور تاوقتیکہ ہمارا مقصد ترقی یہ نہ قرار پائے، ہم عالم ایجاد میں گویا ایک عضو بیکار ہیں۔ مذہب اور تمدن ایک چیز ہیں اس لیے مذہب وہی تعلیم دیتا ہے جو مقتضائے تمدن ہے۔ مذہب ہم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو اصول فطرت کے مطابق ہیں قطع نظر اس امر سے کہ طبائع مختلف ہیں یا نہیں۔ ایک تنگ سینہ سے یہ امید رکھنا کہ وہ حوصلہ مند، وسیع خیال، اور جسارت آزما ثابت ہو یا ایک لانبے سر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عاقل اور سمجھدار ہو یا ایک چھوٹی آنکھ سے فراخ دلی سخاوت عالی ظرفی چاہنا بہت وقت طلب بات معلوم ہوتی ہے مگر پھر مذہب کیوں سب کو ایک سبق دے رہا ہے اور سب سے

ایک بات کا امیدوار ہے؟ پھر اگر کوئی پابند مذہب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو ایک واعظ اُسکو یوں تسکین دیتا ہے کہ دنیا دار الجزا نہیں، یہاں تو ہمیشہ نیک کام کرنے والوں کو ایذا رہتی ہے اور بُرے اعمال والے خوش رہتے ہیں۔ کیا اس کی علت یہ نہیں ہے کہ آدمی جس فطرت پر مجبور ہوا ہے اُس کے خلاف چلایا جاتا ہے اور اسی سبب سے وہ کسی طرف کا نہیں رہتا؟ اگر دنیا دار یا بالفاظ دیگر گناہگار اس اصول کے مطابق آخرت میں مستوجب سزا ہوں گے اور ہم اپنے اعمال نیک کی وجہ سے یہاں کے مصائب اور تکالیف کا عوض وہاں حور و قصور شراب و کباب کی شکل میں پاویں گے تو فرق کیا ہوا یہی نا کہ جو باتیں اُن لوگوں نے یہاں کی ہیں ہم وہاں کریں گے اُنہوں نے یہاں گناہ کیا ہم وہاں کریں گے؟ یہ خیال اور یقین کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ جو لوگ بد ہیں وہ دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں اور یہ کہ انصاف اس دنیا میں نہیں ہو سکتا و مینیات جس کو ہم نے مذہب قرار دیا ہے اگر یہ سبق دیتی ہے تو بالکل نامکمل ہے اور صرف ظاہری نمود میں ترقی کی ہے —

اِس قسم کے شبہات اکثر پیدا ہوتے ہیں لیکن قانون مکافات پر غور کرنے سے جس سے اکثر فلاسفر اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں، معلوم ہو جاوے گا کہ اُس کے اصول اس کے سامنہ منطبق نہیں ہو سکتے۔ آمرسن لکھتا ہے کہ قدرت کے ہر حصّہ میں اضداد جمع ہیں تاریکی و ظلمت میں، حرارت و برودت میں، مد و جزر میں، نباتات و حیوانات کے تنفس میں کہ ہوا کو اندر باہر کھینچتے ہیں، جسم حیوانی میں، خون کی مقدار و کمیت میں، دل کے قبض و بسط میں، مایعات کے گھٹاؤ بڑھاؤ میں، حرکت دوری کے مائل المرکز اور دافع المرکز کششوں میں، قوت کہربائی اور ربط کیمیائی میں، ایک جگہہ کو

خالی کرنا دوسری جگہ کو بھرنا ہے۔ غرضکہ اس دوئی نے کارخانہ عالم کی تضعیف کر رکھی ہے اس طرح پر کہ ہر شے نصف ہے اور اپنے دوسرے نصف کے طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے۔ تاکہ ملک ایک ہو جائے جیسے روح و مادہ، ذہنی و خارجی، طاق و جفت، اوپر نیچے، حرکت و سکون، ہاں اور نہیں جب کہ کل عالم میں دوئی ہے تو یہ دوئی اس کے ہر جزو میں ہے کل نظام کے اشیا ہر ذرہ میں پیدا ہے عورت مرد میں، پانی کے اتار چڑھاؤ میں، شب و روز کے تغیر و تبدل میں۔ عناصر عالم میں جو رد عمل ہوتا رہتا ہے وہ تمام خفیف سی خفیف مخلوق کے مختصر حدود میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ قوا جزء ثقیل کے اصول میں دیکھئے جو کچھ قوت ہم حاصل کرتے ہیں۔ اوسیقدر وقت ضائع کرتے ہیں، زمین جہاں غلہ نہیں پیدا ہوتا بخاروں اور مہلک جانوروں سے پاک ہوتی ہے۔ سرد ملک میں جہاں اور عیب ہیں یہ ایک وصف بھی ہے کہ جسم کو قوی کرتا ہے۔ غرضکہ دوئی انسان کی فطرت میں بھی اوسیطرح پنہاں ہے۔ ہر لذت کے ساتھ کلفت، ہر مصیبت کے ساتھ راحت لازمی نتیجہ اصول مکافات کا ہے اور اس لیئے اگر ہم بنا علیہ یہاں کے عیش و تنعم سے لطف اٹھانے والوں کے لیئے تکلیف آخرت اور یہاں کے غبار اور مصائب اٹھانے والوں کے لیئے راحت عقبےٰ عوض قرار دیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ مگر اس صورت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوتے ہیں جس سے اصول مکافات میں بہت بڑا رخنہ پڑ جائے گا۔ اس لیئے معاد کو چھوڑ کر اور اس عالم کو حیطہ اصول مکافات سے خارج کر کے دیکھتے ہیں تو بیشک ہم کو اصول مکافات کا قانون بہت زبردست قانون ماننا پڑے گا اور ہر فرد میں اس کا

جلوہ نظر آئے گا۔ ہر وہ امیر جو اپنے محلوں میں تمام اسباب آرایش ولذت
کے ساتھہ بیفکری سے زندگی بسر کر رہا ہے ایک جھوپڑے میں رہنے والے
آدمی کے لیے بیشک قابل رشک ہے لیکن اوسی کے ساتھہ اصول مکافات
کی عینک لگاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اوس دولت مند کو ان تمام اسباب
معیشت کے عوض میں کیا کیا چیزیں اور کس قدر دینی پڑی ہیں اور طمانیت
قلب اور اوصاف حمیدہ جو باعتبار تمدن ہر شخص میں ہونا چاہیئے اُس کے
پاس سے گم ہیں کسی غریب نے اگر ظاہری اسباب معیشت کو کھویا ہے
تو اُس کے پاس اُس کے عوض میں سلامتی ضمیر طمانیت دل اور سیکڑوں سا
ملا ہے۔ اب ہم انہیں اصول کی رُو سے طبائع مختلفہ کو دیکھیں تو معلوم
ہوجائیگا کہ فی الحقیقت ہر شخص معاون تمدن ہے۔ ایک متنفس اگر باعتبار اپنے
جبلت کے جرأت آزما دلیر اور شجاع نہیں ہے اور اس صورت سے
وہ تمدن عالم کے ایک حصّہ میں عضو بیکار ہے تو اُسی کے ساتھہ اب یہ بھی
سمجھہ لیں کہ اُس میں جبر و تعدی، ظلم و زیادتی کی بھی قوت نہیں ہے اور
اور اس لیے اگر ایک جری آدمی تمدن کے ایک حصّہ کو قوت دیتا ہے تو
دوسرا دوسری حیثیت سے معاون ہے۔ اگر ایک عقلمند آدمی دوسروں
کے لئے نفع رساں ہوسکتا ہے تو اُسی کے ساتھہ بیوقوف آدمی میں دوسرے
کو نقصان پہونچانے کا مادّہ نہیں ہے اگر ایک اپنی سخاوت اور عالی
ظرفی سے عالم امکان میں ایک جزو ضروری بنا ہوا ہے تو دوسرا
اپنی منتظمانہ اصول سے کچھہ کم مویدنہیں ہے۔ اس لیے کوئی شخص نظر بہ
فطرت وجبلت مسئول نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اُس سے جو کام ایسی اضطراری
حالت میں ہوئے ہیں اُن پر وہ قادر نہ تھا اور ایسے کام سے باز پرس

ہر قسم اخلاقیات عقل و انصاف ہے۔ مگر وہ چیز جس نے آدمی کو ذمہ دار بنایا ہے
حصول امکانات سے جدا ہے اور اسی پر اعتبار کرکے لے دے ہوگی۔ آدمی
کسی خاص پر مجبول ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ مجبور محض ہے
اور اس کے پاس ارادۂ نفسی بھی نہیں ہے۔ انسان کی فطرت چاہے کچھ
ہو مگر اس کے ساتھ اس کو قوت ارادی بر رہبری ضمیر عطا کی گئی ہے جس کا منشا
عمر بھر یہی ہے کہ وہ قوائے نفسانی پر جو جبلاً انسانی وضع میں ودیعت ہیں غالب
رہے اور یہ ظاہر کہ اس حالت میں جبکہ ضمیر ایک کسبی چیز ہے۔ کسبی اس معنے
کر کہ اس کا حصول مدارج اور منتجات کے اعتبار سے وہبی نہیں ہے بلکہ
سعی اور کوشش سے پایا جاتا ہے اور اسی سبب سے اگر کوئی شخص باعتبار
کمزوری ضمیر نظام تمدن میں خلل انداز ہے تو یہ اس کا ذاتی قصور ہے جس کو
فطرت اور جبلت انسانی سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ کہنا کہ ضمیر ہمیشہ نظام
کائنات کے موافق ہو کر چلتا ہے خلاف واقعہ ہے کیونکہ ایسے
افراد انسان موجود ہیں جو یا تو بالکل ضمیر نہیں رکھتے یا اگر رکھتے بھی ہیں تو پورے
معنے ضمیر کے اس پر صادق نہیں آتے اور اس لیے ایسے لوگ جنھوں
نے کسب ضمیر نہیں کیا یا کسب ضمیر کے بعد اسکو بالکل محو کر دیا ہے اخلاقی
مجرم ہیں خواہ وہ فطرتاً کسی امر خاص کے اوپر مجبول ہوئے ہوں اور
یہیں سے **تقدیر** کے مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تقدیر کی نسبت
اعتقاد رکھنے والے تین جدا اعتقاد رکھنے والے گروہ ہیں۔ ایک
انسان کو مختار کل سمجھتا ہے اور دوسرا مجبور محض تیسرا گروہ وہ ہے
جو **بین الاختیار والجبر** ہے۔ اختیار کا عقیدہ سب سے پہلے جس شخص کے
ذہن میں آیا یا بالفاظ دیگر باعتبار وسعت تمدن اس مسئلہ پر غور کرنے کی

ضرورت ہوئی وہ معبد جہنی تھا جو اعتزال کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جبر کا عقیدہ اُن لوگوں کا ہوا جنھوں نے بلاسوچے سمجھے اختلاف معتزلہ پر کمر باندھ لی اور تعصب نے اُن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے۔ فلسفۂ اسلام نے بہت چھان بین اور غور و تعمق کے بعد ایک بین بین حالت اختیار کی۔ غور کرنے سے خود معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سا مسلک موافق فطرت ہے یا کوئی بھی نہیں۔ ان تینوں گروہ میں سے اُس فرقہ کو تو خارج کیجئے جو بالکل اپنی کو مجبور محض سمجھتے ہیں کیونکہ سب کے رکیک اور قوانین قدرت کے منافی یہی مسلک ہے اور اس لیے اب صرف دو باقی فرقے رہ گئے ہیں جو فطرت عام کے پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔ انسان کو مختار ماننا گو ذات باری تعالیٰ کی شان تنزیہ کی رعایت پر مبنی ہے مگر اوسی کے ساتھ تھوڑی سی انانیت اور تکبر کی بو آتی ہے جو اگر بڑھ گئی اور یقینی بڑھے گی تو انتظام کائنات میں تخریب کا باعث ہوگی اور روابط تمدن میں کمزوری پیدا ہو جائیگی جو مقتضائے خیر کے خلاف ہے۔ اس لیے علمائے اسلام نے جو حالت بین بین رکھی ہے وہ نہایت ہی پاکیزہ اور مستحکم اصول پر قایم ہے اگر گروہ معتزلہ مسئلہ اختیار میں زیادہ غلو سے کام نہ لیں تو اُن کو خود بعض اوقات ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہے جو ہمارے ارادوں میں، ہمارے قوانین تمدن کے اصول، ہمارے سمجھے ہوئے عالم اسباب پر حکمراں ہے، اور وہ آناً فاناً بدل سکتی ہے۔ مگر تاہم معتزلہ ہمارے بھائی ہیں اور ہمارے معتقدات کے ایک جزو کے موید ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں ان ابا القاسم الانصاری سئل عن تکدر المعتزلۃ فقال لا لانھم

نزّہوہ فسل عن اھل السنۃ فقال لا لانھم عظموہ یعنے ایک بار امام ابوالقاسم انصاری سے سوال کیا گیا کہ کیا معتزلہ کافر ہیں آپنے کہا نہیں کیونکہ انہوں نے ذات باری کی تنزیہ کی ہے پھر اہل سنتہ کی نسبت سوال ہوا تو آپنے جواب دیا کہ وہ بھی نہیں کیونکہ انہوں نے اُس کی عظمت وجلال کا خیال رکھا ہے۔ اور پھر آگے چل کے امام فخرالدین نے فرقہ اہل سنت کو ترجیح دی ہے

تعلیم الٰہی یہ کہتی ہے کہ ہر ایک قسمت کا حال لوح محفوظ میں مرتسم ہو چکا ہے اور اُس کے خلاف ہرگز نہیں ہو سکتا ہر فرد انسان، حیوانات نباتات، جمادات، غرضکہ ذرہ ذرہ کا حال منقش ہو گیا ہے اور اُسی تحریر کے مطابق ظہور میں آئیگا جف القلم بما ھو کائن لہ مگر اُس کے معنے یہ نہیں ہیں جیسا کہ عوام سمجھے ہوئے ہیں یا بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ قلم سے مراد نہ یہ دنیاوی قلم ہے جس سے ہم لکھا کرتے ہیں اور نہ لوح سے مراد وہ تختی ہے جس پر بچے مشق کیا کرتے ہیں۔ بلکہ قلم اور لوح سے مُراد قوانین قدرت ہیں جن کا دوسرا نام علم الٰہی ہے۔ جو علم الٰہی ہے وہی قانونِ قدرت ہے اور جو قانون قدرت ہے وہی تقدیر ہے علت ومعلول سبب ومسبب لہ میں جو رشتہ قایم کر دیا گیا ہے وہی مقدر ہے جس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں اور یہی مطلب ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ کا اور یہی منشاء ہے لفظ محفوظ کا جو لوح کے ساتھ منضم ہے۔ زہر کا کام مار ڈالنا اور آگ کا جلا دینا ہے پس گویا یہ ایک تقدیر ہو گئی جب کوئی زہر کھائے گا مر جائیگا، آگ میں کودے گا جل جائے گا۔ اسی طرح ہر ذرہ کی تکوین میں اصول فطرت طاری اور ساری ہیں جن پر نظام عالم کا مدار ہے۔ چوری

کرکے سزا پانے والا کسی کو قتل کرکے پھانسی پر لٹکنے والا مجرم اپنے مصائب کا الزام خدا پر نہیں رکھ سکتا کہ اوس نے ایسا کیا، میری تقدیر میں یہی لکھا تھا، نہیں بلکہ اُس نے خود قوانین قدرت سے اس بات کی استدعا کی کہ مجھکو قید کرادو، مجھکو پھانسی پر لٹکا دو اگر وہ خود علت اور سبب نہ ہوتا اور اپنے ضمیر سے کام لیتا تو ہرگز اس آفت میں مبتلا نہ ہوتا۔ کوئی قوم نہیں بگڑتی تا وقتیکہ وہ خود اپنے تئیں نہ خراب کرے" کیا مطلب رکھتا ہے، یہی کہ جبتک نظام عالم اور ترتیب تمدن کے اصول میں انحراف نہ کیا جائیگا ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیگی لیکن جب اُس کا لحاظ اور خیال ترک کر دیا جائیگا تو وہی تقدیر پھر اپنا کام شروع کردے گی جس پر ہم الزام رکھا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

اللہ بدکاروں ہی کو گمراہ کرتا ہے جو نقض عہد کرتے ہیں اور احکام الٰہی کے خلاف کرکے باعث فساد ہوتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ اور کیا کھلے ہوئے الفاظ اختیار انسانی کی نسبت ہوسکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ خاندان عباسیہ بنو امیہ صفویہ مغلیہ کی شان و شوکت کے زوال کا باعث کیا ہوا جبتک اُنہوں نے اُصول کائنات کے نظام پر لحاظ رکھا اور اپنی تمدنی حالت درست رکھی کوئی زوال و انحطاط نہیں شروع ہوا، لیکن جب اُنہوں نے

خلاف ورزی قانون قدرت کرنا شروع کیا تو لگے تباہ و برباد ہونے جو لازمی نتیجہ تھا اُن کے افعال کا۔ ان سب قدرتی جکڑ بندیوں کے ساتھ یہ نہیں کہ ہم بالکل اندھوں کی طرح چھوڑ دیے گئے ہیں بلکہ ہم کو ایک رہنما ایک چراغ روشن ہی دیا گیا ہے جس کو عقل یا ضمیر کہتے ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے کام لیں نیک و بد میں تمیز کر سکیں ورنہ اگر آدمی باعتبار اپنی جبلت کے مجبور محض ہوتا تو اُس کے اعمال سے باز پرس خلاف دانشمندی اور انصاف تھا مگر نیچر جانتا ہے کہ اگر آدمی انسانیت سے کام لے تو اپنی جبلت اور جذبات خلقی کو بدل سکتا ہے۔ شیر اور چیتا وغیرہ درندے ہیں جن کی جبلت میں درندگی اور خونخواری اور بے رحمی ہے لیکن جب وہ پال لیے جاتے اور اچھی طرح پل جاتے ہیں تو ویسے ہی حلیم اور بے ضرر ہو جاتے ہیں جیسے اور معمولی جانور اُن کی درندگی اُن کی ایذا دہی جو فطرت میں تھی بالکل بدل گئی اور وہ صرف اس سبب سے کہ وہ شروع سے جبلت کے خلاف چلنے کے عادی بنائے گئے۔

قسطیمون بہت بڑا حکیم تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ محض ترکیب اعضا اور ساخت جسمانی سے اخلاقی حالت بخوبی پہچان سکتا ہے بقراط کے شاگردوں نے اُس کا امتحان لینا چاہا اور ایک تصویر اپنے استاد (بقراط) کی ہو بہو کھینچکر قسطیمون کے پاس لے گئے قسطیمون نے دیکھ کر کہا کہ جس شخص کی یہ تصویر ہے وہ بڑا زانی ہے۔ تلامذۂ بقراط ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ تصویر بقراط کی ہے اور آپ ایسا کہتے ہیں اُس نے کہا کہ کسی کی ہو مگر میرا علم و تجربہ یہی کہتا ہے جب

بقراط کے پاس واپس گئے اُس سے سارا قصہ بیان کیا اُس نے کہا بیشک میں زنا پر بہت حریص ہوں مگر میں نے اپنے قوائے عقلی سے اُس کو دبا رکھا ہے اور کبھی اپنی جبلی نقص کو نمایاں نہیں ہونے دیتا۔ علاوہ اس کے اور مشاہدات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان کسب ضمیر کرے اور پھر اُس ضمیر سے کام لے تو بہت کچھ کام اپنی فطرت کے خلاف کر سکتا ہے اور اسی اصول پر نظر رکھ کر معاد کا انتظام رکھا گیا ہے ورنہ ہرگز انسان سے کوئی سوال نہ ہوتا اور نہ کوئی بازپرس کی گنجایش تھی غرضکہ انسان کسی طرح اپنے کو اس الزام سے نہیں بری کر سکتا کہ اُسنے اپنی عقل اور ضمیر سے کیوں کام نہیں لیا جب کہ اُس کے لئے ایک کھلا ہوا راستہ ترقی تمدن اور کسب معیشت کا موجود ہے۔ جاہل ہیں وہ لوگ جو ہر بات میں تقدیر پر الزام رکھتے ہیں۔ کاہل ہیں وہ جو محض تقدیر کے بھروسہ پر کوئی کام نہیں کرنا چاہتے یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے کوئی کام نہیں کیا تو تقدیر ہمیشہ اُن کو ذلیل و خوار رکھے گی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہماری تدابیر کارگر نہیں ہوتیں اور باوجود سعی و کوشش ہمیں ناکامیابی ہوتی ہے لیکن اسکو دیکھ کے بجائے اس کے کہ ہم تدابیر کرنا چھوڑ دیں اور بالکل تقدیر پر بیٹھ رہیں، اللہ کی قوت و برتری اور حکمت بالغہ کا قائل ہونا چاہیئے اور یہیں سے انسانی مجبوریت ظاہر ہوتی ہے بقول شخصے اللہ یعرف بفسخ العزائم۔ سچ ہے ایک قوت برتر ہمارے اوپر اور ہے جو ہمارے ارادوں، ہمارے خیالوں پر حکمراں ہے کہ جدھر چاہے پھیرے وھذا ما قدرتی بربی

(نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری)

نامۂ یار

ہے جگر کو تجھ سے تسکیں — مرے دل کو چین سے تجھ سے
تجھے دل میں اپنے رکھوں — کہ جگر میں اپنے رکھوں

ہے اگرچہ دیکھنے میں — تو ذرا سا ایک پرزہ
نہیں پر ترے برابر — کوئی چیز زیر گردوں

تو ہی درد کی دوا ہے — تو ہی زخم دل کا مرہم
تو ہی روح کی ہے قوت — تو سکون قلب محزوں

ہوئی تجھ سے آنکھ روشن — ہے دماغ تجھ سے فرحاں
ہوں نثار میں بتا تو — کوئی سحر ہے کہ افسوں

یہ ہے آنکھوں کا تقاضا — کہ گڑی رہیں تجھی پر
تجھے کس طرح میں پھاڑوں — تجھے کس طرح میں پھینکوں

تو شریک دشت غربت — تو ہی غمگسار غربت
بھلا کس طرح ہے ممکن — کہ تجھے جدا میں کردوں

مجھے کب یہ ہے گوارا — کوئی غیر تجھکو دیکھے
وہ نہ تیری بو بھی پائیں — تجھے ایسی جا چھپاؤں

ہے کشش غضب کی تجھمیں — ہے غضب کی تجھ میں قوت
لیا صبر بھی سکوں بھی — کیا دم میں مجکو مجنوں

یہی اب مری دعا ہے — یہی میری آرزو ہے
لکھا جس نے ہے یہ نامہ — اُسے اک نظر تو دیکھوں

شیخ غلام محمد

کلیوپیٹرا

(دہلی میں ایک ملاقات کی یاد)

کلیوپیٹرا مصر قدیم کی وہ پرناز و محتشم ملکہ جس رات بہت مغلوب ملال ہوتی، تو اپنا دل بہلانے کے لیے، اپنے مشتاق اور عاشق قیدیوں میں سے ایک کو بلاکر، اپنے تمام لطفوں کے ساتھ (جو عورت ہی دے سکتی ہے، اور وہ اس طرح کہ احمق مرد پر ظاہر کرے کہ وہ اسے چاہتی ہے) اُسے مست و مدہوش کرتی، اور پھر، گویا وہ یہ جانتی تھی کہ ایسی مزے دار رات کے بعد اُس قیدی کو اس سے جدا ہوکر زندہ رہنا کیسا مشکل ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے یہ کہکر "میری خاطر، خوشی خوشی پیو گے نا؟" زہر کا پیالہ پلا دیتی،

آ، میں بھی تیرا قیدی ہوجاؤں، اے دلبر! تجھے بھڑک دار فٹنوں میں، موٹر کاروں میں ناز و انداز سے بیٹھے دیکھ کر تیری بیگانہ نظروں کی ایک شعاع جو اتفاقاً مجھ پر پڑ جاتی ہے مجھے غرق حرارت کر دیتی ہے۔ میری رُوح کی بے تابانہ انجذاب میں، ایک اسیرانہ توکل ہے تو میرے لیے اتنی دور ہے، اتنی اونچی ہے کہ کلیوپیٹرا کی طرح دور ہے اونچی ہے۔ اتنی اونچی ہے کہ میری امیدیں بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتیں؛ تجھ تک ان کی رسائی نہیں،

اس چکور کی مانند جو چاند کے نور اور چمک پر عاشق ہوکر اس تک پہونچنے کے لیے اپنے بے طاقت بازو پھڑپھڑا کے زمین پر

گر پڑتی ہے، میری نظریں بھی، اس اشتیاق میں اُٹھتی ہیں کہ تیری ایک نظر سے مین گو وہ بیگانہ ہی ہو، ایک مسکراہٹ کو دیکھیں گو وہ کسی دوسرے کے لیے ہی ہونٹوں پر آئی ہو، تری نظر کے ایک تار نور سے گرم ہوں گو وہ گریزاں ہی ہو، وہ مجھ تک جاتی ہیں اور صرف ان بالوں میں جو مصر کی ناز و انداز بھری ملکہ کی تاج کی یاد دلاتے ہیں پھنس کے رہ جاتی ہیں وہ قیدی، اس سر کے ساتھ ایک جگہ رات گذارنے کے لیئے جس پر وہ تاج رکھا جاتا تھا اپنی جانیں دے دیتے تھے۔

آ تو بھی میری کلیو پیٹرا ہے جس تکیہ پر یہ بال پریشاں ہوتے ہیں وہاں مجھے بھی سجدہ کرنے دے۔ اور مجھے اپنے قیدیوں میں لے لے

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
جسکی شانے پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

یلدرم

ہز ہائنس آغا خاں

کی تصویر جو اس مہینہ کے رسالہ کی زینت کو بڑھا رہی ہے اُمید ہے کہ ناظرین تمدن کی نہایت دلچسپی کا باعث ہوگی، ہم اپنے محترم مولوی محمد عزیز میرزا صاحب سے ہز ہائی نس کے متعلق ایک مفصل مضمون لکھوانا چاہتے تھے مگر مولانائے مرحوم کی موت نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی اور افسوس ہے کہ آج ہم اس تصویر کو بلا مضمون شائع کرتے ہیں ؛

مذہب و سائنس

نہ پوچھو تم کہ مذہب کی ہے پابندی کی حاجت کیا؟ — مسلماں ہو کے اس کے پوچھنے ہی کی ضرورت کیا؟
جو بندے ہو تو ناحق دخل دیتے ہو خدائی میں — خدا کو مان کر فرمان میں اُسکے یہ حجت کیا؟
پڑھو تم فلسفہ سائنس لیکن رہ کے لامذہب — ہے مشکل آدمی بننا پھر ایسی قابلیت کیا؟
نہیں بچ سکتے بے مذہب کے شر نفس و شیطاں سے — بھلا اخلاق کی قانون سے ہوگی حفاظت کیا؟
مطابق کس قدر قانون فطرت سے ہے یہ مذہب — بتاتی ہے تمہیں اسلام کی دیکھو شریعت کیا؟
نہ روحانیت اس میں ہے نہ چوپایوں سی آزادی — بھلا انسان ہو کر اور ملتی ہم کو نعمت کیا؟
مضر ہیں جتنی چیزیں جسم کے یا روح کے حق میں — حرام آئی ہیں مذہب میں تو بیجا ہے یہ حرمت کیا؟

کہو گے تم کہ قیدیں ایک پر ہیں ایک مذہب میں — شریعت تو ہوئی پھر دوسری ہے یہ طریقت کیا؟
سمجھنے کا طریقہ سہل سا یوں ہے اگر سمجھو — کہ ہر ظاہر کو باطن سے نہیں ہوتی ہے نسبت کیا؟
تصوف اصطلاحی نام ہے اصلاح باطن کا — نہوں صوفی تو پھر اصلاح باطن کی ہے صورت کیا؟
حدیث انما الاعمال سے یہ صاف ظاہر ہے — عمل کوئی ہو دیکھی جائیگی ہے اس میں نیت کیا؟
حقیقت کو سمجھ لو حال و قیل میں آ کے — یہاں ملا کی ہے قال اقول کی حقیقت کیا؟
جہاں کھل جائینگے غفلت کے پردے چشم خود بیں سے — تو آنکھیں ہونگی دیکھو گے کہ ہے کثرت میں وحدت کیا؟

شفق از خود پرستی جلوۂ عرفاں کجا بینی
بُت پندار بشکن کے ز خود بینی خدا بینی

شفق عماد پوری

مردوں اور عورتوں کی اخلاقی حالت

طبیعت انسانی کا خاصہ یہ ایک مشہور مقولہ اور مقبولہ امر ہے، کہ انسان کی طبیعت خوش آمد پسند واقع ہوئی ہے؛ اچھے سے اچھا، فہمیدہ سے فہمیدہ، اور عقلمند سے عقلمند، آدمی بھی، جس وقت اس سے اس کی تعریف کیجاتی ہے، خواہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیز ہی کیوں نہو، ضرور ہی محظوظ اور مسرور ہوجاتا ہے، لیکن جہاں یہ مسرت و انبساط ہے وہاں یہ بھی بات ہے، کہ جس وقت اس سے اس کی برائیوں کا اظہار کیا جاتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی خفیف اور اس کے مقابلہ میں بالکل ہی سچ اور ناقابل اشتباہ کیوں نہو مگر وہ اس کی ناخوشی اور رنجیدگی کا باعث ہوتا ہے؛ روزمرہ کے تجربہ اور رات دن کے مشاہدہ نے یہ امر اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہونچا دیا ہے، کہ اچھی بات کو سنکر خوش اور بری بات کے سننے سے رنجیدہ ہوجانا طبیعت انسانی کا ایک مسلّمہ خاصہ ہے؛ اسی لیئے دانشمند اور ذی فہم ناصح جب کسی شخص کو نصیحت کرتا ہے، تو نہایت پاکیزہ، نہایت پسندیدہ الفاظ ایک خوش آیند اور خوشگوار لہجہ میں استعمال کرتا، اور اس کی سچی بھلائی۔ اور بھی خوبی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ سامع کی طبیعت اس نصیحت کا اچھا اور نہایت اچھا اثر، اور وہی اثر جو ناصح کا مفہوم اصلی اور مقصود حقیقی ہوتا ہے، بڑی عجلت، بڑی سرعت، اور بڑی سہولت کے ساتھ قبول کرلیتی ہے؛ اور اگر نامناسب الفاظ اور ناگوار طرز بیان کو ذریعہ

اصلاح قرار دیا جاتا ہے، تو اُس کا نتیجہ مخالفت اور برافروختگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے؛ اسی قسم کے غیر مفید نتائج آجکل اُس بحث کے متعلق ظہور میں آرہے ہیں، جو مردوں اور عورتوں کے بارہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ متعدد رسالوں میں معتد بہ حصّہ لے رہی ہے؛

نامناسب الفاظ کا استعمال اور اُس کا نتیجہ

جو مضمون مردوں کے خلاف لکھا جاتا ہے اس میں مردوں کو جابر، ظالم، اور بیرحم جیسے سخت الفاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے، اور ایک ناقابل برداشت طریقہ پر کوشش کیجاتی ہے، کہ اُن کو ایسا ہی ثابت بھی کیا جائے، اسی طرح جو مضمون عورتوں کی مخالفت میں شائع ہوتا ہے، اُس میں عورتوں کو مکار، بیوفا۔ اور ناقص العقل کہا جاتا ہے، اور نہ صرف کہا جاتا ہے، بلکہ اُس کے ثابت کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کیجاتی ہے، جس سے طبیعتوں میں اشتعال پیدا ہو کر ایک فریق دوسرے کی مخالفت پر آمادہ اور اُسکو تر کی بہ تر کی جواب دینے پر کمربستہ ہو جاتا ہے، اور نصیحت کا مفہوم اصلی اور منشاء حقیقی بالکل مفقود ہو جاتا ہے، یہ کیوں ہوتا ہے؟

صرف اس لیے کہ نصیحت کا پیرایہ اور اصلاح کا طریقہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جو فطرتی طور پر ہر طبیعت کو اسی نتیجہ پر پہونچاتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بد نیلو لے زیر گردوں گر کوئی میری سنے ہے یہ گیہوں کی صدا جیسی کہی ویسی سنے

مردوں کو جابر، ظالم، اور بیرحم، عورتوں کو مکار، بیوفا۔ اور ناقص العقل، جیسے سخت، اور کریہ الفاظ سے مخاطب کرنا، پھر اُن باتوں کے ثابت کرنیکی

سعی اور فضول سعی کرنا، کامیاب ہونا تو کیا معنی، اور ان دونوں میں مخالفت کا پیدا کرنا ہے؟

طرز تحریر اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہمارے ذی علم ریفارمر قوم کی اصلاح کے متعلق مضامین نہ لکھیں، نہیں، لکھیں، اور ضرور لکھیں لکھیں اور زور کے ساتھ لکھیں، مگر وہی پاکیزہ اور شستہ، پیارے پیارے الفاظ ہوں، جو اپنا بہترین اور عمدہ ترین اثر کئے بغیر نہ رہیں؛ اور وہی دلکش، دل آویز اور دل کو لبھا لینے والا طرز تحریر ہو، جو ایک نظر پڑتے ہی پڑھنے والے کے دلکو اپنی برقی اور مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچ لے۔

الزامات کی تحقیق الفاظ اور طرز تحریر کی موزونیت سے گذر کر، اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ الزامات جو مردوں اور عورتوں پر عاید کئے جاتے ہیں کیا فی الحقیقت وہ صحیح طور پر اون سے متعلق ہوتے ہیں؟ یا صرف ایک نتیجہ اشتعال ہے؟ جو ایک فریق کو دوسرے کی نسبت الزامی جواب دینے پر مجبور کرتا ہے؟

چونکہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ اور رات دن کا مشاہدہ، نیز آئے دن کے پیش آنے والے واقعات بظاہر ہمکو یقین دلا رہے ہیں، کہ مرد اپنی عورتوں کے ساتھ طرح طرح کی سختی اور جبر و تعدی عمل میں لاتے رہتے ہیں، اور عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ قسم قسم کی بے وفائی اور مکاری کا برتاؤ کرتی رہتی ہیں، اس لیے ہم بادی النظر میں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں، کہ فی الواقع ہر دو فریق کی نسبت یہ الزامات صحیح معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن کیا صرف اسی قدر تحقیق ایک کامل تحقیق کہی جا سکتی ہے؟ کیا ہمکو اسی قدر تحقیق پر اکتفا کر لینا چاہیئے؟ نہیں ہرگز

نہیں، سرسری اور بادی النظری تحقیق پر رائے قائم کر لینا سخت غلطی ہوگی، بلکہ ہمکو ان الزامات کے اصلی اور حقیقی اسباب پر غایر اور عمیق نظر ڈالنی چاہیئے، اور ایسی چھان بین کرنی چاہیئے، جس سے واقعیت کا انکشاف پورے طور پر ہو جائے؛ قدرت نے عورت اور مرد کو ایک سی شکل و صورت، ایک سا ڈیل ڈول، ایک سے قوائے ظاہری و باطنی، عطا فرمائے ہیں، بجز ایک خاص فرق تذکیر و تانیث کے اور کوئی مابہ الامتیاز تفاوت نہیں پایا جاتا؛ اس لیئے ہم باعتبار تعدّد اعضاء کے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے سکتے، لیکن تعدّد کے بعد جب ہم اُن کے اعضاء ظاہری و باطنی کی قدر و قوت پر غور کرتے ہیں، تو ہم کو ایک بیّن فرق نظر آجاتا ہے، اگرچہ ہم اُس کو قدرت کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، نہ ہم اُس کو عورت کی فطرت قرار دے سکتے ہیں مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ عورت کی دماغی حالت نہایت تاریک اور اُس کی قوت عقلیہ، بحالت موجودہ نہایت کمزور پائی جاتی ہے؛ اس مسئلہ میں اگرچہ حکمائے اقوال بہت کچھ مختلف ہیں اور فلاسفر بھی باہم بہت بڑا اختلاف رکھتے ہیں، کسی کا قول ہے، کہ "علم فزیالوجی کی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا دل۔ دماغ اور گردے وغیرہ بمقابلہ مرد کے قدرتاً کمزور واقع ہوئے ہیں، اور کسی کا مسلک اس کے برعکس ہے؛ لیکن ہمکو ان مختلف خیالات سے کوئی بحث نہیں ہماری رائے میں اس وقت ان متضاد خیالات کو بابہ البحث بنانا، موضوع زیر بحث کے لیے ایک غیر ضروری امر ہے، ہم ان خیالات سے

علیحدہ ہوکر ایک تیسری بات دکھانی چاہتے ہیں، جو عورت کے دماغ کی تاریکی اور اس کی کمزوری عقل کا ایک خاص سبب ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، کہ عقل ایک بڑھنے اور گھٹنے والی چیز ہے، جس کا مدار اس کوشش پر ہے کہ جو اس کے متعلق کیجائے، اور جس کا بہترین ثبوت ہر انسان کی سوانح عمری ہوسکتی ہے، تجربہ نے اس امر کو پورے طور پر ثابت کردیا ہے، کہ علم انسان کی عقل کی ترقی اور افزونی کا سب سے اعلیٰ اور مفید ذریعہ ہے، اور یہی انسان کے دماغ کو روشن بنادیتا ہے، یقیناً یہ امر اس قدر ناقابل اشتباہ ہے، جس میں کسی شخص کو شک اور شبہ کی گنجائش نہیں مل سکتی، اور یہ انسان کے وہ حالات ہیں جن کو ہر شخص روز روشن کیطرح اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں؛ پھر جس وقت ہم مرد و عورت کی اکتسابی حالت، اور علمی لیاقت پر غور کرتے ہیں، تو ہمکو مرد اس لازوال دولت سے مالامال نظر آتا ہے، اور عورت علم کے نام سے بھی لاعلم معلوم ہوتی ہے، گویا اس کو مرد سے وہ نسبت بھی نہیں ہے جو ایک کو ایک ہزار سے ہوتی ہے، بس معلوم ہوا کہ یہی اصل سبب ہے، اس کے دماغ کی تاریکی اور عقل کی کمزوری کا، ورنہ عورت کا دماغ خواہ کیسا ہی محدود پیمانہ پر تیار ہوا ہوتا، پھر بھی اس قدرتی باغ میں وہ پھول ضرور ہی کھلتے، جن کی نمود قدرت نے اپنے دست قدرت سے لگادی تھی، مگر وہ کب کھلتے جب کہ اس کی آبیاری علم کے پانی سے کی جاتی، ہر چیز جب تک اپنے قدرتی مرکز پر قائم رہتی ہے اس وقت تک اس سے، اس منشاء حقیقی کی صحیح طور پر تکمیل ہوتی رہتی ہے، جو واضع کا اس کے وضع کرنیسے

لیکن ہمارا غلط استعمال اُس اصل مقصود کو غلط نتیجہ پر پہونچا دیتا ہے، علم صرف مرد ہی کے خانۂ دماغ کا روشن چراغ نہیں ہے، بلکہ عورت کے دماغ کی تاریکی کو بھی کافور کر دینے کے لیے شمع کافوری ثابت ہوا ہے مردوں نے اُس روشنی سے صرف اپنے ہی دماغ کو منور کرنا پسند کیا، اور عورتوں کے لیے اُس کو غیر مفید تصور کیا، یہی غلط فہمی سب خرابیوں کی جڑ قائم ہوگئی، جس کی مختلف شاخیں، مختلف اطراف میں، مختلف اشکال سے پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ بحالت موجودہ عورتوں کی ناقص العقلی مکاری اور بیوفائی کی مثالیں، عورتوں ہی کے افعال میں زیادہ تر ملتی ہیں، جس کے جواب میں مردوں کی جانب سے بدرجہ مجبوری یا بمنشاء اسداد جبر و سختی عمل میں آتی ہے، اور اس لیے مردوں پر وہ الزامات جو اون پر لگائے جا رہے ہیں، ایک حد تک صادق نہیں آتے، لیکن ساتھ ہی اسکے ہم عورتوں کو بھی بالکل بے قصور پاتے ہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی جہالت کے اصلی اور حقیقی باعث یہی مرد ہیں، خود عالم بنے اُن کو جاہل رکھا، خود مقتضا دصورتیں اختیار کیں، خود جہالت کو اپنا انیس، جلیس اور رفیق زندگی بنایا، اور خود ہی اب یہ شکایت ہے، کہ اُس سے غیر مفید نتائج کیوں پیدا ہوئے؟

تمثیل | یہ بالکل ایک ایسی مثال ہے، کہ ایک شخص اپنی عورت کو ایک ایسی کوٹھری میں بند کر دے جس میں نہ روشن دان ہو، نہ روشنی کے آنے کا کوئی اور راستہ ہو، بلکہ اندھیرا گھپ ہو، بقول شخصے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا ہو، اور جس میں رکھی ہوئی چیزیں کبھی اُس عورت نے دیکھی بھی نہ ہوں، پھر وہ شخص اس صورت سے اُس کو کوٹھری کی

چیزوں میں سے کسی چیز کے ڈھونڈھنے اور تلاش کرنے کو کہے، اور وہ عورت تعمیل حکم میں، اُس چیز کی جستجو کوٹھری کے چاروں کونوں میں کرتی پھرے کسی چیز میں اُس کا ہاتھ لگے اور کسی میں پیر، اور کسی چیز پر وہ خود ہی اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑے، اور اس اندھا دھند حرکت سے مختلف چیزیں ٹوٹ پھوٹ جائیں، پھر وہ شخص اُس عورت سے اُن چیزوں کے ٹوٹ جانے کی باتہ باز پُرس کرے، خشمگیں ہو، اور سخت سُست کہے، مگر اپنے کئے پر نادم نہو، تو وہ کون شخص ہے؟ جو ایسے شخص کی ایسی حرکت کو، دانائی، اور عاقلانہ کارروائی پر محمول کرے گا، وہی جو خود اس نادانی میں مبتلا ہے،

اعتراض | اس امر کے ثابت ہو جانے پر کہ عورتیں فطرتی طور پر مکار، ناقص العقل، اور بیوفا واقع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ یہ ایک دوسری ہی چیز کے اثرات ہیں، جو عورتوں کی فطرت میں داخل کیئے جاتے ہیں، مردوں پر پھر وہی اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے، جس میں سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے، کہ مردوں نے عورتوں کو جہالت میں پھنسا اور علم سے بے بہرہ رکھا، یہ مردوں کی ایک ایسی ظالمانہ کارروائی ہے جس کے بدترین الزام سے وہ کبھی رستگاری حاصل نہیں کر سکتے، اور اُسی ظلم کا نتیجہ ہے کہ آج عورتوں کے اخلاق پر مختلف رنگ کے وہ بدنما دھبے پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ مکار، ناقص العقل اور بے وفا قرار دیجاتی ہیں، اس لیے مردوں کی نسبت جو کچھ الزامات لگائے جاتے ہیں وہ سب اپنی جگہ پر صحیح معلوم ہوتے ہیں مگر نہیں یہ اعتراض بھی اپنی جگہہ صحت کے ساتھہ قائم نہیں رہ سکتا،

ایمائے غلط فہمی | کیونکہ اس پردہ میں ایک ایسی غلط فہمی مخفی ہے جس کا انکشاف اصل واقعہ کو ظاہر کر دے گا اور اُس وقت وہ اعتراض خود بخود اُٹھ جائے گا، اور ثابت ہو جائے گا، کہ فی الواقع مرد بھی اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں، اور ہرگز اُن الزامات کے مستحق نہیں جو اُنکی نسبت کہے جاتے ہیں؛

عورت اور مرد میں جو فطری اور ازلی ربط الفت اور سلسلہ موانست ہے، اُس سے کون واقف نہیں، وہ زرین اصولِ فطرت، یعنی وہ باہمی محبت، جس نے ابتدائے آفرینش سے دونوں کو ایک روح دو جسد ایک جان دو قالب بنایا کون نہیں جانتا؛

عورت اور مرد کا باہمی اتحاد | وہ سب سے پہلا اور اکیلا انسان، جس نے سب سے پہلے اس دنیا میں قدم رکھا، اور ابو البشر کا خطاب پایا، جب تنہائی سے تنگ آکر گھبرانے اور پریشان ہونے لگا، تو عورت ہی اُس کی مونس تنہائی، اور باعث شکیبائی ہوئی، عورت ہی نے اُس کو اتحاد اور یگانگت کی شاہراہ دکھائی، اور تکثیر نسل انسانی کی تدبیر بتائی؛ انسان کا وہ فطرتی جذبہ، یعنے محبت، سب سے پہلے عورت ہی کی جانب مائل ہوا۔ اور انسان سب سے پیشتر اُسی کا فریفتہ اور دلدادہ ہوا۔ اُسی کا سب سے اول اور سب سے زیادہ وہ ہمدرد اور غمگسار بنا، مخلوقات عالم میں مرد کے لیئے قدرتی طور پر عورت ہی سب سے اچھی اور سچی رفیق زندگی پیدا ہوئی ہے؛

لانگ فیلو کا مقولہ ہے کہ "جس طرح کمان میں چلہ ہوتا ہے، ویسی ہی میاں بی بی کی مثال ہے، کمان کو خم دینا یا اُس کو چلانا چلہ کے بغیر محال ہے

اسی طرح اِن دونوں کی زندگی منشاء قدرت کے موافق بسر ہونا ایک دوسرے کی شرکت کے بغیر محال ہے،

عورت کی قدر یہ ایک مانی ہوئی بات اور مسلمہ اصول ہے، کہ ہر شخص اُس چیز کی سب سے زیادہ قدر و منزلت اور نگہداشت کرتا ہے، جو اُس کو سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، گویا ہر چیز کی وقعت اور حفاظت کا معیار اُس کا درجہ مقبولیت اور مرتبہ محبت ہے، جو چیز جس قدر مرغوب محبوب اور منظور نظر ہوتی ہے اسی قدر انسان اُس کے محفوظ رکھنے کی کوشش، اُس کی افزونی وقعت اور ازدیاد قدر و قیمت کی سعی اور اُس کے لیے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی تدبیر کرتا ہے، اسی طرح چونکہ مرد عورت کو جو اُس کی سب سے بڑی غمخوار سچی ہمدردی کی بہی خواہ ثابت ہوئی، اور فطرتی طور پر اُس کی رفیق زندگی بنائی گئی ہے دل سے عزیز رکھتا ہے، اس لیے اُس کی بہتری اور بہبودی کی فکر کرتا اُس کی نگہداشت کو اپنا فرض اصلی سمجھتا ہے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جان بوجھکر سوچ سمجھکر ایک ایسے قابل قدر عطیۂ قدرت اور ایسی لازوال دولت علم سے اُسکو محروم رکھتا، بلکہ یقیناً وہ اس خوشنما اور بیش بہا زیور علم سے اُس کو ضرور آراستہ کرتا،

اثبات غلط فہمی مگر اُس کی سمجھ نے غلطی کی، وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہوا، وہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ بیش قیمت زیور میری پیاری اور عزیز چیز کو بھی خوبصورت بنا سکے گا، بلکہ وہ اس نتیجہ پر پہونچا، کہ اُس کی اخلاقی حالت بگڑ جائے گی اور اُس کے اُس حسین چہرہ پر جو نیکی اور سادگی کے سانچہ میں ڈھلا ہے بدنما جھریاں پڑ جائیں گی، اُس نے اپنی رائے

اور اپنی عقل کے موافق اُس کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کا برتاؤ کیا، گو کہ اُس نے عورت کو ایک غلط راستہ پر چلایا لیکن نیت اوس کی اُس کو اُس منزل مقصود پر پہونچانے کی تھی - جو عورت کے لیے بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید خیال کی جا سکتی ہے، اس صورت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے، کہ اُس نے عورت پر ظلم کیا، جبکہ صریح طور پر یہ صرف ایک غلط فہمی ثابت ہو رہی ہے مرد اگر مرد رہے، اور عورت - عورت تو یہ کبھی ممکن نہیں کہ مرد عورت کے لیے جابر - ظالم اور عورت مرد کے لیے مکار اور بے وفا ثابت ہو سکے، یہ دونوں کی فطرت کے بالکل خلاف امر ہے، ایسا صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے - جبکہ وہ اپنی قدرتی مرکز سے ہٹ جائیں - لیکن اُس وقت نہ مرد - مرد رہتا ہے نہ عورت عورت، سو جو وہ حالت اس امر کی بین دلیل ہے، جبکہ مرد غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور عورتیں جہالت کی تاریکی میں پھنس گئیں تو اُن برائیوں کا اظہار کہ جو اس حالت کا نتیجہ لازمی تھا - ہونے لگا، لیکن نہ مرد اپنے صحیح معنی میں مرد رہا نہ عورت عورت - اس لیے اس صورت میں یہ کہنا کہ مرد جابر اور ظالم ہیں اور عورتیں بے وفا اور مکار ہیں باعتبار منشا قدرت اور اصول فطرت کے خود ہی غلط ہے، غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ عورت ہی مرد کی ماں ہوتی ہے، عورت ہی اُس کی بہن - عورت ہی اُس کی بیٹی - عورت ہی اوس کی بی بی - پھر جبکہ ایسے اہم تعلقات باہم وابستہ ہیں تو کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ مردوں نے عورتوں کو تاریکی میں ڈالنے اور نقصان پہونچانے اور ذلیل کرنے کے خیال سے ذی علم

نہیں ہونے دیا، جبکہ ہر طرح پر عورتوں کے نقائص خود مردوں ہی کے نقصانات ہیں، اور مردوں سے ایسے متعلق ہیں کہ وہ اُن کے اثرات سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے، اس لیے یہ امر بلاشبہ پورے طور پر ثابت ہے کہ مردوں نے صرف ایک غلط فہمی کی ہے جسکو اجتہادی غلطی سے زیادہ نہیں کہہ سکتے، اور جو ایک مقتضا البشریت ہے محض ایک غلط فہمی کی وجہ سے انپر ایسے الزامات صحیح طور پر قائم نہیں کئے جا سکتے، بلکہ جس طرح عورتیں بے قصور ہیں اسی طرح مرد بھی بے خطا سمجھے جانے کے لائق ہیں،

اصلاح اب رہی یہ بات کہ ان خرابیوں کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے، اس کے متعلق بے شمار کوششیں کیجا رہی ہیں، ہزاروں مصلحان قوم اس غلط فہمی سے واقف ہو کر اُن لوگوں کو چلا چلا کر خواب غفلت سے بیدار کر رہے ہیں جنھوں نے ابھی اس میٹھی نیند کا چسکہ نہیں چھوڑا ہے، لیکن کہاں تک سوتے رہیں گے آخر جگانے والے جگا کر رہیں گے؛

نور احمد - وکیل -

مہر افروز بیگم یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اس کی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے۔ قیمت صرف ۸ر علاوہ محصول ڈاک

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

مقتول تمنّا

کھٹکنا رات دن کانٹے کی صورت دل میں پیکاں کا
سمیٹے گا کہاں تک صبر اس دست و گریباں کا

کوئی حد بھی ہے آخر آج برسوں ہو گئی مجھکو
پتہ ملتا نہیں اب تک نشانِ راہِ اماں کا

ہوئی ہیں دفن اتنی حسرتیں دل میں میرے یارب
نمونہ بن گیا سینہ میرا گورِ غریباں کا

مرا یہ دستِ وحشت دستِ مجنوں بن گیا شاید
کہ اب ملتا نہیں ہے تار بھی جیب و گریباں کا

مرے اشکوں میں اتنا وصف رنگِ خونِ ناحق ہے
گواہی دے رہا ہے چاک دیکھو! چاکِ داماں کا

نہ پہنچا آسماں تک نالۂ غم واہ ری قسمت
کروں کیا دل سے شکوہ آہ اپنے سوز پنہاں کا

زمیں نے کب اجازت دی تجھے دامن میں چھپنے کی
فلک نے کونسے دن آہ میرا عیب تہاڑھا نکا

مجھے شک ہے کہ نکلے یا نہ نکلے آرزو میری
گلِ تر مردہ ہوں میں اڑ گئی ہے مجھسے بو میری

ہمیشہ خنجرِ حسرت مرے سینہ پہ چل جانا
غضب ہے آئے دن یوں خرمنِ ہستی کا جل جانا

کچھ کونسی کمی اک آن دست غم نہیں خالی
گوارا ہی نہیں اسکو مرا دم بھر سنبھل جانا

مری امید کیا ہے اک گلِ تر خیر گلشن ہے
ادھر اگدم کو کھلنا اور ادھر مرجھا کے جل جانا

مجھے بالکل نہیں ہے یاد اپنی زندگانی میں
بجز کاوشِ دل صد زخم خوردہ کا بہل جانا

بہت دستِ اجل دکھلا رہا ہے شوخیاں اپنی
کبھی اک سانس آجانا کبھی کچھ دم نکل جانا

مری اس زندگی کے ختم کر دینے کو کیا کم ہے
یکایک اسطرح میرے مقدر کا بدل جانا

مجھے پیرون لاتا ہے خیالِ ہستیٔ فانی
کہ ہائے وہ مرا ہر اچھی صورت پر مچل جانا

وہی میں ہوں کہ اب میں تختۂ مشقِ ستم بھی ہوں،
گرفتارِ بلا بھی۔ رنج بھی۔ تصویرِ غم بھی ہوں،

مری آہوں میں اکثر شعلہائے رنج و غم نکلے
نہ لطفِ زندگی مجھکو میسّر اور نہ دم نکلے

وہ برگشتہ مقدر ہوں جو فرشِ گل پہ جا نکلا
تو پا بوسی کی خاطر خارِ غم زیرِ قدم نکلے

دلِ اندوہگیں سے حسرتیں جانے نہیں پاتیں
نہ ارمان دل سے جاتا ہے نہ اس سینے سے دم نکلے

بندھی تھی کچھ ذرا دھارس کہ نالے کچھ دکھا دینگے
مگر افسوس وہ بھی ہر دلِ عدم نکلے

جنھیں میں پی گیا تھا جانکر اُمید کی مے
مری قسمت سے وہ بھی تھے لہو کے گھونٹ سم نکلے

مرام غم سے وابستہ تھا بالکل شامِ غربت میں
اسی باعث بوقتِ مرگ یہ دو نو بہم نکلے

بس اب رحمت پہ تیری آرزو کا حصر ہے یارب
برائے دل کی حسرت یا یہ جانِ پُر الم نکلے

پتہ کیا پوچھتی ہے آرزو۔ حسرت کے جاروں کا
کوئی پھاٹا نظر آتا نہیں اب دلفگاروں کا

میر زید الواسطی - دہلوی

غزل

اُمڈیں گھٹائیں اور ترشح ہے باغ میں
ساقی شراب خوب سی بھر دے ایاغ میں

میرے لیے محبتِ گیسو وبال ہے
ہوگی یہ زندگی بسر اب کیا فراغ میں

فرقت کی شب تھمیں گے نہ آنکھوں سے اشکِ خوں
جلتا رہیگا تیل ہے جبتک چراغ میں

دلچسپ کس قدر ہے تلاشِ حبیب بھی
میں محو ہو گیا ہوں کسی کے سُراغ میں

ارماں ہیں دل میں سینکڑوں اور عمر گھٹ چلی
شب کم رہی ہے تیل بہت ہے چراغ میں

پھر وحشت و جنوں مرے پیماں گسل ہوئے
پھر شوق لے چلا مجھے صحرا و راغ میں

کرتا ہی منع مے سے جو رندانِ مست کو
واعظ خلل نہ آیا ہو تیرے دماغ میں

واں گل تو یاں مرقعِ عبرت ہے دیکھ لو
ہے لطفِ باغ میرے دلِ داغ داغ میں

رنگیں بیانیوں کا جمے رنگ یارب آج
محوی ہے نغمہ سنج حریفوں کے باغ میں

محوی — محمد حسین

شکریہ

دنیا کے مہذب ممالک کی قوموں میں شکریہ کا اس قدر لحاظ ہے کہ اسکی خلاف ورزی ایک اخلاقی جرم خیال کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر ہماری روزانہ زندگی یا یوں تصور فرمائیے کہ روزانہ طرز معاشرت پر اس قدر غالب آگیا ہے کہ بات بات پر شکر گذار ہونا پڑتا ہے حتی کہ حرکات اور سکنات بھی اس اعلیٰ ترین اور پاکیزہ اصول سے مستثنیٰ نظر نہیں آتے +

لیکن مشاہدات کے تجربہ سے اور بھی بہت سی ایسی ذی روح مخلوق معلوم ہوئی ہے کہ جس کو فیاض قدرت نے اس خاص صفت سے محروم نہیں رکھا، گو شکریہ کا طریق اظہار ان میں مختلف ہے،

شکریہ شکریہ اس جذب نا متناہی کا نام ہے کہ جو جسم کے تمام حصص سے منتقل ہو کر ایک خوشگوار مسرت کے ساتھ زبان سے ادا ہو جائے، یعنی وہ حقیقی جذبۂ دل جو احسانات کے مقابلہ میں اظہار خیالات کا کافی قائم مقام ہو۔ مزید توضیح کے لیے میں ایک مثال بیان کرونگا۔ وہ یہ کہ فلسفۂ منطق کی رو سے کسی چیز کے اثبات کے لیے ہمیشہ اس کے خلاف سے بحث کی جاتی ہے اور جب تک وجہ ثبوت کا طریق استدلال قوی نہ ہو اس کی صحت ہمیشہ مشتبہ رہتی ہے مثلاً رات نہ ہو تو دن کی تمیز کیا، ظلمت نہ ہو تو راست کیسی، احسان نہ ہو تو شکریہ کہاں۔ تعرف الاشیاء باضدادھا

غالباً شکریہ کے صحیح مفہوم کے لیئے مذکورہ بالا بیانات کافی ضمانت ہیں اب میں چند زندہ اور نمایاں مثالیں پیش کر کے شکریہ کا غالب اشر سوسائٹی پر ثابت کرونگا ؛

شکریہ کے مختلف طریق ہیں اور جہاں اُس کے مختلف طریق ہیں وہاں اُس کے اظہار کے بھی مختلف ذرائع ہیں۔ ایک ہندی مثل کے مطابق کہ ہمارا رُواں رُواں شکرگزار ہے،، کوئی چیز ہمیں دی جائے تو ہم شکریہ کے ساتھ لیں اور کوئی چیز ہم پیش کریں تو شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے۔ جہاں کسی سے کوئی غیر معمولی خدمت سرانجام ہوئی اور شکریہ کے رزولیشنوں کا تانتا باندھ دیا گیا ہماری انجمنوں اور کلبوں میں صدہا رزولیشن ہر روز شکریہ کے کسی نہ کسی واقعہ کے متعلق پاس ہوتے رہتے ہیں

چھوٹی چھوٹی باتوں میں بعض اوقات ہم آنکھ یا ہاتھ کے اشارے سے یا کسی اور حرکت جسمانی سے شکریہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک بیرسٹر جب اپنے موکل کی جانب سے مقدمہ کی پیروی میں خاص قانون اور دماغی قابلیت صرف کر کے ڈگری حاصل کرتا ہے تو علاوہ اُس حق المحنت محنتانہ کے نذرانہ اور اُسپر مزید ٹیکس شکرانہ کے نام سے بھی وصول کرتا ہے (گو یہ ٹیکس جائز ہو یا ناجائز اس سے ہمیں بحث نہیں)

ایک سادہ اور اوسط شخص کی زندگی کو اگر ہمارے وجود سے کچھ فیض ہوا تو گو ابھی اُس کی جانب سے شکریہ کا اظہار باقاعدہ نہ کیا گیا ہو، تاہم اُس کے لب و لہجہ سے شکرگذاری کی شان ٹپکتی ہے۔

مذہبی حیثیت سے بھی شکریہ کو ایک خاص وقعت ہے، ہم ہر روز، ہر وقت خدا کے کسی نہ کسی آرزو بر آنے کی التجا کیا کرتے ہیں اور جب ہمیں

اُس میں کامیابی نصیب ہوتی ہے تو ہم شکرانہ کی نماز کے ذریعہ سے اُسکی بارگاہ میں رطب للسانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لطیفہ، ایک ظریف اخبار کے انتظامی شعبہ کے متعلق مینے اپنی کچھ رائے لکھ کر بھیجی تو دفتر ظرافت سے مجھے ایک خط موصول ہوا جس کے الفاظ یہ تھے "شکریہ بادلِ ناخواستہ" بس الحق مُر سمجھئے۔ دکھلانا یہ منظور ہے کہ شکریہ سے قاصر نہیں رہے احسانات کا بدل بعض اوقات غیر ممکن ہے مگر ایک شکریہ ہے جو مشکور کی جانب سے محسن کے دل پر اُس کے احسانات کا صحیح اثر محسوس کراتا ہے اور یہ وہ سچا اثر ہے جو خالص بدل اور پورے بدل سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ شکریہ عقیدت مندی کی ایک شان ہے اور احسانات کا اعتراف۔ کہ جس سے محسن محسوس کرے کہ ہمارا احسان رائگاں نہیں گیا۔

شکریہ جزو اخلاق ہے اور اُسکی ادائگی فرض، اور جب تک ادائگی نہ ہو اخلاق نامکمل ہے۔

شکریہ سے نہ صرف شکرگذاری مقصود ہوتی ہے بلکہ اُس اعلیٰ تریں اور پسندیدہ صفات کا اظہار بھی ہے جو اطاعت و انقیاد کے نام سے موسوم ہیں۔

غرضکہ شکریہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہو رہا ہے۔

اُردو کا ایک حقیقت پرست شاعر کہہ گیا ہے ؎

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں

سیّد لطف علی بلگرامی

شکایت صیّاد

ہوئی ہے بلبلِ آشفتہ جاں بلب صیّاد
اسیر کرکے تو اتنا نہ ڈھا غضب صیّاد

بلا کے دام میں گیسوئے خم بخم تیرے
کہ پھانس لیتے ہیں دل کو بے سبب صیّاد

ہے غم نصیب زخود رفتہ، نامراد ہزار
نہیں امید رہائی کی اسکو اب صیّاد

تڑپ تڑپ کے قفس میں غمِ جدائی سے
غریب جان بھی دیدے تو کیا عجب صیّاد

کچھ اسکو قید میں رہنا تو ناگوار نہیں
گلوں کے غم میں ہے لیکن نحیف بلب صیّاد

زباں دراز نہ تھی یہ بوقت آزادی
ہوئی ہے یاس رہائی سے بے ادب صیّاد

پڑے گا صبر نہ اس بے زباں کا کیا تجھپر
دیے ہیں رنج بہت تو نے بے سبب صیّاد

کیا ہے خانہ خراب اور بے وطن ناحق
کسی چمن ہی میں رکھدے قفس کو اب صیّاد

گلوں کی جامہ دری پر ہر عندلیب نہ ہو
یہ تجھ سے کرتے نہوں خونبہا طلب صیّاد

ہزار صد مو نپہ صدے اٹھائیگا محوی
ہلائیگا ترے آزار سے نہ لب صیّاد

قفس میں شوقِ رہائی و حسرتِ پرواز
فضول ہے جو اسیروں کا بخت ہونا سا

محمد محسن خضری

آہ مظلوماں۔ ہماری بہن محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ نے آہ مظلوماں کے نام سے جس کتاب کا اعلان فرمایا تھا وہ مکمل ہوگئی اور اس کتاب کو دیکھکر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ جس قابلیت سے محترمہ بن نے اس مسئلہ کو حل کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ قصہ اس قدر لطف ہے کہ بغیر ختم کئے کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اس کا منافع تمام یونیورسٹی فنڈ کے واسطے ہے امید ہے کہ ناظرین تمدن اپنی ایک بہن کی حوصلہ افزائی فرماکر اپنے یونیورسٹی فنڈ کو تقویت دیں گے قیمت ۱۲ر مصنفہ سے کوہاٹ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

سیر تاتار

(از محمد شفیع الدین خاں ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)

اگرچہ مذہب اسلام اس وقت دنیا کے ہر ایک آباد اور غیر آباد ملک میں پھیلا ہوا ہے اور چین۔ ہندوستان جزیرہ نمائے ہند زائد۔ جزیرہ نمائے ملایا۔ اور مجمع الجزائر ہند شرقی کے زرخیز اور سرسبز میدانوں کے رہنے والے کروروں کی تعداد میں اس مقدس مذہب کے پیرو ہیں۔ لیکن عجیب اتفاق یہ ہے کہ ساحل بحر اطلانتک سے لیکر ساحل بحر الکاہل تک جو ممالک اور اقالیم خود مختارانہ طور پر پرچم اسلامی کے زیر نگین ہیں وہ سب کوہستانی۔ ریگستان۔ اور بڑے بڑے صحرا اور بیابانوں سے مملو ہیں۔ کیا شمالی افریقہ کی حکومتیں جن میں مراقش۔ ریاستہائے بربر طرابلس۔ مصر۔ سوڈان اور وسط افریقہ کے اسلامی حکومتیں شامل ہیں اور کیا مغربی اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک جن میں عرب۔ شام عراق۔ ایران۔ افغانستان۔ بلوچستان۔ ترکستان شرقی یعنے تاتار اور ترکستان غربی میں توران داخل ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے چوتھائی رقبہ میں ریگستان اور بڑے بڑے لق و دق بیابان واقع ہوں اور اس لیے نکتہ چین عیسائی معترضین اسلامی بہشت کا مضحکہ اڑانے کی ہمت کر بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ بہشت میں نہریں۔ باغات۔ اور میوے شیریں اور سرد پانی کے چشمے اس غرض سے دکھلائے گئے ہیں کہ ریگستانوں کے بادیہ نشینوں اور بے آب گیاہ

بیابانوں کے مسکن گزینوں کو باغ رضواں کے حصول کا بیحد ذوق وشوق پیدا ہو۔ لیکن جیسے ہر معاملہ میں تعصب کی عینک نظر کو خیرہ کر دیتی ہے اور کچھ کا کچھ دکھلاتی ہے اسی طرح بہشت کا مسئلہ بھی معترضین کو نظر آیا اور سیر باغات اور بہتے ہوئے چشموں کی فضا گاہ دیدہ صرف عرب کے بادیہ نشینوں کو ٹھہرایا حالانکہ یورپ والے جو نہایت سرد آب و ہوا میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور ریگستان و بیابان کی تصویر جن کے خواب و خیال میں بھی نہیں گذرتی اور جو ایسے ممالک کے باشندے ہیں جنکی ہوش سنبھالتے ہی سر بلند پہاڑوں۔ پُر فضا منظروں اور بہتے ہوئے چشموں پر نظر پڑتی ہے پھر بھی اُن سے زیادہ کوئی قوم باغوں۔ پھلوں اور پھلدار درختوں۔ نہروں۔ آبشاروں۔ اور چشموں کی شایق نہیں یہاں تک کہ جن شہروں میں قدرتی مناظر کی کمی ہے وہاں مصنوعی سیر گاہیں (پارک) بنا کر ان کی نقل کرتی ہیں کروڑہا روپے صرف کر دیے ہیں جن سے صاف ثابت ہے کہ نہ صرف خشک و گرم ریگستان کے باشندوں کو بلکہ عام بنی نوع انسان کو بالطبع اُن چیزوں سے عشق ہے جن کا ذکر اور وعدہ بہشت کی حدود میں کیا گیا ہے۔ ورنہ چاہیئے تھا کہ جیسے عرب والوں کو بہشت کی ٹھنڈے مناظر کی خواہش ہے اسی طرح یورپ کے سرد ممالک کے باشندوں کو اور برفستان کے رہنے والوں کو بمقابلہ عربوں کے دوزخ کی خواہش ہوتی جہاں تاپنے کے لیے آگ اور پینے کے لیے کھولتا پانی اور حرارت عزیزی قائم رکھنے کے لیے گھپلی ہوئی گندھک بافراط موجود ملیگی لیکن تجربہ ثابت کر رہا ہے کہ اسکاٹ لینڈ اور ناروے کے برفستانی

باشندوں کو جس قدر درختوں۔ پھل۔ پھولوں اور آبشاروں سے شوق ہے اُن کے مقابلہ میں عربی باشندوں کے شوق کو ایک ہزار اور ایک کی نسبت بھی نہیں۔

ملک تاتار یا مشرقی ترکستان بھی عجیب ملک ہے سیاح جب ایک آباد مقام سے گھوڑے یا اونٹ پر روانہ ہوتا ہے تو چند میل چلنے کے بعد ہی وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق بیابان اور بظاہر صحرائے بے پایان میں موجود پاتا ہے۔ ہندوستان کے لہلہاتے جنگل اور اناج سے بھرے ہوئے کھیت اُن اطراف میں عنقا کا حکم رکھتے ہیں۔ درخت اور بعض اوقات صدہا میل تک درخت تو درکنار گھاس کا تنکا تک نظر نہیں آتا۔ البتہ ریتے کے ٹیلے اور پہاڑ جا بجا خط افق کو ناہموار بناتے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔ شب کو ریت اس قدر سرد ہو جاتا ہے کہ ہاتھ لگانا ناگوار گذرتا ہے لیکن گرمیوں کے موسم میں جب کہ دن کے وقت زمین اور آسمان تپنے لگتے ہیں اور کرۂ ہوا میں کوہ نار کا سماں بندھ جاتا ہے تو ان ایام میں رات کے وقت ریگ صحرائی ایسا خوشگوار اور سرد ہوتا ہے کہ مسافر کو اس پر لیٹنا بیحد پُر لطف معلوم ہوتا ہے۔ یارقند کے قریب کے ریگستان میں ریتا اس قدر نرم اور باریک ہے کہ مٹھی میں دبانے سے پانی کی طرح گھائیوں میں سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور جو مسافر رات کو اس پر لیٹتا اور کروٹیں بدلتا ہے تو فرش مخمل کا مزا آتا ہے۔ دن میں ہوا کے ساتھ افق نظری ہمیشہ گرد آلود رہتا ہے۔ اسی حال میں چلتے چلتے راہرو کو معلوم ہوتا ہے کہ دور کوئی پہاڑ ہے جو دامن صحرا کو گھیرے ہوئے ہے لیکن چند منٹ میں اس عجیب راز کا انکشاف ہو جاتا ہے

وہ پہاڑ نہیں ہوتا بلکہ نخلستان کے پُر فضا باغات ہوتے ہیں جو گرد کے پردہ میں پہاڑ نظر آتے ہیں۔ سیّاح کو حیرت ہوتی ہے کہ یکایک سماں کیونکر بدل گیا اور کسی ایسے صحرائی جانگزا میں نمونہ فردوس نکل آیا۔ جہاں سبزہ زار کی بہتات۔ درختہائے میوہ دار کی کثرت۔ نہروں اور چشموں کی افراط باغ ارم کا دھوکہ دیتی ہے۔ انگور۔ نارنگی۔ لیموں۔ آڑو۔ شفتالو اور تربوز کے انبار نظر آتی ہیں۔ ایسے ہی شاداب مقام میں ترکستان کا کوئی نہ کوئی شہر و قصبہ آباد ہے جہاں بازار بھی ہوتا ہے مقبلات کے بازار پختہ نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے دروں اور ستونوں پر چٹائیوں کا سائبان لگا دیا جاتا ہے یہ بازار رات دن بیکار پڑے رہتے ہیں۔ صرف پنٹیہ یا بازار کے روز ان کی دھوم دھام اور رونق قابل دید ہوتی ہے جہاں اطراف جوانب سے سوداگر و دوکاندار جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہفتہ بھر کے لیے لین دین ہو جاتا ہے۔

مکانات یہاں کے شہروں کے اس طرح پر ہیں کہ بازار اور رستہ کی طرف کوئی دریچہ نہیں ہوتا صرف ایک دروازہ اور صحن ہوتا ہے اس کے بعد مکان صحن میں درختوں کی کثرت ہوتی ہے اور عموماً دیواروں سے اونچے اونچے درخت سڑک کی طرف جھکے نظر آتے ہیں باشندے اس ملک کے سب مسلمان ہیں اور حکومت چین کی ہے۔

ناظرین تمدن براہ کرم اپنے خطوں پر نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں ورنہ تعمیل کی شکایت سے معاف کریں۔ منیجر تمدن

تازہ ستم

دشمن ہوا ہے ناحق چرخِ کہن ہمارا
پیشِ نظر خزاں نے لوٹا چمن ہمارا
گردش چھڑا رہی ہے ہم سے وطن ہمارا
کوئی نہیں جو پوچھے رنج و محن ہمارا
دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

مشہور تھے جہاں میں ہم آن بان والے
جھکتے تھے آستاں پر عرش آستان والے
زیر نگیں تھے سارے نام و نشان والے
دب کر رہے ہمیشہ تاب و توان والے
رفعت نشاں ہا ہی ہر جا علم ہمارا
خورشید تمکنت تھا دست کرم ہمارا

مخفی نہیں کسی سے خُلقِ حسن ہمارا
تہذیب مسلمونکی سب پر ہے آشکارا
ظلم و ستم کسی پر کب ہے ہمیں گوارا
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
کرتے رہے ہیں احساں ہم اپنے مدعی سے
جھگڑا نہیں کیا ہی ناحق کبھی کسی سے

بیجا مخالفت پر ہم سے ہی کیوں زمانہ
بھولے ہیں کیوں سلاطیں آئین خسروانہ
کرتا ہے خون جگر کو تبریز کا فسانہ
نشتر ہے زخم دل کو حافظ کا یہ ترانہ
شہر لست پُر حریفاں از ہر طرف نگارے
یا ان صلائے عشق است گر میکنند کارے

دنیا میں ہو چکے ہیں گو انقلاب اکثر
تازہ ستم کیا ہے اے چرخ تو نے ہم پر
مسلم کے خوں سے کافر کرتا ہی سرخ خنجر
بیداد او ستمگر بیداد او ستم گر

ہاتھوں سے کفر کے ہی اسلام کی تباہی
فریاد یا الٰہی! فریاد یا الٰہی

افسوس کیا کہوں میں تھا عشرۂ محرم — دل کو ہلا رہا تھا اہل وطن کا ماتم۔
نظارہ وہ الم کا ہے روبرو جو ہر دم — برسا رہی ہیں آنکھیں قطرے لہو کے پیہم

اسلام کے مشائخ ناری ستا ستا کر
سر۔ دار پر چڑھائی ہمکو دکھا دکھا کر

کوئی ہمیں بتادے دنیا میں بن کے عادل — کیا ہم ہی رہ گئے تھے ایسی جفا کے قابل
اسوقت وہ نہیں ہیں روز جزا کے قابل — جاکر کہاں چھپیں گے ہنگام حشر قاتل

چہرہ ہی سرخ خوں سی خورشید خاوری کا
نزدیک آگیا ہی دوران داوری کا

ارشد بس اب زباں کو تاب بیاں کہاں ہے — مونس نہیں ہی کوئی۔ دشمن تراجہاں ہی۔
فرصت کا وقت کم ہی پر درد داستاں ہے — کر خاتمہ دعا پر اللہ مہرباں ہے

"پہونچادے جلد یارب ہمکو حضور مہدی"
ہیں منتظر نگاہیں۔ دکھلا ظہور مہدی"

آغا غلام حسین ارشد

عصمت جس طرح یہ امر مسلم الثبوت ہی کہ قوم کی ترقی کا انحصار تعلیم النسواں پر ہی اسیطرح اس میں بھی کلام نہیں کہ رسالہ عصمت لڑکیوں کے واسطے ایک بیش بہا نعمت ہی جس میں خانہ داری تعلیم و تربیت مذہب وغیرہ پر منتخب اہل قلم کے مضامین نکل رہے ہیں عصمت کو اری لڑکیوں کو فرمانبردار بیویاں اور بیویوں کو سلیقہ شعار گھر والیاں اور گھر بنانے کے واسطے ایک لاجواب چیز ہے۔
جو بیش قیمت کاغذ اعلیٰ درجہ کی لگائی چھپائی رنگین ٹائیٹل سنہری بیل اور تصویر سے مزین ہو کر ہر ہفتہ شائع ہوتا ہی قیمت سالانہ (۲) صیغہ عصمت تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

مسلمانوں کے دسترخوان پر ایک ناخواندہ مہمان

بروسہ سے دو تین میل ادھر اس مقام پر جہاں کوہ اولمپس کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں قریۃ الیہود ہے جس میں زیادہ تر یہودی آباد ہیں قسطنطنیہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں مگر ان لوگوں کا طرز معاشرت ترکوں سے بالکل علیحدہ ہے سنگین محلوں یا دو منزلوں سہ منزلوں کے بجائے ان کے مکان کچی مٹی اور چھوٹی چھوٹی دیواروں کے ہیں جن میں صاف ستھری ہوا آزادی سے آتی جاتی رہتی ہے زیتون کے خوبصورت باغ اور کھجوروں کے اونچے اونچے درخت چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ہی ان غریبوں کی جائداد اور اثاثہ ہے۔

بستی کا بڑا حصہ یہودی ہے لیکن کچھ مسلمان اور عیسائی بھی ہیں مدائنہ چونکہ یہاں سے قریب ہے اس لیے ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے کے واسطے انکو اکثر شہر میں جانیکا اتفاق ہوتا ہے مگر یہ اپنی حالت میں ایسے مگن ہیں کہ شہری زندگی کو رشک و حسد سے نہیں دیکھتے اور سلطان کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں جس کے عہد سلطنت میں بیفکری سے اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں ✣

ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کی ابتدائی تاریخوں میں جس کو آج سے تقریباً دس سال ہوئے قریۃ الیہود کا رئیس الدیہہ موسیٰ اپنے گھر میں مغموم و متفکر بیٹھا ہے۔ اسکے ہاتھ پر اس کی بیوی خاموش ہے اور سامنے ایک چودہ برس کی مہجبین اپنی ضعیف العمر والدین کے لیئے تھپوڑہ

تیار کر رہی ہے۔ موسم کھلا ہوا ہے اور گو اس نازنین کے گلے میں ایک پتلی سی قمیص ہے مگر قدرت نے اس کو حسن کے سانچہ میں ڈھال کر اس طرح دنیا میں بھیجا ہے کہ ایک زمانہ اس کی صورت پر فریفتہ ہو رہا ہے۔

زیور کا نام نشان تک نہیں مگر چاندنی اس کے پاؤں میں لوٹ رہی ہے رات کا پہلا پہر ختم کے قریب ہے مگر چشم کافر نیند سے آشنا نہیں البتہ افعی کی طرح لہراتے ہوئے سیاہ بال اتنا پتہ دے رہے ہیں کہ چمکتا دمکتا چاند اس افعی کو ڈسنے میں پوری پوری مدد دیگا

موسیٰ جو عالم خیال میں ایک ضروری مسئلہ کے حل کرنے میں مستغرق تھا دفعتہً چونک اٹھا اور بیوی سے کہا۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کی دیکھا دیکھی آزادی نسواں کی گھٹا ٹرکی پر بھی چھا گئی قسطنطنیہ کے بازار قسم کھا سکتے ہیں کہ پچھلی صدی میں سوا کسی خاص ضرورت کے وہ کبھی کسی جوان یا حسین عورت کے قدموں سے آشنا نہ ہوئے مگر ہمارے دیکھے دیکھتے یہ اثر بجلی کی طرح تمام ملک میں سرایت کر گیا اور برقع کی آڑ برائے نام رہ گئی۔ خیر ہمیں اس سے زیادہ بحث نہیں سلطنت اس کی ذمہ دار ہے اور اس کے حسن و قبح پر غور کرنا مسلمانوں کا کام ہے لیکن کوئی چیز ہم کو مجبور نہیں کر سکتی کہ ہم اپنے جیتے جی شادی کے فیصلہ کا اختیار مریم کو دیں اس کو اس معاملہ میں رائے دینے کا مطلق حق نہیں۔ تم کو مجھ سے اتفاق کر لینا چاہیئے۔ میری طرف سے مسلمان اور عیسائی دونوں یکساں ہیں۔ لیکن ایسی حالت میں کہ قریۃ الیہود کے کسی خاندان میں کوئی یہودی لڑکا ایسا نظر نہیں آتا جو پیاری مریم کی آئندہ زندگی کو خوشحال بنانے کی امید

دلاسکے میں محل کے مقابلہ میں ادہم کو ترجیح دیتا ہوں۔

(۲)

آرمینی گورستان کے عظیم الشان اور خوبصورت کتبے اُن مٹنے والی روحوں کے نام یاد دلا رہے ہیں جو اپنی زندگیاں فسلاح قوم پر قربان کر گئے دوپہر کا سنسان وقت ہے اور کھجور کے تناور درخت ان بیخبری کی نیند سونے والوں کا پہرہ دے رہے ہیں۔ ایسے قیامت خیز وقت میں کہ آفتاب عالمتاب نے کائنات کے ہر ذرہ کو جھلسا رکھا تھا مریم ایک زیتون کے درخت کی آڑ میں خاموش کھڑی تھی لباس کی سادگی نہ صرف اس کے کوارپتہ کا ملکی نشان تھا بلکہ فلسفۂ حسن کا مسئلہ کھلے ہوئے الفاظ میں حل کر رہا تھا پسینہ کے قطرے نرم و نازک رخسار و نیز پیشانی کی طرف سے بہتے ہوئے آرہے تھے اور موتی بن بن کر آب و تاب سے چمک رہے تھے نگاہ شوق انتظار کی تکلیف میں مصروف تھی کہ ہوا کے گرم جھونکے نے زیتون کا ایک پتہ گندھے ہوئے بالوں پر پھینکا باد سموم کی یہ چھیڑ چھاڑ مریم کو اچھی نہ معلوم ہوئی اور وہ نگاہ جو جنگل بیابان کیطرف ٹکٹکی بنی ہوئی تھی ہٹ کر درخت پر پہونچی ابھی درخت سے واپس نہ ہوئی تھی کہ ایک نوجوان ترک مریم کے پہلو میں کھڑا تھا جس کے قدموں کی آہٹ نے اس نازنین کی خشم آلود نظر کو بالجبر اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ چونک کر پیچھے ہٹی

ترک:۔ کیوں؟ مریم! اس طرح جھجک کر پیچھے کیوں ہٹیں! کیا ڈر گئیں"!

مریم:۔ "یہ تم کب سے کھڑے تھے آئے خیر سے سپاہی بننے کا بھی شوق ہے

ترک:۔ "شوق ہے ہی نہیں بلکہ پورا بھی ہو گیا۔ پیاری مریم تم یہ سنکر خوش ہو گی کہ تمھارا ادہم آج عثمانی فوج میں شامل ہو گیا"۔

مریم۔ بیشک، بیشک، انسان وہی ہے جس کی زندگی ملک اور قوم کے کام آئے،
ادہم۔ میرے دل و جان کی مالک مریم کس منہ سے شکریہ ادا کروں یہ غضب کا
وقت کہ زیتون کے پتے تک تپ رہے ہیں اور یہ نازک جسم لو کے
تھپیڑوں کی برداشت کر رہا ہے اے گلبدن وہ کونسا مبارک وقت
ہوگا جب ادہم اپنی جان مریم پر سے قربان کر دے۔
مریم۔ ان فضول باتوں سے کیا حاصل! اب میں جاتی ہوں۔
ادہم۔ اتنی اجازت دو کہ میں یہ نازک پاؤں جو اس قدر تکلیف اٹھا چکے
ہیں اپنی آنکھوں سے لگاؤں۔
مریم۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم شرع موسوی کے بموجب ایسے ہی
نامحرم ہو جیسے کوئی اسلئے میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتے مجھے کیوں
شرمندہ کرتے ہو،
ادہم۔ یہ تو بتاؤ! کیا ملے ہوا؟
مریم۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا بہ ظاہر والد تمھاری طرف
مائل ہیں اور والدہ محل کی طرف۔ اچھا خدا حافظ!

(۳)

وہی قریۃ الیہود اور موسیٰ کا گھر، صبح کا سہانا وقت ہے طائران خوش الحان
چہک چہک کر روز روشن کا استقبال کر رہے ہیں موسیٰ منہ اندھیرے
کسی ضرورت سے بروسہ چلا گیا، مہ جبین مریم چھت پر کھڑی نظام عالم کے
کارنمایاں دیکھ رہی تھی باد صبا اس کی سیاہ زلفوں سے سرگوشیاں
کرتی تھی اور ہٹ جاتی تھی پرند اس کے حسن خداداد پر درود پڑھتے تھے
اور اڑ جاتے تھے زمین اس کے پائے نازک کے بوسے لیتی تھی اور لوٹ جاتی تھی

آفتاب جو ادلیس کی چوٹیوں سے جھانک جھانک کر مریم کو تاک رہا تھا بیتابانہ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ ہی ایک عیسائی جوان نیچے کے گھر میں داخل ہوا۔

مریم کی ماں اسکی صورت دیکھتے ہی تعظیم کو اٹھی اور اندر والان میں لاکر بٹھا مریم کو اوپر سے بلایا اور ان دونوں کو ایک جگہ بٹھا کر باہر چلی گئی

مریم :- مسٹر مچل آپ کا مزاج ؟

مچل :- ! بہ ظاہر تندرست ہوں مگر کوئی رات کوئی دن بلکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ اس صورت کا خیال دل سے دور ہوتا ہو میڈم واقعات پر غور کرو اور یقین کرو کہ مسلمان سے کبھی نیکی کی توقع نہ کرنا تکثیر ازدواج ان کے ایمان کا ادنی ثبوت ہے

مریم :- مسٹر مچل ! مجھے اس معاملہ میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں والدین اس کے مجاز ہیں وہ جو مناسب سمجھیں کریں۔

مچل :- آپ کی والدہ میری درخواست کو منظور کرتی ہیں آپ کو علم ہو کہ اس وقت ایک لاکھ ڈالر کی جائداد میرے قبضہ میں ہے میں نہایت خوشی سے اسکو آپکے نام منتقل کرسکتا ہوں

مریم :- اچھا میں اس معاملہ میں غور کروں گی۔

مریم کا فقرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ موسیٰ گھر میں داخل ہوا اور مچل سلام کرکے مریم کی ماں سے کچھ کانا پھوسی کرنے کے بعد رخصت ہوا۔

(۴)

برو سے میں بارش اول تو یوں ہی برائے نام ہوتی تھی مگر ۳۲ء کے دونوں سال تو ایسے ظالم نکلے کہ قریتہ الیہود پانی کے نام کو ترس گیا زمین آسمان کا منہ تکتی رہی مگر اس سنگدل کا دل نہ پسیجا ہر بھری لہلہاتی ہوئی کھیتیاں جل جل کر خشک ہوگئیں اور قریتہ الیہود پر ایسی قحط کی بلا نمودار ہوئی کہ موسیٰ کو کئی ہزار درہم کا باغ جو باپ دادا کی نشانی اور موروثی جائداد تھی کوڑیوں کے مول علیحدہ کرنا پڑا۔ چند ہی روز میں

افلاس کے ڈیرے جا گئے اور موسیٰ کے گھر میں سوا اس دولت کے جو قدرت نے حسن کی صورت میں موسیٰ کے گھر پر نازل کی تھی کچھ باقی نہ رہا مجل کے واسطے اس سے بہتر کامیابی کا موقعہ کیا ہوتا اس نے غریب موسیٰ کو قرضہ اور اس کے احسان میں اتنا دبایا کہ سر اٹھانے کی جگہ نہ رہی اور ضرورت نے اسکو مریم کی شادی میں متفق ہونے پر مجبور کر دیا۔

ذی الحجہ کی وسطی تاریخوں میں ایک رات جبکہ چاند اپنی پوری آب و تاب سے سطح آسمان پر جلوہ گر تھا اور چادر ماہتاب در و دیوار پر پھیلی ہوئی تھی مریم تن تنہا بالاخانہ کی چھت پر بیٹھی مختلف معاملات پر غور کر رہی تھی چشم آہو کو شکست دینے والی آنکھیں جو ہندوستان کے سرمہ اور کابل سے معرا تھیں چاند پر گڑ گئیں ریشمین سرخ بلاؤس نے اس وقت مریم کو گل لالہ بنا دیا تھا،

کانوں میں آویزے بالوں میں سیس ہاتھ میں رومال کندھے پہ شال۔ جوانی کا سن مرادوں کے دن گلابی رخسار نشۂ محبت میں سرشار لعلیں گل ناشگفتہ تل سیاہ و رنا سفتہ۔ موسیٰ کی جان حسن کی کان المختصر لکیر کی فقیر مریم مرجبین زلیخا کی دوسری تصویر عالم استغراق میں محو تھی ہوا نے ان لبوں کے جو گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نازک تھے متواتر بوسہ لیئے مگر وہ اپنے خیال سے نہ چونکی چاندنی کھجور کے درختوں سے چھن چھن کر گری اور جھنجھوڑا لیکن تخیل کے اس سرسبز چمنستان نے جس میں ادہم کی محبت کا پھول کھلا ہوا تھا اس کو باہر نہ نکلنے دیا۔ مالکی اس آواز نے کہ مریم یہاں آؤ اس کے بنے بنائے گلدستوں کو اجاڑ دیا اور وہ حیران و مایوس ماباپ کے سامنے آبیٹھی۔

موسیٰ بیٹی مریم گو میری دلی آرزو یہی تھی کہ تمھاری شادی ادہم سے ہو مگر تم دیکھ رہی ہو کہ مجل کا قرضہ ہزاروں تک پہونچ گیا اور قحط نے جان پر بنا دی ہم نے کئی کئی وقت کے فاقہ کئے مگر کب تک کرتے جب کوئی صورت

گذارہ کی نہ دکھائی دی تو اسکی طرف رخ کیا اب میں چونکہ قول دے چکا ہوں اور وہ متقاضی ہے آیندہ اتوار کو میں یہ رسم ادا کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ تم اپنی آیندہ زندگی مچل کے ساتھ بہ خیر و خوبی بسر کرو۔

(۵)

جامع ایا صوفیہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں پندرہ بیس ترک مشاش بشاش سلطان عبدالحمید کے دوران حکومت پر مختلف رائیں دے رہے ہیں عصر کی نماز ہونے کو ہے اور آفتاب اپنے فرض منصبی کو انجام دیتا ہوا مغرب کی طرف لپکا جا رہا ہے دفعتہً ادہم اپنی محبوبہ مریم کو ساتھ لیے مسجد میں داخل ہوا مریم اس وقت عروسی پوشاک میں تھی اور وہ بھی لباس عنصب زیب تن کیے ہوئے تھا اس کے اندر آتے ہی ایک سفید ریش بزرگ آگے بڑھے اور کلمہ طیبہ پڑھا کر مشرف باسلام کیا جس پر تمام حاضرین نے آفرین و مرحبا کے نعرے لگائے اور اس کے بعد مریم کا نکاح ادہم سے شرع اسلام کے بموجب پڑھا دیا گیا اور وہ بجائے والدین کے خدا کے گھر سے سسرال سدھاری مریم نے اب اپنے شوہر ادہم کے ساتھ قسطنطنیہ میں زندگی بسر کرنی شروع کی مگر اس واقعہ نے موسیٰ اور مچل کے دلوں میں تہلکہ ڈالدیا مچل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسنے بڈھے موسیٰ کو اپنے روپیہ کے عیوض جیلخانہ بھجوایا اور موسیٰ کے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی کہ اسنے ادہم پر اغوا کا دعوی دائر کیا۔

مچل گو اپنی امیدوں سے مایوس ہو چکا تھا مگر ادہم کو سزا دلانیکی واسطے دوران مقدمہ میں طرح طرح کی کوششیں کرتا رہا یہ ثابت ہونے پر کہ مریم سن بلوغ کو پہونچگئی دعوی خارج ہوا مگر مچل نے قسم کھائی کہ موسیٰ چاہے جیلخانہ میں سڑ کر مر جائے مگر وہ اپنے مطالبہ سے دست بردار نہ ہوگا۔

(۶)

ان باتوں کو برسوں گذر گئے عبدالحمید خاں معزول ہو کر سالونیکا پونچے انجمن اتحاد

ترقی کا دور دورہ ہوگیا غازی انور بے کے گیت گائے جانے لگے قسطنطنیہ کیحالت میں
ہیں آسمان و زمین کا فرق ہوگیا۔

ایک دن جبکہ موسلادھار بارش ہو رہی تھی اور کالی کالی گھنگور گھٹائیں آسمان پر
چھائی ہوئی تھیں بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور بادل تھم تھم کر گرج رہے تھے رات
کا پہلا پہر تھا مگر ہوا کی سائیں سائیں آدھی رات کا سماں بنا رہی تھی مریم جو اس وقت
زندگی کے دو پہلوؤں کی مالک تھی گود کے بچے کو لوری دے رہی تھی زبان ترکی
تھی مگر مضمون قریب قریب یہ ہی سا تھا۔ جاہی پڑو گے دنیا کے دھندے۔
کت پالنا۔ کت نیند۔ سویرے بھولے تو سویرے بھلے۔ آجا ری آنکھو نیند نیند
بچہ سو گیا تھا لوری ختم نہ ہوئی تھی مینہ اسی زور شور سے پڑ رہا تھا کڑک اور چمک کا
دور دورہ ہی تھا کہ کوئی شخص مریم کے کمرہ میں داخل ہوا جسکی صورت دیکھتے ہی مریم یہ کہتی
ہوئی بیتابانہ دوڑی "میری محترم والدہ"۔

ماں۔ مریم! خبردار مجھے ہاتھ نہ لگائیو! شقی القلب بیٹی تیرا وجود ہمارے واسطے باعث عذاب
ہوا! خواہش نفسانی کی مغلوب بیٹی تیری اور محض تیری بدولت ہمارا بڑھاپا برباد
ہوگیا تو اور تیرے افعال یقیناً اس قابل نہیں کہ انسانیت کا اطلاق تجھ پر ہو سکے! تم
بروسہ کے کتے تجھ سے بدرجہا بہتر ہیں جو محسن کشی کے الزام سے محفوظ ہیں! بہت بہتر
تھی موت ایسی زندگی سے جو تجھ جیسی ناہنجار بیٹی کے بعد قدرت نے مجھکو دی! تو نے
نہ صرف قریتہ الیہود کو بدنام کیا بلکہ تمام خاندان کی ناک جڑ سے کاٹ دی! اے شقی
بیٹی سنگدل مریم تجھ دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے ایسی حالت میں کہ تیرا
بڈھا باپ محض تیری وجہ سے حبلخانہ میں پڑا ہے مرجا! مرجا! اے مریم مرجا! زمین شق ہو اور
تو سما جا"

شکیت جس کا ہمارا چولی دامن کا ساتھ تھا، تو نے اسکو چھوڑا اور ساتھ دیا

ایک ایسے شخص کا جس سے لغو اور فضول مذہب دنیا میں کوئی نہیں جس ماں کی گود سے ملکر اور بڑھ کر آج تو اس قابل ہوگئی کہ اپنی بچہ کو لوری دے رہی ہے یقین کر اور لکھ رکھ کہ اس کا دودھ تجھ پر حرام ہے اس وقت تک جب تک کہ تو اپنے اس باپ کو جو صرف تیرے کارن جیلخانہ بھگت رہا ہے رہا نہ کروادے مچل اس بات پر آمادہ ہے کہ اگر تو ایک دفعہ اس کے پاس چل کر معافی مانگ لے تو مریم! تیرا باپ قید کی مصیبتوں سے نجات پائے مچل آج پندرہ روز کے واسطے اپنے حقیقی ماموں کے پاس سلطنت اطالیہ کا وزیر جنگ ہے روم روانہ ہوگیا اور تو یاد رکھ کہ اگر اب بھی تو اپنے افعال سے تائب نہ ہوئی تو بہت قریب ہے وہ وقت کہ اٹلی تیرے ساتھ تمام ٹرکی کو مزہ چکھادے

(۷)

ستمبر ۱۱ء ختم ہو رہا ہے اٹلی کے خونخوار حملہ نے طرابلس کے مسلمانوں کو خاک میں برباد کر دیا قسطنطنیہ میں بچہ بچہ کی زبان پر یہی چرچا ہے آبنائے باسفور کے کنارہ شام کے قریب ادہم اپنی محبوبہ مریم کو ساتھ لیئے غروب ہونے والے آفتاب کا لطف اٹھا رہا ہے۔ ہوا کی رفتار دھیمی تھی اور پانی اطمینان سے بہہ رہا تھا دونو میاں بیوی آبنائے کے کنارے کنارے اس طرف نکل گئے جہاں چند کھجور کے درختوں کے سوا اور کوئی نہ تھا مریم نے رخ نازک سے برقع اٹھا کر ادہم کو دیکھا اور کہا۔

کیسی خوشگوار ہوا ہے؟

ادہم۔ مگر میری رقیب ہے اس لیئے کہ ان سیاہ بالوں کے ساتھ جو صرف مجھ سے کھیلنے کے لیئے بنائے گئے ہیں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے۔

مریم۔ تمکو ہر وقت ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ ہاں بتاؤ؟ تم نے طرابلس کے متعلق کیا فیصلہ کیا حمیت اسلام تم سے گئی گذری ہوئی اور ایسی حالت میں کہ ظالم اطالیہ تمھارے بہن بھائیوں پر ایسے ستم توڑ رہی ہے تم اپنی زندگی کی پروا کرتے ہو اس وقت کو یاد کرو جب ۶۶۸ء میں حضرت ایوب انصاری علمبردار اور چند بادیہ نشین عرب

دار الخلافہ قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے اور بہ حالت ناکامی انکی زبانوں سے یہ لفظ نکلے کہ ہمارے خون کا ہر قطرہ جو اس سرزمین پر گرا ہے ضائع نہ جائیگا ہم بیج بو چلے ہیں اور اور قریب آرہا ہے وہ وقت کہ اس خون سے سرسبز و شاداب پھول کھلینگے اور کرسچنستان اسلام اس سرزمین پر لہلہا رہا ہوگا ہمارے رسول (صلعم) کا ارشاد پورا ہوگا اور آیا سمجھو وہ وقت کہ مسلمان اس ملک کے مالک ہوں گے۔

ادہم! پیارے ادہم! آخیر میرے نہیں تمھارے باہمت شجاع سلطان محمد ثانی کی تلوار آٹھ سو برس کے بعد ۱۴۵۳ء میں اس سرزمین پر چمکی حسن و اعتقاد کے دریا اسکے دلمیں لہریں لے رہے تھے۔ اور حدیث نبوی کی تکمیل اس کا یقین کامل تھا اسکو جو کچھ کرنا تھا وہ کر گیا اور اب تمھارا فرض ہے کہ اسلام کی لاج رکھو اور اس سے پہلے کہ البطالیہ طرابلس پر قابض ہو تم اپنے ملک اور قوم پر سے قربان ہو جاؤ۔

مریم کی یہ گفتگو تیر کی طرح ادہم کے کلیجہ میں گڑ گئی مگر ساتھ ہی اسکی بدگمانی نے اس کا حوصلہ پست کر دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ مجھکو طرابلس بھیجنے کے بعد مریم محل سے معافی مانگنے کے لیے قریۃ الیہود جانا چاہتی ہے وہ خاموش ہو گیا اور کچھ جواب نہ دیا

(۸)

۲۸- اکتوبر ۱۹۱۱ء کی وہ تاریخ جس میں البطالیہ نے طرابلس میں قتل عام کیا ہے ٹھیک وہی پندرھواں روز تھا جب محل کے واپس آنیکی خبر تھی قسطنطنیہ کے در و دیوار اپنے بیکس اور بے بس بھائیوں پر خون کے آنسوؤں سے رو رہے تھے اور شجاعان عرب تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے ہوئے چاروں طرف غصہ میں جھومتے پھرتے تھے گو طوفان خیز سمندر بیچ میں حائل تھا مگر البطالیہ کے مظالم انکی آنکھ کے سامنے تھے دانہ پانی انپر حرام تھا ہر چند کوشش کرتے تھے کہ میدان جنگ میں پہونچ جائیں مگر کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا مغرب کی نماز سے فراغت پاکر ادہم ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں گھر کیطرف لوٹا آخری فیصلہ جو اس نے اپنے دلمیں کیا یہ تھا کہ اگر مریم چند روز

کے واسطے قاہرہ چلی جائے تو میں نہایت خوشی سے میدان جنگ میں پہنچ جاؤں یہ فیصلہ چونکہ مریم کی مرضی کے عین مطابق تھا وہ شاداں و فرحاں گھر میں داخل ہوا مگر دیکھتا کیا ہے کہ مریم اور بڑا بچہ محمود دونوں غائب ہیں ہاں مریم کی یاد گار اور گیارہ برس کی محبت کا آخری ثمر معصوم شیر خوار بچہ تنہا دودھ کے واسطے تڑپ رہا ہے۔

ادہم کی آنکھوں سے یہ دیکھکر دنیا اندھیر ہوگئی بچہ کو گود میں اٹھایا بہلانے کی ہر چند کوشش کی مگر اس مظلوم کی زبان پر اسی سے لگی بہتیری کوشش کیں دودھ پلانا چاہا لیکن ماں کی گود کا فراق ایک ایسا ظلم تھا جو ان سے نہ ٹلا تاروں بھری رات ادہم کے سر پر تھی اور ہوا کا ہر جھونکا مریم کی بیوفائی قریۃ الیہود کی بے اعتنائی کی صدا دے رہا تھا احمد رات کے آخر حصہ میں ملفوف باپ کی گود میں تھا کہ ایک ہچکی آئی اور گیارہ مہینہ کا لال باپ کی گود میں دودھ کو ترستا اور باپ کا منہ تکتا دنیا سے رخصت ہوا۔

قریۃ الیہود کی خاک چھانی قسطنطنیہ کی گلیاں اور کوچے دیکھے ممکن کوششیں کر ڈالیں اور مریم کی تلاش میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا مگر جدھر بھی پہنچتا تھا ناکام اور جہاں جاتا تھا مایوس مریم جیسی محبوبہ کی وفا اور ادہم کی زندگی پر ایسی بجلی گری جس نے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کر دیا۔ اب بقیہ زندگی زہر معلوم ہونے لگی اور بالآخر دل نے صلاح دی کہ اس دنیا کو سلام اور اس کے تعلقات کو الوداع مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ خودکشی حرام موت ہے۔ طرابلس پہنچکر شہادت کا درجہ حاصل کروں اور ملک و قوم پر سے فدا ہو جاؤں اس خیال کی تکمیل میں اب کیا چیز سد راہ تھی بھیس بدل مصر کی راہ لی اور شروع نومبر میں نخلستان جا پہنچا۔

(۹)

اللہ اللہ بحر پیس ہزار خانماں برباد واقف و معمولی عرب اور ترکوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ مسلح فوج آمادۂ پیکار ہے جس کے آرام و آسائش کی ذمہ دار سلطنت ایطالیہ ہے غازی انور بے جس کا نام ہمیشہ تک جریدۂ عالم فانی کی پائدار رہیں اپنے اعمال افعال کی بازپرس کے واسطے میدان حشر میں جمع ہوں گے تم چہار دہم کی طرح صفحۂ تاریخ پر چمکیگا ان بدنصیب عربوں کو جن کے بھائی بند

الطالیہ کے ہاتھوں موت کی چاشنی چکھ چکی اور جنکی عمریں کاشتکاری میں بسر ہوئیں ادھر اُدھر سے جمع کر رہا ہے اور انسے کہہ رہا ہے کہ شجاعان عرب تمھاری رگوں میں آجنک ہاشمی خون دوڑ رہا ہے الطالیہ نے جن بیرحمی اور سنگدلی سے تمھارے گھر اجاڑے ہیں اس کا جواب دو۔ مارو یا مر جاؤ۔

۲۵ دسمبر ۱۱ء کو جب تمام مسیحی دنیا رنگ رلیاں منا رہی تھی روسیاہ جنرل کینوا کے حکم سے الطالیہ کے ایک پلٹن طرابلس کے اندرونی حصہ میں روانہ ہوئی اور چند بڈھوں اندھیوں ضعیفوں اپاہجوں معصوموں اور عورتوں کو پابہ جولاں مرد و دازلی کے حضور میں لائی مریض جسمانی تکالیف سے کراہ رہے تھے اور عصمت کی دیویاں اسلئے کہ ہاتھ بندھے ہوئے تھے اپنے منہ نقلوں میں چھپا رہی تھیں مرد ضعیف بستہ کئے گئے بچوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں اور عورتیں ہنسہ کئیں۔

طرابلس کی سرزمین کا ہر ذرہ اپنے ہموطنوں پر خون رو رہا تھا کہ گولیوں کی باڑ نے ان مظلوموں کو شربت شہادت پلا دیا (۱۰)

شہسوار مشرق جس روز اپنے ساتھیوں حضرت مسیح علیہ السلام کو انیس سو گیارہ سال ختم کرنیکے بعد بارہویں سال کا پیغام لایا ہے غازی انور بے تین ہزار کے قریب عرب اور ترکوں کو ساتھ لیکر الطالیہ کے اس مورچہ پر ٹوٹ پڑا جسکی حفاظت کے واسطے اٹھارہ ہزار مسلح لشکر موجود تھا ساحل کی جنگی توپیں مجاہدین پر آگ برسا رہی تھیں اور ایک نوعمر ترک مشکی گھوڑے پر سوار بآواز بلند پکار رہا تھا۔ بہادروں! کلمہ طیبہ کی حفاظت میں گلے اپنی سر و سینہ کو اور سنگینیں اپنے کلیجہ سپر عمر فاروق علی مرتضیٰ خالد ابن ولید کے جانشین آج تم ہو قدم پیچھے نہ ہٹے بزدل الطالیوں کے چھکے چھوٹ چکے ہیں آگے بڑھو بچ گئے تو طرابلس کے مالک کام آئے تو درجہ شہادت۔ چلو چلو کلمہ پڑھو اور بڑھے چلو

الطالیہ نے بھی اس موقعہ پر غیر معمولی شجاعت دکھائی دونو طرف سے توپخانہ اپنا کام کر رہا تھا اور جری ترک بھاڑ کیطرح بھن رہے تھے کہ دفعتہً مائب کمانڈر دسی نوجوان گھوڑی کو ہمیز کرتا توپچی کیطرف چلا غضبناک گولے برس رہے تھے مگر اسکا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا اتفاقاً بہادر توپچی کے سر پر تھا اور پیاسی تلوار اسکی گردن پر وہ اسی طرف کی گولہ باری

بند ہوتے ہی مجاہدین الا اللہ کے نعرے لگاتے ہوئے مورچے پر جا پہونچے اور ہزاروں اطالیونکو تہ تیغ کر دیا اس مورچہ کی فتح وہ فتح ہے جو یکم جنوری کو ترکوں کے لشکر موج ظفر کو حاصل ہوئی مگر فتح کے بعد وہ چند لمحہ نہایت دردانگیز تھے جب نائب کمانڈر ایک لاش کو خاص اہتمام سے دفن کر رہا تھا۔

غازی انور بے:۔ "یہ آپ کا کوئی عزیز ہے"؟

نائب کمانڈر:۔ "جی ہاں! یہ میرا شوہر ادہم ہے"۔

انور بے:۔ "شوہر؟"

نائب کمانڈر:۔ "جی ہاں! میں قریۃ الیہود کے مشہور رئیس موسیٰ کی بیٹی مریم ہوں جو اسلام پر ایمان لائی اور ادہم سے نکاح کیا ۲۸ اکتوبر کے خونریز واقعہ کی خبر مجھکو قسطنطنیہ میں پہونچی اور میں طلاع ادھر روانہ ہوگئی بڑا بچہ میرے ساتھ ہے اسی جنگ میں ایک ہی لیکن چھوٹا بچہ چونکہ شیر خوار تھا اسکو وہیں چھوڑ آئی ادہم میرے بعد اسلئے کہ شرکت جنگ میری خواہش تھی بہبیں مل کر یہاں آیا افسوس ہے اس سے صرف اسوقت مل سکی جب وہ دم توڑ رہا تھا اور مجھ صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ احمد جسکو میں گھر میں چھوڑ آئی تھی اسی رات مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا مریم کی تقریر سے تمام لشکر میں ایک سناٹا چھا گیا عرب اور ترک اس کے پاؤں آنکھوں سے لگاتے اور اب مریم اپنے بڑے بچہ محمود کو ڈھونڈھنے نکلی مگر جب وہ زندہ نظر نہ آیا تو لاشوں کی طرف گئی اور ایک لاش کو دیکھکر ٹھٹکی۔ یہ اسکا لخت جگر محمود تھا۔

میدان جنگ سے جو خط مریم نے اپنے حقیقی دیور کاظم آفندی کو لکھا ہے ہم اسکی نقل درج کرکے بالفصل اس کہانی کو ختم کرتے ہیں۔ (۱۱)

کاظم آفندی! تم لوگ سمجھ رہے ہوگے کہ مکار بھاوج دغا دیگئی، آخر یہودن تھی، دھوکے باز نکلی، مگر تمہیں تعجب ہوگا یہ سنکر کہ بھاوج اس نمک کا حق ادا کر رہی ہے جو اس نے مسلمان خاندان کا کھایا تھا اور اس قرض کو پورا کر رہی ہے جو کلمہ توحید نے اسپر اسوقت مقرر کیا جب وہ خانۂ خدا میں اسلام لائی، احمد کی موت کانوں سے سنی، ادہم اور محمود کی آنکھوں کے

سامنے شہید ہوئی، عمر بھر کی کمائی چشم زدن میں برباد اور گیارہ برس کا ساتھ ایک آن واحد میں ہمیشہ کو چھوٹ گیا بہری گود خالی اور پُر لطف زندگی اجاڑ ہوگئی، قسطنطنیہ کے عالی شان مکانوں میں آرام کرنے کے بجائے آہم نخلستان کے درختوں میں بسیرے لے رہے ہیں، ہوا کے طوفان آسمانی اولے اور مینہ کی جھڑیاں ہمارے سر پر ہیں، گھوڑوں کا دانہ ہماری خوراک ہے اور جنگل کا گھاس پھوس ہمارا اوڑھنا بچھونا، آنکھیں ادہم کی صورت کو اور کان پیارے بچوں کی آواز کو ترس گئے، مگر دل اس نبی برحق کی محبت میں چور ہو رہا ہے جسکے دندان مبارک شہید ہوئے اور جسکی پاک سے رخسار کی تلملیاں ہیں کاظم آفندی تم اور تمھارے وہ بھائی جو مسلمان ہونیکے مدعی ہیں کس دل سے آجکل پیٹ بھر کے کھا رہے ہیں۔ جبکہ ہمکو کئی کئی وقت کے بعد مٹھی بھر دانے میسر آتے ہیں کاظم آفندی ایک یہودن کے دودھ سے پلنے والی عورت جس نے تمھارے اسلام پر اپنے لال نثار کئے شوہر کی قربانی چڑھائی بآواز بلند کہتی ہے کہ تمھارا کھانا تمکو حرام ہے جبتک تم اپنے دسترخوان سے ایک ٹکڑا اٹھا کر ان خاتمان ریاضت تک نہ پہنچاؤ جو اپنے کلیجوں کے ٹکڑے برابر کے بھائی بند ہی ماں باپ گنوا کر صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حفاظت کر رہے ہیں کیوں کاظم آفندی کیا وہ لوگ تمھاری ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں جو اپنے خون بھا کر طرابلس کی مسجدوں کو اوقات سے بچا رہے ہیں کہ انمیں اللہ اکبر کے بدلے تثلیث کی آوازیں گونجیں کاظم آفندی! جب تمھارے دسترخوان انواع و اقسام کے کھانوں سے چنے ہوئے ہوں تو ان مصیبت ماروں کو یاد کرو جو کراکو کی خاتونیں اس سچے پیغمبر کے دین کی حمایت کر رہی ہیں جس کا کلمہ تم بھی پڑھتے ہو، یہ وہ بدنصیب ہیں جن کے گھر لٹ گئے جن کے پیارے کھیت گئے جوان جوان بیٹیاں انکی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا رہے ہیں اور عصمت کی دیویاں انکی ساتھی شہید ہو رہی ہیں کیوں کاظم آفندی کیا ان بھائی بہنوں کا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ روئے زمین کے مسلمان اپنے دسترخوان سے ایک ایک روٹی کی قیمت انکو بھیجدیں۔

ناظرین تمدن اپنا چندہ اخبار زمیندار لاہور کی معرفت روانہ کر سکتے ہیں ایڈیٹر

تاسّف

ستم برپا کیا پھر اے دلِ ناشاد ماں تو نے
کہ چھیڑی عہدِ ماضی کی غم افزا داستاں تو نے

تری غفلت پرستی نے رکھا محوِ طرب تجھکو
سُنی گو بارہا بانگِ درائے کارواں تو نے

تری تفسیرِ یک دم بھر کی تراسرمایۂ عشرت!
نہ پایا بیخبر ذوقِ نشاطِ جاوداں تو نے

نہ سمجھا معنیِ نفع و ضرر بازارِ ہستی میں
ہوائے سُود میں دیکھا فقط روئے زیاں تو نے

تری لائی ہوئی تھی جو بلا ٹوٹی تری سر پر
عبث چھیڑا ہے یہ ذکرِ جفائے آسماں تو نے

کوئی ہمدرد بھی دیکھا کوئی غمخوار بھی پایا؟
سُنجھوں کو تو سنائی دردو غم کی داستاں تو نے

زبانِ آذرینِ خلق سے کچھ کام بھی نکلا؟
دکھائیں تو بہت رنگینیاں تو نے

نہ دیکھی کیا کوئی خوبی بہار لالہ و گل میں
کہ گلشن سے اُڑایا جا کے بس رنگِ خزاں تو نے

مصیبت کیا پڑی تجھپر کہ گویا دست و پا ٹوٹے
دکھائی اپنی کمزوری بوقتِ امتحاں تو نے

اُبھرنے کی کوئی صورت نہیں بحرِ معاصی سے
ڈبویا لاکے مجھکو اے خرد دشمن کہاں تو نے

یہی ہوگا کہ آلودہ کرے اس خاکِ اقدس کو
اگر پیدا کیا شوقِ سجودِ آستاں تو نے

مجھے تو خود نظر آتا ہے تُو اک خاک کا تودہ
گرائی کس پہ برقِ نالۂ آذر فشاں تو نے

تری فریاد نے کھینچا دلِ شیخ و برہمن کو
طلسمِ تازہ باندھا وحشتِ جادو بیاں تو نے

مہر و فرزند بیگم } یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی ہی اور اب عصمت الخینسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہی قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دلکشی سے تعلق رکھتی ہی قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہی قیمت ۸ر منیجر عصمت تمدن دہلی

زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ

محبت، ۔ وہ پری جس کے عالم شمول بازوؤں کے سائے کے نیچے، میں بھی زندگی بسر کرتا ہوں۔ شکر ہے مجھے قاہرہ تک تو لے آئی۔ اس کی تفصیل اب آپ نہ سنیئے کہ آیا میں سینہ پر سکوں لیکر آیا تھا اور متہیج لے کے نکلا یا متہیج لے کر آیا تھا اور پر سکوں لے کر نکلا۔ بازار مصر میں تنہا میں ہی اک پر شوق مگر بے مایہ خریدار نہیں آیا ہوں۔ اک سوت کی انٹی والی مجھ سے پہلے بھی گذر چکی ہے۔ بازار میں برقی روشنی ہو رہی تھی، اور از بکیہ یہ اس حصہ شہر کا نام ہے جہاں میں ٹھیرا تھا۔ ایک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ وہ ادیب شہیر و استاد محترم، شبلی جس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے، اپنی علمی صحبتوں میں جو ان کے ساتھ ہو علی گڈھ سے خدا جانے کہاں شاید لکھنؤ چلی گئیں اپنے شاگردوں کو اپنا اور قدیم اُستادوں کا کلام سنا سنا کر طلبہ میں مذاق سخن پیدا کرتے تھے۔ میں بازار مصر میں آپ یہ نہ خیال۔ فرمائیں کہ میں بار بار بازار مصر بازار قاہرہ کی بجائے صرف ایک لفظی رعایت کی وجہ سے کہتا ہوں، اہل مصر شہر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔ نکلتے ہی ایک مصرعہ میرے زبان پر بیساختہ آگیا:۔ ڈانڈا ملا دیا ہے حبش سے تتار کا۔ وہیں مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ یہ مصرعہ مولانا شبلی کے زبان سے سنا تھا بمصرع تھا یا پورا شعر، جو انہوں نے فرمایا تھا یہ یاد نہیں مگر میں اسے بار بار دہراتا رہا۔ یہاں کی حالت پر وہ بلفظہ صادق آرہا تھا۔ ہمارے شعرا کی سحر و شام کا اجتماع جیسا میں نے یہاں دیکھا اور کہیں

نظر نہ آیا جس قہوہ خانے میں گھس جاتے، جس ٹرامو ے پر سوار ہو جائے، اک حبشی زادۂ شب رنگ کے پہلو میں ایک ترک سمن پر بیٹھا ہوا ہے۔ شب دیجور اور صبح صادق ایک ہی میز پر کھانا کھا رہی ہیں یا چائے پی رہی ہیں۔ (معلوم ہوتا ہے ابھی تہذیب میں مصر نے بالکل ترقی نہیں کی، ٹرانسوال سے اور ہندوستان کی ریلوے کمپنیوں سے چند درس گویاں مدنیت وہاں بھیجدینے چاہییں)

کھانیکا وقت تھا، اور میں بھوکا بھی تھا۔ ایک کھانے کے ہوٹل میں۔ یا یہاں کی اصطلاح میں لوقنطہ میں۔ میں بھی جا بیٹھا۔ میں جب کبھی ہندوستان سے باہر آیا؛ ہندوستان کی ایک خصوصیت کا خیال بہت شدت کے ساتھ دماغ میں آیا۔ مصر بہت سی باتوں میں ہندوستان سے مشابہ ہے۔ موسم ملتا جلتا ہے، پیداوار قریب قریب یکساں ہے۔

باشندوں میں اختلاف مذاہب بھی ہندوستان کی طرح ہی شدید ہے۔ نئی اور پرانی تہذیبیں دونوں یہاں بھی ہندوستان کی طرح جلوہ گر ہیں؛ ہندوستان کی مانند یہاں بھی طرز قدیم اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیئے مدافعانہ گو مذبوحانہ کوشش میں مصروف ہے، اور طرز جدید حملہ کناں ہے۔ سیاسیات میں ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے مخاصمانہ تعلقات کا چربہ مصر میں قبطی اور مسلمانوں کے تعلقات نے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی اوتارا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر طرز معاشرت میں وہ یکسانیت ہے جسے آنکھیں ہندوستان میں حسرت سے ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں، یکسانیت ہی نہیں اشتراک بھی ہے۔ اجزارات کو دیکھیئے تو آپ کو یہ خیال ہو کہ قبطی اور مسلمان ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، مگر ہوٹلوں میں، تناول خانوں میں، اور گھروں میں جایئے تو دیکھیئے گا کہ ایک دوسرے کو نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کھاتا ہے بسیاسی اور پولیٹکل سب وستم مصر

میں بھی ایک فن لطیف ہوگیا ہے، مگر دونوں جانب کے استادان فن عربی ہی میں اپنا کمال دکھاتے ہیں: اور میرے خیال میں داد طلبی کے لیے یہ لازم بھی ہے شاعر کہتا ہے۔

سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں مزا لینے والے مزا لے رہے ہیں

ہمنے فرض کیا کہ سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں اور یہ بیحد جائے مسرت و خوشی ہے۔ لیکن مزا لینے والے تو مزا اسی وقت لے سکتے ہیں جب وہ ان گالیوں کو سمجھیں۔ یہاں یہ کوشش ہے کہ گالیاں تو ضرور دی جائیں، بغیر اس کے زندگی ایک بارگراں ہوجائے گی، مگر ہم ہندی میں گالیاں دیں گے تم اردو میں اور یہی نہیں بلکہ ہمارا اور تمھارا ہر چیز میں تیل پانی کا ساتھ ہونا ظاہر کیا جائے۔ ہم دھوتی پہنیں گے تم پاجامہ پہنو اور ہاں دیکھنا کہیں کھانا ایک جگہ نہو۔ تنہا خوری الی الابد تنہا خوری!

مصر میں دوسرا ہی منظر پیش نظر ہوتا ہے ہمصر میں کیا ان تمام ممالک میں ایک ہوٹل میں آپ کھانا کھانے کے لئے تشریف لیجاتے ہیں۔ تمام خدام یا ایٹرین ہیں، یا یونانی یا ارمنی جنین، سرخ و سفید لڑکے اعلیٰ درجے کا سیاہ کھانیکا سوٹ پہنے ہوئے، نہایت صاف ستھرا کالر لگائے ہوئے، صاف شفاف قمیص جس کے کف اور فرنٹ (سامنے کا حصہ) روشنی میں چمک رہے ہیں زیب بر پیکے آپ کی پذیرائی کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ سب صاحب لوگ ہیں۔ اس بات کو آپ ہرگز نہ بھولیے گا کہ اگر آپ کی ملاقات کلکتہ میں، یا بمبئی میں نہیں سے کسی سے ہوگی تو یہ آپ سے بات کرنی بھی ہتک عزت سمجھیں گے۔ ہندوستان پہونچکر ارمنی بھی اپنے تئیں ایرانی ہندیں سے شمار کرنے لگتے ہیں اور یونانی بھی۔

آپ داخل ہوتے اور یہ غلماں پری تمثال دوڑ کر آئے اور آپ کو گھیر لیا؛ ایک کہتا ہے "اہلاً وسہلاً" ایک کہتا ہے "تفضل" ایک آپکو آپکا اوور کوٹ اتارنے میں مدد دیتا ہے، ایک نہایت ادب سے آپ کے ہاتھ سے چھڑی لیتا ہے، ایک میز کے پاس ایک کرسی کو آپکے لیے گھسیٹتا ہے؛ اور فوراً کھانے کی فہرست آپ کے سامنے لاکر پیش کرتا ہے۔ آپنے کھانا انتخاب کر کے اُسے لانے کو کہا۔ وہ آپسے استفسار کے طور پر پوچھتا ہے "نعم یاسیدی؟" آپ چونک اُٹھتے ہیں۔ ان لبوں سے "یس سر" کی توقع ہوتی ہے، اور کہتے ہیں وہ "نعم یاسیدی" ایک دم آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ مصر میں ہیں۔ کھانا لایا جاتا ہے۔ طریقہ انگریزی ہے، لانے والے یورپین ہیں؛ آپکو دماغ سے پھر یہ واقعہ نکل سا جاتا ہے کہ آپ پارس ہیں یا روما میں نہیں ہیں کہ اتنے میں عین آپ کے سامنے، مقابل کی کرسی پر، الف لیلہ کے صفحات میں سے ایک تصویر نکل کر آ بیٹھتی ہے اور نہایت بے تکلفانہ اور بے دھڑک طریقہ سے، ٹمن چاپ کے لیے حکم دیتی ہے۔ وہی الف لیلہ، کا عبا ہے، وہی ہارون الرشید کے زمانہ کا قبا ہے، وہی عمامہ ہے اور جمال رُخ روشن ہے وہی۔ امان! یہ مولوی صاحب اس صفائی سے بیٹھے ہوتے ٹمن چاپ اُڑا رہے ہیں! پاس والی میز پر دو اور حضرات، ایک قبائے عربیت میں، ایک رخت مدنیت میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، آکر بیٹھتے ہیں۔ آپ دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف بھی دیکھتے ہیں اور اپنے دل ہی میں حیران ہوتے ہیں کہ یہ کون ہیں۔ قبائے عربی آمرانہ لہجے میں کھانے کو حکم دیتا ہے۔ غلمان جنت کے زمرے کا ایک غلام، ان کے لیے بھی کھانا لاتا ہے۔ یہ منظر اب آپ کے لیے معمولی ہوگیا ہے؛ آپکے سامنے پہلے ہی سے ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے ٹمن چاپ خوری کر رہے تھے،

مگر یا لعجائب! یہ کیا؟ قبائے عربی کے سامنے گلاس اور بوتل لاکر رکھی جاتی ہے اور وہ کاگ کھول کر ایک گلاس اُس عرق کا جس کا تیز بھپکا آپ کی ناک سے گزر کر دماغ کو ٹکرا کر یہ کہتا ہے، میں شراب ناب ہوں۔ کچھ اور نہ سمجھئے گا" اپنے رفیق کوٹ تپلون کو دیتا ہے۔ اور پھر ایک گلاس اپنے لئے بھی بھر کر، نہایت اطمینان سے تلچھٹ تک پی جاتا ہے! یہ دُردِ آشام آپکے رہے سہے حواس باختہ کر دیتا ہے۔ یہ جامۂ تقوے، یہ لباس مشروع اسلام اور علناً مصاحبتِ صراحی وجام! محتسب کہاں ہے؟ عسس کدھر ہے؟ مگر تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ مسلم صورت، بس بصورت مسلم ہے؛ یہ اور اس کے، آبا و اجداد اسلام سے اسیقدر دور رہے ہیں جس قدر مثلاً ریورنڈ زویمر حضرت نصرانی ہیں؛ اور یہ کٹر متعصب دشمنِ اسلام نصرانی۔ انہیں اس پر فخر ہے کہ ہمارا خاندان شیوع اسلام سے پہلے عیسائی تھا اور اب تک عیسائی ہے۔ یہ قبطی ہیں۔ نیل مبارک اسلام نے تمام مصر کو سیراب کیا، مگر قبطی بادیہ خشک ہی رہا۔ اور ابتو اس بادیہ سے وہ جھکڑ چل رہے ہیں؛ اس شدت کی بادِ سموم اُٹھ رہی ہے کہ مصر کی مذہبی شادابی معرضِ خطر میں ہے۔

مگر میں اخفاءِ حقیقت کا مجرم ہونگا اگر میرے اس قدر لکھنے سے آپکے دل پر یہ اثر ہو کہ مصر کے ہوٹلوں میں اسلامی لباس پہنے جو لوگ جام بکف نظر آتے ہیں، وہ سب قبطی نصرانی ہیں؛ یہ صحیح نہیں۔ وہ سب قبطی نہیں؛ انمیں سے بعض قبطی ہیں لیکن اکثر اور بیشتر مسلمانانِ مصر ہیں یا کلمہ گویانِ شام! یہ اُن لوگوں کا حال ہے جو اپنا پُرانا قومی لباس پہنے نظر آتے ہیں۔

رہا نوجوان مصر، جو اپنے کپڑے پیرس سے سلوا کے منگواتا ہے؛ جو مراقِ فیشن میں انگریزی رنگیلے رسیلے فوجی لفٹنٹ سے بھی کئی منزل آگے نکل گیا ہے؛

یہ نوجوان مصر، یا بقول خود انکی اصطلاح کے،

"مصر الفتاۃ" اسکی نہ پوچھیے۔ انکی زندگی عجیب زندگی ہے۔ اول تو یہ دن بھر سیر سپاٹے میں بسر کرتے ہیں، اور شام کو گھر آتے ہیں؛ آرام لینے اور سونے کی غرض سے نہیں، کیونکہ ان وظیفہ شناسان فرض عشرت کے قسمت میں گھر پر بیٹھنا اور آرام لینا کہاں لکھا ہے۔ انہیں تو گھر پر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا؛ یہ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف کپڑے بدلنے کے لیئے؛ پیرس کے کسی صنعت کار کے ہاتھ کا (جو درزی گری کو بھی شاعری اور مصوری کے ہمراہ فنون لطیفہ بھی شامل کیئے جانیکا بحق مدعی ہے) سلا ہوا سوٹ پہنکر مصر الفتاۃ باہر نکلتا ہے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر وہ ہر شب گھر سے بھوکا ہی نکلتا ہے اور کسی رستاران (تناول خانہ) میں جاکر کھانا کھاتا ہے۔ رستاران میں، میں نے غلط کہا، رستاران کے باہر سڑک پر کھانا کھاتا ہے۔ قاہرہ کے فیشن ایبل بازاروں میں جایئے۔ دور تک سڑک کے دونوں طرف دوکانوں کے سامنے پٹریوں پر قطار در قطار چھوٹی میزیں لگی ہوئی ہیں، گرد دو دو چار چار کرسیاں پڑی ہیں۔ میز پر سفید شفاف چادر بچھی ہوئی ہے۔ دلدادگان فیشن، ان پٹریوں پر لگی ہوئی میزوں پر جاکر کھانا کھاتے ہیں خلقت جوق جوق گذر رہی ہے یہ اس عالم گذران کا تماشہ بھی کرتے ہیں اور کھانا بھی کھاتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ میں اپنے دل میں انہیں قابل مواخذہ نہیں سمجھتا۔ مصر کے اس صاف نیلگوں چادر کے نیچے، اس قدرتی مکوکب شامیانے کے تلے، رہنے کو (جس کی چھت میں جڑے ہوئے موتی اور ہیرے ایسی دلاویزی سے چمکتے ہیں؛ یوں کیوں نہ کہوں ساکنان ملاء اعلی جہاں سے شرارت

یونان کنان خطۂ خاک کی طرف آنکھ مارتے ہیں) انسان کا دل اس طرح بے اختیار ہو کر چاہتا ہے کہ مصر کی بناہاتے محتشم جن کی بنانے میں فراعنۂ قدیم، اور مغرب سے آئے ہوئے فراعنۂ حال نے اپنی ہمتیں صرف کی ہیں، اپنی طرف بلاتی ہی رہ جاتی ہیں۔

آسمان، ہمارے ہندوستان کا بھی صاف ہے، اور دلکش۔ مگر کم ایسا ہوتا ہے کہ اس گنبد اخضری میں کہیں سفید پلاسٹر سے مرمت نہ کی گئی ہو۔ آسمان مصر اپنے پورے معنوں میں گنبد اخضری ہے۔ آپ دوربین لگا کر بھی دیکھیں تو آپکو کہیں لکۂ ابر نظر نہ آئے گا۔

اور اس وقت آپ کو شاعر کا قول نہایت درست معلوم ہوگا:

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(یلدرم)

اخلاق عزیزی یا پارس اوف سنیکا - مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کورٹ انسپکٹر لکھنؤ نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے تمام ملک پر احسان کیا ہے جس کے مطالعہ سے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے نوجوان طلباء کے واسطے یہ کتاب خصوصیت سے مفید ثابت ہوگی اوڈکمسٹ بک کمیٹی کا اس کتاب کو پسند فرمانا قابل مصنف کی حوصلہ افزائی ہے جو یقیناً حق بجانب ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہم مولانا کو خلوص سے اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

قیمت حصہ اوّل ایکروپیہ آٹھ آنہ (۱۸/) حصہ دوم۔ بارہ آنہ (۱۲/)

صاحب مصنف سے مل سکتی ہے

کلام شاد

سید الشعرا خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی عم فیوضہٗ

(رباعیات)

کیا مفت کا زاہدوں نے الزام لیا — تسبیح کے دانوں سے عبث کام لیا
یہ نام وہ تھا جسے بے گنتی لیتے — کیا لطف جو گن گن کے ترا نام لیا

کھلنے کے لیے جہاں میں کیا کیا نہ کھلا — تقدیر کا راز اب تک اصلا نہ کھلا
کیا علم کہ کیا لکھا ہے پیشانی میں — افسوس اسی خط کا لفافہ نہ کھلا

دنیا میں جو ہیں بھی تو نہ ہونے کی طرح — جاگے بھی کبھی کبھی تو سونے کی طرح
ہنسنا تو بھلا ہم کو بہت مشکل تھا — روتے ہیں کہ روئے بھی نہ رونے کی طرح

دل مورد ایذا و بلا ہوتا ہے — پاداش عمل میں سب بجا ہوتا ہے
جو قرض کہ خوش ہو کے لیا تھا میں نے — وہ سود سمیت اب ادا ہوتا ہے

ہوں مثل حباب کیا ٹھکانا میرا — کٹ جائے گا ایک دم میں زمانا میرا
گر سانس نہ آئے کام سب ہیں برباد — چلتا ہے ہوا پہ کارخانہ میرا

غزل

کچھ کہے جاتا تھا عرق اپنی ہی افشانی میں تھا — مرتے مرتے ہوش باقی ترے دیوانے میں تھا
اے پروانے کا وہ جلنا وہ ترا شمع کا! — میں نے روکا۔ وہ کیا آنسو نکلنے میں تھا؟

یہ نمبر میں تکملہ ہے جو کہ ۲ نمبر سے رہ گیا تھا + چونکہ مالی نمبر صاف چاہتے تھے اس لئے ۲ نمبر میں صاف نہ ہو سکا + اگر قدر دان خریدار ۲ نمبر کا دوبارہ مانگیں تو قیمت ۲ نمبر کی ۲ آنہ ہے

حارث

(۱)

میں کیا تھا؟

مجو درستیٔ عہد از جہاں سست نہاد
کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

آپ جانتے ہیں مفلسی کیا چیز ہے؟ — وہ مفلسی نہیں جس کی شکایت کوئی ڈپٹی کلکٹر یا منصف کرتا ہے، وہ مفلسی نہیں جس کا نام لے لیکر ہمارے رؤسا اکثر اوقات خواہ مخواہ غل مچایا کرتے ہیں! نہیں وہ نہیں۔ بلکہ وہ مفلسی جو تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے تک کی اجازت نہیں دیتی، جو ہمجنسوں کے سامنے گردن اٹھا کر چلنے سے روکتی ہے، جو ہموطنوں سے نظر چار کرنے سے مانع آتی ہے، اور؟۔ اور جو اشرف المخلوقات کو ارذل المخلوقات بنا کر بھی نہیں چھوڑتی! ایسی مفلسی سے میرا مطلب ہے اور ایسی مفلسی کو آپ بھی جانتے ہیں کیا چیز ہے؟۔ آہ۔ یہ ایک چکی ہے۔ احتیاج اور ناداری کے پاٹوں سے ملکر بننے والی چکی ہے۔ جو تمام شریفانہ جذبات اور جائز انسانی خواہشات کو پیستے پیستے سرمہ بنا دیتی ہے! یہ ایک لعنت ہے۔ ناقابل برداشت اور لاعلاج لعنت ہے جس کا ہر وقت قائم رہنے والا اثر بیباکی کے ساتھ بات کرنے اور آنکھ ملانے تک سے روکتا ہے! یہ ایک کیڑا ہے۔ نظر نہ آنے والا اور مردم خوار کیڑا ہے۔ جو دل و دماغ کے اندر ہی اندر ہمت و استقلال کو کھا جاتا ہے، جرأت و خودداری کو چاٹ جاتا ہے، اور ہر قسم انسان کو تباہ کر دیتا ہے، غارت

کر دیتا ہے، فنا کر دیتا ہے!

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج احتیاج ست، احتیاج ست، احتیاج

جس وقت اُسے نظر آتا ہے کہ سوسائٹی کی منظورِ نظر۔ گوشت کی پُتلی، چکنائی اور چربی ہوئی۔ جوان عورت اپنے سرخ سرخ رخسارے دکھاتی، موٹر میں پانوں پھیلائے پڑی ہوئی، اُس کے پاس سے ہوا کیطرح گذر گئی؛ جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ تمول کا پُتلا فیشن ایبل جنٹلمین۔ اعلیٰ درجہ کی تمباکو کے دُھوئیں اُڑاتا، نہایت غرور کے ساتھ پارک کا نظر فریب سبزہ روندتا پھرتا ہے؛ اُس وقت۔ اور خصوصاً اُس وقت مفلس آدمی کا خون ایک ایک رگ میں عسرت کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے، دماغ چکراتا ہے، دل بیٹھتا ہے اور روحِ انسانی۔ زندانِ خاکی میں قید ہونے والی پری آزادی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پانوں مارتے ہوئے چیخ اُٹھتی ہے کہ "یہ اندھا دُھند! بیہودہ طرفداری! کیوں ایک شخص تمول کی زرین جھُول والا حیوانِ ناطق محض ورثہ کی اتفاقی وجہ سے بغیر کسی ذاتی قابلیت کے تمام دنیا کے لذائذ اور عیش و آرام کے مزے لوٹتا ہے؟ اور کیوں میں۔ غریب، مسکین، مصیبت زدہ انسان۔ تمام دن جد و جہد اور انتہائی کوشش کے بعد، رات کو بھی خوش ذائقہ کھانا حاصل نہیں کر سکتا اور پانوں پھیلا کر آرام سے سو نہیں سکتا؟ کیا جوہر آفرینش کے لحاظ سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کی مٹی کا پتلا ہے؟ کیا خلقِ خدا اور ملکِ خدا پر اُسے کوئی خاص حق حاصل ہے؟ اور اگر نہیں:۔ تو پھر یہ ظلم کیوں؟ یہ بے انصافی کیوں؟" ——— واقعی یہ ناقابلِ فہم راز کیوں نظر آتا ہے؟ بنانے والے کے منصف اور عادل ہونے پر بھی

ایسی صریح بے انصافی: اور اس قدر زیادتی کے ساتھ: آخر کیوں؟ زیادہ غور کے ساتھ سوچنے والا۔ بار بار تنگدستی کی وجہ سے اکتا کر سوچنے والا۔ ایک ایک مرتبہ اس نتیجہ پر بھی پہنچتا ہے کہ اس تمام کائنات کا وجود بالکل اتفاق ہی اتفاق پر۔ مادہ کی خودرائی اور خودمختاری پر۔ مبنی ہے! کوئی علیم، دانا، اور خصوصاً عادل اس کا خالق نہیں! یہ ہی وجہ ہے کہ تمول کے بدولت جس کسی کو متمول ہونے کا موقع نیکی یا بدی کے ذریعہ سے ملجائے۔ تمام عیش اور حکومت کے لطف اُڑاتا ہے' ایک ایک چیز کو محض اپنی ہستی کے لیے موجود سمجھتا ہے اور نشۂ دولت میں مست ہوکر برگزیدہ اخلاق کو ٹھوکر مار کر دور پھینکدیتا ہے! آج سے دس سال پیشتر میں بھی یہ ہی سمجھتا تھا، اور غالباً برابر سمجھتا رہتا اگر میری "اپنی بیتی"۔ خوفناک تعجب انگیز مگر سچی سرگذشت۔ میری غلطی مجھے نہ سجھادیتی۔ ان ہی آنکھوں سے نہ دکھادیتی! مگر اُف! وہ خوفناک، ہیبت ناک، تغیر پذیر ہستی۔ جس کو میرے اُستاد یا ادیب رہنے کا موقع ملا۔ کیا چیز تھی؟ میں کانپ جاتا ہوں، میں تھرا جاتا ہوں، میں لرز جاتا ہوں: جب میں دیکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ بنی آدم اسی مکتب میں تعلیم پا رہے ہیں، اسی ناقابل تشبیہ اُستاد سے سبق لے رہے ہیں جس کی زیر نگرانی میں بھی ایک عرصہ تک رہ چکا ہوں! آہ! کیا اچھا ہوتا کہ میں آج سے دس سال پیشتر ہر ایک چیز کو اُن ہی آنکھوں سے دیکھتا جن سے اب دیکھتا ہوں! ہر ایک بات کو اسی طرح سمجھتا جس طرح کہ اب سمجھتا ہوں، اور اُس خاص راز کی اصلیت سے۔ تمول اور افلاس کی گلجھٹی سے۔ ایسا ہی واقف ہوتا جیسا کہ اب ہوں! کیوں؟ اس لیے کہ وہی چیز جس کو میں ناانصافی سمجھتا تھا اب عین انصاف بالکل مساوات کے اصول کیموافق نظر آتی ہے! یہ تو ناممکن ہے کہ جو اعتقاد میں نے تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل کیا ہے اُس کو محض عقلی دلائل سے آپ کے دلنشین

کرسکوں؛ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ میں وُہی حیرت انگیز "اپنی بیتی" بے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کردوں، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تہذیب یافتہ دُنیا کے بہت کم حضرات اس سرگذشت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہونگے! تاہم، میری دلی تمنّا ہے کہ میرے عزیز بھائی بھی اپنی ترقی یافتہ دُنیا کو۔ ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق رکھنے والی دُنیا کو۔ اُس کی تہ تک دیکھ سکیں، اُسکی اصلیت معلوم کرسکیں اور اس بھیڑ کی کھال اوڑھنے والے بھیڑیئے کو اچھی طرح پہچان سکیں!!

معاف کیجئے اگر میں اُس "اپنی بیتی" سے پہلے کچھ اپنی نسبت نہایت مختصر طور پر بیان کردوں، کیونکہ میری پوری حالت کا اندازہ کیئے بغیر آپ اُس نادر سرگذشت کا لطف بمشکل سے حاصل کرسکتے ہیں! میں صفر کے مہینے میں ہنیچر کے دن، رات کے ٹھیک بارہ بجے پیدا ہوا؛ ایسے ٹھیک بارہ بجے، کہ ادھر تو طاق میں رکھے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیئے اور اُدھر میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلی آواز نکالتے ہوئے بِلک بِلک کر رونا شروع کیا! گھنٹے کا بجنا اور میرا رونا، یہ دونوں باتیں اس قدر ساتھ ساتھ ہوئیں کہ میرے محلّہ کی اکثر بوڑھیوں کو۔ جو میری پیدائش کے وقت موجود تھیں۔ اب تک اچھی طرح اور تعجب کے ساتھ یاد ہیں! میری پیدائش کے مہینے، دن، اور وقت کے لحاظ سے۔ اُس وقت کے توہمات کے موافق اکثر عورتوں نے رائے لگادی تھی کہ میں بدقسمت ہوکر جیوں گا اور زیادہ تر بھوت پلید کے خلل میں مبتلا رہونگا! پیشین گوئی کا پہلا حصّہ۔ میرا بدقسمت ہونا نہایت صاف طور پر سچّا ثابت ہوا؛ سب سے پہلی بدقسمتی۔ اور غالباً سب سے بڑی نحوست۔ یہ تھی کہ میں نے مامتا جیسی نایاب اور بے مثل رحمت کا لطف نہیں اُٹھایا اور آغوش مادر میں ہاتھ پانوں مارتے ہوئے۔ اُن محبت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر مُسکرانے کا پاک مزا حاصل نہیں کیا! کیونکہ جس وقت میری آنکھیں اس ناپاک دُنیا میں

پہلی مرتبہ کھلیں اُس کے پورے دس گھنٹے بعد میری ماں کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں! میں ایک جاہل انّا کی آغوش میں دیدیا گیا۔ پلا اور بڑھا۔ مگر مجھے خوب یاد ہے کہ جب کبھی مجھے اُس خشمناک انّا سے چھٹکارہ ملتا، میں لڑکتا لڑکتا اپنی مرحوم ماں کی قبر پر۔ جو مجھ منحوس کی پیدائش پر سے قربان ہوئی اور جس کی قبر میرے گھر کے احاطہ میں ہی تھی۔ جا پڑتا تھا؛ اور یقین کیجئے کہ اُس قبر کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھر مجھے اس قدر اچھے معلوم ہوتے تھے اور وہاں مجھے اس قدر آرام آتا تھا کہ میں تیسرے تعویذ سے لپٹ کر نہایت چین کے ساتھ سو جایا کرتا تھا! یہ ایک فطرتی کشش تھی، یہ ایک ناقابل بیان قدرتی جذبہ تھا، جس کا احساس مجھے اسوقت قطعی نہیں تھا! مختصر یہ کہ پیشین گوئی کا پہلا جزو سچا ثابت ہوا! رہا آخری حصّہ اُس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا! مجھے یاد نہیں کہ میں ایک مرتبہ بھی سایہ سکہ کی وجہ سے بیمار پڑا ہوں؛ ہاں صرف ایک بات کا مجھے خیال ہے کہ میں اسکول میں ابتدائی جماعتوں کے زمانہ میں اکثر اوقات پٹتے وقت اُستاد کو لپٹ جایا کرتا تھا، اور اگر موقع لگ جاتا تھا۔ جیسا کہ کئی مرتبہ ہوا۔ تو استاد کا ہاتھ یا انگلیاں چبا ڈالتا تھا! اسکو آپ بھوت پلید کا اثر سمجھیں یا دماغی جنون بہرحال میں اپنے بچپن میں اکثر اوقات اپنے آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا! میں پٹتا تھا، میں کٹتا تھا میں چار چوٹ کی مار کھاتا تھا، لیکن کیا ممکن جو ایک دن بھی مدرسہ سے بھاگ سکتا! کیونکہ استاد کی مضبوط آہنی آغوش مادر کی فطرتی حمایت میرے لیے نہ تھی، اور رعب پدری ایک دن بھی مجھے مدرسے سے غیر حاضر ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا! میں پڑھتے گیا، اور پڑھتے گیا! یہاں تک کہ میں نے مڈل پاس کیا، انٹرنس پاس کیا، ایف اے۔ پاس کیا، بی۔ اے۔ پاس کیا، اور اب میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکایک میرے والد نے میرے اکیلے سرپرست نے رحلت کیا، اور باوجود میری بیحد دوڑ

دھوپ اور سول سرجن کی انتہائی کوشش کے صرف ایک دن اور ایک رات میں چٹ پٹ ہو گئے! اس کو میری دوسری بدقسمتی سمجھ لیجئے! اس جانکاہ غم کی حالت میں میں امتحان میں شامل ہوا اور ڈگری حاصل کرتے ہی تعلیم کے سلسلہ سے مجبوری کے ساتھ ہاتھ دھو بیٹھا! دو تین مہینہ کے اندر ہی اندر اس تمام جائداد پر جس کو میں ترکۂ پدری میں پانیکا اکیلا مستحق تھا، ایک دو تین کی بولی بولدی گئی اور گھر کے مکان تک پر ڈونڈی پٹ گئی! میرے والد مرحوم کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی سخاوت نے، خدا اُن کی روح نہ شرمائے، قرضہ کا انبار لگا دیا تھا! اور اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی قرضخواہوں نے۔ دھوتی باندھنے والی بنیوں نے منقولہ وغیر منقولہ تمام جائداد نیلام کرا کر چھوڑی! اب میں تھا اور تنہائی، عالم بیکسی تھا اور پریشانی، بھری پُری دنیا تھی اور محض میری ذاتی کوشش! یہ میری تیسری بدقسمتی کہی جا سکتی ہے! میری لیاقت اچھی تھی، میرے خاندانی حقوق کافی تھے، مگر میرے پاس سفارش کا گولا بارود قطعی نہ تھا، اور اسی لیے میں گورنمنٹ سروس حاصل نہ کر سکا! ضرورت برابر مجبور کر رہی تھی اور ساتھ ہی میری طبیعت کا رجحان قدرتی لگاؤ بھی اسی طرف تھا، میں نے ایک اخبار کی ایڈیٹری منظور کر لی! اس ملازمت کا سلسلہ مشکل سے ایک سال قایم رہا! کیونکہ میں نے اُس اخبار میں ایک مرتبہ ایسے مصنف کی تعریف کی جو میری رائے میں نہایت لائق اور طباع شخص تھا، مگر مالک اخبار کی مذہبی آنکھوں میں نیچری تھا! غرض اُس خطا پر مجھے مارا کہ خطا دار نہ تھا، اُس نیچری کی تعریف شائع کرنے پر میں برخاست کر دیا گیا! اب میرے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ مختلف مضامین لکھوں اور اپنی دماغی محنت کو پیٹ پالنے کے لیے کوڑیوں کے مول مختلف ایڈیٹروں کے ہاتھ فروخت کر دوں، اور اسی قلیل آمدنی پر کسی نہ کسی طرح بسر اوقات کروں!

اللہ اللہ و خیر صلاح: نئی روٹی تلاشو رہ! یہ میری پہلی.... دوسری.... تیسری ہاں، چوتھی بدقسمتی تھی!

اب آپ سمجھئے یہ میری زندگی کا مختصر سا خاکہ! میں مضمون نگاری پر زندگی بسر کر رہا تھا، بمشکل اپنا پیٹ بھر رہا تھا، شستم پشتم گزر اوقات ہو رہی تھی کہ دفعتاً میں افلاس کے انتہائی کنارے پر جا لگا! یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میں نے اپنی موروثی جائداد کے نیلام ہوتے ہی وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا، اور تلاش معاش کے لیے بمبئی کو اپنا مسکن۔ گمنام اور خاموش مسکن بنا لیا تھا! کھیتواڑی کی پشت والی گلی میرا پوشیدہ مسکن تھا، اور چال نمبر.... مالا نمبر.... میرا وحشت بھرا آشیانہ تھا! دراصل اس مالے میں ایک زردوز کا کارخانہ تھا جس نے بغل کا چھوٹا کمرہ اپنے طور پر بیس روپے ماہوار پر مجھے دے رکھا تھا! مجھ تنہائی پسند کے لیے وہ کمرہ۔ تنگ و تاریک کمرہ۔ کافی سے بھی زیادہ تھا، اور اس زردوز کا محبت آمیز برتاؤ۔ کیونکہ کئی کئی مہینے وہ مجھ سے کرایہ نہ مانگتا۔ افلاس کی مصیبت میں بزرگوں کی شفقت سے کم نظر نہ آتا تھا! تاہم افلاس۔ فلاکت اور بدقسمتی کا سیاہ بادل۔ میری خاموش زندگی پر چھاتا جاتا تھا، اور میرے دماغ و طبیعت کو علمی قابلیت کے روشن آفتاب کو رفتہ رفتہ اپنی گھٹا ٹوپ سیاہی میں چھپاتا جاتا تھا! نوبت بہ اینجا رسید، کہ ایک روز میں۔ ایم اے۔ او کالج کا ایم اے۔ فقر و فاقہ کے دست بدست اور روبرو تھا!!

آپ یقین کیجئے کہ دسمبر ۱۹۰۵ء کی تیسری تاریخ میرے لیے ایک منحوس ترین دن تھا! میں دن بھر تلاش رزق میں مارا مارا پھرا، پھر بھی شام کو میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی! اسی زمانہ میں، میں نے ایک ناول نہایت دماغ سوزی اور جانکاہی کے ساتھ لکھا تھا؛ لکھا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ کسی طرح اپنی آمد

میں سے تھوڑا بہت بچا کر پیٹ کاٹ کر۔ اُسے خود چھپواتا: مگر نادار کی کا بُرا نہ ہو، وہ گھٹنے کے عیوض بڑھتی ہی رہی اور آخر کار بھوک نے۔ ناقابلِ تسکین شعلۂ جہنّم نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُس تصنیف کو بھی۔ اُس اپنی تنہا ملکیت کو بھی۔ آتش جوع کے نذر کردوں! اُسی کوشے کر میں مختلف ایڈیٹروں کے پاس گیا، لیکن بلا استثنا ہر ایک نے لینے سے انکار کر دیا! جو اڈیٹر صاحب ملاحظہ کرتے۔ اندھا دُھند ورق اُلٹ کر کہیں کہیں سے پڑھتے۔ وہ عجیب ہمہ دانی اور لیاقت کا چہرہ بنا کر فرما دیتے کہ "مسٹر جواں بخت! آپ نے محنت تو واقعی بہت کی ہے، مگر سوسائٹی پر نکتہ چینی سے کیا فائدہ؟ یہ بہت برا رنگ ہے آپ کو زمانہ اور ترقی کے ساتھ چلنا چاہیئے! اور۔ اور غالباً آپ کی یہ اُردو بھی ٹھیک نہیں، آپ کاروبار کی اُردو لکھیں، بالکل ٹھیٹ بازاری بول چال علمی زبان محض لغو سمجھی جاتی ہے؛ غالب اور ذوق کی اُردو اب سوسائٹی پسند نہیں کرتی!" واقعی میں سوسائٹی کے عیوب ایک ایک کر کے گنا تا تھا، میں غالب اور ذوق کی سی اُردو لکھنے کی کوشش کرتا تھا؛ میں تسلیم کرتا ہوں اگر یہ دونوں باتیں عیب سمجھی جائیں۔ تو مجھ میں تھیں اور اچھی طرح تھیں! وہ میرے رنگ میں بیٹھ گئی تھیں، میری فطرت میں ڈوب گئی تھیں، اور اُن کے خلاف لکھتے ہوئے میرا کانشنس مجھے ملامت کرتا تھا! میں دن بھر پھرا، بیسیوں دروازے جھانکے، بہت سی گلیاں چھانیں، مگر شام کے آٹھ بجے جب واپس آیا تو "بیک بینی و دو گوش" ایک بار افکار و الم لیکر واپس آیا! اپنے تنگ و تاریک کمرے میں گھستے ہی میں نے لیمپ جلایا اور ایک عجیب جذبہ کے ساتھ غصہ، نفرت، بیکسی اور مجبوری کے ساتھ۔ میں اپنی ہیچکار تصنیف کو زمین پر پھینکتے ہوئے کرسی پر گر پڑا، گر پڑا، اور بیدم ہو گیا، بیدم ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر آنکھیں بند کر لیں!!

آہ! اے کبھی نہ ماننے والی پیٹ کی آگ، تجھے آگ لگے! آہ! اے بغیر کھائے نہ بجھنے والے شعلۂ جوع، تو غارت ہو! رات کے کھانیکا خیال، بیہودہ خیال! جوئندہ یابندہ کا مقولہ، لغو مقولہ! مجھ سے زیادہ کون جوئندہ کا لقب حاصل کرسکتا ہے؟ مگر آہ! مجھ سے زیادہ کون یابندہ کی حالت سے کوسوں دور ہے؟ اے برابر بڑھنے والی بھوک کی آگ! میری ہڈیوں کو جلادے، جلادے اور چربی نکال لے، نکال لے اور اسی کو معدہ میں عمیق غار جہنم میں۔ ڈال دے! کیا رزق میرے لیے آسمان سے برسے گا؟.... مگر آسمان تو محض ایک حد نظر ہے! تو پھر کیا خدائے رحیم...؟.... مگر کسی خالق کا وجود تو محض ایک ڈھکوسلا۔ لغو اور مہمل ڈھکوسلا ہے! اُف! کوئی صورت نہیں! کوئی جائے پناہ نہیں! کوئی نقطہ اس افلاس کی کشمکش سے بچانے والا نقطۂ سکون نہیں۔ کہیں نہیں! خود مختار مادے کی رنگ برنگ کی شکلیں نئی نئی دلفریبی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں! حرکت کا زبردست انجن برابر مادے کی صورتوں کو پلٹ رہا ہے! آب و آتش باد و خاک ہستی کا ایٹم پیدا کرکے نظام عالم کو لازوال رنگ میں حرکت دیئے جارہے ہیں! اور تمول کا عظیم الشان پتہ اتفاق یا ایکسیڈنٹ کے بدولت کبھی نہ ختم ہونیوالی گردش میں مشغول ہے! آہ! کیا میری باری کبھی نہ آئے گی؟ کیا ہر وقت حرکت کرنیوالا تمول کا پتہ مجھے اس فلاکت سے اوپر نہ اٹھائیگا؟ اٹھائیگا اور ضرور اٹھائیگا! ٹھہر، اے سوسائٹی کے نور نظر، گوری چمڑی والے نوجوان ٹھہر! اسوقت تک ٹھہر جب تک کہ میں اسی زیست کے تلاطم میں، اسی دولت کے بھنور میں، اسی مالداری کی مشین میں، دیکھتے دیکھتے ڈوبتا ہوجاؤں اور اس بے مروت، اس سیاہ قلب، اس بیدرد، سوسائٹی کو اس برتاؤ کا اچھی طرح جواب دیسکوں!!

ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا، گولی کھائے ہوئے ہرن کی طرح ماؤتھ سے کوارٹر کھولتا ہوا اندر گھسا، اور میرے ہوشیار ہوتے ہوتے لیمپ کو گل کرتا ہوا غائب ہو گیا! اندھیرے نے مجھے گھبرایا۔ طبیعت اور زیادہ گھٹی، اور میں نے دیا سلائی کا بکس جیب سے نکالکر ٹٹول ٹٹول کر میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کیا!! اب طبیعت کسی قدر ساکت تھی، بھوک کا شعلہ تو بڑھ رہا تھا مگر دماغی الجھن کم ہو گئی تھی: افلاس کی منحوس شکل تو برابر منڈلا رہی تھی مگر بدحواسی بہت کچھ فرو ہو چکی تھی! لیمپ جلانے کے ساتھ ہی اس مرتبہ تین خط مجھے میز پر پڑے ہوئے نظر آئے، جن کو غالباً ڈاکیہ میری عدم موجودگی میں حسب معمول رکھ گیا ہو گا! ان میں سے ایک خط لمبے لفافہ میں تھا جو بظاہر کوئی سرکاری حکم نظر آتا تھا، دوسرا خط نہایت خوبصورت مونوگرام لئے ہوئے نیلے رنگ کا تھا، اور تیسرے خط کے معمولی لفافہ پر بیروت کی مہر تھی! یہ آخری خط میں جانتا تھا کہ میرے اسکول کے زمانہ کے ایک ہم جماعت کا تھا! میں اور وہ معین الدین۔ انٹرنس میں ہم جماعت تھے، جس کے بعد وہ بیروت چلدیا اور وہاں تجارت کی بدولت خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا! دو مہینے گذرے کہ میں نے اُسے ایک خط لکھا تھا۔ اپنی تنگدستی کی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے اُس سے کچھ مدد قرض دستگرداں کے طور پر چاہی تھی۔ اور غالباً یہ اُسی کا جواب تھا! سب سے پہلے میں نے یہی خط اُٹھایا، اور پڑھنے سے پیشتر اُس کا وزن جانچنا شروع کیا اُس نے میری درخواست پوری کی ہو گی؟ کیا اُسے وہ محبت بھرا آزادی کا زمانہ یاد ہو گا جبکہ چاندنی رات میں ہم دونوں سٹریچی ہال کے سامنے ٹہلا کرتے تھے!

آہ! کالج کی زندگی اور خصوصاً ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی زندگی، ناممکن ہے کہ کوئی بھول جائے؛ مگر پھر بھی امداد کی امید مجھے مطلق نہ تھی! میں خوب جانتا تھا کہ اور بیسیوں دوستوں کی طرح معین نے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑا ہوگا! اور کچھ نہیں تو مجبوری کا اظہار۔ پہلوتہی کرنے کے لیے آسان سا نسخہ ہے! تاہم میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اوروں کی طرح اس نے بھی صرف مجبوری ظاہر کرنے پر ہی اکتفا کی ہے یا کوئی نیا عذر تراشا تھا! میں نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا، معین نے اپنی غلط سلط انگریزی میں لکھا تھا:-

"ڈیر بکیٹ! مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا لایق شخص بھی زمانہ کے ظلم سے محفوظ نہ رہا! میں ڈھائی سو روپے کے تین نوٹ اسی خط کے ساتھ ملفوف کرکے بھیج رہا ہوں! تاخیر محض برٹش گورنمنٹ کے نوٹ حاصل کرنے کی وجہ سے ہوئی! میری دلی دعا ہے کہ میں جلد تمھیں کامیاب اور مقصد ور دیکھوں! میں ایک شخص کو تمھاری سرپرستی کے لیے آمادہ کرتا ہوں۔ وہ بمبئی آرہا ہے اس کا نام پرنس حارث کنسی ہے! یہ شخص بے حد متمول ہے اور چونکہ نہایت وسیع معلومات کا شخص ہے اس لیے لایق وطبّاع آدمی کی جان و دل سے مدد کرتا ہے! تم اس سے بہت فائدہ حاصل کرسکتے ہو اگر اس کی رائے پر کاربند رہو! وہ تم سے مل کر طریق تمھاری امداد کرے گا۔ مجھے اس وقت فرصت بہت کم ہے اس لیے فی الحال رخصت! میری رقم واپس کرنے میں جلدی نہ کرنا، اور بلا تکلف ضرورت کے وقت یاد کرکے حق دوستی ادا کرنیکا موقع دینا!" ——— میں ہوں تمھارا صادق "لفیلو"

خط ختم کرتے ہی میں نے تینوں نوٹوں کو اچھی طرح دیکھا، اور لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا! اب میں قطعی مطمئن تھا! بیکٹ اور بفیلو ایک عرصہ دراز کے بعد میری نظر سے گذرے تھے! کالج کی متبرک زندگی نے مجھے بیکٹ کا اور معین کو بفیلو کا خطاب عنایت فرمایا تھا! مگر آہ، ظالم معین تو نے کالج کی یاد کو پھر تازہ کر دیا! تو نے مُردہ دل میں پھر بجلی دوڑا دی! تو نے اُس مبارک یونین کلب کا نظارہ پھر یاد دلا دیا! کیسی متبرک تھی وہ بے فکری کی زندگی، کیسی سچی محبت پیدا کرنے والی تھی اُس کی تعلیم! ہائے۔ جواں بخت نہیں۔ وہی جان بیکٹ! اور تو معین نہیں۔ وہی بھولا بھالا گداز جسم والا بفیلو! پیارے بفیلو! ڈیر بفیلو! معاف کرنا، میں سمجھتا تھا کہ تم بھی اپنے دوست مفلس بیکٹ کو بھول گئے ہو گے؟!

سلطان حمید جوش (علیگ)

مرحوم مولوی محمد عزیز میرزا صاحب بی۔ اے۔ کی موت نے جن کی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے جو نقصان قوم کو پہنچایا ہے اسکی تلافی کا بہ ظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ مغفور محمڈن کالج کے اُن طلبا میں سے اور قوم کے اُن افراد میں سے تھے جنپر کالج اور قوم دونوں کو ناز تھا۔ ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد مرحوم نے اپنی عمر قومی خدمات کے واسطے وقف کر دی تھی اور قوم کی بہت سی اُمیدیں مرحوم سے وابستہ تھیں جو موت نے پوری نہ ہونے دیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ اور پس ماندگان کو صبر دے۔

انقلاب

اب کہاں پہلی سی وہ سرمستی جوشِ شباب — ہے گرفتارِ خمارِ عیش مدہوشِ شباب
تلخکامی کے سوا آخر نہ کچھ حاصل ہوا — نیش ہے۔ کہتا ہے اک عالم جسے نوشِ شباب
صحبتِ دوشینہ کے اب ذکر سے کیا فائدہ — کیوں بنے منت کشِ گفتار خاموشِ شباب
رات کے جاتے ہی وہ باتیں بھی سب جاتی رہیں — سعی لاحاصل ہے اب کر نا غمِ دوشِ شباب

یادِ عہدِ نوجوانی لاکھ نشتر زن رہے
کچھ غمِ فردائے پیری بھی دلِ پُرفن رہے

شان برنائی کہاں وہ آہ رعنائی کہاں! — حسنِ صورت اب کہاں وہ طورِ زیبائی کہاں!
اب جوانی کی کہاں پُرلطف وہ کیفیتیں — وہ لبِ لعلیں میں پہلی سی شکرخائی کہاں
جوششِ دیوانگی اب کاش پیچھا چھوڑ دے — جذبۂ الفت کہاں اب اور یہ سودائی کہاں
حسرت و ارمان اب گھیرے ہوئے ہیں کیوں مجھے — کنجِ تنہائی میں شوقِ بزم آرائی کہاں

ولولے سب بُجھ گئے تو شورش افزا کون ہو
خارزارِ زندگی میں گامفرسائی کہاں

سرگذشتِ نوجوانی اک فسانہ ہوگیا — منقلب یعنی نصیبوں سے زمانہ ہوگیا
خواہشیں دل میں جو تھیں پیری میں سب جاتی رہیں — صبح ہوتے قافلہ سارا روانہ ہوگیا
آرزوہائے مسلسل میں پڑا ہے تفرقہ — کیا گھڑی آئی کہ برہم کارخانہ ہوگیا
ان علائق کا نہ آسانی سے دامن چھوٹتا — ترکِ دنیا کا مگر اچھا بہانہ ہوگیا

غم نہیں پیری اگر صبر آزما ہونے کو ہے
رندِ عشرت کوش بھی اب باخدا ہونے کو ہے

سید محمد عارف

لکھنؤ کے قدیم نظارے

شاہان اودھ اگرچہ ایک چھوٹی سی سلطنت کے مالک تھے لیکن شوکت پسندی اور اظہار جاہ وحشمت میں شاہان مغلیہ کے قدم بقدم چلتے رہے ان کے دربار کی شان وشوکت، ان کی سواریوں کا تزک واحتشام، ان کے محلوں کی رفعت، ان کی تفریح گاہوں کی نفاست، ان کے جلسوں کی کیفیت، اور روزانہ زندگی کے واقعات بجائے خود ایک دلچسپ افسانہ ہیں جن کا ذکر موجودہ نسلوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے کو کافی ہے۔ ایسٹ انڈین کمپنی سے گہرے تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے لکھنؤ ہمیشہ افسران کمپنی کی جولاں گاہ بنا رہتا تھا اور ہر اعلیٰ افسر کی آمد پر اظہار شان وشوکت کی حد ہو جاتی تھی خصوصاً گورنر جنرل، کمانڈر انچیف اور نئے رزیڈنٹ کا داخلہ نہایت شاندار ہوتا تھا اور استقبالی رسم اس شان وشوکت سے ادا کیجاتی تھی کہ ان سادہ مزاج اہل مغرب کو دریائے حیرت میں غرق کر دیتی تھی۔

استقبال خود بادشاہ یا ولیعہد سلطنت کرتا تھا اور اس کے بعد شاہی دعوت ہوتی تھی جس میں روشنی اور آتش بازی کے منظر نہایت تابناک ہوتے تھے۔ مارکوئیس آف ہیسٹنگز ایک منظر کا ذکر حسب ذیل کرتے ہیں:۔

"قسطنیہ (جنرل مارٹین کی کوٹھی) کے ایک پھاٹک سے ہمنے اس"
"سڑک پر نظر ڈالی جو شاہی محل کیطرف گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب"
"لکڑی کے ستون قایم کیے گئے تھے اور ہر ستون پر بیشمار گلاس روشن تھے"
"جب ہم آگے بڑھے تو روشنی کے بلند پھاٹک (ترپولیے) نظر آئے جو"

"جو بانس کے ٹھاٹھروں پر کپڑا منڈھ کے کھڑے کئے گئے تھے اور جو"
"سر سے پانوں تک روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے"
"ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں دونوں جانب نہایت صاف و شفاف"
"عارضی بازار لگے ہوئے تھے ہندوؤں اور چینیوں کے قومی بانوں کی"
"حیرت انگیز تصویریں دکھائی گئی تھیں۔ اس کے بعد ہم ایک کوشک یا"
"گرجائی محل کے قریب پہونچے جو نہایت پرتکلف طریقے سے آراستہ"
"تھا لیکن یہ تمام سنور اور تابناک نظارے اس قلعہ نما احاطے میں پہونچکر"
"ماند پڑ گئے جو دعوت خانہ کے محاذی واقع تھا جس کی کھڑکیاں اس"
"احاطے کی طرف کھلی ہوئی تھیں۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا جس کی وسعت"
"انگلستان کے متوسط میدان کے برابر تھی۔ سارا احاطہ خوشرنگ پھولوں کی"
"کثرت سے باغ ارم معلوم ہوتا تھا۔ روشن گلاسوں اور قندیلوں کی تعداد جن سے"
"اس موقع پر زمین ڈھک دی گئی تھی بے انتہا تھی اور ان کے مختلف رنگوں"
"کی ترتیب نہایت خوش آیند تھی۔ ..... یہ روشنی فی الحقیقت اپنی"
"قسم کی سب سے بہتر روشنی تھی جو میں نے دوسرے مقامات پر نہیں دیکھی"

دریائے گومتی پر روشنی اور آتش بازی کے منظر اس سے زیادہ دلچسپ ہوتے تھے۔ اس قسم کے ایک منظر کے متعلق مسٹر منڈی حسب ذیل رقمطراز ہیں:۔

"جو منظر یہاں (دریائے گومتی پر) میری نظر سے گذرا وہ کلیتہً دلکش اور"
"خالص مشرقی طرز پر مبنی تھا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا گویا الف لیلہ کے کسی"
"تابناک سین کو واقعی طور پر پیش نظر کر دیا گیا ہے۔ رات اگرچہ تاریک"
"تھی لیکن آسمان بالکل شفاف تھا جس پر آمد سے پہر ہم کھڑے ہوئے"
"تھے وہ لب دریا واقع تھا جس کے نیچے موجیں اپنی روانی کا لطف"

"دکھاری تھیں اور متعدد ساخت کی کشتیوں اور بجروں سے سارا دریا بھرا"
"ہوا تھا۔ دریا کے بیچوں بیچ میں ایک آراستہ کشتی پر ناچ ہو رہا تھا"
"جس میں ناچنے اور گانے والی طوائفوں کا ایک پورا گروپ تھا۔ تمام"
"منظر نیلی قندیلوں سے منور کیا گیا تھا جو اس ترکیب سے برآمدے"
"میں لگائی گئی تھیں کہ ان کی ٹنڈی اور پُر اسرار روشنی بغیر آنکھوں"
"کو تکلیف پہونچانے کے تمام سین پر چھائی ہوئی تھی۔ دریا کے دوسرے"
"کنارے پر جو اس کے محاذی واقع تھا اس سرے سے اُس سرے تک"
"آتش بازی کی قطار تھی جو مختلف قسم کی تھی اور بہت بڑی گوناگونی پر مبنی"
"تھی، اور دریا کی سطح پر کشتیوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔ تھوڑے"
"تھوڑے وقفے پر غبارے اُڑائے جاتے تھے جو ایک شاندار"
"انداز سے ہوا میں بلند ہو کے باری باری سے کبھی کسی خوبصورت"
"محل کا کبھی کسی مندر یا مسجد کا نقشہ دکھاتے تھے جس کے طلائی"
"مینار ایک لمحہ کے لیے نہایت چمک دمک سے روشن ہوتے اور بعد ازاں"
"تاریک ہو کر غائب ہو جاتے تھے"

دریا میں روشنی ہندوستان کا ایک نہایت قدیم طریقہ ہے جو گنگا وغیرہ کے بڑے بڑے میلوں میں اب تک نظر آتا ہے۔ ہندی میں اسے "جل بہار" کہتے ہیں۔ زندہ دلان لکھنؤ نے جل بہار کو ایک خاص سالانہ میلے کے طور پر اختیار کیا تھا جس کی مٹی ہوئی نشانی اب تک باقی ہے۔ اس موقع پر دریا میں دور تک آراستہ کشتیاں چھوڑی جاتی تھیں جن پر رنگا رنگ شامیانے کھینچے ہوتے تھے اور جھاڑ، کنول، وغیرہ کی روشنی میں ناچ ہوتا تھا۔ دریا کے دونوں جانب کی عمارتیں اور پُل، اور گھاٹ روشنی سے جگمگاتے تھے جن کی چھوٹ میلوں تک پہنچتی تھی

لیکن روشنی کے سب سے زیادہ تابناک نظارے محرم کے ایام میں نظر آتے تھے۔ جب سارا شہر ایک بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا۔ ہر گلی کوچہ امام باڑوں کی کثرت سے روشنی کا ایک خاص مرکز ہوتا تھا اور شاہی امام باڑوں کی تیاریاں بے پایاں تھیں جن کی تفصیل کو ایک دفتر درکار ہے۔ حسین آباد اور شاہ نجف کی روشنی اگرچہ اب نصف سے بھی کم رہ گئی ہے۔ تاہم نو وارد لوگوں کے لیے وہ ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ اس موقع پر یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں ہے کہ محرم کی تاریک راتیں اپنی جگمگاہٹ سے روز روشن کو شرماتی تھیں۔

اسیطرح آتش بازی بھی لکھنؤ کی ایک خاص صنعت تھی جس پر اب تک دنیا کا کوئی شہر سبقت نہیں لے گیا۔ آجکل لوگ امریکہ کی آتشبازی پر مٹے ہوئے ہیں جس کی ہوائیوں سے پریاں نکل کر ناچنے لگتی ہیں۔ راقم کو بھی کئی مرتبہ اس آتشبازی کے نظارے کا فخر حاصل ہوا ہے، اور اُسے دیکھ کر اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ یہ اسی قدیم صنعت کی غیر مکمل نقل ہے جو عہد شاہی کے سیاحان لکھنؤ کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہے۔ جس طرح ہندوستان کی دوسری صنعتیں ولایتی آب و ہوا میں پہونچکر مقامی رنگ میں جلوہ گر ہوئی ہیں، اُسی طرح لکھنؤ کی یہ صنعت بھی امریکن فضا میں پہونچکر سائنٹفک لباس میں نمودار ہوئی۔ امریکن آتش بازی میں سائنس کے خواہ کیسے ہی غیر معمولی کرشمے کیوں نظر نہ آئیں لیکن اس میں اُس صنعت کو مطلق دخل نہیں جس پر لکھنؤ عرصے تک نازکرتا رہے گا۔ یہاں کی آتش بازی کے قلعے بجائے خود ایک تھیٹر ہوتے تھے جنمیں آگ دیتے ہی ایک اصلی جنگ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا تھا۔ طرفین کے سپاہی اور گولہ باری صاف نظر آتی تھی اور قلعے کے بُرج اور فصیلیں اور دوسری عمارتیں بالکل تھیٹر کی طرح روشن ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح ہاتھیوں، مینڈھوں اور دوسرے

جانوروں کی لڑائیوں کے منظر نمایاں کیے جاتے تھے۔ غبارے، ہوائیاں، مہتابیں، اور دوسری قسم کی آتش بازیاں بھی خاص کیفیت رکھتی تھیں۔ لیکن اس فن کا سب سے بڑا کمال فرشی آتشبازی تھی جس کے شعلے سفید و شفاف فرش پر گرتے تھے لیکن اُس میں دھبہ تک نہیں پڑتا تھا۔ شاید آجکل کے لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات نہ آسکے گی کہ گھنگچی، سرسوں اور الائچی کے دانوں میں بارود بھر کے اُن سے آتشبازی کا کام کس طرح لیا جاتا ہوگا۔ لیکن اب سے چہارم صدی پیشتر تک نواب میرزا علی خاں صاحب جو حسین آباد کی پشت پر رہتے تھے۔ ایک سالانہ میلے کے طور پر اس قسم کی فرشی آتشبازی چھوڑا کرتے تھے جس میں اہل شہر کے علاوہ بعض جلیل القدر انگریز اور میمیں بھی آتی تھیں۔ اُن کے کمال کی شہرت صرف لکھنؤ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ "پکٹوریل لکھنؤ" کے انگریز مصنف نے بھی اُن کا مجمل ذکر کیا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی بے حقیقت آتشبازیوں کی حقیقت اُس وقت ظاہر ہوتی تھی جب اُن میں سے مختلف رنگ کے پھول پھل، پتے اور کلیاں نکل کر آتش بازی کا ایک مسلم درخت دکھا دیتی تھیں۔ لطف یہ کہ ان میں نہ دُھواں ہوتا تھا نہ گندھک کی بدبو آتی تھی۔ اس مختصر نظیر سے رؤسا لکھنؤ کی نفاست پسندی کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان شاہانہ مدارات اور دھوم دھامی جلسوں کے بعد گورنر جنرل یا دیگر اعلیٰ افسران کمپنی کے ساتھ ایک تخلیے کی صحبت بھی ہوتی تھی جس میں گورنر جنرل بادشاہ کمپنی اور بادشاہ اودھ کے مابین امور سلطنت پر گفتگو ہوتی تھی [illegible] اور تمام امور قابل اطمینان طور پر طے ہو جاتے تھے۔ یہ صحبت بادشاہ، اور انگریزی رزیڈنٹ میں بھی ہفتہ وار ہوا کرتی تھی جسے عموماً "چائے پانی کی

صحبت کہتے ہیں اس کا انعقاد باری باری سے کبھی شاہی محل میں ہوتا تھا اور کبھی رزیڈنسی کی عمارت میں۔ اس "چار پانی" کے اخراجات میں تین ہزار ماہوار تھے جو شاہی خزانے سے دیے جاتے تھے +

شاہان اودھ اگرچہ تمام امکانی امور میں مغل شاہنشاہوں کی تقلید کرتے تھے لیکن اُن کی طرح کبھی روزانہ دربار کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں "دربار عام" "دربار خاص" کا کوئی طریقہ نہ تھا اور وزیر اعظم یا دیگر اعلیٰ افسران سلطنت صرف شاہی محل میں باریابی حاصل کرکے امور سلطنت کے متعلق گفت و شنید کرتے تھے۔ محل میں بادشاہ ایک طلائی پلنگڑی پر جلوہ افروز ہوتے تھے جو بہت قیمتی جواہرات سے مرصع ہوتی تھی۔ پلنگڑی کے چار کونوں پر چار بڑی تھیلیاں رکھی رہتی تھیں جن میں سے ایک میں روپیہ بھرا ہوتا تھا، دوسری میں اشرفیاں، تیسری میں جواہرات، اور چوتھی تھیلی میں سونے کے کڑے۔ جب بادشاہ کسی پر مہربان ہوتے تھے تو ان تھیلیوں میں سے جن کے منہ کھلے ہوتے تھے مٹھی بھر کے روپیہ، اشرفی، یا جواہرات دیدیتے تھے۔ سونے کے کڑے صرف خدمت گاروں کے لیے تھے جو فوراً ہی اسی بات پر انعام پاتے تھے۔

تاہم سال میں چند مرتبہ بڑے بڑے دربار ہوتے تھے خصوصاً عید، بقرعید اور نوروز کو نہایت تزک و احتشام سے دربار ہوتا تھا۔ محرم کے اختتام پر بھی ایک دربار لازمی تھا۔ خاص خاص تقریبات پر بھی عظیم الشان دربار ہوا کرتے تھے۔ لیکن تخت نشینی کا دربار بالکل رسمی طور پر ہوتا تھا جس میں رزیڈیٹ اور خاص خاص اعیان دولت شریک ہوتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہر بادشاہ کے انتقال پر چند دعویٰ دار سلطنت اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، لہٰذا جسے بادشاہ بنانا منظور ہوتا تھا اُسے عجلت تخت پر بٹھا کر نذریں دیدیجاتی تھیں

اور توپوں کی سلامی شہر میں اعلان کر دیتی تھی کہ بادشاہ تخت نشین ہوگیا۔ ایک وجہ اس سادہ دربار کی یہ بھی تھی کہ شاہ متوفی کی لاش اُس وقت تک محل میں موجود رہتی تھی اور اُس کی موجودگی میں زیادہ دھوم دھام خلاف تہذیب تھی۔ جب نیا بادشاہ تخت نشین ہولیتا تھا تو وزرا و اُمرا دست بستہ عرض کرتے تھے کہ "ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہوگیا ہے، جہاں پناہ اس کی تجہیز و تکفین میں امداد فرمائیں"، اس پر بادشاہ خزانۂ عامرہ سے ایک خاص رقم دلواتا تھا اور شاہ متوفی کی لاش محل کے چور دروازے نکالی جاتی تھی۔

بہرکیف شاہانِ اودھ میں نواب غازی الدین حیدر کے سوا کسی کی تخت نشینی کی رسم غیر معمولی تزک و احتشام سے نہیں ادا ہوئی۔ خاندان اودھ میں یہ پہلے شخص تھے جنھیں وزارت یا صوبہ داری کے درجہ سے بادشاہ کے مرتبے پر پہونچا دیا گیا تھا۔ چونکہ یہ ایک غیر معمولی عزت تھی جو اس خاندان کو پہلی مرتبہ حاصل ہوئی تھی لہٰذا اس موقع پر شاہانہ تزک و احتشام کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خزانہ اُس بیشمار دولت سے لبریز تھا جو نواب سعادت علیخاں اپنی کفایت شعاری سے جمع کر گئے تھے اور جس میں بائیس کرور روپیہ نقد تھا۔ زر و جواہر کے انبار اس کے علاوہ تھے۔ بادشاہ کے لیے نیا تاج و تخت تیار کیا گیا تھا جو مکلل اور مرصع تھا۔ تمام سامان جلوس کی تیاری میں ایک کرور روپیہ صرف ہوا تھا۔ تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی اور شاہی عمارات تکلف سے آراستہ ہوئی تھیں خصوصاً تخت گاہ (لال بارہ دری) کی آراستگی نہایت زور پر تھی جس میں جلوس کا دربار ہوا تھا۔ بادشاہ کئی کرور کے جواہرات زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اہل دربار کی پوشاکیں نہایت زرق برق تھیں۔ جان مینٹن صاحب رزیڈنٹ بھی درباری لباس پہنے ہوئے تھے اور جھالردار پالکی میں تشریف لائے تھے۔ یہ زربفت کا جامہ پہنے

ہوئے تھے اور سر پر شملہ معرق مع جیغہ و سرپیچ و گوشوارہ تھا۔ ان کے خاص خاص انگریز مصاحب بھی پُر تکلف ہندوستانی لباس زیب تن کیئے ہوئے تھے۔ تمام اقربائے شاہی و ارکان دولت و اہلکارانِ رزیڈنسی کو خلعت فاخرہ عطا کیے گئے تھے۔ نواب معتمد الدولہ کو خلعت وزارت اور خطاب وزیر اعظم دیا گیا راجہ دیا کرشن کو دیوانی عطا ہوئی سبحان علیخاں نے سکہ شاہی کا شعر پیش کیا۔ پانچہزار روپے بطور انعام عطا ہوئے۔

سکہ زد بر سیم و زر از فضلِ رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

دربار میں رزیڈنٹ کے سوا کسیکو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ تاجپوشی کے وقت مجتہد العصر نے تاج کو سونے کی کشتی سے اُٹھا کر رزیڈنٹ کے حوالہ کیا اور انہوں نے بادشاہ کے فرق مبارک پر رکھ کے نذر دی۔ فوراً مبارک سلامت کے شور سے ساری عمارت گونج اُٹھی شاہی توپخانے سے سلامیاں دغنے لگیں اور سارے شہر میں غلغلہ پڑگیا۔ بادشاہ کے فرق مبارک پر سے جواہرات تصدق کر کے حاضرین دربار پر پھینکے گئے اور خاندان شاہی و ارکان دولت کی نذریں گذریں اس کے بعد شاہ برآمدے میں تشریف لائے۔ زیر محل خلعت کا انبوہ تھا۔ یہاں بھی روپے اشرفی کی بارش ہوئی۔ ارباب نشاط نے گانا شروع کیا اور طرح طرح کے تماشے ہونے لگے +

مسٹر رابرٹس نے اپنی دلچسپ تصنیف "سین اینڈ کیریکٹر" میں شاہ نصیر الدین حیدر کے ایک دربار کا نقشہ دکھایا ہے جو خالی از لطف نہیں :-

"اورنگ شاہی ایک مربع تکیہ ہے جو زمین سے دو فیٹ بلند ہے۔ اور"
"جس کے تین جانب کٹہرے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر ایک تار"

"شامیانہ ہو جس کی چوبوں پر خالص سونے کے پتر منڈھ کے نہایت بیش"
"قیمت جواہرات جڑے گئے ہیں۔ شامیانہ قرمزی رنگ کی کاشانی"
"مخمل کا ہے جس پر زردوزی کا نہایت نفیس کام ہے اور چاروں طرف"
"موتیوں کی بہت دبیز جھالر لگی ہوئی ہے۔ جس مسند پر بادشاہ رونق"
"افروز ہیں وہ بھی اسی قسم کی مخمل کی ہے اور اسپر بھی زردوزی کا نہایت"
"عمدہ اور بھاری کام بنایا گیا ہے۔ نیز چتر شاہی بھی اسی کا ہے اور اسکے"
"گرد بھی خوش آب موتیوں کی دبیز جھالر ہے۔ خود بادشاہ سلامت بھی"
"سر سے پانوں تک بیش بہا جواہرات میں غرق ہیں خصوصاً گردن"
"سے کمر تک الماس، یاقوت، اور زمرد وغیرہ کے مالے ہی مالے"
"نظر آتے ہیں۔ تاج شاہی بھی جواہرات کا تارا منڈل ہے جس کے"
"بالائی حصے میں بہشت کی چڑیا (ہما) کے پر لگے ہوئے ہیں تخت"
"کے دونوں جانب دو اعلیٰ عہدہ دار مور کے پروں کی مورچھلیں ہلا"
"رہے ہیں جن کے دستے طلائی ہیں تخت کے داہنے جانب دو"
"طلائی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں جو رزیڈنٹ اور اُن کی بیوی کے"
"لیے مخصوص ہیں۔ ان کرسیوں کے عقب میں اُن انگریزوں کی"
"جگہ ہے جو رزیڈنسی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کرسیوں کے"
"دونوں پہلوؤں میں رزیڈنسی کے شاہی ملازم استادہ ہیں جنکی"
"پوشاکیں نہایت ترق برق اور طلا کار ہیں تخت کے بائیں طرف"
"دیسی امرا اور اعیان دولت کی جگہ ہے جن کے درباری لباس نہایت"
"فوق العظمت اور قیمتی ہیں"

بادشاہ کے قدموں کے پاس وزیر اعظم کھڑا ہوا ہے جو نذر بیش"

"کراتا ہے۔ نذروں کی تعداد اکیس اشرفیوں سے لیکر چندر وپیوں تک"
"محدود ہے اور یہ نذر دینے والے کی حیثیت اور مرتبے سے تعلق رکھتی"
"ہے۔ نذر پیش کرتے وقت لوگ تخت کی جانب بڑھتے ہیں اور ہر"
"زینے پر باقاعدہ آداب بجالاتے ہیں حتیٰ کہ بادشاہ کے قریب"
"پہونچکر اپنی نذر کو ایک تہ کیئے ہوئے رومال پر رکھ کے پیش کرتے"
"ہیں اور بادشاہ اسے قبول کرنے کے انداز سے ہاتھ لگا دیتے ہیں۔"
"بعد ازاں یہ رقم وزیر اعظم کو دیدی جاتی ہے جو اسے لیکر اس ڈھیر"
"میں شامل کر دیتا ہے جو اس کے پہلو میں لگا ہوا ہے۔ اس تقریب"
"کے بعد بادشاہ اور رزیڈنٹ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ ایک"
"شخص کے ہاتھ سے جو اسی خدمت پر مامور ہوتا ہے گوٹے کے ہار"
"لیتا ہے اور خاص اپنے ہاتھ سے رزیڈنٹ کے گلے میں ڈالتا"
"ہے۔ بعد ازاں رزیڈنٹ بادشاہ سے رخصت ہوتا ہے اور بادشاہ"
"اس کے ساتھ دروازے تک آتا ہے جہاں ایک مختصر جملہ خدا حافظ"
"کہتا ہے اور تھوڑا عطر رزیڈنٹ کے ہاتھ پر اونڈیل دیتا ہے۔ اگر"
"رزیڈنٹ سے زیادہ موافقت ہوتی ہے تو یہ رسم ان انگریزوں کے"
"ساتھ بھی ادا کیجاتی ہے جو شریک دربار ہوتے ہیں"۔

"ان درباروں میں خلعت، انعامات، اور خطابات بھی عطا ہوتے"
"ہیں۔ انعامات میں بیشتر ہاتھی مع ہودج یا گھوڑا مع زین و ساز، یا پالکی"
"بھالردار ہوتی ہے۔ اس موقع پر نذر انعامات کی مناسبت سے"
"پیش کیجاتی ہے حتیٰ کہ بڑے بڑے عہدے اور جاگیریں پانے"
"والوں کی نذر بعض اوقات ایک لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہوتی۔"

"یہ رقم ریشم کی ایک سو تیلیو نمیں لیجائی جاتی ہے جن کے منہ نقرئی"
"ڈوریوں سے بندھے ہوتے ہیں"

اسی کتاب میں شاہی سواری کے ایک جلوس کی کیفیت حسب ذیل قلمبند کیگئی ہے جب شاہ موصوف بقرعید کے موقع پر عیدگاہ تشریف لے گئے تھے۔

"شاہی جلوس کے آگے آگے پچاس ہاتھی تھے جو شاہی نشان اٹھائے"
"ماہی مراتب وغیرہ لیے ہوئے تھے۔ ہر ہاتھی پر ایک پیلبان اور"
"دو بندوقچی سوار تھے جن کی وردیاں سفید تھیں، اور پگڑیاں اور"
"کمربند سرخ و سبز بانات کے تھے۔ ان کے بعد توپخانہ کی ایک"
"جماعت تھی جس کے گولندازوں کی وردی نیلی تھی۔ اس کے"
"بعد سواروں کے دو رسالے تھے جن کی وردیاں گلنار تھیں اور"
"سیاہ ٹوپیاں دیلے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیدل فوج"
"کا ایک دستہ تھا جس کے ساتھ فوجی ڈنکا بجتا جاتا تھا۔ اس کے"
"سپاہی گھٹنوں تک کا پائجامہ اور اونچی اونچی سرخ کرتیاں پہنے"
"ہوئے تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے"
"جلوس کے سب سے زیادہ شاندار حصے میں بادشاہ کی فیل گاڑی تھی"
"جس کے آگے آگے نجیبوں کا ایک زبردست غول تھا۔ اس نقرہ"
"گاڑی میں بادشاہ ایک فاتحانہ انداز سے تخت پر بیٹھے ہوئے"
"تھے جو اُن کے دربار کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی۔ گاڑی میں چار"
"ہاتھی جُتے ہوئے تھے جو رنگ و روپ اور قد و قامت میں بالکل"
"یکساں تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ندیمانِ شاہی اور ارکانِ دولت"
"کی گاڑیاں تھیں جن میں صرف دو دو ہاتھی جُتے ہوئے تھے لیکن"

"سب کی سب طلائی و نقرئی پتروں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ جو نمک"
"خوارانِ شاہی ان گاڑیوں میں سوار تھے وہ سر سے پانوں تک جواہرات"
"اور زر خلعت میں جگمگا رہے تھے۔ ان کے شملوں میں نہایت قیمتی"
"جواہرات کی کلغیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور بیش قیمت موتی اور جواہر"
"کے طرّے، بازو بند، بدھیاں اور انگوٹھیاں وغیرہ پہنے ہوئے"
"تھے۔ ان کے پاؤں میں گھنگھرو جوتے تھے جو مرصع بجواہر تھے"
"اور زر دوزی کپڑے یا قیمتی شال سے بنائے گئے تھے۔ ان گاڑیوں"
"کے ارد گرد چوبداروں، خواصوں، ہرکاروں اور دیگر شاہی ملازموں"
"کے غول تھے، جن میں بعض ننگی تلواریں چمکاتے جاتے تھے،"
"بعض چنوریاں ہلا رہے تھے۔ اور بعض بہ آواز بلند ان عالی مرتبت"
"امرا کے نام و خطاب پکارتے جاتے تھے جن کی سواریوں کے"
"وہ ہمراہ تھے۔ ان کے دونوں پہلوؤں میں بقاعدہ سواروں کا"
ایک زبردست ہجوم تھا جو نیزہ بازی اور دوسرے فوجی کرتب
"دکھا رہے تھے۔ ان کے بعد بادشاہ کے کوتل گھوڑوں کی قطار"
"تھی جو مرصع ساز و براق سے آراستہ تھے اور جن کے سائیسوں کی"
"وردیاں نہایت زرق برق تھیں۔ ان کے پیچھے شاہی پالکی اور"
"میانہ تھا۔ یہ دیسی سواریاں نہایت شاندار وضع رکھتی ہیں جو خالص"
"سونے کے پتروں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ ان کے کہاروں کی"
"لمبی وردیاں گلنار تھیں جن پر سنہری کام تھا۔ [illegible]"
"ان کی پگڑیوں میں طلائی مچھلیاں اور شاہی مار کے لگے ہوئے"
"تھے۔ جلوس کے اس حصے میں ایک انگریزی ساخت کی بگھی تھی"

"خاص شان رکھتی تھی جس میں مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے اور"
"جسے ایک یورپین کوچبان گلنار وردی پہنے ہوئے ہنکا رہا تھا"
"بادشاہ کے انگریز مصاحب بھی درباری لباس پہنے ہوئے ہاتھیوں"
"پر سوار تھے، اور اُن کے پیچھے دیسی اُمرا کے ہاتھیوں کی ایک"
"لمبی قطار تھی۔ سب سے آخر میں سوار اور پیدل سپاہیوں کے دستے تھے"
"ان میں جو پلٹنیں اسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھتی تھیں اُن کے"
"قومی جھنڈے کھلے ہوئے تھے اور فوجی باجہ بجتا جاتا تھا۔ ان کے"
"علاوہ تمام جلوس میں ہزاروں کارچوبی بیرقیں اور جھنڈیاں ہر جگہ"
"ہوا میں لہرا رہی تھیں"۔
"باوجود اس کی انتظام اور بے قاعدگی کے جو ایسے عظیم الشان اور بے پایاں"
"جلوس کے لیے لازمی ہے، تمام جلوس بغیر کسی خاص ہنگامے کے"
"جس میں فوجوں کی مسلح شوری نے بہت کچھ اضافہ کر دیا تھا، منزل"
"مقصود تک پہونچ گیا۔ اس موقع پر یورپین باجوں کے لیے دیسی"
"قرنا اور ڈھول وغیرہ کے شور کی ہمسری بالکل فضول تھی۔ جلوس"
"کے عیدگاہ تک پہونچنے پر مجتہد العصر نے نماز وغیرہ مذہبی رسوم"
"ادا کیے اور بادشاہ کے ہاتھ میں ایک چھری دی جسے انہوں نے"
"کلمہ تکبیر پڑھتے ہوئے ایک اونٹ کی گردن میں پیوست کر دیا جو"
"قربانی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ توپخانے کے گولنداز اسی وقت"
"کے منتظر تھے اور انہوں نے اشارہ پاتے ہی توپیں داغنی"
"شروع کر دیں جن کی گھن گرج آوازوں سے تمام شہر گونجنے"
"لگا اور سب کو اطلاع ہو گئی کہ بادشاہ قربانی کی رسم ادا کر چکے"۔

لکھنؤ کے پرانے سین دکھاتے ہوئے ہم ایک شادی کا ذکر کیئے بغیر نہیں رہ سکتے یہ نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نہاد پسر اور ولیعہد سلطنت میرزا وزیر علیخاں کی شادی تھی جس کی نسبت مورخین کا بیان ہے کہ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد سے ہندوستان کو پھر کبھی ایسی دھوم دھام دیکھنا نصیب نہیں ہوئی صاحب قیصر التواریخ لکھتے ہیں کہ :- سنہ ۱۲۰۸ھ مطابق سنہ ۱۷۹۴ء شادی میرزا وزیر علی خاں کی ہوئی جس میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جتنے صاحبان عالیشان اور امرائے عالی قدر دور نزدیک کے تھے سب شریک ہوئے تھے۔ صحبت مجلس عیش باغ وچار باغ میں ہوئی۔ اس خاندان میں اس تکلف کی کسیکی شادی نہیں ہوئی اور نہ اس قدر روپیہ صرف ہوا۔ اب اس کا احوال مثل کہانی خیالی کے ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہاں آباد میں بھی وشادیاں یادگار زمانہ ہوئیں۔ ایک نواب شجاع الدولہ بہادر کی دوسری جوگل کشور کی۔ یہ اور وزیر علی خاں کی شادی کا شہرہ یہ ہے کہ پانسو چوگھڑا فقط چاندی کا تھا۔ حضرت خلدمنزل (آصف الدولہ) نے فرح بخش میں نہر کے دونوں طرف قصر فلک بنوایا تھا۔ ظفر الدولہ (داروغہ خزانہ) نے کوٹھے (خزانہ) سے بھی چاندی کے گھڑے دیے تھے"

اس شادی کی کسیقدر تفصیلی کیفیت مسٹر فوربس کی نفیس کتاب "مشرقی کہانیاں" میں درج ہے جو اس شادی میں بنفس نفیس شریک تھے اور جنکا بیان نسبتہً زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"آصف الدولہ نے شہر کے قریب ایک میدان میں اپنے خیمے نصب کیے تھے۔ ان میں دو بہت عظیم الشان خیمے تھے یہ بہت مضبوط سوتی کپڑے کے تھے جن میں اعلیٰ قسم کی انگریزی

"بانات کی رنگ برنگ کی دھاریاں دی گئی تھیں۔ ان کی ڈوریاں"
"بھی ریشمی تھیں۔ ان میں ہر خیمے کی لاگت ساٹھ ہزار پاونڈ اسٹرلنگ"
"کے قریب تھی۔ ان کی دیواروں کی قناتیں دس فیٹ اونچی تھیں"
"اور چلمنوں کے ذریعے سے دونوں خیموں میں الحاق قایم کیا گیا"
"تھا تاکہ پردہ نشین بیگمات محفل کا نظارہ کر سکیں۔ شادی کے"
"روز نواب آصف الدولہ دو ملین اسٹرلنگ کے قیمتی جواہرات"
"پہنے ہوئے تھے۔ محفل والے خیمے میں دو سو نفیس جھاڑ دو سو"
"ہانڈیاں اور کئی ہزار کنول روشن تھے۔ ایک سو طائفوں کا"
"ناچ تھا جن کی پشوازیں نہایت زرق برق تھیں اور جو ہندی"
"فارسی مخلوط زبان میں گاتے اور ناچتے تھے۔"
"دولھا جس کی عمر تیرہ سال کی تھی سر سے پانوں تک اس قدر"
"جواہرات میں لدا ہوا تھا کہ مشکل سے جنبش کر سکتا تھا۔ دلہن"
"کی عمر دس سال کی تھی اور وہ اسیطرح جواہر کے دریا میں غرق تھی"
"سات بجے شام کو دونوں جداجدا ہاتھیوں پر ایک حیرت انگیز"
"باغ میں لائے گئے جو ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ برات"
"کے جلوس میں صرف بارہ سو ہاتھی تھے جو زربفت کی جھولوں"
"اور قیمتی زیورات سے آراستہ تھے۔ ان میں ایک سو ہاتھیوں پر"
"چاندی کے ہودے رکھے ہوئے تھے سب کے بیچ میں آصف الدولہ"
"کا ہاتھی تھا جس کا قد و قامت نہایت غیر معمولی تھا۔ اس پر"
"جو ہودہ رکھا ہوا تھا وہ خالص سونے کا تھا اور اس میں"
"بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کی جھول"

"مغرق تھی اور تمام زیورات نہایت بیش قیمت تھے۔ نواب کے"
"داہنے پہلو میں ہمارے رزیڈنٹ "مسٹر جانسٹن" بیٹھے ہوئے"
"تھے اور بائیں جانب دولھا متمکن تھا۔"

خیموں سے باغ تک سڑک کے دونوں جانب روشنی اور آتشبازی گڑی ہوئی تھی اور ہاتھی کے ہر قدم پر ہمارے سامنے کی زمین چمک اٹھتی تھی۔ ہزاروں ہوائیاں ہوا میں بلند ہوکر آسمان تک کو منور کردیتی تھیں اور ان پر مہتابوں کی روشنی کے اضافہ سے تاریک رات روز روشن معلوم ہوتی تھی ساری برات میں مشعلوں اور پنجشاخوں کے علاوہ صرف تین ہزار کنول روشن تھے جنھیں خدمت گار لیے ہوئے تھے اس شاہانہ تزک و احتشام سے ہم لوگ باغ تک پہنچے اور ہاتھیوں سے اتر کے اس میں داخل ہوئے باغ میں مختلف رنگ کی بیشمار قندیلیں روشن تھیں جو درختوں کی شاخوں میں آویزاں کیگئی تھیں۔ اس کے وسط میں ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کے زینے پر چڑھ کے ہم ایک وسیع مہمان خانہ میں داخل ہوئے جو نہایت نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا اسمیں انگریزی ساخت کے جھاڑ کنول لگے ہوئے تھے جن میں موی شمعیں روشن تھیں۔ یہاں ہمارے سامنے ولایتی اور دیسی قسم کی نہایت نفاست کے ساتھ کھانا چنا گیا۔ ساتھ ہی تقریباً ایک سو طائفے اپنی سریلی آوازوں میں گانے اور اپنا دیسی ناچ دکھانے لگے صبح صادق تک یہی پرلطف جلسہ رہا۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوئے اس تقریب کے تمام اخراجات جسمیں تین راتوں تک متواتر ایسے ہی جلسے ہوتے رہے تین لاکھ پونڈ (بیتالیس لاکھ روپیہ) سے زائد تھے۔

عذر تقصیر

میں گنہگار ہوں بندہ ترا اے رب قدیر
جرم وہ میں نے کیے ہیں کہ نہیں جن کی نظیر
سوچتا ہوں تو نکلتی نہیں کوئی تدبیر
تا کہ ہو روز جزا کچھ نہ سزا اے تقصیر

یوں تو ہے گرچہ بہت بیم قیامت مجھے
ناامیدی نہیں لیکن تری رحمت سے مجھے

صاف ظاہر ہے کہ میں عفو کے قابل ہی نہیں
عذر بے جا سے مرے کچھ مجھے حاصل ہی نہیں
یہ تو کھلم کھلا کہوں میں کہ تو عادل ہی نہیں
ہاں مگر رحم جو آجائے تو مشکل ہی نہیں

کام دشوار سے دشوار بھی آساں ہو جائے
یکقلم محو مرا دفتر عصیاں ہو جائے

تجھکو معلوم ہے کوئی بھی نہیں میرا کفیل
کم بضاعت ہوں میں سرمایۂ نیکی ہے قلیل
دل کو میرے ہے یہی فکر خداوند جلیل
کہیں محشر میں نہ ہو جاؤں میں رسوا و ذلیل

آبرو کا ہوں طلب گار وہ انساں ہوں میں
تجھ سے اے بحر کرم فیض کا خواہاں ہوں میں

یوں تو دولت بھی زمانے میں عجب نعمت ہے
باعث عیش و نشاط و طرب و عشرت ہے
اس سے مفلس کو بھی زردار کو بھی الفت ہے
جمع کرنا مگر اس چیز کا اک آفت ہے

سبب جاہ و حشم کچھ زر و دولت ہی نہیں
آبرو جس کی نہیں اس کی کچھ عزت ہی نہیں

بس اگر ہے بھی تو یا رب مجھے عزت کا خیال
دوسرا کوئی نہ اندیشہ نہ غم ہے نہ ملال۔
کون ہے تیری سوا اور میرا واقف حال
تجھکو اے صاحب قدرت نہیں امر محال

میری جانب نظرِ شافعِ محشر ہو جائے
آبروئے دو جہاں خورشید سے بڑھکر ہو جائے

دستگیری کو مری جب بڑھیں محبوبِ خدا — اور فرمائیں کہ اے بندۂ عاصی اُٹھ آ۔
چل شفاعت کے لیے ہوتا ہوں ضامن تیرا — کیوں ہراساں ہے؟ محمدؐ سا جو ہے راہنما!

بحرِ عصیاں سے کہیں وہ۔ کہ نکالا میں نے
تو یہ فرمائے کہ بخشا اسے بخشا میں نے

جب کہیں وہ کہ تھی ہر چیز سے نفرت اس کو — تھی نہ دنیائے دنی سے بھی محبت اس کو
مجھ سے تھی یا میری اولاد سے اُلفت اسکو — حکم صادر ہو ترا۔ بخشدو جنت اِس کو

جائے کوثر پہ۔ یہ اب فیضِ اولادِ رسولؐ
عذرِ تقصیر کو آرشد نے کیا ہم نے قبول

آغا غلام حسین ارشد

غزل

بادہ کشِ الست ہوئے ہوشیار کب — قالو بلا کہے سے بھی اُترا خمار کب
تو ہی نہ ہو تو گل میں جو جلوہ نما تو پھر — یوں چیخ چیخ جان کو کہو تا ہزار کب
ہر سر قدم پہ تیرے قیامت بپا ہوئی — فتنہ نے تیری چال سے پایا قرار کب
جنت میں اُس کے ملنے کی ہوتی نہ گر امید — کرتے پسند ہے کو بھلا بادہ خوار کب
ہو کر کے تیم بسمل تیرِ نگاہِ شوخ — تڑپا نہ مثلِ مرغ دلِ بیقرار کب
یہ بیخودیٔ شوق میں کیا ہو کے رہ گیا — دستِ خیال چھٹ گیا دامانِ یار کب

دن رات زلف و رخ کا چھٹا اُن کے کب خیال
خورشید سے جنوں میں چھٹے غم کا رکب

رسم و رواج اور انسان کی فطرت

اس امر سے شاید کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بھلائی اور برائی کے جانچنے کا معیار خود انسان کی فطرت ہے۔ دنیا کی ہر شے ہماری ذات کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتی ہے۔ گو وہ تعلق عام طور پر ایک سا ں نہیں ہوتا۔ بعض چیزوں کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے جسے ہم خوشگوار کہتے ہیں۔ اور بعضوں کے ساتھ ایسا جسے ناگوار سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ دراصل خوشگواری یا ناگواری کیا ہے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ گلاب کا پھول دیکھنے میں اچھا سا معلوم ہوتا ہے اور خوشبو بھی ہے۔ برعکس اس کے کسی بدبودار شے (فرض کیجئے ہینگ) سے ہمیں ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہوتی ہے اس کی بو سے ہمارا دم ناک میں آتا ہے۔ یہی خوشگوار یا ناگوار تعلق کا احساس جو ہمارے اور دنیا کی ہر شے کے ساتھ وابستہ ہے اس فطرت کا پتہ دیتا ہے جو صانع مطلق نے ہماری تخلیق میں ملحوظ رکھی ہے فطرت انسان کو محض ان محسوسات اور کیفیات سے تعلق ہے جو حواس ظاہری و باطنی کا نتیجہ ہیں ہم کسی چیز کو دیکھ کر یا سنکر سونگھ کر چھو کر یا چکھ کر کیوں محظوظ یا منغض ہوتے ہیں؟ صرف اس وجہ سے کہ ہمارے حواس خمسہ اوسی طور کی شہادت دیتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کے جانچنے کا آلہ یہی حواس خمسہ ہیں اور ہماری فطرت انہیں حواس خمسہ کی ماتحت ہے۔

ہمیں دنیا میں ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے خود ہماری فطرت ایک بہترین رہنما ہے۔ نیچر کے سارے کارخانے ایک مستقل اصول کے پابند ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ ہماری فطرت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ

ہمارے سارے کام اسی اصول پر منضبط ہوں۔ اگر ہم اس غیبی ہنما (یعنی فطرت) کے نقش قدم پر چلتے چلیں تو کبھی راہ راست سے بھٹک نہیں سکتے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم اس سچے راہ نما یعنے اصول فطرت کی مخالفت کر کے راہ سے گمراہ چلیں اور پھر منزل مقصود تک پہنچ بھی جائیں۔ ہم ہزار اس کی مخالفت کریں مگر اس پر کبھی فتح نہیں پا سکتے۔ ہم ہزار اس سے انحراف کریں مگر اس کی استحکام میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ قطب نما کی صداقت سے اگر ہم انحراف کریں تو خود منزل مقصود سے کوسوں بھٹک جائیں گے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ نیچر پر ہم کسی طرح فتح نہیں پا سکتے سوائے اس کے کہ ہم اس کی متابعت کریں۔ اور اسی مضمون کو لارڈ ٹینی سن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہم نیچر کی (قوتوں کی) متابعت کر کے اس پر حکمرانی کرتے ہیں۔ علاوہ ان حکماء کے حکیم علی الاطلاق خداوند جل شانہٗ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے "لا تبدیل لفطرت اللہ" یعنے فطرت نہیں بدلتی اور یہ بھی فرمایا ہے "فطرت اللہ فطرت الناس" یعنے یہ وہی فطرت ہے جس کے مطابق انسان کی تخلیق واقع ہوئی ہے۔ پس جب فطرت کے قوانین ایک ایسے مستحکم اصول پر ہیں کہ ان سے انحراف یا چشم پوشی یا بے پروائی کر کے سوائے خجلت یا پشیمانی یا ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہاتھ آتا اور نہ ہماری مخالفت سے ان میں کوئی تغیر پیدا ہو سکتا ہے تو انحراف ہمارا (خواہ وہ ہماری معاشرت کے متعلق ہو یا ہمارے سوسائٹی یا قومی اور ملکی ضروریات یا زندگی کے اور کسی امور کے متعلق ہو) خود ہماری تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اور دشوار اور پیچیدہ مرحلوں میں پھنسا کر منزل مقصود سے ہمکو بہت دور بھٹکا دیگا اور اگر اسیکو مذہبی رخ سے دیکھئے تو ایک گناہ بھی ہے۔ لہذا فطرت کی مطابقت کا حق یہ ہے کہ اسکی جو ہدایت جہاں پر ہو اس پر کاربند ہو اور جہاں جس امر سے یہ روکے

اُس سے اجتناب کرے۔

جب یہ امر یقینی ہے کہ دنیا میں رہ کر اصول فطرت سے انحراف کرنے والا ہمیشہ نادم اور پشیمان ذلیل و خوار رہے گا۔ تو شاید ہی کوئی شخص ایسا جاہل ہوگا جو دانستہ منشاء فطرت کی مخالفت کر کے اپنے تئیں مورد بلا بنانا پسند کرے گا۔

مگر افسوس اور ہزار افسوس اس امر کا ہے کہ بدنصیبی سے انسان میں خلاف فطرت و مضر صحت چند ایسے رسم و رواج جاری ہو گئے ہیں جو بالکل مقتضائے فطرت کے منافی ہیں۔ عقل کا منشا اور ہادی فطرت کی ہدایت تو یہ تھی اور ہمیشہ رہے گی کہ رسم و رواج عین فطرت کے مطابق ہوتے مگر کسی نہ کسی وجہ سے اکثر اقوام میں ایسی ایسی رسمیں جاری ہو گئیں جو بالکل ناپسندیدہ اور خلاف عقل ہیں

میں اُن سب رسم و رواج کا یہاں پر نام لینا نہیں چاہتا۔ اُن کہ وہ کون کون سے اور کہاں کہاں ہیں۔ فقط اس قدر دکھانا منظور ہے کہ اندھی تقلید میں انسان نے کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اگر مذہبی حیثیت سے بھی ہم دیکھیں تو ظاہر ہے کہ اصول فطرت کو ایک مستحکم بنیاد پر خدا ہی نے قایم کیا اور گویا اُس کی مخالفت عین خدا کی مخالفت ہے۔ کسی سچے دین کے احکام کبھی فطرت کے خلاف نہیں پائے جائیں گے۔ پھر کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ہم بعض رسم و رواج کی اندھی تقلید کے پیچھے حکم خدا پر نظر رکھتے ہیں اور فطرت کے منشاء پر غور کرتے ہیں اور اس کے بُرے نتیجے بھگتنے پڑتے ہیں اگر [illegible] کہ [illegible]

منشاء فطرت کے خلاف عمل پیرا ہونے کی ایک عمدہ مثال رونے کی ہے۔ کسی فرقہ کے سوا ہر ملک اور زمانے کا دستور ہے کہ ملک ان باتوں کو [illegible] عقلمند عورتیں نہیں کرتیں سچ ہے [illegible] ان باتوں کو کرتے ہیں

تمام عمر کواری بیٹھی رہتی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی ایک یہ رسم جاری ہے کہ جو لڑکیاں کسنی میں بیوہ ہو جاتی ہیں اُن کا عقد ثانی نہیں کرتے اور خدا جانے کیونکہ وہ لوگ اپنی زندگیاں بسر کر لیتے ہیں۔

اب یہ امر قابل غور ہے کہ انسان فطرت کے تقاضوں سے منھ پھیر کر اور بے پروائی کر کے کہاں تک اور کب تک خوش اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور جو کچھ ناگوار نتائج اس قسم کے مخالفت فطرت سے پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ہمکو بھوک لگتی ہے تو کھانا کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پیاس ہوتی ہے تو پانی پی لیتے ہیں۔ جاڑوں میں جسم کے استحفاظ کے لیے اور گرمیوں میں لُو سے بچنے کے لیے سامان ضروری کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ان تقاضائے فطرت سے ہم بے پروائی کریں گے تو نتیجہ ہمارے ہی حق میں مُضر اور تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ غرض باوجودیکہ ہم قانون فطرت کے نتائج کی نسبت عین الیقین رکھتے ہیں پھر بھی بعض رسم و رواج کے پیچھے اُن نتیجوں کو برداشت کرتے ہیں۔

ہم کو جاننا چاہیئے کہ فطرت کی مخالفت ہی میں ہماری شکست ہے اور اُس سے جنگ کرنے میں خود ہماری شکست اور ہلاکت ہے۔ نتیجہ اس بحث کا یہ ہے رسم و رواج جو اصول فطرت کے بالکل مطابق ہیں اور کسی طور سے مضر صحت و مخرب اخلاق نہیں ہیں وہی داخل معاشرت کرنے چاہییں اور جو رسم و رواج فطرت کے خلاف ہیں اُن کا سوسائٹی سے بالکل خارج کر دینا لازم ہے۔ افسوس ہے کہ خیر خواہان قوم اس پر توجہ نہیں کرتے کہ کون کون سے رسم و رواج منشاء فطرت کے خلاف ہم لوگوں میں جاری ہیں پس ایک یہی دھن ہے لاؤ چندہ لاؤ چندہ۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہی از سخنم پند گیر خواہ ملال۔

میر زاد احسن بیب

مدینہ کی ایک مغنیہ (غزۃ المیلا)

طُوسیس مغنی

گذشتہ سے پیوستہ

کھانا کھاتے کھاتے بھی سمیہ ان مناظر کیطرف آنکھ اُٹھا اُٹھا کر دیکھتی جاتی تھی، کہ غزہ نے اُس سے پھر سوال کیا "کیوں سمیہ؟ تم نے مجھے ابتک اِس کا جواب نہ دیا کہ تم پر آج خاموشی کیوں چھا گئی ہے" اتنا کہہ کر غزہ منتظر جواب رہی کہ پھر سمیہ نے اِن مغربی مناظر کو دیکھا، تو حیرت سے اُس کی پُتلیاں اُس طرف جم گئیں مُنہ کا لقمہ وہ چبانا بھول گئی، اور ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہا۔

غزہ نے پھر مکرر سوال کیا، اور حیرت کی وجہ پوچھی، اسپر وہ کھانے میں مشغول ہو کر بولی "مجھے یہ درخت متحرک سے معلوم ہو رہے ہیں، خدا جانے کیوں؟ میری نظر ایسی غلطی کھا رہی ہے" اب غزہ نے بھی اُدھر دیکھا، اور ذرا آنکھ جما کر دیکھنے سے اُسے اس کی کُنہ معلوم ہو گئی کہ درختوں کے نیچے دو شتر سوار جا رہے ہیں، اور ان کی رفتار سے درختوں کے تنہ بھی متحرک نظر آتے ہیں، پھر اُس نے سمیہ کے شک کو اس خیال سے رفع کیا، سمیہ بھی مان گئی، اور اُس نے کہا، کہ اسیطرح دو شتر سوار پانی کے اندر بھی نظر آتے ہیں" جس پر غزہ ہنسنے لگی۔ اور خوش فعلی کے انداز سے اُس کے گال پر آہستہ سے طمانچہ مار کر بولی "بھولی لڑکی پانی میں جو شتر سوار نظر آتے ہیں، وہ ان سوار دنکا جو تالاب کے کنارہ جا رہے ہیں عکس ہے۔

بلکہ ان کے پیچھے ایک ایک تیسرا سوار بھی وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل رہا ہے
اتنے میں وہ سوار درختوں کے سایہ میں پہونچکر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ عزہ
نے سمیہ سے کہا فکر کی کوئی بات نہیں، اس راستہ سے دمشق کی آمد و رفت
لگی ہی رہتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی کوئی دمشق ہی کے مسافر ہوں گے"
لو اب کھانا کھاؤ ہوا میں خنکی آچلی ہے، اس لیے یہاں اب زیادہ تر
ٹھہرنا مناسب نہیں، ہاں! میں آج تمھیں ایک ایسی عمدہ خوش آیند
رگنی سنانے والی ہوں، جس سے تم بہت محظوظ ہوگی، اور جسے میری
شفیق معلمہ نے مجھے بڑی محنت سے بتایا تھا، اور میں نے بھی خون جگر
پی پی کے اسے سیکھا تھا"

اس کے بعد پھر وہ دونوں کھانے میں مشغول ہو گئیں، ہنوز فراغت
نہوئی تھی کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے شمع خاموش کر دی، عزہ نے فوراً
دستک دی، اور نیچے سے ایک خوش قطع شخص صاف ستھرے لباس
میں، اوپر آیا، جسے آتا ہوا دیکھکر سمیہ نے اپنا چہرہ نقاب سے چھپایا، عزہ کو
اسپر ہنسی آگئی، اور کہنے لگی، "سمیہ! کیا تم مخنث سے بھی پردہ کرتی ہو"
بات یہ تھی کہ سمیہ تاریکی شب سے اس کی تمیز نہ کر سکی کہ یہ آنے والا شخص مرد
ہے یا مخنث[۵۱]،

[۵۱] مدینہ میں ان مخنثوں کی ایک جماعت کثیرہ تھی، جو بے تکلف عورتوں میں آتے
جاتے، اور اُن سے ملتے جلتے تھے۔ مشاطہ گری کا کام بھی زیادہ تر ان سے انجام
پاتا تھا، جس کا طریقہ یہ تھا، کہ جب کوئی زوجہ ان شادی کرنا چاہتا، تو ان میں سے
کسی ایک سے مشورہ کرتا، یہ خواتین کے اصلی اوصاف اور خوبیوں کا مرقع اپنی جادوئی
تقریر سے اُس کے سامنے کھینچ دیتے، جس سے انتخاب میں ایک گونہ سہولت ہوتی

یہ مخنث جب آکر سامنے کھڑا ہو گیا، تو عزہ نے اُس سے پوچھا،

عزہ:۔ طویس! کیوں آئے ہو؟

طویس کا نام سنکر سمیہ نے تعجب سے سوال کیا، کیا طویس یہی ہے؟ عزہ نے جواب دیا ہاں یہی ہے، اور اس کا ہمارے پاس اس وقت بلا اطلاع چلا آنا کوئی نئی بات نہیں، بلکہ یہ پہلے سے اس طرح بے تکلف آنے جانے کا عادی ہے۔"

طویس سے خطاب کرکے "اچھا طویس! باندی سے کہو شمع روشن کر جائے"

طویس:۔ میں ایک شرط سے بولوں گا،

عزہ:۔ کیا شرط؟"

طویس:۔ اس شرط سے کہ مجھے ایک شعر ہزج[۵] میں سناؤ،

عزہ:۔ مجھ سے ہزج میں شعر سننا چاہتا ہے، حالانکہ تو خود اہزج الناس ہے ہاں اگر ثقیل یا رمل میں سننا ہو، تو میں سناؤں گی،

طویس:۔ اچھا تمھاری جیسی خوشی ہو، مجھے تو شعر سننے سے مطلب ہے

عزہ:۔ اچھا سناؤں گی، مگر مجھے تیری صورت سے اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کیونکہ تیری نحوست اور شوم زبان زد ہے،

بقیہ نوٹ صفحہ ۵۲) انتخاب کے بعد اگر بخت مرحلہ بھی ان کے ذمہ کیا جاتا تو وہ اسے بھی بحسن اسلوب انجام دیتے۔ عزہ کے یہاں ان لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تر اس بنا پر تھی، کہ یہ اس کے پاس اپنا تقرب جماتے۔ اور وقتاً فوقتاً موسیقی کے کچھ نئے سُر، اُس سے حاصل کر جاتے، سب میں طویس عزہ کا زیادہ سر چڑھا تھا۔ ۱۲

[۵] یہ عربی بحروں کے نام ہیں، ۱۲۔

طوبیس "مجھ سے بڑھکر شوم کون ہوگا، میں ماں کے پیٹ سے اُس روز پیدا ہوجس روز نبی کریم (صلعم) نے وفات پائی، یعنی جو ذات باعثِ تخلیق عالم تھی اُس کے وجود کی تجلی اہلِ عالم کی نظر سے جس روز پوشیدہ ہوئی، میری دودھ بڑھائی اُس روز ہوئی جس روز صدیق اکبرؓ نے انتقال کیا، یعنی صحبت برار اور ہمنشینان رسول اللہ کے ایک فرد اعظم کے حادثہ ارتحال سے دنیائے اسلام پر غم والم کی گھٹا چھائی تھی، پھر بلوغ کو میں اُس روز پہونچا یعنی دستور دنیا کے مطابق اعتبار کا ایک جزو مجھے قدرت سے اُس روز عطا ہوا، جس دن عمر ابن خطابؓ کی شہادت کا قیامت خیز واقعہ وقوع میں آیا، اسی طرح بیوی کے ساتھ میری خلوت کا روز وہ تھا جو شہادت عثمانؓ کا روز ہے اور میرے یہاں ولادتِ فرزند علی شیرِ خداؓ کے شہادت کے روز ہوئی۔

عزہ اس صاف گوئی، اقرار نخوست، اور تطبیق واقعات پر متعجب ہوئی۔ اور اُس نے ہنسکر کہا "خدا کے لیے اپنی اس نخوست کو کہیں آج ہمپر ختم نہ کرنا تمھاری فرمایش بہرحال پوری کیجائے گی"

اجنبی میہمان شب

اس گفتگو کے بعد طوبیس نیچے اُتر آیا، اور پھر چند لمحوں کے بعد عزہ اور سمیہ بھی نیچے آگئیں، اور میہمانوں کے کمرہ میں جا بیٹھیں، عزہ نے انو پر تکیہ جما، اُس سے سہارا دے کر صدر نشست میں بیٹھ گئی، اور سمیہ اُس کے بازو میں جا بیٹھی، اور اپنے خیالستان میں تخیل کی پرواز سے پہونچ گئی، طوبیس یہاں موجود تھا، اُٹھا، اور جھٹ سے دیوار پر جڑے ہوئے

آلات موسیقی، اور مزامیر میں سے ایک دف لاکر عزہ کے سامنے رکھ دیا، اور کہنے لگا "اب کچھ چھیڑیئے"

عزہ:- "بندۂ خدا ذرا صبر کر، ابھی کھانا کھایا ہے، آرام بھی لینے دیگا،

یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ باغ کے قریب سے کچھ اونٹوں کی آواز معلوم ہوئی جسے سُنکر عزہ نے کہا "طویس ذرا دیکھ تو اس رات میں کون آنے والا ہے، خدا خیر کرے تیرے قدم کی برکت کیا بلا نازل کرتی ہے" اتنے میں سمیہ بول اٹھی سمیہ:- "ہمیں کسی بات کا ڈر نہیں، ہم یہاں بالکل امن میں ہیں" اتنا کہہ کر پھر ذرا دھیمی آواز سے بولی "نہیں ہم یہ کیسے کہیں کہ ہم امن میں ہیں، جبکہ امیر وقت انواع واقسام کے مصائب میں گرفتار ہے، اور دانہ پانی اُسپر بند ہے اچھا طویس جاکر خبر تو لا، کہ کون آیا ہے؟

طویس ایک عجیب انداز سے جوتہ پہن، اور اٹھکیلیاں کھاتا ہوا چلا، اور دروازہ پر پہونچکر ایک پٹ کھولا اور سر نکالکر دیکھا تو دو اونٹ باہر کھڑے تھے، جن کی مہار میں دو شخصوں کے ہاتھ میں تھیں، جس میں سے ایک طویل القامت تھا اور معزز معلوم ہوتا تھا، جس کا چہرہ چہرہ بند کوفیوں کی طرح چھپا ہوا تھا، اور عبا زیب بر تھی، دوسرا اس کی بہ نسبت کوتاہ قامت تھا، اور قرینہ سے پہلے شخص کا خادم معلوم ہوتا تھا، طویس نے پوچھا، آپ کون ہیں اور کہاں سے اور کیوں تشریف لائے"؟ طویل نے آواز بنا کر جواب دیا، "ہمارا علم غالباً اس معاملہ میں ہمیں غلط ہدایت نہیں کرتا کہ یہ مکان عزۃ المیلاء کا ہے"

طویس:- "بے شک یہ عزہ کا مکان ہے، آپ کی غرض کیا ہے؟

طویل:- میری غرض مکان میں آنے، اور صاحب مکان سے ملاقات

کرنی کی ہے،

طوبیس۔ کیا اپنی تعریف آپ مجھے بتائیں گے؟"

طویل۔ نہیں، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں،

طوبیس۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی اطلاع کروں،

یہ کہہ کر طوبیس اندر چلا گیا، اور عزہ کو اس شخص کے آنے کی اطلاع کی، جس کے ساتھ ہی ہمیمہ نے کہا "مجھے تو اب اجازت دیجئے۔ کیونکہ مجھے آئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ علی الخصوص ایسی حالت میں میرا ٹھہرنا یہاں اور بھی غیر مناسب ہے، جبکہ کچھ اجنبی مہمان یہاں آگئے ہیں"۔

عزہ۔ جیسی تمہاری خوشی، میں ایسے موقعہ پر روکنا بھی مناسب نہیں خیال کرتی

اس کے بعد ہمیمہ رخصت ہوئی، عزہ نے چند قدم اس کی مشایعت کی، اور ایک مخصوص پشت کے دروازہ سے اسے راستہ بتا کر واپس ہوئی۔

واپس ہوئی تو عزہ نے طوبیس سے کہا کہ جا کر یا تو اس آنے والے کا چہرہ دیکھیے، یا کچھ نام و نشان پوچھ کر آ۔

طوبیس گیا اور چند لمحہ کے بعد واپس آیا، اور کہا آنے والا شخص اہل بادیہ سے ہے، اور محض آپ کے گانے کا شوق اسے یہاں کھینچ لایا ہے، نام نہیں بتاتا مگر میرے اصرار پر اس نے صرف اتنا پتہ دیا، کہ ان دو بیتوں کا قائل میں ہی ہوں"۔

وذی حاجۃ قلنا لہ لا تہ بھا ۔۔۔ قلبس الیھا ما حییت سبیل[1]

لئام صاحب لا ینبغی ان تخونہ ۔۔۔ وانت لاحزی صاحب وخلیل[2]

---

[1] اور جب کسی خواہشمند ایسے کو میں نے اُن سے کہا کہ تجھے سلام کرو اسکو، کیونکہ اس تک تجھے کی رسائی ہی نہیں

[2] میرا کوئی ایسا دوست کہ جس کی امانت میں مجھ کو خیانت نہ ہو، اور ایسے ہی تو دو حرے کا یا راضی ہو

لیلی الاخیلیہ

عزہ نے طویس سے جب یہ سُنا، وہ اپنی جگہ پر خوشی سے اُچھل پڑی، اور اگر اُس کی فربہی اُسے اجازت دیتی تو ضرور وہ دروازہ تک اس مہمان کے استقبال کو جا پہونچتی۔ طویس نے اُس کی اس بے اختیاری پر تعجب سے پوچھا "کیوں آپ ایسی خوش کیوں ہوئیں"؟

عزہ:۔ طویس کیا مجھے نہیں معلوم کہ آنے والا شخص کون ہے؟

طویس:۔ میں نہیں واقف ہوں۔

عزہ۔ اگر میں اُس کی زبان سے کسی غیر کا کلام بھی سنتی، تو باتوں ہی باتوں میں اُسے پہچان لیتی، کیا تو نے خیال نہیں کیا کہ اُس نے حرف ضاع کو مکسور ادا کیا ہوگا مثل اہل بہرائے،

طویس:۔ کچھ خیال تو مجھے پڑتا ہے کہ اُس نے ایسا کیا، اگرچہ میں نے زیادہ توجہ اُس پر نہ کی۔

عزہ۔ ہمارا مہمان شب لیلی الاخیلیہ مشہور شاعرہ ہے، جس کے یہ شعر ہیں؛

طویس:۔ (خوش ہوکر) عجب حُسن اتفاق ہے، اب تو مرے ذوقِ سماعت کی بن آئی اُس کی زبان سے شعر بھی سُنوں گا اور اُس کے ساتھ توبہ ابن حمیر کے عشق کا دلکش فسانہ بھی، اس موقعہ پر اس تذکرہ کی چھیڑ کچھ بے محل اور لیلیٰ کے برخلاف مزاج تو نہ ہوگی،

عزہ:۔ ہرگز نہیں، لیلی کو تو یہاں نہایت بے تکلف پائے گا۔ باوجود اہل بادیہ ہونے کے جو بلا ضرورت آبادی میں آنا بُرا جانتے ہیں، وہ کبھی کبھی یہاں آجاتی ہے۔

اس کے بعد طوبیں اپنے بوڑھے غمزہ دکھاتا ہوا پھر دروازہ پر پہونچا، اور غمزہ کی جانب سے تاخیر پر معذرت، اور عمدہ الفاظ میں مشتاقانہ خیر مقدم کیا، پھر تینوں باغ میں داخل ہوئے طوبیں لیلیٰ کے پیچھے تھا، اور اس کی کشیدہ قامتی اور سرو رفتار کو حیرت سے دیکھتا جاتا تھا، کیونکہ عرب خواتین میں لیلیٰ کی طوالت صفت نادرہ تھی، اور اس کا انداز خرام نرالا، مگر دلکش،

تھوڑی دور جاکر لیلیٰ نے خادم کو اشارہ کیا کہ اونٹوں کو وہ عرش درختوں سے بنے ہوئے مسقف مقام میں لیجائے۔ یہ حکم دے کر وہ چلی گئی، اور جونہی غمزہ کے سامنے پہونچی، غمزہ بڑے تپاک اور گرمجوشی، سے اس کے استقبال کو یہ کہتی ہوئی بڑھی" مرحبا بلیلیٰ۔ اھلا بك یا حبیبه۔ لقد بالغت فی الاختفاء حتے اسانا معاملتك۔ واخرنا" اور نہایت اعزاز و اخلاص سے اسے صدر میں تکیہ کے سامنے لیجاکر بٹھایا، لیلیٰ نے (بھاری اور مردانی آواز سے مشابہ آواز میں) جواب دیا،

کچھ مضائقہ نہیں، مری ہی غلطی تھی، میرا خیال تھا کہ لب و لہجہ اور آواز سے میں آسانی کے ساتھ پہچانی جاسکوں گی"

طوبیں دروازہ سے لگا ہوا اس اشتیاق میں کھڑا باتیں سن رہا تھا کہ "کاش لیلیٰ چہرہ کھولدیتی، تو اس کے رخ زیبا کی زیارت بھی کرلیتا، لیلیٰ کے دل میں یہ تھا، کہ یہ کمبخت یہاں سے ٹلتا، تو میں فراغت کے ساتھ سامان سفر اور اشیاء تبدیل ہیئت سے ہلکی ہوکر غمزہ سے کچھ باتیں کرتی، اتنے میں غمزہ اس کے دلی خیال کو خود تاڑکر بول اٹھی" پیاری لیلیٰ! یہ مخنث ہے، پردہ کی چیز نہیں" اور اس سے زیادہ اس کی تعریف یہ ہے، کہ طوبیں مغنی بھی ہے" لیلیٰ یہ سنکر ہنسنے لگی، اور چہرہ بند وغیرہ اتار دیا، اور کہنے لگی"

وہی طوبیس جس کی نحوست اور شوم نے اُسے مشہور کر رکھا ہے؟ میں اسے دیکھکر بہت خوش ہوئی"۔

مگر لیلیٰ کا چہرہ کہتے ہی طوبیس اُس کے حسن سے مرعوب ہوگیا، اُسکی چشم غزالاں نے جادو ڈالا، دانتوں کی آب و تاب بہار عقل کو لے اُڑی، چہرہ کی رونق اور شگفتگی نے (جو بادیہ نشینوں کے چہرہ سے خاصکر جھلکتی ہے)، ہوش و حواس لے لیے اور بیچارہ طوبیس بُت بنکر رہ گیا، مگر لیلیٰ کی باتوں میں جو اُس نے بُوئے اُنس پائی، تو خوشی سے پھول گیا، اور یہ کہتا ہوا بالقصد قربت مسند کیطرف جسپر لیلیٰ بیٹھی تھی، بڑھا،

مجھے آج اپنی خوش بختی اور یاوری طالع پر ناز کرنے کا بجا حق حاصل ہے کہ عرب کی قابل فخر شاعرہ بارعہ! کی ملاقات مجھے نصیب ہوئی، اور اُس حسن قدرت کی تصویر مجسم نے لطف فرمائی سے ایک خادم کی ذرہ نوازی بھی فرمائی، تیرے عشق میں توبہ ابن حمیر کے گداز کا واقعہ اور اُس کا پُر تاثیر کلام جب کوئی مجھے سُناتا تھا، تو میں اُسے سنتا تھا، اور حیرت کرتا تھا، کہ تو ایک شوہر دار عورت ہے، تجھ سے اُس کا شغف اُس کی صحت دماغ کا کرشمہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا، مگر آج اس چہرہ نے جس میں صبح درخشاں کی چمک اور دلربائی کی صفت ہے میری اُس حیرت کو زائل کردیا، اور حسن میں جو کان ملاحت اور رعنائی، ہے، ضرور وہ کشش ہے جس نے توبہ ابن حمیر کو دیوانہ بنا رکھا ہے"۔

لیلیٰ نے جب توبہ کا نام سُنا تو اُس کے چہرہ پر ایک قسم کی سُرخی دوڑ گئی، اور انفعال سے اُس کی نظر نیچی ہوگئی پھر اُس نے نظر اُٹھا کر طوبیس سے کہا، "کیا تم نے توبہ کے کچھ ایسے اشعار سُنے ہیں؟

طوبیس ہاں میں نے اُس کا اکثر کلام، اس رنگ کا سُنا ہے، جس میں سے آپ کو اس وقت چند شعر سُناتا بھی ہوں، وَهُوَ هٰذَا

ولو ان لیلی الاخیلیۃ[1] سلمت علیّ و دونی جندل و صفاح
لسلمت تسلیم البشاشۃ اوزقی[2] الیھا صدی من جانب القبر صائح
واغبط من لیلی بما لا انالہ[3] الا کل ما قرت بہ العین صائح

اشعار سنتے سنتے لیلیٰ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ عزہ نے اسے محسوس کیا، اور اس ذکر کو ٹالنے کیلئے کہنے لگی "مناسب ہوگا کہ اب اٹھکر آپ غسل فرمائیں اس کے بعد خاصہ طیار ہے تناول کریں" لیلیٰ نے جواب دیا "ان امور کا آپ اہتمام نکریں، میں اسوقت محض آپ سے ملاقات کرنے آئی ہوں" اور کچھ خاص باتیں اور گانے وغیرہ کی صحبت کے بعد واپس جاؤں گی"

عزہ۔ کیا آپ اسوقت شام سے آتی ہیں؟

لیلیٰ "ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے مدینہ میں ہم داخل ہوئے، میرے ساتھ ایک رفیق سفر اور بھی ہے، جسے ایک دوسری جگہ ٹھہرا کر میں یہاں آئی ہوں اور اسی جہہ سے جلد واپس جاؤنگی،

اسوقت عزہ کے دل میں خیال آیا، کہ کہیں وہ لوگ جو سمیہ کو اسوقت کنارۂ آب نظر آئے تھے یہی تو نہ تھے اور اس نے لیلیٰ سے پوچھا، "میں سمجھتی ہوں کہ بعد الغروب ہم نے درختوں کے پاس شام کے راستہ سے آتے ہوئے آپ ہی لوگوں کو دیکھا تھا"

لیلیٰ نے کہا "ہم تین آدمی تھے۔ اور بیشک بعد الغروب ہم صواحی مدینہ میں اپنے اونٹوں پر سوار پہونچ گئے تھے"

"خالغالی"

---

[1] لیلیٰ اخیلیہ اگر مجھے تحفہ سلام بھیجے اگرچہ میرے اس کے درمیان ٹیلہ اور چٹانیں پہاڑ حائل ہیں؟

[2] تو میں بھی اگر (زندہ رہا تو) اس کو دلی جوش کے ساتھ سلام بھیجوں گا، (اگر مر گیا تو) قبر سے میری صدا ایک چیخ کی صورت میں اس کے کانوں تک جائے گی۔

[3] غبطہ کرتا ہوں میں لیلیٰ کی ان باتوں پر جن کا لطف مجھے نصیب نہیں، اور جن باتوں کا نقشہ جہن میں کھنچا ہے، ان کی دلفریبی کا کیا پوچھنا،

سرمستیِ آلام

میرا پہلو آہ وقفِ بسترِ غم ہو چلا — قلب میرا آشنائے دردِ پیہم ہو چلا
زیرِ سر بالش مرا اشکوں سے پُرنم ہو چلا — آنکھ اور لختِ جگر سے ربطِ باہم ہو چلا
چھن گیا آرام میرا لٹ گئی راحت مری
پھر ہوا مجھکو جنوں پھر آ گئی شامت مری

ہو گئے شبہائے عشرت کے فسانے اک خیال — محو دل سے ہو چلا ہے لطفِ پیمانِ وصال
اب تو یہ فرطِ تپش سے ہو گیا ہے اپنا حال — بیٹھ جاؤں چین سے میں اک جگہ بالکل مجال
کھائے جاتا ہے مجھے فرقت کا نالہ دل کا درد
حدتِ غم سے ہوئی جاتی ہیں نبضیں میری سرد

ہجر میں جس کے تڑپتا ہوں وہ مجھ سے دور ہے — میں یہاں بے چین وہ عشرت میں اپنے چور ہے
کرب ہے یاں، قلب اُس کا عیش سے معمور ہے — کیا خبر اُسکو کہ کیا حالِ دلِ مہجور ہے
ہو کے افتادہ، ہیں ہم آغوشِ گردِ راہ کے
کیا اُٹھیں گے اب سہارے سے عصائے آہ کے

جب میں تھا نخچیرِ بائے زلفِ مشکیں جیب — اوج پر طالع تھا جب میرا ترقی پر نصیب
چارۂ دردِ جگر کو پاس تھا اپنے طبیب — میں قریبِ یار تھا اور یار تھا مجھ سے قریب
میں تو اُس دم بھی حریصِ دردِ حسن و عشق تھا
تھا مسیحا پاس رہتا تھا مگر بیمار سا

جب نگاہِ بے محابا میں لذت یاب تھا — جب شعاعِ حسن سیمیں سے زبس سیراب تھا
دستِ نازک جب مرے سینہ پہ وجہِ خواب تھا — ہائے کمبخت دل اُسوقت بھی بیتاب تھا

حسن تھا میرے قریں لیکن مٹا جاتا تھا میں
آتشِ ہجراں نہ تھی لیکن بھڑکا جاتا تھا میں

اب کہ میں ہجراں کشِ تسکینِ وصلِ یار ہوں
اب کہ تیغِ تیز فرقت سے میں دل افگار ہوں

آتشِ دوریِ جاناں سے میں شعلہ بار ہوں
ہے تپش اب بھی وہی ویسا ہی اب بھی زار ہوں

فرق اتنا ہے کہ جب تھا دردِ وصلِ حسنِ یار
تنگیِ فرقت میں اب ہے روحِ لرزاں کو فشار

کرب و بیچینی یہ ماہم نے، ہیں پیغامِ ہجر
یہ مسلّم ہے، مٹا دیں گے ہمیں آلامِ ہجر

دردِ و غم کو ہم سمجھتے ہیں، کہ ہیں آرامِ ہجر
یہ مگر ہوگا نہ ہم سے تجھکو کو سیں شامِ ہجر

رازِ دل میرا نہاں ہے تیرے خلوت خانے میں
جوش کھاتی ہی میری صہبا ترے پیمانے میں

ہمدمو آخر نتیجہ کیا مرے سمجھانے کا
کیوں گلہ تمکو کسی سے ہو مرے تڑپانے کا

پہلے یہ سمجھو مجھے کیوں شوق ہے مٹنیکا
کیا مگر تم جان لوگے مرتبہ دیوانے کا؟

میری کروٹ اضطرارِ شوق کی تصویر ہے
میری بیتابی کتابِ حسن کی تحریر ہے

دم ذرا لے لوں محبت میں مجھے فرصت کہاں
سانس لینے کی حباب بحر کو جرأت کہاں

دردِ ہولذت کشِ تسکین کب، راحت کہاں
واقفِ صبر و سکوں ہوں، یہ میری قسمت کہاں

میں بابِ زندگی کا نغمۂ پُر درد ہوں
کاروانِ حسن کے رفتار کی میں گرد ہوں

میرے غم کو دیکھکر عشرت نہ ہو دے بدگماں
گل فشاں ہے فی الحقیقت میری چشمِ خونچکاں

ہے تپش میری پر پروازِ حسنِ دلستاں
بیقراری میں مرے ہے جلوۂ ہستی نہاں

ہے شکستِ رنگ میری ہمدمو ساز عشق کا
میری رسوائی ہی اک افسانہ رازِ عشق کا

ہیں نظم و نثر میں عشق کی کاہیاں | انوارِ اصفہ ہوگئیں ہیں جسکی جبینوں | ابیتِ قرار قلب حزیں عشق کی بیتابیاں | احسن کی شوخیاں بھی ہیں موجِ آسمانی | دردِ دل میرا گداز شمع ہستی ہوگیں

تمدن کی پہلی سالگرہ اور بزم احباب

شکریہ قبول کر، فانی دنیا! ان زندہ آنکھوں کا، جو تیری ناپائدار بساط پر رنگ بہ رنگ کے جلوے دیکھ رہی ہیں، حوصلہ بڑھا رہی ہے تیری دورنگی ان تماشائیوں کا بھی، جو اپنی کوششوں میں ناکام اور آرزوؤں میں مایوس ہو چکے اس بے بسی اور بے کسی کے میدان میں، جہاں ہر طرف تفکرات کے کانٹے بچھے ہوتے ہیں تو اس دیوی کا جلوہ دکھا کر دل موہ لیتی ہے جس کے سر پر امید کا تاج شاہی ارمانوں کے موتیوں سے جگمگا رہا ہے یہی گنگا جمنی سماں دیکھتے دیکھتے عمریں ختم ہو گئیں، زمانہ کہیں کا کہیں پہنچا، جو کل بچے تھے وہ آج سیانے اور جو نئے تھے وہ اسوقت پرانے ہو گئے،

کل کی بات ہے کہ تمدن دنیائے ادب میں نمودار ہوا۔ اور آج کا پرچہ اس کا پہلا سال ختم کر رہا ہے جن ہاتھوں نے چند روز پہلے اس کا پروسپکٹس تیار کیا وہ اسوقت اس کے ابتدائی سال پر ریویو کر رہے ہیں جس دماغ میں اجرائے تمدن کی خواہش مارچ ۱۹۱۱ء میں زور شور سے پیدا ہوئی تھیں وہی دماغ مارچ ۱۹۱۲ء میں اپنی خواہشوں کے انجام پر نظر ڈال رہا ہے جو دل آج سے ایک سال پہلے بہت سی حسرتوں سے لبریز اور ارمانوں سے بھرا ہوا تھا اب یہ دیکھتا ہے کہ کتنے ارمان پورے ہوئے اور کتنی حسرتیں خاک میں مل گئیں۔ تمدن جو ایک چھوٹے دودھ کے ساتھ لیکر نکلا تھا اور جس کی بہت سی امیدیں دوسروں سے وابستہ تھیں اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اور اس کی امیدیں کس حد تک پوری ہوئیں

جس طرح چشم بینا عمر کی منزلیں طے کرتی ہوئی کبھی بار آور درخت اور کھلے ہوئے پھولوں سے آشنا اور کبھی ان مرجھائی ہوئی کلیوں سے دوچار ہو کر جو باد سموم کے جھونکوں سے فنا ہو چکیں اس نتیجہ پر پہونچتی ہے کہ اے! عنصر خاکی، حیات پریشان کو دماغ سے نکال پیوند زمین کر، سر اٹھا، آنکھ کھول، اور اپنے سامنے دیکھ! ملکہ کامیابی کی شاہانہ سواری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح یہ تین چوتھائی صدی تمدن کے بسر ہوئے اہل وطن کی خموشی ہمیشہ حوصلے پست اور ہمتیں توڑتی رہی مگر ان احباب کی قدردانی نے جو خلوص کا ساغر لگائے محبت کی آنکھوں سے تمدن کو دیکھ رہے تھے امیدوں کو ہمیشہ کامیابی کے لباس میں پیش نظر رکھا اور یہی صورتیں آج مایوس دماغ اور افسردہ دل سے یہ چند سطریں لکھوا رہی ہیں وضع کے پابند آن پر جان دینے والے وہ اگلے لوگ جن کے نام آج فانی دنیا آنکھوں سے لگا رہی ہے، مدتیں ہوئیں کہ مرکھپ گئے گو آسمان و زمین دونو یقین کر چکے کہ اب تاریخ ان پاک ناموں سے محروم ہو چکی مگر تمدن نے بتا دیا کہ ابھی ایسی صورتیں دنیا میں موجود ہیں جو کونے کھدروں میں پڑے لوگوں کو بھی قوت سے دیکھ رہی ہیں۔

رفتار زمانہ متقاضی تھی اور ضرورت کے فرشتے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ تعلقات کا دائرہ وسعت کا محتاج ہے۔ دوسروں کے نقش قدم پیش نظر ہیں مگر وہ دل وحشی جو عمر بھر قید تنہائی کا عادی رہا جسکو دربار کے دو ایک بھی گھر سے نکلنا قسم تھا جس کی آنکھیں ویرانہ میں آبادی کا لطف دیکھ رہی ہیں اپنا رنگ تبدیل نہ کر سکا۔

کج خلقی جس کی جبلیں بے مروتی جس کی انیس تنہائی جس کی ہم وحشت جس کی ہمدم۔ اسکو حق کیا ہے کہ کسی کی بے اعتنائی کا شکوہ

مگر ہاں تمدن کا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس نے اُردو علم ادب کو اُن جواہرات سے مالا مال کیا جو ضرورتِ زمانہ، ناقدری یا عدیم الفرصتی کی وجہ سے علیحدہ پڑے ہوئے تھے مگر اُن کی آب و تاب کا سکہ ملک اور قوم دونوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، اور جن کی چمک دمک تمدن کے سوا دوسری جگہ نظر آنی مشکل ہی کفرانِ نعمت ہے اگر اس موقعہ پر تمدن شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب ایل۔ایل۔ڈی۔ سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے۔ میرزا محمد سعید صاحب ایم اے مولوی سید اشرف حسین صاحب بی۔اے۔ ڈاکٹر محمد شرف الحق صاحب۔ ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی مشتاق احمد صاحب زاہدی۔بی اے۔ جیسے حضرات کا جو لٹریچر کے واسطے مایۂ ناز ہیں ذکر نہ کرے جو عقدہ کامل ایک سال تک الجھا رہا آج سلجھتا ہے۔ تمدن کے دسترخوان سے بعض مہمان ناقدری کا الزام لگا کر کھڑے ہوگئے اس کا فیصلہ ناظرین تمدن کریں گے کہ جن پردیسیوں کا تمدن کے سوا کوئی ٹھکانا نہ تھا اُن کے قدم سر آنکھوں پر لینے میں تمدن کس جرم کا مرتکب ہوا۔

آنکھ کے سامنے ہیں وہ مقدس صورتیں جنھوں نے محض اس وجہ سے تمدن کی مخالفت کی کہ حقوق نسواں کی بحث تضیع اوقات ہے مگر،

عزیزو! دوستو! انصاف کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی نہ باندھو! زندگی جو دمے ثبات اور حیات ناپائدار ہے، عمر عزیز کی کل کائنات ایک رات کی صحبت ہے۔ اس جلسے کے شریک دور دور سے تمھارا نام سنکر آئے ہیں وہ کام نہ کرو حسرت صبح صادق کے وقت جب یہ پیاری صورتیں ٹھنڈی سی تصویر رہ جائیں گی، نکلا ہے آفتاب جس نے بارہ گھنٹے تمھارا ساتھ دیا پھیکا پڑ چکا ہوگا خوشرنگ پھول جو مقابلہ پر ہیں مرجھا چکے ہونگے شمع کا فوری دم توڑ رہی ہوگی، ! دنیا تمھارے

اعمال پر ٹھٹے لگائے۔

دلپر ہاتھ رکھ کر دیکھنا، بیٹیاں آگے بہنوں کے بھائی اور ماؤں کے بیٹے ہو، کیا قدرت نے انہیں اسی لیے بنایا تھا کہ یہ تمھاری خدمت کریں اور پیٹ میں ٹکڑا ڈال لیں۔

خیال بھی تھا توقع بھی تھی اور یقین بھی تھا کہ فرقۂ نسواں اور حامیان حقوق نسواں تمدن کی اس کوشش میں ہاتھ بٹائیں گے مگر اللہ اللہ خواتین میں سے بنت نذر الباقر صاحبہ۔ نواب نظیری بیگم صاحبہ۔ بیگم عطاء اللہ صاحب۔ اے بیگم صاحبہ۔ دختر صاحبزادہ عبد المجید خاں صاحب بیگم منشی عزیز الدین صاحب۔ ز۔ خ۔ ش صاحبہ ان چار پانچ کے سوا کسی نے اسطرف خیال بھی نہ کیا البتہ لاہور کے ایک کرمفرما کی عنایت خصوصیت سے قابل ذکر ہے جنھوں نے اس شرط پر سو پرچے خریدنے کی درخواست کی کہ تمدن حقوق نسواں پر بحث نہ کرے۔

ظاہری ٹیپ ٹاپ جسمیں کثرت تصاویر بھی شامل ہے روپیہ کا کھیل تھا مگر ضمانت ہی تمدن کے واسطے ایسا کاری زخم تھا جس نے آجتک نہ پنپنے دیا اسپر فحط الرجال، یا حامیان حقوق نسواں کا کال رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ لیکن اس یاس و نا امیدی میں جہاں خدا کے سوا کوئی مددگار نہ تھا با وصف مخالف کشتی تمدن کو اوڑائے پھرتی تھی۔ چند ایسی صورتیں بھی کنارے پر نظر آئیں جو سلامتی کے واسطے دست بدعا تھیں ان کا خلوص اور سچی محبت دل وحشی کو مسخر کر گئی افسوس اس کا ہے کہ انمیں سے بعض صورتیں دیکھنے سے پہلے آنکھیں ہمیشہ کو بند ہو جائینگی۔ مگر اسوقت کہ رات کے دو بج چکے ہیں تمدن یہ پیغام اُن پیاروں تک پہنچا دیگا جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور ترسیں گی۔

یادش بخیر لطیف الدین احمد نہیں فقط لطیف اور بیان حامد حسن نہیں صرف حامد (عزیزوں معاف کرنا) دہارادی اور پور قاضی کی عزت جو کچھ بھی ہو خدا زیادہ کرے زندہ رہو اور خوش رہو۔ مولوی نور احمد صاحب سید تصدیق احمد صاحب منشی عبد الرزاق صاحب بسمل شکریہ کے محتاج نہ ہوں مگر انکی عنایتیں فراموش نہیں ہو سکتیں،

سرزمین دکن جو قدر دانی و جوہر شناسی میں سدا مشہور رہی یلبرگہ سے خان عالی و سید بخاوت خاص حیدر آباد سے میر مہدی علی صاحب شہید نے جو کچھ کیا دل اب تک اس کے مزے لے رہا ہے۔

بھوپال کا خیال آتے ہی سید ناصر و منشی جمیل احمد کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور میاں ارشد کی یاد کہیں سے کہیں لے گئی، اچھا بھائی! یار زندہ صحبت باقی! کبھی تو ملو ہی گے،

کیسی اچھی محفل جمی ہوئی ہے! عالم خیال اسوقت وہ صورتیں دیکھ رہا ہے جنکی بدولت تمدن نے دلی کی لاج رکھ لی، آؤ، آؤ میرے محسنو، آؤ، تمھارے قدم سر آنکھوں پر، اجڑے ہوئے شاہجہاں آباد کی مقدس خاک کا ہر ذرہ تمھارے استقبال کو تیار ہے، تمھاری محبت بھرے دل اور بزرگوں کی ضعداری کا پتہ دینے والی آنکھیں اسی بستی میں رنگ برنگ کے تماشے دیکھیں گی رات آدھی سے زیادہ گذر چکی، چاند مدھم پڑا اور تارے چھٹکنے شروع ہو گئے یہ تمام بہار صبح صادق تک ہے پھر تم کہاں اور یہ تمدن کی محفل کہاں اذان کے ساتھ یہ سماں درہم برہم ہے مدتوں کے بچھڑے ایک جا جمع ہوئے ہیں اب غنیمت ہے یہ صحبت جس کا لطف مدتوں آنکھوں میں سمایا رہے گا۔ آنکھیں ترسیں گی اور روئیں گی۔ دل تڑپے گا اور ڈھونڈھیگا

مگر بعض صورتیں دوبارہ نظر نہ آئیں گی پردیسی مسافر دیکھنا دیکھنا! کیسے کیسے لوگ تم سے ملنے آئے ہیں انکی ظاہری صورتوں پر نہ جاؤ، ان کی حیثیت اور حالت پر نظر نہ ڈالو ان کے پہلو میں دل ہیں ان کے دلوں میں درد ہے یہ وہ ہیں جنھوں نے دلوں کے رستے اور مہینوں کی منزلیں گھڑیوں میں طے کیں محبت کے پروں سے اڑے اور قدر دانی کی فضا میں جھومتے جھامتے شاہجہاں آباد پہونچے۔ عزیزم سید ابوالقاسم خاں شوکت کی طرح سو جانے کی سہی نہیں ہے راتیں بہت سی آئیں گی مگر یہ سماں نظر نہ آئیگا جوش کی طرح بزم تمدن کی شرم رکھو۔ منشی لیاقت علی خاں صاحب اودھ سے آئے ہیں ایسا نہ ہو دلی پر نام رکھیں۔ مولوی سیف الدین شباب کو ساتھ لو اور محفل کا چکر لگالو۔

ٹھیر جا! ٹھیر جا! اے شب وصل، خدارا راز ہو اور پیاروں کی صورت دل بھر کر دیکھ لینے دے، بھائی رضا حیدر! دلی اب وہ دلی نہیں رہی اکبرآباد پہونچکر شکایت نہ کرنا، پھر بھی اس وقت کو غنیمت سمجھو آنے والے لوگ ان باتوں کو بھی ترسیں گے، پیارے لطیف! اکتیس برس کے بعد صورت دکھائی ہے اگلی کی باتیں کہانیاں کردیں سلطان پور کی منصفی وہ سفکری خاک میں ملادی کبھی ملاقات ہو تو اوسط کو سلام پہونچا دینا۔

آہ! آہ! اے ساعت فراق کس دل سے سریہ آہ پہونچی، اور دیکھتے دیکھتے وہ سماں درہم برہم کردیا، اٹھو! اٹھو! بدیسی مسافر تمدن سے رخصت ہو پھر ہے تشریف لانے والے نیر کو آغا غلام حسین صاحب شاہد اور منشی مظفر خاں صاحب مدارات میں کوئی کمی ہوئی ہو تو مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کورٹ انسپکٹر کی طرح معاف کردینا،

صبح صادق کا پیغام لانے والی چڑیوں للہ رحم کرو۔ سید ظفر احسن صاحب سبزواری شیخ علی اختر خزیں، ڈاکٹر سلیمان خاں، عزیزم محمد محسن سید حشمت علی۔ صاحبزادہ وحید احمد صاحب فاروقی۔ مولوی محمود حسن۔ سید حسن عسکری منشی عبدالعزیز، شیخ غوث محمد جیسے دوستوں سے دو باتیں کر لینے دو،

معزز ناظرین تمدن! سمع خراشی معاف مؤذن اذان دے رہا ہے، نسیم پیغام صبح لے آئی۔ جلسہ ختم اور آنے والے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہوئے رات گئی اور رات کے ساتھ وہ بات البتہ اس صحبت کی یادگار پہلو میں وہ دل مجروح ہے جو محبت کی آنکھوں سے ایک ایک کی صورت کو تکتا رہا، اور شب فراق کے مزے لے رہا ہے۔ مرجھائے ہوئے پھول جلی ہوئی شمع وہ سماں یاد دلا رہی ہے جو آنکھ سے اوجھل ہو گیا،

پیارو چشم ظاہر سے دور ہو جاؤ مگر دل تمہاری یاد سے خالی نہیں سچے دوستو کامل ایک سال کے بعد (بشرط محبت) ملاقات ہو گی خدا تمہارا نگہبان ہے میرا شکریہ قبول کرو زندہ رہا تو شریک بزم ہو کر میری عزت بڑھاؤں مر گیا تو فاتحہ کے پھولوں سے یاد کرنا،

تمدن اب دوسرے سال میں قدم رکھتا ہے قدردانی کے ہاتھ اس کے سر پر رکھو، شفقت بزرگانہ سے اسکی غلطیاں معاف کرنا اور اسکو اپنا فرزند تسلیم کرنا قصد ہے کہ اپریل کا پرچہ غیر معمولی حجم متعدد تصاویر و منتخب اہل قلم کے مضامین کے ساتھ تمہارے متبرک ہاتھوں میں پہنچے وعدہ ہے کہ ناظرین تمدن کو دوسرا سال مبارک ہو اور آرزو ہے کہ خاک شاہجہاں آباد کا یہ خشک پودہ اپنے سرپرستوں کے فیض سے سرسبز و شاداب ہو کر لہلہاتا رہے۔

ناشکری ہوگی اگر تمدن اس موقعہ پر ان مہربانوں کا شکریہ بھری محفل میں نہ ادا کرے جنھوں نے حقوق نسواں جیسی سنگلاخ زمین کو خون جگر سے سینچکر گلزار تمدن کو لالہ زار کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مشہور ادیب منشی نوبت رائے صاحب نظر کا اسم گرامی ہے۔ منشی صاحب کی قابلیت ہماری تعریف کی محتاج نہیں، انکی توجہ کا ایک کرشمہ انڈین پریس کا رسالہ ادیب ہے، باوجود افکار و حوادث کے جنمیں اکلوتے بچے کی موت بھی شامل ہے حضرت نظر نے تمدن کو فراموش نہ کیا۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی مولوی رضا علی صاحب وحشت، مولوی نیاز محمد خانصاحب نیاز فتحپوری۔ میرزا مہدی خانصاحب کوکب عظمت محوی۔ مولوی میرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی، مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی خصوصیت کے ساتھ شکریہ کے مستحق ہیں، اہل قلم کی وہ جماعت جس کے مضامین سے قوم اور ملک کا کوئی پرچہ محروم نہیں اور جس کے مضامین تمدن نے شکریہ سے واپس کیے ضرر تمدن سے ناخوش ہوگی مگر تمدن ان سے معافی کا خواستگار ہے

اپریل کے پرچہ کے متعلق جو قصد اوپر ظاہر ہوا اسکی تکمیل محض قدردانان تمدن کی توجہ پر منحصر ہے گو اس قسم کی خواہش ایک قسم کی سبکی ہے مگر موجودہ مالی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے ہم صرف ان چند احباب کو جن کی ذات سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست کو ضائع نہ کریں گے اور جن کی بابت یہ یقین ہے کہ انکی ادنی توجہ اس مقصد کو پورا کر دے گی ہم وی وی پی کارڈ روانہ کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے کارڈ واپس فرما کر اس سال تمدن کی ضخامت اور تصویر میں اضافہ کریں گے۔

ایڈیٹر

غزلیں

یاں سے بھی محروم و مشتاق لقا جاتا ہوں میں
جو خوشی تیری رضینا بالقضا جاتا ہوں میں

تا نہ میری پیڑی سی خاک ہو جائے کوئی
کوئی جاناں سی مٹا کر نقش پا جاتا ہوں میں

یار کیا آتا ہی گھر میرے کہ آتی ہے بہار
صورت گل فرط شادی سے کھلا جاتا ہوں میں

روز یہ عمر گراں مایہ ہوئی جاتی ہے کم
دن دہاڑے عین بستی میں لٹا جاتا ہوں میں

شعبۂ راہ محبت میں ہزار اندر ہزار
ساتھ ہوں سب کے مگر سب سے جدا جاتا ہوں میں

مضمحل ہے جسم خاکی کے تعلق سے یہ روح
پیرہن بھاری جو پہنا ہے دبا جاتا ہوں میں

بحر موج قضا میں کیا ٹھکانا کاہ کا
پھینک دیتی ہیں جدھر موجیں بہا جاتا ہوں میں

ساز و سامان کی ضرورت کیا عدم کی کوچ میں
مطمئن ہے دل کہ بے پیش آشنا جاتا ہوں میں

ہست و بود اپنی ہے لے آباد مثل نقش پا
خود بخود آیا ہوں یوں جیسے چلی جاتا ہوں میں

غلام علی آزاد

نگہ صاف کام اپنا کر جائے گی
یہ برچھی مگر تا جگر جائے گی

وہ زلف رسا گر بکھر جائے گی
تو پھر یہ بلا کس کے گھر جائے گی

وہ آئیں گے جنبک مجھے دیکھنے
یہاں مت کام اپنا کر جائے گی

نہ آئے تو کل کیطرح یہ بھی شب
تڑپتے تڑپتے گذر جائے گی

نہ پوچھیگا بلبل ترا حال گل
تڑپتے تڑپتے ہی مر جائے گی

تری غیر دشمن میں طالب ہوں موت
ادھر آئے گی یا ادھر جائے گی

یہ دھڑکا عبث ہے تمہیں اے شہید
گذرنی جو ہوگی گذر جائے گی

حضرت شہید

نخلِ اُمید ہے گریہ کا شجر پانی میں — یاس ہے نالۂ بیدل کا ثمر پانی میں
پرتوِ عارضِ جاناں سے ہیں روشن دونوں — نظر آتے ہیں جو یہ شمس و قمر پانی میں
حیف گریہ سے ہوا سوختہ نخلِ اُمید — کیا تماشا ہے ہوا خشک شجر پانی میں
عکسِ خالِ رخِ جاناں ہے سیاہی مہتاب — زلفِ پیچاں کا نمونہ ہے بھنور پانی میں
دلِ بیتاب کی گریہ سے نہ حالت پوچھو — آہ یہ جاتا ہے یہ لختِ جگر پانی میں

کس کی تقدیر کے چکر کا نمونہ ہے ذکی
کیوں پڑا کرتا ہے دن رات بھنور پانی میں

تجمل حسین ذکی

کلامِ ربانی کے اکثر ترجمے ملک میں شائع ہوئے مگر جو قبولیت مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی مولانائے مرحوم کی علمی قابلیت نے دنیائے اسلام پر کیسا احسان کیا ہے کہ اسکا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا اور نفس الامر یہ ہے کہ مولانا ہی کی ذات بابرکات اس اہم کام کی اہل بھی تھی۔

یہ کلام اللہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جو مطلب ترجمہ سے حل نہیں ہوتا اس کی تصریح حاشیہ پر نہایت عمدگی سے خود قابل مترجم نے کر دی ہے حروف اس قدر جلی ہیں کہ بچے اور بڈھے بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں اور ترجمہ بھی اس قدر کشادہ کہ پڑھنے میں مطلق دقت نہیں ہوتی باوجود ان تمام خوبیوں کے مجلد کپڑے کی جلد رسمی کاغذ کی قیمت صرف ۴ حنائی ہے۔

میرزا صاحب ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ اس کلام ربانی کی قیمت میں سے ایک چوتھائی رقم ٹرانسوال فنڈ میں دیں گے اور چونکہ اس کلام ربانی کی خریداری ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے ہمیں اُمید ہے کہ ناظرین تمدن ضرور اسطرف توجہ کریں گے۔

درخواستیں بنام ابوظفر منشی حامد میرزا صاحب کوچہ روح الامین دہلی آنی۔